دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دار العلوم

جلد: ۹۱ | ذی الحجہ ۱۴۲۷ھ مطابق جنوری ۲۰۰۷ء | شمارہ: ۱

مدیر	نگراں
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۰ روپئے، سالانہ -/۱۰۰ روپئے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۶۰۰ روپئے

بنگلہ دیش سے سالانہ -/۱۲۵ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۵۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411077577 *(EDITOR)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman, Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P. Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	وقت نفس وجوب کا سبب نہیں ہے وقت برائے ذبح اضحیہ میں مکان اضحیہ....	مفتی رشید احمد فریدی	۷
۳	فرقہ واریت کے خاتمہ کیلئے امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰؓ کے چالیس ارشادات	مرتب: ایم ایم ابوعثمان علی	۲۱
۴	ای کوڈ (E. Code) کی شرعی حیثیت ناپاک چیزوں کی ملاوٹ کا شرعی حکم	مولانا اسلم اللہ خاں	۳۲
۵	مفتی بے نقاب یا میڈیا کی مسلم دشمنی بے نقاب	محمد اللہ خلیلی قاسمی	۴۶
۶	نام نہاد مہذب دنیا کا دوہرا رویہ	ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی	۵۵

ختم خریداری کی اطلاع

- ○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا نورالحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مکتبہ معاویہؓ داؤدوالا ڈاکخانہ کرم علی والا، براستہ شجاع آباد ضلع ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

ہماری دینی درس گاہوں کا اصل موضوع قرآن وسنت اور فقہ اسلامی ہے انہیں کی تعلیم وتعلّم افہام وتفہیم، تکمیل اتباع اور دعوت وتبلیغ مدارس عربیہ دینیہ کا مقصود اصلی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ دینی تعلیمی وتربیتی ادارے علوم شریعت اسلامی کے نقیب اور خاتم الانبیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہم کے فرائض سہ گانہ: تلاوت قرآن، تعلیم کتاب اور تفہیم حکمت وسنت کے وارث ہیں۔

ماضی قریب میں ان تعلیمی مراکز نے اس عظیم امانت کی حفاظت اور اس قابل صد فخر امانت کو اخلاف تک منتقل کرنے میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے وہ ہماری علمی وثقافتی تاریخ کا ایک زرّیں باب ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف کئے بغیر کوئی منصف مزاج نہیں رہ سکتا۔ آج کے انتشار پذیر اور مادیت کے فروغ کے دور میں بھی یہ اسلامی مدارس اپنے وسائل وذرائع کے مطابق مصروف عمل ہیں اور ملت اسلامیہ کی اولین واہم ترین ضرورت کی کفالت کررہے ہیں۔ بھلا اس سچائی کا کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ کفر وفسق کے گھٹا ٹوپ اندھیرے اور مذہب بیزاری کے موجود ماحول میں اسلامی تہذیب ومعاشرت اور دینی رسوم وعبادات کے جو روشن آثار نظر آرہے ہیں وہ واسطہ وبالواسطہ انہیں درسگاہوں کے جہد وعمل کا ثمرہ ہیں۔

مدارس دینیہ کا یہی وہ کردار ہے جو اسلام بیزار طبقہ کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے، کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ ان مدرسوں کی آزادانہ کارکردگی کا یہ سلسلہ جب تک جاری رہے گا اسلام اور مسلمانوں کی اسلامی شناخت کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال دینے کا ان کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکے گا۔ اس لئے آج یورپ وامریکہ کی زیر سرپرستی عالمی پیمانہ پر اسلامی درسگاہوں کے نظام تعلیم وتربیت میں ترمیم وتنسیخ کے لئے منصوبہ بند مہم چل رہی ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ سقوط روس کے بعد ہمارے ملک کی قومی حکومتوں کا جھکاؤ امریکہ کی جانب ہے اور چاروناچار اظہار وفاداری کے لئے انہیں کی آواز میں آواز ملانا ہی پڑتا ہے۔ یہ مدرسہ بورڈ کا قیام بھی غالب گمان یہی ہے کہ اسی اظہار وفاداری کا ایک حصہ ہے۔ اور مدارس کو اس بورڈ سے وابستہ کرکے دراصل انہیں بے جان بنادینے کی ایک شاطرانہ ترکیب ہے۔

آخر اس کی کیا توجیہ کی جائے کہ خود حکومت کے بیان کردہ اعداد وشمار کے مطابق مدارس عربیہ دینیہ میں زیر تعلیم بچوں کی تعداد صرف دو فیصد۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلم بچوں کی اٹھانوے فیصد تعداد اسلامی مدارس سے دور سرکاری اسکولوں کالجوں وغیرہ میں زیر تعلیم ہوگی یا ان میں کی ایک معقول تعداد اپنے والدین کی خانگی مجبوری کی بناپر بچہ مزدوری کی صف میں شامل ہوگئی ہوگی مسلمانوں کی اقتصادی وتعلیمی کمزوری کے بارے میں سچرکمیٹی نے جو رپورٹ دی ہے اس کے پیش نظر قرین قیاس یہی ہے کہ اس اٹھانوے فیصد کی تعداد میں اکثریت تعلیمی مشغلہ سے الگ ہی ہوگی۔ پھر جو بچے سرکاری اسکولوں اور کالجوں وغیرہ میں پڑھتے ہیں ان میں خود سرکاری بیان کے مطابق تقریباً ساڑھے پانچ فیصد درمیان ہی میں تعلیمی سلسلہ کو منقطع کرکے گھر بیٹھ رہتے ہیں اس لئے عقل وانصاف اور ہمدردی وغمخواری کا تقاضا یہی ہے کہ پہلے اٹھانوے فی صد مسلم بچوں کے روشن مستقبل کی فکر کی جائے اور ان کے معاش ومفاد کی خوشحالی کی تدبیریں سوچی جائیں۔ لیکن ہماری قومی وزارت تعلیم کو ان مسلم بچوں کی کوئی فکر نہیں اور فکر ہے تو صرف ان دو فیصد بچوں کی جو دینی ومذہبی مدرسوں میں تعلیم وتربیت حاصل کررہے ہیں ہماری وزارت تعلیم اور اس کے غمخوار وزیر انہیں کے فکر معاش میں دبلے ہورہے ہیں۔ وزارت تعلیم کا یہ رویہ بجا طور پر یہ شبہ پیدا کررہا ہے کہ ان دو فیصد بچوں کے بہانے وہ مدرسہ بورڈ بالواسطہ سے ملک کی دوسری اکثریت قوم مسلم سے ان کے دستوری حق کو چھیننا چاہتی ہے اسے یہ گوارا نہیں ہے کہ مسلمان اپنے دستوری حق کے مطابق اپنی مرضی کے مطابق اپنے مذہبی ادارے چلائیں۔ انہیں سرکار کے قانونی شکنجے میں کسنے کے لئے ہی یہ مدرسہ بورڈ قائم کیا گیا ہے۔

کیونکہ اس سرکاری مدرسہ بورڈ سے ملحق ومنسلک ہوجانے کے بعد ان مدارس کی خود مختار حیثیت اور آزادی مجروح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور اس قسم کی مداخلت سے آگے چل کر مدارس کے اصل دینی مقاصد روحانی واخلاقی تربیت، تعلیمی روح اور صدیوں سے آزمودہ طریقۂ کار کو درہم برہم کرکے رکھ دے گا۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد اور دائرۃ المعارف حیدرآباد کی مثالیں

ہمارے سامنے ہیں۔ان اداروں کا سرکاری تحویل میں آجانے کے بعد کیا حشر ہوا وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سرکاری اداروں میں آئے دن تجاویز وترمیمات کا سلسلہ جاری رہتا ہے ان بدلتے ہوئے اضافوں وقراردادوں کے ساتھ مدارس عربیہ سکون واطمینان کے ساتھ فروغ اشاعت دین وتحفظ قرآن وسنت اور ترویج علوم دینیہ کی اپنی خدمات کو کیونکر باقی رکھ سکتے ہیں۔نیز آئے دن بدلتی ہوئی حکومتوں، اور ان کے اہل کاروں کے بدلتے ہوئے رجحانات ونظریات کے ساتھ مدارس عربیہ اپنی خودمختاری کو (جوان کا دستوری حق ہے) بھلا کیسے باقی رہ سکیں گے۔

پھر دینی مدارس کی اصلاح کا یہ منصوبہ کوئی نیا منصوبہ نہیں ہے، فرقہ پرست پارٹیاں اور تنظیمیں نیز لادین طبقہ دینی مدارس کی آزادانہ کارکردگی کو ہمیشہ سے تشویش کی نگاہوں سے دیکھتا اور ان کے حق خوداختیاری کو چھین لینے کی تدبیر سوچتا اور اسکیمیں بناتا رہا ہے۔کون اس سے ناواقف ہوگا کہ فرقہ پرست طاقتیں ایک عرصہ سے مدارس اسلامیہ کے سر یہ الزام تھوپنے کی ناروا کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ یہ مدارس دہشت گردی کے اڈے ہیں یہاں دہشت گرد تیار کئے جاتے ہیں حالانکہ آج تک وہ اپنے اس غیر معقول دعویٰ پر ثبوت پیش نہیں کرسکیں اور نہ قیامت کی صبح تک پیش کرسکتی ہیں۔ان کے اس بیہودہ پروپیگنڈہ کا مقصد یہی ہے کہ وہ کسی طرح ان مدارس کو قومی مجرم بتلا کر انہیں بند کرانے میں کامیاب ہوجائیں۔یہ مدرسہ بورڈ بھی مدارس کو بے روح بنادینے کی ایک خوشنما اور دلفریب ترکیب ہے، یہ دام خوش رنگ بھی دراصل اسی اصلاح مدارس کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسے ایک سیکولر حکومت اور اس کے سیکولر وزیر کے ذریعہ بچھایا گیا ہے۔

آج جو لوگ اس مدرسہ بورڈ کی وکالت وحمایت کررہے ہیں اگر ان کی یہ بات مان بھی لی جائے کہ موجودہ وزارت تعلیم دینی مدارس کے علماء وطلبہ کی خیرخواہ ہے اور انہیں کی فلاح وبہبود کے لئے یہ بورڈ قائم کررہی ہے اس بات کو تسلیم کرلینے کے باوجود بھی ملت اسلامیہ کو یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ اگر اس بہانے ایک بار مدارس سرکاری تحویل میں دیدیئے گئے تو ان کی حیثیت کسی نہ کسی حد تک سرکاری اداروں کی ہوجائے گی۔آج اگر ایک سیکولر اور مسلم اقلیتوں کے حقوق کی رعایت کرنے والی سرکار ہے تو کل فرقہ پرست اور مسلم بیزار سرکار بھی آسکتی ہے پھر اس وقت سرکاری قانون کے شکنجے میں کسے ان مدارس کا حشر کیا ہوگا وہ دن کے اجالے کی طرح روشن ہے اگر ہمارے ان علماء کرام کو جو مدرسہ بورڈ کی حمایت اور اس کی سودمندی پر لچھے دار تقریریں کررہے ہیں اور اخباروں

میں بیانات، مراسلات چھپوا رہے ہیں مدارس کی یہ حیثیت گوارا ہے تو بڑے شوق سے مدرسہ بورڈ سے ملحق ہوجائیں اور سرکاری مراعات سے فیض یاب ہوں، مگر اس بات کو بھی ذہن میں ملحوظ رکھیں کہ کل کا حقیقت پسند مؤرخ ان مدرسوں کی تباہی کی تاریخ مرتب کرے گا تو میر جعفر وصادق کی صف میں انہیں کھڑا کرے گا۔

ہماری ان علماء کرام سے گذارش ہے کہ سرکاری تعلیم گاہوں میں جو نصاب تعلیم رائج ہے اس سے ایک جہاں کا جہاں استفادہ کررہا ہے اور ہزاروں میں ایک آدھ فرد اپنی آخرت وعاقبت سنوارنا چاہتا ہے، اگر مدرسہ بورڈ کے اشارہ کے مطابق وہی سرکاری نصاب کلی یا جزوی طور پر دینی مدارس میں بھی جاری کردیا جائے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ ہزاروں میں سے ایک فرد کو جو دین سیکھنے کے لئے دینی مدارس کو قبلۂ توجہ بناتا تھا اس کے لئے کوئی پناہ گاہ باقی نہیں رہے گی اس لئے دینی مدارس کو جدید تعلیم گاہوں کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے یہی بہتر ہے کہ ان مدارس کو ان کے حال پر رہنے دیا جائے اور جو لوگ سرکاری مراعات کے خواہشمند ہوں وہ دینی مدارس کے بجائے عصری تعلیم گاہوں سے استفادہ کریں۔دینی مدارس کو جدید تعلیم گاہوں میں کلی یا جزوی طور پر تبدیل کرکے ان کی اصلی حیثیت کو بدل دینا یہ ایسا جرم ہوگا جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔

آخر میں ہم موجودہ حکومت اور وزارت تعلیم اور اس کے سیکولر وزیر سے بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مسلم بچوں کے سلسلے میں ان کی خیرخواہی واخلاص سرآنکھوں پر لیکن دینی مدارس کے بارے میں یہ سرکاری مدرسہ بورڈ خود حکومت کے لئے بہت سی پریشانیوں کا باعث ہوگا۔اور ملت اسلامیہ ہند کی اکثریت ان سے منحرف ہوجائے گی جس کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں اس لئے وسعت قلبی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کے حق مذہبی تعلیم پر کسی قسم کی قدغن لگانے سے احتراز کیا جائے اور چند خوشامدیوں اور اغراض پسندوں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر کوئی ایسا اقدام نہ کریں جو ملک کی دوسری اکثریت کے اندر بے چینی واضطراب کا باعث بنے۔کیونکہ اس سے خود حکومت اور ملک کا ہی نقصان ہوگا۔

وقت نفس وجوب کا سبب نہیں ہے

وقت برائے ذبح اضحیہ میں مکان اضحیہ ہی کا اعتبار ہے

از: مفتی رشید احمد فریدی

قابل احترام لائق تکریم حضرت مولانا صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ آنجناب بعافیت ہوں گے۔

مسئلہ قربانی سے متعلق نئے موقف کا علم ہونے پر بندہ نے تحقیق کے لئے کتب ذیل کا مطالعہ کیا: بدائع الصنائع، مجمع الانہر، ملتقی الابحر، الدر المنتقی، ہدایہ، بنایہ، عنایہ، فتح القدیر، تکملہ فتح، کنز الدقائق، فتح المعین حاشیہ شرح کنز، شرح وقایہ، عمدۃ الرعایہ، شرح نقایہ، السعایہ، نور الانوار، حسامی، نامی حاشیہ حسامی، تقریر وتحبیر وغیرہ (اور الفقہ علی مذاہب الاربعہ) حاصل مطالعہ اور تفتیش کے خلاصہ کو ''قربانی کے نفس وجوب اور وجوب اداء وشرط اداء - اور - مکان اضحیہ کے اعتبار کی تحقیق'' کے نام سے مقالہ کی شکل میں مرتب کرکے اہل علم کی خدمت میں روانہ کیا۔ چند ہفتوں کے بعد نئے موقف کی تائید میں سہارنپور سے ایک تحریر آئی اور کراچی پاکستان سے ان کے سابق فتویٰ کا خلاصہ آیا اِن دونوں کے اجمالی جواب کے بعد ایک دوسرا مختصر اور اہم مقالہ ''سبب اور محل وجوب کی تدقیق'' تیار کرکے مفتیان کرام کی خدمت میں بھیجا۔

ان تحریرات میں فقہی صریح دلائل کی بنیاد پر راقم کو یقین تھا بلکہ ہے کہ ذی علم علماء جب عمیق اور وسیع نظر سے مطالعہ فرمائیں گے تو ضرور حقیقت آشکارہ ہوجائے گی اس لئے خیال تھا کہ آنے والی عید الاضحیٰ (۱۴۲۶ھ) سے پہلے پہلے حسب سابق تعامل کے مطابق کوئی تحریر یا فتویٰ کسی بڑے صاحب قلم کی طرف سے ظاہر ہوجائے گا تاکہ عامۃ المسلمین بلکہ عام علماء کی تشویش ختم ہوجائے۔ رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ کی تعطیل کے بعد نئے موقف کے مخالف نتائج کو واضح اور مرتب کرنے لگا پھر مراد آباد کے فتویٰ پر اصول کی روشنی میں تحقیقی نظر ڈالی تو کئی تسامحات سامنے آئے جو تحریر میں لائے گئے۔ بایں ہمہ تذبذب دور نہ ہوا اور خطاء وذہول کا پردہ چاک نہ ہوا تو ایک تیسری تحریر ''وقت نفس وجوب کا سبب نہیں ہے الخ''، مفصل ومبرہن تیار کی گئی۔ اب یہ سب تحریریں بھی اہل علم کی خدمت میں بھیجی جارہی ہیں جن سے نئے موقف کے خدوخال اور حقیقت حال سے کماحقہ واقف ہوجائیں گے مذکورہ بالا تمام تحریرات میں تاریخ تالیف وترتیب بھی درج ہے۔

اہل علم سے بصد ادب عرض ہے کہ بندہ یقیناً کم علم وبے مایہ ہے، ناچیز کے پاس ہے ہی کیا کہ سراونچا کیا جائے اور جھولی میں جو کچھ ہے وہ اساتذہ کرام کی دی ہوئی علمی بھیک ہے فللّٰہ الحمد علی ذلک۔ پس فقیر بے نوا

علمائے ربانی میں کسی ایک کے مقام ومرتبہ کے پاسنگ بھی نہیں ہوسکتا بلکہ ان کی خاک پا کی ہمسری بھی نصیب ہوجائے تو زہے سعادت۔ میں نہ علمائے حق کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں نہ اُن سے مراء وجدال مطمحِ نظر ہے نہ اپنی تحریروں سے سمعہ وشہرت کا طالب اور نہ کسی پر فوقیت جتانا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان خصالِ ذمیمہ سے میری اور میری ذریت کی حفاظت فرمائے اور تاحیات صراط مستقیم پر گامزن رکھے، آمین۔ علمائے کبار تو اپنے اپنے مقام پر علم کے پہاڑ اور فیض کے سمندر، اور ناچیز ذرۂ بے وقار وقطرۂ بے مقدار ہے چہ نسبت خاک را بعالم پاک۔ مگر اس علو مرتبت اور رفعت شان کے باوجود بہر حال وہ انسان ہیں اور انسان خطاء ولغزش سے بری نہیں ہے۔

پس راقم آثم اپنی علمی بے بضاعتی کے باوجود کتب فقہ کے اصولی وفقہی صریح دلائل کے پیش نظر پورے یقین اور وثوق کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ اِس مسئلہ خاص میں ہمارے علماء سے ذہول ہو رہا ہے اور فتاویٰ اسی پر متفرع ہیں۔ بندہ النُصح لائمة المسلمين (الحديث) کی بنیاد پر لوجہ اللہ علمائے وقت کی خدمت میں مؤدّبانہ عرض پرداز ہے کہ مسئلہ قربانی میں نئے اختلاف کا سبب وقت سے نفس وجوب مراد لینا ہے۔ وقت کا سبب وجوب ہونا بالکل مسلّم مگر اصولاً وجوب کی دو قسمیں نہ ہوتیں، اور وقت کو فقہاء سبب وجوب اداء قرار نہ دئے ہوتے، اور سببیت وقت میں انتقال نہ پایا جاتا تو بلاشبہ کراچی ومراد آبد وغیرہ کا فتویٰ علی الرأس والعین۔

لہٰذا کاتب الحروف اہل علم سے درخواست کرتا ہے کہ بندہ کی تمام تحریرات کو وسیع اور گہری نظر سے مطالعہ فرمائیں پھر اپنے تأثر سے آگاہ فرمائیں اور ان تحریرات میں کہیں بھی علمی وقلمی فروگذاشت ہو اس سے ناچیز کو ضرور مطلع فرمائیں گے میں آپ کا ممنون وشکر گذار رہوں گا۔ فقط

رشید احمد فریدی

نحمده و نصلي على رسوله الكريم   امابعد:

فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق عام مشائخ احناف کے نزدیک وجوب کی دو قسمیں ہیں: (۱) ایک اصل وجوب (نفس وجوب) (۲) وجوبِ اداء۔ مقصود بالذات چونکہ اداء ہے نہ کہ نفس وجوب اس لئے وجوبِ اداء مطلوب ہوا مگر اصل وجوب غیر معتبر بھی نہیں ہے۔ شریعت نے مختلف مواقع میں نفس وجوب (اصل وجوب) کا اعتبار کیا ہے۔ پھر یہ نفس وجوب تو اداء سے منفک (علیحدہ) اور مقدم ہوتا ہے اور وجوبِ ادا، اداء سے متصل اور اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ وجوبِ اداء وقت سے متعلق اور وابستہ رہتا ہے۔ وقت پر نفس وجوب کا مدار نہیں ہے۔ کیونکہ وقت کی تخصیص وتحدید اداء کیلئے کی گئی ہے نہ کہ نفس وجوب کیلئے۔ (مقالہ اولیٰ، ص:۲۰۱) حسامی، بدائع تقریر وتحبیر وغیرہا۔

(۱) عبادات میں نفس وجوب کا مدار ایسے چند امور پر ہے جو مکلّف کی صفات ہیں اسلام، عقل، بلوغ، اقامت، حریت، غناء (مالک نصاب ہونا) اور استطاعتِ زاد وراحلہ اِن امور کے پائے جانے پر علی حسب اختلاف العبادۃ مکلّف کے ذمہ اعمال کا وجوب ہوتا ہے یہ وجوب من جانب اللہ ہے۔ یہی نفس وجوب ہے یا اسے مکلّف ہونا کہتے ہیں اِن امور کو حضرات فقہاء عموماً

شرائط وجوب سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ حج کا مکلّف ہونے یعنی حج کے نفس وجوب کیلئے فقط بیت اللہ کا وجود کافی نہیں ہے جس کو فقہاء نے سبب قرار دیا ہے بلکہ **وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً** (قرآن پاک) مستطیع یعنی زاد وراحلہ پر قادر رہنا شرط ہے یہ استطاعت وقدرت مکلّف ہی کی صفت ہے۔ اور عبادت مالیہ میں علاوہ شرائط تکلیف کے حر اور مالک نصاب ہونا بھی شرط ہے۔ اور بعض چیزوں کا وجوب من جانب العبد ہوتا ہے یعنی بندہ کے اختیار میں ہے جیسے دم قران، دم تمتع اور اشیاء منذورہ خواہ وہ قربت بدنی ہو یا مالی اِس وجوب کا مدار بھی صفاتِ مکلّف پر ہے یعنی قارن، متمتع ہونا یا ناذر رہنا فقہاء کرام اُسے سبب سے تعبیر کرتے ہیں۔ (مقالۂ ثانیہ، ص:۱)

قربانی بالاتفاق مالی عبادت ہے اس لئے قدرت علی المال تمام ائمہ مجتہدین کے نزدیک ضروری ہے ائمہ ثلثہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ کے نزدیک قربانی سنت مؤکدہ ہے اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے پس عاجز پر بالاتفاق قربانی نہیں ہے۔ البتہ قدرت کی حد میں تفصیل ہے۔

تنقسم شروط الاضحیة الی قسمین شروط سنیتها وشروط صحتها فاما سنیتها فلا تسن للعاجز عنها وفی حد القدرة تفصیل المذاهب.

الحنفیة قالوا القادر علیها هو الذی یملك مائتی درهم. الحنابلة قالوا: القادر علیها هو الذی یمکنه الحصول علی ثمنها ولو بالدَین اذا کان یقدر علی وفاء دَینه. المالکیة قالوا: القادر علیها هو الذی لایحتاج الی ثمنها لامر ضروری فی عامه فاذا احتاج الی ثمنها فی عامه فلا تسن. الشافعیة قالوا: القادر علیها هو الذی یملك ثمنها زائدًا عن حاجته وحاجة من یعول یوم العید وایام التشریق. (الفقه علی مذاهب الاربعة ج ۱)

احناف کے نزدیک قربانی کے وجوب (نفس وجوب) میں بنیادی شرط غناء ہے۔ لان العبادة المالیة متوقفة علی المال (عمدة الرعایه ج:۳،ص:۳۸) اذا الغناء یوجب الاحسان وهو یحصل بالنصاب (نورالانوار، ص:۲۷۴) لان الغناء یوجب المواساة (حسامی، ص:۱۲۲) وشرائطها الاسلام الیسار الذی یتعلق به صدقة الفطر... (موسر) لان العبادة لاتجب الا علی القادر وهو الغنی دون الفقیر (مجمع الانهر، ج:۴، ص:۱۶۶) اذ لا نِزَاع لاحد فی ان علة وجوب الاضحیة علی الموسر هی القدرة

علی النصاب (تکلمه فتح القدیر، ج:۹، ص:۵۰۷) غرض یہ کہ قدرت علی النصاب مع دیگر امور کے مدار (اصل) وجوب ہے خواہ آپ اسے علت کہیں یا شرط یا لغۃً سبب کہہ لیں بہرحال ''قدرت'' مکلّف کی صفت ہے پس اِن صفات (شرائط وجوب) سے جو وجوب متحقق ہو رہا ہے وہ نفس وجوب ہے یعنی وجوب فی الذمہ چنانچہ بدائع میں ہے لان الموسر تجب علیه الاضحیة فی ذمته . اور اس کا محل ذاتِ مکلّف ہے یہ نہ وقت پر موقوف ہے نہ وقت کے ساتھ مقید ہے۔ امور مذکورہ بالا (صفات) کے شرائط وجوب ہونے کے دلائل کتب فقہ ہدایہ، بدائع وغیرہ میں مطالعہ فرمائیں۔

اب اُس واجب فی الذمہ کی ادائیگی جو درحقیقت امر الٰہی سے واجب ہے عقلاً ہمہ وقت ہونی چاہئے تھی مگر تیسیراً علی الناس ایام مخصوصہ اور اوقات متعینہ میں اداء کو کافی مان کر زمان مخصوص کی آمد کو خطاب الٰہی کے متوجہ ہونے کی علامت اور ادائیگی تک پہنچنے کا ذریعہ اور سبب قرار دیا گیا لان الخطاب یتوجه بعده (هدایه) کوقت الصلاة المکتوبة لها فانه سبب محض علامة علی الوجوب (تقریر وتحبیر، ج:۲،ص:۱۵۵) اور وقت مکلّف کی صفت نہیں ہے ہاں اداء (فعل) کیلئے وقت وزمان کا ہونا ضروری ہے کہ فعل بغیر زمان کے نہیں پایا جاتا اس لئے وقت مخصوص کی آمد سے جو وجوب متحقق ہوتا ہے اس کا اصل تعلق اداء سے ہے اسی لئے اس کو وجوب اداء کہتے ہیں اور اداء کا جو محل ہوگا اس کے حق میں بواسطۂ اداء وقت کا اعتبار کیا جائیگا چنانچہ نماز، روزہ میں محل اداء خود ذاتِ مکلّف ہے اور زکوٰۃ وقربانی میں محل اداء مال، جانور ہے۔ پس نفس وجوب اور وجوبِ اداء دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ وجوبِ اداء وقت پر موقوف ہے اس سے قبل نہیں ہوتا ہے۔ ان دونوں میں بیّن فرق ملاحظہ فرمائیے (مزید مقالۂ اولیٰ ص:۱ دیکھئے)

ونصاب الزکوة قبل مضی الحول ... فانه علةٌ اسمًا لانه وضع لوجوب الزکوة ویضاف الیه الوجوب بلاواسطة ومعنًی لانه مؤثر فی وجوب الزکوة اذ الغناء یوجب الاحسان وهو یحصل بالنصاب لا حکما لتأخر وجوب الاداء إلی حولان الحول (نورالانوار ص:۲۷۴) وکذا فی حسامی ص:۱۲۲. وعبادة فیها معنی المؤنة کصدقة الفطر فانها فی اصلها عبادة ملحقة بالزکوٰة ولهذا شرط لها الغناء (نورالانوار)

حضرت مولانا عبدالحیٔ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت محقق اور عمدہ طریقہ سے سمجھایا ہے:

الاصل فی هذا ان المال النامی سببٌ لوجوب الزکوة والحول شرط لوجوب

الاداء فاذا وجد السبب يصح الاداء مع انه لم يجب (شرح وقايه)

قوله الاصل فى هذا . حاصله ان ههنا امرين احدهما نفس الوجوب وهو كون الشيء فى الذمة وكونها غير فارغ عنها الا بالاداء او بالابراء وثانيهما وجوب الاداء وسبب نفس الوجوب هو المال النامى بالقيود المذكورة سابقا فاذا وجد ذلك اشتغلت ذمة المالك بالزكوة ووجبت عليه ووجوب الاداء انما يتحقق بحولان الحول فصحة الاداء متفرعة على وجوب ذلك الشيء فى نفسه فاذا وجد سبب الوجوب صح الاداء وان لم يجب بعد بخلاف مالم يكن عنده نصاب مطلقا فانها لم تجب عليه فلا يصح اداء ها مقدمًا. قوله مع انه لم يجب الحاصل ان تحقق سبب الوجوب يجب الشيء فى الذمة فاذا وجد المال النصاب وجبت فى الذمة وتعلقت بالزكوة واما وجوب الاداء الموقوف على مطابعة الشارع فهو انما يتحقق بعد حولان الحول. (عمدة الرعايه، ج:۱، ص:۲۲۸)

فقہ واصول فقہ کے اِن حوالوں سے واضح ہوگیا کہ وجوبِ اداء، وقت مخصوص ومعین کی آمد پر ثابت ہوتا ہے اورنفس وجوب کا تعلق ملک نصاب سے ہے اور یہ مسلّم ہے کہ قربانی مالی عبادت ہے زکوۃ وصدقۃ الفطر کی طرح اسی لئے تینوں عبادتوں میں مالک نصاب ہونا شرط ہے اورنصاب کا حوائج اصلیہ سے فارغ ہونا بھی ضروری ہے اور زکوۃ میں مال نامی ہونا بھی شرط ہے پس جوکوئی مسلمان آزادنصاب کے بقدر مال نامی کا مالک ہوا اور وہ حوائج اصلیہ سے فارغ ہوتو اب مالی تینوں عبادتوں کا مکلّف ہوگیا یعنی تینوں عبادت کا نفس وجوب ذمہ میں آ گیا پھرزکوۃ میں سال بھر کا گذرنا۔ صدقۃ الفطر میں صبح یوم الفطر کا پانا اور قربانی میں ایام نحر کا ہونا یہ سب وجوب اداء کے لئے شرط ہے اس سے پہلے وجوب نہیں ہوتا یعنی اس کی ادائیگی واجب نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ شرعاً غنی ہونے کی وجہ سے اس کے لئے صدقہ لینا جائزنہیں ہے اگرکسی نے دیدیا تو اس کا صدقہ اداء نہیں ہوگا۔ یہ حکم نفس وجوب پر ہی عائد ہوتا ہے۔ لہٰذا مکلّف ہونا تینوں عبادتوں میں شرعی غناء پر موقوف ہے اور وقت پراس کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔

(۲) عبادتِ غیر موقتہ یعنی جس کی اداء مقید بالوقت نہیں ہے۔ جیسے زکوۃ وصدقۃ الفطر ان میں وجوب اداء حولانِ حول سے یا صبح یوم الفطر کے پانے سے ہوتا ہے اس سے قبل نہیں اسی طرح عبادتِ موقتہ (نماز، روزہ اور قربانی) میں بھی وجوب اداء وقت پر موقوف ہے چنانچہ فقہاء نے

وقت کوسبب وجوب قرار دیا ہے اورسببیت میں کوئی اختلاف نہیں ہے وسببها الوقت وهو ايام النحر لان السبب انما يعرف بنسبة الحكم اليه ... ولا نزاع فى سببيّة ذلك ومما يدل على سببية الوقت امتناع التقديم عليه كامتناع الصلاة عليه (نهايه ۱۱/۳) لیکن وجوب خواہ اسے مشترک لفظی کہہ لیں جس کے دومعنی ہیں یا کلی جس کے دوجزئی ہیں یا مطلق کہہ لیجئے جسکے دوفرد ہیں ایک نفس وجوب (اصل وجوب) دوسراوجوبِ اداء، اصولی وفقہی صراحت کے مطابق سببیتِ وقت میں اس سے مراد سبب وجوب اداء ہے کیونکہ وقت سے اداء کا تعلق ہے نفس وجوب کا نہیں۔ دلیل نمبر(۱) کے تحت ملاحظہ فرما چکے ہیں مزید صریح دلائل مطالعہ فرمائیں۔

ووجه ذلك ما تقرر فى علم الاصول من ان وجوبَ الاداء فى الموقتات التى يفضل الوقت عن ادائها كالصلاة ونحوها انما يثبت آخر الوقت اذهنا يتوجه الخطاب حقيقة لان فى ذلك الآن يأثم بالترك لاقبله حتى اذا مات فى الوقت لا شيء عليه . والاضحية من هاتيك الموقتات فتسقط بهلاك المال قبل مضى وقتها ولا تسقط بهلاكه بعد مضى وقتها لتقرر سبب وجوب ادائها (تكمله فتح القدير ۵۰۸/۹) وقد يجامع الشرط السبب مع اختلاف النسبة كوقت الصلاة فانه شرط بالنسبة الى الاداء وسبب بالنسبة الى وجوب الاداء . (تقرير وحبير ۱۰۲/۲)

پس جب وقت وجوب اداء کا سبب ہوا تو وقت سے ثابت ہونے والے وجوب کا اصلاً اداء سے تعلق ہوا اور پھرمحل اداء سے متعلق ہوگا وههنا الواجب فى الوقت اراقة الدم ... لان الوجوب تتعلق بالاراقة ... ولانها قربة تتعلق بالمال. (بدائع) چنانچہ نماز، روزہ میں اِس وجوب کا تعلق ذاتِ مکلّف سے ہے اور وہی محل اداء ہے اس لئے مکلّف کے حق میں وقت کی ابتداء وانتہاء کا اعتبار کیا جائے گا اور قربانی میں اضحیہ کے حق میں اعتبار ہوگا کیونکہ وہی محل اداء (ذبح) ہے یہ بات عقلاً وفقہاً بالکل قطعی ہے۔ پس قربانی کا جانور جہاں ذبح کیا جاتا ہے خواہ ذبح کرنے والا خود من علیہ الاضحیہ ہو یا اس کا وکیل ونائب ہو ذبح اضحیہ کیلئے وقت کا اعتبار ضروری ہے۔

(۳) واجبات موقتہ (نماز، روزہ اور قربانی) میں باتفاق جمیع الفقہاء وقت شرطِ اداء یعنی شرطِ صحۃ اداء ہے وكل موقّت فالوقت شرط لادائه لانه لا يتحقق بدونه (تقرير و تحبير ۱۷۵/۲) الوقت شرط لادائها على ما عرف فى اصول الفقه (فتح القدير ۵۰۷/۹) اور یہ صرف احناف ہی کے نزدیک نہیں بلکہ دیگر ائمہ مجتہدین کے نزدیک بھی مثلاً یہی قربانی جوائمہ

ثلثہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے ان کے نزدیک بھی وقت شرط ادا ہے۔

واما شروط صحتها فمنها السلامة من العيوب ... ومنها الوقت المخصوص فلا تصح اذا فعلت قبله او بعده وفى بيانه تفصيل المذاهب .

الحنفية قالوا: يدخل وقت الاضحية عند طلوع فجر يوم النحر وهو يوم العيد ويستمر الى قبيل غروب اليوم الثالث وهذا لايختلف فى ذاته بالنسبة لمن يضحى فى المصر او يضحى فى القرية و لكن يشترط فى صحتها للمصرى ان يكون الذبح بعد صلاة العيد.

المالكية قالوا : يبتدئ وقت الاضحية لغير الامام فى اليوم الاول بعد تمام ذبح الامام ويبتدئ وقتها لِلِامام بعد الفراغ من خطبته بعد صلاة العيد او مضى زمن قدر ذبح الامام اضحيته ان لم يذبح الامام ويستمر وقتها لآخر اليوم الثالث ليوم العيد ويفوت بغروبه .

الحنابلة قالوا: يبتدئ وقت ذبح الاضحية من يوم العيد بعد صلاة العيد فيصح الذبح بعدالصلاة وقبل الخطبة ولكن الافضل ان يكون بعد الصلاة والخطبة ... واذا كان فى جهة لا يصلى فيها العيد كالبادية واهل الخيام ممن لا عيد عليهم فان وقت الاضحية يبتدئ فيها بمضى زمن قدر صلاة العيد ... وآخر وقت ذبح الاضحية اليوم الثانى من ايام التشريق. فايام النحر عندهم ثلثة يوم العيد ويومان بعده.

الشافعية قالوا: يدخل وقت ذبح الاضحية بعد مضى قدر ركعتين وخطبتين بعد طلوع الشمس يوم عيد النحر وإن لم ترتفع الشمس قدر رمح ولكن الافضل تاخيره الى مضى ذلك من ارتفاعها ويستمر الى آخر ايام التشريق الثلثة. (الفقه على مذاهب الاربعه ۱/۷۲۱)

پس ائمہ اربعہ کے نزدیک مطلق قربانی (یعنی واجب، سنت، نفل سب) کیلئے وقت شرطِ ادا ہے۔ البتہ احناف کے نزدیک چونکہ قربانی کی ایک قسم واجب ہے اور یہی وقت اس کا سبب وجوب ہے لہٰذا اب وقت دوحیثیتوں (شرط ادا، سبب وجوب ادا) کا جامع ہوا ان الوقت سبب لوجوبها وشرط لادائها (فتح القدير ۹/۵۰۶) فان قلت جعلتَ الوقت سببًا فكيف يكون شرطاً قلتُ هو سبب للوجوب وشرط للاداء (عناية على هامش الفتح

۱/۲۱۶) اور وقد يجامع الشرطُ السببَ مع اختلاف النسبة كوقت الصلاة فانه شرط بالنسبة الى الاداء وسبب بالنسبة الى وجوب الاداء (تقرير) یعنی وقت شرط ادا تو ہے ہی اب اگر قربانی واجب ہے جس کی مقدار غیر واجب (سنت ونفل) قربانیوں کے مقابلہ قلیل ہے تو شرط کے ساتھ سببیت بھی مجتمع ہوگی اسی لئے قد یجامع تقلیل کا صیغہ لیکر آئے۔ اور ... لاتجوز قبل دخول الوقت لان الوقت كما هو شرط الوجوب فهو شرط جواز اقامة الواجب كوقت الصلاة (بدائع ۵/۷۳) صاحب بدائع نے بجائے سبب الوجوب کے شرط الوجوب کا لفظ استعمال کیا ہے اس کی وجہ مقالۂ اولی ص:۷ پر درج ہے: اور المعتبر مكان الاضحية کا ضابطہ (اسی وقت بحیثیت) شرط ادا کے حق میں ہے۔

(۴) وقت سبب وجوب ہے اور سبب وقت میں فقہاء کے نزدیک انتقال پایا جاتا ہے یعنی وقت مخصوص کا وہ جزء جو ادا سے متصل ہے اسے سبب قرار دیتے ہیں اگر اوّل وقت میں ادا کا وجود ہو تو وہی سبب کہلائے گا ورنہ سببیت منتقل ہوگی اپنے مابعد کی طرف حتیٰ کہ وقت اخیر میں فعل واجب کا وجود ہوا تو اسے سبب کہیں گے ورنہ وقت نکل جانے کے بعد پورے وقت کو قضاء کے حق میں سبب قرار دیتے ہیں اور اسی انتقالِ سببیت کی وجہ سے وقت کے جس حصہ میں ادا پائی جائے گی اُس وقت کی صفت عارضی کا اثر وجوب میں ظاہر ہوگا کہ وقت صحیح کی وجہ سے وجوب کامل اور وقت فاسد کی وجہ سے وجوب ناقص مرتب ہوگا ذیل میں صاحب عنایہ شرح ہدایہ کے کلام کو غور سے مطالعہ فرمائیں اور حسامی، ص:۳۳ وغیرہ کتب میں بھی یہ مضمون دیکھا جائے۔

وقد تقدم ان سبب الصلاة اوقاتها لكن لايمكن ان يكون كل الوقت سببًا لانه لو كان كلُّه سببا لوقع الاداء بعده لوجوب تقدم السبب بجميع اجزائه على المسبب فلايكون اداءً وليس دليل يدل على قدر معين منه كالربع والخمس اوغيرهما فوجب ان يجعل بعض منه سببًا واقل ما يصلح لذلك الجزء الذى لا يتجزأ والجزء السابق لعدم ما يزاحمه اولىٰ فان اتصل به الاداء تعين لحصول المقصود وهو الاداء وان لم يتصل ينتقل الى الجزء الذى يليه ثم وثم الى ان يضيق الوقت ولَمْ يَتَقَرَّرُ على الجزء الماضى لانه لو تقرر كانت الصلاة فى آخر الوقت قضاء وليس كذلك لما سنذكر. فكان الجزء الذى يلى الاداء هو السبب او الجزء المضيق او كل الوقت ان لم يقع الاداء فيه لان الانتقال من الكل الى الجزء كان لضرورة وقوع الاداء خارج الوقت

علی تقدیر سببیة الکل وقد زالت فیعود کل الوقت سببًا ثم الجزء الذی یتعین سببًا تعتبر صفته من الصحة والفساد فان کان صحیحًا بان لایکون موصوفًا بالکراهة ولا منسوبًا الی الشیطان کالظهر وجب السبب کاملاً فلا یتأدّی ناقصًا. وان کان فاسدا ای ناقصًا بان یکون منسوبا الی الشیطان کالعصر یَسْتَأنِفُ وقت الاصرار وجب الفرض فیه ناقصاً فیجوز ان یتادی ناقصًا لانه اداه کما وجب بخلاف غیرها من الصلوات الواجبه باسباب کاملة فانها لا تقضی فی هذه الاوقات لان ما وجب کاملاً لایتأدی ناقصًا وقد ذکرنا ذلك فی الانوار والتقریر مستوفی بعون اللّٰه وتائیده. (عنایة شرح الهدایه فی هامش فتح القدیر ۲۳۴/۱)

کیا نفس وجوب جو متعلق بذمة المکلف ہوتا ہے اس میں بھی انتقال پایا جاتا ہے اور کیا نفس وجوب میں بھی وجوب کامل اور وجوب قاصر کا فرق ہے اور ادار وقت میں نہ پائے جانے کی صورت میں کیا پورے وقت کو نفس وجوب کا سبب قرار دیں گے؟ اور اگر وقت کے جزء اوّل ہی کو بالتعیین سبب کہتے ہیں تو دوسرے وقت میں وہ عمل (مامور بہ کی ادائیگی) ادار کہلائے گا یا قضار؟ وغیرہ سوالات پیدا ہوں گے۔

یہی حال یعنی انتقالِ سببیت قربانی کے وقت وجوب میں بھی ہے والاصل ان ما وجب فی جزء من الوقت غیر عین یتعین الجزء الذی ادی فیه الوجوب أوُ آخر الوقت کما فی الصلاة وهو الصحیح من الاقاویل علی ما عرف فی اصول الفقه (بدائع) ... لما ذکرنا ان الوجوب عند الاداء او فی آخر الوقت فاذا مات قبل الاداء مات قبل ان تجب علیه کمن مات فی وقت الصلاة قبل ان یصلیها انه مات ولا صلاة علیه کذا ههنا (بدائع ۶۵/۵)

اور نفس وجوب تو ادار سے منفک (جدا) مقدم ہی رہتا ہے اور نہ ہی اس میں انتقال ہے پس لامحالہ وقت نفس وجوب کا سبب نہیں ہے۔ لہٰذا وقت کو نفس وجوب کا سبب مان کر اس پر حکم (فتویٰ) کی بنار رکھنا صحیح نہیں ہے۔

(۵) وقت اگر نفس وجوب کا سبب ہوتا تو اہل بلغاریہ جیسے لوگوں کے حق میں جن کو عشار کا وقت قطعاً نہیں ملتا ہے فقہائے کرام کا نہ اختلاف ہوتا اور نہ ہی قضائے عشار کے وہ قائل ہوتے حالانکہ صحیح وراجح اور مفتی بہ قول کے مطابق عشار کی قضار واجب ہے معلوم ہوا کہ وہ عشار بلکہ وتر

کے بھی مکلّف ہیں وفاقدُ وقتیهما مکلفٌ بهما (درمختار) تو باوجود وقت مخصوص یعنی سبب وجوب نہ پائے جانے کے نماز کا مکلّف ہونا دلیل ہے کہ وقت پر نفس وجوب کا مدار نہیں ہے اور جس پر تکلیف شرعی موقوف ہے وہ اسلام، عقل، بلوغ، حریت، ملکیت وغیرہ امور ہیں۔ ہاں وقت جس کا سبب ہے یعنی وجوب ادار، کا سواس کے نہ پائے جانے کی وجہ سے کوئی بھی فقیہ اہل بلغاریہ کے حق میں ادار کے وجوب کا قائل نہیں ہے۔ الاداء فرض الوقت ولم یقل به احد اذ لایبقی وقت العشاء بعد طلوع الفجر اجماعًا وایضا فان من جمله بلادهم ما یطلع فیها الفجر کما غربت الشمس کما فی الزیلعی فلم یوجد وقت قبل الفجر یمکن فیه الاداء (شامی ۱۹/۲ مطبوعه بیروت) دیکھئے مقالہ ثانیہ ص:۴۰۔

تنبیہ

اگر خیال کیا جائے کہ عرف میں تو وقت سے ہونے والے وجوب کو ہی نفس وجوب کہتے ہیں اور بعض فقہار کی عبارت سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے جیسے وسبب وجوبها اوقاتها والامر طلب اداء مَاوجب فی الذمة بسبب الوقت (عنایة) تو بات درحقیقت یہ ہے کہ وقت کی آمد سے نماز، روزہ میں جس فعل معین (یعنی ارکان مخصوصہ، امساک مخصوص) کا وجوب ہورہا ہے اس کا صدور اور وقوع خود مکلّف کی ذات سے ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں نیابت جائز نہیں ہے۔ الاصل ان الوجوب اذا تعلق بفعل معین انه لا یقوم غیره مقامه کما فی الصلاة والصوم وغیرها (بدائع ۶۶/۵) لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ وقت کی آمد سے مکلّف کے ذمہ وجوب آرہا ہے مگر یہ ادائے واجب کا وجوب ہے نفس وجوب نہیں ہے۔ اور ادائے واجب ہی شرعاً مقصود ہے اور نفس وجوب اُسی ادار کے لئے مطلوب ہے اس لئے عرف میں وجوب ادار کو ''نفس وجوب'' یا محض ''وجوب'' سے ذکر کرتے ہیں لیکن اصولاً واصطلاحاً دونوں میں فرق ہے۔ فافهم وتدبر۔ یعنی نفس وجوب (ذمہ کا مشغول بالواجب ہونا) یہ متعلق بالمکلف ہے کیونکہ باعتبار صفاتِ مکلّف ہے۔ اور وجوب بسبب الوقت (یعنی تفریغ الذمہ عن الواجب) متعلق بالادار ہے اور بواسطہ ادار محل ادار کی صفت ہوسکتی ہے جو عبادت مالی، زکوۃ وقربانی میں مال اور جانور کی صفت اور اس سے متعلق ہے اور عبادت بدنی نماز، روزہ میں وجوب بسبب الوقت محل ادار (مکلّف) سے متعلق ہے پس نماز روزہ میں دونوں وجوب کا محل ایک ہی ہے اور زکوۃ وقربانی میں دونوں کا محل بھی الگ الگ

ہے۔(دیکھئے مقالۂ ثانیہ ،ص:۳) بہرحال وقت نفس وجوب کا سبب نہیں ہے وقت سے نفس وجوب مراد لینے میں قطعاً ذہول ہورہا ہے۔

(۶)''وقت کوسبب نفس وجوب ماننے کے مخالف نتائج''، مضمون کے تحت سات نتائج ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے ہرایک مستقل دلیل ہے کہ وقت نفس وجوب کا سبب نہیں ہے ورنہ یہ منفی نتائج مرتب نہ ہوتے۔ان میں نمبر(۳) کی کچھ تفصیل یہ ہے۔ سنئے

خیرالقرون سے اب تک ۱۲/۱۳/سو سال میں امت مسلمہ سلف وخلف، متقدمین ومتاخرین، اکابر علماء اصاغر صلحاء اوراولیاء محققین کے علاوہ بے شمار عوام مسلمین نے جتنی قربانیاں کی ہیں ان میں بہت سی قربانیاں من علیہ الاضحیہ کے اعتبار سے قبل از وقت (بلکہ بعد از وقت بھی) کی گئی ہوں گی وہ سب نئے فتاویٰ کے اعتبار سے ضائع اور رائیگاں ہوئیں نہ ہی واجب ادا ہوا اور نہ ہی ثواب ملا۔اتنا ہی نہیں بلکہ متواتر عمل کی خاص مثال کہ اللہ کے بعض بندے دنیا کے مختلف خطوں میں حرم واہل حرم کی عظمت ومحبت میں حجاج کی معرفت قربانی کا جانور یا اس کی رقم حرم بھیج دیتے ہیں تاکہ ان کی طرف سے دسویں ذی الحجہ کو قربانی کی جائے یا حاجی کے ساتھ اس کی ہدی میں حصہ دار ہوجائے اور یوم النحر کو حاجی جب اپنی ہدی (قران یا تمتع یا افراد) کا جانور ذبح کرے تو ساتھ ہی دوسرے شریک کی قربانی بھی ادا ہوجائے جبکہ رویت ہلال کی بناء پر ایک دن کا اور شمسی تقویم کے حساب سے صبح صادق وغیرہ اوقات میں فرق دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں یقینی اور قطعی ہے۔اس تعامل کی یہ دو بنیادیں ہوں گی:

(۱) ایک تو یہی اراقۃ الدم (ذبح نحر) قربت غیر معقولہ ہے اور ایسی عبادت شرع میں جس طرح وارد ہو اس کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ چنانچہ شریعت نے اضحیہ (قربانی) اور دم قران وتمتع کی ادائیگی کیلئے زمان کو خاص ومتعین کردیا ہے اور عقلاً ذبح کیلئے کہ وہ فعل ہے زمان کا ہونا ضروری بھی ہے پس عقل ونقل دونوں کے مطابق ذبح اضحیہ وہدی میں وقت کا اعتبار ضروری ہوا اس لئے مکان ذبح اضحیہ وہدی کے حق میں ایام نحر شرط ہے۔

(۲) دوسری بنیاد اس قربت کی ادائیگی کیلئے محل ذبح بَدَنہ (بڑے جانور) میں شرکت کی اجازت اور جہت قربت کا عموم اور وسعت ہے۔

ولو ارادوا القربة الاضحية او غيرها من القرب اجزاهم سواء كانت القربة واجبة او تطوعاً او وجبت على البعض دون البعض وسواء اتفقت جهات القربة او اختلفت

بان اراد بعضهم الاضحية وبعضهم جزاء الصيد وبعضهم هدى الاحصار وبعضهم كفارة شيء اصابه فى احرامه وبعضهم هدى التطوع وبعضهم دم المتعة والقِران – وهذا قول اصحابنا الثلثه. (بدائع ۷۱/۵) حتیٰ کہ اس میں عقیقہ کی بھی اجازت ہے۔

پس اگر کسی بدنہ (اونٹ، گائے) میں سات الگ الگ شرکاء ہوں جیسا اوپر مذکور ہوا اور صاحب اضحیہ مثلاً ہندمیں ہے جہاں یوم النحر عموماً ایک دن بعد ہوتا ہے اور قارن ومتمتع نے حرم میں دسویں تاریخ کو ہدی ذبح کی تو چونکہ اضحیہ اور دم قران وتمتع وافراد کے ذبح کے لئے ایام نحر کا ہونا ضروری ہے اور اس کا ہی اعتبار ہے لہٰذا فقہاء کرام کی صراحت کے مطابق قربانی اور قران وتمتع وغیرہ کا دم بھی صحیح ہوگا اور مُحصر کا اپنے احرام سے نکلنا درست ہوگیا اور کفارہ بھی ادا ہوگیا رہا نفس وجوب تو وہ ایام نحر سے قبل ہی موجود ہے۔یعنی غناء، احرام قران وتمتع، احصار، قتل صید اور جنایت کی وجہ سے وجوب ثابت ہوچکا ہے اور یہ امور کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں ہیں۔

اب اگر نفس وجوب وقت سے مان کر کہا جائے کہ ہندوستانی غنی کی قربانی مکہ میں یوم النحر کو درست نہیں ہے تو صورت مذکورہ بالا میں کسی کا واجب ادا، نہ ہوا کیونکہ (اراقۃ الدم) یعنی فعل ذبح فعل واحد ہے اس لئے ایک حصہ بھی غلط ہوا تو ذبح قربت (عبادت) ہی نہیں بنا نہ قربانی ہوئی نہ حاجی کا دمِ شکر ادا ہوا نہ جزاء وکفارہ ادا ہوا اور نہ ہی محصر کا دم صحیح ہوا تو اس کا احرام سے نکلنا بھی درست نہیں ہوگا۔اور اتنی صدیوں میں کتنے ہی ایسے واقعات ہوئے ہوں گے۔

وقت سے نفس وجوب ماننے سے صدیوں کا تعامل غلط ثابت ہوگا اور مفاسد کثیرہ پیش آئیں گے۔

(۷) جو مسلمان شرعاً غنی ہو اور غنی وہ ہے جو حوائج اصلیہ اور دین سے فاضل نصاب کا مالک ہو وہ مالی عبادتوں کا مکلّف ہونے کے سواء تمام فقہاء لکھتے ہیں کہ وہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہے اس کے لیے نہ زکوٰۃ وصدقہ لینا جائز ہے اور نہ ہی کسی نے اس کو دیا ہو تو اس کی زکوٰۃ ادا ہوگی اس حکم میں اولاد صغار بھی غنی باپ کے تابع ہے غنی شرعی کا یہ حکم عام ہے کسی زمان کے ساتھ مخصوص ومحدود نہیں ہے اگر مالک نصاب ہونے کے باوجود شریعت اس کو غنی نہیں مانتی اور وقت مخصوص ہی میں غنی تسلیم کرتی بالفاظ دیگر وقت سے نفس وجوب ثابت ہوتا جیسا کہ نئے فتاویٰ کا مبنیٰ ہے تو اوقات مخصوصہ میں وہ غنی مستحق زکوٰۃ نہ رہتا اور وقت گذر جانے کے بعد مستحق ہوجاتا۔(دیکھئے ہدایہ وغیرہا من الکتب)

بالفرض اگر یہ بات صحیح ہوتی کہ وقت نفس وجوب کا سبب ہے جیسا کہ اس وقت سمجھا جارہا

ہے تو بندہ پورے یقین کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ ماضی کے فقہاء ضرور ذکر فرماتے۔ اتنی اہم اور بنیادی چیز کو ہرگز ترک نہ فرماتے۔ فانهم اَعْمَقُهُمْ علمًا .

مذکورہ عقلی ونقلی دلائل اصولی وفقہی صریح عبارتوں سے بخوبی واضح ہوگیا کہ وقت وجوب اداء کا سبب ہے نفس وجوب کا نہیں اور سببیت وقت میں انتقال پایا جاتا ہے اس لئے وقت مخصوص میں جب بھی اداء (مثلاً قربانی) ہوگی سبب وجوب کے بعد ہی ہوگی اس سے قبل نہیں ہوسکتی کیونکہ سبب تو وقت کا وہ جزء سابق ہے جو اداء سے متصل ہے۔ پس اس مسئلہ خاص میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی ومتّعنا بعلومہ وفیوضہ کی مفتی عمر فاروق ڈیسائی صاحب (لندن) کے فتویٰ کی تائید ”.....جبکہ زیر بحث مسئلہ میں قربانی قبل سبب الوجوب واقع ہورہی ہے.....“ میں تسامح ہے۔

حاصل یہ کہ اگر کوئی شخص قربانی کا مکلّف ہے اور وہ وہی ہے جو زکوٰۃ وصدقۃ الفطر کا بھی مکلّف ہے اور زکوٰۃ وصدقہ کا نفس وجوب مالک نصاب پر آتا ہے اور قربانی کے وجوب کے لئے مقیم ہونا بھی شرط ہے لہٰذا مسلم آزاد مقیم مالک نصاب شخص کی قربانی چاہے خود ذبح کرے یا دوسرا وکیل اور وکیل چاہے من علیہ الاضحیہ کے مقام میں ہو یا دور علاقہ میں جیسے آج کل افریقہ، برطانیہ، امریکہ، پنامہ، بارباڈوز، آسٹریلیا یا سعودی وغیرہ ملکوں کے مالداروں کی قربانی ہندوستان، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش وغیرہ ملکوں میں یا اس کے برعکس بلکہ ملک میں ایک صوبہ والوں کی قربانی دوسرے صوبہ میں حتیٰ کہ صوبہ میں ایک ضلع والوں کی قربانی دوسرے ضلع میں شہر میں نماز عید کے بعد (کہ نماز عید الاضحیٰ کی ادائیگی شہر میں ذبح کیلئے شرط ہے) اور جہاں شرعاً نماز عید نہیں ہوتی ہے خواہ دیہات ہو یا جنگل صبح صادق کے فوراً بعد بالکل صحیح اور درست ہے۔ کیونکہ وقت کا اعتبار مکان ذبح اضحیہ کے حق میں کیا جاتا ہے۔ (تفصیل کیلئے مقالہ ثانیہ کا مطالعہ کیا جائے)

وانما يعتبر في هذا مكان الشاة لامكان من عليه هكذا ذكر محمدؒ في النوادر وقال انما انظر الى محل الذبح ولا انظر الى موضع المذبوح عنه وهكذا روى الحسن عن ابي يوسف يعتبر المكان الذي يكون فيه الذبح ولا يعتبر المكان الذي يكون فيه المذبوح عنه وانما كان كذلك لان الذبح هو القربة فيعتبر مكان فعلها لامكان المفعول عنه. (بدائع ۷۳/۵)

اور من علیہ الاضحیہ کے حق میں شرائط وجوب کا اعتبار کیا جائے گا۔ وقت وجوب اداء کا من علیہ الاضحیہ کے حق میں (اگر وہ ذابح نہیں ہے) ہونا ضروری نہیں ہے نفس وجوب کافی ہے۔

ہاں قربانی ذبح کرنے والے کے حق میں ایام نحر شرط ہے واول وقتها اى اول وقت تضحية الاضحية (بعد فجر النحر) مجمع الانهر ۱۶۹/۴، لايجوز لاحد ان يضحّى قبل طلوع الفجر الثاني من اليوم الاوّل من ايام النحر. بدائع ۷۳/۵.

پس مفتی اعظم گجرات فقیہ النفس حضرت اقدس مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری نوراللہ مرقدہ کا فتویٰ اس زیر بحث مسئلہ میں فقہ واصول فقہ کی روشنی میں بالکل صحیح ہے قطعاً اس میں کوئی تسامح نہیں ہے۔

اور مفتی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی دامت برکاتہم کا وہ فتویٰ جو ندائے شاہی کے فتویٰ شائع ہونے کے بعد دیا گیا ہے وہ یہ ہے۔ قربانی جہاں کی جاتی ہے اس کا اعتبار ہوتا ہے لہٰذا ہندوستان میں قربانی ہوگی تو اسی ملک کی تاریخ ۱۰/۱۱/۱۲ر ذی الحجہ کا اعتبار ہوگا اور انہی تاریخوں میں قربانی کی جائے گی افریقہ، لندن وغیرہ ملکوں کا اعتبار نہ ہوگا۔ (بلکہ اندرون ملک بھی جہاں جانور ذبح کیا جارہا ہے وہاں کا وقت ابتداء وانتہاء معتبر ہوگا) یہی صحیح ہے اسی کو تسلیم کرنا چاہئے اور یہی تعامل چلا آرہا ہے جو فقہ واصول فقہ کی تصریحات کے مطابق برحق ہے اسی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اسی میں امت کیلئے یسر وسہولت ہے۔ ان اللّٰہ یرید بکم الیسر ولا یرید بکم العسر. (قرآن پاک)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم

وما علینا الا البلاغ

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین

فرقہ واریت کے خاتمہ کیلئے
امیرالمومنین حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ
کے چالیس ارشادات (از نہج البلاغہ)

مرتب: ایم ایم ابوعثمان علی

اللہ وحدہ لاشریک لہٗ سے محبت

ارشادالٰہی ہے:''کچھ لوگ اللہ کے ساتھ (ذات وصفات اور حقوق میں) اوروں کو شریک بتاتے ہیں کہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے ہونی چاہیے۔ اور ایمان والے تو اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں''۔ (بقرہ ع۲۰ پ۲)

حضرت امیرالمومنین علی المرتضیٰؓ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے تھے چند ارشادات ملاحظہ فرماکر عقیدۂ توحید درست کریں۔

(۱) میں خدائے پاک کی حمد کرتا ہوں اس کی نعمت کی تکمیل، اس کی عزت کے سامنے سرتسلیم خم کرنے اور اسکی نافرمانی سے بچنے کیلئے اس کی مدد کا طالب ہوں اس کی کفالت کا محتاج ہوں جسے وہ ہدایت دے وہ گمراہ نہیں ہوسکتا اور جس کا وہ دشمن ہوجائے وہ نجات نہیں پاسکتا جس کا وہ ضامن ہوجائے وہ پریشان نہیں ہوسکتا—— اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں—— ہم ہمیشہ اسی سے تمسک کرتے اور مدد مانگتے ہیں جب تک وہ ہمیں زندہ رکھے، آنے والے خطرات سے وہ بچائے گا کیونکہ یہی ایمان کی محکم بنیاد، پہلا عمل خیر، رضائے الٰہی کا ذریعہ اور شیطان سے دوری کا سبب ہے۔ (نہج البلاغہ، ص:۱۸۱ خطبہ صفین)

یہاں سے پتہ چلا کہ جنگ ومصیبت میں صرف خدا سے مدد مانگنا حضرت علیؓ کا ایمان وعمل تھا ہم مومن تب ہوں گے کہ آپؓ کے تابعدار بن کر صرف خدا کو پکاریں اور غیر خدا سے ''یافلاں

مددکر'' کا شرکیہ نعرہ نہ لگائیں۔

(۲) امیرالمومنینؓ یہ دعا بکثرت فرمایا کرتے تھے: ''تمام حمد اس خدا کی جس نے مجھے مردہ رکھا ہے نہ بیمار، نہ میری رگوں میں جراثیم ہیں نہ برے اعمال کا نتیجہ بھگت رہا ہوں—— میں اس کا بے اختیار بندہ اور اپنے نفس پر ظلم وجور کا خوگر ہوں۔ تیری حجت مجھ پر تمام ہوچکی، میرے لیے اب عذر کی گنجائش نہیں۔ خداوندا مجھے کوئی طاقت نہیں کہ کوئی شے حاصل کروں، ہاں تو جو عطا کرے کسی چیز سے بچنے کی طاقت نہیں، ہاں جس سے تو بچاوے خداوندا تجھ سے پناہ چاہتا ہوں۔ (نہج البلاغہ)

(۳) جو تیرا نافرمان ہو وہ تیری سلطنت کو کم نہیں کرسکتا، جو تیرا فرمانبردار ہو وہ تیری سلطنت کو بڑھا نہیں سکتا۔ ہر راز تیرے لیے آشکار ہے اور ہر عیب تیرے سامنے ہے۔ تو قدیم ازلی ہے تیرا کوئی شریک نہیں تیری کوئی حد نہیں اور تو آخری منزل ہے۔ (نہج البلاغہ، ص:۳۸۴)

(۴) خدا نعمتوں، بخششوں اور روزیوں کو تقسیم کرکے احسان کرنے والا ہے، مخلوق اس کی عیال ہے، اس نے سب کے رزق کی ذمہ داری لی ہے—— نہ اس کا بے انداز ذخیرہ ختم ہوتا ہے نہ اس کے اکرام وانعام کے خزانوں کو دنیا کی مانگیں ختم کرسکتی ہیں۔ (نہج البلاغہ، ص:۳۴۰)

(۵) اپنے لخت جگر محمد بن حنفیہ کو فنون حرب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا: ''یقین رکھو کہ مدد فتح خدا کی طرف سے ہوتی ہے''۔ (نہج البلاغہ، ص:۲۱۰)

(۶) خدا کے بندو! اسی سے فتح وکامیابی اور حاجت روائی چاہو، اسی کی طرف دست سوال بڑھاؤ اسی سے بخشش کی بھیک مانگو۔ تمہارے اور اس کے درمیان کوئی پردہ نہیں—— میرا ایمان ہے وہی اوّل وآخر ہے، میں اسی سے مدد چاہتا ہوں، اسی پر توکل کرتا ہوں، وہی مجھے کافی اور مددگار ہے، وہی قادر وتوانا ہے۔ (نہج البلاغہ)

(۷) حضرت علیؓ توحید کی شہادت اور رب کی صفات یوں بیان فرماتے ہیں: ''اللہ کے سوا کوئی خالق رازق، معبود، نفع ونقصان دینے والا، کم وبیش کرنے والا، دینے اور روکنے والا، مصائب ٹالنے والا، بھلا پہنچانے والا، کام آنے والا، شفا دینے والا، آگے کرنے والا اور پیچھے کرنے والا کوئی نہیں۔ مخلوق کا پیدا کرنا، اسے سنبھالنا اسی کا خاصہ ہے۔ اس کے ہاتھ میں سب بھلائیاں ہیں، تمام جہانوں کا پالنے والا وہ رب بہت بابرکت ہے۔ (عمادالاسلام، ج:۱، ص:۱۸۱)

(۸) تفسیر صافی صفحہ ۲۰ پر حضرت امیرالمومنینؓ نے رب کی یہی صفات بیان فرمائی ہیں۔

(از اصول الشریعہ، ص:۱۶۳)

انبیاء علیہم السلام کی قرآنی تاریخ شاہد ہے کہ جن ہستیوں نے خدا کی یہ مخصوص صفات بتائیں ان کے جاہل عقیدت مندوں نے یہی خدائی صفات عطائی طور پر خود ان میں مان لیں پھر ان کے نام پر نذر و نیاز حاجت برآوری کے لیے دعا و پکار شروع کردی قوم نوحؑ نے حضرت ادریسؑ کے پانچ نیک صاحبزادوں ـــــ ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسرؒ ـــــ کے بت بنا کر پوجے حضرت ابراہیمؑ نے پھر ان کے یہ بت توڑے تو آپ کی جاہل اولاد قریش نے خود حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام اور لات منات ہبل کے بت بنا کر پوجے جن کو حضور ﷺ نے فتح مکہ کے وقت توڑا تھا حضرت علیؓ جیسی باکمال ہستی اس ظلم و غلو سے بچ نہ سکی ان کو بھی جاہل یہود مجوس نے غالی عقیدت و محبت سے رب، ہر چیز کا خالق، مالک، کارساز اور حاجت روا بنا ڈالا اور مدد کا نعرہ لگایا جن کے ۷۰ افراد کو آپؓ نے مرتد قرار دے کر زندہ جلا دیا۔ (رجال کشی مشکوٰۃ) مولانا فاضل مجتہد محمد حسین لکھتے ہیں: ”متعدد اخبار و آثار میں مذکور ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے اپنی ظاہری دور خلافت میں اپنے متعلق غلو کرنے والوں کو زندہ نذر آتش کر دیا تھا (ہفتم بحار صفحہ ۳۴۹ اصول شرعیہ صفحہ ۲۷ وغیرہ) اگر حضرت علیؓ کا یہ قانون نافذ ہو تو ذرائع ابلاغ سے شرک کے اڈے خاکستر ہو جائیں۔ خدا کی ذات کے ساتھ حضرت علیؓ کی محبت کا یہ خاص معیار ہے کہ اپنے غالی حبداروں کو جلا دیا جبکہ حضرت عیسیٰؑ روح اللہ جیسی ہستی قیامت کے دن کہے گی ”اگر تو ان کو سزا دے تو تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو تُو بڑا زبردست حکمت والا ہے اللہ فرمائے گا (غالی مشرک کو نہ بخشوں گا) اس دن سچے موحدوں کو ان کا سچ نفع دے گا جن کے لیے ہمیشہ نہروں والے باغات ہیں اللہ ان سے خوش وہ اللہ سے خوش یہی تو بڑی کامیابی ہے۔ (پارہ نمبر ۷ رکوع نمبر ۶)

خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت

ارشاد الٰہی ہے بے شک اللہ نے مومنین پر بڑا احسان فرمایا کہ ایک عظیم پیغمبر ان کی قوم سے ان پر مقرر فرما دیا جو ان کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو (ہر قسم کے عیوب سے) پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و سنت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی جہالت میں تھے۔ (پ۴ ع۸)

ہمارا ایمان ہے کہ حضرت امیر المومنینؓ پہلے دن ہی خدا اور رسول ﷺ کے احسان مند ہوئے اور ان چار کمالات میں آپ ﷺ کی شاگردی کا فخر پایا فرماتے ہیں:

(۹) خداوند عالم نے محمد ﷺ کو اس وقت رسول بنا کر بھیجا جب کوئی شخص نہ تو کتاب پڑھتا

تھا نہ نبوت کا دعویدار تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رہنمائی فرمائی یہاں تک کہ انہیں اصلی مقام تک پہنچا دیا اور نجات کی منزل پر ٹھہرا دیا آخر ان کے نیزے سیدھے ہو گئے ان کے پتھر دل رام ہو گئے بخدا جہالت و گمراہی کو بھگانے والوں میں، میں بھی تھا پتہ چلا کہ حضور ﷺ اپنے مشن تعلیم و تزکیہ اور ہدایت میں کامیاب ہو کر گئے اور حضرت علیؓ سمیت آپ کے ہزاروں شاگرد کامل، ناجی اور جنتی ہوئے۔

(۱۰) اور حضور ﷺ نے تم میں وہی کچھ چھوڑا جو اور انبیاء اپنی اپنی امتوں میں چھوڑ کر گئے تھے۔ پیغمبرؑ نے پروردگار کی کتاب تم میں یادگار اور خلیفہ چھوڑی ہے۔ (نہج البلاغہ ص: ۱۷۷-۱۷۶) معلوم ہوا کہ جیسے تورات کو خدا نے امام کہا (پارہ نمبر ۱۲، ۲۶ رکوع ۲) اسی طرح قرآن بھی اربوں مسلمانوں کا امام اور پیغمبر ﷺ کا جانشین و خلیفہ ہے۔

(۱۱) خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کو ضیاء بخش نور، روشن دلیل، کھلی ہوئی راہ شریعت اور ہدایت کرنے والی کتاب کے ساتھ مبعوث فرمایا ان کا قبیلہ بہترین شجرہ بہترین جس کی شاخیں سیدھی اور پھل جھکے ہوئے ہیں جائے ولادت مکہ معظّمہ اور جائے ہجرت مدینہ منورہ ہے وہاں سے آپ ﷺ کے نام کی شہرت ہوئی اور آوازہ ہر طرف پھیل گیا اور خدا نے آپ کو مکمل دلیل شفاء دینے والی نصیحت اور جہالتوں کو دور کرنے والا پیغام دے کر بھیجا دین کی نامعلوم راہوں کو ظاہر کر دیا اور جو بدعتیں داخل تھیں ان کا قلع قمع کر دیا۔ (نہج البلاغہ ص: ۴۸۸) (بدعت (خدا رسول کی نہیں) اپنی بناوٹی، پسندیدہ بات اور رسوم و اعمال کو کہتے ہیں جو شرک کے بعد بڑا گناہ ہے ہر فرقہ اس سے پہچانا جاتا ہے)

(۱۲) یہ کتاب اللہ (قرآن تمہارے درمیان خاموش نہیں) بولنے والا ہے اس کی زبان نہیں تھکتی اس کے ستون نہیں گرتے اور اس کے مددگار کبھی شکست نہیں کھاتے۔ (نہج البلاغہ ص: ۴۳۳)

(۱۳) میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا وحدہ لاشریک ہے اور حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور برگزیدہ رسول ہیں نہ ان کے فضل و کمال کی کوئی برابری کر سکتا ہے اور نہ ان کی رحلت کے بعد تلافی ممکن ہے تاریک گمراہیوں، بے حد جہالتوں اور سخت مزاجی کے بعد آنحضرت ﷺ کے نور ہدایت سے شہر کے شہر جگمگا اٹھے۔ (نہج البلاغہ ص: ۴۵۵)

(۱۴) آپ نے اپنے فرمانبردار صحابہ کرامؓ کو ساتھ لے کر اپنے مخالفوں سے جنگ کی آپ لوگوں کو کھینچ کر نجات کی طرف لا رہے تھے قبل اس کے کہ ان پر موت آ پڑے ان کو ہدایت کی طرف بڑھا رہے تھے یہاں تک کہ تھکے ماندوں کو بھی نجات کی سرحد پر پہنچا دیتے تھے سوائے اس منکر کافر

کے جس میں کوئی نیکی نہ ہو آپ ﷺ نے ان کو نجات کی منزل دکھادی اور اس مرتبہ تک پہنچا دیا کہ ان کی چکی گھومنے لگی اور نیزوں کی کجی دور ہوگئی (کہ انھوں نے فتوحات کرتے کرتے قیصر و کسریٰ کو بھی دارالاسلام بنادیا تھا) (نہج البلاغہ ص:۳۷۵)

(۱۵) خدا نے آپ ﷺ کے ذریعے پرانے کینے دبا دیئے آتش انتقام بجھا دی بھائیوں کو آپس میں ملا دیا اور مشرکین کے ہم سروں کو منتشر کر دیا، حق کی پستی کو عزت بخشی اور کفر کی عزت کو ذلت سے بدل دیا ان (جماعت رسول) کا کلام، امر خدا کا پیغام اور خاموشی بولتی زبان تھی غور فرمایئے حضرت علیؓ حضور ﷺ کی بار بار تعریف تلامذہ نبوت کی کامیابی اور ان کے ہدایت یافتہ ناجی ہونے کی شکل میں کر رہے ہیں دھوپ دن کی نشانی اور آفتاب کے چمکنے کی دلیل ہے چند صحابہ کرامؓ کے سوا سب سے بغض آفتاب نبوت سے دشمنی ہے۔

(۱۶) کلمہ طیبہ ہی کلمہ اسلام ہے

ہم سب گواہی دیتے ہیں کہ اللہ ایک اور یکتا ہے اور اسکا کوئی شریک نہیں اور یہ بھی کہ حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور پیغمبر ہیں یہ دو شہادتیں ایمان کی بات کو اٹھاتی اور عمل کو بلند کرتی ہیں جس ترازو میں یہ رکھی جائیں وہ ہلکا نہیں ہوتا جس سے اٹھالی جائیں اسکا وزن نہیں ہوتا (نہج البلاغہ صفحہ نمبر ۴۰۰) معلوم ہوا کہ توحید و رسالت کا کلمہ ہی اصلی قرآنی اور ایمانی نجات دہندہ اور پورا کلمہ اسلام ہے۔

(۱۷) کتاب وسنت کی اتباع اور اہمیت

خداوند عالم نے ایسی ہادی کتاب نازل فرمائی جس میں ہر برائی اور اچھائی کو واضح کیا گیا پس تم بھلائی کی راہ اختیار کرو ہدایت پاؤ گے برائی سے منہ پھیر لو تا کہ سیدھی راہ پر چل سکو (نہج البلاغہ ص:۱۶۶)

(۱۸) اگر تم ثابت قدم رہے تو تمہارا حق ہے کہ تمہارے تصفیہ کے لئے ہم کتاب خدا اور سیرت رسول پر عمل پیرا ہوں ان کے حق کو قائم اور طریقے کو بلند رکھیں (نہج البلاغہ ۵۰۹)

(۱۹) تمہارے لئے رسول ﷺ کی تابعداری کافی ہے دنیا کے نقص وعیب اور اس کی رسوائیوں، برائیوں سے بچنے کے لیے آپ کی ذات تمہاری رہنما ہے پس تم اپنے طیب وطاہر نبی ﷺ کے نقش قدم پر چلو کیونکہ آپ نے دنیا کا بقدر ضرورت ذائقہ چکھا کبھی اسے نظر بھر کر نہیں دیکھا آپ دنیا سے بھوکے نکلے اور بسلامت آخرت میں پہنچ گئے۔ (مختصراً نہج البلاغہ صفحہ ۴۸۷)

(۲۰) بدعت کی مذمت

کوئی بدعت عمل میں نہیں آتی مگر سنت چھوٹ جاتی ہے۔ لہٰذا بدعت سے بچو اور روشن طریقہ سنت پر جمے رہو سب سے افضل وہ کام ہیں، جو شریعت سے ثابت ہیں اور سب سے برے وہ کام ہیں جو دین میں نئی ایجاد اور بدعت ہوں۔ (نہج البلاغہ صفحہ ۴۴۹)

(۲۱) پس تم فتنوں کی راہ دکھانے والے اور بدعتوں کے نشان نہ بنو۔ جماعت مومنین (تلامذہ نبوت) کی گرہ اصول اور اطاعت کے پابند رہو۔ (ایضاً)

(۲۲) اب قرآن وسنت کی آواز سے بہرہ ہی قاصر رہے گا۔ اور اندھا ہی محروم رہے گا۔ جسے اللہ کی آزمائشوں سے فائدہ نہ ہو وہ کسی اور کے وعظ سے فائدہ نہیں پا سکتا کیونکہ آدمی دو قسم کے ہیں ایک شریعت وسنت کے پابند اور دوسرے بدعتی جن کے پاس نہ سنت کی سند ہے نہ (آسمانی) دلیل اور برہان کی روشنی ہے۔ (نہج البلاغہ:۵۲۶)

(۲۳) اپنی جماعت سے خارج ہونے والے بدبخت ابن ملجم کے حملہ کے بعد وصیت فرمائی ”کہ سارے عالم میں کسی کو خدا کا شریک نہ کرو اور حضرت محمد ﷺ کے طریقہ کو ضائع نہ کرو، پس ان دونوں ستونوں - توحید وسنت —— کو ہمیشہ قائم رکھو ان دونوں چراغوں کو جلائے رکھو، جب تک متحد رہو گے۔ تم میں برائی نہ آئیگی —— کل تک تمہارا ساتھی تھا آج تمہارے لئے عبرت بنا ہوں اور کل میں تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ خداوند عالم تمہیں اور مجھے بخش دے (نہج البلاغہ:۴۵۵) انا للہ وانا الیہ راجعون پھر اپنی اولاد کو صبر کی وصیت کی جیسے حضور ﷺ نے فاطمہؓ کو کی تھی۔

(حضرت فاطمہؓ سے حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ جب میں فوت ہو جاؤں تو میرے غم میں چہرہ نہ نوچنا، نہ پیٹنا، بال نہ بکھیرنا، بین نہ کرنا، ماتمی مجلس قائم نہ کرنا) (فروع کافی ج:۳، ص:۵۲۷)

(۲۴) حضور ﷺ کو غسل دیتے وقت فرما رہے تھے اگر یہ بات نہ ہوتی کہ آپ نے صبر کا حکم دیا اور رونے پیٹنے سے منع فرمایا ہے تو ہم یقیناً اپنے سر کا پانی آپ کی وفات کی مصیبت پر رو رو کر خشک کر دیتے اور اپنا کوئی علاج نہ کراتے۔ (نہج البلاغہ، جلاء العیون صفحہ ۶۷)

تمام نیک مسلمانوں سے حضرت علیؓ کی محبت

ارشاد الٰہی ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں آپ ﷺ کے ساتھی کافروں پر سخت باہم مہربان ہیں تم

ان کو رکوع وسجود میں دیکھتے ہو وہ خدا کا فضل اور اس کی رضا چاہتے ہیں (وہ حضور ﷺ کو پسند ہیں) جیسے لہلہاتی تیار فصل کسان کو پسند آتی ہے صحابہ کرامؓ (کی ترقی اور کثرت) سے کافر جلتے ہیں اللہ نے ان ایمان واعمال صالحہ والوں سے بخشش اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔ (سورہ الفتح آخری آیت پارہ ۲۶)

آگے سورہ حجرات رکوع نمبر ایک میں ہے ''اگر ایمان والوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو۔ مومن تو بھائی بھائی ہیں ان میں صلح کرادو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم ہو' حضرت امیر المومنینؓ ان آیات کا مصداق تھے ہر مسلمان سے صلح ومحبت کرتے تھے۔

(نوٹ: (الف) قرآن وحدیث میں اہل بیت رسول ﷺ آپ کے گھر میں رہنے والی بیویوں، بیٹیوں، دامادوں اور نواسوں اور آل رسول، (ب) ان کے علاوہ آپ ﷺ کے دین کے پیروکار نیک مسلمانوں کو کہتے ہیں جیسے قرآن نے فرعون کے ساتھ ڈوبنے والے ہم مذہبوں کو آل فرعون کہا ہے۔ (پ:۱ع:۶) اسی طرح آپ ﷺ کے خونی رشتہ دار (ج) جو مسلمان ہوئے ہیں آل علی، آل جعفر، آل عقیل عباس اور آل حارث بن عبدالمطلب، جن پر صدقات واجبہ حرام ہیں، سب اہل بیتؓ واجب الاحترام اور مسلمانوں کے محبوب ہیں)۔

(۲۵) ہم اہل بیت کے پاس حکمت کے دروازے اور امر خدا کی روشنی ہے جس نے ان کو اختیار کیا تو کامیابی سے حق تک پہنچ گیا۔ جو ان کو چھوڑ کر رُک گیا گمراہ اور پریشان ہوا اس دن کے لئے عمل کرلو جس کے لئے نیک کاموں کے ذخیرے جمع کیے جاتے ہیں اور راز فاش کیے جائیں گے، اس آگ سے بچو جس کی حرارت سخت ہے اور گہرائی بہت ہے۔ جس کا زیور لوہا اور کھانے پینے کے لئے خون آلود پیپ ہے (نہج البلاغہ صفحہ ۴۱۱)

(۲۶) صفین میں حضرت حسنینؓ کے متعلق فرمایا کہ ان دونوں کو جنگ سے روک دو۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں رسول اللہ ﷺ کی نسل ختم نہ ہوجائے۔ (نہج البلاغہ صفحہ ۵۸۳)

(۲۷) اپنے ہم زلف ذوالنورینؓ امام حسنؓ کے خسر محترم حضرت عثمان غنیؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''وہ سب کچھ آپ جانتے ہیں جو ہم جانتے ہیں جیسے اسلام ہم نے سمجھا آپ نے بھی سمجھا جیسے ہم نے سنا آپ نے بھی سنا حضور ﷺ کی صحبت ورفاقت ہم نے پائی آپ نے بھی پائی ابوقحافہ کے بیٹے (ابوبکر صدیقؓ) اور خطاب کے بیٹے (عمر فاروقؓ) حق پر عمل کرنے میں آپ سے اولیٰ اور آگے نہ تھے حضور ﷺ سے خاندانی قرب اور خونی رشتہ داری میں ابوبکرؓ اور عمرؓ سے زیادہ نزدیکی ہیں (کہ عثمانؓ آپ ﷺ کی پھوپھی ام حکیم بیضاء، بنت عبدالمطلب (اروی کی والدہ) کے

نواسے تھے آپ نے رسول ﷺ کی دامادی کا وہ شرف پایا ہے جو وہ نہ پاسکے تو اپنی ذات میں اللہ کا تقویٰ اختیار کیجئے۔ (نہج البلاغہ ۶۸ قسم دوئم)

(۲۸) حضرت عثمانؓ سے پہلے ایک خلیفہ (حضرت عمرؓ) کے متعلق فرمایا خداوند افلاں شخص کو کارگزاریوں کی جزا مرحمت فرما اس نے کجی کو سیدھا کیا، مرض کا علاج کیا، فتنہ فساد کو پیچھے چھوڑ دیا، سنت کو قائم کیا پاک دامن اور کم عیب دنیا سے رخصت ہوگیا دنیا میں اچھائیوں کو پالیا اور شر سے آگے نکل گیا، خدا کی اطاعت کا حق ادا کیا اور کما حقہ خدا سے ڈرتا رہا، خود چلا گیا اور لوگوں کو ایسے پراگندہ چھوڑ گیا جس میں گمراہ راستہ نہیں پاسکتا اور ہدایت پانے والا یقین حاصل نہیں کرسکتا۔ (نہج البلاغہ صفحہ ۶۴۹ خطبہ ۲۲۶)

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں — بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لیے

(۲۹) حضور ﷺ کے بعد مسلمانوں کے حاکم (ابوبکرؓ وعمرؓ) ایسے بنے کہ خود بھی شریعت پر ثابت قدم رہے اور لوگوں کو بھی شریعت پر ثابت قدم رکھا یہاں اسلام نے اپنا سینہ زمین پر ٹیک دیا (یعنی وہ خوب مستحکم اور مضبوط ہوگیا) (نہج البلاغہ)

(۳۰) **اتحاد المسلمین:** کے جذبہ سے جنگ جمل میں اعلان صلح کرتے ہوئے فرمایا جاہلیت اور اس کے اعمال کی بدبختی کے ذکر کے بعد فرمایا اسلام اور مسلمانوں کی نیک بختی باہمی محبت اور ایک جماعت ہونے میں ہے اور بیشک اللہ نے اپنے نبی کے بعد مسلمانوں کو ابوبکر صدیقؓ پھر عمر فاروقؓ اور پھر عثمانؓ کی خلافتوں پر متفق رکھا پھر یہ (شہادت عثمانؓ کا) حادثہ ان لوگوں نے برپا کیا جو دنیا کے طالب ہیں اور اس فضیلت پر حسد کرتے ہیں جس کا اللہ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا ہے یہ اسلام کے اعمال اور مسلمانوں کو پس پشت پھینکنا چاہتے ہیں اور اللہ اپنا کام پورا کرنے والا ہے پھر فرمایا کہ میں صبح (مدینہ کو) کوچ کررہا ہوں اور تم بھی میرے ساتھ لوٹو وہ لوگ ہرگز میرے ساتھ نہ چلیں جنھوں نے کچھ بھی حضرت عثمانؓ کے قتل میں معاونت کی یہ گھٹیا لوگ ہیں اپنے آپ پر پھٹکار کریں۔ (تاریخ طبری ابن خلدون وغیرہ)

مگر ہائے مسلمانوں کی بدقسمتی! کہ انہی قاتلوں نے اس صلح میں اپنی موت دیکھ کر رات کو غداری سے جنگ بھڑکا دی پھر شام کے مقام صفین پر جاکر ۷۰ ہزار شہید کیے کرائے پھر خارجی بن کر شیر خدا سے ٹکرائے اور آپؓ کو شہید کردیا اور پھر حضرت امام حسنؓ کو ناک کٹوانے والا، منہ کالا کرنے والا، ذلیل کرنے والا، کہہ کر ران سے کاٹا وہ بچ گیا تو دور یزید میں امام حسینؓ کو بلایا پھر

حسب سابق غداری کی اور تین شرطیں مسترد کردیں آپ کو شہید کرکے دیرینہ ارمان پورا کردیا اور اہل بیتؓ کی بددعاؤں کو اپنے گلے کا رنگین ہار بنالیا۔ (لعنت اللہ علیہم اجمعین)

(۳۱) آپ اپنے فوجیوں سے حضرت طلحہؓ وزبیرؓ کی شہادت پر بہت دکھی تھے ان پر پھٹکار کی جہنمی بتایا اور یہ آیت پڑھتے تھے ''ہم ان صحابہؓ کو باہمی، رنجشوں سے پاک کرکے جنت میں آمنے سامنے بھائیوں کی طرح باعزت بٹھائیں گے''۔ (پارہ:۱۴ع:۴) اور حضرت طلحہؓ کا شل ہاتھ چوم کر روتے اور فرماتے اس ہاتھ نے احد میں رسول اللہ ﷺ کو شہید ہونے سے بچایا تھا۔ (تاریخ طبری ابن عساکر)

(۳۲) شان صحابہؓ

میں نے محمد ﷺ کے صحابہ کو دیکھا میں تم سے کسی کو ان جیسا نہیں پاتا وہ صبح کو جہاد کی دھول میں اٹے ہوتے راتیں سجدوں اور قیام کی حالت میں گزارتے وہ اپنی آخرت یاد کرتے تو معلوم ہوتا کہ انگاروں پر کھڑے ہیں۔ (نہج البلاغہ جلد ا، صفحہ ۱۷)

(۳۳) وہ لوگ کہاں ہیں جنہیں اسلام کی دعوت دی گئی تو فوراً قبول کیا قرآن پڑھا تو اسے خوب اپنایا جب انہیں قتال کی دعوت دی گئی تو تلواریں سونت کر ایسے میدان میں آگئے جیسے شیر دار اونٹنی دودھ پلانے آتی ہے اور وہ جتھہ جتھہ ہوکر زمین میں پھیل گئے اور جنگ کے لئے قطار در قطار ہوگئے اور کچھ شہید ہوئے اور کچھ غازی بن کر واپس آئے۔ (نہج البلاغہ)

(۳۴) میں بھی مہاجرین کا ایک فرد ہوں جہاں وہ گئے میں بھی گیا جہاں سے وہ پلٹے میں بھی پلٹا (یعنی پہلے تین خلفاء کی بیعت وحمایت پر ہم سب مہاجرین متفق رہے) اور اللہ نے ان کو گمراہی پر جمع نہیں کیا تھا۔ (نہج البلاغہ)

(۳۵) لوگو! سواداعظم (مسلمانوں کی بڑی اکثریت) کا ضرور اتباع کرو کیونکہ اللہ کا دست نصرت جماعت پر ہے تنہا پسندی اور علیحدگی سے بچو کیونکہ جماعت سے الگ رہنے والا الگ بکری کی طرح شیطان بھیڑیے کا شکار بنے گا۔ (نہج البلاغہ صفحہ ۱۹۵)

(۳۶) **خلافت**: بیشک میری بیعت بھی اسی قوم مہاجرین وانصار نے کی ہے انہی شرائط پر جن پر انھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ کی بیعت خلافت کی تھی اب موجود کو اختیار نہیں کہ وہ کسی اور کو خلیفہ چنے۔ نہ غیر کو بیعت رد کرنے کا حق ہے۔ یہ خلیفہ چننے والی مجلس شوریٰ تو مہاجرین وانصار کی ہے وہ اگر کسی پر اتفاق کرکے امام نامزد کردیں تو

وہی اللہ کا پسندیدہ (بنایا ہوا) امام ہوتا ہے۔ (نہج البلاغہ جلد ۳ صفحہ ۸ و تاریخ ندوی جلد ا صفحہ ۲۶۳)

(۳۷) جب آپ کے ساتھیوں نے شامیوں کو برا کہا تو فرمایا کہ میں پسند نہیں کرتا کہ تم گالیاں دینے والے بنو۔ لیکن تم ان کے اعمال واوصاف کا تذکرہ کرو تو اچھی بات ہے برا کہنے کی بجائے یہ دعا مانگو ''اے اللہ! ہمارے اور ان کے خونوں کی حفاظت اور ہمیں باہم صلح عطا فرما اور ان کو ہدایت دے'' (خطبہ صفحہ ۲۰۴)

چنانچہ ۳۸ ہجری میں پنچایت کے فیصلہ سے دونوں کی خودمختاری ماننے کے بعد صلح ہوگئی تکمیل امام حسنؓ نے اپنے دور خلافت میں کردی۔ (تاریخ)

(چنانچہ امام حسنؓ نے بیعت کے بعد امیر معاویہؓ کے بھرے دربار میں اپنے بنو ہاشم اور اہل بیتؓ کو سناتے ہوئے فرمایا: ''یقیناً مسلمانوں کا دین کی بہت سی باتوں پر اتفاق ہے اور ان میں کوئی جھگڑا، اختلاف اور فرقہ بندی نہیں ہے۔ ان متفق علیہ چیزوں میں سے کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کا اقرار اور آپ کو خدا کا بندہ ماننا ہے۔ پانچ وقت کی نمازیں، زکوٰۃ، رمضان کے روزے اور حج بیت اللہ (اسلام کے ارکان خمسہ) ہیں۔ خدا کی تابعداری میں ان کے علاوہ اور بھی متفق علیہ چیزیں ہیں جن کا شمار اللہ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ نیز مسلمان زنا، چوری، جھوٹ، خیانت اور بہت سے گناہوں کے حرام ہونے پر متفق ہیں۔ جن کو خدا ہی گن سکتا ہے۔ مسلمانوں کا اختلاف اگر ہے تو چند سنتوں کی بابت ہے، جن میں وہ باہم لڑائی کرکے فرقے بن گئے ہیں۔ کہ ایک دوسرے کو برا کہتے ہیں۔ اور یہ اختلافی مسئلہ ''ولایت اور حکومت کرنے کا ہے'' جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے تبرا کرتے ہیں۔ اور قتل کرتے ہیں۔ ہر ایک کہتا ہے کہ ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں صرف ایک فرقہ اس اختلاف سے بچا ہے جو کتاب اللہ اور سنت نبوی کا پیروکار رہے۔ پس جو شخص ان باتوں کو اپنائے، جن میں تمام اہل قبلہ کا اتفاق ہے کسی کا اختلاف نہیں اور جن باتوں میں اہل قبلہ کا اختلاف ہے ان کا علم اللہ کے حوالے کردے۔ (کسی پر کافر منافق اور غیر مومن ہونے کا فتویٰ نہ لگائے کیونکہ صرف خود کو مومن جاننا دوسرے کو کافر کہنا ہے خدا فرماتا ہے: ''ھو الذی خلقکم فمنکم کافر و منکم مومن'' (پارہ ۲۸، رکوع ۱۵) وہ دوزخ سے بچ جائیگا۔ اور جنتی ہوگا) (احتجاج طبری صفحہ ۱۴۷ طبع لکھنؤ جلد نمبر ۲ صفحہ ۶ طبع ایران)

ہمیں یقین ہے کہ اگر خاص مومن اپنے امام دوم کا یہ عقیدہ وعمل اپنالیں انتظامیہ قانون بنائے ذرائع ابلاغ ان کی اشاعت کریں تو سب فرقے ختم ہوکر مسلمان ایک قوم بن جائیں (آمین) منہ

(۳۸) جمل میں آپؓ نے فرمایا کہ عائشہؓ دنیا اور جنت میں تمہارے نبیؐ کی بیوی ہیں دوشخصوں نے اماں کہہ کر تنقید کی تو آپؓ نے ان کو سوسو درے لگائے اب بھی ایسی سزا فرقہ پرستی کو مٹادے گی نیز امیر معاویہؓ اور سب شامیوں کو ایمانیات میں اپنے جیسا کامل بتاکر قتل عثمانؓ کے الزام سے خود کو بری فرمایا۔ (نہج البلاغہ)

نیز ایک دفعہ یہ بھی فرمایا لوگو! امیر معاویہؓ کی امارت کو برا نہ جاننا خدا کی قسم اگر وہ بھی نہ رہی تو تمبے کی طرح سر کٹتے دیکھو گے (تاریخ)

(۳۹) جب طلحہؓ وزبیرؓ نے آپؓ کو فوج میں شامل قاتلین عثمانؓ سے بدلہ لینے کا مطالبہ کیا تو فرمایا: ''بھائیو! جو تم جانتے ہو میں بے خبر نہیں لیکن میرے پاس بدلہ لینے کی طاقت کہاں ہے جبکہ بلوائی انتہائی زورآور ہیں اور وہ اس وقت ہمارے مالک بنے ہوئے ہیں ہماری ملکیت اور تسلط میں نہیں ہیں''۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۶)

(۴۰) دو فرقے میرے بارے میں (غلط عقائد واعمال کی وجہ سے) برباد اور جہنمی ہوں گے۔

(الف) محبت میں حد سے بڑھنے والا (کہ ناحق مجھ میں خدا اور رسولؐ کی صفات مانے گا)

(ب) دشمنی میں حد سے بڑھنے والا اور مجھ پر جھوٹ وافتراء باندھنے والا (کہ قرآن وسنت کے مقابل نیا مذہب بنالے گا) میرے متعلق بہترین عقیدہ وعمل والے وہ اکثریتی مسلمان ہیں جو درمیانی راہ چلتے ہیں (مجھے برگزیدہ صحابی خلیفہ شاگرد رسول ﷺ مانتے ہیں تم ان کی راہ پر چلو) (نہج البلاغہ)

خلاصہ کلام

یہ سچا فرمان رسول ہے (حضرت علیؓ سے سچی محبت واتباع مومن ہی رکھے گا اور دشمنی غداری مخالفت منافق ہی کرے گا۔ (مسلم)

متفقہ تاریخ شاہد ہے کہ آپؓ کو اور آپؓ کی اولاد کو دوست نما غداروں اور دشمن منافقوں نے شہید کیا ہے ان کے شر عمل اور عقیدہ سے خدا ہر مسلمان اور افسر کو بچائے۔

(اللهم صل على محمد وآل محمد)

دوسری قسط

ای کوڈ (E. Code) کی شرعی حیثیت

ناپاک چیزوں کی ملاوٹ کا شرعی حکم

از: مولانا اسلم اللہ خاں
مدرس الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

فقیہ العصر مولانا تقی عثمانی کی توضیح

الکوہل سے بنی ہوئی دواؤں کے بارے میں فرماتے ہیں: وحيث عمت البلوى في هذه الأدوية فينبغي أن يوخذ في هذا الباب كمذهب الحنفية أو الشافعي والله اعلم. ثم هناك جهة أخرى ينبغي أن يسأل عنها خبراء الكيميائي وهو أن هذه الكحول بعد تركيبها بأدوية أخرى هل تبقى على حقيقتها؟ أو تستحيل حقيقتها وماهيتها بعمليات كيمياوية فان كانت ماهيتها تستحيل بهذه العمليات بحيث لا تبقى الكحل وإنما تصير شيئاً آخر فيظهر أن عند ذلك يجوز تناوله باتفاق الأئمة لأن الخمر إذا صارت خلاً جاز تناولها في قولهم جميعاً لاستحالة الحقيقة.

(جب الکحل سے بنی ہوئی دواؤں کا استعمال عام ہوگیا اور اس قسم کی دوائیں تمام لوگوں کی ضرورت میں داخل ہوگئیں تو عموم بلوی والی فقہاء کی اصطلاح کے اعتبار سے بھی جائز ہوگا، پھر ایک اور رخ سے بھی مسئلہ پر بحث ہوسکتی ہے، جس سے کیمیا، کیمسٹری کے ماہروں سے دریافت کیا جاسکتا ہے، وہ یہ کہ الکحل کو دوسری دواؤں سے ملانے کے بعد کیا وہ الکحل اپنی اصل شکل میں رہ جاتا ہے یا اس کی شکل اور حقیقت مختلف کیمیائی مراحل اور ادوار سے گذارنے کے بعد وہ شکل و حقیقت اس طرح بدل جاتی ہے کہ الکحل کچھ بھی نہ رہے، پس صرف دوسری چیز وہ دوائیاں (الکحل

جس سے بدل گئی ہیں) رہ گئی ہیں اور ظاہر ہے کہ الکحل جب اپنی حقیقت کھودیا اور صرف دوائیاں رہ گئیں تو تمام ائمہ کے نزدیک اس کا استعمال جائز ہے، جیسا کہ شراب جب سرکہ بن جائے تو تبدیلئ ماہیت کی وجہ سے بالاتفاق جائز ہے، پھر آگے خنزیر کے اجزاء سے بنے جلاٹین سے بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: إن كان العنصر المستخلص من الخنزير تستحيل ماهيته بعملية كيمياوية بحيث تنقلب حقيقته تماماً. زالت حرمته ونجاسته وإن لم تنقلب حقيقته بقي على حرمته ونجاسته لأن انقلاب الحقيقة موثر في زوال الطهارة والحرمة عند الحنفية.

اگر خنزیر کے اجزاء سے بنا ہوا عنصر کیمیاوی تجزیہ سے اپنی پوری حقیقت بدل دے اور دوسری شکل اختیار کرلے تو اس کی حرمت اور نجاست کا حکم بھی ختم ہوجائے گا اور اس کی اصلی شکل اور حقیقت باقی رہ جائے تو نجاست وحرمت کا حکم بھی باقی رہ جائیگا، اسلئے کہ طہارت وحرمت کے حکم کے بدل جانے میں حقیقت کا بدل جانا ہی اثر انداز ہوتا ہے۔ (بحوث في قضايا فقهية معاصرة:۳۴۱)

الموسوعۃ الفقہیۃ کی صراحت

عصر حاضر کی مشہور اور معتبر فقہی انسائیکلوپیڈیا الموسوعۃ الفقہیۃ میں استحالہ کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے:

الاستحالة – تغير الشيء عن طبعه ووصفه (استحالہ ایک چیز کے اپنی طبیعت اور صفت بدل دینے کا نام ہے) اس کے بعد استحالہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے: فالإستحالة قد تكون بمعنى التحول كاستحالة الأعيان النجسة من العذرة والخمر والخنزير وتحولها عن أعيانها وتغير أوصافها وذلك با الإحتراق أو بالتخليل أو بالوقوع في شيء.

ترجمہ: (استحالہ کبھی کسی چیز کے اپنی حالت بدل دینے سے ہوتا ہے، جیسے گوبر شراب اور سور جیسی ناپاک چیزوں کا اپنی ذات سے پھر جانا اوران کی صفات کا بدل جانا، اور یہ تبدیلی کبھی چیز کے جلا دینے سے یا شراب کو سرکہ بنانے سے یا کسی چیز میں ڈال دینے سے ہوتی ہے، پھر استحالہ کا حکم اس طرح بیان کیا گیا ہے: تحول العين وأثره في الطهارة والحل (ایک چیز کے بدل جانے کا اثر اور حکم پاک اور حلال ہونے میں) ذهب الحنفية والمالكية وهو رواية عن أحمد إلى أن نجس العين يطهر بالإستحالة فرماد النجس لايكون نجساً – ولا يعتبر نجسا ملح كان

حماراً أو خنزيرا أو غيرهما .... ولأن الشرع رتب وصف النجاسة على تلك الحقيقة فينتفي بانتفائها فإذا صار العظم واللحم ملحاً أخذ حكم الملح لأن الملح غير العظم واللحم ونظائر ذلك في الشرع كثيرة. (الموسوعة الفقهية: ۱۰/۲۷۸)

ترجمہ: (حنفیہ مالکیہ اور (باعتبار ایک روایت کے) امام احمد اس طرف گئے ہیں کہ کوئی بھی نجس العین چیز اپنی حالت بدل دے تو پاک ہوجاتی ہے، ناپاک چیز کی راکھ ناپاک نہیں ہوتی اور وہ گدھا یا خنزیر یا کوئی بھی ناپاک جانور نمک بن جائے تو پھر ناپاک شمار نہیں ہوتا، کیونکہ شریعت نے ناپاکی کا حکم اس گندگی کی حقیقت پر لگایا تھا، جب وہ گندگی باقی نہیں رہی پوری طرح مٹ گئی تو گندگی کا حکم بھی ختم ہوجائے گا، پس جب وہ ناپاک گوشت اور پوست نمک بن جائے تو اس پر نمک ہی کا حکم لگے گا، اس لئے کہ اب یہ صرف نمک رہ گیا ہے، گوشت پوست وغیرہ کچھ نہیں رہا کہ اس کا حکم لگے اس طرح کی مثالیں شریعت میں بہت سی ہیں۔

حضرات فقہاء ومفتیان کی ان روایات اور فتاویٰ سے صورت مسئولہ بالکل نکھر جاتی اور صاف ہوجاتی ہے کہ اگر صابون یا پیسٹ یا کیک اور بسکٹ یا اسی طرح دیگر ماکولات ومشروبات میں اگر ناپاک چربی یا اسی قسم کی ناپاک اشیاء کی ملاوٹ ہوتی بھی ہے تو تین وجوہات کی وجہ سے اس کے جائز اور حلال ہونے میں کوئی شبہ یا خلجان نہیں رہ جاتا۔

پہلی بات یہ کہ دلائل شرعیہ کے ثبوت کے بغیر ملاوٹ مسلم نہیں، یعنی تسلیم نہیں کی جائے گی، جس کو حضرت مفتی نظام الدین صاحب نے بیان فرمایا کہ جب تک دلائل شرعیہ سے ملاوٹ ثابت نہ ہو اور یقینی نہ ہوجائے اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، مولانا خالد سیف اللہ صاحب نے اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا کہ جب تک معتبر اور یقینی اطلاع نہیں ملتی، بات محض ظن وگمان کے درجہ کی چیز ہوتی ہے اور شریعت اس قسم کے محض احتمالی اور شکی باتوں پر احکام کا دارومدار نہیں رکھتی، اس لئے بھی کہ اصل اشیاء میں اباحت ہی ہے، تو تحریم کے لئے معقول اور قوی وجہ پایا جانا ضروری ہے، نیز اليقين لايزول بالشك .

دوسری وجہ اگر ملاوٹ ہوئی بھی ہو اور ثابت بھی ہوجائے تو شرعی اصول استہلاک اور استحالہ، یعنی ایک چیز کا اپنی حالت بدل دینا نیز انقلاب العین اور تغیر ماہیت وحقیقت کا اصول نافذ ہوگا، جس کی تفصیلات دلائل وشواہد سمیت گذر چکی ہیں۔

اس بحث کے اختتام سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتویٰ

سے چند اقتباسات پیش کردیئے جائیں جو بڑا مبسوط تشفی بخش اور بحث کے تمام گوشوں کو محیط ہے، نیز مفتی اعظم مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسی عبقری شخصیتوں کے تائیدی دستخط سے بھی مزین ہے۔

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کا فتویٰ

(سوال) آج کل ولایتی صابون عموماً استعمال کیا جاتا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس میں خنزیر کی چربی پڑتی ہے، اس وجہ سے اس کے استعمال میں تردد پیدا ہوگیا ہے، شرعی حکم سے مطلع فرماکر ممنون فرمایا جائے۔ وأجركم على الله .

(۳۵۲) جواب: اوّل تو یہ امر محقق نہیں کہ صابون میں خنزیر کی چربی پڑتی ہے، اگرچہ نصاریٰ کے نزدیک خنزیر کا استعمال جائز ہے، اور انہیں اس سے کوئی پرہیز واجتناب نہیں ہے، لیکن پھر بھی یہ ضروری نہیں کہ صابون میں اس کی چربی ضرور ڈالی جاتی ہو، ظاہر ہے کہ یورپین کارخانے تجارت کی غرض سے صابون بناتے ہیں، اور ایسے ذرائع مہیا کرتے ہیں جن سے ان کی مصنوعہ اشیاء کی تجارت میں ترقی ہو۔

آپ نے اکثر یورپین چیزوں کے اشتہاروں میں یہ الفاظ ملاحظہ فرمائے ہوں گے کہ ''اس چیز میں بنانے کے وقت ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے، اس چیز میں کسی مذہب کے خلاف کوئی چیز نہیں ڈالی گئی ہے، اس چیز کو ہر مذہب کے لوگ استعمال کرسکتے ہیں'' وغیرہ وغیرہ۔

ان باتوں سے ان کا مقصود کیا ہوتا ہے؟ صرف یہی کہ اہل عالم کی رغبتیں اس چیز کی طرف مائل ہوں اور ان کے مذہبی جذبات اور قومی خیالات ان اشیاء کے استعمال میں مزاحم نہ ہوں، اور ان کی تجارت ہر قوم میں عام ہوجائے، اور یہی ہر تجارت کرنے والے کے لئے پہلا مہتم بالشان اصول ہے کہ وہ اپنی تجارت کو پھیلانے کے لئے ان لوگوں کے مذہبی جذبات اور قومی خیالات کا لحاظ کرے، جن میں اس کی تجارت فروغ پذیر ہوسکتی ہے، اور اس کے مال کی کھپت ہے، اہل یوروپ جو ہندوستان اور اکثر اطراف عالم میں اپنا مال پھیلانا چاہتے ہیں، اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ مسلمان ہر حصہ عالم میں بکثرت موجود ہیں، اور یہ کہ مسلمان خنزیر اور اس کے اجزاء کے استعمال کو حرام مطلق سمجھتے ہیں، پس موافق اصول تجارت ان کا اولین فرض یہ ہے کہ اشیاء تجارتی میں جن کی اشاعت وترویج ان کا مطمح نظر ہے، ایسی چیزیں نہ ڈالیں جن کی خبر ہوجانے پر

مسلمان ان چیزوں کے استعمال کو حرام سمجھیں اور ان کی تجارت کو ایک بڑا صدمہ پہنچے۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ یورپین اشیاء میں ایسی چیزوں کا استعمال جو مسلمانوں کے نزدیک حرام ہیں غیر ممکن ہے، بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ یقینی طور پر معلوم نہ ہونے کی صورت میں گمان غالب یہ ہے کہ اصول تجارت کے موافق وہ ایسی چیزیں نہ ڈالتے ہوں گے، پس صرف اس بنا پر کہ یہ چیزیں یوروپ سے آتی ہیں اور اہل یوروپ کے نزدیک خنزیر حلال ہے، یہ خیال قائم کر لینا کہ ان میں ضروری طور پر خنزیر کی چربی پڑتی ہوگی یا پڑنے کا غالب گمان ہے صحیح نہیں، ہندو جن کے ہاتھ میں ہندوستان کی اکثر تجارت کی باگ ہے، بہت سی ناپاک چیزوں کو پاک اور پوتر سمجھتے ہیں، گائے کا گوبر اور پیشاب ان کے نزدیک نہ صرف پاک بلکہ متبرک بھی ہے، باوجود اس کے ان کے ہاتھ کی بنی مٹھائیاں اور بہت سی خوردنی چیزیں عام طور پر مسلمان استعمال کرتے ہیں اور استعمال کرنا شرعاً جائز بھی ہے، یہ کیوں! صرف اس لئے کہ چونکہ ہندو دکاندار جانتے ہیں کہ ہمارے خریدار ہندو مسلمان اور دیگر اقوام کے لوگ ہیں، اور ہندوؤں کے علاوہ دوسرے لوگ گائے کے گوبر اور پیشاب کو ناپاک سمجھتے ہیں، اس لئے وہ تجارتی اشیاء کو ایسی چیزوں سے علیحدہ اور صاف رکھتے ہیں، تاکہ خریداروں کو ان سے خریدنے میں تامل نہ ہو، اور خریداروں کے مذہبی جذبات ان کی تجارتی اغراض کی مزاحمت نہ کریں۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے، جس پر بہت سے جزئیات کا حکم متفرع ہوتا ہے، اور نہ صرف صابون بلکہ یوروپ کی تمام مصنوعات کی طہارت ونجاست اسی قاعدہ کے نیچے داخل ہے، ولایتی کپڑے اور بالخصوص رنگین کپڑے جو مسلمان عموماً استعمال کرتے ہیں، کسے خبر ہے کہ ان رنگوں میں کیا کیا چیزیں ملائی جاتی ہیں، اور کن پاک یا ناپاک اشیاء کی آمیزش ہوتی ہے، لیکن قاعدۂ مذکورہ کی بنا پر ان چیزوں کا حکم بھی یہی ہے کہ جب تک یقینی طور پر یا بہ گمان غالب یہ ثابت نہ ہو کہ کوئی ناپاک چیز ملائی جاتی ہے، ناپاکی کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔

اولاً: طہارت ونجاست کے باب میں کتب فقہیہ میں بہت سی ایسی نظیریں موجود ہیں، جن میں محض گمان اور شک کا کوئی اعتبار نہیں کیا گیا، ماہرین کتبِ فقہ پر یہ امر واضح ہے۔

ثانیاً: اگر اس امر کا ثبوت اور کوئی دلیل بھی موجود ہو کہ صابون میں خنزیر کی چربی پڑتی ہے، تاہم صابون کا استعمال جائز ہے، کیونکہ صابون میں جو ناپاک تیل یا چربی پڑتی ہے، وہ صابون بن جانے کے بعد پاک ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد فقہ کی کتابوں سے بہت سی روایات کی تخریج کے بعد (جن میں سے کچھ روایات پہلے گذر چکی ہیں) فرماتے ہیں:

ان روایات منقولہ سے امور ذیل بصراحت ثابت ہو گئے۔

(۱) انقلاب حقیقت سے طہارت ونجاست کا حکم بدل جاتا ہے۔

(۲) یہ حکم طہارت بانقلاب حقیقت امام محمد کا قول ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، اور اکثر مشائخ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

(۳) صابون میں روغن نجس یا چربی کی حقیقت بدل جاتی ہے، اور انقلاب عین حاصل ہو جاتا ہے (درمختار اور مجتبیٰ کی عبارتیں دیکھو)۔

پس اب سوال کا جواب واضح ہو گیا کہ صابون خواہ کسی چیز کی چربی یا روغن نجس سے بنایا جائے صابون بن جانے کے بعد وہ پاک ہو جاتا ہے، اور اس کا استعمال جائز ہے، کیونکہ انقلاب حقیقت کی وجہ سے وہ چربی چربی اور روغن روغن نہ رہا، بلکہ صابون ہو کر پاک ہو گیا، جیسے مشک ہے کہ اصل میں خون ناپاک ہوتا ہے، لیکن مشک بن جانے کے بعد وہ پاک اور جائز الاستعمال ہو جاتا ہے، پس ولایتی صابون کے استعمال کے لئے اس تحقیقات کی کچھ ضرورت نہیں کہ اس کے اجزاء کیا ہیں؟ وہ پاک ہیں یا ناپاک؟ کیونکہ حقیقت صابونیہ اس کی طہارت کی کفیل ہے، جیسے کہ حقیقت مسکیہ اس کی طہارت کی ضامن ہے۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ روایات مذکورہ سابقہ سے روغن نجس کے صابون کا پاک ہونا ثابت ہوتا ہے، لیکن ممکن ہے کہ یہ حکم روغن کے ساتھ خاص ہو کیونکہ اصل اس کی پاک ہے، ناپاکی باہر سے اسے عارض ہوئی ہے، پس اس سے خنزیر کی چربی کے صابون کا حکم نکالنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ خنزیر اور اس کے اجزاء نجس العین ہیں، تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ انقلاب عین سے پاک ہو جانا نجس العین اور غیر نجس العین دونوں میں یکساں طور پر جاری ہوتے ہیں، خون بھی نجس العین ہے، مشک بن جانے سے پاک ہو جاتا ہے، خود خنزیر کا انقلاب حقیقت کے بعد پاک ہو جانا بھی روایات ذیل سے ثابت ہے: ولا ملح كان حمارا أو خنزيرا ولا قذر وقع في بئر فصار حمأة لانقلاب العين به يفتى (درمختار) یعنی وہ نمک ناپاک نہیں جو دراصل گدھا یا خنزیر تھا۔ اور وہ پلیدی بھی جو کنوئیں میں گر کر کیچڑ بن جائے ناپاک نہیں، کیونکہ انقلاب حقیقت ہو گیا اسی پر فتویٰ ہے۔

قوله لانقلاب العين علة للكل وهذا قول محمد وذكر معه فى الذخيرة

والمحيط أبا حنيفة (حلية) (یعنی مصنف کا قول کہ انقلاب عین موجب طہارت ہے یہ گدھے اور خنزیر کے نمک اور پلیدی کے کیچڑ بن جانے کے بعد پاک ہوجانے کی دلیل ہے اور یہ امام محمد کا قول ہے، اور ذخیرہ اور محیط میں امام ابوحنیفہ کو بھی امام محمد کے ساتھ ذکر کیا ہے:

قال في الفتح: و كثير من المشائخ اختاروه وهو المختار لأن الشرع رتب وصف النجاسة على تلك الحقيقة وتنتفى الحقيقة بانتفاء بعض اجزاء مفهومها فكيف بالكل فإن الملح غير العظم واللحم فإذا صار ملحا ترتب حكم الملح ونظيره في الشرع: النطفة نجسة وتصير علقة وهى نجسة وتصير مضغة فتطهر والعصير طاهر فيصير خمرا فينجس ويصير خلاً يطهر فعرفنا أن استحالة العين تستتبع زوال الوصف .

ان نصوص فقہیہ سے امور ذیل ثابت ہوتے ہیں:

(۱) گدھا، خنزیر، کتا، انسان انقلاب حقیقت کے حکم میں سب برابر ہیں کچھ تفاوت نہیں۔

(۲) یہ نمک کی کان میں گر کر مریں یا مرے ہوئے گریں، دونوں حالتوں میں یکساں حکم ہے، یعنی میتۃ جو بہ نص قرآنی حرام اور نجس ہے وہ بھی اسی حکم میں شامل ہے۔

(۳) انسان جس کے اجزاء سے بوجہ کرامت انتفاع حرام ہے اور خنزیر وہ میتۃ جن سے بوجہ نجاست انتفاع حرام ہے، انقلاب حقیقت کے بعد ان پر انسان اور خنزیر و میتۃ کا حکم باقی نہیں رہتا، بلکہ بعد انقلاب حقیقت پاک اور جائز الانتفاع ہوجاتے ہیں، جبکہ انقلاب حقیقت طاہرہ کی طرف ہو۔

(۴) نمک کی کان میں گرنے اور صابون کے دیگ میں گرنے کا حکم یکساں ہے، کیونکہ یہ دونوں صورتیں موجب انقلاب حقیقت ہیں، جیسا کہ کبیری شرح منیۃ کی عبارت میں صراحتاً مذکور ہے، ان امور کے ثبوت کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ خنزیر یا میتۃ یا کتے کی چربی سے بنے ہوئے صابون کے جواز استعمال میں تردد کیا جائے، اور یہ شبہ کچھ وقعت نہیں رکھتا کہ خنزیر بہ نص قرآنی حرام اور نجس ہے، پس صابون بن جانے کے بعد اس کی طہارت کا حکم کرنا نص قرآنی کا معارضہ ہے، جواب اسکا یہ ہے کہ یہ معارضہ نہیں، نص قرآنی نے خنزیر یا میتۃ کو نجس بتایا ہے، لیکن نمک یا صابون بن جانے کے بعد وہ خنزیر یا میتۃ ہی کہاں رہے، دیکھو شراب بہ نص قرآنی حرام و نجس ہے، اور سرکہ بن جانے کے بعد بالاتفاق وہ پاک وحلال ہوجاتی ہے، پس جس طرح کہ شراب منصوص النجاسۃ پر سرکہ بن جانے کے بعد طہارت وحلت کا حکم کرنا نص قرآنی کا معارضہ نہیں، اسی طرح خنزیر کے صابون بن جانے کے بعد اس کی طہارت کا حکم نص قرآنی کا معارضہ نہیں، اصل یہ ہے کہ شریعت

نے جس حقیقت پر نجاست کا حکم لگایا تھا وہ حقیقت ہی نہیں رہی اور بعد انقلاب جو حقیقت متحقق ہوئی وہ شریعت کے نزدیک پاک ہے، پس یہ حکم طہارت بھی حکم شرعی ہے نہ غیر۔

تنبیہ اول: یہ بات ضروری طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگرچہ خنزیر ومیتۃ وغیرہ کی چربی سے بنے ہوئے صابون کا استعمال جائز ہے، لیکن کسی مسلمان کو یہ حلال نہیں ہے، کہ وہ خنزیر وغیرہ کی چربی سے صابون بنائے، کیونکہ قصداً ان چیزوں کو صابون بنانے کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں اور یہ جدا بات ہے کہ غیر مسلموں کے بنانے اور صابون بن جانے کے بعد استعمال جائز ہوجائے..... واللہ اعلم وعلمہ اتم ۔

کتبہ الراجی رحمة ربه **محمد کفایت اللہ غفرلہ مدرس المدرسۃ الامینیہ**

هذا التحقيق صحيح، **عزیز الرحمٰن عفی عنہ مفتی مدرسہ دیوبند**

الجواب صحيح ، **محمد انور عفا اللہ عنہ، دار العلوم دیوبند**

امام بخاریؒ کا مذہب

امام بخاری نے ما يقع من النجاسات باب باندھا ہے اور مختلف صورتوں سے بحث کرتے ہوئے اس صورت سے بھی بحث کی ہے، ایک ناپاک چیز جب اپنی ہیئت بدل کر پاک چیز بن جائے تو وہ پاک اور جائز ہوجاتی ہے اور مشک والی روایت سے استدلال کیا ہے کہ شہید کے خون کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ قیامت میں شہید اس طرح آئے گا کہ اس کے بدن سے بظاہر خون بہتا ہوگا، لیکن اس سے مشک کی خوشبو پھوٹتی ہوگی:

وقال بعضهم مقصود البخارى أن يبين طهارة المسك ردا على من يقول بنجاسته لكونه دما إنعقد فلما تغير عن الحالة المكروهة من الدم وهي الزهم وقبح الرائحة إلى الحالة الممدوحة وهي طيب الرائحة المسك دخل عليه الحل وانتقل من الحالة النجاسة إلى حال الطهارة كالخمرة اذا تخللت (فتح البارى: ۱/۲۳۶)

ترجمہ: امام بخاری کا مقصد ان لوگوں پر رد ہے جو مشک کو اس لئے ناجائز کہتے ہیں کہ وہ بندھا ہوا خون ہے، ان کا جواب مقصود ہے کہ یہ ناپاک جما ہوا خون تھا، لیکن ناپاک حالت اور بدبو سے نکل گیا اور پاک اور خوشبو والی حالت میں بدل گیا، تو اب یہ بلاشبہ پاک اور جائز ہے، جیسے کہ جب شراب سرکہ بن جائے۔

مذکورہ اشیاء میں ظاہر ہے کہ بسکٹ چاکلیٹ اور بیکری کی مصنوعات میں چربی کی صورت شکل مزہ کچھ نظر نہیں آتا، اس لئے یہ مسئلہ بالکل واضح ہے ان کے استعمال کو بلاتحقیق حرام قرار دینا اور اس پر زبردستی اور اصرار کرنا خواہ مخواہ کی زیادتی ہے اور احکام شرعیہ کے ساتھ مخول اور ٹھٹھا ہے، البتہ شکوک وشبہات سے بچتے ہوئے احتیاط اور تقویٰ کو اپنانا اولیٰ اور بہتر رہے گا۔

تیسری چیز جس کی طرف اخیر فتویٰ میں اشارہ کیا گیا کہ ان اشیاء کے استعمال کی اس قدر کثرت ہے کہ اس سے احتراز کرنا تقریباً ناممکن یا دشوار ضرور ہے، اس عموم البلوی میں داخل ہوگا یا (الحرج مدفوع المشقة تجلب التيسير) کے ضمن میں داخل ہوگا۔

ملاوٹ کی تیسری صورت

تیسری صورت یہ کہ محض احتمال اور شبہ ہو ملاوٹ کا کوئی شرعی ثبوت نہ ہو، اس کا حکم دوسری صورت کے ضمن میں تفصیل سے گذر چکا ہے کہ ملاوٹ جب تک یقینی ثابت نہ ہوجائے محض گمان پر کوئی حکم شریعت نہیں لگاتی۔

ملاوٹ کی چوتھی صورت

چوتھی صورت یہ کہ کمپنیوں کی طرف سے مختلف چربیوں (حلال وحرام) ملانے کا احتمال ہو اس کی وضاحت نہ ہو کہ کس چیز میں کونسی چربی ملائی جارہی ہے۔

مذکورہ بالا صورت بظاہر مخدوش اور مشتبہ ہے، اس لئے احتیاطاً یہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ انفرادی طور پر آدمی حتی المقدور پرہیز اور احتیاط کو اپنائے، یہی بہتر اور مناسب ہے لیکن شرعی قانون کی بات وہی ہے جو اوپر مذکور ہوچکی ہے کہ محض شبہات کی بنیاد پر ساری چیزوں پر بے تحقیق حکم لگا کر امت کو مشقت میں ڈالنا عقل کے بھی خلاف ہے اور شریعت تو ویسے بھی بے بنیاد حکم لگانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتی، اور یہ مسئلہ بہت پرانے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔

فرنگی پنیر کے بارے میں ابن تیمیہؒ کی تحقیق

علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اس پر بحث فرمائی ہے کہ افرنج (یعنی فرنگی اور یورپی ممالک) سے آئے ہوئے پنیر کے بارے میں اسی وقت سے دو باتیں مشہور تھیں، ایک یہ کہ اس میں خنزیر کے

دودھ کا استعمال یا غیر مذبوحہ جانور کے پیٹ سے جما ہوا دودھ جو دہی کی شکل کا ہوتا ہے، اس سے پنیر (Cheese) بنایا جاتا ہے تو اس کے بارے میں علامہ نے یہ فرمایا کہ امت میں اس کا استعمال بلانکیر چلا آرہا ہے، حتی کہ صحابہ کے زمانہ میں مجوسیوں کا بنایا ہوا پنیر استعمال کیا جانا بھی عام ہوگیا تھا، جب کہ ان کے بارے میں یقینی معلوم تھا کہ وہ جانور ذبح نہیں کرتے اور باقی افرنگی اہل کتاب کا معاملہ مشکوک تھا کہ وہ کبھی ذبح کرتے ہیں کبھی ذبح نہیں کرتے اور پھر خنزیر کے پیٹ کا مادہ بھی اس میں استعمال کئے جانے کی خبر تھی، اس کے باوجود علماء اور فقہاء اور بزرگان دین نے اس کے جواز پر کبھی نکیر نہیں فرمائی۔

الثانی أنهم لايذكون ما تضع منه الأنفخة بل يضربون رأس البقر ولا يذكونه وأما الوجه الثانی فقد علم أنه ليس كل يعقرونه من الأنعام يتركون ذكوته بل قد قيل إنهم إنما يفعلون هذا بالبقر وقيل إنهم يفعلون ذلك حتى يسقط ثم يذكونه ومثل هذا لايوجب تحريم ذبائحهم بل إذا اختلط الحلال بالحرام فی عدد لا ينحصر كاختلاط أخته بأهل البلد واختلاط الميتة والمغضوب بأهل بلدة لم يوجب ذلك تحريم ما فی البلد كما إذا اختلط الاخت بالأجنبية والمذكی بالميتة فهذا القدر المذكور لا يوجب تحريم ذبائحهم المجهولة الحال وبتقدير أن يكون الجبن مصنوعا من أنفخة ميتة فهذه المسئلة فيها قولان أحدهما أن ذلك مباح طاهر كما هو قول أبی حنيفة و أحمد إحدى الروايتين، والثانی أنه حرام نجس كقول مالك والشافعی الخ والمطهرون احتجوا بأن الصحابة أكلوا جبن المجوس مع كون ذبائحهم ميتة . (فتاویٰ ابن تیمیه ۵۳۳/۱۲)

ترجمہ: دوسری صورت یہ ہے کہ افرنگی انفحہ بچھڑے کے پیٹ سے نکالے جانے والے رینٹ اور پنیر کے بارے میں یہ اشکال ہوتا ہے کہ وہ لوگ جانور کو ذبح نہیں کرتے، بلکہ اس کا سر زمین سے یا دیوار سے زور سے مارتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ مردار ہوجاتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ وہ تمام جانوروں کو اس طرح نہیں مار ڈالتے، بلکہ صرف گائے کے ساتھ کرتے ہیں، باقی جانور (بکری وغیرہ) ذبح کرتے ہیں اور یوں بھی کہا جاتا ہے کہ سر ٹکرانا صرف گرانے کیلئے ہوتا ہے، پھر جب وہ سست ہوتا ہے تو پھر ذبح کرتے ہیں، اس طرح کے مخلوط اور مشتبہ چیزوں کو حرام نہیں کہا جائے گا، بلکہ جب حلال وحرام مخلوط ہوجائے اور امتیاز مشکل ہوجائے تو یہ بالکل اسی طرح

ہے، جیسے کسی شہر میں مردار اور چوری اور غصب کے کچھ جانور عام جانوروں میں رل مل جائیں تو ظاہر ہے کہ ان چند غلط جانوروں کے مل جانے کی وجہ سے پورے جانوروں کو حرام نہیں کہا جائے گا، پھر اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ پنیر مردار جانوروں سے بنا ہے، تب بھی اس مسئلہ میں دو قول ہیں، ایک امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کی ایک روایت کہ یہ جائز اور پاک ہے، دوسرا قول امام شافعیؒ و مالکؒ کا کہ ناپاک اور ناجائز ہے، جائز قرار دینے والے اس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ صحابہ مجوس کے بنے ہوئے پنیر کو استعمال کرتے تھے، جبکہ وہ ذبح کرنے کے عادی نہیں تھے۔

ولایتی پنیر کے بارے میں مفتی نظام الدین صاحبؒ کا فتویٰ

افریقہ سے آئے ہوئے اسی قسم کی صورت حال کے بارے میں استفسار کے جواب میں حضرت فرماتے ہیں:

(سوال) جس طرح ملک میں اکثر کھانے پینے کی چیزیں غیر مسلم عیسائیوں یہودیوں کی فیکٹریوں میں بنتی ہے اور مسلمان ان کو خرید کر کھاتے ہیں، اسی طرح پنیر اپنے تمام اقسام کے ساتھ انہیں غیر مسلموں کے فیکٹریوں میں بنتا ہے اور مسلمان انہیں خرید کر کھاتے ہیں، الی اٰن.....

اب سوال یہ ہے کہ غیر مسلم کے ذبیحہ سے کشیدہ انفحہ سے بنایا ہوا پنیر مسلمان کے لئے حلال ہے یا نہیں؟

(جواب) البیضة إذا وقعت من الدجاجة فی الماء والمرقة لا تفسده و كذا سبخلة و كذا الأنفحة وهی ماتكون فی معدة الرضیع من أجزاء اللبن طاهرة عند أبی حنیفةؒ لاتفسد الماء ولاغیره وإذا خرجت من شاة میتة سواء كانت جامدة أو مائعة وعندهما المائعة نجسة والجامدة متنجسة طهر بالغسل فیفسدان فی الماء وغیره إلا إذا اغتسلت الجامدة أما لو خرجت من مذكاة فلا خلاف فی طهارتها. الخ

اس عبارت سے معلوم ہوا ہے کہ انفحہ جو گائے کے بچہ کے شکم سے یا بکری وغیرہ کسی بھی ایسے جانور سے جس کا گوشت حلال ہے وہ انفحہ اس جانور کے شکم سے شرعی طریقہ سے ذبح کر کے نکالا جائے تو وہ بالاتفاق حلال و پاک ہوتا ہے اس کا کھانا اور استعمال کرنا درست ہوتا ہے اور جو انفحہ ماکول اللحم ہی سے نکالا جائے، مگر بغیر شرعی ذبیحہ کے (مردار) جانور سے نکال دیا جائے تو صاحبین کے نزدیک حلال ہوتا ہے، امام صاحبؒ کے نزدیک ہر حال میں اس کا استعمال درست ہوتا ہے۔

آگے فرماتے ہیں:

(سوال) یہ کہ محکمہ زراعت واقتصادیات کے ذمہ دار شخص نے بتلایا کہ پنیر بناتے وقت دودھ کو منجمد کرنے کے لئے خنزیر کے پیٹ سے کوئی سیال مادہ بھی استعمال ہوتا ہے، مگر یہ نہیں بتایا کہ اس ملک میں بھی استعمال ہوتا ہے یا نہیں؟ اور بعض ذمہ دار شخص نے بتایا کہ اب حیوانی رینٹ کے بجائے نباتاتی رینٹ استعمال ہوتا ہے، تو کیا ایسی صورت حال میں پنیر کو مشکوک ٹھہرا کر حرام سمجھا جائے یا دوسرے ذمہ دار کے انکار کی بناپر اسے حلال ٹھہرایا جائے؟

(جواب) خنزیر مثل غلاظت کے ناپاک یعنی نجس العین اور حرام ہے، ذبح کے بعد بھی یہ پاک نہیں ہوتا، اس کے پیٹ سے کشید کیا ہوا کوئی مادہ سیال ہو یا منجمد پاک وحلال نہ ہوگا، ناپاک و حرام ہی رہے گا اور اس کا استعمال جس کھانے وغیرہ میں ہوجائے گا، وہ بھی ناپاک وحرام ہوجائے گا اور اس کا کھانا اور اس کا استعمال کرنا بھی درست اور جائز نہ رہے گا، البتہ جب تک حرام وناپاک کی آمیزش کا ثبوت یقینی نہ ہوجائے اس وقت تک قطعی حرمت کا حکم نہیں دیا جائے گا لیکن احتیاط اولیٰ اور بہتر رہے گی مکروہ یا حرام نہ کہہ سکیں گے۔

اس طرح کے مخلوط حرام اور حلال دونوں قسم کے دودھ سے بنایا ہوا مشکوک اور مشتبہ پنیر کا استعمال جائز ہے یا نہیں اس کے بارے میں آگے فرماتے ہیں۔ (حرمت کیلئے قطعی ثبوت ضروری ہے محض اندازہ سے حکم لگانے سے تمام علماء نے پرہیز کیا ہے)

غرض جب پنیر بنانے میں دونوں قسم کے (حرام وناپاک اور حلال) رینٹ استعمال کرتے ہیں اور دراصل اشیاء میں حلت اور اباحت ہی ہے تو جب تک کسی پنیر کے بارے میں دلیل سے متحقق نہ ہوجائے کہ اس میں حرام و ناپاک رینٹ استعمال ہوا ہے، اس وقت تک اس پر حرام و ناپاک ہونے کا حکم نہیں لگائیں گے۔ ہاں جب دلیل سے یقین ہوجائے اور ثبوت مل جائے کہ اس میں کوئی حرام یا ناپاک چیز ملی ہے جیسے یہ کہ پیکٹ وڈبہ پر ہی لکھا ہو یہ پنیر کسی حرام یا ناپاک چیز سے تیار شدہ ہے تو اس کو ہرگز استعمال نہ کیا جائے یا مثلاً معتبر شہادت مل جائے کہ اس میں حرام وناپاک چیز ملی ہوئی ہے۔

نیز اس سلسلہ میں تجارتی اصول کے ماتحت ذمہ دار اشخاص کے بیان پر اعتماد کیا جائے گا، کیونکہ دنیوی اصول کے مطابق بھی تجارت کو سچائی اور دیانت ہی سے فروغ ہوتا ہے اس لئے بغیر وجہ شرعی کے کسی کو جھوٹا و دغاباز سمجھنا یا کہنا صحیح نہیں ہوگا (منتخبات نظام الفتاویٰ: ۴۲/۱)

پنیر کا مسئلہ اگر چہ کہ گوشت اور چربی کے مسئلہ سے جدا ہے، لیکن حلال وحرام کی آمیزش کی وجہ سے صورت حال چونکہ مشترک ہے، اس لئے مشتبہ ہونے کی صورت میں کس بات کا اعتبار کیا جائے اور کونسی بات غیر معتبر ہوگی، اس کے اصول کو اس میں واضح کر دیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ناپاک چربی کی آمیزش والی چیزیں اگر اپنی حقیقت بدل دیں اور کسی پاک چیز کی شکل اپنالیں تو یہ دوسری صورت میں شامل ہوگا، جس کی تفصیل گذر چکی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ بسکٹ کیک اور پیسٹ کی شکل میں بدل چکی ہے اور ناپاک چربی کی حقیقت بالکل ختم ہو چکی ہے، تو اب نہ اس کا رنگ روپ باقی ہے، نہ ہی ذائقہ اور شائبہ تو اس کے کھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اس پنیر والی صورت سے ملتی جلتی شکل ہے کہ جن چیزوں کا استعمال کیا جا رہا ہے، ان میں ناپاک چیزوں کی ملاوٹ کا ثابت ہونا شرعی دلائل سے ثابت ہی نہیں ہے، جب کہ کمپنیوں سے ہر طرح کی سینکڑوں قسم کی چیزیں (پاک اور ناپاک ملاوٹ والی) تیار ہو کر نکلتی رہتی ہیں تو کسی کے بارے میں جب تک کمپنی کی طرف سے یا عینی شاہدین کی طرف سے متعین طور پر نہ کہہ دیا جائے کہ اس میں ملاوٹ ہے، اس وقت تک ملاوٹ کا دعویٰ محض بلا دلیل ہونے کی وجہ سے غیر معتبر ہے اور متعین طور پر ثابت ہونے کی صورت میں تبدیلی ماہیت کے ہونے کی وجہ سے جائز ہے، (بہت سے لوگ خود پنیر کا استعمال کرتے ہیں، اس مسئلہ میں ان کے لئے بھی مستقل رہنمائی ہے)

خلاصہ کلام یہ ہے حضرات علماء کرام مفتیان عظام کے سامنے کئی اصول وضوابط ہیں، ان سب کا لحاظ کرنا ان کیلئے ضروری ہوتا ہے، ورنہ ایک ضابطہ کو لے کر باقی اصول سے صرف نظر کرنے کی صورت میں امت کیلئے دشواریاں اور مشکلات کھڑی ہو جانے کا خدشہ ہے تو دوسری طرف شریعت کے بہت سے مصالح اور فوائد سے محرومی کا خطرہ ہے، اس لئے مسئلہ کے سارے پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے انتہائی تفکر وتدبر کے ساتھ ساری صورتوں کو انھوں نے واضح کر دیا ہے۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ ملاوٹ ثابت ہو جائے، تب بھی اصول وضوابط کی رو سے مسئلہ شرعیہ وہی ہے جو مذکور ہوا، اس لئے کہ فتویٰ میں سہولت وآسانی اور یسر مطلوب ہوتا ہے، لوگوں کو مشقت تنگی ودشواری اور حرج میں ڈالنا ہرگز پسندیدہ نہیں ہوسکتا۔ ﴿يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (یسروا ولا تعسروا) لیکن عموماً یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ناعاقبت اندیشی اور جلد بازی کا شکار ہو کر یا جذبات سے مغلوبیت کے نتیجہ میں لوگ بائیکاٹ کی اور حرام ہونے کی باتیں کرتے رہتے ہیں، لیکن عملی میدان میں جب بازار کی

صورت حالی یہ سامنے آتی ہے کہ مارکیٹ پر انہیں یہودی، عیسائیوں کا قبضہ ہے اور یہی مخدوش و مشتبہ کمپنیاں ہر طرف چھائی ہوئی ہیں، ان کی مصنوعات سے ان شبہات والی مشتبہ چیزوں سے بچنا اپنے قبضہ سے باہر معلوم ہوتا ہے تو بےبسی کا شکار ہو جاتے ہیں، انجام کار شرعی مسئلہ ایک تماشہ اور اضحوکہ یا عجوبہ بن جاتا ہے، اس کا علاج اور تیر بہدف نسخہ یہی ہے، جس کو قرآن وحدیث نے بتایا ہے کہ مسلمان خصوصاً یہود ونصاریٰ سے دوستی، ان پر بھروسہ، ان سے لین دین اور معاملات سے حتی الامکان بالکلیہ پرہیز کریں اور اپنے طور پر یا حکومتوں کے تعاون سے میدان عمل میں آگے بڑھ کر ذرائع اور وسائل کو اپنے ہاتھ میں لیں، مارکیٹ پر اپنا قبضہ کریں اور جہاں تک ہو سکے خود کفیل ہونے کی کوشش کریں اور حکومتوں کو بھی بیدار کریں، بیداری کی تحریک چلائیں، عوام اور حکومتوں کو تفصیل سے بتائیں کہ ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کا مارکیٹ پر قبضہ ملک وقوم کے لئے اور ملک کی اقتصادی حالت کیلئے انتہائی تباہ کن اور غربت اور بے روزگاری کو بڑھاوا دینے والا ہے، تو دوسری طرف نت نئی بیماریوں کا جنم دینے والا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسلمانوں کو ملّی، دینی غیرت وحمیت کا اور ملکی وقومی مصالح کا مقتضا یہی ہے کہ ملک وقوم اور ملت ان دشمنوں کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کرے اور اپنی مصنوعات کو فروغ دے اور بیرونی مصنوعات یعنی یہود ونصاریٰ جو شروع سے سازشی طور پر دنیا کے مارکیٹ پر قبضہ کئے ہوئے اور ساری دنیا سے دولت سمیٹ کر ان کے کھاتوں میں منجمد ہو رہی ہے، تو عوام کی اسی دولت سے وہ دنیا میں بدامنی انتشار اور خوں ریزی پھیلا رہے ہیں۔

ان سب کا علاج یہی ہے کہ ان کے مقابلہ میں اپنی مصنوعات کو ہر طرف پھیلایا جائے تاکہ ماحول میں شفافیت برقرار رہے اور معاشرے کو سکون ملے۔ وما علینا الا البلاغ۔

اللهم ارنا الاشياء كما هي اللهم فقهنا في الدين وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين.

اسٹار نیوز کا پروگرام ’بے نقاب‘:

مفتی بے نقاب یا میڈیا کی مسلم دشمنی بے نقاب؟

از: محمد اللہ خلیلی قاسمی
شعبۂ انٹرنیٹ، دارالعلوم دیوبند

۱۶/ستمبر کی شام کو اسٹار نیوز پر ایک خصوصی پرگرام پیش کیا گیا جس کا عنوان تھا: ’بے نقاب‘۔ اس خصوصی رپورٹ میں دعوی کیا گیا تھا کہ کچھ مفتی حضرات نے سائل کی منشاء کے موافق روپئے لے کر فتوی جاری کیا ہے۔ مجھے اس رپورٹ کے خصوصاً اس حصے کے کچھ پہلوؤں پر روشنی ڈالنی ہے جن کا تعلق دارالعلوم دیوبند اور حضرت مفتی حبیب الرحمٰن صاحب کی ذات گرامی سے ہے۔

اسٹار نیوز آسٹریلیا کے عیسائی کا چینل ہے جو ہندی میں خبریں نشر کرتا ہے۔ اسٹار نیوز سیٹلائٹ چینل ہونے کی وجہ سے دنیا کے تقریباً تمام اہم ملکوں اور خطوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اسٹار نیوز کے اس پرگرام ’بے نقاب‘ میں تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کے دوران یہ پیش کیا گیا ہے کہ مفتی فتووں کے عوض پیسے لیتے ہیں اور سوال پوچھنے والے کی مرضی کے مطابق شریعت کو توڑ مروڑ کر فتوے جاری کردیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خلاف شریعت فتوی جاری کرنے کے لیے رشوت لینے کے جرم عظیم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس پورے پروگرام میں مفتیوں کو بے ایمان، فتووں کے دلال، دھرم کے ٹھیکیدار جیسے القاب سے نوازا گیا ہے۔ نیز، فتووں کا فریب، فتووں کا فساد، فتوے کی فیس وغیرہ کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ مفتیوں پر آستھا (عقیدت) اور جذبات سے کھلواڑ، سمودائے (معاشرہ) کو بدنام کرنے، دھرم پر وشواس رکھنے والوں کو گمراہ کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔

پروگرام میں پیش کیے گئے فتوے دارالعلوم دیوبند، مدرسہ امینیہ دہلی، اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی، مدرسہ خادم الاسلام ہاپوڑ، مدرسہ محمودیہ میرٹھ وغیرہ کے مفتیان کرام سے حاصل کیے گئے

تھے۔ بے نقاب پروگرام میں پیش کیے گئے فتوے کچھ اس قسم کے تھے: کریڈٹ کارڈ کا استعمال ناجائز ہے، لڑکیوں کا جینس اور ٹی شرٹ پہننا ناجائز ہے، مسلمانوں کا فلموں میں کام کرنا ناجائز اور ان کی کمائی حرام ہے، عورتوں کا ایسے کھیل کھیلنا جس میں ان کے بدن کا کوئی عضو دکھائی دیتا ہو ناجائز ہے، ڈبل بیڈ کا استعمال ناجائز ہے، ٹی وی دیکھنا ناجائز ہے، پولیو خوارک مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہے، برتھ کنٹرول کی تدبیر اختیار کرنا ناجائز ہے، وغیرہ۔

’بے نقاب‘ جھوٹ کا پلندہ

قابل غور بات یہ ہے کہ تقریباً ان تمام مسئلوں پر مفتیان کرام نے جو جوابات دیے تھے وہ اپنی جگہ پر صحیح اور شریعت اسلامیہ کے مطابق تھے۔ خود بے نقاب پرواگرام نے اپنے الفاظ میں جو فتوے پیش کیے (ڈبل بیڈ کی حرمت سے متعلق فتوے کے علاوہ) وہ سارے فتوے ازروئے شرع بالکل صحیح تھے۔ لیکن ان کو اس انداز اور ایسے تبصروں کے ساتھ پیش کیا گیا کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ سارے فتوے شریعت اسلامیہ کے خلاف اور سائل کی منشاء ومرضی کے موافق پیسے لے کر جاری کیے گئے ہیں۔ اسٹار نیوز کا یہ جادو چل بھی گیا اور اچھے خاصے لوگ اس کے دام تزویر میں گرفتار ہوکر اول وہلہ میں اس واقعہ کو صدفی صد سچ سمجھ بیٹھے۔ ممبئی کے ایک مہربان نے جو عالم دین بھی ہیں، اس پروگرام کو دیکھنے کے بعد ٹی وی ہی پر یہ تاثر دیا کہ ایسے مفتیوں کو سرعام پھانسی دیدینا چاہیے۔ اسٹار نیوز کے اس ڈھائی گھنٹے کے پروگرام نے پوری ملت اسلامیہ اور خصوصاً دارالعلوم دیوبند سے وابستہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے ایک طرف اس پروگرام میں دارالعلوم دیوبند کے مفتی حبیب الرحمٰن صاحب کو پیسوں کے عوض فتوی دینے کا الزام لگایا گیا، اور دوسری طرف ان دیگر مفتیوں کو بھی دارالعلوم دیوبند سے منسوب کرکے دکھایا گیا کہ یہ مفتی دارالعلوم دیوبند سے مفتی کے سند حاصل کیے ہوئے ہیں۔ اس طرح یہ پورا معاملہ کہیں نہ کہیں دارالعلوم دیوبند سے جوڑا گیا۔

پروگرام میں جگہ جگہ بار بار یہ دعوی کیا گیا ہے کہ من چاہا فتوی حاصل کرنے کے عوض رقم دینے کے متعلق مفتی سے پیشگی بات ہوچکی تھی، لیکن کہیں بھی صاف طور پر انھوں نے اس سودے بازی کا منظر نہیں دکھایا ہے۔ علاوہ ازیں، اسٹار نیوز نے اپنے پروگرام میں ان فتاوی سے اپنے مطلب کے مطابق ادھر ادھر سے عبارتیں لے لیں اور اسی کو پیش کردیا، حالاں کہ اہل علم جانتے

ہیں کہ کسی بھی استفتاء کا جواب سوال کی نوعیت کے مطابق دیا جاتا ہے۔ پورے استفتاء اور فتوی کو دیکھے بغیر اس کے کسی جز کے متعلق کسی حتمی رائے کا اظہار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسٹار نیوز نے یہاں بھی عیاری سے کام لیتے ہوئے استفتاء، اس کے پس منظر اور سوال کی نوعیت کو حذف کر کے محض وہ اجزاء پیش کیے جو نہ صرف مفتی کے منشاء کے خلاف تھے بلکہ دیانت وانصاف کے عالمی اصول سے بھی ٹکراتے تھے۔ مفتیوں نے ان کی مرضی کے مطابق فتوی تو نہیں دیا لیکن انھوں نے ان فتاوی کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کے مطابق ضرور بنالیا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس اس پروگرام کی ویڈیو فائل میں بہت زیادہ ایڈیٹنگ سے کام لیا گیا۔ کسی بھی پروگرام کو تیار کرنے کے لیے ویڈیو کو ایڈیٹ کرنا اور اس کے مختلف اہم ٹکڑوں کو ملا کر فلم تیار کرنا ضروری امر ہوتا ہے۔ اس سے انکار وفرار کی گنجائش نہیں، لیکن یہ چیز اس وقت قابل اعتراض بن جاتی ہے جب اس میں ہیرا پھیری، دھوکہ دہی اور جعل سازی سے کام لیا گیا ہو، ایک جگہ کے واقعہ کو دوسری جگہ کے واقعہ سے جوڑ کر غلط تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہو، ایک وقت کی بات دوسرے وقت کی بات سے ملا کر بے بنیاد نتیجہ نکالا گیا ہو۔ اسٹار نیوز کے 'بے نقاب' پروگرام میں اس پیشہ ورانہ مہارت کا انتہائی چالاکی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

نیز، مفتیان کرام سے جو فتاوی حاصل کیے گئے انکے سوالات کے انتخاب میں کافی فنکارانہ عیاری سے کام لیا گیا تھا۔ چناں چہ ایسے سوالات کا انتخاب کیا گیا جن کا تعلق عام مسلمانوں کی زندگی اور ان کے جذبات سے تھا۔ کریڈٹ کارڈ، ٹی وی کا عدم جواز، فلموں اور کھیلوں میں مسلمانوں کے شمولیت پر پابندی، برتھ کنٹرول اور لڑکیوں کے لیے جینس وٹی شرٹ کی مخالفت؛ یہ ایسے مسائل تھے جس میں عموماً مسلم طبقہ بھی ملوث ہے، ان مسائل کے متعلق ان فتووں کو دکھا کر یہ تاثر بھی دینے کی کوشش کی گئی یہ مفتی دھرم کے ٹھیکیدار، سطحی ذہنیت رکھنے والے، قدامت پسند اور ترقی کے مخالف ہیں اور جیسا چاہتے ہیں شریعت کو توڑ مڑوڑ کر فتوی جاری کردیتے ہیں۔

فتوی میں تبدیلی کی گئی

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس پروگرام میں حضرت مفتی حبیب الرحمٰن صاحب (مفتی دارالعلوم دیوبند) کے جس فتوے کو پیش کیا گیا، اس میں تبدیلی کی گئی ہے۔ نیچے سوال وجواب کی عبارت بعینہٖ درج کی جاتی ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں ہمارے ملک کے اندر اور مختلف بینک کے ذریعہ کریڈٹ کارڈ جاری کرتا ہے۔ پہلے تو لوگ لالچ میں آکر کریڈٹ کارڈ بنوالیتے ہیں اور بعد میں بہت موٹی رقم بیاج کے طور پر ادا کرنی پڑتی ہے۔ کیا اسلام کے اندر بیاج لینا دینا اور کریڈٹ کارڈ کا استعمال کرنا شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟ جواب باصواب سے نوازیں۔ فقط

محمد عامر بن جاوید حق، ایل ۱۸- کالکاجی، نئی دہلی

الجواب: وباللہ التوفیق! فی نفسہٖ کریڈٹ کارڈ کا استعمال جائز ہے۔ البتہ اگر اس کے ذریعہ دھوکہ دیا یا لاپرواہی وغفلت میں سود دیا تو پھر کریڈٹ کارڈ کا استعمال جائز نہ ہوگا، بلکہ گناہ ہوگا۔ مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے: لعن رسول الله ﷺ علی اٰکل الربوا و مؤکلہ الخ. واللہ اعلم

حبیب الرحمٰن عفی اللہ عنہ، مفتی دارالعلوم دیوبند

مفتی صاحب نے فتوی میں یہ لکھا تھا کہ 'فی نفسہٖ کریڈٹ کارڈ کا استعمال جائز ہے'۔ دارالافتاء کا رجسٹر جس میں حضرت مفتی صاحب کے جاری شدہ فتاوی درج ہوتے ہیں، اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اگلی عبارت میں کریڈٹ کارڈ کے سود اور دھوکہ پر مبنی استعمال کے عدم جواز کا استثناء کیا گیا۔ لیکن اس پروگرام میں جو فتوی دکھایا گیا، اسکرین پر اس کو روک کر پڑھا جاسکتا ہے۔ اس میں صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ فتوی میں لفظ ''جائز ہے'' سے پہلے ''نا'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ٹی وی پر جب اس کو پڑھ کر سنایا گیا تو اس وقت ''جائز نہیں'' کے ساتھ سنایا گیا۔ ٹی وی پر اس کا ہندی ترجمہ یوں لکھا گیا:

کریڈٹ کارڈ کا استعمال ناجائز ہے۔ اگر اس کے ذریعہ دھوکا دیا یا لاپرواہی اور انجانے میں سود دیا تو پھر کریڈٹ کارڈ کا استعمال جائز نہیں ہوگا، بلکہ گناہ گار ہوگا کیوں کہ سود کا لینا جس طرح گناہ ہے اسی طرح سود کا دینا بھی گناہ ہے۔

درج بالا عبارت کو پڑھ کر زبان کا ایک ادنی طالب علم بھی اس میں کی گئی جعل سازی کو پکڑ سکتا ہے۔ اولاً، کریڈٹ کارڈ کے استعمال کو ناجائز کہا گیا اور پھر استثناء کرنے کے بعد بھی اس کو ناجائز ہی کہا گیا جس سے پوری عبارت کا مفہوم ہی خبط ہوکر رہ گیا ہے۔ سچ ہے:

دروغ گو را حافظہ نہ باشد

دیگر فتاوی کے بارے میں ہمیں اب تک تحقیق نہیں ہوئی۔ لیکن بعید نہیں کہ ان میں بھی ایسی تبدیلی کی گئی ہو۔ اگر تبدیلی نہ بھی کی گئی ہو تو بھی بہر حال اتنا صاف ہے کہ انھوں نے صحیح فتاوی کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھال کر منفی انداز سے پیش کیا۔

مفتی صاحب پر روپئے لینے کا بے ہودہ الزام

اسٹار نیوز نے اس پروگرام میں یہ دعوی کیا ہے کہ انھوں نے مفتی حبیب الرحمٰن صاحب کو کریڈٹ کارڈ کے عدم جواز کا فتوی دینے کے عوض میں پانچ ہزار روپئے دیے ہیں۔ اس سلسلے میں ٹی وی پر جو منظر پیش کیا گیا ہے اس سے بادیٔ النظر میں یہ مغالطہ تو دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مفتی صاحب کو رقم دی ہے۔ لیکن اسے بغور دیکھنے سے ’بے نقاب‘ ٹیم کی بدنیتی اور جعل سازی بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس میں ایک طرف یہ دکھایا گیا ہے کہ رپورٹر روپئے گن رہے ہیں اور پھر درمیان میں بے ربط سے مناظر کے بعد مفتی صاحب کو اپنے بیگ میں کچھ روپئے رکھتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس پورے منظر میں کہیں بھی روپئے دیتے اور مفتی صاحب کو روپئے لیتے نہیں دکھایا گیا ہے، جب کہ یہی سین اس پوری فلم کا سب سے اہم حصہ ہو سکتا تھا، اور یہی غائب ہے۔

مفتی صاحب کا روپیہ نہ لینا درج ذیل وجوہ سے ظاہر ہے:

❁ مفتی صاحب نے اس سے خود انکار کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے ذریعہ قائم شدہ تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس کو غلط بتایا ہے۔ دفتر اہتمام سے جاری پریس ریلیز میں کہا گیا ہے کہ مفتی صاحب جو رقم رکھتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں وہ رقم ایک کتب خانے سے ان کی کتابوں کی فروخت کے عوض اتفاقاً اسی وقت آئی تھی جسے وہ اپنے بیگ میں رکھ رہے تھے۔ ان لوگوں نے اسی منظر کو قید کر کے اس کو رقم قبول کرنے سے جوڑ دیا۔

❁ اس معاملہ میں دارالافتاء ہی کے دوسرے مفتی محمود حسن صاحب جن کی نشست گاہ مفتی حبیب الرحمٰن صاحب کے بالکل قریب ہے، ان کی شہادت ہے کہ فتوی پوچھنے والوں نے مفتی صاحب کو میرے سامنے رقم دینے کی پیش کش کی لیکن مفتی صاحب نے اسے سختی سے مسترد کر دیا۔ اس طرح دو بار پیش آیا۔ اس پروگرام میں مفتی صاحب کے مکرر انکار کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

❁ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ فتویٰ پوچھنے والے کے ساتھ محمد عمران نامی جو شخص

آیا تھا، اس نے خود اقرار کیا ہے کہ مفتی صاحب نے کسی بھی طرح کی کوئی رقم قبول نہیں کی۔

❁ پروگرام میں فتوی پوچھنے والے جو نوٹ مفتی صاحب کو دینے کے لیے گن رہے ہیں وہ پانچ پانچ سو کے نوٹ ہیں اور ان کا دعوی ہے کہ انھوں نے مفتی صاحب کو فتوی کے عوض پانچ ہزار روپئے دیے، اس طرح پانچ ہزار میں پانچ کے صرف دس نوٹ بنیں گے جن کو اگر موڑ کر رکھا جائے تو ان کی موٹائی کوئی زیادہ نہیں ہوگی جب کہ مفتی صاحب جو نوٹ اپنے بیگ میں رکھ رہے ہیں ان کی تہہ نسبتاً کافی موٹی ہے اور وہ کسی بھی صورت میں (پانچ پانچ سو کی) پانچ ہزار رقم نہیں ہو سکتی۔

❁ انھوں نے دعوی کیا ہے کہ انھوں نے اپنی مرضی کا فتوی حاصل کرنے کے لیے مفتی صاحب کو رشوت دی۔ آخر جب فتوی شریعت اسلامیہ کی رو سے صحیح اور درست تھا تو پھر رشوت کا کیا مطلب؟

❁ مفتی حبیب الرحمٰن صاحب سے متعلق پورے منظر میں کہیں بھی حضرت مفتی صاحب کی کوئی بات صاف اور واضح طور پر سنائی نہیں گئی ہے جب کہ اسی منظر میں اور اس طرح کے دوسرے مناظر میں دوسرے افراد کی آواز صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے علاوہ دیگر اداروں کے مفتی حضرات سے بھی انھوں نے روپیوں کے بدلے من چاہا فتوی حاصل کرنے کا دعوی کیا ہے۔ تقریباً ان تمام اداروں نے اسٹار نیوز کے دعوے کو بے بنیاد اور غلط بتایا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ تاہم، دہلی کے ایک مفتی نے کچھ رقم لینے کی بات قبول کی ہے۔ ان کے بقول ایک وقت فتوی لے کر جانے کے بعد یہ لوگ دوبارہ ان کے پاس آئے اور ہدیہ کے نام پر کچھ روپئے قبول کرنے کے لیے اصرار کیا جسے انھوں نے آخر کار قبول کر لیا۔ ٹی وی پر اس منظر کو رشوت لینے سے تعبیر کیا گیا۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر کوئی مفتی شریعت کے عین مطابق اور بلا کسی دباؤ کے فتوی دے رہا ہو اور بالفرض اگر وہ فتوی دینے کے بعد کوئی رقم ہدیہ کے عنوان سے قبول بھی کرتا ہے تو اس میں شرعاً وعرفاً کوئی ایسی قباحت بھی نہیں کہ اس کے اس انفرادی اور اتفاقی واقعہ کو ملک میں مروج بدعنوانی و رشوت خوری کے مماثل ومساوی قرار دیا جائے۔

یہ ایک گھناؤنی اور قابل مذمت سازش ہے

اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ دشمنان اسلام اس وقت پوری دنیا میں

جس طرح مختلف محاذوں پر اور مختلف عنوانات کے ساتھ اسلام پر حملے کررہے ہیں یہ معاملہ کسی ذی ہوش سے مخفی نہیں۔ پوری دنیا میں مسلمانوں کے ایمان وعقیدہ، اعمال واخلاق اور ملک وسیاست پر جس انداز سے حملے ہورہے ہیں وہ دشمنان اسلام کی طویل مدتی منظّم اور منصوبہ بند سازش کا ایک حصہ ہیں۔ خصوصاً گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد سے افغانستان، عراق وفلسطین پر ہونے والی یورشیں اس دعوی کا بین ثبوت ہیں۔ فوجی محاذ پر عالم اسلام کے خلاف جو غیر اعلانیہ صلیبی جنگ چھیڑی گئی ہے یہ تو الگ رہی، اس کے علاوہ داخلی سطح پر جس طرح سے مسلم ممالک پر اسلامی نصابہائے تعلیم تبدیل کیے جانے اور مدارس ومعاہد اسلامیہ پر شکنجہ کسنے کے لیے دباؤ اور دھمکی کی پالیسی اپنائی جارہی ہے، وہ بھی حالیہ واقعات سے ادنی دلچسپی رکھنے والے سے مخفی نہیں۔

پچھلی صدی کی آخری دہائی میں طالبان تحریک کے عروج کے بعد اسلام دشمن طاقتوں کو اس کا اندازہ ہوگیا ہے کہ مسلمانوں کی عالمی دینی بیداری، تصلب، دعوتی سرگرمیوں اور بقول ان کے اسلامی بنیاد پرستی وشدت پسندی کا منبع ومصدر یہی دار العلوم، اس نہج پر چلنے والے تعلیمی مدارس اور دینی وتبلیغی جماعتیں ہیں۔ اسی لیے وہ مسلمانوں کی اسی روح کو کچلنے کے درپئے ہیں۔ اس معاملہ کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ تقریباً تمام عالم اسلام کے اندر مسلم دشمن طاقتیں اپنی عیارانہ اور تہدید آمیز پالیسیوں کے نفاذ میں کامیاب ہورہی ہیں۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان اور ان کے دینی معاہد ومدارس ان کی سازشوں کے جال سے بہت حد تک محفوظ ہیں۔ وہ عالم اسلام کے تقریباً تمام ہی ممالک حتی کے عالم عرب کے مدارس ومعاہد میں جاری نصابہائے تعلیم کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے پر مجبور کررہے ہیں۔ خود پاکستان کے مدرسوں اور دینی جماعتوں پر نکیل کسنے میں انھیں خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اللہ کے فضل وکرم سے ہندوستان کے مدارس اور دینی جماعتوں کو ہزار پروپیگنڈہ اور کوششوں کے باوجود رام کرنے میں کوئی نمایاں کامیابی نہیں مل سکی ہے۔

علاوہ ازیں، اس وقت پوری دنیا میں فقہ اسلامی خصوصاً فقہ حنفی کے خلاف ایک طوفان اٹھایا گیا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں اور نہ ہی یہ صرف اپنے چند ناسمجھوں کی ناسمجھی کا نتیجہ ہے؛ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس سازش کی زمام کار بھی اسی مغرب کے ہاتھ میں ہے۔ فقہ اسلامی جس کی اساس فقہ حنفی ہی کو کہا جاسکتا ہے، آج تک اس کا متبادل نہ اقوام متحدہ کا چارٹر (Charter) پیش کرسکا ہے اور نہ یورپ وامریکہ کے نام نہاد جمہوری قوانین ودساتیر۔ مسلمانوں کا قانون اسلامی چودہ صدی قبل اس وقت مدون ہوچکا تھا جب آج کے جمہوریت ومساوات انسانی کے علم

برداروں کے آباء واجداد پہاڑوں میں بھیڑیں چراتے تھے یا آپس میں اس طرح برسر پیکار تھے کہ ایسی باہمی آویزشیں چشم فلک نے دیکھی بھی نہ ہوں گی۔ اسی کے ساتھ یہ قانون اس حد تک کامل ومکمل، فطری اور لچکدار ہے کہ وقت کے ساتھ بدلنے والے حالات سے بالکل ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔ مغربی دنیا اسلام، پیغمبر اسلام اور اسلامی شخصیات کی اہمیت وحیثیت گھٹانے، انھیں بدنام کرنے اور انھیں جاہل ووحشی ثابت کرنے کی اپنی پرانی ڈگر پر اب بھی قائم ہے۔ اس نے ہمیشہ اسلامی شخصیات، اسلامی علوم اور اسلامی کارناموں کو گھٹا کر یا اسے بدنام کرکے پیش کیا ہے۔ خود انھوں نے فقہ اسلامی کے بارے میں یہ ہوّا اڑایا تھا کہ اس کی بنیاد قانون روما (Roman Law) پر رکھی گئی ہے۔ آج تحقیقات سے اس مغربی الزام کی دھجیاں اڑ چکی ہیں۔ ایک طرف تو فقہ اسلامی کی یہ حیثیت کہ ساری دنیا میں اس جیسا جامع ومکمل اور قدیم قانون نہیں۔ اور دوسری طرف اس کی یہ اہمیت کہ آج مسلم معاشرے کی بنیاد یہی فقہ ہے، اس کی عملی زندگی کی روح فقہ ہے، کم وبیش سارے عالم اسلام میں اسی فقہ اسلامی کی حکمرانی ہے۔

مغرب کے دسیسہ کاروں نے فقہ کے اس قلعہ میں نقب زنی کی کوشش شروع کی۔ آج فقہ اسلامی کے نام پر ہنگامہ مچانے والے اپنے بھی کسی نہ کسی طرح شعوری یا لاشعوری طور پر اسی مغربی سازش کے آلۂ کار بن رہے ہیں۔ آج مغرب میں فقہ اسلامی اور شریعت اسلامیہ کے نام پر تحقیق وریسرچ کا خاصا چسکا پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کتابیں معرض وجود میں آرہی ہیں۔ ان تحقیقات، کتابوں اور پروپیگنڈوں کا مقصد فقہ اسلامی کو بدنام کرنا اور اس سے مسلمانوں کا رشتہ منقطع کردینا ہے، کیوں کہ اگر فقہ وشریعت سے مسلمانوں کا رشتہ کٹ جائے گا تو مسلمان عملی طور پر اپاہج ہوجائیں گے اور فقہ کے چشمۂ صافی سے قرآن وحدیث کا جو آب حیواں اُن کے معاشرے کے رگ وریشہ میں رواں دواں ہے وہ گدلا ہوجائے گا۔

خصوصاً برصغیر میں فتوی کی جو اہمیت وحیثیت ہے وہ کسی ذی علم سے مخفی نہیں۔ تقریباً سارے ہی مسلمان فتوی کو اعتبار واعتماد اور عظمت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے بڑے بڑے مسئلے محض ایک مفتی کی رائے پر (جو عدالتی فیصلہ کی طرح لازمی وجبری نہیں ہوتی) حل ہوجاتے اور وہ ادب واحترام سے اس فیصلے کو مان لیتے ہیں۔ امریکی واسرائیلی مصنوعات کے بائیکاٹ کے فتوی کے سلسلے میں قارئین کو یاد ہوگا کہ پورے برصغیر خصوصاً اور پورے عالم اسلام میں عموماً امریکہ واسرائیل مخالف فضا کی ایک لہر پیدا ہوگئی تھی۔ اسی کے نتیجے میں پیپسی وکوکا کولا کی

کمپنیوں کو کروڑوں ڈالر کا نقصان ہوا تھا۔

ظاہر ہے کہ جب فتووں، مفتیان کرام اور مدرسوں کے ساتھ مسلم عوام کو اس درجہ عقیدت و محبت اور تعلق خاطر ہے تو ان مدارس وعلماء سے عوام کو کاٹنے میں یہ لوگ کیسے کامیاب ہوسکتے ہیں؟ آخر انھوں نے اس کی شکل یہ نکالی کہ مدرسوں، علماء اور مفتیان سے سادہ لوح مسلمانوں کو بدگمان کیا جائے۔ اور اس کے لیے میڈیا کا طاقت ور ہتھیار ان کے پاس ہے ہی۔ اگر وہ مسلم عوام کو علماء و مدارس سے بدگمان کرنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر ان کے لیے آگے کے سارے مرحلے آسان ہوجائیں گے۔ ان مدرسوں کے نصاب میں تبدیلی آسان ہوسکتی ہے، ان پر شکنجہ کسنا سہل ہوجائے گا اور حتی کہ معمولی الزامات لگاکر ان کو بند کرانا کچھ مشکل نہ ہوگا؛ کیوں کہ عوامی مزاحمت وبغاوت کا خطرہ ٹل جائے گا۔ گذشتہ کئی سالوں سے اس منصوبے پر عمل جاری ہے اور آئے دن گاؤ ذبیحہ، ٹی وی، عارف گڑیا، عمرانہ معاملہ، ثانیہ مرزا، انشورنش، وندے ماترم وغیرہ موضوعات پر فتوے کو اچھالنے کی حرکت، اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔

میڈیا اس زمانہ کا ایک انتہائی طاقتور ہتھیار ہے جو افسوس کی بات یہ ہے کہ تقریباً پورا کا پورا غیروں کے ہاتھوں میں ہے۔ میڈیا خود کو جمہوریت کا پانچواں ستون کہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا، خصوصاً مسلمانوں سے متعلق مسائل میں منفی انداز اپنانا اس کا وطیرہ بن چکا ہے۔ ہر اخبار اور ٹی وی چینل ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور سنسنی خیز مواد حاصل کرنے میں اتنا آگے نکل جاتا ہے کہ بسا اوقات بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا دیا جاتا ہے جس میں کتنے بے گناہ اور معصوم افراد میڈیا کی 'ہاٹ نیوز' کی بھوک کا شکار بن جاتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

نام نہاد مہذب دنیا کا دوہرا رویہ

از: ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی
۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

۴۵۰ سوسالوں میں ۲۶۵۹ جنگیں لڑنے والے جنگجو یوروپ اور سالانہ ۲۰-۱۵ ارب ڈالر کی اسلحہ کی تجارت کرنے والا امریکہ مل کر اسلام اور مسلمانوں کی ایک شرانگیز تصویر بنارہے ہیں جس کی کڑی اہانت رسول پر مبنی شائع کارٹون اور ان کی مختلف ممالک میں بار بار اشاعت شامل ہے۔ اور اس شرمناک فتنہ پروری کو آزادیٔ اظہار کے نام پر جائز ٹھہرایا جارہا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے انگریزی پریس کا بڑا حصہ اِس فتنہ انگیزی کی حمات میں شامل ہے۔ مگر اس منافقانہ کردار کو عیاں اور واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ جس ہندوستانی اخبار نے اس کی حمایت کی اسی نے امریکہ میں شراب کی بوتل اور اشتہار میں ''درگا'' کی تصویر بنانے پر اعتراض کیا اور پہلے صفحہ پر شائع کیا اور نتیجتاً اس کمپنی نے اُسی دن 15/2/06 کو اپنا اشتہار واپس لے لیا۔ اس دن منافقانہ کردار کی ایک اور بے شرم مثال برطانوی پارلیمنٹ میں دیکھنے کو ملی جس میں ''دہشت گردی'' کی تعریف یا ''بڑائی کرنا'' بھی جرم میں شامل کیا گیا۔ جبکہ نہ تو دہشت گردی کی تعریف متعین ہے اور نہ ''تعریف'' یا ''بڑائی'' کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اگر دہشت گردی کی تعریف بھی جرم ہے تو اہانت رسول ﷺ کیوں جرم نہیں؟ کیا اس سے بدامنی نہیں پھیلتی؟ کیا اس سے جانی مالی نقصان نہیں ہوتا؟ کیا اس سے دل مجروح نہیں ہوتے؟ کیا اہانت رسول ﷺ سے اور اِس کی ناجائز سرکاری حمایت سے غصہ نہیں پیدا ہوگا؟ پھر اس آزادی کے معاملہ میں بھی اِن منافقین کا رویہ قابل نفرت ہے۔ اسلام کی ہتک برطانیہ میں جرم نہیں ہے مگر عیسائیت کی ہتک جرم ہے۔

گذشتہ سال ۲۰۰۵ء میں اقوام متحدہ میں یہ ریزولیشن پاس ہوا ہے کہ Zionist ''صیہونیت'' کی اصطلاح کا استعمال قانوناً پوری دنیا میں جرم قرار دیا جائے۔ اس کے علاوہ قارئین کو غالباً یاد

ہوگا کہ گذشتہ سال ۲۰۰۵ء میں شاہزادہ ہیری Harry نے کسی مزاحیہ تفریحی پروگرام میں نازی ڈریس پوشاک پہن لی تھی جس پر سواستک 卐 کا نشان بنا ہوا تھا جو ہٹلر کی فوج کی وردی پر بھی بنا ہوتا تھا۔ مگر دراصل وہ ایک آریائی مذہبی تہذیبی علامت ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے (یہ اچھا/ ٹھیک ہے) صرف ڈریس پہننے پر جو ہنگامہ صہیونی لابی، یوروپی سرکار اور میڈیا نے اٹھایا تھا وہ قارئین کو یاد ہوگا۔ کہا یہ گیا کہ اس سے اتنے بڑے ظالم اور ظلم کی توقیر ہوئی اور مظلوموں کے دل دکھے۔ (کیوں کہ وہ یہودی تھے مسلمان نہیں تھے) جرمنی میں اس نشان کا استعمال ممنوع ہے۔ مگر اس واقعے کے بعد پورے یوروپ میں اس علامت کا استعمال قانوناً جرم بنانے کی طرف کارروائی شروع ہوگئی کیوں؟ کیا اس سے تفریح کی آزادی کا حق مجروح نہیں ہوتا؟ ابھی ایرانی اخبار کے ذریعہ ۱۹۲۰ء کے عشرہ میں یوروپ میں یہودیوں پر ہوئے مظالم اور نام نہاد ''ہولوکاسٹ'' پر کارٹون مقابلہ پر یوروپ میں کیوں غصہ ہے؟ کیا اس سے آزادی اظہار رائے پر بندش نہیں پیدا ہوتی؟ یا اس سے یوروپی عیسائیوں کا اصل چہرہ کھلنے کا خوف ہے۔ پھر اٹلی کے وزیر روبرٹو کارڈولی کے ذریعہ کارٹون پر مبنی شرٹ تقسیم کرنے اور پہننے کا اعلان کس آزادی یا حق کا استعمال ہے؟ مسلمانوں کے ردعمل میں اِکا دکا تشدد کو تنقید کا نشانہ بنانے والے اس وقت چپ کیوں رہتے ہیں جب انہیں خواہ مخواہ اکسایا جاتا ہے۔ ورنہ الگ الگ ملکوں میں کارٹون بار بار کیوں شائع کئے جارہے ہیں؟ اٹلی کا وزیر کیوں قانون ہاتھ میں لے رہا ہے؟ جینوا میں انسانی حقوق پر نمائش کے دوران ایک ماڈل کو جس میں فلسطین میں یہودی ظلم کو دکھایا گیا تھا اسرائیلی سفیر نے خود برباد کر کے اس کے بجلی کے تار پانی میں ڈال دیئے جس سے پورے ہال کو خطرہ ہوگیا تھا۔ مگر ساری مہذب دنیا چپ رہی۔ کیوں؟؟

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۹۱	محرم ۱۴۲۸ھ مطابق فروری ۲۰۰۷ء	شمارہ: ۲

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند- ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۰ روپئے، سالانہ -/۱۰۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۶۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۱۲۵ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۵۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411077577 *(EDITOR)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman, Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P. Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	اسلام میں نکاح کی اہمیت	سید کمال اللہ بختیار ندوی	۷
۳	ضروریات دین ہر مسلمان کی پہچان ہے	مولانا ابوعثمان میانوالی	۱۸
۴	محرم الحرام تاریخ کے آئینے میں	محمد اُبوسفیان حسینی	۲۸
۵	سلاطین ہند کے عہد میں غیر مسلموں کی شرعی حیثیت	محمد شمیم اختر قاسمی	۳۳
۶	کیا ہندو عرب دوستی ''مسلم تشٹی کرن'' ہے؟	ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی	۴۲
۷	فرقہ وارانہ فساد... اور فدائے ملتؒ	فاروق اعظم عاجز کھگڑیاوی	۴۸
۸	مرحومہ کے لئے ایصال ثواب کی اپیل	....	۵۶

ختم خریداری کی اطلاع

- ○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا نورالحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مکتبہ معاویہؓ داؤد والا ڈاکخانہ کرم علی والا، براستہ شجاع آباد ضلع ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

احسان یا بالفاظ متعارف تصوف کیا ہے؟ انسانی روح کا اپنے مطلوبِ حقیقی سے ملنے کا شدید اشتیاق؟ تصوف کیا ہے؟ اخلاق کی جان اور ایمان کا کمال، شریعت اسلامی اس کی اساس اور قرآن وحدیث اس کا سرچشمہ، چناں چہ سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی کا بڑے واضح الفاظ میں اعلان ہے کہ:

''ایں راہ کسے یابد کہ کتاب بردست راست گرفتہ باشد وسنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بردست چپ ودر روشنائی ایں دوشمع می رودتا نہ درمغاک شبہت افتد نہ درظلمت بدعت۔''

اس راہ کو وہی پاسکتا ہے جو کتاب اللہ کو داہنے ہاتھ میں اور سنت رسول کو بائیں ہاتھ میں لیے ہو اور ان دونوں چراغوں کی روشنی میں راہِ سلوک طے کرے تاکہ گمراہی اور بدعت کی تاریکی میں نہ گرے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری جو متقدمین صوفیاء میں امتیازی مقام ومرتبہ کے حامل تھے فرماتے ہیں: اصولنا سبعة اشياء التمسك بكتاب اللّٰه والاقتداء بسنة رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم واكل الحلال وكف الاذى واجتناب المعاصى والتوبة واداء الحقوق (التاج المكلل) ہمارے سات اصول ہیں کتاب اللہ پر مکمل عمل، سنت رسول کی پیروی، اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچنے دینا، گناہوں سے بچنا، توبہ واستغفار، اور حقوق کی ادائیگی۔

سلطان الہند شیخ معین الدین اجمیریؒ کا یہ مقولہ تاریخِ اجمیر میں درج ہے۔

''اے لوگو تم میں سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ترک کرے گا وہ شفاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم رہے گا۔''

حضرت میر سید اشرف سمنانیؒ مدفون کچھوچھا ضلع فیض آباد فرماتے ہیں:

''یکے از اہم شرائط ولی است کہ تابع رسول علیہ السلام قولاً وفعلاً واعتقاداً بود (الطائف اشرفی)

ولی کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے قول، فعل اور اعتقاد میں پیرو ہو۔''

تصوف دراصل وہ رہنما ہے جو سالک کو ہر آن باخبر رکھتا ہے کہ دیکھنا کہیں مقصود نگاہ سے اوجھل نہ ہو جائے وہ ہدایت کرتا ہے کہ جب تو بارگاہِ خداوندی میں نماز کے لیے کھڑا ہو اور یہ دیکھے کہ قبلہ رو ہے یا نہیں، جائے نماز اور کپڑے پاک ہیں یا نہیں، تو اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھ کہ تیرا تصور پاک ہے یا نہیں، دل مالک کائنات کی طرف ہے یا نہیں، غرض تصوف ہر ہر قدم پر سالک کو خبردار رکھتا ہے کہ مقصود اصلی خدائے ذوالجلال والاکرام کے خیال سے دل غافل نہ ہونے پائے، ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل کے تلامذہ نے ان سے سوال کیا کہ آپ بشر حافیؒ کے پاس کیوں جاتے ہیں وہ تو عالم ومحدث نہیں ہیں؟ تو امام صاحب نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ سے واقف ہوں مگر بشر اللہ سے واقف ہیں۔ عارف ہندی اکبر الہ آبادی مرحوم نے بہت خوب کہا ہے۔

قرآن رہے پیش نظر ، یہ ہے شریعت
اللہ رہے پیش نظر ، یہ ہے طریقت

اس حقیقت کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ فقیہ بھی ہدایت کرتا ہے کہ، اے بندے اللہ کا نام لے، اور صوفی بھی یہی کہتا ہے کہ اللہ کا نام لے مگر اس طرح کہ وہ تیرے دل میں اتر جائے، یعنی صوفی کا کہنا یہ ہے کہ صرف زبان سے اللہ کا نام لینا کافی نہیں ہے، زبان کے ساتھ تیرا دل بھی ذاکر ہونا چاہیے، حاصل کلام یہ نکلا کہ تصوف یا احسان دل کی نگہبانی کا اصطلاحی نام ہے، حدیث جبرئیل میں ''ان تعبد اللّٰه كانك تراه فان لم تكن تراه فانّه يراك'' کا جملہ اسی دل کی نگہبانی کی انتہائی بلیغ اور پیغمبرانہ تعبیر ہے، امام العرفاء سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختصر جملے سے احسان یا تصوف کی پوری حقیقت بیان فرمادی ہے کیوں کہ راہِ تصوف کے تمام جہد وعمل، ذکر وفکر، محاسبہ ومراقبہ وغیرہ کا منشاء ومقصد یہی ہے کہ دل مشاہدہ وحضور کی متاعِ عزیز سے ہم کنار ہو جائے۔

تصوف کی مستند کتابوں مثلاً قوت القلوب از شیخ ابوطالب مکی، طبقات الصوفیہ از شیخ عبدالرحمٰن سلمی، حلیۃ الاولیا از ابونعیم اصفہانی، الرسالۃ القشیریۃ از امام قشیری — کشف المحجوب از شیخ علی بن عثمان ہجویری مدفون لاہور، تذکرۃ الاولیاء از شیخ فریدالدین عطار، عوارف المعارف از شیخ سہروردی، فوائد الفواد ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاء، خیرالمجالس ملفوظات شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی وغیرہ کے صفحے کے صفحے الٹ جایئے صرف زبانی ہی نہیں بلکہ عملاً بھی کتاب وسنت کی تلقین ملے گی، اور معتمد طور پر یہ بات واضح ہوجائے گی کہ اکابر صوفیاء کے مجاہدات، ریاضات اور مراقبات کی اساس وبنیاد قرآن وحدیث کی تعلیمات ہی ہیں، اور ان کی پاکیزہ زندگیاں اسلام کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں۔

اسلامی تعلیمات میں محبت الٰہی، مکارم اخلاق اور خدمت خلق کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے، تصوف کی تعلیمات بھی انھیں ارکانِ ثلثہ پر مبنی ہیں، تاریخی شواہد کی بنیاد پر بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرات صوفیاء ہی نے اپنی عملی جدوجہد کے ذریعہ ہر زمانے میں اسلام کے اخلاقی وروحانی نظام کو زندہ رکھا، صوفیاء سے بڑھ کر تبلیغ اور تعمیرِ سیرت کا فریضہ کسی جماعت نے انجام نہیں دیا، متکلمین، معتزلہ اور حکماء نے صرف دماغ کی آبیاری کی جب کہ صوفیاء نے دماغ کے ساتھ دل کی تربیت اور اصلاح کی اہم ترین خدمت بھی انجام دی اور یہ بات کسی بیان وتشریح کی محتاج نہیں ہے کہ اسلام میں اصلی چیز دل ہے نہ کہ دماغ اگر دل فاسد ہوجائے تو دماغ کا فاسد ہوجانا یقینی ہے، چناں چہ نبی صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”الا ان فی الجسد مضغة اذا صَلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله الا وهى القلب“ انسان کے جسم میں ایک عضو ہے اگر وہ صالح ہوجائے تو سارا جسم صالح ہوجائے اور اگر وہ فاسد ہوجائے تو سارا جسم فاسد ہوجائے، آگاہ ہوجاؤ وہ قلب ہے۔

حضرات علمائے کرام نے علمی ونظری دلائل سے اسلام کی حقانیت کو واضح کیا جب کہ حضرات صوفیاء نے اپنے اعمال واخلاق اور سیرت وکردار سے اسلام کی صداقت کو مبرہن اور آشکارا کیا، اس لیے تصوف یا طریقت شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں تصوف اسلام کا عطر اور اس کی روح ہے، لیکن کوئی انسانی تحریک خواہ وہ کتنی اچھی کیوں نہ ہو جب افراط وتفریط عمل وردعمل کا بازیچہ بنتی ہے تو اس کی شکل مسخ ہوئے بغیر نہیں رہتی، چناں چہ متکلمین نے اسلام کو یونانی فلسفہ کی زد سے بچانے میں بڑی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہیں، لیکن آگے چل

کر جب علم کلام کو شکوک وشبہات پیدا کرنے کا ذریعہ بنالیا گیا تو یہی علم کلام مسلمانوں میں ذہنی انتشار برپا کرنے کا سبب بن گیا، یہی حال تصوف کا بھی ہوا کہ تصوف کی ہمہ گیر مقبولیت اور ہر دلعزیزی دیکھ کر جاہل یا نقلی ارباب غرض صوفیوں کے بھیس میں اس جماعت صوفیہ صافیہ میں در آئے اور اپنی مقصد برآری کے لیے شریعت وطریقت میں تفریق کا نظریہ شائع کردیا، مجاز پرستی، قبر پرستی، نغمہ وسرود کو روحانی ترقی کا لازمی جزو بنادیا اور دنیا پرستی سے گریز کو رہبانیت کی شکل دیدی مگر ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ محققین صوفیا نے ہمیشہ ان گمراہیوں کے خلاف آواز بلند کی ہے، اور ان فاسد عناصر کو تصوف سے خارج کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔

اس جعلی اور غیر اسلامی تصوف کی بنا پر سرے ہی سے تصوف کا انکار کردیا جائے اور اسے نوع انسانی کے لیے بمنزلۂ افیون بتایا جائے اور الزام عائد کیا جائے کہ تصوف زندگی کے حقائق سے گریز کی تعلیم دیتا ہے اور اس نے مسلمانوں کے قوائے عمل کو مضمحل یا مردہ بنادیا ہے تو یہ سراسر ناانصافی اور اسلامی تصوف پر ظلم ہوگا۔

بدقسمتی سے خود مسلمانوں کا ایک طبقہ جو براہ راست اسلام اور اسلامی مآثر کا مطالعہ کرنے کی بجائے مستشرقین اور عیسائی مصنّفین کے واسطہ اور انھیں کی مستعار عینک سے اسلامی علوم ومعارف کو دیکھنے کا عادی ہے، اسلامی تصوف پر اسی قسم کے بیجا اور غلط اعتراضات کرتا رہتا ہے، یہ بات حق وصداقت اور انصاف وعدالت سے کس قدر بعید ہے کہ ہدفِ ملامت تو بنایا جائے اسلامی تصوف کو اور قبائح مدنظر رکھی جائیں غیر اسلامی تصوف کی، اسلام کے ان نادان دوستوں نے اپنے اس رویہ سے نہ صرف علم وتحقیق کا خون کیا بلکہ لاکھوں بندگانِ خدا کو تصوف کی حسنات وبرکات سے محروم کردیا۔ فالی اللہ المشتکی ۔

اسلام میں نکاح کی اہمیت

از: سید کمال اللہ بختیار ندوی
لکچرر شعبۂ عربی دی نیو کالج چینائی

اسلام میں نکاح کی بڑی اہمیت ہے۔ اسلام نے نکاح کے تعلق سے جو فکرِ اعتدال اور نظریۂ توازن پیش کیا ہے وہ نہایت جامع اور بے نظیر ہے۔ اسلام کی نظر میں نکاح محض انسانی خواہشات کی تکمیل اور فطری جذبات کی تسکین کا نام نہیں ہے۔ انسان کی جس طرح بہت ساری فطری ضروریات ہیں بس اسی طرح نکاح بھی انسان کی ایک اہم فطری ضرورت ہے۔ اس لیے اسلام میں انسان کو اپنی اس فطری ضرورت کو جائز اور مہذب طریقے کے ساتھ پورا کرنے کی اجازت ہے اور اسلام نے نکاح کو انسانی بقاوتحفظ کے لیے ضروری بتایا ہے اسلام نے تو نکاح کو احساسِ بندگی اور شعورِ زندگی کے لیے عبادت سے تعبیر فرمایا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے: "النکاح من سنتی" نکاح کرنا میری سنت ہے۔(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو آدھا ایمان بھی قرار دیا ہے "اِذَا تَزَوَّجَ الْعَبْدُ اِسْتَکْمَلَ نِصْفَ الدِّیْنِ فَلْیَتَّقِ فِی النِّصْفِ الْبَاقِیْ" جو کوئی نکاح کرتا ہے تو وہ آدھا ایمان مکمل کر لیتا ہے اور باقی آدھے دین میں اللہ سے ڈرتا رہے۔(۲) نکاح انبیاء کرام کی بھی سنت ہے۔ ارشاد ربانی ہے "وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِکَ وَ جَعَلْنَا لَھُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّیَّةً" (اے محمد ﷺ) ہم نے آپ سے پہلے یقیناً رسول بھیجے اور انہیں بیویوں اور اولاد سے بھی نوازا(۳)۔ اس ارشاد ربانی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام بھی صاحبِ اہل وعیال رہے ہیں۔ ارشاد نبویؐ اس طرح ہے حضرت ابوایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا رسولوں کی چار سنتیں ہیں: (۱) شرم وحیا کا خیال (۲) مسواک کا اہتمام (۳) عطر کا استعمال (۴) نکاح کا التزام(۴)۔

نکاح کی اہمیت ان احادیث سے بھی واضح ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "اے نوجوانو! تم میں سے جو نکاح کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے اسے نکاح کر لینا چاہئے کیونکہ نکاح نگاہ کو نیچا رکھتا ہے اور شرمگاہ کی حفاظت کرتا ہے (یعنی نظر کو بھکنے سے اور جذبات کو بے لگام ہونے سے بچاتا ہے) اور جو نکاح کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا ہے اسے چاہئے کہ شہوت کا زور توڑنے کے لیے وقتاً فوقتاً روزے رکھے(۵)۔ اسی طرح ایک مرتبہ جب بعض صحابہ کرام نے عبادت وریاضت میں یکسوئی ودلچسپی کے پیشِ نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قوت شہوت کو ختم کر دینے کی خواہش ظاہر کی تو آنحضرت ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا اور شادی نہ کرنے کو زندگی سے فرار اختیار کرنا قرار دیا۔ اس لیے کہ اسلام زندگی سے فرار کی راہ کو بالکل ناپسند کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے: "وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَتْقَاکُمْ لَہٗ وَلٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّیْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ" بخدا میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ اس کی ناراضگی سے بچنے والا ہوں (لیکن میرا حال) یہ ہے کہ میں کبھی نفل روزے رکھتا ہوں اور کبھی بغیر روزوں کے رہتا ہوں راتوں میں نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں (یہ میرا طریقہ ہے) اور جو میرے طریقے سے منھ موڑے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔(۶)

انسان کسی قدر آرام طلب واقع ہوا ہے اور فطری طور پر راحت وسکون کا محتاج ہے اور اسی طرح فطری جذبات اور انسانی خواہشات کو پورا کرنے کا مزاج رکھتا ہے۔ راحت ومسرت سکون و اطمینان اس کی فطرت میں داخل ہیں۔ انسان کو اپنے مقصد تخلیق میں کامیاب ہونے عبادت میں یکسوئی ودلچسپی پیدا کرنے بندوں کے حقوق کو اچھی طرح ادا کرنے اور اپنے متضاد جبلی اوصاف کو صحیح رخ پر لانے کے لیے نکاح انسان کے حق میں نہایت مؤثر ذریعہ اور کارآمد طریقہ ہے۔ اللہ نے نکاح میں انسان کے لیے بہت سے دینی ودنیاوی فائدے رکھے ہیں۔ مثلاً معاشرتی فائدے خاندانی فائدے اخلاقی فائدے سماجی فائدے نفسیاتی فائدے غرضیکہ فائدوں اور خوبیوں کا دوسرا نام نکاح ہے۔

انسان کو نکاح کے ذریعہ صرف جنسی سکون ہی حاصل نہیں ہوتا بلکہ قلبی سکون ذہنی اطمینان غرض کہ ہر طرح کا سکون میسر ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے "ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَفْسٍ

"وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنهَا زَوجَهَا لِيَسكُنَ اِلَيهَا" وہی اللہ ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور پھر اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنادیا تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے (۷)۔اس آیت سے عورت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ عورت مرد کے حق میں ایک انمول تحفہ ہے اور مرد کے لئے باعث سکون واطمینان ہے لہٰذا جو مرد عورت کی قدر کرتا ہے وہ کامیاب اور پرسکون زندگی گزارتا ہے۔اگر انسان نکاح سے جو انسانی فطری ضرورت ہے منہ موڑنے کی کوشش کرتا ہے تو انسان کو خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔نکاح کے بغیر سارا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے۔تاریخ میں چند استثنائی صورتوں اور چند مذہبی لوگوں کے افکار کے علاوہ دنیا میں ہمیشہ تمام انسان ہر زمانے میں شادی کو اہم ضرورت تسلیم کرتے آئے ہیں تاریخ کی روشنی میں شادی سے مستثنیٰ کبھی کوئی قوم مذہب اور ملت نہیں رہے ہیں۔ہر مذہب وملت میں مقررہ مراسم اور رواجات کے بغیر تعلقات مرد وعورت برے اور اخلاق سے گرے ہوئے سمجھے گئے ہیں اگرچہ ہر مذہب وملت میں شادی کے طور طریقے رسم ورواج الگ الگ رہے ہیں بہر حال شادی کی اہمیت پر سب متفق ہیں۔

نکاح کے متعلق بعض مذاہب اور اہلِ مغرف کے افکار

آگے اجمالی طور پر ان مذاہب کے افکار کو پیش کیا جارہا ہے جنھوں نے شادی کو غیر اہم بتایا ہے اور شادی سے انکار کیا ہے بعض مذاہب کے بعض لوگوں نے رہبانیت کے چکر میں پھنس کر شادی کو روحانی اور اخلاقی ترقی میں رکاوٹ مانا ہے تجرد رہنے اور سنیاس لینے (یعنی شادی نہ کرنے) کو اہم بتایا ہے اسی طرح روحانی واخلاقی ترقی کیلئے انسانی خواہشات مٹانے اور فطری جذبات دبانے کو ضروری قرار دیا ہے۔ان لوگوں کے نظریات وافکار نہ صرف فطرتِ انسانی کے خلاف ہیں بلکہ نظامِ قدرت کے بھی خلاف ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب رقم طراز ہیں: ''رہبانیت کا تصور آپ کو عیسائیوں میں بھی نظر آئے گا اور ہندوؤں میں بھی۔دنیا کے اور بھی مذاہب ہیں جیسے بدھ مت جین مت ان میں بھی یہ تصور مشترک ملے گا کہ نکاح اور گھر گرہستی کی زندگی روحانیت کے اعتبار سے گھٹیا درجہ کی زندگی ہے۔اس اعتبار سے ان مذاہب میں اعلیٰ زندگی تجرد کی زندگی ہے۔شادی بیاہ کے بندھن کو یہ مذاہب کے بعض لوگ روحانی ترقی کے لئے رکاوٹ قرار دیتے ہیں مرد ہو یا عورت دونوں کے لئے تجرد کی زندگی کو ان کے ہاں روحانیت کا اعلیٰ وارفع مقام دیا جاتا ہے نکاح کرنے والے ان مذاہب کے

نزدیک ان کے معاشرہ میں دوسرے درجہ کے شہری (Second rate Citizens) شمار ہوتے ہیں چونکہ شادی بیاہ میں پڑ کر انھوں نے اپنی حیثیت گرادی ہے'' (۸)

چنانچہ جن لوگوں نے شادی کرنے کو غلط قرار دیا ہے اور عورت سے دور رہنے کا درس دیا ہے اور روحانی ترقی کے لئے ایسا کرنا ناگزیر بتایا ہے آخر کار وہی لوگ انسانی خواہشات اور فطری جذبات سے مغلوب ہو کر طرح طرح کی جنسی خرابیوں اور اخلاقی برائیوں کے مرتکب ہوئے ہیں حتیٰ کہ فطرت کے خلاف کاموں تک میں ملوث ہوئے ہیں اور برے نتائج اور تباہ کن حالات سے دوچار ہیں۔

اسی طرح عصرِ حاضر میں خصوصاً بعض اہلِ مغرب اور مغرب زدہ لوگوں نے بھی شادی کو غیر اہم بتایا ہے اور شادی سے انکار کردیا ہے۔ان کے بے ہودہ نظریات کے مطابق انسان ہر طرح کی آزادی کا حق رکھتا ہے اور اسے اپنے فطری جذبات کو جیسا چاہے ویسا پورا کرنے کا اختیار حاصل ہے۔اس معاملہ میں انسان کسی قسم کی روک ٹوک اسی طرح شادی جیسی کوئی پابندی اور بندھن کا قائل نہیں ہے۔ان کے ہاں شادی کا تصور ہے بھی تو اس کا مقصد صرف جنسی خواہشات کا پورا کرنا رنگ رلیاں منانا، موج مستی کرنا اور سیر وتفریح کرنا پھر ایک مقررہ وقت اور مدت کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہوجانا ہے۔مغربی ممالک کے لوگ خصوصاً اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے دنیا کے دیگر ممالک کے افراد عموماً مرد کے لئے عورت دوست اور عورت کے لئے مرد دوست (Boy friend, Girl friend) نظریے کے تحت بے حیائی بے شرمی کے شکار ہیں۔عاشق ومعشوق کی حیثیت سے بے حیا وبے شرم بن کر زندگی گزارتے ہیں ایشیائی ممالک میں تو بعض بیوقوف اور کم عقل لوگ اخلاق سوز فلموں اور بے ہودہ ٹی وی پروگراموں کی بدولت عشق کی خاطر جان دینے اور جان لینے کی احمقانہ باتیں اور عقل کے خلاف حرکتیں بھی کرتے ہیں۔اہلِ مغرب اور مغرب زدہ لوگوں نے شادی کو ایک کھیل تماشا بنا کر رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے مغربی ممالک میں گھر گرہستی کا تصور ختم ہوگیا ہے۔خاندان اور اقارب کا نام ونشان مٹ گیا ہے۔ماں باپ اور بچوں کے درمیان کوئی تعلق قائم نہیں رہ گیا ہے۔اس سنگین صورت حال سے خود مغربی ممالک کے سنجیدہ اور غیور لوگ بہت پریشان ہیں اور غور وفکر کررہے ہیں کہ کس طرح ان تباہ کن حالات اور انسانیت سوز ماحول پر قابو پایا جائے اور سوسائٹی کو ان برائیوں اور خرابیوں سے محفوظ رکھا جائے۔

اسلامی طریقۂ نکاح میں تمام مسائل ومصائب کا حل

ان تمام مسائل کا حل اور تمام مصائب کا علاج صرف اسلام میں موجود ہے۔ اس لیے کہ اسلام دینِ فطرت اور دینِ اعتدال ہے۔ ارشاد ربانی ہے "فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ" یہ فطرت (یعنی فطری جذبات) اللہ کی طرف سے ہے۔ اس فطرت پر انسان قائم رہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کرے(۹)۔ ہر انسان اپنے فطری جذبات اور انسانی خواہشات کو پورا کرنے پر مجبور ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ اگر انسان نکاح سے فرار اختیار کرتا ہے اور جائز و مذہب طریقے پر اپنی فطری خواہشات کو پورا نہیں کرتا ہے تو ناجائز اور غیر مہذب طریقے پر پورا کرنے لگتا ہے اور ہر طرح کی برائی و بے حیائی کا شکار ہوجاتا ہے۔ لہٰذا جو کوئی بھی اللہ کی قائم کی ہوئی فطرت سے بغاوت کرتا ہے تو وہ خود تو تباہ و برباد ہوتا ہی ہے لیکن دوسروں کو بھی تباہ و برباد کردیتا ہے اور اس سے دنیا میں فتنہ وفساد پھیل جاتے ہیں یعنی لاوارث معصوم بچوں کے مسائل اور اسقاطِ حمل جیسے اخلاق سوز واقعات ہونے لگتے ہیں۔ جیسا کہ مغربی سوسائٹی کے لئے یہ مسائل پریشانی کا باعث اور سر کا درد بنے ہوئے ہیں یورپ وامریکہ میں بہت سے لوگ ان سنگین حالات اور مسائل سے دوچار ہیں اور ان ممالک میں بہت سارے لوگ لاوارث کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔

اسی بنا پر اسلام نے نکاح کو اس قدر اہم بتایا ہے اور مرد اور عورت کو نکاح کے مہذب بندھن میں باندھنا لازمی سمجھا ہے اس لئے کہ نکاح خاندان کو وجود بخشتا ہے۔ سماج کا تصور دیتا ہے۔ گھر گرہستی کا نظام قائم کرتا ہے۔ اسلام نکاح کے ذریعہ نسل آدم کا تسلسل کے ساتھ صحیح طریقہ پر افزائش چاہتا ہے اور اس میں کسی بھی طرح کے انقطاع کو ناپسند کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: "وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا وَّجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا وَّکَانَ رَبُّکَ قَدِیْرًا" وہی اللہ ہے جس نے انسان کو پانی (یعنی ایک قطرہ بوند) سے پیدا کیا (اور اس کے ذریعہ) نسل آدم کو چلادیا اور اسے خاندان اور سسرال والا بنادیا اور تمہارا رب واقعی بڑی قدرت والا ہے(۱۰)۔ اسی طرح اسلام انسانی زندگی کو اللہ کی بندگی اور اسوۂ نبوی ﷺ میں ڈھلی ہوئی دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام نکاح کو روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے رکاوٹ نہیں بلکہ ترقی کی شاہراہ قرار دیتا ہے۔ روحانیت اور اخلاق میں سب سے اونچا مقام اور بلند معیار انبیاء کرام کا ہوتا ہے اور انبیاء کرام کے تعلق سے ذکر کیا

جاچکا ہے کہ انبیاء کرام شادی شدہ اور بال بچے والے رہے ہیں۔ انسان کو نکاح کے بعد گھر کی ذمہ داریوں کو نبھانے میں اور انسانی حقوق کے ادا کرنے میں جو پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں اگر انسان ان حقوق و ذمہ داریوں کو اسلامی تعلیمات اور اسوۂ نبوی ﷺ کی روشنی میں ادا کرتا ہے تو اسلام کی نظر میں نکاح خود انسان کے حق میں روحانی اور اخلاقی ترقی کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے ایک طرف رہبانیت کو روا نہیں رکھا ہے تو دوسری طرف انسان کو بے لگام بھی نہیں چھوڑ دیا ہے۔ اسلام انسان کی زندگی میں اعتدال و توازن پیدا کرتا ہے اور اسلام کے فکر اعتدال اور نظریۂ توازن میں انسان ہی کی خیر خواہی و بھلائی ہے۔ اسلام نے نکاح کے سلسلہ میں اعتدال و توازن کا جو جامع فکری و عملی نظریہ پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

اسلام میں نکاح کو انجام دینے کیلئے چند اہم امور

مندرجہ ذیل امور میں سے چند کو تفصیل کے ساتھ اور چند کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے اور وہ چند امور اس طرح ہیں۔ ایجاب وقبول دو گواہوں کی موجودگی، نکاح میں عورت کے لئے ولی (سرپرست) کا موجود ہونا، نکاح کا اعلان، دعوتِ ولیمہ، مہر کی ادائیگی اور خطبۂ نکاح۔ اگر ان امور پر غور وفکر سے کام لیا جائے تو یہ بات خود بخود واضح ہوجاتی ہے کہ یہ امور عبادت ہونے کے ساتھ ساتھ کس قدر دعوتِ فکر وعمل اور باعثِ ثواب ہیں۔

ایجاب و قبول:

ایجاب سے مراد ہے ایک فریق (یعنی دلہے) کی طرف سے نکاح کے معاملہ میں پیش کش اور قبول سے مراد ہے دوسرے فریق (یعنی دلہن) کی طرف سے اس پیش کش پر رضامندی غرض کہ فریقین کا نکاح پر خوشی سے رضامند ہوجانا ایجاب وقبول کہلاتا ہے۔

ایجاب وقبول نکاح کے لئے شرط ہے اسلام میں کسی مرد یا عورت کی مرضی واجازت کے بغیر نکاح قرار نہیں پاسکتا چنانچہ ارشادِ ربانی ہے "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْهًا" اے ایمان والو تم کو حلال نہیں کیا کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ(۱۱)۔ لفظ کرہا کا اطلاق بہت سے معنوں میں ہوتا ہے مثلاً زور زبردستی جبر دباؤ وغیرہ۔ اسی طرح کسی مرد کا نکاح کسی عورت سے اس کی مرضی واجازت کے بغیر نہیں ہوسکتا چونکہ عموماً عورت باختیار نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے عورت کی اجازت ومرضی کا ذکر وضاحت سے کردیا گیا ہے اور اس سے بتانا مقصود

ہے کہ اسلام نے نکاح میں عورت کو رضامندی پسند ناپسند کا پورا حق دیا ہے۔

دو گواہ:

نکاح میں دو گواہ کا موجود ہونا بھی شرط ہے۔ نکاح میں شہادت نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ اس سے بدکاری بے حیائی کا راستہ بند ہوجاتا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ "اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَلْبَغَایَا الَّتِیْ یُنْکِحْنَ اَنْفُسَھُنَّ بِغَیْرِ بَیِّنَۃٍ" عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورتیں چوری چھپے نکاح کرلیں وہ حرام کار ہیں (۱۲)۔

ولی کی اہمیت:

عورت کے لئے نکاح میں رضامندی کے ساتھ ولی (سرپرست) کا ہونا بھی ضروری ہے۔ عورت کا نکاح بغیر ولی کے نہیں ہوسکتا چنانچہ ارشاد نبوی ﷺ ہے "عَنْ اَبِیْ مُوْسٰیؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ لَا نِکَاحَ اِلَّا بِوَلِیٍّ" حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ولی کے بدون نکاح نہیں (۱۳)۔ عورت کا شرف اور مقام اسی میں ہے کہ وہ کسی کی سرپرستی میں نکاح کرے۔ اس طرح بہت سی سماجی اور معاشرتی خرابیاں دور ہوجاتی ہیں۔ اس میں بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ اگرچہ نکاح کرنے یا نہ کرنے کا اختیار پورا عورت کو حاصل ہے ولی اس کی مرضی اور رائے کے بغیر نکاح نہیں کرسکتا۔

اعلانِ نکاح:

اسی طرح اسلام نے نکاح میں اعلان وتشہیر کی تعلیم دی ہے۔ نکاح کا اعلان کرنا اور مسجد میں نکاح کرنا سنت ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے "اِعْلِنُوْا ھٰذَا النِّکَاحَ وَاجْعَلُوْہُ فِی الْمَسَاجِدِ" (۱۴)۔ نکاح کا اعلان کرو اور مسجدوں میں نکاح کرو۔ اس کا بنیادی مقصد نکاح کو عام کرنا اور نسب کو ثابت کرنا ہے۔

ولیمۂ مسنون:

دولہا اپنی شادی کی خوشی وشادمانی کے موقع پر جو دعوت دیتا ہے اسے ولیمہ کہا جاتا ہے اور ولیمہ کرنا سنت ہے۔ ولیمہ شوہر کے ذمہ ہے اور دعوت ولیمہ نکاح کے بعد ہے۔ مولانا عتیق احمد بستوی صاحب رقم طراز ہیں "دعوتِ ولیمہ زن وشوہر کی پہلی ملاقات کے بعد کی جاتی ہے۔ اس میں بے شمار مصلحتیں ہیں۔ اس سے شائستہ طور پر نئے رشتے کی تشہیر ہوتی ہے۔ عورت اور اس کے

اہلِ خاندان کا اعزاز ہوتا ہے ایک قابلِ قدر نئی نعمت کے ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا ہوتا ہے" (۱۵)۔ آنحضرت ﷺ نے ولیمہ نکاح کے دوسرے دن کیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے جب آنحضرت ﷺ سے اپنے نکاح کا ذکر کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاۃٍ" ولیمہ کرو اگرچہ ایک بکری کا ہی کیوں نہ ہو (۱۶)۔ لہٰذا نکاح کے دوسرے یا تیسرے دن ولیمہ کرنا مناسب اور سنت ہے۔ چاروں فقہی مسالک میں ولیمہ کا مستحب وقت عقد کے بعد ہے (۱۷)۔ ولیمہ اپنی حیثیت کے مطابق کیا جاسکتا ہے۔ قرض تکلف اسراف اور نمائش سے اجتناب ضروری ہے۔ ولیمہ کی دعوت میں اقارب احباب اور دیگر لوگوں کو بلانے کی گنجائش ہے۔ اپنی طاقت اور حیثیت سے بڑھ کر خرچ کرنا خلافِ شریعت ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسراف اور غیرضروری اخراجات سے اپنا دامن بچاتے ہوئے تکلّفات اور لوازمات سے بچتے ہوئے ولیمہ کی دعوت حیثیت کے مطابق کی جاسکتی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر حضرت انسؓ سے فرمایا تھا کہ جاؤ فلاں فلاں کو دعوت ولیمہ میں بلالاؤ (۱۸)۔ حضرت علیؓ کا نکاح جب حضرت فاطمہؓ سے ہوا تو ان کے ولیمہ میں صرف کھجور اور منقیٰ پیش کیا گیا اور سادہ پانی پلایا گیا (۱۹)۔ دعوت ولیمہ کے تعلق سے ارشاد رسول ﷺ ہے "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذْ دُعِیَ اِلَی الْوَلِیْمَۃِ فَلْیَاْتِھَا" نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کو ولیمہ کی دعوت دی جائے تو اس میں ضرور شرکت کرے (۲۰)۔ نیز فرمایا جو شخص دعوتِ ولیمہ بلاعذر قبول نہ کرے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کیا (۲۱)۔ آنحضرت ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "بدترین کھانا اس ولیمہ کا کھانا ہے جس میں فقط مالدار لوگوں کو بلایا جائے اور غریبوں کو نظر انداز کردیا جائے" (۲۲)۔ عموماً ایسا کیا جاتا ہے۔ اس سے بچنا ضروری ہے ورنہ نکاح اور ولیمہ کی برکات وفیوضات سے محرومی یقینی ہے۔

مہر کی ادائیگی:

نکاح میں مہر کا ادا کرنا واجب ہے۔ مہر عورت کا شرعی حق ہے۔ مہر اس رقم کو کہا جاتا ہے جو مرد شادی کے پرمسرت موقع پر خوشی سے اپنی ہونے والی بیوی کو تحفہ کی شکل میں دیتا ہے۔ مہر اسلام کے سوا کسی مذہب یا قوم میں نہیں ہے۔ ارشاداتِ ربانی یوں ہیں "وَآتُوا صَدُقٰتِھِنَّ نِحْلَۃً" اور دے ڈالو عورتوں کو مہر ان کے خوشی سے (۲۳)۔ "وَآتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" بہتر طریقے سے ان کے مہر ادا کرو (۲۴)۔

آنحضرت ﷺ نے ایسے مرد کو جو مہر زیادہ سے زیادہ مقرر کرتا ہے اور پھر اسے نہ ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے نہ صرف گناہ گار بتایا ہے بلکہ زانی قرار دیا ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے "أيُّما رَجُلٍ تَزَوَّجَ اِمْرَأَةً عَلَى صَدَاقٍ وَلَا يُرِيْدُ اَنْ يُعْطِيَهَا فَهُوَ زَانٍ" آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے مہر کے بدلے نکاح کرتا ہے مگر وہ اسے ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے تو وہ زانی ہے (۲۵)۔ امام نوویؒ نے مہر کو نکاح کا جز لاینفک قرار دیا ہے اور اس کے بغیر ازدواجی تعلقات کو ناجائز بتایا ہے (۲۶)۔

مہر کی ادنیٰ رقم دس درہم یا اس کے بقدر قیمت ہے۔ قیمت کا اعتبار عقد کے وقت کا ہوگا ادائیگی کے وقت کا نہیں (۲۷) اور مہر میں زیادہ سے زیادہ کی کوئی تعیین نہیں ہے۔ شوہر کی حیثیت اور آمدنی پر انحصار ہے۔ اگر زیادہ مہر باندھتا ہے تو اسے ادا کرنا ضروری ہے۔ مہر کی فوری ادائیگی مناسب اور مستحب ہے یا کچھ مدت کے بعد کا بھی جواز ہے۔ ان دونوں صورتوں کو اسلام کی اصطلاح میں اول الذکر کو مہر معجّل کہا جاتا ہے اور آخر الذکر کو مہر موَجل کہتے ہیں۔ مہر کے تعلق سے مولانا محمد شہاب الدین ندویؒ لکھتے ہیں "مہر کے نام سے عورت کو جو تھوڑی بہت رقم ملتی ہے وہ اس کی خدمات کا پورا پورا صلہ تو نہیں ہوسکتی ہاں البتہ اس کی وحشت دور کرنے کی راہ میں ایک درجہ میں باعث اطمینان ہوسکتی ہے۔ شریعت نے اگرچہ کم سے کم مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی ہے مگر زیادہ کی حد بھی مقرر نہیں کی ہے۔ اس میں حکمت عملی یہ معلوم ہوتی ہے کہ مہر مرد کی مالی اور اقتصادی حالت کے مطابق ہو لہٰذا اگر کوئی صاحب حیثیت اپنی منکوحہ کو ہزاروں بلکہ لاکھوں روپئے بھی دے دے تو وہ جائز ہوگا قرآن میں ڈھیر سارا مال دینے کا تذکرہ بھی موجود ہے" (۲۸)۔

اس لئے مہر فاطمی بہت مناسب مہر ہے۔ اس کی مقدار چار سو مثقال چاندی ہے یعنی ایک کیلو سات سو گرام چاندی جس کی قیمت لگ بھگ بارہ ہزار روپئے ہوتی ہے (۲۹)۔ مہر نقد بھی ادا کیا جاسکتا ہے اور زیور کی شکل میں بھی دیا جاسکتا ہے (۳۰)۔ بیوی کی مرضی اور خواہش پر ہے۔ حضرت عمرؓ کے ارشاد سے بھی مہر میں اعتدال وتوازن کا نکتہ سامنے آتا ہے "اے لوگو! عورتوں کے بھاری بھاری مہر نہ باندھنا اس لیے کہ اگر دنیا میں یہ کوئی شرف وعزت کی چیز ہوتی اور اللہ کی نگاہ میں اچھا فعل ہوتا تو اس کے سب سے زیادہ حقدار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ اوقیہ سے زیادہ پر کسی عورت سے نکاح کیا ہے یا اپنی لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کا نکاح کیا ہے" (۳۱)۔

ایک اوقیہ کی مقدار دس تولہ چاندی کے برابر ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صرف اُم حبیبہؓ کا مہر زیادہ باندھا تھا، اس لیے کہ ان کا مہر حبش کے بادشاہ نجاشی نے مقرر کردیا تھا (۳۲)۔ لوگ خاندانی شرافت وعزت کی بنا پر جھوٹی شان دکھانے کی خاطر بھاری بھاری مہر مقرر کردیتے ہیں اور ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتے ہیں اس لئے حضرت عمرؓ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ہاں اگر کوئی واقعی صاحب حیثیت ہے زیادہ سے زیادہ مہر ادا کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو مضائقہ نہیں ہے۔

آج برِصغیر ہندوپاک اور بنگلہ دیش میں مسلم گھرانے لڑکیوں کے سلسلے میں جوڑے جہیز اور بہت ساری رسومات کی بنا پر پریشان ہیں تو اسلامی ممالک میں مسلم گھرانے لڑکیوں کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ مہر مقرر کرکے غیرضروری پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں خاص طور پر عرب ممالک میں جو جتنا زیادہ مہر باندھتا ہے اتنی جلدی نکاح کرسکتا ہے بسا اوقات نکاح کا انحصار مہر کے زیادہ مقرر ہونے پر ہے جس کی وجہ سے بہت سارے مرد شادی سے محروم ہیں۔

❀ ❀ ❀

حوالے وحواشی:

(۱) بخاری کتاب النکاح باب الترغیب فی النکاح۔

(۲) مشکوٰۃ المصابیح کتاب النکاح۔

(۳) الرعد: ۳۸۔

(۴) ترمذی بحوالہ اسلامی معاشرہ، ص: ۶۰ مولانا یوسف اصلاحیؒ۔

(۵) بخاری کتاب النکاح باب قول النبیؐ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ۔

(۶) بخاری بحوالہ اسلامی معاشرہ، ص: ۶۳ مولانا یوسف اصلاحیؒ۔

(۷) اعراف: ۱۸۹۔

(۸) نکاح ایک اصلاحی تحریک، ص: ۳۸ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب۔

(۹) الروم: ۳۰۔

(۱۰) الفرقان: ۵۴۔

(۱۱) النساء: ۱۹۔

(۱۲) ترمذی بحوالہ معارف الحدیث، ج: ۷، ص: ۲۰۔

(۱۳) ابوداؤد بحوالہ معارف الحدیث، ج: ۷، ص: ۱۸۔

(۱۴) ترمذی کتاب النکاح باب ماجاء فی اعلان النکاح۔

(۱۵) بحوالہ اسلامی نکاح، ص: ۱۰، ناشر جمعیۃ شباب الاسلام۔

(۱۶) بخاری کتاب النکاح باب ”کیف یدعی للمتزوج“

(۱۷) ”الفقه علی المذاهب الاربعة“ ج:۲،ص:۳۳،بحوالہ شادی کے شرعی اور غیرشرعی طریقے،ص:۳۰شمس پیرزادہؒ۔

(۱۸) بخاری۶/۱۴۰۔

(۱۹) ابن ماجہ۱/۶۱۶۔

(۲۰) بخاری ومسلم۔

(۲۱) بخاری کتاب النکاح باب حق الولیمہ والدعوة۔

(۲۲) مسلم کتاب النکاح باب الامر باجابة الداعی الی الدعوة۔

(۲۳) نسار:۴۰۔

(۲۴) نسار:۲۵۔

(۲۵) سنن کبریٰ۷/۲۴۱۔

(۲۶) اوجزالمسالک،ج:۹،ص:۲۸۹۔

(۲۷) ہدایة باب المہر۔

(۲۸) بحوالہ نکاح کتنا آسان اور کتنا مشکل،ص:۳۰۔

(۲۹) تحفة الاحوذی بشرح ترمذی،ج:۴،ص:۲۵۶۔

(۳۰) شادی کے شرعی اور غیرشرعی طریقے،ص:۲۴شمس پیرزادہؒ۔

(۳۱) ترمذی،بحوالہ حسنِ اخلاق دہلی اگست ۱۹۹۵ء،ص:۲۹۔

(۳۲) عون المعبود،ج:۲،ص:۱۰۵۔

❁ ❁ ❁

ضروریات دین ہر مسلمان کی پہچان ہے

مرتب: مولانا ابوعثمان میانوالوی

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم .

کلمه طیبه: لآ اله الاّ اللّٰه محمّد رّسول اللّٰه (پ۲۶ع۶/۱۲)

کلمہ شہادت کا ترجمہ: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں (ذات، صفات وحقوق میں) اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے (معزز) بندے اور (آخری) رسول ﷺ ہیں۔

استغفار: استغفر اللّٰه ربّی من کلّ ذنب واتوب الیه.

ترجمہ: میں اللہ سے ہر گناہ کی معافی چاہتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔ (ایک تسبیح استغفار روزانہ پڑھنا سنت نبویؐ ہے)

متفقہ اذان سنت: وہی ہے جو اللہ اکبر سے شروع ہوتی اور لآ اله الاّ اللّٰه پر ختم ہوتی ہے۔ البتہ اہل سنت حکم نبوی کے مطابق اذان فجر میں الصّلوٰة خیرمّن النّوم اور امامیہ بحکم امام حی علی خیر العمل دو دو مرتبہ کہتے ہیں بقیہ اضافے قرآن وحدیث اور کسی فقہ میں نہیں ہیں۔

اہل بیتؓ پر افضل درود شریف یہ ہے:

اللّٰهُمّ صلّ علی محمدنِ النّبی الامّی و ازواجه امّهات المؤمنین و ذرّیته و اهل بیته کما صلّیت علی ابراهیم و علی آل ابراهیم انّك حمید مّجید. (ابوداؤد)

یہ وہی درود ہے جو فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کے اہل بیت حضرت سارہؓ پر پڑھا۔ کوئی بھی درود مسنون پڑھنے سے دس رحمتیں ملتی ہیں۔ دس گناہ معاف ہوتے ہیں اور دس درجے بلند ہوتے ہیں۔ قیامت کے دن آپ ﷺ کا قرب اور شفاعت نصیب ہوگی۔

تسبیح فاطمی: ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھے۔

ضروریات ایمان: اپنی مرضی سے تمام امور شرعیہ کا زبانی اقرار، دل سے تصدیق، حقائق غیبیہ کو ماننا، علم غیب کو خاصہ خداوندی جاننا، خدا سے خوف و امید رکھنا، اسے تمام کائنات کا خالق و مالک مختار رازق، کارساز معبود اور مستعان و رب ماننا، حلال وحرام کو قطعی ماننا، ایمان بسیط ہے۔ اعمال صالحہ اس کا نور حسن اور کمال ہیں۔ بغیر ایمان قبول نہیں اسلئے محدثین ان کو اجزاء ایمان کہتے ہیں۔

ایمانیات کے اصل عقائد تین ہیں

(۱) توحید، (۲) رسالت، (۳) قیامت۔

توحید: اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی دائمی زندہ اور کائنات کو سنبھالنے والا ہے۔ اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ آسمان اور زمین کی ہر چیز اسی کی ہے۔ ایسا کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے؟ وہی مخلوقات کے سب اگلے پچھلے حالات کو جانتا ہے۔ وہ سب کسی چیز کے متعلق خدا کے علم سے کچھ نہیں جان سکتے ہاں جتنا وہ چاہے (کسی کو بتا دے) اور اس کی کرسی اور اقتدار نے سب زمینوں اور آسمانوں کو اپنے قبضے میں لیا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے لئے ان کی حفاظت کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ وہی عالی شان بڑی بزرگی والا ہے۔ (آیت الکرسی) جو ہر نماز کے بعد پڑھنا سنت ہے۔ ۲۔ بے شک اللہ کے پاس ہی قیامت کا علم ہے وہی بارش برساتا ہے۔ وہی جانتا ہے جو ماؤں کے پیٹ میں ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس نے کل کیا کرنا ہے اور کہاں مرے گا۔ بے شک اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ (لقمان پارہ:۲۱ آخری آیت)

رسالت محمدی ﷺ

۱- آپ ﷺ کہہ دیجئے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ (پ۹/۱۰ع)

۲- ہم نے آپ ﷺ کو سب جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ (پ۱۷/۷ع)

۳- بابرکت ہے وہ ذات جس نے قرآن اپنے بندے پر اتارا تاکہ وہ تمام جہانوں کو ڈرائے۔ (پ۱۸/۱۷ع)

۴- اے نبی ﷺ ہم نے آپ کو گواہی دینے والا خوشخبری سنانے والا اللہ کی طرف بلانے والا ہدایت کا آفتاب عالمتاب بنا کر بھیجا ہے۔ (پ۲۲/۳ع)

۵- اللہ نے مومنین پر بہت بڑا احسان کیا کہ ایک عظیم پیغمبر ان میں ان کی قوم سے ہی کھڑا کردیا جو ان کو خدا کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو (کفر، شرک، نفاق، عیوب، گناہوں سے) پاک کرتا ہے اور ان کو قرآن وسنت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ (پ۴/۸ع)

روز جزاء یعنی قیامت (خدا جنت عطا کرے، دوزخ سے بچائے)

۱- اور جب زمین میں زلزلہ آئے گا اور وہ سب بوجھ (مردے) باہر نکال دے گی اس دن زمین اپنے حالات بتائے گی کیونکہ رب نے اسے وحی کی ہوگی اس دن لوگ گروہ در گروہ لوٹیں گے تاکہ ان کو اپنے اپنے اعمال دکھائے جائیں۔ پس جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی اسے دیکھ لے گا۔ (پ۳۰ زلزال)

۲- قیامت آرہی ہے میں اسے مخفی رکھوں گا تاکہ ہر جی کو کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ (پ۱۶/۱۰ع)

۳- کیا انسان کا گمان ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہ کریں گے کیوں نہیں ہم تو اس کے پور پور جمع کرنے پر قادر ہیں۔ (پ۲۹ قیامۃ)

قبر قیامت کی پہلی منزل ہے اس میں سوال وجواب آرام وعذاب برحق ہے۔ جو دیکھا سنا نہیں جاسکتا گنہگار مسلمانوں کو نیکوں کی سفارش کا فائدہ جنت میں ہوگا اہل ایمان خدا تعالیٰ کی بے کیف زیارت کریں گے دوزخی ہمیشہ جلیں گے اللہ ہمیں بچائے۔

عقائد، اعمال، اخلاق

نیکی صرف اتنی نہیں کہ اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو (نماز پڑھ لو) لیکن بڑی نیکی اس کی ہے جو اللہ پر یقین کرے اور قیامت کے دن پر یقین کرے، فرشتوں پر آسمانی کتابوں پر اور پیغمبروں پر یقین لائے، اور رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور مانگنے والوں کو محبوب مال دے اور قیدیوں کو چھڑانے میں، نماز کی پابندی کرنے میں اور زکوۃ دینے میں اچھی طرح کاربند رہتا ہو اور جو لوگ جب عہد کریں تو اسے پورا کرنے والے ہوں تنگدستی اور بیماری کو برداشت کرنے والے ہوں جنگ وجہاد میں ڈٹے رہنے والے ہوں یہی لوگ تو سچے اور یہی لوگ تو متقی ہیں۔ (پ۲/۶ع)

چار آسمانی کتابیں: (۱) توراۃ، (۲) انجیل، (۳) زبور، (۴) قرآن مقدس۔

چار مقرب فرشتے: (۱) جبرائیل، (۲) میکائیل، (۳) اسرافیل، (۴) عزرائیل۔

فرائض اسلام

کلمہ توحید ورسالت کا زبان سے اقرار کرے، نماز پانچ اوقات میں پابندی سے پڑھے۔ (فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء) نماز سب سے بڑی عبادت ہے کفر واسلام میں بڑا فرق نماز سے ہے اور اس کو اگر ادا نہ کیا جائے تو سخت گناہ ہے۔

۳- **روزہ** رمضان میں فرض ہے اور باقی نذر، کفارہ، قضاء کے روزے بھی ضرور رکھئے۔

۴- **زکوٰۃ** ضروریات اصلیہ کے علاوہ بقدر نصاب بچت مال پر ۱/۴۰ اور بارانی زمین پر ۱/۱۰ اور آبی زمین پر ۱/۲۰ عشر نکالنا فرض ہے۔

۵- **حج** صاحب استطاعت پر زندگی میں ایک بار حج فرض ہے۔ حج کیلئے جب گیا تو زیارت روضہ نبویؐ ضرور کرے۔

واجبات اسلام

جہاد، صدقہ فطر، بقرعید کی قربانی، ایفاء نذر، نماز عیدین، ایفاء عہد، پڑوسیوں سے اچھا سلوک، ماں باپ کا ادب، بیوی پر خاوند کی اطاعت وخدمت اچھے کاموں کا حکم دینا برے کاموں سے روکنا، اساتذہ اور بڑوں کی تعظیم کرنا، چھوٹوں پر شفقت کرنا، جائز کاموں میں حاکم کی اطاعت کرنا، سچ بولنا، حلال کھانا، اچھی طرح ملازمت کی پابندی کرنا، مشت برابر داڑھی رکھنا، ملک وقوم سے وفاداری کرنا، امانت کی حفاظت کرنا، ستر عورت، پردہ، دعوت دین، حلال کمانا، حقوق العباد ادا کرنا وغیرہ۔ (نماز وتر بھی واجب ہے)

معاملات اہل اسلام

مال وراثت کی شرعی تقسیم، نزاع میں جائز مقدمہ کرنا، اداء حقوق زوجین، امانتوں کی ادائیگی، لین دین میں درستی۔

آداب اسلام

اچھے اخلاق، اچھی عادات، اچھی سیاست وحکومت، بہترین معاشرہ، پاکیزہ افکار، عمدہ تہذیب وتمدن۔

سنت ہائے نبویؐ واسلام

مسواک، خوشبو، جماعت کے ساتھ نماز (۱۲ سنتیں) صفائی، ناخن تراشنا، سرمہ لگانا، غسل

جمعہ وعیدین، شادی، نماز تہجد، اشراق، اوابین، نماز تراویح، یوم حج اور عاشورہ کا روزہ، اعتکاف رمضان، ہر تکلیف پر صدقہ کرنا، نماز اور خدا سے دعا اور ذکر کی کثرت درود شریف زیادہ پڑھنا، ہر جائز کام خدا کی امداد اور بسم اللہ سے شروع کرنا، شلوار یا چادر وغیرہ ٹخنوں سے اوپر رکھنا، لباس سنت کے مطابق پہننا، سر پر ٹوپی وعمامہ، پڑوسی یا غیر کی بہن، بیٹی کی حفاظت کرنا، دعوت دینا اور کھانا، حلال تجارت، جائز خرچ، صحیح مشورہ، مخلوقات کے ساتھ بھلائی، چھوٹوں سے پیار اور شفقت، بڑوں کا ادب، راز چھپانا، سلام، مصافحہ، بیمار پرسی، شرکت جنازہ، خیر خواہی مسلم، ہنسنا، مسکرانا، جائز دل لگی مزاح، علاج، سواری، نیکی کا بدلہ نیکی، برائی کی معافی، شادی وغمی میں سادگی، نیچی نگاہ، زبان ہاتھ پاؤں سے تکلیف نہ دینا، مہمان نوازی، رات کو جلدی سونا، صبح کو جلدی اٹھنا، پابند شرع، پیر کے ہاتھ پر بیعت کرنا، شرک وبدعت سے گریز کرنا، حسد، بغض، حرص، تکبر، حق تلفی سے نفرت، زیارت قبور سے موت کی یاد، بغیر رسم وریا، میت کو ایصال ثواب اور دعاء مغفرت، ہر اچھے سنت کام پر خرچ کرنا، تنظیم بنانا، شریعت پر جمنا، مخالفت اور تکالیف برداشت کرنا، ظالم سے بائیکاٹ، مظلوم کی امداد، قرآن وسنت کا قانون بنوانا، امین ہونا، صنعت وحرفت، فوجی طاقت میں ٹیکنالوجی اور قومی ترقی میں کفار سے آگے بڑھنا وغیرہ۔ (فاستبقوا الخیرات)

خدا و رسول ﷺ کی محبت اور اتباع

محبت عظمت کا عکس ہے اور اس میں محبوب کی عادات اور مرغوبات کا خفیہ جال تنا ہوا ہے۔ محبّ ان سے نکل نہیں سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ: ”ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔“ (پ۲ع۴)

ارشاد نبوی ﷺ: (۱) ”تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک ”میں“ اسے والدین اور اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں“ پھر اس کی نشانی اپنی سنت واعمال کی اتباع بتائی۔ (۲) ”جس نے میرے طریقے سے محبت کی دراصل اس نے مجھ سے محبت کی مجھ سے محبت واتباع کرنے والا میرے ساتھ جنت میں ہوگا“ اس لئے خدا اور رسول سے سچی محبت اور طلب جنت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم آپ کی شریعت کی اتباع میں تمام خواہشات کو قربان کردیں۔ اور اصلی مومن بنیں۔ انگریزی تہذیب کی غلامی، نقالی چھوڑ دیں، سیکولر نہ بنیں۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے۔ ”خدا اور رسول ﷺ کا نافرمان اور محبت کا دعویدار؟ یہ تو بے عقلی ہے اگر تو سچا ہوتا تو تابعدار ہوتا۔

اس لئے کہ محبّ اپنے محبوب کا تابعدار ہوتا ہے۔“ اسی لائن پر خلفائے راشدینؓ، اہل بیت، صحابہؓ تابعینؒ، فقہا اور محدثین اور لاکھوں اولیاء کرامؒ چلے ہیں۔

اسلامی حدود اور سزائیں

(۱) قتل کا بدلہ قتل یا رضامندی اور دیت۔ (۲) چور کا ہاتھ کاٹنا۔ (۳) ڈاکو کو قتل کیا مخالف سمت سے ہاتھ پاؤں کاٹنا۔ (۴) کنوارے زانی کو سو درے اور شادی شدہ کو سنگسار کرنا۔ (۵) شرابی اور تہمت لگانے والے کو اَسّی درے مارنا۔ (۶) مرتد کو تین دن بعد تائب نہ ہونے پر پھانسی دینا۔ ان سب سزاؤں کا ذکر قرآن وحدیث میں ہے۔ نہ ماننے والا یا ظلم کہنے والا ایمان سے محروم اور قابل سزا ہے۔

بڑے گناہ جو بغیر توبہ معاف نہیں ہوتے: قتل، زنا، چوری، ڈاکہ، تہمت زنا، ماں باپ اور خاوند کی نافرمانی، شرک، کفر، دین کی مذمت یا مذاق، علماء اور دین داروں کی توہین، سود کھانا، رشوت لینا، شراب پینا، خنزیر کھانا، جھوٹی گواہی، غیبت کرنا خصوصاً صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہؒ کی، یتیم کا ناحق مال کھانا، ظلم، دھوکہ، فریب، جادو، جوا، لاٹری اور انعامی بانڈ زکمانا، جہاد سے بھاگنا، کاہنوں سے غیب کی خبریں پوچھنا، مشت سے کم داڑھی کتروانا، کفار کی وضع قطع اور رسوم پسند کرنا، ماتم وبین کرنا، نوحہ کی مجالس قائم کرنا یا ان میں جانا، قبروں کا طواف کرنا اور ان سے مددیں مرادیں مانگنا، فرضی قبر یا روضہ بنانا، حصول مراد کے لئے غیر خدا کی منت ماننا، نیاز غیر کو کھانا، فلمیں، وی سی آر، ناچ گانے سننا دیکھنا، ملک وقوم سے غداری کرنا، قرآن وسنت یا خیر امت کی تصریحات کے خلاف مذہب وفرقہ بنالینا، خدا اور رسول کو ناراض کرنا۔

اللہ والے کون ہیں؟

”خدا کے نیک بنے اس سے خوب ڈرتے ہیں وہ علماء ہیں۔“ (پ۲۲) ”اولیاء اللہ پر کوئی خوف وغم نہیں ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مومن وپرہیزگار ہیں۔“ (پ۱۱) اولیاء اللہ کی کرامات اور انبیاء کے معجزات برحق ہیں یہ سب مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔ ”اللہ اور اس کے رسول کے تابعدار قیامت کے دن انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوں گے۔ جن کی رفاقت بہت اچھی اور فضل الٰہی ہے“۔ (پ۵/۶ع)

زیارت نبوی ﷺ سے مشرف مسلمان

صحابیؓ کہلاتے ہیں۔ان کا تین پاؤ غلہ صدقہ دینا ہمارے اُحد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کرنے سے افضل ہے۔ان کے درجے اور مرتبے کو کوئی امام، ولی، غوث، وقطب نہیں پہنچ سکتا۔خدا نے ان کو ''صدیقین امت کے بہترین مومنین، متقین، جنت والے اپنے پیارے، ہدایت یافتہ، کافروں پر سخت آپس میں مہربان رکوع اور سجود میں مشغول خدا کے فضل کے متلاشی، ان کی نیک مثالیں توراۃ و انجیل میں مذکور، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا لہلہاتا ہوا تیار فصل، سدا بہار باغ اور ان پر جلنے والوں کو کفار بتایا ہے۔(پ۲۶/۱۲فتح) اس لئے ان سے محبت کرنا معیار حق وہدایت ہے اور عادل ماننا واجب ہے۔گلہ، غیبت کرنا حرام ہے۔''خدا نے ان کی سیئات مٹا دیں اور حالت درست فرما دی''۔(پ۲۶ محمد آیت۲) ہم مومن تب ہوں گے کہ بناوٹی تاریخ میں ان کی غلطیوں سے درگزر کریں اور یہ دعا مانگا کریں کہ ''اے اللہ ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں (مہاجرین وانصارؓ اور مسلمانان فتح مکہؓ) کو بھی جو ہم سے پہلے مسلمان ہو چکے ہیں اور ہمارے دل میں ان مومنین کے متعلق کوئی کینہ دشمنی نہ رہنے دے۔اے ہمارے رب تو بہت شفیق اور مہربان ہے۔(پ۲۸/۲ع)

خلافت علیؓ برحق ہے

فاتح خیبر شیر خدا امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت، امامت پر بھی سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔تمام مہاجرین وانصارؓ کی طرح حضرت طلحہؓ، زبیر، ام المومنین سیّدہ عائشہؓ اور خال المومنین حضرت امیر معاویہؓ بھی آپ کو خلیفہ مانتے ہیں۔صرف یہ چاہتے تھے کہ آپ انہیں اپنے ماتحت امیر شام برقرار رکھیں اور قاتلوں سے بدلہ لے لیں۔حضرت علیؓ نے ان سب کو اپنے مومن بھائی بتلاتے ہوئے یہ اعلان نشر عام کیا۔''ہمارا اور اہل شام کا ٹکراؤ ہو گیا حالانکہ کھلی بات ہے کہ ہمارا رب ایک ہے۔نبی ایک ہے۔دین ایک ہے۔اسلام کی دعوت ایک ہے۔ہم ان سے کسی چیز کا اضافہ نہیں چاہتے نہ وہ ہم سے کوئی چیز زائد مانگتے ہیں۔ الامر واحد اسلام اور ایمان کی ہر بات متفقہ اور مسلم ہے۔سوائے اس کے کہ ہمارا بدلہ عثمانؓ میں اختلاف ہوا ہم ان کے الزام سے پاک ہیں۔(نہج البلاغہ) جب آپ کے ساتھیوں نے شامیوں کو برا کہا تو فرمایا:''برا نہ کہو تم بدگو نہیں ہو یہ دعا مانگو اے اللہ ہمارے اور ان کے خونوں کی حفاظت فرما۔ہمارے اور ان کے

درمیان صلح فرما اور ان کو ہدایت عطا فرما۔'' چنانچہ ۳۸ھ میں صلح ہو گئی، دونوں بزرگ اپنے اپنے علاقوں میں خدمت اسلام بجالاتے رہے۔(تاریخ طبری) حتیٰ کہ ریحانہ رسول ﷺ جگر گوشہ بتولؓ امام حسنؓ نے ارشاد نبویؐ کے مطابق صلح و بیعت کر کے تمام مسلمانوں کو متحد کر دیا اور ۲۰ سالہ دور امن وخلافت میں لاتعداد فتوحات ہوئیں۔اگر آج ہم سب مسلمان حسن المجتبیٰؓ کی صلح واتحاد کو اپنا نصب العین اور متفقہ پلیٹ فارم بنالیں تو معاندین اسلام کو لوہے کے چنے چبوا سکتے ہیں۔(فانصرنا علی القوم الکافرین)

شخصیات اسلام

۵ **سب سے افضل اولوالعزم پیغمبر**: حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

۵ **سب سے افضل ترین خواتین**: حضرت آسیہ، مریم، فاطمہ، ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

۴ **یار خلفائے راشدین**: حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

۶ **بقیہ عشرہ مبشرہ بالجنہ**: حضرت طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن، سعد ابن ابی وقاص، سعید، ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔یہ دس بعد از انبیاء تمام صحابہؓ سے افضل ہیں پھر تمام مہاجرین اور انصار میں سے تین سو تیرہ (۳۱۳) اہل بدر ۷۰۰ اہل اُحد، اہل خندق، ۱۵۰۰ اہل بیت رضوان، ۱۰ ہزار فاتحین مکہ اور بعد والے ہیں۔خدا نے سب سے جنت کا وعدہ کیا ہے۔ و کلا وعد اللہ الحسنی (پ۲۷/ع۱ سورہ حدید)

خلافت راشدہ کا قرآنی وعدہ

تم میں سے اہل ایمان اور اعمال صالحہ والوں سے خدا کا وعدہ ہے۔کہ یقیناً ان کو زمین پر جانشین نبوی بنائے گا جیسے کہ پہلوں کو بنایا تھا اور اپنے پسندیدہ دین پر ان کو پختہ اقتدار دے گا ان کے خوف کو امن سے بدلے گا وہ میری ہی عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔جو لوگ اس کے بعد ان کا انکار کریں گے وہ فاسق (دین سے خارج) ہیں۔(پ۱۸/۱۳ع)

پوری تاریخ گواہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد متصل جو خلیفے ہوئے تو وہی قرآنی وعدہ کا مصداق اور برحق خلیفہ ہیں۔

یہ محبوب سرور یہ مقبول داور — ابوبکرؓ و فاروقؓ و عثمانؓ وحیدرؓ
یہ تزیین مسجد یہ تنویر منبر — بڑا ان کا رتبہ ہے اللہ اکبر
یہ معراج ایمان کے ہیں چار زینے — یہ چاروں ہیں تاج شرف کے نگینے
مجلّٰی ہیں انوار سے جن کے سینے — سنوارا ہے جن کو جمال نبی نے

اقرباء رسول ﷺ جن سے محبت واجب، دشمنی حرام ہے۔ چار آل عبا، رسول ﷺ حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت فاطمہؓ، علی مرتضیٰؓ (مسلم از عائشہ) چادر میں لے کر خاص دعا فرمائی۔ اس حدیث کے مطابق اہل بیت نبویؐ ہیں۔

۴ **بنات طاہرات:** حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت ام کلثومؓ (وبناتك پ۲۲)

۴ **ننھے صاحبزادے:** قاسم، طیب، طاہر، ابراہیم۔

۴ **ننھے نواسے:** حسنؓ، حسینؓ، علی بن زینبؓ، عبداللہ ابن رقیہؓ۔

۴ **آباؤ اجداد:** عبداللہ، عبدالمطلب، ہاشم، عبدمناف۔

۳ **بہترین داماد:** حضرت ابوالعاص بن ربیعؓ، (حضرت خدیجہؓ کے بھانجے) حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ۔

۲ **مومن چچے:** سیدالشہداء حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ۔

۲ **مومن پھوپھیاں:** حضرت صفیہؓ، حضرت عاتکہؓ۔

۲ **محسن و مربی چچے:** ابوطالب اور زبیر بن عبدالمطلب۔

۲ **بہترین خسر اور جنتی بزرگوں کے سردار:** حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما۔ (آپؐ نے فرمایا: لوگو میرے بعد ابوبکر وعمر کی پیروی کرنا) ترمذی۔

۲ **جنتی نوجوانوں کے سردار:** امام حسنؓ وحسینؓ۔

۱ **ایک سیّدالسادات حضرت حسنؓ:** فرمان نبوی ﷺ ہے۔ یہ ہے میرا بیٹا سردار اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کروائے گا۔ (بخاری)

ایک ہادی: ہدایت یافتہ معاویہؓ اے اللہ! اس کے ذریعے ہدایت دے (ترمذی)

ایک خاتون جنت: سیّدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا۔

ایک ماموں: سعد ابن ابی وقاص (فاتح ایران)

ایک سفر ہجرت میں گر کر شہید مظلوم سب سے افضل بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا (زوجہ ابوالعاصؓ)

گیارہ ازواج مطہرات: جو بنص قرآنی امہات المومنین واہل بیت نبویؐ ہیں۔ فضیلت وتقویٰ میں کوئی خاتون ان جیسی نہیں۔ (احزاب پ۲۲/ع۱)

بارہ امام اہل بیت: حضرت علیؓ، حسنؓ، حسینؓ، زین العابدین، محمد باقر، جعفر صادق، موسیٰ کاظم، علی رضا، محمد تقی، علی نقی، حسن عسکری، مہدی منتظر رحمہم اللہ کبار اولیاء اللہ ہیں۔ فرقہ خاصہ صرف انہی کو پیشوائے دین مانتا ہے۔

چار امام فقہ: امام اعظم ابوحنیفہؒ، مالکؒ، احمدؒ، شافعیؒ۔

۶ **امام حدیث:** امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ رحمہم اللہ۔

۴ **مرجع صوفیاء پیر:** حضرت عبدالقادر جیلانی، حضرت بہاؤالدین نقشبندی، حضرت معین الدین چشتی، حضرت شہاب الدین سہروردی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

دس مشاہیر اولیاء کرام جن سے لاکھوں افراد فیض یافتہ ہوئے اور مسلمان ہوئے۔ حضرت داتا گنج بخش، معین الدین اجمیری، بابا فرید گنج شکر، شاہ شمس تبریز، جلال الدین رومی، بہاؤ الدین زکریا، مجدد الف ثانی، فریدالدین عطار، نظام الدین اولیاء، سلطان باہو رحمہم اللہ تعالیٰ۔

دس اکابر علماء و صوفیاء: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ آپ کے چار بیٹے شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ عبدالغنیؒ والد (شاہ اسماعیل شہیدؒ)، مرزا مظہر جان جاناںؒ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، سید احمد شہید بریلویؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔

صلی اللہ تعالی علی حبیبه خیر خلقه محمد و آله واصحابه وازواجه وجمیع امته اجمعین۔

❁ ❁ ❁

محرم الحرام تاریخ کے آئینے میں

از: محمد اُبوسفیان حسینی
پاکستان

ہمارا نظریہ دینِ اسلام ہے اس کی بنیاد علاقائیت، وطنیت، نسل پرستی یا زبان نہیں ہے، بلکہ ہمارا دین اسلام یہ نہ صرف مذہب ہے بلکہ ضابطہ حیات ہے، ہر قوم کا کوئی نہ کوئی کیلنڈر رہا ہے۔ یہودیوں کا سن ۳۷۰۰ ق م سے شروع ہوتا ہے، عیسوی سن کی ابتداء حضرت عیسیٰؑ کے یوم ولادت سے ہوتی ہے، اس طرح بکرمی سن کی ابتداء مہاراجہ بکر ماجیت کو ساکھا قوم پر فتح حاصل ہونے کے واقعے سے ہوتی ہے، اس طرح سن ہجری حضور ﷺ کے سفرِ ہجرتِ مدینہ کی یاد دلاتا ہے۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کا یہ سفر آٹھ ربیع الاول کو ہوا۔ جو عیسوی سن کے مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء کا واقعہ ہے، یہیں سے اسلامی سال کی ابتداء ہوتی ہے، جس کو سیدنا فاروق اعظمؓ نے اپنے دورِ خلافت میں نافذ کیا اور اسی سال یکم محرم الحرام سے اسلامی سن کی ابتداء کی گئی۔ گویا پہلے اسلام صدی کی ابتداء اور آغاز ۱۶ جولائی ۶۲۲ء کو ہوا۔ اس امر میں بھی ایک عجیب حکمت پنہاں ہے کہ جب پہلی اسلامی صدی کی ابتداء ہوئی تو یکم محرم الحرام کو جمعہ کا دن تھا۔

قمری تقویم اور اس کے فوائد

اگر ہم سن ہجری کا دوسرے مروجہ سنین سے تقابل کر کے دیکھیں۔ تو یہ سن بہت سی باتوں میں دوسروں سے منفرد و ممتاز نظر آتا ہے۔ سن ہجری کی ابتداء چاند کو بنایا گیا۔ اور اسلامی مہینوں کا تعلق چاند سے جوڑا گیا۔ یہ تقدیم خالق کی بنائی چیز سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں کسی پیوندکاری کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام چونکہ سادہ، عجز و انکساری والا آسان مذہب ہے (لا کراہ فی الدین) ...لہٰذا چاند کے ذریعے ہر علاقہ کے لوگ خواہ پہاڑوں میں رہتے ہوں یا کہ جنگلوں میں

...خواہ جزیروں میں۔ ان کے لئے آسان ہے کہ اپنے معاملات چاند کے مطابق طے کریں۔ اس میں کوئی مشکل و پیچیدگی نہیں۔ پڑھے لکھے اور اَن پڑھ سب آسانی سے حساب کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس دیگر تقویمیں ہر آدمی آسانی سے معلوم نہیں کر سکتا۔ جبکہ چاند ہر جگہ نکلتا ہے۔ کسی مشکل حساب کتاب کی ضرورت نہیں۔ جبکہ دوسری تاریخوں میں یہ بات نہیں۔ اسلام چوں کہ دینِ فطرت اور عدل و انصاف کا دین ہے۔ اس میں مساوات و ہمہ گیری ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہی پسند فرمایا۔ کہ اسلامی مہینے ادلتے بدلتے آیا کریں۔ لہٰذا قمری تقویم کو بنیاد قرار دیا گیا۔ اگر اسلام دیگر اقوام کے طریق کو اپنا لیتا یا گوارہ کر لیتا جیسے شمسی (عیسوی) تقویم تو ماہ صیام کسی ایک مقام پر ہمیشہ ایک ہی موسم میں آیا کرتا جس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا کہ نصف دنیا کے مسلمان جہاں موسم سرد اور دن چھوٹے ہوتے ہمیشہ آسانی میں رہتے۔ اسی طرح سفرِ حج کا بھی یہی حال رہتا۔

محرم الحرام اور تاریخ انسانیت

طلوع اسلام سے قبل بھی تاریخِ انسانیت کے بے شمار واقعات محرم الحرام میں رونما ہوئے۔ یہ واقعات محض اتفاقی یا حادثاتی نہ تھے۔ بلکہ قسامِ ازل کا اٹل فیصلہ تھا جو ہونا تھا اور ہو کر رہا۔ ذیل میں چند اُن واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں جو محرم الحرام میں ظہور پذیر ہوئے:

(۱) اس ماہ میں کائنات کی تخلیق ہوئی۔
(۲) حضرت آدمؑ پیدا ہوئے۔
(۳) حضرت آدمؑ کی توبہ قبول ہوئی۔
(۴) حضرت آدمؑ کو خلافت کا تاج پہنایا گیا (انی جاعل فی الارض خلیفه)
(۵) سیدنا ادریسؑ کو درجات عالیہ عطا ہوئے۔
(۶) کشتی نوحؑ وادی جودی پہ ٹھہری۔
(۷) سیدنا ابراہیمؑ کو منصب و مقامِ خلیل سے سرفراز فرمایا گیا۔
(۸) سیدنا یوسفؑ صدیق اللہ کو جیل سے رہائی ملی۔
(۹) سیدنا یعقوبؑ کی بینائی لوٹائی گئی۔
(۱۰) سیدنا یونسؑ کو مچھلی کے پیٹ سے رہائی ملی۔

(۱۱) فرعون غرقِ نیل ہوا اور موسیٰؑ کلیم اللہ کو کامیابی عطا ہوئی۔

(۱۲) سیدنا عیسیٰؑ کو آسمان پر زندہ اُٹھایا گیا۔

(۱۳) اس روز قیامت آئے گی۔

(۱۴) اسی ماہ یوم عاشورہ کو اہلِ مکہ خانہ کعبہ پر غلاف چڑھاتے تھے اور اس دن کو یوم الزینۃ کہتے تھے۔

(۱۵) اسی ماہ امام الانبیاء خاتم المعصومین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چند سال قبل ابرہہ بیت اللہ پر حملہ کی نیت سے نکلا۔ تو اللہ نے ابابیلوں کا لشکر بھیج کر اسے تباہ و برباد کردیا۔

محرم الحرام اور تاریخ اسلام

ذیل میں ہم تاریخ اسلام کے اُن واقعات پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں جو محرم میں رونما ہوئے:

(۱) شعب ابی طالب کی محصوری جو یکم محرم ۴ نبویؐ۔

(۲) نکاح سیدہ فاطمہ الزہرہؓ بنت رسول اللہ ﷺ ہمراہ سیدنا علیؓ ۲ ہجری۔

(۳) غزوہ غطفان ۳ ہجری۔

(۴) نکاح سیدہ اُم کلثومؓ بنت رسول اللہ ﷺ ہمراہ سیدنا عثمان غنیؓ۔

(۵) سلاطین عالم کو دعوت اسلام ۷ ہجری۔

(۶) غزوہ خیبر ۷ ہجری۔

(۷) وفد اشعرین کا قبول اسلام ۷ ہجری۔

(۸) نکاح ام المومنین سیدہ صفیہؓ ہمراہ رسول اللہ ﷺ ۔

(۹) غزوہ وادی القریٰ ۷ ہجری۔

(۱۰) عام الوفود ۹ ہجری۔

(۱۱) تقرر عاملین زکوٰۃ ۹ ہجری۔

(۱۲) طاعونِ عمواس ۱۸ ہجری۔

(۱۳) امارتِ سیدنا امیر معاویہؓ ۱۹ ہجری۔

(۱۴) خلافت سیدنا عثمان غنیؓ یکم محرم ۲۴ ہجری۔

(۱۵) فتح قبرص ۲۸ ہجری۔

(۱۶) خلافت سیدنا علی المرتضیٰؓ ۳۴ ہجری۔

(۱۷) جنگ صفین ۳۷ ہجری۔

(۱۸) فتوحات افریقہ ۴۵ ہجری۔

(۱۹) ابومسلم کا خراسان پر قبضہ ۱۳۱ ہجری۔

(۲۰) بنواُمیہ کا قتلِ عام ۱۳۳ ہجری۔

(۲۱) قیصر روم کی شکست ۱۳۸ ہجری۔

(۲۲) مسجد نبویؐ کی توسیع ۱۶۱ ہجری۔

(۲۳) مصر پر عیسائیوں کا قبضہ ۳۰۹ ہجری۔

(۲۴) نوحہ ماتم کی ابتداء ۳۵۲ ہجری۔

(۲۵) ہلاکو نے بغداد کو تاراج کیا ۲۵۲ ہجری۔

(۲۶) حکومت شیر شاہ سوریؒ ۹۴۷ ہجری۔

(۲۷) دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۵ محرم ۱۲۸۳ ہجری۔

(۲۸) کعبۃ اللہ پر بے ادب ٹولے کا حملہ ۱۴۰۰ ہجری۔

(۲۹) صدر ضیاء الحقؒ کی شہادت اور حکومت کا خاتمہ ۱۴۰۹ھ۔

(۳۰) بے نظیر کی پہلی حکومت کا تختہ اُلٹا ۱۴۱۱ھ۔

(۳۱) نواز شریف کو حکومت سے فارغ کیا گیا۔

(۳۲) یوم فاروق اعظمؓ کی چھٹی منظور کی گئی یکم محرم ۱۴۱۵ھ

برصغیر کی ماہ محرم میں پیدا ہونے والی چند علمی شخصیات

(۱) امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ مدفون دین پور۔

(۲) شیخ الحدیث مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک۔

(۳) شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ مدرس دارالعلوم دیوبند۔

(۴) حافظ الحدیث مولانا عبداللہ درخواستیؒ مدفون دین پور۔

(۵) مفتی عبدالحکیم سکھرویؒ۔

ماہ محرم الحرام میں وفات یا شہادت پانے والی چند شخصیات

(۱) سیدنا ابوعبیدہؓ بن الجراحؓ۔
(۲) شہادتِ دامادِ علیؓ سیدنا عمر فاروقؓ ۔
(۳) شہادت سیدنا ابوایوب انصاریؓ۔
(۴) سیدنا عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکر صدیقؓ ۔
(۵) سیدنا سعدؓ بن ابی وقاصؓ ۔
(۶) اُم المومنین سیدہ جویریہؓ ۔
(۷) سیدنا سمرہؓ بن جندبؓ ۔
(۸) شہادتِ سیدنا حسینؓ ابن علی المرتضیٰؓ ۔
(۹) سیدنا عبداللہ بن عمر فاروقؓ ۔
(۱۰) حضرت یوسفؒ بن تاشفینؒ ۔
(۱۱) حضرت بابا فرید گنج شکرؒ۔
(۱۲) مرزا مظہر جانِ جاناںؒ۔
(۱۳) علامہ انور شاہ کشمیریؒ ۔
(۱۴) مولانا سید اصغر حسینؒ ۔
(۱۵) شہید ملت لیاقت علی خانؒ۔
(۱۶) مولانا محمد احمد تھانویؒ ۔
(۱۷) سید منیر احمد شہیدؒ ۔
(۱۸) شہادتِ سید منظور شاہ ہمدانیؒ۔

❋ ❋ ❋

سلاطین ہند کے عہد میں غیر مسلموں کی شرعی حیثیت

از: محمد شمیم اختر قاسمی
ریسرچ اسکالر شعبہ سنی دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نورنبوت کی شعاعیں غار حرا سے چمکیں تو اس کا عکس سرزمین ہند پر بھی پڑا، اور پہلی صدی ہجری ہی میں نہ صرف مسلمان ہندوستان میں مقیم وآباد ہونے لگے، بلکہ یہاں باقاعدہ طریقے سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی، اس طرح سندھ ونواحی سندھ حکومت اسلامیہ کا ایک حصہ بن گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ محمد بن قاسم (۱) کی طرح کسی اور عرب فاتح نے یہاں حکومت نہیں کی تاہم مرکز سے اس کا تعلق کبھی بھی منقطع نہ ہوا۔ اور برابر بلکہ متواتر عرب ولاۃ یہاں آتے جاتے رہے۔ محمد بن قاسم کے بعد محمود غزنوی (۲) نے یہاں دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی اور سندھ وملتان اور پنجاب وغیرہ کے علاقے کو اپنے زیرنگیں کیا۔ اور متعدد حملوں کے ذریعہ دہلی کے اکناف و اطراف تک کی زمین کو نعرۂ تکبیر سے بلند کیا۔ مگر ان کے انتقال کے بعد اس خاندان کے دیگر حکمرانوں نے وہ کامیابی دکھانے میں کمزور ثابت ہوئے جس طرح محمود غزنوی نے یہاں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ اس کے بعد شہاب الدین غوری (۳) نے ہندوستان پر منظم حملہ کیا اور متعدد علاقوں کو فتح کرکے مسلم سلطنت سے جوڑا۔ یہاں تک کہ اسی کے غلام قطب الدین ایبک (۴) باضابطہ طریقے سے ہندوستان میں مسلم حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جس کا پایہ تخت دہلی قرار پایا۔ اس کے بعد سے لے کر انگریزی حکومت کے قائم ہونے تک پورا ہندوستان مسلمانوں کے قبضہ وتصرف میں رہا اور مسلم حکمراں اپنی رعایا کی خوش حالی اور ترقی کے لیے برابر کوشاں رہے۔ ان کی رعایا میں نہ صرف مسلمان تھے جو یا تو باہر سے آئے تھے، یا یہاں کی پیداوار

تھے بلکہ ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ جنھیں مسلمانوں کی طرح کلی آزادی حاصل تھی اور حکومت میں بھی ان کا عمل دخل تھا اور اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ اب چوں کہ مسلم حکومت میں یا تو صرف مسلمان مقیم وآباد ہوں گے، یا پھر اور دوسرے لوگ بھی ہوں گے جن کی شرعی حیثیت کا تعین ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کی زیرنگرانی کس حیثیت سے رہیں گے، اور انھیں یہاں رہنے کا اختیار ہے یا نہیں۔ اور اگر وہ رہیں گے تو وہ کس حساب سے اور کس قاعدہ کلیہ کے تحت سلطنت اسلامیہ کو ٹیکس ادا کریں گے۔ چنانچہ پیش نظر مضمون میں انھی چیزوں پر قرآن وحدیث اور فقہ کی روشنی میں بحث کی گئی اور غیرمسلموں کی شرعی حیثیت متعین کی گئی ہے۔ تاکہ ان اعتراضات و شبہات کا ازالہ ہوسکے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے غیرمسلموں کے جان ومال، عزت وآبرو کا خیال نہیں رکھا اور ان کے حقوق کی پامالی کا حکم دیا ہے جس کے پیش نظر مسلم فرمارواؤں نے غیرمسلموں کے ساتھ نامنصفانہ سلوک کیا ہے۔

ذمی اور معاہد کو اسلامی مملکت میں کیا حقوق حاصل ہوں گے

جس کسی نئے علاقے یا ملک کو فتح کرکے مسلمان اس پر اپنا قبضہ واقتدار حاصل کرے تو مفتوحین میں سے جو لوگ مسلمانوں کی حکومت تسلیم کرکے یہاں رہنا چاہیں اور عہد کریں کہ وہ مملکت اسلامیہ کے خلاف بغاوت، سرکشی اور کسی سازش میں ملوث نہ ہوں گے تو اب حکومت اسلامیہ کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ ان مفتوحین اور معاہدین کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کرکے اس کے جان ومال اور عزت وآبرو کی بالکل اسی طرح حفاظت کرے جس طرح وہ مملکت میں مقیم و موجود مسلمان رعایا کی محافظت کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ البتہ ایسے مفتوحین اور معاہدین سے اسلامی حکومت کچھ سالانہ ٹیکس (جزیہ) وصول کرنے کا حق رکھتی ہے۔ یہ ٹیکس انھی لوگوں سے حاصل کیے جائیں گے جو فوجی خدمت کے قابل ہوں گے۔ عورت، بوڑھے، بچے، لونڈی، غلام اور مذہبی خدام اس کلیہ سے مستثنیٰ قرار دیئے جائیں گے (۵)۔ ٹیکس کی وصولی میں ذمی کی مالی حیثیت کا بہرصورت خیال رکھا جائے گا (۶)۔ اس رقم کی ادائیگی کے بعد اہل ذمہ سے نہ صرف فوجی خدمات ساقط ہوجائیں گے، بلکہ وہ اپنے سماجی اور عائلی معاملات میں بھی اسلامی قانون کے پابند نہ ہوں گے (۷)۔ مگر وہ مسلم علاقوں میں کوئی نئی مذہبی عبادت گاہ اپنی مرضی سے تعمیر نہیں کرسکتے (۸)۔ البتہ پرانے معابد اور خستہ مذہبی مقامات کی دوبارہ تعمیر اور جدید کاری کرسکتے ہیں (۹)۔ انھیں مسلم

علاقوں میں رہتے ہوئے اس امر کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ وہ ایسے امور انجام دینے سے پرہیز کریں جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہو اور ان کے مذہبی معتقدات کو ٹھیس لگتی ہو(۱۰)۔ ان باتوں کے باوجود اگر وہ اپنی مرضی سے اپنے نزاعی معاملات کے حل کے لیے شرعی عدالت سے رجوع کریں تو فیصلہ شرع کے مطابق ہی کیا جائے گا(۱۱)۔ اگر شخصی قانون سے تعلق رکھنے والے کسی معاملہ میں ایک فریق ہندو اور دوسرا مسلمان ہو تو ایسی صورت میں بھی فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہوگا(۱۲)۔ لیکن کسی معاہد یا مفتوحین کو بلاوجہ کسی مسلمان نے قتل کردیا تو اس کے عوض قاتل کا بھی سر قلم کیا جائے گا اور اگر مقتول کے ورثا اپنی مرضی سے معاوضہ لے کر یا بلا معاوضہ معاف کردے تو قاتل بری ہوجائے گا(۱۳)۔ اسی طرح کوئی مسلمان بغیر کسی اہم سبب کے معاہد سے معاہدہ نہیں توڑ سکتا جب تک کہ فریق ثانی کی رضامندی نہ ہو۔ معاہدہ خواہ اہل کتاب سے کیا جائے یا مشرکوں سے(۱۴)۔

غیر مسلموں کی شرعی حیثیت کا مسئلہ ہندوستانی تناظر میں

مذکورہ فقہی تصریحات کی روشنی میں سلاطین ہند کے عہد میں غیرمسلموں کی شرعی حیثیت کے تعین کے سلسلے میں غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عہد اموی میں حجاج بن یوسف کے ایما پر محمد بن قاسم نے ہندوستان پر منظم اور کامیاب حملہ کرکے سندھ کو اسلامی قلم رو میں شامل کیا۔ جس کی بنا پر یہاں کے ہنود نے مسلمانوں کی ماتحتی قبول کرکے سندھ ہی میں رہنا گوارا کیا۔ چنانچہ اس وقت پہلی مرتبہ یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ یہاں کے ہنود کی شرعی حیثیت کیا ہوگی اور انہیں کس حد تک اور کہاں تک آزادانہ زندگی بسر کرنے کی اجازت ہوگی۔

یہ بات محقق ہے کہ محمد بن قاسم نے یہاں کے باشندے جو بدھ اور برہمنی مت سے تعلق رکھتے تھے کو ذمی کا درجہ دے کر ان سے سالانہ جزیہ وصول کیا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے مذہب پر قائم رہے اور اپنے سماجی اور عائلی معاملات میں بھی سلطنت کے شرعی قوانین سے بری کردیئے گئے۔ انھوں نے اپنے مندروں میں عبادت اور پوجا پاٹ کرنے کے ساتھ ساتھ بعض قدیم اور خستہ عبادت گاہوں کی تعمیر و مرمت کی(۱۵)۔

تاریخی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جب محمد بن قاسم نے سندھ پر اقتدار حاصل کیا تو برابر ان کی مراسلت حجاج بن یوسف سے قائم رہی، اور ہر تیسرے روز حجاج کے پاس خط بھیجنے اور ان کی طرف سے جواب ملنے کی صراحت موجود ہے(۱۶)۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ محمد بن قاسم نے

اپنے پہلے حملہ میں کامیابی کے بعد یہاں کے ہنود کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے لیے تفصیلات حجاج بن یوسف کو بھیجی ہوں گی، کیوں کہ ہندوؤں کے ہاں الہامی کتاب کے فقدان کی وجہ سے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہوگا کہ یہاں کے لوگ اہل کتاب ہیں یا شبہ اہل کتاب، یا مشرک۔ لہٰذا یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ حجاج نے علماء وقت سے رجوع کرنے کے بعد محمد بن قاسم کو اطلاع دی ہوگی کہ انہیں شبہ اہل کتاب کے زمرے میں شامل کرکے ہر قسم کی آزادی اور ان سے سالانہ جزیہ وصول کیا(۱۷)۔ جیسا کہ پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی رقم طراز ہیں:

> ”ہندوستان کے بعض علماء اور جدید دانشوروں نے ہندوستان کے ذمیوں کو شبہ اہل کتاب کے زمرے میں رکھا۔ جب کہ قدیم ماخذ سے اسکی کوئی وضاحت نہیں ہوتی، لیکن ذمیوں کے منادر کے سلسلے میں محمد بن قاسم کا جو اعلامیہ رہا اس سے صاف واضح ہوتا ہے جو چچ نامہ میں مذکور ہے کہ ہندوؤں کی عبادت گاہوں کی وہی حیثیت ہے جو شام و عراق کے یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہوں کی ہے(۱۸)۔“

اہل کتاب سے جزیہ لینا قرآنی فیصلہ
اور مجوس سے جزیہ لینا حدیث سے ثابت ہے

اہل کتاب سے جزیہ وصول کرنے کا حکم قرآن سے ثابت ہے جبکہ مجوسیوں سے جزیہ کی وصولی کے سلسلے میں قرآن میں کوئی صراحت نہیں ملتی۔ لیکن رسول خدا نے مجوسیوں سے جزیہ وصول کیا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے ہجر کے مجوسیوں کو تحریری صورت میں اسلام کی دعوت دی، جس میں تحریر تھا کہ جو شخص اسلام لے آئے گا اس کا اسلام قبول کیا جائے گا اور جو نہیں قبول کرے گا اس پر جزیہ لگایا جائے گا۔ نیز اس کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا، نہ اس کی عورتوں سے نکاح کیا جائے گا۔ اسی حکم کو پیش نظر رکھ کر حضرت عمرؓ نے مجوسیوں سے جزیہ وصول کیا تھا، اور جس کی گواہی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے دی تھی۔

فقہائے اسلام نے کن لوگوں کو ذمی قرار دیا ہے؟

اسلام کے علاوہ دوسرے بہت سے قدیم وجدید مذاہب ہیں جن کے ماننے والوں کی خاصی تعداد ہے، جن میں یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، بدھ ازم، جین ازم اور ہندوازم وغیرہ

قابل ذکر ہیں۔ان میں بعض مذاہب کی وضاحت کتاب وسنت اور فقہاء کرام کی تصریحات سے ہوتی ہیں کہ فلاں فلاں مذاہب اہل کتاب ہیں۔البتہ کچھ دوسرے مذاہب کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی کہ ان کی حیثیت کیا ہے۔چنانچہ فقہائے کرام نے ایسے مذاہب کے متعلق جو تفصیلات بیان کی ہیں اس کی روشنی میں ہندوؤں کی شرعی حیثیت کا تعین بہ آسانی کیا جاسکتا ہے،جس کی روشنی میں سلاطین ہند نے غیر مسلموں کو حقوق عطا کیے۔

امام ابوحنیفہ (۱۹) کے علاوہ امام احمد کے ایک قول کے مطابق اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کے علاوہ مشرکین وکفار کو ذمی قرار دیا جائے گا۔البتہ مشرکین عرب اس سے مستثنیٰ ہوں گے جن کے لیے قرآن میں اسلام اور تلوار کے علاوہ تیسری صورت نہیں (۲۰)۔امام مالک (۲۱) کے نزدیک عرب اور غیر عرب کو بھی ذمی کا درجہ دیا جائے گا (۲۲)۔اہل کتاب اور مجوسی کو ہی ذمی کی حیثیت حاصل ہوگی امام شافعی (۲۳) کے مسلک کے مطابق (۲۴)۔

جزیہ کن لوگوں سے وصول کیا جائے گا؟

اسی کے ساتھ جن ذمیوں سے جزیہ وصول کیا جائے گا اس سلسلے میں بھی فقہاء کا اختلاف پایا جاتا ہے۔امام ابوحنیفہ کے نزدیک جزیہ اہل کتاب سے وصول کیا جائے گا خواہ وہ عرب ہوں یا عجم، اور عجم کے مشرکوں سے بھی لیا جائے گا چاہے وہ مجوسی ہوں یا بت پرست،البتہ مرتدوں سے نہیں لیا جائیگا (۲۵)۔امام ابویوسف (۲۶) کا قول ہے کہ عرب سے بالکل جزیہ نہیں لیا جائیگا،اہل کتاب ہوں یا مشرک،جزیہ صرف عجمیوں سے لیا جائیگا،اہل کتاب سے بھی اور مشرکوں سے بھی (۲۷)۔

امام اوزاعی (۲۸) کے نزدیک ہر کافر سے جزیہ لیا جائے گا،خواہ وہ عرب ہوں یا عجمی کتابی یا کوئی اور۔ہاں مرتدوں سے اور قریش کے مشرکوں سے نہیں لیا جائے گا (۲۹)۔امام شافعی کے بقول جزیہ مذہب کی بنیاد پر ہے،شخصیت کی بنیاد پر نہیں ہے،لہٰذا صرف اہل کتاب سے جزیہ لیا جائے گا خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی،بت پرستوں سے بالکل نہیں لیا جائے گا۔امام شافعی کے نزدیک مجوسی اہل کتاب ہیں (۳۰)۔

جن لوگوں نے اہل عرب سے جزیہ وصول کرنے کی صراحت کی ہے اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ (۳۱) نے لکھا ہے کہ اہل کتاب اور مجوس سے اس وقت تک مقاتلہ کرنے کا حکم واجب ہے جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہوجائیں یا جزیہ دینا قبول نہ کریں۔ان کے سوا

جو دوسرے ... ہیں ان سے جزیہ قبول کرنے کے متعلق علماء میں اختلاف ہے لیکن عام فقہاء مشرکین عرب سے جزیہ قبول کرنا روا نہیں رکھتے،بعض فرقے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں،لیکن بعض ان شرائع کو جو بالکل ظاہر اور متواتر ہیں منکر ہیں۔ ان کے خلاف بھی باتفاق مسلمین اس وقت تک جہاد واجب ہے جب تک کہ تمام دین اللہ ہی کا نہ ہوجائے۔چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے جہاد کیا تھا،ابتدا میں بعض صحابہ کو ان کے قتال میں توقف تھا،لیکن آخر میں سب متفق ہوگئے۔(۳۲)

محمد بن قاسم کے عہد میں ہندوؤں کی جو شرعی حیثیت متعین کی گئی وہ بعد کے عہد میں بھی برقرار رہی

شبہ اہل کتاب کے زمرے میں یہاں کے ہنود کو شامل کرکے محمد بن قاسم کے عہد میں غیر مسلموں کی شرعی حیثیت متعین کی گئی اور انہیں ذمی کا درجہ دیا گیا۔چنانچہ غیر مسلموں کی یہی حیثیت بعد کے عہد میں بھی برقرار رہی۔مگر جب التمش (۳۳) کا زمانہ حکومت آیا اور فقہ نے زور پکڑا تو نئے نئے مسائل درپیش اور مدون ہوئے تو علمائے وقت نے اس مسئلہ کو ابھارا کہ یہاں کے ہندوؤں کی شرعی حیثیت کیا ہو؟ ایک طبقہ انہیں اہل ذمہ کے حقوق دیئے جانے کے حق میں نہ تھا اور ان کے ساتھ اما الاسلام اور اما القتل کے اصول پر عمل کرنے پر مصر تھے،کیوں کہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں۔جبکہ دوسرے علماء کی رائے اس کے برعکس تھی۔جب یہ مسئلہ بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تو بادشاہ نے اول الذکر طبقہ کی اس رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے غیر مسلموں کو سابقہ حیثیت پر برقرار رکھا اور اپنے وزیر نظام الملک جنیدی (۳۴) سے کہا کہ ان علماء کو یہ جواب دیں کہ اس وقت مذکورہ اصول پر عمل نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ:

> "ابھی ابھی ہندوستان فتح ہوا ہے،اس وقت مسلمانوں کا تناسب بس اس قدر ہے کہ جیسے آٹے میں نمک۔اس صورت میں اگر اس اصول پر عمل کیا گیا تو یہ ممکن ہے کہ ہندو متحد ہوجائیں اور ملک میں فساد برپا کردیں گے اور ہماری طاقت کمزور ہے،اس لیے ہم ان پر قابو نہیں پاسکیں گے،لیکن جب ذرا وقت گذر جائے گا اور مسلمان ہر جگہ پہنچ جائیں گے اور آباد ہوجائیں گے اور لشکروں کی تعداد میں اضافہ ہوجائے گا تو ہم ہندوؤں کے ساتھ یہی معاملہ کریں گے"۔(۳۵)

یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مشرکین وکفار کو بھی ذمی کا درجہ دیا جائے گا، جب کہ شافعی کے یہاں ایسا نہیں ہے اور جن علماء نے عہد التمش میں اس مسئلہ کو ابھارا وہ اسی آخر الذکر مسلک سے تعلق رکھتے تھے، جن میں ایک عالم دین سید مبارک (۳۶) غزنوی بھی تھے۔ چوں کہ بادشاہ وقت کا تعلق حنفی مسلک سے تھا، لہٰذا اس نے امام ابوحنیفہ کے قول پر عمل کر کے اسے ذمی کا درجہ دیا اور چوں کہ علماء وفد کی باتوں کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا لہٰذا انہیں مذکورہ جواب دے کر خاموش کر دیا گیا۔ اس وقت سے لے کر بعد کے عہد میں بھی ہندوؤں کی یہی حیثیت برقرار رہی جیسا کہ محمد بن قاسم کے عہد میں تھی۔ چنانچہ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی لکھتے ہیں:

> "سندھ میں محمد بن قاسم کی حکومت کے دوران ہندوؤں کی جو قانونی حیثیت قانونی وعملی طور پر تسلیم کی گئی تھی وہی تیرہویں صدی عیسوی کی ابتدا میں دہلی سلطنت کے قیام کے بعد بھی برقرار رہی جیسا کہ اس زمانہ کی تاریخی کتب اور سرکاری دستاویز سے واضح ثبوت ملتا ہے۔" (۳۷)

ہندوستان میں انبیاء ورسل کے بعثت کا امکان

قرآنی تصریحات کے مطابق ہر قوم وملت میں نبی اور رسول بھیجے گئے، تاکہ ان کی زبان اور ان کے مزاج کے مطابق خدا کا پیغام پہنچائیں اور سمجھائیں تاکہ وہ برائیوں اور غلط کاموں سے اجتناب کریں اور اللہ کی رضا حاصل کریں۔ اس اعزاز سے ہندوستان کو محروم کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے عہد میں علماء کی ایک بڑی تعداد نے وضاحت کی ہے کہ ہندوستان میں بھی خدا کے فرستادہ آئے ہیں جنھوں نے احکام الٰہی کی تبلیغ کی۔ حضرت مجدد الف ثانی (۳۸) کی یہی رائے ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں (۳۹) نے نبی کی آمد کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ ہندوؤں میں وید الہامی کتاب ہے جو برہما فرشتے کے ذریعہ بھیجی گئی ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۴۰) کا بھی یہی خیال ہے۔ بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی (۴۱) کا مسلک اس سلسلے میں اتنا محتاط تھا کہ وہ رام چندر جی اور کرشن جی کی شان میں گستاخی کو منع فرماتے تھے؛ کیوں کہ ان کے خیال میں ان کے رسول ہونے کا امکان ہے (۴۲)۔ مولانا مناظر احسن گیلانی (۴۳) نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں نبی ورسول کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا (۴۴)۔ شاہ عبدالرحمٰن چشتی نے متعدد حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ ہندو دھرم اور سماج میں نبی ورسول کی بعثت کا

تصور ہے (۴۵)۔ حضرت تھانوی (۴۷) اور شیخ الحدیث مولانا زکریا (۴۸) کی رائے میں یہاں نبی و رسول کے مبعوث ہونے کے واضح اشارے ملتے ہیں (۴۹)۔ عبدالرزاق ہانسوی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، جناب اجمل خاں، سید اخلاق دہلوی، شمس نوید عثمانی وغیرہ کی یہی رائے ہے (۵۰)۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۵۱) کی تفسیر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں نبی ورسول آئے کیوں کہ وید میں نبی آخر الزماں کے مبعوث ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> میں کہتا ہوں کہ اگر مجوسیوں کے اسلاف کا اہل کتاب ہونا ان مجوسیوں کے اہل کتاب قرار دینے کیلئے کافی ہے تو ہمارے زمانہ کے ہندو بت پرست بھی اہل کتاب ہوجائیں گے۔ ان کے پاس بھی وید نام کی ایک کتاب ہے، جس کے چار حصے ہیں، اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہ خدائی کتاب ہے، پھر ان کے اکثر اصول بھی شرعی اصول کے موافق ہیں اور جن اصولوں میں اختلاف ہے وہ شیطانی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ جس طرح شیطانی تفرقہ اندازی سے مسلمانوں کی جماعت پھٹ کر بہتر فرقے بن گئی۔ ہندوؤں کے اہل کتاب ہونے کی تائید قرآن سے بھی ہورہی ہے۔ اللہ نے فرمایا وان من امة الاخلا فيها نذير ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر ضرور گذرا ہے۔ مجوسیوں سے تو ہندو اہل کتاب کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں۔ مجوسیوں کے بادشاہ نے تو نشہ سے بدمست ہوکر اپنی بہن سے زنا کی اور اپنے دین وکتاب کو چھوڑ دیا اور دین آدم کا مدعی بن بیٹھا، مگر ہندوؤں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی، البتہ رسول اللہ کی رسالت کا انکار کرنے کی وجہ سے کافر ہوگئے۔ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ چوتھے وید میں رسول اللہ کی بعثت کی بشارت مذکور ہے جسکو پڑھ کر ہندو مسلمان ہوگئے۔" (۵۲)

مذکورہ اقتباس میں شامل آیت قرآنی کی تفسیر وتوضیح بیان کرتے ہوئے مولانا سید اخلاق حسین دہلوی لکھتے ہیں کہ:

> "اس بیان سے یہ مستفاد ہے کہ اگر کوئی قوم یا امت کسی کتاب کے خدائی کتاب ہونے کا دعویٰ کرتی ہے جیسا کہ مجوس وصائبین تو یہ کہہ کر کہ قرآن پاک میں اس کا نام نہیں ہے، اسے رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ جنہیں قرآن پاک کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں سب ہی آسمانی یا خدائی کتابوں کے نام نہیں ہیں۔ اس لیے کہ قرآن پاک فہرست کتب نہیں ہے، البتہ قرآن پاک میں سابقہ تین

آسمانی کتابوں کے نام واضح طور پر ہیں جو اس عہد میں معروف ومروج تھیں، چوتھا نام خود قرآن پاک کا ہے۔ان کے علاوہ سابقہ آسمانی کتابوں کا ذکر مجملاً ہے، جیسے الزبر والکتاب المنیر وصحف الاولی، بہرحال جن کتابوں کو بعض قومیں آسمانی کتاب مانتی ہیں تو ان کے متنوں کے مطالعہ سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے کہ اگر وہ توحیدی ہدایات سے اور تصور آخرت سے مزین ہیں اور طاغوتی لغویات سے فی نفسہ مبرا ہیں تو ان کا آسمانی کتابیں ہونا اقرب از یقین ہے۔البتہ تحریف والحاق کو مسترد قرار دینا ہوگا جو آسمانی کتاب میں لاحق ہوتا رہا ہے،لیکن فی نفسہٖ انکار نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ ہمیں یہ ہدایات بھی نہیں ہے کہ ہم انکار ہی کریں تسلیم نہ کریں،اس لیے خذ ما صفا و دع ما کدر پر عمل کرنا ہوگا اور توحید وتصور آخرت کی عظمت کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔" (۵۳)

اسی طرح مولانا ابوالکلام (۵۴) آزاد نے لکھا ہے کہ اگر مجوسی وصابئی کو اہل کتاب کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے تو ہندو بدرجہ اولیٰ اس میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔اگر مجوسیوں کے پاس زنداوستا خدائی کتاب کا دعویٰ ہے جسے وہ پڑھتے پڑھاتے ہیں تو ہندوؤں کے ہاں بھی اس قسم کی کتابیں موجود ہونے کا امکان ہے اور یہ باتیں وہی کہہ سکتا ہے جنہیں ان کے حالات کا گہرا علم ہے۔(۵۵)

ان باتوں کے علاوہ مسند احمد کی حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کی ہدایت کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء ورسل بھیجے گئے (۵۶)،جن میں کچھ کی وضاحت قرآن میں موجود ہے، جبکہ بیشتر کے متعلق کوئی صراحت نہیں ملتی۔اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ غیر مسلموں میں نبی ورسول کا امکان ہے۔

یہ تمام تصریحات اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ہندوستان میں انبیاء ورسل مبعوث ہوئے۔لیکن ان آرا سے کلی طور پر اتفاق اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ کوئی واضح دلیل سامنے نہ آجائے،لیکن علماء کی رائے کی روشنی میں یہ فیصلہ ضرور کیا جاسکتا ہے کہ مسلم حکومت کے قیام کے ابتدائی زمانہ میں انہی تصریحات کی روشنی میں معاصر علماء وفقہائے ہندوستان کے غیر مسلموں کو شبہ اہل کتاب کے زمرے میں شامل کرکے ان کی شرعی حیثیت متعین کی جس پر محمد بن قاسم اور بعد کے سلاطین نے عمل کیا۔ (جاری)

کیا ہندوعرب دوستی ''مسلم تشٹی کرن'' ہے؟

از: ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی
۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

۱۳/نومبر ۲۰۰۶ء کونئی دہلی میں منعقدہ ہند،عرب تعلقات: ترقی میں ''پارٹنرشپ'' کے موضوع پرمنعقدہ دوروزہ کانفرنس کاافتتاح کرتے ہوئے مرکزی وزیرخزانہ پی چدمبرم نے بتایا کہ اس وقت ۳۵ لاکھ سے زیادہ ہندوستانی عرب ملکوں میں کام کررہے ہیں جوسالانہ ۲۴/ارب ڈالر اپنے وطن بھیجتے ہیں۔ان ممالک کو ہندوستان سے جانے والے سامان کی مالیت سالانہ ۱۷/ارب ڈالرہوگئی ہے۔(راشٹریہ سہارا۱۴/۱۱/۲۰۰۶ء)

اس کے علاوہ وزیرموصوف نے عرب اور ہندوستان کے درمیان روایتی، قدیم مذہبی، تہذیبی رشتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ عرب نے دنیا کوایک عظیم تہذیبی سرمایہ دیا ہے اور ہندوستان بھی اس سے مستفید ہوا ہے۔ان اعدادوشمار کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہرکس وناکس سمجھ سکتا ہے کہ یہ اعدادوشمار پوری طرح مادّی لحاظ سے بھی ہمارے ملک کے حق میں ہیں۔ ہمارے غریب مزدور، کسان، کم ہنرمند افراد، ہنرمند افراد ۳۵ لاکھ کی تعداد میں وہاں رہ رہے ہیں تو یقیناً ان سے ہندوستان کے کیرالہ سے لے کر آسام اور کشمیروگڑھوال تک کروڑوں خاندان اور وہ بھی غریب خاندان عزت کی زندگی گذار پارہے ہیں۔انھوں نے مفلوک الحالی اور بھکمری کے عذاب کے بعد خوشحالی اورشکم سیری کی نعمتوں کا مزہ پایا ہے۔اس موقع پرخاص بات جس پر دھیان دیا جانا ضروری ہے وہ یہ کہ امریکہ، یوروپ اور دیگرممالک میں صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہت مالدار افراد کے لئے ہی روزگار میسر ہے جب کہ عام غریب اوران پڑھ انسان کوروٹی روزی انہیں عرب ممالک میں میسر ہے۔مگرافسوس کا مقام ہے کہ ہمارے حکمراں طبقہ کی اکثریت چونکہ نسل پرستی کے فلسفہ کوہی مذہب سمجھتی ہے اس لئے وہ اسلام اور مسلمانوں سے جڑی ہر چیز اور ایشو کومشکوک اور

زیادہ سادہ الفاظ میں دیش بھکتی کے خلاف ثابت کرنے پراتارورہتی ہیں۔ ہندوعرب دوستی کوبھی ایک طرح سے مسلمانوں کی خوشامد ''تشٹی کرن'' کے زمرہ میں رکھ کر باقاعدہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔عربوں سے جڑی ہرخبر کوسیاہ عینک چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔مگروہیں پرنسل پرست اور غاصب ریاست اسرائیل کے بڑے سے بڑے عیب اورجرم کوشیرمادر کی طرح ہضم کرلیا جاتا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں اسرائیلی سیاح راجستھان، گوااوراترانچل وغیرہ میں آتے ہیں اور انتہائی فحش اورعریاں حرکتیں ومناظر پیش کرتے ہیں نشہ آورادویہ کے استعمال خصوصاً گانجہ کے تو اتنے عادی ہیں کہ وہاں کی حکومت کورشی کیش (اترانچل) میں ایک عمارت کرایہ پرلے کرخصوصاً اسرائیلی مذہبی شخصیات کوبلایا جارہاہے تاکہ وہ انہیں ان فحش حرکات سے روکیں۔راجستھان سے اُن کی بے حیائی اورعریانی کے مظاہر پر بہت ہنگامہ ہوچکا ہے۔وہ واقعہ بھی بہت پرانا نہیں ہے کہ ایک اسرائیلی خاتون نے برہنہ ہوکر مندر میں شادی کی اور بازار میں بھی گھومی اوراس پر مقامی عدالت میں مقدمہ بھی چلا۔مگر ہمارے نسل پرست میڈیا نے اس کووہ رنگ اورکوریج نہیں دیا جووہ کسی اکادکا عرب کی عیاشیوں کودیتے ہیں۔ ہمارے حکومت کے وزراء اور مسلم دشمن سیاستداں تو ہرسال میں کئی بار وہاں ''کھیتی باڑی کے گر'' سیکھنے جاتے ہیں۔ گجرات میں توپوری اسمبلی کوسرکاری خرچ پراسرائیل لے جانے کی ریاستی سرکار کی دعوت ہے۔مہاراشٹر سے تعلق رکھنے والے بڑے مرکزی وزیراورسابق وزیردفاع بھی وہاں کئی بار زراعت کے گرسیکھنے وہاں جاتے رہے ہیں۔ اوریہی وہ ریاستیں ہیں جہاں فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ بہت سنگین ہوتا جارہا ہے۔فرقہ وارانہ تعلقات پربھی منفی اثر ہورہا ہے۔

سپریم کورٹ آف انڈیا کے معزز ایڈوکیٹ ڈاکٹرنفیس احمد صدیقی ایڈوکیٹ نے بجا طور پر اپنے ایک حالیہ خط میں سوال اٹھایا ہے کہ ہندوستان میں بہت سی بیرونی خفیہ ایجنسیوں کوکام کرنے کی چھوٹ ملی ہوئی ہے کیا وہ ہندوستان میں سیکورٹی کے سنگین حالات پیدا کرنے کے لئے سازشیں نہیں رچ سکتیں؟ ہندوستان میں سیکورٹی کے حالات خراب ہونے کا سیدھا فائدہ ان ممالک کوہی پہنچتا ہے جوہندوستان کواسلحہ کی سپلائی کرتے ہیں۔اوران ممالک میں امریکہ، روس، اوراسرائیل ہی تین ایسے ملک ہیں۔ اسلحہ کی صنعت ان تینوں ممالک بلکہ دیگر یوروپی ممالک خصوصاً برطانیہ اورفرانس وغیرہ کیلئے بھی بہت اہم ہیں۔اور اسلحہ کی تجارت میں جتنا بڑا کمیشن ہتھیارخریدنے والے ممالک کوملتا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ بوفورس کی مثال توپرانی

ہے حال کے دنوں میں ہر اک میزائیل میں کمیشن کے مسئلہ پر ہمارے یہاں بہت ہنگامہ ہوا ہے جانچ چل رہی ہے۔ مگر یہ طے ہے کہ کمیشن دیا گیا اور باوجود موجودہ صدر جمہوریہ کی عدم سفارش کے یہ میزائیل خریدے گئے۔ اربوں ڈالر کے سامان کی کمیشن بھی کروڑوں ڈالروں میں تو ہوتی ہی ہوگی۔ ۱۲؍دسمبر کو پارلیمنٹ کی کمیٹی نے انکشاف کیا کہ بارودی سرنگیں صاف کرنے کے لئے منگائی گئی (ہنگامی خریداری کی بنیاد پر) مشینوں کی خریداری میں ملک کو ایک ارب روپیہ کا چپت لگا۔ مگر یہ دیش درو نہیں ہے؟

اسرائیل کی ایک تاریخ رہی ہے سازشوں اور قتل وغارت گری کی اور تاریخ میں اس کی تمام مثالیں موجود ہیں کہ وہ دشمن سے کس طرح سے عیارانہ جنگ کرتے ہیں اور مفاد کے حصول میں کس طرح آگے جاسکتے ہیں؟

(۱) ۸؍اکتوبر ۲۰۰۳ء کو ایجنسیوں کے حوالہ سے خبر شائع ہوئی کہ ۱۹۹۹-۱۹۹۸ء میں انسداد دہشت گردی کا آپریشن اسرائیلی اینٹلی جنس کے تعاون سے FBI کے آفس سے جاری کیا گیا۔ یہ چال اس وقت چلی گئی جب بل کلنٹن اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان امن کے لئے ثالثی کی کوشش کررہے تھے۔ اس وقت کی اٹارنی جنرل جینیٹ رفیو نے اسے تسلیم کیا تھا۔ FBI نے پہلی بار اس سازش کو تسلیم کیا لیکن وہ کبھی بھی عدالت نہیں پہنچی۔ اس آپریشن کے دوران اسرائیل اور FBI نے ہزاروں ڈالر حماس کے لیڈروں کو بھیجے تاکہ وہ اس سے اسلحہ خرید کر کچھ بھی کارروائی کریں اور نتیجتاً کلنٹن کی ثالثی کی کوشش ناکام ہوجائے۔ ایری زونا کے ایک تاجر ہیری ایلین نے گواہی دی کہ FBI کے Kenneth Welliams کینتھ ولیمس نے کہا کہ وہ یہ رقم حماس کی کسی شخصیت کو پہنچائے۔ کلنٹن کے مشیر بینیٹر برجر نے کہا کہ وہائٹ ہاؤس کو ان حرکتوں کے بارے میں لاعلم رکھا گیا۔ یہ ساری معلومات عدالتی ریکارڈ اور گواہوں کے بیانات سے ماخوذ ہیں جو کہ واشنگٹن سے ایجنسیوں کے حوالہ سے ۸؍اکتوبر ۲۰۰۳ء کو شائع ہوا۔

(۲) ۲۴؍جنوری ۲۰۰۶ء کو واشنگٹن سے ہی خبر ہے کہ ''امریکہ نے دہشت گرد تنظیم الفتح کو ۲۰ لاکھ ڈالر دیئے۔ نیویارک ٹائمس نے مشرقی یروشلم کے تعینات امریکی تجارتی سفارت خانہ کے مکالا سوئیر بلہم کے حوالے سے بتایا کہ اس پوری رقم کا استعمال حماس کو شکست دینے کے لئے کیا جائے گا۔ ایک دوسرے اخبار واشنگٹن پوسٹ نے لکھا کہ U.S.A.I.D بظاہر فلاحی تنظیم فلسطین میں مختلف پروگراموں میں ۲۰ لاکھ ڈالر خرچ کررہی ہے۔ (شاہ ٹائمس ۲۴/۱۲/۲۰۰۶ء)

(۳) ۲۳؍نومبر ۲۰۰۶ء کو لندن میں سابق کے۔ جی۔ بی کرنل الیگزینڈر لتوینینکو کو ریڈیو تابکاری مادہ پلونیم ۲۱۰ کے ذریعے ہلاک کردیا گیا۔ کرنل موصوف نے اپنے انتقال سے پہلے ایک کتاب Blowing up Russia - Tenor from within میں اپنے سابق خفیہ ادارہ کی کالی کرتوتوں کے بارے میں بتایا کہ ۱۹۹۹ء میں ماسکو کی عمارتوں میں جو دھماکہ ہوئے تھے اور جس میں ۱۸۰۰ افراد ہلاک ہوئے تھے اور ۲۰۰۲ء میں ماسکو تھیٹر میں جو لوگوں کو یرغمال بنایا گیا تھا یہ دونوں حرکتیں روس کے ایجنٹوں نے کروائی تھیں۔ روس میں ہونے والے ان واقعات کا مقصد مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کرنا اور چیچنیا کے خلاف فوجی کارروائی کا جواز حاصل کرنا تھا۔ (راشٹریہ سہارا، ۱۴/۱۲/۲۰۰۶ء)

اسکالر فار نائن الیون ٹرتھ Scholars for 9/11 truth نام کی ویب سائٹ جو کہ ۷۰ ممتاز سائنسداں اور اعلیٰ پروفیسروں کی نگرانی میں چلتی ہے نے بتایا اِن حملوں کے پیچھے وہائٹ ہاؤس میں جنگ کے حامی تھے۔ جن کا مقصد افغانستان اور عراق کے خلاف جنگ اور مشرق وسطیٰ میں تیل کے ذخیروں پر قبضہ کرنا تھا۔ اس گروپ کا استدلال ہے کہ جڑواں ٹاور دو طیاروں کے ٹکرانے سے مسمار نہیں ہوسکتے تھے۔ کیوں کہ طیارے کے تیل سے درجہ حرارت اتنا نہیں بڑھ سکتا تھا کہ اس سے فولاد پگھل جائے۔ اِن ٹاورز کو مسمار کرنے کے لئے دھماکہ کیئے گئے تھے۔ ''المنار'' نیوز چینل نے واقعہ کے ۶ روز بعد اطلاع دی تھی کہ یہ یہودیوں کی کارستانی تھی ورنہ حملہ والے دن ۴ ہزار یہودی ایک ساتھ چھٹی پر کیسے تھے؟ (ایجنسیاں۔ راشٹریہ سہارا، ۱۵/۹/۲۰۰۶ء)

ہندوستان کے تناظر میں دیکھیں تو گجرات فسادات میں یہ خفیہ ہاتھ صاف طور پر نظر آتا ہے۔ فساد کے فوراً بعد کئی آزاد ذرائع نے بتایا کہ بلڈنگوں میں آگ لگانے کے لئے مخصوص دھماکہ خیز پاؤڈر استعمال کیا گیا تھا۔ پھر یہ خبر تصدیق شدہ ہوگئی جب حکومت نے اعتراف کیا کہ ہمارے پاس یہ پاؤڈر تھا جو زلزلہ کے دوران لاشوں کو جلانے کے لئے اسرائیل سے آیا تھا۔ اور یہی پاؤڈر فسادات میں استعمال ہوا۔

بابری مسجد انہدام سے متعلق الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ میں ایک رٹ مسلم فورم برائے قومی یکجہتی کے صدر اقبال قریشی نے دائر کی ہے۔ جس میں انھوں نے وشو ہندو پریشد کی رام مندر تحریک کے پیچھے غیر ملکی سازش بتائی تھی۔ رٹ میں کہا گیا ہے کہ ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء سے کچھ پہلے کلیان سنگھ وزیر اعلیٰ یوپی کے نجی سکریٹری ہر پیندر مشرا کی قیادت میں اجودھیا، کاشی، متھرا کے خفیہ

دورے کیئے تھے جن کی خبر لگنے پر مرکزی سرکار کے محکمہ داخلہ نے آئی. بی. اور ''را'' کے ذرائع سے جانچ کرائی تھی۔ خصوصی بنچ نے یو پی کی صوبائی سرکار سے حلف نامہ داخل کرنے کو کہا جو داخل نہیں کیا گیا۔ بنچ نے مرکزی سرکار کے سینئر ایڈوکیٹ این. کے. سیٹھ کو طلب کر کے رٹ پر ان کا موقف طلب کیا تو انھوں نے مہلت مانگی۔ اقبال قریشی نے اس رٹ کے تاروں کو گجرات فساد سے جوڑتے ہوئے کہا کہ وشو ہندو پریشد کی ۱۷/اکتوبر ۲۰۰۳ء کی سنکلپ سبھا کے دوران وشو ہندو پریشد نے ۸ صوبوں سے آدی واسیوں کو بلوایا تھا۔ (راشٹریہ سہارا، ۱۷/۵/۲۰۰۵ء)

اس ضمن میں ۱۵/دسمبر ۲۰۰۶ء کے فرنٹ لائن میں پرفل بدوائی کا یہ انکشاف بھی قابل غور ہے ''ہند۔ امریکی نیوکلیائی توانائی سمجھوتہ منظور کرانے میں U.S. India business council کا اہم رول تھا۔ جس میں امریکی نیوکلیائی اور اسلحہ تیار کرنے والی کمپنیوں کے نمائندہ اور Zionist American jeuish Commitee کے انتہائی با اثر لوگ شامل تھے۔ ہندوستان کو انکے اس احسان کی قیمت آگے چل کر چکانی ہوگی۔ (پرفل بدوائی۔ فرنٹ لائن ۱۵/۱۲/۲۰۰۶ء)

جو ممالک اسلحہ کا کاروبار کرتے ہیں ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ دنیا میں کسی بھی طریقہ سے بدامنی، خلفشار، تشدد پھیلے تاکہ عوام میں خوف اور عدم تحفظ کا احساس ہو اور وہ حکومتوں سے تحفظ کا مطالبہ کریں اور حکومتیں تحفظ کے لئے بڑے پیمانہ پر نئے سے نیا اور قیمتی سے قیمتی اسلحہ خریدیں۔ اِس کے لئے وہ کیا کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں - وہ ہتھیاروں کی خریداری سے متعلق بڑے بڑے سودوں بوفورس، سب میرین، ہراک میزائیل وغیرہ سب سے ظاہر ہے۔ اربوں ڈالر کی خریداری کا کمیشن بھی کروڑوں ڈالر میں ہوتا ہی ہوگا۔ جس کی طرف اشارہ CBI کے سابق جوائنٹ ڈائریکٹر بی آر لال نے کیا ہے کہ ہندوستان کے سیاستدانوں، افسروں اور سرمایہ داروں کا بیرونی ممالک میں اتنی دولت جمع ہے جتنی ہندوستان کا ۳۵ سال کا بجٹ ہوتا ہے۔

(Who owns CBI - Naked Truth by B.R. Lall)

ناندیڑ، پربھنی، اورنگ آباد میں وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے کارکنوں سے دھماکہ خیز اشیاء، نقلی داڑھیاں، پٹھانی سوٹ وغیرہ کا برآمد ہونا اور کیس کی کما حقہ تحقیقات نہ ہونا کس طرف اشارہ کرتا ہے؟ عرب ممالک کے ساتھ امتیازی رویہ کی مثال جگہ جگہ موجود ہے۔ ہوائی جہاز سے کرایہ عرب ممالک کا زیادہ ہے امریکہ اور انگلینڈ کا کم ہے۔ جبکہ دوری امریکہ اور انگلینڈ کی زیادہ

ہے۔ یہی معاملہ ٹیلی فون کال کا ہے۔ دوری کم ہونے کے باوجود وہاں کے کال ریٹ زیادہ ہیں امریکہ اور یوروپ کے کم ہیں۔ عرب ممالک بڑی مقدار میں ہندوستانی اشیاء خورد و نوش، کپڑے، زیورات وغیرہ خریدتے ہیں۔ یہاں پر لاکھوں عرب لوگ علاج کے لئے آتے ہیں اُس کا فائدہ بھی ہمارے ملک کے عوام کو ہی پہنچتا ہے۔ پھر اصولی لحاظ سے دیکھیں تو فلسطین کی آزاد ریاست کا قیام اُن کا حق ہے۔ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے حملہ کر کے مصر، شام، اردن، اور فلسطین کے بڑے علاقہ اور قبلہ اول بیت المقدس پر قبضہ کر لیا جس کے خلاف اقوام متحدہ کی ۲۸۰ قرارداد یں پاس ہو چکی ہیں۔ اس جارحانہ قبضہ کے خلاف آواز اٹھانا کیا ہمارا اخلاقی فریضہ نہیں ہے؟ اسرائیل سے ہمارے تعلقات کا موازنہ عرب ممالک سے تعلقات کریں تو اخلاقی، مالی، تہذیبی، سیاسی، خارجہ ضرورت کسی بھی لحاظ سے اسرائیل سے غیر معمولی تعلقات ہندوستانی مفادات کے حق میں نہیں ہیں۔ ہتھیار تو کھلی منڈی میں ہر جگہ سے دستیاب ہیں۔ مگر اخلاقی پہلو بھی دیکھا جانا ضروری ہے۔

ہندوستان کے ہوشمند شہریوں کی عموماً اور مسلم قیادت کی خصوصاً یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہندوستان کو غیر مستحکم کرنے والی تمام قوتوں پر نظر رکھیں چاہے وہ جو بھی ہوں۔ ہندوستان میں بدامنی اور انتشار کا فائدہ مسلمانوں کو کچھ نہیں ہوتا ہاں جنگ اور دہشت کا ماحول بننے سے ہتھیار فروخت کرنے والوں کا فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ امریکہ، اسرائیل اور روس ہندوستان کو سب سے زیادہ ہتھیار فروخت کرتے ہیں۔ ان کی ایجنسیوں کے ماضی کے کارنامے بہت بار میڈیا میں آچکے ہیں۔ ایڈوکیٹ سپریم کورٹ نفیس صدیقی صاحب نے اس طرح پھر اشارہ کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ تمام ملک دوست قوتوں کے ساتھ مل کر اِس سازش کے خلاف عوام کو مستقلاً آگاہ کیا جائے۔ جگہ جگہ اجلاس کر کے اِس مسئلہ پر عوامی بیداری لائی جائے۔ ہمارے ملک کو بدامنی، فساد اور دہشت گردی میں مبتلا کر کے اپنے اسلحہ کے کارخانہ چلانے والوں اور اپنے خارجہ پالیسی کے مفاد حاصل کرنے کے لئے ہندوستانی سماج میں نفرت، قتل، لوٹ مار کا کھیل کھیلنے والوں کے خلاف پورے ملک میں شعور بیدار کرنا وقت کا اہم تقاضہ ہے خصوصاً مسلمانوں کیلئے کیونکہ سازشی طاقتیں انہیں کو نشانہ بنا کر اپنے مذموم مقاصد حاصل کر سکتی ہیں۔ تمام محبّ وطن، انسانیت دوستوں پر لازم ہے کہ وہ متحدہ لائحہ عمل اختیار کر کے انسانیت کے دشمنوں کی مذموم کوششوں کو ناکام بنادیں۔

فرقہ وارانہ فساد... اور فدائے ملتؒ

از: فاروق اعظم عاجزؔ کھگڑیاوی
دارالعلوم دیوبند، احاطۂ مطبخ کمرہ:۱۱

یوں تو ملک کی قسمت کا ستارہ اسی دن گردش میں آگیا تھا جب کہ ہندوستان کے دوٹکڑے ہوئے اور اسکا ایک اہم عضواسکے جسم سے الگ ہوگیا، کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا قیام عظیم مصالح کے پیش نظر تھا؛ لیکن جس نظریہ کے تحت اس پودے کو لگایا گیا تھا سچی بات یہ ہے کہ وہ بارآور نہیں ہوا۔

مگدھی زبان کا مثل مشہور ہے کہ ''سانپ تو مرگیا لیکن اپنا پوا چھوڑ گیا'' اس پر عمل کرتے ہوئے سفید فام انگریز نے جاتے جاتے اس موقع سے بھی فائدہ اٹھایا اور اپنے بعد فرقہ پرست ذہنیت کے بہت سے اپنے چیلوں اور حاشیہ برداروں کو چھوڑ گیا، انگریزوں کے خونی چنگل سے ملک آزاد کیا ہوا مسلمانوں کے جان ومال کے لالے پڑنے لگے اور فرقہ پرست عناصر کے ہاتھوں ان کی نسل کشی اور کشت وخون اسلامیانِ ہند کا مقدر بن گئے، تقسیم ہند اور تشکیل پاک کے نام پر گویا مسلمانوں کو اپنی جانوں کی بلی دینا پڑی، جو پاکستان چلے گئے چلے گئے اور جو ہندوستان میں رہ گئے وہ جارحیت پسند ذہنیت کے لیے دھرتی کے بوجھ محسوس ہونے لگے، انھیں ہر طرح سے پیسنے کی ناروا کوششیں کی گئیں اور ملکی سطح پر سانپ کے چھوٹے چھوٹے بچے ہی نہیں بلکہ ان کی پرورش کرنے والے بڑے بڑے زہریلے ناگ(۱) بھی پھنکارنے لگے اور اپنے زہر سے ہندوستان کی ''گنگا جمنی'' فضا کو مسموم کرنے لگے، جگہ جگہ مسلم کش فسادات کے شعلے بھڑکنے لگے، مسلمانوں سے جینے کا حق چھینا جارہا تھا، ان کے خون سے ہولی کھیلی جارہی تھی، ان کی عورتوں کی عصمتوں کو سرِ بازار تار تار کیا جارہا تھا، ان کے معصوموں کی لاشوں کو کھلونا بنا کر فٹ بال کی طرح روندا جارہا تھا، عبادت گاہوں کو اصطبل اور قرآن مقدس کو راکھ میں تبدیل کرکے سرعام ان کی بے حرمتی کی جارہی تھی، ان کی جائداد پر ناجائز تسلط جمایا جارہا تھا، ان کے صنعتی کارخانوں کو تہس نہس کرکے

(۱) مراد حکومت کے لوگ

مسلمانوں کی معاشی قوت کو کمزور سے کمزور تر کیا جارہا تھا، ان کی آبادیوں کو تہہ وبالا کیا گیا، نان شبینہ تک سے مسلمانوں کو محروم کرنے کی ملک گیر پلاننگ کے خاکے تیار کیے جارہے تھے اور ستم بالائے ستم یہ کہ پولیس ان شرارت پسند عناصر کا قدم قدم پر پیٹھ تھپتھپاتی ہوئی نظر آرہی تھی اور ستم ظریفیوں کی حد یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ ،، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' والے اصول پر مضبوطی کے ساتھ یہ لوگ عمل پیرا تھے اور بے گناہ بلکہ ستم رسیدہ ایسے مسلمان کہ ابھی ان کے خشک حلقوم تک پانی بھی نہیں پہنچا تھا، ابھی ان کے بہتے خون کے آنسو بھی خشک نہیں ہو پائے تھے، بدن سے خون کا فوراہ بھی بند نہیں ہوا تھا، جسم کی ٹوٹی ہڈیاں ابھی جھول ہی رہی تھیں کہ ان کو بجائے اس کے کہ ان کی تسلی کا سامان مہیا کیا جاتا، ان کی مزاج پرسی کی جاتی، ان کے آنسو پوچھے جاتے، ان کی پیاس بجھائی جاتی الٹے اسی ٹوٹی کلائی میں پٹی کی جگہ ہتھکڑی لگا کر ہسپتال نہیں جیل خانوں میں بھینس بکری کی طرح ٹھونس دیا گیا اور حقِ انصاف کو بھی سلب کرنے کی ناپاک کوششیں کی گئیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ اپنے عہد شباب سے گزر رہے تھے، چوں کہ قدرت نے آپ کو ایک عظیم مجاہد کے گھر پیدا کیا تھا، آپ نے قرآن وحدیث کی زمزمہ سنجیوں سے پر خانوادے میں نشوونما پائی تھی، مولانا مرحوم جہاں ایک مرد مجاہد، بے باک اور حق گو باپ کے بیٹے تھے وہیں ملت کا درد، اس کی حالت زار پر کڑھن، اس پر پڑنے والے برے وقت میں پوری ثبات قدمی اور بیدار مغزی کے ساتھ اس کے سدّ باب کی مناسب تدابیر اور اپنی قوت عمل سے ان خاکوں میں روغن بھرنے کی سعیِ جمیل بھی آپ کو اپنے عالمگیر باپ ہی سے وراثت میں ملی تھی، چند دنوں مدرسی کے بعد مولاناؒ نے اپنے والد بزرگوار کے مشن اصلی کو آگے بڑھانے کا پختہ عزم کرلیا، چناں چہ ۱۹۵۶ء میں صدر جمعیۃ دیوبند، ۶۲ء میں صدر جمعیۃ علماء اترپردیش، ۶۳ء میں ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند اور ۷۳ء میں مولانا سید فخرالدین احمدؒ کی وفات کے بعد متفقہ طور پر آپ کو مرکزی صدارت کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ چناں چہ آپ اس وقت سے تادم واپسیں تقریباً ۳۳ سال تک جمعیۃ کے متحدہ پلیٹ فارم سے ملک وقوم کے تحفظ واستحکام اور اس کی تعمیر وترقی میں جٹے رہے اور کسی قسم کی ناخوشگوار حالات کے سامنے سپرانداز ہونے کے بجائے پورے ہوش مگر جوش کے ساتھ نبردآزما رہے، ''آئین جواں مرداں حق گوئی وبے باکی'' کا کھل کر مظاہرہ کیا اور ''اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی'' کو عملی جامہ پہنا کر یہ اعلان کردیا:

''باطل سے دبنے والے آے آسماں نہیں ہم سو بار کرچکا ہے تو امتحاں ہمارا''

آپ اسم بامسمّٰی تھے اور اسعد کے ساتھ آپ اسد بھی تھے اور اخیر دم تک لوگوں نے آپ کے اندر اس امتیازی وصف کا مشاہدہ کیا۔ چناں چہ فدائے ملت نے اپنی عملی زندگی کے روزِ اول ہی سے ایسی ایسی حیرت انگیز ملی خدمات انجام دیں کہ بڑوں کے حلقے سے بھی رشک کی صدائے باز گشت سنائی دینے لگی اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ جیسے جری و بے باک قائد کہ جس کی ایک گرج سے ایوان حکومت دہل دہل اٹھتا تھا، کے سانحۂ ارتحال کے بعد ملت میں جو یاس و نا امیدی چھا گئی تھی اور ایک خلا محسوس کیا جارہا تھا اللہ نے حضرتؒ کے وجود با مسعود سے اس خلا کو پر کردیا، مجاہد ملت کے بعد جمعیۃ کی نظامت کی باگ ڈور آپ کے سپرد ہوئی اور آپ باضابطہ طور پر اسٹیج پر آئے؛ لیکن ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے،۶۴ء کی آمد آمد تھی، رمضان بھی قریب تھا، مولاناؒ رمضان گزارنے کی غرض سے گیا (بہار) کے لیے پا بر کاب تھے کہ اچانک معلوم ہوا کہ کلکتہ سمیت مغربی بنگال کا ایک بڑا حصہ فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہوچکا ہے اور مسلمان گاجر مولی کی طرح کاٹے جارہے ہیں اور جائدادیں لوٹی جارہی ہیں، ابھی خونی ڈراموں کا اسٹیج لگا ہی تھا کہ اسی طوفانِ بلاخیز میں مولاناؒ مظلوموں کی حمایت کے لیے ابراہیمی جرأت کے ساتھ کود پڑے اور ان کی تسلی کا سامان فراہم کرنے میں ہمہ تن جٹ گئے پورے دن رمضان کا روزہ رکھ کر زخمیوں کی مرہم پٹی، بھوکوں کو کھانا کھلانا اور بے گھروں کو ٹھکانہ دینے میں گلی کوچے کی خاک چھانی اور صحابہ جیسی شب زندہ دار جماعت کا وہ عملی نمونہ پیش کیا کہ جو حضرات دن کے غازی اور رات کے نمازی تھے۔ اس واقعہ کی شہادت مولانا محمد میاں صاحب کی تحریر سے یوں ہوتی ہے کہ ''مولانا سید اسعد صاحب نے کلکتہ پہنچ کر شہر کے تباہ سترہ محلوں کا دورہ شروع کیا تو ان کو دیہات کے حالات کا بھی علم ہوا، اب ایک نئی تڑپ پیدا ہوئی اور باوجودیکہ خطرات ہر طرف سے منھ پھیلائے تھے مگر مجاہد ملتؒ کی یاد تازہ کرنے والے جواں ہمت مولانا اسعد صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند نے ان بے بسوں اور بے کسوں تک پہنچنا ضروری سمجھا... رمضان شریف کے مبارک رات دن اس میں صرف ہوئے'' (گلہائے عقیدت) اس فساد میں جمعیۃ نے باز آبادکاری اور ریلیف پر تقریباً سات لاکھ کی خطیر رقم خرچ کی۔

ابھی کلکتہ فسادات کی آگ بجھنے نہیں پائی تھی کہ ۱۹/ مارچ ۶۴ء کی شام کو مسلمانان جمشید پور پر آگ و خون کی بارش شروع ہوگئی اور مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو کی ایسی پامالی کی گئی کہ سراپا ظلم ''ہٹلر'' کی روح بھی شرما گئی، جمشید پور، راوڑکیلا، اور چائے باسا و اطراف کے تقریباً ۱۴۳۲ بے گناہوں کو شہید کیا گیا اور لاکھوں کی املاک تباہ کرکے مسلم آبادی کی کمر توڑ دی گئی،

حضرت فدائے ملتؒ نے جب یہ خبر سنی تو بے چین ہو اٹھے، اور اپنے دردمند دل کے ساتھ پورے علاقے کے گاؤں گاؤں کا تفصیلی دورہ کیا، ریلیف اور باز آبادکاری کے لیے زبردست جد و جہد اور دوڑ دھوپ کی اور جگہ جگہ کیمپ قائم کرکے زخموں سے چور جلے کٹے مسلمانوں کی مسیحائی کی اور کسی بھی امکانی تدبیر سے آپ نہیں چوکے۔

انھیں دلدوز مناظر کا نقشہ مولانا اسرار الحق صاحب یوں کھینچتے ہیں کہ ''چھٹی دہائی میں خوفناک فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، راوڑکیلا، بھلائی، کلکتہ، رانچی وغیرہ میں رونما ہونے والے فسادات کی تباہی کے واقعات کا تصور کرکے آج بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں.... کلکتہ فساد میں متاثرہ علاقوں کے دوسرے پر ان پر جان لیوا حملے ہوئے؛ لیکن ان کے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی''، ملت کے تئیں آپ کے سوز دروں کو مولانا قاسمی یوں پیش کرتے ہیں ''فسادات اور قدرتی آفات کے متاثرین کی بربادی کی خبر ملتے ہی وہ بے چین ہوجاتے تھے، ان کے چہرے پر کرب کے آثار صاف دکھائی پڑتے اور کئی بار ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے؛ لیکن ان کے آنسوؤں کے پیچھے عزم ہوتا تھا'' بلاشبہ آپ مجاہد ملت کے بعد ایسے واحد رہنما تھے جنھوں نے آگ و خون میں کود کر مظلوموں کے آنسو پوچھے اور اپنی بے پناہ جرأت و بلند ہمتی کی روشن تاریخ رقم کی۔

انھیں نسل کشی کے سیلِ رواں کے سد باب کی اہم کڑی نومبر ۶۴ء میں ''وگیان بھون'' میں ''قومی جمہوری کنونشن'' کا انعقاد ہے جس میں اس وقت کے وزیر اعظم ''لال بہادر شاستری'' نے دیگر سرکردہ لیڈران سمیت شرکت کی اور سبھوں نے اس پھیلتے زہریلے فتنے کی تریاقی کا عزم مصمم کیا، جس کا لازمی نتیجہ اس طرح ظاہر ہوا کہ فسادات کی لہر ایک حد تک سرد پڑ گئی اور مسلمانوں کو جینے کا حوصلہ ملا۔ (الجمعیۃ نمبر ص:۴۵۴)

کچھ دنوں بعد ۶۷ء میں پھر بنارس اور رانچی کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوئی، ۶۹ء میں ایک سینما میں دو جوانوں کے جھگڑے کا بہانا بناکر پولیس کی سرپرستی میں مئو اعظم گڑھ میں خونی ڈرامے کھیلے گئے، اور اسی سال ستمبر میں احمد آباد کی خوشگوار فضا کو لالہ زار کیا گیا، ملک میں ایک بار پھر مسلم کش فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور فتنہ پروروں نے اسلامیانِ ہند کے وجود کو ملک سے سرے سے ختم کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔

اس وقت ملک کے امن کا کس طرح جنازہ نکالا جارہا تھا اور حالات کیسے ناگفتہ بہ تھے اس کی حقیقی تصویر صاحبِ ''تاریخ جمعیت'' کی تحریر میں یوں دیکھی جاسکتی ہے کہ ''۶۹ء میں

ہندوستان کے فرقہ پرستوں نے ایک بار پھر اپنی شرمناک سرگرمیاں تیز کردی ہیں، جمعیۃ کے دفتر میں جب بھی فون کی گھنٹی بج اٹھتی ہے تو دل دھڑکنے لگتا ہے اور ریسیور اٹھاتے ہوئے ڈر سا لگتا ہے کہ ہو نہ ہو فساد کی خبر ہے“۔

مولانا مرحوم نے اسی طوفانی حالات میں احمد آباد کا تفصیلی دورہ کیا، اقلیت کے کشت وخون کے انسداد کے لیے مناسب تدبیریں کیں اور اپنے سوز بھرے دل کے ساتھ نومبر میں پارلیامنٹ کے ایوان میں ایسا تاریخی خطاب کیا کہ جس کا لفظ لفظ درد، کڑھن اور تڑپ سے عبارت ہے، اخیر میں جو ایک شعر کہا۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درِحق بہر استقبال می آید

اس نے ارکان حکومت کو لرزہ براندام کردیا۔

امتحاں ابھی اور بھی ہیں

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی شروع ہوچکی تھی کہ پھر مسلمانوں پر قتل وغارت گری کی آندھی چل پڑی، ان کی معاشیات کو تباہ و برباد کرکے انھیں کھوکھلا بنانے کے لیے جلگاؤں اور بھیمڑی (جو پاورلوم صنعت کا بڑا مرکز رہا ہے) کو تہ وبالا کرنے کی مکمل کوششیں کی گئیں تاکہ ایک ایک مسلمان نانِ شبینہ تک سے محروم ہوجائے، مولاناؒ اس خبر کو پاکر تڑپ تڑپ اٹھے اور پوری پامردی سے فرقہ واریت کے اس دہکتے شعلے میں بے خوف کود پڑے، تڑپتی لاشوں کو اٹھایا، ان کی مرہم پٹی کی، آنسو پوچھے اور ہر طرح سے ان کی بازیابی اور سابقہ حالات پر لانے کی انتھک کوشش کی اور شرپسندوں سے سختی سے نمٹنے کے لیے ایوان حکومت میں صدائیں بلند کیں۔

ابھی یہ مردِ مجاہد ایک عظیم معرکہ سَر کرکے چین کے دو سانس بھی نہ لے سکا تھا کہ اسی سال ”ہزاری باغ“ میں ایک مری پڑی گائے کا بہانہ بناکر پولیس کی نگرانی میں خون خرابہ کا جو ننگا ناچ ناچا گیا کہ آسمان بھی تڑپ اٹھا اور زمین بھی دہل گئی۔ مولانا مرحوم نے پوری ثبات قدمی کے ساتھ وہی کچھ کیا جو ایک دردمند باپ اپنی اولاد کے لیے کرتا ہے۔ چناں چہ ۷۰ء میں مولاناؒ نے ناظم عمومی کی حیثیت سے پارلیامنٹ کے معزز ایوان میں مسلم اقلیت کی مسلسل نسل کشی پر کرخت لہجے میں ارباب حل وعقد کو متنبہ کیا اور یوں گویا ہوئے: ”ابھی تازہ واقعہ جائے باسہ کا ہے، جہاں اگر

فرقہ پرستوں اور پولیس کی سازش نہ ہوتی تو اقلیت طبقہ کے پچیس افراد کے بے دردی سے موت کے گھاٹ نہ پہنچایا جاتا... پولیس نے حالات سے چشم پوشی کی ہے“ اخیر میں صدر جمہوریہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”اگر ذمہ دارانِ حکومت نے اپنی ذمہ داری کو اب بھی نہیں پہچانا تو ملک کو نراج اور تباہی سے نہیں بچایا جاسکتا“؛ لیکن ابھی اور ابھی اس مرد دلیر کی سرفروشانہ داستان کا مطالعہ کرتے جائیے اور سر دھنتے جائیے!!!

۱۹۷۲ء کے نصف اخیر کا زمانہ چل رہا تھا کہ ایک بار پھر مسلم کش فسادات سے سرزمین ہند لہولہان ہوگئی اور گویا اس ملک کے سینے پر اسلام دشمنی کا کوہِ آتش فشاں پھوٹ پڑا تھا۔

چناں چہ جون ۱۹۷۲ء میں علی گڑھ، بنارس اور فیروز آباد میں اقلیت پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے، جان، مال، جائداد اور کارخانے ہر ایک کو نشانہ بنایا گیا اور مسلمانوں کے خونِ جگر کو نچوڑ کر خونی معرکہ کو مزید بھڑکایا گیا، ایسے ہی اسی سال عثمان آباد (مہاراشٹر) دادری، اعظم گڑھ، گجرات، بہار اور کرناٹک میں بڑے بڑے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور ہر طرح سے مسلمانوں کو تباہی و بربادی کے دہکتے تنور میں جھونکا گیا، اسی زمانہ کی تصویر کشی مولانا اسیرادروی صاحب یوں کرتے ہیں کہ ”جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کا کوئی اجلاس ایسا نہیں جس میں نسل کشی کی اس انسانیت سوز مہم پر نوحہ خوانی اور ماتم سرائی نہ کی گئی ہو، مجلس عاملہ کا رجسٹر کارروائی آزادی کے بعد سے ہونے والے ان فسادات کی انسائیکلوپیڈیا ہے“۔

مولانا مرحوم نے ملک کے ناگفتہ بہ حالات کے پیش نظر ایک بار پھر پارلیامنٹ میں حیدری رعب کے ساتھ ذمہ دارانِ حکومت پر سخت نکتہ چینی کی اور پولیس کی درندگی کا پردہ فاش کرتے ہوئے اس کی سخت مذمت کی اور فرمایا کہ: ”اس سال انیس بڑے فسادات ہوئے ہیں جن میں بنارس، بنگلور اور دربھنگہ سرفہرست ہیں، اور خون کا آنسو پیتے ہوئے مزید یوں گویا ہوئے کہ: جن کو لوٹا جائے، مارا جائے ان کو ہسپتال کے بجائے جیل خانہ لے جایا جاتا ہے، جن کے ہاتھوں کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں انھیں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں بھی ڈالی جاتی ہیں، میری نگاہیں خود اس واقعہ کی گواہ ہیں۔

حضرت فدائے ملتؒ اپنے بے مثال باپ کی عظیم روایات کے سچے امین اور حقیقی وارث تھے۔ بقول مولانا انظر شاہ کشمیری صاحب: ”(انھوں نے) اپنے نامور باپ کی ہر گوشہ میں جانشینی کی اور کافی حد تک اس کا حق ادا کیا“ چناں چہ ۱۹۷۳ء کا زمانہ تھا، مولانا سید فخرالدین احمدؒ مسند صدارت کو الوداع کہہ کر مالک حقیقی سے جا ملے تھے، آپ کی بالغ نظری اور دوسری کے پیش نظر

صدارت کا بارگراں آپ کے کاندھے پر رکھا گیا، اس وقت ارض وطن بڑے پرآشوب دور سے گزر رہی تھی، جہاں ایک طرف اسلام دشمن عناصر مسلمانوں کے آئینی حقوق پر حملہ آور ہورہے تھے اوران کی پرسنل لاء میں مداخلت کی ناپاک کوشش کررہے تھے وہیں مسلم کش فسادات پھر راہ لینے لگے تھے اوراسکا شرارہ روز بروز تیز سے تیزتر ہی ہوتا جارہا تھا، چناں چہ اسی سال گجرات کے مسلمان فساد کی زد میں آئے اور ۱۹۷۴ء میں منظّم سازش کے تحت میرٹھ، الٰہ آباد میں قیامت برپا ہوئی، پونہ، جھنڈواڑہ (مدھیہ پردیش)، پورسد (گجرات)، رانچی (بہار)، شرپسندوں کی ہوسناکی کے شکار ہوئے، اسی طرح آگرہ، کھرگون (مدھیہ پردیش)، بمبئی کو بھی نشانہ بنایا گیا، ۱۹۷۵ء میں یہ سلسلہ آگے بڑھتے ہوئے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، ہندوستان پر لاقانونیت کا منحوس سایہ دراز سے درازتر ہوتا چلا گیا اور قانون بازیچۂ اطفال بن کر رہ گیا تھا۔ چناں چہ ۱۹۷۷ء میں بنارس میں ایک بار پھر قتل وغارت گری مچائی گئی، جنوری ۱۹۷۸ء میں بہار کا ضلع بہار شریف پوری طرح جھلسایا گیا اوراسی سال مارچ میں سنبھل مراد آباد کی تاریخ میں وہ دن آیا جس کی پیشانی تباہیوں اور بربادیوں سے آلودہ ہوئی، اسی طرح مارچ ۱۹۷۹ء میں فولاد کے شہر جمشید پور میں دوبارہ کشت وخون اور تباہی کا جو سیلاب آیا اس نے مسلمانوں کے خرمن کو خاکستر کرکے رکھ دیا، جولائی میں ضلع پورنیہ کے گاؤں کے گاؤں کو زیروزبر کردیا گیا، زمانہ گزرتا گیا ملک کے مختلف خطوں میں چھوٹے بڑے حوادث گردش کرتے رہے، پھر ۱۹۸۹ء میں بھاگلپور کی زمین پر سفاکیت کا وہ ننگا ناچ ناچا گیا کہ جس سے درندے بھی شرما گئے، اور جارحیت پسند ہندو لٹیروں نے ظلم وستم اور قتل وخون کا وہ منظر پیش کیا کہ چشم فلک بھی اشک بار ہوگئے اور وہاں کی خوشگوار فضا دیکھتے ہی دیکھتے سراپا ماتم بن گئی۔

اس کے بعد سب سے بڑا خونی ڈرامہ فروری ۲۰۰۲ء میں گجرات کی سرزمین پر اسٹیج دیا گیا اور مسلمانوں کی عزت، اس کے تڑپتے لاشے اوراس کے سرخ خون سے پروگرام کو زینت بخشا گیا، ان کی آہ وبکا پر قہقہے لگائے گئے، انھیں بے گھر کیا گیا اور پوری مسلم آبادی کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی؛ لیکن سرمایۂ ملت کے اس نگہبان ''مولانا سید اسعد مدنیؒ'' کو ان قیامت خیزیوں اورطوفانوں کے ریلے سے ٹکرانا پڑا، جان کو جوکھم میں ڈال کر جلے کٹے مسلمانوں کی مکمل مسیحائی کی، یہ فساد ہندوستان کے چہرے کا وہ بدنما داغ ہے جو مٹائے نہیں مٹ سکتا اور یہ تاریخ ہند کا بدترین المیہ ہے مولاناؒ نے مسلمانوں کو دلاسہ دیا، ان کے غموں کو ہلکا کرنے کی جان توڑ کوشش کی،

اپنی پیرانہ سالی، ضعف ونقاہت کے باوجود عالم اسلام کا بار بار دورہ کیا، ریلیف جمع کرکے ان کی بازآبادکاری کا وہ عظیم کارنامہ انجام دیا جسے عموماً تاریخ اسلامی اور خصوصاً گجرات کی لہولہان دھرتی کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

چناں چہ آپ کی زیر صدارت جمعیۃ نے عبوری راحت، طبی سہولیات، یتیموں اور بیواؤں کی کفالت، تعمیرومرمت مساجد ومکانات اور فراہمی روزگار وغیرہ عنوانات سے جمعیۃ کی اکتوبر ۲۰۰۲ء تک کی رپورٹ کے مطابق ۱۲/کروڑ ۱۶/لاکھ روپے کا صرفہ ہوچکا ہے۔ اور ''راشٹریہ سہارا یکم مارچ ۲۰۰۶ء کے مطابق ''گجرات کے سیکڑوں ماخوذ افراد کی ضمانتیں، گودھرا کے اسیروں اور بیس نگر کے افراد کی قانونی چارہ جوئی اور دیگر امور کی انجام دہی، اس کے علاوہ مختلف کالونیوں کی مسجدوں اوراسکولوں پر مشتمل ڈھائی ہزار سے زائد مکانوں میں فساد کے متاثرہ اجڑے افراد کو بسانے کا کام کیا جاچکا ہے، نیز ۵۱ گاؤں کے ڈھائی ہزار سے زائد برباد جلائے گئے مکانات کی تعمیر وتجدید کی گئی، کل ملاکر اکیاون سو مکانوں میں ۲۵۰ گاؤں کے افراد آباد ہوچکے ہیں۔

اس مختصر خونی داستان سے حضرت مولانا مرحوم کی غیرمعمولی جرأت وہمت، عزم و استقلال، دوررسی، قوت ارادی، اور تحفظ دین واسلام کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کا جذبۂ خالص، کا پتہ چلتا ہے، روئے زمین پر بہت کم ایسی مثال ملتی ہے کہ جس کی مدح وستائش کے ترانے اپنوں کے علاوہ مخالفوں کی زبانوں پر بھی ہوں،... کہنا چاہیے کہ درحقیقت یہ سب کچھ اپنے نامور والد کے روحانی فیض کا کرشمہ اوران کے بتائے ہوئے الہامی اصول کا مرہون منت تھا جیسا کہ ایک موقع پر خود فدائے ملتؒ نے فرمایا تھا: ''میرے والد ماجد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ہمیں ایمان ویقین اور تحصیل واشاعت دین کے ساتھ وطن عزیز سے عشق، آزادی سے محبت اور انسانوں کی خدمت کی جو راہ دکھائی تھی میری کوشش یہی ہے کہ جب تک زندہ رہوں ان عنوانات پر زندگی کی داستان ترتیب دیتا رہوں'' (گلہائے عقیدت، ص:۲۲) اوراخیر تک آپ اس اصول پر آہنی دیوار کی طرح قائم رہے اور پوری دیانت داری کے ساتھ ملک وقوم کی بےلوث خدمت کرتے رہے اور خدمت کرتے کرتے ۷/محرم الحرام ۱۴۲۷ھ پیر کے دن شام چھ بجے جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

ہوا تھی گو تند وتیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا تھا
وہ مرد درویش جسکو حق نے دیے تھے انداز خسروانہ

حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی بڑی صاحبزادی کا انتقال پُر ملال

مرحومہ کیلئے ایصال ثواب کی اپیل

دیوبند: ۱۰؍جنوری

دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین و شیخ الحدیث حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب کی بڑی صاحبزادی میمونہ خاتون کا دیوبند میں انتقال ہوگیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون .

مرحومہ کی عمر ۷۰ سال تھی اور وہ حضرت مولانا کی سب سے بڑی اولاد تھیں کچھ عرصہ سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھیں، وہ بڑی نیک صالح اور صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں، عمر کا بڑا حصہ مرحومہ نے بچیوں کو قرآن کریم پڑھانے اور خواتین کیلئے تبلیغی مصروفیات میں گذارا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرماتے ہوئے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور ان کی دینی خدمات کو قبولیت عطا فرماتے ہوئے اجر عظیم عطا فرمائے، آمین۔

ذمہ دارانِ مدارس اور متعلقین سے ایصال ثواب کی گذارش ہے۔

جاری کردہ دفتر اهتمام دارالعلوم دیوبند

نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۹۱ | صفر ۱۴۲۸ھ مطابق مارچ ۲۰۰۷ء | شمارہ: ۳

مدیر	نگراں
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند- ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۰ روپے، سالانہ -/۱۰۰ روپے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۶۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۱۲۵ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۵۰ روپے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411077577 *(EDITOR)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman, Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P. Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	بدیہیات قرآن-حکمتیں اور فائدے	محمد عارف جمیل مبارک پوری	۸
۳	ایک سے زائد حج فقہ ترجیحی کی روشنی میں	علامہ یوسف القرضاوی	۱۸
۴	سلاطین ہند کے عہد میں غیر مسلموں کی شرعی حیثیت	محمد شمیم اختر قاسمی	۲۱
۵	صدام حسین کو پھانسی....	مولانا نور عالم خلیل امینی	۳۱
۶	مدارس اسلامیہ اور علماء دین کی ذمہ داری	میر زاہد مکھیالوی	۴۳
۷	مغربی ممالک اسلام سے خوف زدہ کیوں؟	محمد اللہ خلیلی قاسمی	۴۹
۸	نابغہ روزگار ہستی جو اب مرحوم ہے....	عادل صدیقی	۵۴

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا نور الحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مکتبہ معاویہؓ داؤد والا ڈاکخانہ کرم علی والا، براستہ شجاع آباد ضلع ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

ہندوستان کی علمی تاریخ سے جولوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے دوراقتدار میں تعلیم وتدریس کا تمام تر انحصار مسلم حکمرانوں، امراء اور نوابین کی علم پروری، علماء نوازی اور داد ودہش پر تھا، ہرشہر اور قصبات میں سلاطین اور امراء کی جانب سے مدرسے قائم تھے جن کے مصارف کی مکمل ذمہ داری شاہی خزانے پر ہوتی تھی، چنانچہ اجمیر، دہلی، پنجاب، آگرہ، اودھ، بنگال، بہار، دکن، مالوہ، ملتان، کشمیر، گجرات وغیرہ میں اس قسم کی ہزاروں درسگاہیں قائم تھیں، ان باقاعدہ درسگاہوں کے علاوہ علماء شخصی طور پر بھی اپنے اپنے مستقر پر تعلیم وتعلّم کی خدمات انجام دیا کرتے تھے، اوران علماء کو معاش کی جانب سے بےفکر رکھنے کے لئے دربارشاہی سے مدد معاش کے عنوان سے جاگیریں اوروظائف مقرر تھے۔

مسلمانوں کا یہ نظام تعلیم ۱۸۵۷ء تک قائم رہا، اس نظام تعلیم میں عام طور پر صرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر، حدیث وغیرہ کے علوم وفنون پڑھے پڑھائے جاتے تھے، البتہ حدیث وتفسیر کا فن برائے نام تھا، زیادہ توجہ فقہ واصول فقہ اور پھر منطق وفلسفہ پردی جاتی تھی۔

۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا چراغ گل ہوگیا، اور مسلمانوں کی بجائے سیاسی اقتدار پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو یہاں کے عام باشندے اوربطور خاص مسلمان "انّ الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها و جعلوا اعزة اهلها اذلة" (۱) کے فطری اصول کا تختۂ مشق بن گئے۔

(۱) جب بادشاہ کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو برباد اور اس کے باعزت باشندوں کو ذلیل کرڈالتے ہیں۔

اس سیاسی انقلاب نے مسلمانوں کے اقتصادی، تمدنی اور علمی ودینی نظام کو کس طرح پامال کیا اس کی تفصیل سرولیم ہنٹر نے اپنی کتاب ''آور انڈین مسلمانز'' ہمارے ہندوستانی مسلمان میں کسی قدر بیان کی ہے، انھوں نے ایک جگہ مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی اور مشکلات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> حکومت نے ان کے لئے تمام اہم عہدوں کا دروازہ بند کردیا ہے۔ دوسرے ایسا طریقۂ تعلیم جاری کردیا ہے جس میں ان کی قوم کے لئے کوئی انتظام نہیں ہے تیسرے قاضیوں کی موقوفی نے ہزاروں خاندانوں کو جوفقہ اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے بیکار اور محتاج کردیا ہے، چوتھے ان کے اوقاف کی آمدنی جو ان کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہئے تھی غلط مصرفوں پر خرچ ہورہی ہے (۱)

تعلیم کے سلسلہ میں اس نئی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ اس طرح کا تعلیمی نظام رائج کیا جائے جسے پڑھ کر ہندوستانی ذہنی وفکری طور پر بالکل انگریز یا کم ازکم ایماندار ومحنتی رعایا بن جائیں۔ چنانچہ مسٹر الفنسٹن اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں:

> میں اعلانیہ نہیں تو درپردہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا، اگرچہ مجھے گورنرصاحب سے اس بارہ میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جائے تاہم جب تک ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں، تب تک ان کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں، اگر تعلیم سے ان کی رایوں میں ایسی تبدیلی پیدا نہ ہوسکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم وہ اس سے زیادہ ایماندار محنتی رعایا تو ضرور بن جائیں گے (۲)

اس سلسلے کی تفصیلات کے لئے اسباب بغاوت ہند از سرسید مرحوم، روشن مستقبل از مولوی سید طفیل احمد مرحوم اور نقشِ حیات ج۲ از شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ ملاحظہ کی جائیں۔

ان حالات میں مسلم مفکرین ومدبرین کا یہ متفقہ فیصلہ ہوا کہ گورنمنٹ کا قائم کیا ہوا نظامِ تعلیم مسلمانوں کی ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا، بلکہ یہ اسلامی تہذیب اور کلچر کیلئے تباہ کن اور ان کے عقائد واخلاق کے واسطے مہلک ہے، مگر اس نظام کی اصلاح کے سلسلے میں ان کی رائیں مختلف ہوگئیں، ایک جماعت نے مسلمانوں کی اس زبوں حالی کا علاج انگریزی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن میں تجویز کیا، بالفاظ دیگر اس جماعت کا اصل مقصد مسلمانوں کی اقتصادی

(۱) موج کوثر، ص: ۴۷۔ (۲) روشن مستقبل، ص: ۹۵۔

اصلاح اور دنیوی پستی کا دور کرنا تھا، اس جماعت کے سربراہ اور قائد سرسید احمد مرحوم تھے، اور اس نظریہ کا اولین مظہر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے، سرسید مرحوم بھی اگرچہ مذہب کی ضرورت کو تسلیم کرتے تھے مگر دنیوی ترقی کو وہ اولیت دیتے تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ دنیوی ترقی کی راہ سے دینی مقاصد تک پہنچا جائے، مرحوم اپنے اس نظریہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے تھے۔

''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔''

مگر وہ اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہیں ہوسکے، چنانچہ تحریک علی گڈھ کے معقول وکیل اور سرسید مرحوم کے زبردست حامی شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں: ''وہ مغربی علوم کے ساتھ ایمان کامل اور صحیح مذہبی تربیت کو ضروری سمجھتے تھے، لیکن اس میں انھیں پوری کامیابی نہیں ہوئی۔''(۱)

اس ناکامی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہی شیخ اکرام لکھتے ہیں:

''جن لوگوں نے مسجدوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر تعلیم پائی، ان میں تو سرسید، محسن الملک اور وقار الملک جیسے مدبر اور منتظم پیدا ہوئے، جو لوگ انگریزی سے قریب قریب ناواقف تھے اور جن کے لئے مغربی ادب ایک گنج سربستہ تھا انھوں نے نیچرل شاعری اور ایک جدید ادب کی بنیاد ڈالی، اور آب حیات، سخندانِ فارس، شعر وشاعری، مسدس حالی جیسی کتابیں تصنیف کرلیں، لیکن جن روشن خیالوں نے کالج کی عالیشان عمارتوں میں تعلیم حاصل کی اور جن کی رسائی مغرب کے بہترین اساتذہ اور دنیا بھر کے علم وادب تک تھی وہ مطمح نظر کی پستی اور کیرکٹر کی کمزوری سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پرزے بن جائیں۔''(۲)

مزید تفصیل کے لئے موج کوثر کے صفحات ۱۵۰-۱۵۱ دیکھے جائیں۔

مفکرین اسلام کی دوسری جماعت کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء کا واحد ذریعہ اسلامی تعلیمات ہیں، لہٰذا برٹش گورنمنٹ کی تعلیمی امداد واعانت سے صرفِ نظر کرکے دینی درسگاہیں اور اسلامی ادارے قائم کئے جائیں، اس جماعت کے سامنے بھی مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی تھی مگر اس نے اولیت ایمانیات وروحانیات کو دی اس جماعت کے سرخیل اور میر کارواں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے، اور نقطۂ نظر کا مظہر اولین دارالعلوم دیوبند ہے، شیخ اکرام ان دونوں نظریوں کے اختلاف کو ان الفاظ میں

(۱) موج کوثر، ص:۱۴۶۔ (۲) موج کوثر، ص:۱۴۸۔

بیان کرتے ہیں:

''سرسید کا مقصد مسلمانوں کے دنیوی تنزل کو روکنا تھا اور ارباب دیوبند کی نظر دینی ضرورت پر تھی، پھر سرسید طبقۂ امراء کے رکن تھے اور مولانا قاسم جمہور کے نمائندے''۔(۱)

اس دوسرے نظریہ اور طریقۂ کار پر پیام ندوہ میں ان الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

''اس حقیقت سے کوئی ہوشمند اور منصف انسان انکار نہیں کرسکتا کہ دارالعلوم دیوبند کے فضلا نے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر دین خالص کی جس طرح حفاظت کی ہے، اور اس کو بدعت تحریف اور تاویل سے محفوظ رکھا ہے اس سے ہندوستان میں اسلامی زندگی کے قیام وبقاو استحکام میں بیش بہا مدد ملی ہے اور آج جو صحیح اسلامی عقائد، دینی علوم، اہل دین کی وقعت اور صحیح روحانیت اس ملک میں نظر آتی ہے اس میں بلاشبہ اس کا نمایاں اور بنیادی حصہ ہے''۔

آج کل ہندوستان میں مسلمانوں کے جو دینی ودنیاوی ادارے اور تعلیم گاہیں قائم اور اپنے طور پر خدمات انجام دے رہی ہیں وہ انھیں دونوں نقطۂ نظر کی ترجمان ہیں اور اپنے اپنے نظریے کے مطابق مسلمانوں کی علمی، دینی اور دنیاوی تعمیر وترقی میں مصروف عمل ہیں، اب اگر کسی ایک نظریہ کو دوسرے پر بزور تھوپنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ اتحاد واتفاق کے بجائے انتشار اور پراگندگی کا سبب ہوگی، آج کل ایک خاص حلقے کی طرف اسلامی درسگاہوں کی اصلاح وتنظیم کی آواز بڑی شدومد کے ساتھ بلند کی جارہی ہے بالخصوص مدارس کے نصاب اور نظام تعلیم وتربیت پر کھلے الفاظ میں حملے کئے جارہے ہیں۔

یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی تحریک کو بارآور رکھنے اور اُسے مفید تر بنانے کے لئے ضرورت کے مناسب اس میں اصلاح اور تجدید وتطہیر کا عمل جاری رہنا چاہئے جس سے مدارس اسلامیہ قطعاً مستثنیٰ نہیں ہیں، لیکن اس اصلاح کے نام پر انھیں اسکول وکالج کے قالب میں ڈھال دینے کی تجویز کسی صورت بھی قابل قبول نہیں ہے۔

ہمارے ملک میں جہاں مکمل طور پر لادینی نظام تعلیم رائج ہے اور ہمارے مسلم بچوں کی نوے فیصد سے بھی زائد تعداد اسی نظام سے وابستہ ہے۔ لے دے کر صرف چار پانچ فی صد بچے ہی اسلامی تعلیم سے متعلق ہیں اب اگر ان مدرسوں کو بھی ملک میں رائج اسکولوں کالجوں اور

(۱) موج کوثر، ص:۲۰۱۔

یونیورسٹیوں کے سانچے میں ڈھال دیا گیا تو پھر بتایا جائے کہ اسلامی علوم وفنون کو زندہ رکھنے کی کیا صورت ہوگی۔

پھر یہ آواز ایک ایسے وقت میں بلند کی جارہی ہے جبکہ حکومت وقت اپنے ذہنی تحفظات اورمخفی عزائم کے تحت ''مدرسہ بورڈ'' کا دام ہم رنگ زمیں کے ذریعہ مدارس کا شدھی سنگٹھن کرنے کی تیاریوں میں مصروف عمل ہے۔

ملت کے ان درمندوں کو آخر یہ روشن حقیقت کیوں نظرنہیں آتی کہ جماعت مسلمین کے وہ نوے فیصد سے زائد طلبہ جو عصری تعلیم گاہوں سے منسلک ہیں وہ ملت کی اقتصادی زبوں حالی اور معاشی کمزوریوں کو دور کرنے میں اپنا کوئی نمایاں اور قابل ذکر کردار پیش نہیں کرسکے تو پھر یہ چار و پانچ فیصد بچے اس سلسلے میں کیا انقلاب لاسکتے ہیں۔

اس لئے ہماری ان دانشمندوں اور ملت کے بہی خواہوں سے مخلصانہ گذارش ہے کہ خدارا مدارس اسلامیہ کو اصلی مدارس کے فکر وعمل کے دائرے میں بحالہ چھوڑ دیجئے اور ژرف نگاہی وبالغ نظری سے ملت کی زبوں حالی کی واقعی علت اور سبب سمجھئے اور پھر جرأت واستقلال کے ساتھ اسے دور کرنے کی جدوجہد کیجئے۔ مدارس کو کالج بنادینے کی سعی لاحاصل میں اپنی قوت و طاقت کو رائگاں کرنا بے سود ہے، ملت اسلامیہ اسے کسی قیمت پرتسلیم نہیں کرسکتی۔

❁ ❁ ❁

بدیہیات قرآن
حکمتیں اور فائدے

(سورہ بقرہ)

بہ قلم: محمد عارف جمیل مبارک پوری
شارجہ، متحدہ عرب امارات

(۱) فرمان باری: (أفتطمعون أن يؤمنوا لكم وقد كان فريق منهم يسمعون كلام الله ثم يحرفونه من بعد ما عقلوه وهم يعلمون) [بقرہ:۷۵]

''اب کیا اے مسلمان! تم توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات، اوران میں ایک فرقہ تھا کہ سنتا تھا اللہ کا کلام پھر بدل ڈالتے تھے اسکو جان بوجھ کر اور وہ جانتے تھے''

سوال یہ ہے کہ (عقلوہ) اور (وھم یعلمون)؛ دونوں ہم معنی ہیں پھر (وھم یعلمون) کے ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

امام رازی نے یہ سوال اٹھانے کے بعد اسکا جواب قفال کے حوالے سے دیتے ہوئے لکھا ہے:

اول: اللہ تعالیٰ کی مراد کو سمجھنے کے بعد انھوں نے اس کی غلط تاویل کی، اور انہیں یہ معلوم تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے۔

دوم: انھوں نے اللہ تعالیٰ کی مراد کو سمجھا اور انہیں یہ معلوم تھا کہ غلط تاویل کرکے وہ گنہ گار ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی سزا کے حق دار۔ اور چوں کہ گناہ کا علم ہوتے ہوئے، جان بوجھ کر انھوں نے تحریف کی؛ اس لیے یہ ان کی نہایت سخت قلبی اور حد درجہ دلیری کی بات ہے۔ اور چوں کہ اس کا مقصد آپ ﷺ کو تسلی دینا اور ان کی سرتابی پر صبر کی تلقین کرنا ہے اس لیے ان کی سرکشی جس قدر زیادہ ہوگی، اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی زیادہ ہوگی۔(۱)

(۲) فرمان باری ہے: "فويل للذين يكتبون الكتاب بأيديهم ثم يقولون: هذا

من عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا فويل لهم مما كتبت أيديهم وويل لهم مما يكسبون) (بقرہ:۷۹)

''سو خرابی ہو ان کو جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے، پھر کہہ دیتے ہیں: یہ خدا کی طرف سے ہے، تاکہ لیں اس پر تھوڑا سا مول، سو خرابی ہے ان پر اپنے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ہے ان کو اپنی کمائی سے۔''

اس آیت میں دو جگہوں پر بدیہیات ہیں:

۱- لازمی بات ہے کہ لکھنا ہاتھ ہی سے ہوتا ہے پھر (بایدیھم) کے ذکر میں کیا حکمت ہے؟

اس میں کئی اقوال ہیں:

اول: یہ تاکید کے لیے ہے، اس سے مجاز کا احتمال ختم ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ جب آپ یہ کہیں کہ زید لکھتا ہے تو اس کا ظاہری معنی یہ ہے کہ بذات خود لکھتا ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ زید کی طرف لکھنے کی نسبت بہ طور مجاز ہو، زید محض لکھنے کا حکم دینے والا ہو، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے لکھا۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ آپ ﷺ نے لکھنے کا حکم فرمایا؛ کیوں کہ آپ ﷺ نبی امی تھے اور امی وہ ہوتا ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانے۔ فرمان باری ہے: (وما كنت تتلو من قبل من كتاب ولا تخطه بيمينك إذا لارتاب المبطلون) (عنکبوت:۴۸) (اور تو پڑھتا نہ تھا اس سے پہلے کوئی کتاب، اور نہ لکھتا تھا اپنے داہنے ہاتھ سے، تب تو البتہ شک میں پڑتے یہ جھوٹے)۔

اس تاکید کی نظیر یہ فرمان باری ہے: ولا طائر يطير بجناحيه (اور نہ کوئی پرندہ کہ اڑتا ہے اپنے دو بازووں سے''۔

نیز فرمان باری: "يقولون بأفواههم" (کہتے ہیں اپنے منہ سے)

نیز شاعر کہتا ہے: نظرت فلم تنظر بعينيك منظرا. ''تم نے دیکھا تو اپنی دونوں آنکھوں سے ایسا منظر نہیں دیکھا''

ان تمام الفاظ کے ذکر کرنے کا مقصد اس مفہوم کی تاکید ہے جس کے ظاہری الفاظ متقاضی ہیں اور ممکنہ مجاز کا احتمال بھی ختم ہوجاتا ہے۔ یہ قول ابوحیان، ابن عاشور، رازی اور آلوسی نے ذکر کیا ہے۔(۲)

دوم: یہ ان کے عمل کی قباحت بیان کرنے کے لئے ہے؛ اسلئے کہ انھوں نے صرف یہ نہیں کیا کہ تخلیق وتحریف کا حکم دیتے؛ بلکہ بذات خود انھوں نے اسے انجام دیا اور اس کو اپنے ہاتھوں سے

کیا۔ یہ قول ابوحیان اور ابن عاشور نے نقل کیا ہے (۳)

سوم: ابن سراج نے کہا: "ایدی" کا ذکر اس بات سے کنایہ ہے کہ انھوں نے اس کو بذات خود اور اپنی طرف سے گھڑا ہے، ان پر یہ بات اتری نہیں ہے۔''

ابوحیان نے اس کو نقل کرنے کے بعد کہا:

''یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی؛ اس لیے کہ کسی کام کو ہاتھ سے انجام دینا اس کو گھڑنے اور ایجاد کرنے کا متقاضی نہیں؛ لہٰذا ایک حال محذوف مقدر ماننا ہوگا، جس پر اگلا حصہ دلالت کرتا ہے۔ تقدیر عبارت کچھ اس طرح ہوسکتی ہے: وہ اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے تھے اس حال میں کہ وہ محرف ہے۔ یا اس طرح کی کوئی اور عبارت، جس کی دلیل آیت کریمہ کا اگلا حصہ ہے (ثم یقولون هذا من عند الله)؛ اس لیے کہ بذات خود اپنے ہاتھوں سے کتابت وتحریر قابل نکیر تبھی ہے جبکہ غلط ہو؛ اسی لیے ہم نے یہ حال مقدر مانا ہے۔(۴)

ابن عاشور کہتے ہیں: "یکتبون الکتاب بایدیهم" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی باتیں لکھتے ہیں، جو ان کو رسولوں سے نہیں پہنچیں بلکہ وہ ان کو ایجاد کرنے والے ہیں اس کی دلیل آیت کا یہ ٹکڑا ہے: (یقولون هذا من عند الله) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے اپنے منھ سے نکلی ہوئی بات ہے، حقیقت کے مطابق نہیں۔ (۵)

۲- اس میں لفظ ''ویل'' دو مرتبہ آیا ہے، جبکہ اول الذکر کافی تھا پھر اس میں کیا حکمت ہے؟

امام رازیؒ نے یہ سوال اٹھایا اور اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

"فویل لهم مما کتبت ایدیهم" سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے جو لکھا ہے، یہ لکھنا مستقل ایک بڑا گناہ ہے، اسی طرح اس پر مال وصول کرنا بھی گناہ ہے؛ اسی لیے لفظ "ویل" کو "یکسبون" کے ساتھ دوبارہ لائے، ورنہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ دونوں مجموعی طور پر سخت وعید کے متقاضی ہیں، انفرادی طور پر نہیں۔ اسی اشتباہ کو اللہ تعالیٰ نے دور کردیا۔ اس کو ابوحیان نے بھی لکھا ہے۔ (۶)

(۳) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ثم تولیتم الا قلیلا منکم وأنتم معرضون) (بقرہ:۸۳)

''پھر تم پھر گئے مگر تھوڑے سے تم میں، تم ہو ہی پھرنے والے''۔

یہاں پر "تولی" اور "اعراض" دونوں ہم معنی ہیں، اول الذکر، دوسرے پر دلالت کرتا ہے، پھر اس کے ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

اول: دوسرا پہلے کی تاکید ہے، یہ دونوں ہم معنی ہیں۔ دوسرا جملہ پہلے جملے کے لیے حال تاکیدی ہے۔

دوم: "تولی" اور "اعراض" الگ الگ ہیں، لہٰذا تکرار نہیں، اور یہ حال بیانی ہے۔

سوم: دونوں ہم معنی ہیں؛ لیکن دونوں کے متعلقات الگ الگ ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ تم اپنے عہد ومیثاق سے پھر گئے اور تم اس نبی ﷺ سے منھ پھیرنے والے ہو۔ (۷) (البحر المحیط ۱/۴۶۴)

(۴) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (ولما جاء هم کتاب من عند الله مصدق لما معهم وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاء هم ما عرفوا کفروا به فلعنة الله علی الکافرین) (بقرہ:۸۹)

''اور جب پہنچی ان کے پاس کتاب، اللہ کی طرف سے، جو سچا بتاتی ہے اس کتاب کو جو ان کے پاس ہے اور پہلے سے فتح مانگتے تھے کافروں پر، اور جب پہنچا ان کو جس کو پہچان رکھا تھا تو اس سے منکر ہوگئے، سو لعنت ہے اللہ کی منکروں پر''۔

یہاں بدیہی بات ہے کہ (ولما جاء هم کتاب من عند الله الخ) کا معنی وہی ہے جو (فلما جاء هم ما عرفوا) الخ کا ہے، پھر دوسرے جملہ کے ساتھ (لما) دوبارہ لانے میں کیا حکمت ومصلحت ہے؟

ابن عاشور اس کا جواب دیتے ہیں:

''دوسرے جملہ کے ساتھ لما کا اعادہ (یعنی یہ نہیں کہا: وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فجاء هم ما عرفوا) کا مقصد، ان دونوں جملوں (میں جو "لما" سے شروع ہورہے ہیں) کے معنی میں اتحاد کا اظہار ہے۔ اور دونوں معانی میں مزید ربط پیدا کرنا ہے؛ کیوں کہ جملہ حالیہ سے فصل پیدا ہوگیا تھا۔ ''معمول'' کے ایک ہوتے ہوئے، ''عامل'' کا تکرار، ایک فصیح عربی اسلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ولا تحسبون الذین یفرحون بما أتوا ویحبون أن یحمدوا بما لم یفعلوا فلا تحسبنهم بمفازة من العذاب) (آل عمران:۱۸۸)

''اور جو لوگ خوش ہوتے ہیں اپنے کیے پر اور تعریف چاہتے ہیں بن کیے، سو مت سمجھ ان کو چھوٹ گئے، عذاب سے، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''

نیز فرمایا: ایعدکم أنکم اذا متم وکنتم ترابا وعظاما أنکم مخرجون (مومنون:۳۵)

''کیا تم کو وعدہ دیتا ہے کہ جب تم مرجاؤ اور ہوجاؤ مٹی اور ہڈیاں تو تم کو نکلنا ہے''۔

یہاں پر ''أنکم'' کو دوبارہ ذکر کیا حالاں کہ پہلے کی خبر ابھی نہیں آئی تھی۔(۸)

(۵) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وللکافرین عذاب مھین. (آیت:۹۰)

''اور کافروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا''۔

یہ بدیہی بات ہے کہ عذاب میں ذلت واہانت ہوتی ہے پھر ''ذلت کا عذاب'' کہنے میں کیا حکمت ہے؟

اس کی کئی وجوہات ہیں:

۱- امام رازی کہتے ہیں کہ عذاب اہانت کے ساتھ ہوگا اس کی دلیل کی ضرورت تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے دلیل کے طور پر اس کا ذکر فرمایا۔(۹)

۲- اہانت آمیز وہ عذاب ہوتا ہے، جس سے آدمی کو ذلت اور رسوائی ملے، جس میں ہمیشہ رہے اور اس ذلت سے نکل کر کبھی بھی اسے عزت نہ مل سکے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ عذاب کافروں کیلئے خاص کر رکھا ہے، لیکن جس عذاب میں انسان کی ذلت نہیں؛ بلکہ اس کو پاک وصاف کرنا ہوتا ہے، مثلاً ایک مسلمان چوری کرتا ہے، اور اس پر شرعی سزا نافذ کرتے ہوئے، اسکا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے، یا کسی مسلمان سے بدکاری ہوجاتی ہے، تو اسکو شرعی سزا دے دی جاتی ہے اور اس طرح کی دوسری سزائیں جو دراصل گناہوں کا کفارہ ہیں، یا گناہ کبیرہ کے مرتکب مسلمانوں کو، جرائم کے لحاظ سے، آخرت میں جو سزا ہوگی، اس کا مقصد، یہ ہے کہ ان کو گناہوں سے پاک کر دیا جائے پھر جنت میں داخل ہوں۔ یہ ہر چند کہ عذاب ہے لیکن اہانت آمیز نہیں، کیوں کہ اس عذاب الٰہی کا مقصد گناہوں سے پاک وصاف کر کے جائے عزت وکرامت میں پہنچانا ہے، جہاں آدمی، جنت کی نعمتوں میں، ہمیشہ ہمیش رہے گا۔ یہ قول: طبریؒ، ابوحیانؒ، قرطبیؒ، آلوسیؒ اور بیضاویؒ نے نقل کیا ہے۔(۱۰)

(۶) فرمان باری: (ولتجدنھم أحرص الناس علی حیاۃ ومن الذین اشرکوا) (بقرہ:۹۶)

''اور تو دیکھے گا ان کو، سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر، اور زیادہ حریص مشرکوں سے بھی''

یہ بات بدیہی ہے کہ ''الناس'' کے تحت (الذین اشرکوا) داخل تھے پھر دوبارہ ان کو ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

امام رازی اس کا فائدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کو الگ سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کو زندگی کی حرص بہت ہے، اور اس میں سخت توبیخ ہے؛ اس لیے کہ مشرکین، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، دنیا کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں، اگر وہ

زندگی کے حریص ہوں تو کچھ بعید نہیں؛ کیوں کہ یہی ان کی جنت ہے۔ اب اگر کوئی اہل کتاب، جو جزا کا اقراری ہو، ان لوگوں سے زیادہ زندگی کا حریص بن جائے تو وہ سخت ترین توبیخ کا حق دار ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ مشرکوں سے زیادہ حریص کیوں ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انہیں یہ معلوم ہے کہ وہ لامحالہ جہنم میں جائیں گے۔ مشرکوں کو اس کا علم نہیں۔ یہ فائدہ طبریؒ اور ابوحیانؒ نے بھی نقل کیا ہے۔(۱۱)

(۷) فرمان باری: (من کان عدواً للہ، ملائکتہ، رسلہ، وجبریل ومیکال فان اللہ عدو للکافرین) (بقرہ:۹۸)

''جو کوئی ہو دشمن اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبریل کا اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا''

کھلی ہوئی بات ہے کہ لفظ ''ملائکہ'' کے تحت جبریل ومیکائیل داخل تھے پھر ان کو دوبارہ ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟

اس کے دو جواب ہیں:

۱- ان دونوں فرشتوں کے فضل وکمال کے سبب ان کو الگ سے ذکر کیا، گویا اپنے فضل وکمال کے سبب وہ فرشتوں سے الگ جنس بن گئے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

(فیھما فاکھۃ ونخل ورمان) (سورہ رحمان:۶۸)

''ان میں میوے ہیں اور کھجوریں اور انار''

یہ جواب رازی اور قرطبی نے نقل کیا ہے۔(۱۲)

۲- رسول اللہ ﷺ اور یہودیوں کے مابین ان ہی دونوں فرشتوں کا ذکر ہوا تھا، اور آیت کریمہ ان ہی دونوں کی وجہ سے نازل ہوئی تھی؛ اس لیے ان کا ذکر ضروری تھا مبادا یہودی یہ کہیں کہ ہم اللہ کے سارے فرشتوں کے دشمن نہیں؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی تصریح فرما کر، ان کی طرف سے تخصیص کے احتمال کو ختم کر دیا۔ یہ جواب طبری، رازی اور قرطبی نے نقل کیا ہے۔(۱۳)

(۸) فرمان باری (کتاب اللہ وراء ظھورھم) (بقرہ:۱۰۱)

''کتاب اللہ کو اپنی پیٹھ کے پیچھے''

سوال: ''ظھور'' اور ''وراء'' ایک معنی میں ہیں، پھر دونوں کے ساتھ لانے میں کیا حکمت ہے؟

ابن عاشور نے یہ سوال اٹھایا، اور اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

''لفظ "وراء" کو لفظ "ظهور" کی طرف مضاف کرنے میں اس بات کی تاکید ہے کہ جس چیز کو انھوں نے چھوڑ دیا وہ اس قدر دور ہے کہ اس کے بعد مل نہیں سکتی۔ اس لیے "ظهر" کے لیے "وراء" قرار دیا، گوکہ یہ یہاں یہ "وراء" ہی کے معنی میں ہے۔

یہی جواب اس اشکال کا دیا جاسکتا ہے، جو ابن عرفہ نے فقیہ ابوالعباس احمد بن عبلون کی طرف سے نقل کیا ہے موصوف نے کہا کہ ان الفاظ کا تقاضا ہے کہ انھوں نے اللہ کی کتاب کو اپنے آگے ڈال دیا؛ اس لیے کہ پشت کی پشت، چہرہ ہے، جیسا کہ پشت چہرہ کے پیچھے ہے، اسی طرح چہرہ پشت کے پیچھے ہے، ابن عرفہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ ''ظہر'' کا ذکر ''ورار'' کے مفہوم کی تاکید کے لیے ہے جیسے کہتے ہیں: ورار ورار'' یعنی نہایت پیچھے۔ (۱۴)

(۹) فرمان باری (ومن ذريتنا أمة مسلمة) (بقرہ:۱۲۸)

''اور ہماری اولاد میں بھی ایک جماعت، فرماں بردار اپنی''۔

اس سے پہلے "لاينال عهدى الظالمين" (میرا اقرار ظالموں کو نہیں پہنچے گا) سے معلوم ہوچکا تھا کہ ان کی اولاد میں کچھ ظالم ہوں گے اور کچھ غیر ظالم بھی۔ لہٰذا ان کی بعض اولاد کا فرماں بردار ہونا معلوم ہوچکا تھا۔ پھر دوبارہ دعا کے ذریعہ اس کے مطالبہ میں کیا حکمت ہے؟

امام رازی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ دلالت قطعی نہیں تھی اور صاحب شفقت کے دل میں خدشات پیدا ہوتے ہیں۔ (۱۵)

(۱۰) فرمان باری (قالوا نعبد الٰهك واله آبائك ابراهيم واسماعيل واسحاق الٰها واحدا) (بقرہ:۱۳۳)

''بولے: ہم بندگی کریں گے تیرے رب کی، اور تیرے باپ دادوں کے رب کی جو کہ ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق ہیں''

سوال یہ ہے کہ "الٰها" دوبارہ ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے جب کہ "الٰهك" کے تحت اس کا ذکر آچکا تھا؟

اس کے کئی جواب دیئے گے ہیں:

۱- "الٰها"، "الٰهك" سے حال ہے، لفظ اور معنی کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوصف حال ہونا اس لیے جائز ہوگیا کہ یہ اس پر ''وحدانیت'' کا وصف جاری کرنے کے اعتبار سے ہے، حال درحقیقت وہ وصفِ تاکید ہے۔ صفت ''واحدا'' پر اکتفا کرنے کے بجائے لفظ "الها" کو

دوبارہ اس لیے لایا گیا تا کہ مزید وضاحت ہوسکے؛ اس لئے کہ یہ مقام، اطناب وتفصیل کا مقام ہے۔ اعادہ میں معاد کی اہمیت بتانا اور ماسبق کی تاکید ہے۔ یہ فصاحت کا ایک اسلوب وانداز ہے؛ اس لیے کہ لفظ کا اعادہ کرکے اس پر صفت یا متعلق قائم کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ تابع ہوکر، سابقہ لفظ کی تاکید ہوجاتی ہے۔ اور اس کا مقصد محض تاکید نہیں ہوتا۔ اسی باب سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: (واذا مرو باللغو مروا كراما) (فرقان:۷۲) ''اور جب گذرتے ہیں کھیل کی باتوں پر تو نکل جائیں بزرگانہ''۔

نیز فرمان باری: (ان أحسنتم أحسنتم لأنفسكم وإن أسأتم فلها) (اسراء:۷)

''اگر بھلائی کی تم نے تو بھلا کیا اپنا''

نیز فرمان باری: (واتقو الذي أمدكم بما تعلمون، أمدكم بأنعام وبنين) (شعراء:۱۳۳) ''اور ڈرو اس سے جس نے تم کو پہنچائیں وہ چیزیں جو تم جانتے ہو، پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے''

ان میں فعل کا اعادہ ہے۔

اسی قبیل سے احوص کا یہ شعر ہے:

فاذا تزول تزول عن متخمط   تخشى بوادره على الأقــران

ابن جنی شرح الحماسہ میں لکھتے ہیں: ''یہ کہنا کسی طرح ممکن نہیں: "اذا قمت قمت"؛ اس لیے کہ دوسرے جملہ میں کوئی ایسی بات نہیں جو پہلے میں نہ ہو، یہاں پر "تزول تزول" کہنا اس لیے درست ہوگیا کہ دوسرے کے ساتھ حرف جر لاحق ہے جس سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: (هولاء الذين أغوينا أغويناهم كما غوينا) (قصص:۶۳)

''یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے بہکایا، ان کو بہکایا جیسے ہم آپ بہکے''۔

لہٰذا "الها" حال تمہیدی ہے، اسم ذات کو صفت کی تمہید کے لیے لایا گیا ہے۔ (۱۶)

اس میں بدل ہونے کا بھی امکان ہے، لہٰذا یہ باوصف نکرہ، معرفہ سے بدل ہوگا۔ (۱۷)

۲- ابوحیان کہتے ہیں کہ اس حال یا بدل کا فائدہ، اس بات کی تصریح ہے کہ ان کا معبود فرد واحد ہے؛ کیوں کہ کسی چیز کی، بہت ساری چیزوں کی طرف اضافت سے، مضاف کے متعدد ہونے کا وہم ہوتا ہے، لہٰذا اس حال یا بدل کے ذریعہ، اس وہم کی، بہ تصریح نفی کردی۔ (۱۸)

(۱۱) فرمان باری: (تلك أمة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كتسبتم ولا

تسألون عما كانوا يعملون ﴾ (بقرہ:۱۴۱)

''وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی، ان کے واسطے ہے جو انھوں نے کیا، اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے کیا، اور تم سے کچھ پوچھ نہیں ان کے کاموں کی''۔

یہ آیت کریمہ مکرر آئی ہے، اس تکرار میں کیا فائدہ ہے؟

مفسرین نے اس کے کئی جواب نقل کیے ہیں:

۱- امام رازیؒ کہتے ہیں: ''پہلی آیت سے مراد: ابراہیمؑ اور وہ لوگ ہیں جن کا ذکر ان کے ساتھ آیا ہے، اور دوسری آیت سے مراد یہودیوں کے اسلاف ہیں۔ جبائی کہتے ہیں کہ قاضی نے کہا: یہ بعید ہے؛ اس لیے کہ یہود ونصاریٰ کے اسلاف کا یہ تصریح ذکر نہیں آیا۔ اس سلسلہ میں شبہ یہاں سے پیدا ہوا کہ ان لوگوں نے جب ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کے بارے میں کہا کہ وہ یہودی تھے تو گویا انھوں نے یہ کہا کہ یہ لوگ ہمارے یہودی اسلاف جیسے طریقہ پر تھے، لہٰذا ان کے اسلاف مذکورہ لوگوں کے حکم میں ہوگئے، اس طرح ممکن ہوگیا کہ ''تلك امة قد خلت'' اس ان کو مراد لیا جائے؛ لیکن یہ ناانصافی ہے؛ اس لیے کہ ماسبق میں ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کا ذکر آیا ہے؛ لہٰذا (تلك أمة) کا مرجع لازماً یہی لوگ ہوں گے۔

یہ قول ابوحیان، ابوسعود اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔ آلوسی نے اخیر میں کہا کہ اس میں جو کھلی ہوئی ناانصافی ہے، مخفی نہیں۔ (۱۹)

۲- اوقات، حالات اور مقامات کی تبدیلی کے بعد تکرار بے سود نہیں ہوتا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تو بشر ہی ہیں، ان انبیائے کرامؑ کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ اسی دین پر تھے جن پر تم ہو، اس باب میں تقلید کا جواز پیدا نہیں کرتا۔ لہٰذا تم ان لوگوں کے بارے میں گفتگو چھوڑو، انھوں نے جو کیا ان کو ملے گا، تمہیں تو یہ دیکھنا ہے کہ محمد ﷺ کس بات کی دعوت دے رہے ہیں، اسی میں تمہارا نفع اور فائدہ ہے، تم اپنے اعمال کے جواب دہ ہو۔ یہ قول امام رازی نے نقل کیا۔ (۲۰)

۳- انسان کی طبیعت میں، اپنے آباء واجداد پر فخر ومباہات راسخ ہے اسی سے بچانے میں مبالغہ کے لیے اس آیت کریمہ کو مکرر لایا گیا جیسے کہا جاتا ہے: اتق الله، اتق الله (اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو) یا وعید کی تاکید وتوثیق کے لیے مکرر لایا گیا یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا، تمہارے آباواجداد تمہارے کام نہیں آئیں گے، قیامت کے دن تم ان کے اعمال کے نہیں؛ بلکہ اپنے اعمال کے جواب دہ ہوگے۔ یہ قول ابوسعود اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔ (۲۱)

۴- پیچھے اہل کتاب مخاطب تھے اور اس آیت میں، ہم کو ان کی پیروی سے روکا گیا ہے۔ یہ قول ابوسعود اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔ (۲۲)

۵- ابن عاشور لکھتے ہیں: تکرار کی وجہ، سننے والوں کے دلوں میں اس مفہوم کو، اس کی اہمیت کے پیش نظر، مزید راسخ کرنا ہے، اس لیے کہ مخاطب نے اس سے پہلے اس کو نہیں سنا تھا، لہٰذا ایک بار تذکرہ کو ناکافی سمجھا گیا، اس طرح کا تکرار عربی کلام میں موجود ہے، لبید کا شعر ہے:

فتنازعا سبطا يطير ظلاله　　　كدخان مشعلة يشب ضرامها

مشمولة غلثت بنابت عرفج　　　كدخان نار ساطع اسنامها

(یہ غبار ایک دوسرے سے الگ کرسیدھے اوپر چلے، اس کے سایے اڑ رہے تھے جیسے آگ کا دھواں جس کو خوب بھڑکا دیا گیا ہو۔ جس پر شمالی ہوا آئی ہو، اس میں ''عرفج'' ملا دیا گیا ہو، جیسے وہ دھواں جس کی لپٹیں اوپر جا رہی ہوں)

شاعر نے اڑنے والے غبار کو بھڑکتی آگ کے مشابہ قرار دیا، اس آگ کے بارے میں بتایا کہ اس پر شمالی ہوا اٹھی اور اس نے دھویں میں اضافہ کردیا، اور یہ آگ تروتازہ ''عرفج'' (ایک نازک پودا جو تیزی سے آگ پکڑتا ہے اور جلد ہی ٹھنڈا ہوجاتا ہے) لگائی گئی ہے، اس لیے کہ اس میں دھواں بہت ہوتا ہے، تو اس نے تشبیہ کا اعادہ کیا اس لیے کہ یہ غیر معروف، اچھوتی تشبیہ تھی۔ (۲۳)

❁ ❁ ❁

مراجع

(۱) تفسیر کبیر:۳/۱۰۵۔ (۲) البحرالمحیط: ۱/۴۴۷، ابن عاشور:۱/۵۷۷، رازی:۳/۱۰۵، آلوسی:۱/۳۰۲۔ (۳) البحرالمحیط: ۱/۴۴۷، ابن عاشور:۱/۵۷۷۔ (۴) البحر المحیط:۱/۴۴۷۔ (۵) ابن عاشور:۱/۵۷۵۔ (۶) تفسیر رازی:۳/۱۵۰؛ البحرالمحیط:۱/۴۴۸۔ (۷) البحرالمحیط:۱/۴۶۴۔ (۸) ابن عاشور:۱/۶۰۲؛ آلوسی:۱/۳۲۰۔ (۹) تفسیر کبیر:۳/۹۹۱۔ (۱۰) طبری:۱/۲۳۳، ابوحیان، قرطبی:۱/۲۳؛ آلوسی:۲/۲۹، بیضاوی:۱/۳۹۵، تفسیر طبری:۱/۲۳۳؛ معارف القرآن:۱/۲۰۴۔ (۱۱) رازی:۳/۲۰۸؛ طبری:۱/۳۳۹؛ ابوحیان؛ قرطبی:۲/۳۶-۳۷۔ (۱۲) رازی:۳/۲۱۴۳؛ قرطبی:۲/۳۶۔ (۱۳) طبری:۱/۳۴۹؛ وازی: ۳/۲۱۴؛ قرطبی:۲/۳۶۔ (۱۴) ابن عاشور: ۱/۶۲۶۔ (۱۵) رازی:۴/۶۷۔ (۱۶) ابن عاشور: ۱/۳۴۷، ابوحیان:۱/۶۴۲۔ (۱۷) ابوحیان: ۱/۶۴۲۔ (۱۸) ابوحیان:۱/۶۴۲۔ (۱۹) رازی: ۴/۱۰۰؛ ابوحیان تفسیر آیت؛ ابوسعود آلوسی:۱/۴۰۱۔ (۲۰) رازی:۴/۱۰۰۔ (۲۱) ابوسعود تفسیر:۱/۱۷۶، آلوسی:۱/۱۰۴۔ (۲۲) ابوسعود تفسیر:۱/۱۷۶، آلوسی:۱/۱۰۴۔ (۲۳) ابن عاشور:۱/۷۴۸۔

❁ ❁ ❁

ایک سے زائد حج فقہ ترجیحی کی روشنی میں

از: علامہ یوسف القرضاوی

وہ شخص جو اسلام کی ترجیحات سے واقف ہو اور ہر چیز کے درست مقام کا علم رکھتا ہو، کبھی ان ترجیحات کے سلسلے میں شک وشبہ کا شکار نہیں ہوگا جن کا لحاظ کرنا ناگزیر ہے، میں کئی سالوں سے اسی کی صدا لگا رہا ہوں اور اسے میں نے ''فقہ ترجیحی'' کا نام دیا ہے۔

ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام نے ہمیں جن چیزوں کا مکلّف بنایا ہے، وہ ایک درجے کی نہیں ہیں، بلکہ ہر عمل کا ایک الگ الگ درجہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں جن میں سب سے بلند مرتبہ لا إله إلا الله کا ہے اور سب سے کم درجہ کا عمل راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا ہے''۔ اس سے پتہ چلا کہ سب سے کمتر اور سب سے بلند درجے کے علاوہ بیچ کے بھی درجات ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أجعلتم سقاية الحاج وعمارة المسجد الحرام كمن آمن بالله واليوم الآخر وجاهد فى سبيل الله لايستوون عند الله﴾ (کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کو آباد کرنے کو ایسا سمجھ لیا ہے جیسے کہ کوئی شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور خدا کی راہ میں جہاد کیا؟ یہ دونوں اللہ کے یہاں ہرگز برابر نہیں ہوسکتے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام اعمال آپس میں برابر نہیں ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اس فقہ سے واقف کرائیں، میں ایک مدت سے ایسے لوگوں کو دیکھتا آرہا ہوں جو اپنے مزدوروں پر ظلم ڈھاتے ہیں اور اپنی زمینوں میں اجرت پر کام کرنے والوں کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں، میں نے اپنے گاؤں کے ان کسانوں کو بھی دیکھا ہے جو دوسروں کی زمینوں میں اجرت پر کام کرتے ہیں، ان کے مالکوں کا حال یہ ہے کہ ان کی زمینیں برباد ہوجاتی ہیں، لیکن وہ ان غریبوں کو ایک پیسہ دینا گوارا نہیں کرتے، دوسری طرف وہ تین تین بار یہاں تک کہ دس دس بار حج کے لئے جاتے

ہیں۔ اگر یہ لوگ ان غریبوں کے حقوق ادا کرتے تو ان کا یہ عمل بار بار حج سے افضل ہوتا۔

علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرض کی ادائیگی سے قبل نوافل کو قبول نہیں کرتا اور جو شخص فرض کی ادائیگی کے بعد نفل کی فرصت نہ پائے تو وہ معذور ہے، لیکن جس شخص کی نفل میں مشغولیت اسے فرض سے محروم کردے وہ مغرور ہے، ہمیں اس وقت اس نکتے کو سمجھنے کی سخت ضرورت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے فرمایا: آخری زمانہ میں لوگ بلاوجہ کثرت سے حج کریں گے، ان کے لئے سفر انتہائی آسان ہوگا اور مال و دولت کی فراوانی ہوگی، تو ان میں سے ایک شخص ریگستان اور بے آب وگیاہ زمین میں اپنا اونٹ دوڑائے گا اور حج کا سفر کرے گا حالانکہ اس کا پڑوسی بدحال ہوگا اور وہ اس کی غم خواری نہ کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ حج کے ارادے سے ریگستانوں اور بے آب وگیاہ زمینوں میں سفر کرے گا اور اپنے پڑوسی کو اس حال میں چھوڑ دے گا کہ وہ بھوک، فقر اور ضرورت سے بدحال ہوگا اور کوئی اس کا پرسان حال نہ ہوگا، یہی آج کل ہو رہا ہے۔

بشر بن حارثؒ جو کہ متصوفین وزہاد میں شہرت کے حامل ہیں اور جن کا شمار امت کے معروف زاہدوں اور اللہ والوں میں ہوتا ہے، ان کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا: اے ابونصر! میں نے حج کا ارادہ کیا ہے اور آپ کے پاس کچھ نصیحت کی باتیں سننے آیا ہوں، تو کیا آپ مجھے کچھ نصیحت کریں گے؟ آپ نے اس سے پوچھا: تم نے حج کے لئے کتنا سفرخرچ اکٹھا کیا ہے؟ اس نے کہا: دو ہزار درہم، (ہزار درہم اس وقت کے لئے ایک بڑی رقم تھی اور اس کی قوت خرید بہت زیادہ تھی) انھوں نے اس سے پھر دریافت کیا: تم اس حج کے ذریعہ زہد وتقوی حاصل چاہتے ہو یا بیت اللہ کا اشتیاق تمھیں وہاں لئے جارہا ہے یا تم رضائے الٰہی کے حصول کے خواہشمند ہو؟ اس نے کہا: خدا کی قسم رضائے الٰہی کا حصول میرا مقصد ہے، انھوں نے فرمایا: کیا میں تمہیں ایسا راستہ بتاؤں جس سے تمہیں اپنے شہر ہی میں گھر بیٹھے خدا کی خوشنودی حاصل ہوجائے اور اگر میں تمہیں یہ طریقہ بتاؤں تو کیا تم اس کے مطابق عمل کروگے؟ اس نے کہا: ضرور کروں گا۔ فرمایا: جاؤ اور یہ رقم دس لوگوں کو دے دو، کسی فقیر کو جس سے تم اس کی تنگ دستی دور کردو، یتیم کو جس کی ضرورتیں پوری کردو، قرض دار جس کا قرض ادا کردو اور کسی کثیر العیال شخص کو جس سے کہ تم اس کے اہل وعیال کا بوجھ ہلکا کردو.... اس طرح انھوں نے دس لوگوں کا ذکر کیا اور کہا: اگر تم ان میں سے کسی ایک کو یہ رقم دے دو جس سے اس کی ضرورتیں پوری ہوجائیں تو یہ عمل افضل ہے۔ یہ سن کر اس شخص نے کہا:

اے ابونصر! میں سفر کا پختہ ارادہ کر چکا ہوں، فرمایا کہ جب مال گندی تجارت اور مشکوک ذرائع سے اکٹھا کیا جاتا ہے تو انسان کا نفس اسے اپنی خواہشات کے مطابق خرچ کرنا چاہتا ہے۔یعنی ایسا شخص مسلمانوں کیلئے نفع بخش اور افضل چیزوں کو چھوڑ کر حج کی خوشیاں لوٹنا زیادہ پسند کرتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ بلاوجہ بار بار حج کرنا اور اس طرح سے ترجیحات کو ترک کر دینا بے بصیرتی کا نتیجہ ہے، بہتر یہ ہے کہ ایک مسلمان یہ سمجھے کہ بھوکے کو کھلانا، مریض کا علاج کرانا، بے سہارا کو پناہ دینا، یتیم کی کفالت کرنا، بیوہ عورت کی ضروریات پوری کرنا، ایشیا یا افریقہ یا کہیں کی بھی اسلامی برادری کیلئے مدرسہ یا مسجد بنانا اور خیر کے کسی بھی کام میں شریک ہونا اللہ کی نظر میں زیادہ بہتر ہے۔

ایک مسلمان پر فرض ہے کہ اس طرح کے ثواب والے کاموں میں بے پناہ سرور اور لذت محسوس کرے اور اس کا یہ سرور اور لطف اس لذت سے بھی بڑھ کر ہو جس کا احساس اسے دو بار اور تین بار حج کرتے وقت ہوتا ہے، جب کہ وہ بیت اللہ کا طواف کر رہا ہوتا ہے اور "لبيك اللّٰهم لبيك" کی صدا بلند کرتا ہے، ان عظیم کارہائے خیر کی بجائے دوسری یا تیسری بار کے حج میں کیف و سرور محسوس کرنا یقیناً افسوس ناک ہے، دین میں بے بصیرت ہونے کی دلیل ہے اور فقہ ترجیحی سے نابلد ہونے کی علامت ہے۔

اگر مسلمانوں کو اس کا شعور ہو جائے تو ہم ہر سال اربوں روپے سے صحیح فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔اگر کوئی تنظیم اس کام کو منظّم طریقہ پر انجام دے اور ایک فنڈ بنائے جس کا نام حج کا متبادل فنڈ ہو اور وہ لوگ جو نفلی حج کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنا چاہتے ہیں اسی طرح وہ بھائی جو بیس اور تیس ہزار میں فائیو اسٹار حج کرتے ہیں، وہ حج کا خرچ "حج کے متبادل فنڈ" میں جمع کریں تاکہ اس رقم کو ساری دنیا کے مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کیا جائے تو ایک بڑی ضرورت پوری ہوگی اور مسلمانوں کی زندگی کا ایک بڑا خلا پر ہو جائے گا۔اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ کاش! امت میں یہ بیداری پیدا ہو جائے۔

(علامہ یوسف القرضاوی کی تحریر کا ترجمہ)

❁ ❁ ❁

دوسری قسط:

سلاطین ہند کے عہد میں غیر مسلموں کی شرعی حیثیت

از: محمد شمیم اختر قاسمی
ریسرچ اسکالر شعبہ سنی دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کیا جزیہ اسلام ہی کی محدثات ہے:

جب یہ بات متحقق ہوگئی کہ ہندوستان کے غیر مسلموں کو فقہائے اسلام نے شبہ اہل کتاب کا درجہ دے کر انھیں ذمی کی حیثیت دی، تو اب یہ دیکھنا ہے کہ ان پر جو جزیہ نافذ کیا گیا، کیا وہ صرف اسلام ہی کا طریقہ ہے یا اس سے پہلے بھی حکمراں جماعت اپنی رعایا سے اس قسم کی رقم وصول کرتی تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں جرجی زیدان (۵۷) نے اسکی تاریخی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”جزیہ کچھ اسلام کی محدثات (نئی پیدا کی ہوئی باتوں) میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ تمدن قدیم سے رائج چلا آرہا ہے۔ ایتھینز کے رہنے والے یونانیوں سے پانچویں صدی قبل مسیح میں سواحل ایشیاء کوچک کے رہنے والوں پر جزیہ مقرر کیا گیا تھا اور انھوں نے اس جزیہ کا تقرر اس ذمہ داری کے مقابلہ میں کیا تھا جو انھوں نے ان مقامات کے باشندوں کو اہل فینیقیہ کے حملوں سے محفوظ رکھنے کی بابت اٹھائی تھی اور فینیقیہ اس زمانے میں فارس کا مقبوضہ ملک تھا۔ ان سواحل کے باشندوں کو اپنی جانوں کی حفاظت کے مقابلہ میں مال کا دے دینا آسان معلوم ہوا اور انھوں نے اسے خوشی کے ساتھ منظور کرلیا تھا۔ رومانی لوگوں نے جن قوموں کو زیر کرکے اپنا تابع وفرماں بردار بنایا ان پر انھوں نے مسلمانوں کے اس مقدار جزیہ سے جس کو فاتحین اسلام نے اس زمانہ کے بہت عرصہ بعد مقرر کیا تھا کہیں اور کئی حصہ بڑھ کر جزیہ مقرر کردیا تھا؛ کیوں کہ رومانی

لوگوں نے جس زمانہ میں گال (فرانس کا ملک) فتح کیا ہے تو انھوں نے وہاں کے ہر ایک باشندہ پر جزیہ مقرر کیا تھا جس کی تعداد ۹ سے ۱۵ گنی سالانہ تک کے مابین ہوتی تھی، یا یوں کہنا چاہیے کہ مسلمانوں کے مقرر کردہ جزیہ سے سات گنی تھی۔“ (۵۸)

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے متعدد مستند حوالوں کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ اسلام سے پہلے اور اس کے بعد بھی دنیا کے مختلف ممالک اور ملل کے سربراہ اپنی رعایا سے ایک مخصوص رقم وصول کرتی تھی، جو اسلامی جزیہ سے ہرگز مختلف نہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

”تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ اسلام سے پہلے جزیہ کا لفظ رائج ہوچکا تھا اور نوشیرواں عادل نے اس کے قواعد بھی مرتب کیے تھے۔ ایران اور روم میں اس طرح کے ٹیکس لیے جاتے تھے۔ عرب کے جو علاقے ان کے زیرنگیں تھے وہ اسی طرح کے ٹیکسوں سے واقف تھے۔ ہندوستان کے شہری بھی اس قسم کے ٹیکسوں سے ناواقف نہ تھے۔ قنوج کا گہروار خاندان ایک ٹیکس ترشکی ڈانڈا وصول کرتا تھا۔ ٹاڈ نے لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں بھی بعض راج پوت ریاستیں ایک روپیہ فی کس وصول کرتی تھی۔ ڈاکٹر ترپاٹھی کا خیال ہے کہ کم وبیش اسی نوعیت کے ٹیکس فرانس میں Hoste tax، جرمنی میں Commen Penny انگلستان میں Sculage کے نام سے وصول کیے جاتے تھے۔“ (۶۰)

علامہ شبلی نعمانی (۶۱) نے بھی اپنی تحقیق میں وضاحت کی ہے کہ جزیہ اسلام سے بہت پہلے کی پیداوار ہے اور غالبا نوشیرواں کے عہد میں نہ صرف اس کا نفاذ ہوا بلکہ اس نے اس حوالے سے باضابطہ اصول وضوابط مرتب کیے۔ اس ضابطے میں معزز حضرات شامل نہ کیے گئے اور صرف متوسط اور مفلوک الحال لوگوں سے جزیہ بمعنی ٹیکس وصول کیا جاتا رہا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

”جہاں تک ہم کو معلوم ہے کہ ایران وعرب میں خراج وجزیہ کے وہ قواعد جو باقی اسلام میں رائج ہیں، نوشیرواں کے عہد میں مرتب ہوئے۔ امام ابوجعفر طبری جو بہت بڑے محدث اور مورخ تھے نوشیرواں کے انتظامات ملکی کے بیان میں لکھتے ہیں کہ:

”لوگوں پر جزیہ مقرر کیا گیا جس کی شرح ۱۲ درہم اور ۸ و ۶ وہ تھی، لیکن خاندانی شرفا اور امرا اور اہل فوج اور پیشوایان مذہب اور اہل قلم اور عہدہ داران دربار جزیہ سے مستثنیٰ تھے اور وہ لوگ بھی جن کی عمر ۵۰ سے زیادہ یا بیس کے کم ہوتی تھی“۔ امام

موصوف اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: حضرت عمرؓ نے جب فارس کو فتح کیا تو ان ہی قاعدوں کی تقلید کی۔ علامہ ابوحنیفہ دینوری نے بھی کتاب الاخبار والاحوال میں بعینہٖ اس تفصیل کو نقل کیا ہے.... اس غرض سے نوشیرواں نے جزیہ کا قاعدہ جاری کیا اس کی وجہ علامہ طبری نے نوشیرواں کے اقوال سے یہ نقل کی ہے کہ

''اہل فوج ملک کے محافظ ہیں اور ملک کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈالتے ہیں، اس لیے لوگوں کی آمدنی سے ان لیے ایک رقم خاص مقرر کی کہ ان کی محنتوں کا معاوضہ ہو...'' خراج و جزیہ کے متعلق جو کچھ ان مورخوں نے لکھا ہے اس کی تائید فردوسی کے اشعار سے بھی ہوتی ہے، اگرچہ بعض امور میں دونوں کا بیان مختلف ہے۔''(۶۲)

جزیہ کی وصولی اسلامی سلطنت کی ناگزیر ضرورت:

قابل ذکر ہے کہ ٹیکس ہو یا جزیہ کسی بھی مملکت کے سربراہ کے لیے اپنے ملک میں مقیم رعایا سے وصول کرنا ناگزیر امر ہے، جس کے بغیر حکومت کا نظم ونسق سنبھالا نہیں جاسکتا، کیوں کہ اس طرح کی رقم وصول کرکے رعایا پر ہی مختلف طریقے سے خرچ کردی جاتی ہے۔ مگر اس ٹیکس کی وصولی میں رعایا کے کسی بھی طبقہ کی تخصیص نہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے غیر مسلموں سے ٹیکس وصولی میں اس کی مالی حیثیت کے علاوہ سماج کے کمزور طبقہ کو اس سے بری کردیا، جس کی وضاحت کی جاچکی ہے، اور جس مقدار میں رقم وصول کی جاتی تھی اس کی ادائیگی کسی بھی فرد کے لیے چنداں مشکل نہ تھا، جو دوسرے سربراہ مملک جبراً وقہراً اپنی رعایا سے وصول کرتے تھے۔

اس کے علاوہ بعضے وقت اس رقم سے ذمی اور معاہد کی مدد بھی کی جاتی تھی جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ حضرت عمر (۶۳) نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک غیر مسلم بوڑھے شخص کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا، انھوں نے اس بوڑھے فقیر سے پوچھا کہ تیرا کیا مذہب ہے، اس نے اپنا مذہب یہودی بتایا، حضرت عمر کو اس بوڑھے پر بہت ترس آیا۔ وہ فقیر کو اپنے ساتھ لائے اور روپے پیسے دینے کے بعد بیت المال کے افسر سے کہلا بھیجا کہ اس بوڑھے اور اس کے ساتھیوں پر خیال کرو۔ اللہ کی قسم! یہ ناانصافی ہوگی کہ اس کی جوانی کی کمائی ہم کھائیں اور اب یہ بوڑھا ہوگیا ہے تو اس کو ہم نکال دیں۔ صدقے کی نسبت جو خدا نے کہا ہے کہ فقیروں اور مسکینوں کو دینا چاہیے تو فقیروں سے مسلمان اور مسکینوں سے اہل کتاب مراد ہیں۔ (۶۴)

اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے غیر مسلموں سے جزیہ وصول کرکے انہیں ہر قسم کی آزادی اور امان دے دیا۔ یہاں تک کہ انہیں یہ بھی ضمانت دی کہ دشمنوں کے حملے اور ان کے ظلم سے انہیں محفوظ رکھا جائے گا۔ جب کبھی مسلم فاتح اس قسم کے حقوق دینے میں خود کو کمزور پایا تو وصول کی جانے والی جزیہ کی رقم کو واپس کردیا یہ کہہ کر کہ ان حالات میں تمہاری حفاظت ممکن نہیں، تم اپنی حفاظت خود کرو۔ جس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت عمر ہی کے زمانے میں جب اسلامی فوجیں حمص (شام) سے ہٹ آئیں تو حضرت عبیدہ (۶۵) رضی اللہ عنہ نے وہاں کے یہودیوں اور عیسائیوں کو بلاکر کئی لاکھ رقم جزیہ کی یہ کہہ کر واپس کردی کہ اب تمہاری حفاظت نہیں کرسکتے، اس لیے جزیے کی رقم بھی نہیں رکھ سکتے۔ اس قسم کی حفاظت اور تعاون کی مثال کیا دنیا کے کسی دوسرے فاتحین کی تاریخ میں مل سکتی ہے کہ اس نے غیر مذہب رعایا کی خاطرداری اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اس انداز میں لی ہو (۶۶)۔ بلکہ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے جب بھی عروج حاصل کیا تو ایک نے دوسرے پر کتنے شدید مظالم ڈھائے اور انہیں نیست ونابود کیا۔ حکمراں جماعت نے کمزور طبقہ کو بڑی بے دردی سے کچلا اور ستایا۔ خود ہندوستان میں ہندو مذہب اور بدھ مت کے عروج وزوال کی داستان بڑی کرب ناک ہے ایک دوسرے نے اپنے زمانہ عروج میں محکوم طبقہ کا جینا حرام کردیا اور ایک دوسرے کے معابد ومنادر کو منہدم اور مسمار کیا۔ (۶۷)

تاریخ ہند خاموش ہے کہ مسلم حکمرانوں نے ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد جزیہ کی وصولی سے پہلے یا اس کے بعد اپنی غیر مسلم رعایا کو تعصب وتنگ نظری کی بنا پر ستایا یا اور تہہ تیغ کیا اور ان کے منادر و معابد پر دست درازی کی بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ جنھوں نے جزیہ ادا کیا یا جو ٹیکس دینے سے مجبور رہے سب کو یکساں حقوق ملے، جس حد تک فقہاء نے ان کے حقوق متعین کیے ہیں۔ بلکہ بعضے وقت تو حکمراں جماعت ان حقوق متعینہ سے زیادہ ان کا خیال رکھا اور سلطنت کے اہم امور ان کے سپرد کیے اور ان پر غیر معمولی اعتماد وبھروسہ کیا۔

''مسلمان فاتح نے مفتوحوں کے ساتھ عقلمندی اور فیاضی کا سلوک کیا۔ مال گزاری کا پرانا نظام قائم رہنے دیا، اور قدیمی ملازموں کو برقرار رکھا، ہندو پجاریوں اور برہمنوں کو اپنے مندروں میں پرستش کی اجازت دی اور ان پر فقط ایک خفیف سا محصول عاید کیا جو آمدنی کے مطابق ادا کرنا پڑتا تھا۔ زمینداروں کو اجازت دی گئی کہ وہ برہمنوں اور ہندوؤں کو قدیم ٹیکس دیتے رہیں۔''

سندھ میں داخلہ کے بعد محمد بن قاسم نے اگر کچھ متمول لوگوں سے جزیہ وصول کیا تو اس کے ساتھ انھوں نے غیر مسلموں کو جس فراخ دلی سے عہدے اور مناصب دیئے اس پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ:

”محمد بن قاسم نے پرانے نظام کو حتی الوسع تبدیل نہ کیا، راجا داہر کے وزیر اعظم کو وزارت پر برقرار رکھا اور اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے تمام نظام سلطنت ہندوؤں کے ہاتھ میں رہنے دیا۔ عرب فوجی اور سپاہیانہ انتظام کے لیے تھے، مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ قاضی کرتے تھے، لیکن ہندوؤں کے لیے ان کی پنچائتیں بدستور قائم رہیں۔“

جزیہ دے کر غیر مسلم اسلامی ریاست کی طرف سے فوجی خدمات، ملک کی نگہداشت اور دوسرے کاموں سے بری ہوجاتے اور انہیں مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل ہوجاتے۔ حالاں کہ مسلمانوں کو اس طرح کے کئی ٹیکس زکوٰۃ وصدقات اور عشر وخراج نکالنے پڑتے تھے اور حکومت ان سے وصول کرتی تھی، باوجود اس کے ملک کی فلاح و بہبود اور اس کی تعمیر وترقی کے ساتھ فوجی خدمات پر بھی مامور ہونا پڑتا ہے، جہاد میں شرکت کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ جزیہ کی وصولی کی حکمت بیان کرتے ہوئے علامہ یوسف القرضاوی لکھتے ہیں کہ:

”ذمیوں پر جزیہ لگانے کی ایک دوسری وجہ بھی تھی اور یہ وہی وجہ ہے جس کا سہارا ہر زمانہ میں کوئی بھی حکومت ٹیکس لگاتے وقت لیتی ہے، یعنی مفاد عامہ کے اخراجات مثلاً پولیس اور عدالت کا نظام، سڑکوں اور پلوں وغیرہ کی تعمیر کے کام جو معیشت کی بہتری کے لیے ضروری ہیں اور جن سے ہر شہری چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم یکساں فائدہ اٹھاتا ہے۔ مسلمان زکوٰۃ، صدقۂ فطر اور دیگر ٹیکسوں کی صورت میں اس طرح کے اخراجات میں حصہ لیتے ہیں۔ اگر غیر مسلمین جزیہ کی صورت میں ایک معمولی رقم کے ذریعہ ان میں حصہ لیں تو تعجب کی کیا بات ہوگی۔“(۹۷)

پھر علامہ موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

”اس فریضہ کے بدلہ وطن کے دفاع وحفاظت کے اخراجات میں شرکت کیلئے غیر مسلم شہریوں پر جو ٹیکس لگایا گیا ہے اسے اصطلاحاً جزیہ کہتے ہیں، چنانچہ جزیہ کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ فوجی خدمت کا مالی بدل ہے نہ کہ اسلامی حکومت کے سامنے جھکنے کی علامت۔“(۹۷)

جزیہ کب ساقط ہوگا:

جزیہ فوجی خدمات سے سبکدوشی کا بدل ہے، اگر کوئی ذمی اپنی مرضی سے اس میں شامل ہونا چاہتا ہے یا ریاست کے مفاد کے لیے اپنی خدمات پیش کرنا چاہتا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر دشمنان اسلام سے دارالاسلام کو بچانے کے لیے جنگ میں حصہ لیتے ہیں تو ایسی صورت میں ان سے جزیہ ساقط ہوجائے گا اور تمام حقوق مثل مسلمان کے اسے حاصل رہیں گے۔“(۹۸)

اسی طرح اگر حکام وقت ذمیوں کی حفاظت کر پانے پر قادر نہیں ہیں تو پھر ضروری ہوگا کہ امارت کے سربراہ جزیہ کی رقم واپس کردیں۔ جس کی طرف گذشتہ سطور میں اشارہ کیا جاچکا ہے کہ ایسے حالات میں لی گئی جزیہ کی رقم واپس کردی گئی۔(۹۹)

انہی رعایتوں سے فائدہ اٹھاکر بہت سے ذمیوں نے ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کیے اور بڑے بڑے عہدے ان کے ذمے کیے گئے (۱۰۰) اور بقول مولانا شبلی نعمانی ہر زمانے میں سیکڑوں اور ہزاروں عیسائی، یہودی، ہندو، آتش پرست سرکاری خدمتوں پر مامور ہوئے، ہندوستان میں ایک خاص تغیر ہوا، یعنی یہ کہ ہندوؤں نے کثرت سے فوجی خدمتیں قبول کیں اور فوج میں بہت بڑا حصہ ان کا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوؤں نے ہر قسم کے بڑے بڑے عہدے حاصل کیے۔(۱۰۱)

تنقیض معادہ کی صورت اور علت:

ذمی یا معاہد کو اسلامی قلم رو میں ہر قسم کی آزادی اور مراعات حاصل ہوں گی، جو ایک مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ وہ اسلامی قلم رو میں ایسا کوئی کام نہیں کریں گے جو حکومت کے منشا کے خلاف ہو۔ مثلاً اگر ذمی جزیہ ادا کرنے یا معاہدہ کے خلاف کسی حکم کو ماننے سے انکار کردے، یا کسی مسلمان کو قتل کردے، یا مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے لوگوں کو جمع کرے، یا کسی مسلمان عورت سے زنا کرے یعنی نکاح (غیر شرعی) کرکے مسلمان عورت سے قربت کرے، یا کسی مسلمان کو اسلام کی طرف سے ورغلائے، یا مسلمانوں کو راستہ میں لوٹ لے اور رہزنی کرے یا مشرکوں کے لیے جاسوسی کرے، یا مسلمانوں کے خلاف کافروں کی راہنمائی کرے، یا کافروں کو مسلمانوں کی خبریں اور مسلمانوں کے رازوں سے واقف کرے تو ظاہر روایت کے مطابق ایسے ذمی کا معاہدہ توڑ دیا جائے گا اور وہ ذمی نہیں رہے گا۔ ایک دوسری روایت یہ ہے کہ معاہدہ ذمیت کی شکست صرف اسی

وقت کی جاسکتی ہے کہ ذمی اداءِ جزیہ سے یا ہمارے احکام کو ماننے سے انکار کردے۔(۶۸)

امام مالکؒ نے فرمایا کہ صرف تین وجوہ سے ذمیت کا معاہدہ توڑا جاسکتا ہے۔ جزیہ دینے سے انکار کردے یا اسلام کے احکام کو لاگو ہونے سے انکار کردے، یا مسلمانوں سے لڑنے کا پکا ارادہ کرلے۔ ہاں اگر مندرجہ بالا امور کی شرط معاہدے کے وقت کرلی گئی ہو تو پھر امور مندرجہ بالا میں سے اگر کوئی خدمت کرے تو اس کی ذمیت کا معاہدہ توڑ دیا جائے گا۔(۶۹)

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ مسلمان عورتوں سے اگر ذمی زنا کرے یا برائے نام نکاح کے بعد مسلمان عورت سے قربت کرے یا رہزنی کرے تو ان تینوں صورتوں میں معاہدہ نہیں توڑا جاسکتا۔ باقی مذکورہ بالا صورتوں میں معاہدہ توڑ دیا جائے گا۔(۷۰) امام مالکؒ کے شاگرد قاسم کے نزدیک رہزنی کی صورت میں بھی شکست معاہدہ کی جاسکتی ہے۔(۷۱)

امام ابوحنیفہؒ نے کہا کہ صرف اس صورت میں معاہدہ توڑا جاسکتا ہے کہ ذمی دارالحرب سے مل جائے یا اس کے پاس کوئی فوجی طاقت ہو جس کی وجہ سے وہ دارالاسلام کے کسی حصہ پر قابض ہوگیا ہو۔ ان دونوں صورتوں میں وہ حربی ہوجائے گا۔ ذمی نہ رہے گا، باقی کسی صورت میں جزیہ کا وعدہ کرلیتے ہیں اور جزیہ کو اپنے اوپر لاگو مان لیتے ہیں (اس کے بعد ادا بھی کرتے ہیں یا نہیں یہ دوسری بات ہے) جزیہ ادا کرنا معاہدے کی بنیاد نہیں ہے۔ اب اگر کوئی آدمی جزیہ نہیں دیتا اور اس کے پاس جنگی یا فوجی قوت بھی نہیں ہے تو اس نہ دینے کا اعتبار نہیں (ہم اس کو باغی یا جری نہیں کہہ سکتے) امام المسلمین اس کو گرفتار کراسکتا ہے اور مار سکتا ہے۔(۷۲)

جزیہ کی مقدار کیا ہوگی:

حکومت اسلامی مقیم غیر مسلموں سے جزیہ کی رقم کتنی مقدار میں وصول کی جائے گی۔ اس کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اس کا تعین باہم صلح اور رضامندی سے ہونا چاہیے۔ دونوں جتنی مقدار میں جزیہ کی رقم طے کرلیں۔ دلیل کے لیے فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے یمن کے نجرانیوں سے، قسط وار دو ہزار کپڑے کے جوڑوں کی شرط پر صلح کی تھی۔ ایک قسط ماہ رجب میں ادا کریں اور دوسری قسط ماہ صفر میں۔ اور اگر مصالحت کے بجائے بطور غلبہ ان پر اقتدار حاصل کیا گیا تو ہر مال دار سے چار درہم ماہانہ کے اعتبار سے یعنی سالانہ ۴۸ درہم، متوسط درجہ سے دو درہم ماہانہ کے حساب سے اور غریب سے برسرروزگار سے جو سال کے زیادہ حصوں میں تندرست

رہتا ہو ایک درہم ماہانہ کے حساب سے جزیہ وصول کیا جائے گا۔(۷۳)

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ ہندوستان کی فتح بزور طاقت ہوئی تھی۔ اس لیے ابتدائی مسلم فاتحوں نے یہاں کی ذمی (غیر مسلموں) سے جزیہ کی رقم مذکورہ بالا تصریح کی روشنی میں اسی مقدار میں وصول کیا جس کا ادا کرنا چنداں مشکل نہیں۔

امام مالکؒ کا مشہور قول یہ ہے کہ امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ہر شخص سے چار دینار یا چالیس درہم سالانہ لیے جائیں۔(۷۳) امام شافعیؒ کے نزدیک ہر غریب امیر سے سالانہ ایک دینار لیا جائے(۷۴)۔ امام احمدؒ کے چار اقوال مختلف روایات میں آئے ہیں۔ پہلی روایت میں وہ امام ابوحنیفہ کے ساتھ ہیں۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ مقدار کی تعین امیر اسلام کی رائے پر ہے۔ متعین مقدار کوئی نہیں۔ تیسری روایت میں آیا ہے کہ کم سے کم ایک دینار سالانہ لیا جائے، زیادہ کی حد بندی نہیں ہے۔ چوتھی روایت میں آیا ہے کہ صرف اہل یمن کے لیے ایک دینار فی کس سالانہ مخصوص تھا۔ (یہ حکم عمومی ہر ذمی کے لیے نہیں)(۷۵)

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سال شروع ہوتے ہی پورے سال کا جزیہ ادا کرنا واجب ہوگا۔ امام مالک کا قول بھی ایک روایت میں یہی آیا ہے۔ لہٰذا ذمیت کا معاہدہ ہوتے ہی سال بھر کا جزیہ ادا کرنا لازم ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اداءِ جزیہ کا وجوب سال ختم ہونے پر ہوتا ہے، اس لیے سال گزرنے سے پہلے مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ امام مالک کا بھی مشہور قول یہی ہے۔(۷۷)

اگر دوران سال یا سال تمام ہونے کے بعد ذمی مرجائے اور جزیہ ادا نہ کیا ہو تو امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک واجب الادا رقم جزیہ ساقط ہوجائے گی۔ (اس کے ترکہ سے وصول نہیں کی جائے گی) کیوں کہ جزیہ کفر کی دنیوی سزا ہے اور موت سے تمام دنیوی سزائیں ساقط ہوجاتی ہیں، جس طرح حدود (وقصاص) کا سقوط ہوجاتا ہے(۷۸)۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک جزیہ چوں کہ دارالاسلام میں رہنے کا اور حفاظت جان کا معاوضہ ہے اور سکونت وحفاظت سے مرنے والا سال بھر فائدہ اٹھا چکا ہے اس لیے معاوضہ کی ادائیگی واجب ہے اور جزیہ اس کے ترکہ سے وصول کیا جائے گا، بالکل اسی طرح جس طرح دوسرے قرض ترکہ سے وصول کیے جاتے ہیں۔(۷۹)

ذمی اور معاہد کن لوگوں کو کہا جائے گا:

ذمی اور معاہد اگرچہ دو مختلف فقہی اصطلاحات ہیں۔ مگر سلطنت اسلامی میں آجانے کے بعد

دونوں کے احکام یکساں ہی ہیں۔ یعنی یہ کہ سلطان وقت غیر مسلموں کی حتی المقدور نگہداشت کرے اوراس کی راحت رسانی اوراس کے جان و مال اورعزت وآبرو کی حفاظت کرے۔ یہ ساری سہولتیں دراصل جزیہ کا بدل ہے۔ چنانچہ ذمی اور معاہد کے سلسلے میں جو احکام ملتے ہیں اور ان کی جو تعریف شرعی واصطلاحی کی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:

''ذمی یا ذمہ کے معنی عہد، کفالت، حرمت، ذمے داری اورحق کے آتے ہیں۔ "رجل ذمی" کے معنی ہیں رجل له عهد یعنی وہ شخص جس سے کوئی عہدو پیمان کیا گیا ہو۔ اس لیے اهل العهد اور اهل الذمه مترادف الفاظ ہیں۔ جوہری نے لکھا ہے کہ اهل العقد کو اهل الذمه کہا جاتا ہے۔ ابوعبیدہ نے ذمہ کے معنی امان کیے ہیں، چنانچہ حدیث نبویؐ ویسعی بذمتهم ادناهم میں ذمہ کے معنی ''امان'' ہی کے لیے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قوم میں سے کوئی ایک شخص بھی کسی کو اماں دے دے تو پوری قوم کا فرض ہے کہ جسے امان دی گئی ہے، اس کی حفاظت کرے اوراسے گزند نہ پہنچائے۔ چنانچہ ایک غلام نے دشمن کے ایک لشکر کو امان دے دی تھی تو حضرت عمرؓ نے اس کے وعدے کو قائم رکھا تھا۔ معاہد کو ذمی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی حفاظت، امان، ذمے داری اور معاہدے میں ہوتے ہیں۔ (لدخولهم فی عهد المسلمین وامانهم) قرآن مجید میں ہے: لا یرقبون فی مومن الا ولا ذمة (التوبہ:۹) یعنی کسی مسلمان کے حق میں قرابت اور عہد کا لحاظ نہیں کرتے۔ یہاں ذمہ سے عہد مراد ہے۔ اصطلاح میں یہ وہ ذمہ داری ہے جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا کو ذمی یا اہل ذمہ کہا جاتا ہے۔ گویا یہ وہ لوگ ہیں جن کے جان ومال اورعزت وآبرو اورشہری حقوق کی حفاظت کا اسلامی حکومت نے ذمہ لیا ہے۔ یہ ذمہ داری بڑی مقدس ہے۔ امام ابوزید نے لکھا ہے کہ: ان الذمة شرعاً وصفٌ یصیر به الانسان اهلا لما له ولما علیه یعنی اصطلاح شریعت میں ذمہ سے مراد وہ وصف ہے جس کے ذریعہ کوئی شخص اپنے حقوق اور ذمے داریوں کا اہل گردانا جاتا ہے۔ اسلامی اصطلاح میں ذمی لفظ میں ذم یا تحقیر کا پہلو نہیں، بلکہ لفظ ذمی میں اس کی حفاظت کی کفالت اوراس کی شہریت کی حفاظت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ اسلامی حکومت میں رہنے والا وہ غیر مسلم ہے جس کی حفاظت

کرنے اور جس کے حقوق ادا کرنے کا اسلامی حکومت نے ذمہ لیا ہے۔'' (۹۱)

شرعی احکام میں ذمی اور معاہد برابر ہیں:

ذمی اور معاہد دو اصطلاحیں عام طور سے مروج ہیں جو اسلامی مملکت میں رہتے ہیں، ان کے احکام بھی یکساں ہیں، البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ذمی جو ممالک جنگ کے بعد فتح ہوئے اور وہاں کے باشندوں کی اسلامی ریاست نے جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت کی ذمہ داری لی اور انہیں مذہبی آزادی دی اوران کے قانونی حقوق متعین کیے اوران سے فوجی خدمات نہیں لی گئی انہیں اصطلاح میں ذمی کہا جائے گا اوران حقوق کے عطا کرنے کے بعد ایسے لوگوں سے ریاست کے حکام ایک رقم وصول کریں گے جو جزیہ کہلاتا ہے۔ (۹۲)

وہ غیر مسلم علاقے جو جنگ کے ذریعہ فتح نہیں ہوئے بلکہ بعض شرائط کی بنا پر وہ اسلامی ریاست میں شامل ہوکر اس کا حصہ بن گئے اور شرائط کے تعین میں دونوں قوموں نے رضامندی ظاہر کردی جو ملک کی سالمیت اوراس کے مفاد کے لیے کوئی خطرہ پیدا نہیں کرسکتے، لہٰذا جن شرائط کے ساتھ معاہد اور پابندی کی گئی تو ایسے لوگوں کو معاہد کہا جائے گا۔ (۹۳)

مختصر یہ کہ ذمی اور معاہد میں بس اتنا فرق ہے کہ ذمی کو اسلامی ریاست اپنی طرف سے حقوق دیتی ہے اور معاہد ریاست سے معاہدہ کے تحت اپنے حقوق کا تعین کرتا ہے۔ علماء جب ذمی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو دونوں طرح کے لوگ اس میں شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن اثیر معاہد کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

المعاهد من کان بینك وبینه عهد واکثر ما یطلق فی الحدیث علی اهل الذمة وقد یطلق علی غیرهم من الکفار اذا صولحوا علی ترک الحرب مدة ما لانه معصوم المال یجری حکمه مجری حکم الذمی" (۹۴)

(معاہد وہ ہے کہ تمہارے اوراس کے درمیان عہد و پیمان ہو۔ حدیث میں اس کا زیادہ تر اطلاق ذمیوں پر ہوتا ہے، کبھی ان کے علاوہ یہ ان غیر مسلموں کے لیے بھی بولا جاتا ہے جن سے کسی مدت تک کے لیے جنگ بندی کی صلح کی جائے۔ اس لیے کہ اس کے مال کو عصمت اور حفاظت حاصل ہے، اس پر وہی حکم نافذ ہوگا جو ذمی پر نافذ ہوتا ہے)

صدام حسین کو پھانسی

اور امریکہ اور عالمِ عرب و عالمِ اسلام کے تعلق سے ناگزیر سچائیاں

بہ قلم: مولانا نور عالم خلیل امینی
ایڈیٹر ''الداعی'' عربی واستاذ ادب عربی
دارالعلوم دیوبند

مشرقِ وسطیٰ کے تعلق سے جن قارئین کو ناچیز کی نگارشات، بالخصوص عربی زبان میں پڑھنے کا موقع ملا ہوگا، وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ عالم اسلام اور بہ طور خاص عالمِ عربی کو اپنا مکمل غلام بنالینے کے لیے امریکہ کی دور رس سازشوں کے تانے بانے کی شکل اختیار کرلینے والے قائدین وحکام کو یہ راقم ہمیشہ مشخص کرتا رہا ہے۔ اِسی تناظر میں جنگِ خلیج اوّل کے موقع پر راقم نے صدام حسین کے حوالے سے دسیوں دراز نفس مضامین لکھے جن میں خطۂ خلیج میں امریکہ کے عسکری ارتکاز کی خطرناکی اور اس کے دور رس مضمرات پر مفصل اور مدلل گفتگو کی گئی تھی۔

کمالِ چالاکی سے امریکہ — جو مکمل طور پر اِس وقت موساد اور صہیونیت کے اِس طرح زیرنگیں ہے کہ ماضی میں اِس کی نظیر نہیں ملتی — مسلم ملکوں کے جن حکمرانوں کو اپنے ''کارندے'' کے طور پر منتخب کرتا ہے، اُن میں بے شمار ''خوبیوں'' کے ساتھ ساتھ، اِس ''اہم خوبی'' کو ضرور پیشِ نظر رکھتا ہے کہ اُن کے کسی رویّے سے اُمّتِ مسلمہ کو آخر تک یہ محسوس کرنا مشکل؛ بلکہ ناممکن ہو کہ یہ صورت وشکل سے مسلمان اور عربی؛ لیکن باطن اور حقیقت کے اعتبار سے، امریکی یا مغربی ہیں۔ اسکے برخلاف، اُن کے بہت سارے برتاؤ سے یہ محسوس ہوتا ہو کہ یہ ''شیرِ خدا'' ''مجاہدِ اعظم'' قومِ مسلم کے واحد نجات دہندہ اور اسرائیل اور بالآخر امریکہ کو دریا برد کردینے یا کسی اور طریقے سے حرفِ غلط کی طرح مٹادینے کی بھرپور صلاحیت کے حامل اور اِس حوالے سے پکے اِرادے اور سچے جذبات سے بہرہ ور ہیں!۔

اِسلام اور مسلمانوں کے خلاف عالمِ عربی میں اور بیرونِ عالمِ عربی، جتنی سازشیں روبہ عمل لائی

گئیں اور لائی جارہی ہیں، اُن میں سے بیش تر اِنھی حکمرانوں کے ذریعے برپا کی گئیں اور کی جارہی ہیں۔ بعض دفعہ تو خود اِن حکمرانوں کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ انھیں کوئی استعمال کررہا ہے اور قوم وعقیدۂ ووطن کے خلاف اُن سے بھرپور طور پر کام لیا جارہا ہے۔ اگر کبھی انھیں اِس کا اِحساس ہوتا ہے تو پیچھے کی طرف لوٹنے اور تلافیِ مافات کرنے کا وقت نکل چکا ہوتا ہے؛ کیوں کہ وہ مجبور وبے بس ہوچکے ہوتے ہیں اور اُن کے لیے اپنے ارادے سے کچھ کرنا یا کہنا خارج از اِمکان ہوچکا ہوتا ہے۔

ہاں کسی وقت — شواذ کے درجے میں — یہ بھی ہوتا ہے کہ کارندہ حکمرانوں کو شروع سے ہی اپنی کارندگی کا علم ہوتا ہے اور وہ اِس ''منصب'' پر فائز کیے جانے پر بہت خوش ہوتے ہیں اور اُس وقت تک حالات کی ''جنّت ریزی'' سے خوب خوب لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں، جب تک ''ہنی مون'' Honeymoon کے دن نہیں گزر جاتے اور کارندگی کے نتائج بد نکلنے کے دن نہیں آتے اور قوم ووطن اور خود انھیں اُن کے تلخ پھلوں کو نہ چاہتے ہوئے کھانے پر مجبور نہیں ہونا پڑتا۔ جب یہ وقتِ بد آجاتا ہے، تو پانی سر سے اونچا ہوچکا ہوتا ہے اور وقت کا بے رحم ہاتھ ان کی گردنوں تک پہنچ کے رہتا ہے، پھر ''گیہوں'' کے ساتھ ''گھن'' بھی پس جاتا ہے کہ سازش کنندوں کی طرف سے روزِ اوّل سے ہی ''گھن'' کو بھی پیسنے کا ارادہ کیا گیا ہوتا ہے۔ چناں چہ وہ تو ڈوبتے ہی ہیں قوم ووطن بھی ان کے ساتھ ہی حتمی برے نتائج کا شکار ہوجاتے ہیں ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے''۔

اس ضروری تمہید کا دوسرا جزو یہ ہے کہ اسرائیل کی بقا اور عالم عربی میں موجود قدرتی ذخائر — جن میں اب تک کی دریافت کے اعتبار سے تیل کی دولت سرِفہرست ہے، جو دنیا کی صنعت وتجارت کے لیے شہ رگ کا درجہ رکھتا ہے — پر قبضہ؛ یہ دونوں مقاصد یورپ اور امریکہ کے نزدیک ہمیشہ سے اہم رہے ہیں۔

عراق، مصر، شام، پاکستان، افغانستان کو عالم اسلام وعرب کے مابین یہ امتیاز حاصل ہے کہ اگر وہاں کی عسکری طاقت کو برگ وبار لانے کا موقع ملے اور وہاں کے سارے حکمرانوں یا اکثر کی سمتِ سفر کو خدا کی توفیق سے ''قبلے'' کی طرف ہوجانے کی فرصت ملے، تو یہ ممالک کسی بھی اسلام مخالف دشمن سے لوہا لے سکتے ہیں؛ کیوں کہ ان میں سے بعض ممالک کے مسلمان اپنی دینی غیرت میں بڑھے ہوے ہیں، تو بعض لڑائی بھڑائی کی فطرت اور شجاعت وقوت کی بے پناہ صلاحیت سے بہرہ ور ہیں، تو بعض کی عددی طاقت بھی قابلِ لحاظ ہے؛ اِسی لیے یہ ممالک ہمیشہ امریکہ ویورپ کی

نگاہوں میں کھٹکتے رہے ہیں اور انجانا سا خوف اُنھیں اُن کی طرف سے ستاتا رہا ہے؛ اسی لیے اولاً تو انھیں مطلوبہ عسکری طاقت ہی بننے نہیں دیتے اور اگر اِس سمت میں کسی طرح کی پیش قدمی کے ارادے کا اُن کو علم ہوجائے تو فوراً پیش بندی کردیتے ہیں اور اگر یہ ممالک پیش بندی کا نوٹس نہ لیں تو ان کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کی سوچتے ہیں۔ جیسا کہ مصر کے ساتھ بار بار ہوا، پھر نائن الیون کے بہانے افغانستان کی راہ سے پاکستان کو بھی تباہی کے راستے پر ڈال دیا گیا اور اس کے تئیں باقی آپریشن آنے کو ہے۔ عراق کو تباہ کردیا گیا ہے اور اب باقی جو ممالک ہیں وہ آخری حد تک امریکہ کے ہاتھوں تباہی کو تیار بیٹھے ہیں!۔

فی الوقت عالمِ اسلام وعرب کے بڑے بڑے اور خوش نما القاب و اسماء والے حکمرانوں میں سے کل یا اکثر امریکہ کے وفادار غلام ہیں، یا وہ اپنی کرسیوں کے بچانے اور اپنی عزّت کے ''دردِ تہِ جام'' کو باقی رکھنے کیلئے امریکہ کی قدم بوسی اور اس کے چشم وابرو کے اشارے پر چلنے کیلئے مجبورِ محض ہیں؛ کیوں کہ وہ ''شہ کا مصاحب'' بن کے ہی ''اِتراتے پھر رہے ہیں'' ورنہ عربی و اسلامی معاشرے میں وہ اتنے بے آبرو ہیں کہ اگر امریکہ کی غلامی کا طوق اپنی گردن سے باہر نکال پھینکیں تو وہ اسی آن عرش سے فرش پر آجائیں گے اور کوئی ان کی ''تعزیت'' کرنے والا بھی نہ ہوگا۔

❁ ❁ ❁

مرحوم صدام حسین بھی اِسی سلسلے کی کڑی تھے۔ انھوں نے بعض مرحلوں میں شعوری اور بعض مرحلوں میں لاشعوری طور پر مشرقِ وسطیٰ میں امریکی وصہیونی منصوبے کو بھرپور طور پر آگے بڑھایا اور امریکہ کو پہلے سے زیادہ اور عجلت کے ساتھ خلیج کے خطّے میں اپنے فوجی ارتکاز، عسکری اڈے کے قیام واستحکام اور اس کو ہمہ گیر طور پر تہس نہس کردینے کا من چاہا سنہرا موقع عطا کیا۔

عراق ایران جنگ —— جو عرصہ ۸ سال تک جاری رہی اور دونوں ملکوں کے ۱۵-۱۶ لاکھ کے قریب فوجی و شہری جاں بہ حق ہوگئے اور اربوں ڈالر مصارف آئے —— امریکی اسرائیلی منصوبے کے بر پا ہونے کی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرنے کی سمت میں بہت بڑا اور بنیادی قدم تھا۔ امریکہ نے اِس موقع سے نہ صرف عراق کو؛ بلکہ دگر عربی ملکوں کو بھی ہتھیار کی کھیپ کی کھیپ دے کر اڑوس پڑوس کے عربی ممالک سے خوب خوب دولت بٹوری؛ کیوں کہ انھیں ایرانی شیعی خطرے پر ''سب سے بڑا ڈیم'' تعمیر کرنے کا خواب دکھایا گیا اور بتایا گیا کہ عراق، خلیج کے عربی ملکوں پر ایران کے مُسلَّط ہوجانے کی راہ میں درحقیقت سدِّ سکندری ہے، خدانہ خواستہ اگر یہ سد ڈھہ گئی، تو

ایران کے سیلِ بلاخیز کو کسی طرح بھی روکنا ممکن نہ ہوگا!۔

امریکہ نے چوری چھپے ایران کو بھی ہتھیار سپلائی کیے؛ تاکہ ایک طرف اسلحے کی کھپت کے ذریعے اس کی دولت کو اسپنج کی طرح چوسا جائے، دوسری طرف دونوں کو تادیر لڑتے رہنے اور اپنی عسکری، مادی اور بشری طاقت کو کم زور سے کم زور تر کرلینے کا جنون امریکہ واسرائیل کی خواہش کے مطابق اپنا اثر دکھا سکے۔

ابھی یہ جنگ ختم نہ ہوئی تھی کہ اور عراقی عوام ابھی اس سے پیدا شدہ زخمِ جسم وزخمِ جگر چاٹ ہی رہے تھے کہ امریکہ نے اپنی جواں سال، فتنہ خیز یہودن دوشیزہ سفیر APRIL GALASPIE (جس کو کسی مصلحت کے تئیں ہی عراق میں متعین کیا گیا تھا اور جس کے تعلق سے ذرائع ابلاغ نے یہ نوٹ کیا تھا کہ اُس وقت صدام حسین صاحبؒ بہ وقتِ شام اکثر سفارت خانے کی زیارت اور قتالہ سفیرہ کی ملاقات و وصال سے بہرہ یاب ہوا کرتے تھے) کے ذریعے صدام حسین کو باور کرایا کہ کویت فلاں خطّے سے —— جو عراقی سرحد سے ملا ہوا ہے —— مسلسل عراق کے تیل کی چوری کا مرتکب ہو رہا ہے، اگر عراق اِس حوالے سے کویت سے عسکری طور پر نمٹتا ہے، تو امریکہ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا؛ کیوں کہ یہ عراق اور کویت کا معاملہ اور تمام تر عربوں کی داخلی کشاکش ہوگی۔ عراق نے کویت پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا اور اس چھوٹے سے خودمختار عربی ملک کو اپنی ریاست کا ایک صوبہ قرار دے کر وہاں سے کسی طرح بھی باہر نہ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ مسلم اور عربی ملکوں، نام نہاد اقوامِ متحدہ اور دگر عالمی اداروں نے صدام کو بہتیرا سمجھایا کہ بھئی! تم کویت چھوڑ دو؛ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوے۔ امریکہ نے سارے عربی ملکوں کو عموماً اور سعودی عرب کو خصوصاً یہ باور کرایا کہ عراق اپنی ''بھیانک'' حربی طاقت کے ذریعے، یکے بعد دیگرے سارے عربی ملکوں پر حملے اور قبضے کی سوچ رہا ہے۔ چناں چہ خطّے کے سارے ملکوں نے امریکہ کو اپنے ہاں اپنی فوج اتارنے اور خلیج کے خطے میں عسکری ارتکاز کی نہ صرف بہ خوشی اجازت دے دی بلکہ اچھل اچھل کے انتہائی بے تابی کے ساتھ اس کی پیش کش کی۔ اس سے امریکہ کو اپنی من چاہی مراد مل گئی۔ اس نے پوری دنیا میں اپنے طاقت ور یہودی ذرائع ابلاغ کے ذریعے شب وروز شور مچایا کہ صدام کویت پر قبضہ کرکے اب سارے عربی ملکوں پر قبضے کے لیے پر تول رہا ہے۔ چناں چہ وہ ۳۰ ملکوں کی نام نہاد افواج اور دراصل اپنی صلیبی وصہیونی افواج کو اس خطۂ عرب میں اتار لیا جس کو کافروں سے بالیقین ہمیشہ پاک رہنا چاہیے۔

عصرِ حاضر میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک عربی ملک پر ایک پڑوسی عربی ملک نے حملہ و قبضہ کرکے، عربوں کی صفوں میں ایسی گہری خلیج پیدا کردی تھی جس کو پاٹنا خارج از امکان بن گیا تھا۔ ہماری اِن آنکھوں نے زمانے کی یہ نیرنگی بھی دیکھی کہ ایک مسلم عربی ملک کو ایک مسلم عربی ملک سے آزاد کرانے کے لیے صلیبی وصہیونی اتحاد سرگرمِ کار رہا اور امریکہ نے ہمیشہ کے لیے اِس خطے میں اپنے زبردست فوجی جماؤ اور عسکری اڈوں کی راہ ہموار کرلی۔ کویت کو آزاد کرانے کے بہانے عربوں کو صلیبی وصہیونی طاقت کا ہمیشہ کے لیے غلام بنالیا گیا۔ ۲۸/فروری ۱۹۹۱ء کو جب امریکہ نے عراق کے خلاف اپنی فوجی کارروائی موقوف کی، تو نہ صرف یہ کہ عراق کے ۲۵ ہزار فوجی وشہری ہلاک اور ۷۵ ہزار فوجی وشہری زخمی ہوچکے تھے؛ بلکہ عراق کی عسکری طاقت چورہ چورہ ہوچکی تھی اور معاشی طور پر وہ قلاش ہوچکا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ صدام حسین سارے عربوں سے کٹ گئے اور سارے عرب اُن سے بالکل برگشتہ ہوگئے، اِس وقت مسلمانوں کے درمیان بش کی جو شبیہ ہے غالباً اسی طرح کی شبیہ صدام کی عربوں اور مسلمانوں کے بہت بڑے طبقے کے درمیان بن گئی تھی۔ اِس موقع سے صدام کے خلاف ہزاروں صفحات لکھے گئے، ان کے محرومیوں سے بھرپور بچپن، بے سمت نوجوانی، اور خون کی رسیا جوانی اور ہم عصروں و رفقائے کار کے خلاف بڑے سے بڑے اور بُرے سے بُرے اقدامات کے ذریعے اقتدار پر قابض ہوجانے میں اُن کی فن کاری وغیرہ پر سیکڑوں کتابیں چھپیں اور بہت بکیں۔

صدام نے کویت کی بہ جائے اگر سنجیدگی سے اسرائیل سے بھرپور پنجہ آزمائی نہ سہی دوچار میزائلس صہیونی ریاست کی طرف داغ دیتے (جس کے متعلق ہمیشہ ان کے بڑے بڑے معاندانہ بول سے، دنیا کے مسلمان عموماً اور اسلام پسند خصوصاً بہت خوش ہوتے رہے تھے اور اُن سے اسرائیل سے نمٹنے کے تئیں بڑی بڑی امیدیں لگائے رہتے تھے) تو وہ دنیا میں پوجے جانے والے مسلم حکم راں بن جاتے اور امتِ مسلمہ یہ سمجھتی کہ واقعی عراق کی عسکری تیاری اپنے مصرف میں ٹھکانے لگی؛ لیکن انھوں نے امریکہ کے جھانسے میں آکر کویت پر حملہ وقبضہ کرکے اور ساتھ ہی متعدد عربی ملکوں کو بے وجہ دھمکی دے کر، اپنی بدقسمتی پر ہمیشہ کے لیے مہر لگادی اور قوم و وطن اور پوری امتِ مسلمہ اور بالخصوص عربوں کو امریکہ اور اسرائیل کے قدموں میں اِس طرح ڈال دیا کہ اب بہ ظاہر بہت دنوں تک دور دور تک ان کے پنجۂ استبداد سے نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی؛ بلکہ

غلامی کے نہ معلوم کتنے طوق کس کس مسلم و عربی ملک کی گردن میں کب کب ڈالنے کا پلان ہے، اس کا علم صرف خدائے علیم ہی کو ہے۔

امریکہ نے اب کی بار صدام حسین کو اپنے لیے ''ہنرمندی'' سے مکمل طور پر اِس طرح استعمال کرلیا کہ ایک تیر سے اس نے لاتعداد شکار کرلیے اور عربوں کے بحر و بر اور جسم دونوں سے تیل نکالنے کی ایسی راہ پیدا کرلی، جو اَب کبھی ناہموار ہونے والی نہ تھی، یہاں سے صدام حسین میں امریکہ کے تئیں پائے دار عداوت، بغض وعناد کا ایسا جذبۂ بے کراں بیدار ہوا جو شہادت تک اُن کا ہم راہی رہا۔ امریکہ نے صرف اسی پر بس نہیں کیا؛ بلکہ نام نہاد سلامتی کونسل کے ذریعے عراق پر زبردست اقتصادی پابندی عائد کردی جو ۱۲/سال تک جاری رہی، جس سے عراق عسکری طاقت کی مسماری کی رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی اور اقتصادی طور پر وہ بالکل دیوالیہ بن گیا۔ اس دوران کم وبیش دس لاکھ عراقی بچے غذائی قلت اور دواؤں کی نایابی کی وجہ سے دم توڑ گئے۔

اس کے بعد امریکہ نے عراقی اسلحے کی تفتیش کا ایسا دراز نفس ڈرامہ اسٹیج کیا کہ دنیا والے اس کو دیکھ دیکھ کر اوبھ گئے۔ جب یقین ہوگیا کہ عراق کے پاس مزاحمت کی کوئی عسکری طاقت نہیں تو اس نے نائن الیون کے پس منظر میں، اس پر یہ کہہ کر حملہ کردیا کہ اس کے پاس وسیع تر تباہی کے بے شمار ہتھیار ہیں۔ اس جنگ کی اقوام متحدہ، سارے عالمی اداروں اور دو ایک کو چھوڑ کے دنیا کے سارے ملکوں نے مخالفت کی؛ لیکن جونیئر بش کو اپنے والد سینئر بش کا صدام سے انتقام لینا تھا؛ کیوں کہ صدام نے بغداد کے رشید ہوٹل کی دہلیز میں سینئر بش کی شبیہ فرش پر بنوادی تھی؛ تاکہ سارے آنے جانے والوں کے پاؤں اس پر ضرور پڑیں، سو بش نے بالآخر یہ انتقام لے ہی لیا۔

صدام حسین کے لیے اس آخری خلیجی جنگ میں (جو اُن کے اور اُن کے ملک وقوم کے خلاف لڑی گئی اور لڑی جارہی ہے اور جو ۲۰/مارچ ۲۰۰۳ء کو شروع کی گئی اور یکم مئی ۲۰۰۳ء کو جونیئر بش نے جنگ کے ''خاتمے'' کا اعلان تو کردیا؛ لیکن آج بہ وقت تحریر — شنبہ: ۳/فروری ۲۰۰۴ء = ۱۴/محرم ۱۴۲۸ھ — بھی امریکہ کی دم تباہ شدہ عراق کی پھٹن سے تمام کوششوں کے باوجود نہیں نکل سکی ہے) اِس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ مسلسل جنگ اور عالمی پابندیوں کی وجہ سے عسکری طور پر مفلوج ہوجانے کو دیکھتے ہوئے وہ امریکہ کی ساری ظالمانہ اور ذلت آمیز شرطوں کو مان کر سپر انداز ہوجاتے یا پھر مقابلہ کی طاقت سے تہی مایہ ہونے کے باوجود اپنا بھرم باقی رکھنے اور اپنی جھینپ مٹانے کے لیے اپنی ضد پر قائم رہتے اور امریکہ سے دو دو ہاتھ کرنے کو، اپنے

محلات کی جنت میں انتظار کرتے رہتے۔ انھوں نے اپنے فطری سرپھرے پن کی وجہ سے (جس کی وجہ سے زندگی میں بڑی بڑی خطرناکیوں، ناانصافیوں، جارحیتوں اور منطقی نتائج نیز ناگہانی مصائب کو دعوت دی اور پھر انھیں جھیلا اور اپنی ذاتی وصفاتی وقومی توانائیوں کا زیادہ تر اور بہتر حصہ ان سے نمٹنے میں ہی صرف کردیا) دوسری ترجیح کو ہی اپنے نصیبے کے آخری انجام تک پہنچنے کے لیے منتخب کیا۔ اور دنیا والوں کی توقع کے مطابق وہی کچھ ہوا جو ہونا تھا۔ ہمارے بہت سے خوش فکر مسلمان، جو ہمارے حکمرانوں کے تئیں عموماً سچائیاں نہیں جانتے، صدام حسین اور اُن کی افواج کی طرف سے، خدا کے حکم سے اور انبیا کے سچے ماننے والوں کے تعلق سے، خدا کے وعدے کے بہ موجب، ''معجزات'' کے ظہور کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے کہ عراقی افواج نے اب امریکہ کو کچل دیا اور تب اور بش کی کافر وفاجر افواج عراق کے صحرا کا اب پیوند بنی اور تب۔ دوسری طرف خدا کی مشیّت اور زمینی حقیقت اِس شکل میں سامنے آئی کہ صلیبی وصہیونی امریکی و برطانوی افواج نے سارے عراق بالخصوص بغداد کے چپے چپے پر خطرناک بموں کی موسلادھار بارش (جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے) کرکے، آخری حد تک اس کو تباہ کردیا اور انسانی لاشوں کی ''زرخیز'' فصل کاٹ کر، صرف ۴۲ دنوں میں، عراق کو غلام بنالیا۔

امریکہ کی اِس جارحیت میں دنیا کے اکثر ملکوں نے نہ صرف یہ کہ اس کا ساتھ نہیں دیا؛ بلکہ اسکے خلاف بڑے بڑے عالم گیر اور بے نظیر مظاہرے ہوئے؛ لیکن حیرت کی بات ہے کہ چکنے چپڑے عربی نام والے عرب اور مسلم حکمرانوں نے نہ صرف چپ سادھے رکھا؛ بلکہ درپردہ اور کھل کر امریکہ کا ساتھ دیا اور کئی ایک نے اپنے ہاں سے برادر عربی ملک عراق کے خلاف ہر طرح کی عسکری کارروائی کو بہ خوشی قبول کیا، جس کے بغیر امریکہ کے لیے عراق کے خلاف کارروائی ممکن نہ تھی۔

دوسری طرف بش نے عراق کے حوالے سے جو حسین خواب دیکھا تھا کہ وہ تر نوالہ ثابت ہوگا، وہ مزاحمت کاروں کی ناقابلِ تصور مزاحمت کی وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا نہ آئندہ اِن شاء اللہ ہونے کو ہے۔ امریکہ نے عراق پر حملے کے بار بار وجوہِ جواز بدلے، دنیا والے بش کے جھوٹ، فریب، ضد، خونِ مسلم کی عجب سی ان کی لت سے بری طرح اکتا چکے ہیں اور خود امریکہ والے بہت سے لوگ ان کا منھ نوچنے کو تیار ہیں۔ امریکہ نے عراق میں صہیونی کارندوں کو کھل کھیلنے کا موقع دے رکھا ہے، ان کے محبوب مشغلوں میں یہ بھی ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کے عقیدۂ وثقافت کو تہس نہس کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں شیعہ سنی جھگڑے کو خوب خوب بڑھاوادیا

جائے، نیز کردوں اور مختلف نسلی وقبائلی گروہوں کی عصبیت کو ہوا دی جائے؛ تاکہ عراق کا تیا پانچہ کرکے اس کے فرزندوں کے عسکری اور حربی بھرم کو ختم کردیا جائے اور اسرائیل کے لیے اب یہ کبھی خطرہ نہ بن سکے۔ بش کے ذریعے فتح کے اعلان کے بعد سے اب تک ۶-۷ لاکھ عراقیوں کو (جن میں اکثریت سنیوں کی ہے) موت کے گھاٹ اتارا جاچکا ہے، امریکہ نے وہاں ظلم وبربریت اور قتلِ عام کا طوفان برپا کررکھا ہے، جیلوں کو عقوبت خانہ بنا رکھا ہے، عراقیوں کی عزت وآبرو کو پامال کرنا امریکیوں کے نزدیک غالبًا ان کے رب کی رضا جوئی کا بہترین ذریعہ ہے، جان ومال کا اِس بے دردی سے ضیاع، اتنے دنوں تک اور اس پیمانے پر، عالم نے کیوں دیکھا ہوگا؟۔

❁ ❁ ❁

دوسری طرف ۲۲/جولائی ۲۰۰۳ء کو امریکی فوج نے عراق کے شہر ''موصل'' میں ایک زبردست حملے میں صدام حسین کے دونوں بیٹوں: ''عدی'' اور ''قصی'' کو قتل کردیا۔ صدام حسین تو سقوطِ بغداد کے بعد ہی روپوش ہوگئے اور اُن کے تعلق سے بھانت بھانت کی خبریں گشت کرتی رہیں، تا آں کہ ۱۴/دسمبر ۲۰۰۳ء کو امریکی فوجیوں کے ذریعے اُن کے پکڑے جانے کا اعلان کیا گیا۔ ۱۹/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو ''دجیل'' میں ۱۴۸ شیعوں کے قتل کے الزام میں صدام پر مقدمہ شروع کیا گیا۔ ۵/نومبر ۲۰۰۶ء کو دجیل قتل کا انھیں ملزم ٹھہراتے ہوئے بغداد کی عدالت نے اُن کو پھانسی کی سزا سنائی۔ وکلا کے مشورے سے اُنھوں نے سزا کے خلاف اپیل دائر کی؛ لیکن ملک کی کریمنل عدالتِ علیا نے ۲۶/دسمبر ۲۰۰۶ء (سہ شنبہ ۴/ذی الحجہ — بہ تقویم ہندوستان — ۱۴۲۷ھ) کو ان کی اپیل کو مسترد کرتے ہوئے پھانسی کے ذریعے انھیں مارڈالنے کی سزا کو برقرار رکھا اور بالآخر بہ عجلت تمام انھیں جمعہ شنبہ: ۲۹-۳۰/دسمبر کی درمیانی شب میں صبح صادق سے ذرا پہلے تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا۔ عالمِ عربی کی جنتری کے حساب سے اس دن ۱۰/ذی الحجہ ۱۴۲۷ھ کی تاریخ تھی۔ دنیا کے لاکھوں مسلمان شعائرِ حج کی ادائیگی میں مشغول تھے اور ساری دنیا کے مسلمان عیدالاضحیٰ کی نماز اور سنتِ ابراہیمی کو بجالانے کے لیے مصروفِ کار تھے کہ اُنھیں یہ اندوہناک خبر ملی کہ صدام حسین کو شہید کردیا گیا، تو ہر ایک کو یہ لگا کہ صدام حسین کو بالیقین ظالمانہ طور پر قتل کیا گیا ہے۔ کروڑوں مسلمانوں نے انھیں دعا دی اور کٹھ پتلی عراقی حکومت کے اہل کاروں اور امریکہ کے بش پر دل کی گہرائیوں سے آبدیدگی کے ساتھ لعنت کی اور بددعا دی۔

ذرائع ابلاغ میں دوسرے دن خبر آئی کہ صدام کو پھانسی دینے میں شیعی رہنما مقتدی صدر اور

ان کے حامی بھی شریک تھے، پھانسی کے تختے پر چڑھاتے وقت صدام سے بدزبانی بھی کی گئی اور عار دلا کر اُن کا دل دکھایا گیا، پھانسی کے بعد ان کی لاش کے ساتھ بے حرمتی کی گئی جس کی غمازی اخبارات میں چھپی تصویر سے بہ خوبی ہوتی تھی۔

صدام حسین پر مقدمہ کی کارروائی تمام تر غیر منصفانہ تھی، ان کے ۳ وکلا اور ججوں کو صرف اس جرم میں مار دیا گیا کہ وہ صدام کی وکالت کیوں کر رہے ہیں۔ اُن کے آخری جج کو بھی زبردستی اور بے وجہ تبدیل کر دیا گیا؛ تاکہ فیصلہ حسبِ منشا صادر ہو۔ پھر ان کو جس طرح عیدالاضحیٰ کے دن صبح سویرے پھانسی دی گئی، یہ اقدام انتہائی افسوسناک اور بدبختانہ تھا اور اس کا مقصد صرف دنیا کے مسلمانوں کا منھ چڑھانا تھا اور یہ بتانا تھا کہ اے مسلمانو! ہم تمھارے دینی تیوہاروں، مذہبی تقریبات اور شعائر کی کوئی پروا نہیں کرتے اور تمھیں ہم جب اور جس طرح چاہیں ذلیل کر سکتے ہیں۔

صدام حسین کو پہلی مرتبہ جو محبوبیت ملی، دعاؤں کا ہدیہ ملا، نیک نامی کی سوغات ملی؛ وہ انھیں زندگی میں کبھی نہ ملی تھی۔ کیا عجب ہے کہ خدائے بے نیاز نے اس طرح اُن کے لیے مغفرت کی کوئی راہ پیدا کر دی ہو اور ان کے گناہوں کو معاف کر دینے کا بہانہ نکال لیا ہو۔ اس کریم کے ہاں بخشش کے لیے بہانہ چاہیے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے امام ترمذیؒ نے جو حدیث قدسی نقل کی ہے اور جس کو امام صاحب نے ''حدیث حسن صحیح'' قرار دیا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر بندے کا گناہ اتنا ہو کہ اس سے زمین وآسمان کی پوری فضا بھر جائے اور روے زمین کا احاطہ کر لے تب بھی وہ غفور رحیم بخش دے گا بشرطے کہ وہ اس سے سچے دل سے مغفرت کا طالب ہو اور اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

صدام حسین کا آخری وقت — اور صحیح علم تو خدا ہی کو ہے — بہت اچھا گزرا، اُن کے رویّے سے محسوس ہوتا تھا کہ انھوں نے اپنے رب سے صدقِ دل سے معافی چاہی ہے۔ وہ تختۂ دار پر جاتے وقت دائیں ہاتھ میں قرآن پاک لیے ہوئے تھے، جو انھوں نے اپنے گلے میں پھندا ڈالے جانے کے وقت جلادوں کو یہ کہہ کر دے دیا کہ فلاں صاحب کو یہ قرآنِ پاک دے دیا جائے، تختۂ دار پر لائے جانے سے قبل جب ان کو اہل کاروں نے جیل میں کہا کہ اب آپ کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا آپ تیار ہو جائیں، تو انھوں نے غسل کیا، نماز پڑھی، قرآنِ پاک کی تلاوت کی، تب وہ متعلقہ اہل کاروں کی گاڑی پر سوار کرائے گئے اور کال کوٹھری تک لائے گئے۔ تختۂ دار پر چڑھتے وقت وہ پرسکون رہے، کسی گھبراہٹ اور خوف کا اظہار اُن کے کسی برتاؤ سے نہیں ہوا، یہ

بہت بڑی بات ہے؛ اسی لیے سارے ذرائع ابلاغ نے اس کو نہ صرف ریکارڈ کیا؛ بلکہ بار بار اس کو مشتہر کیا: پھندہ کسے جانے سے قبل انھوں نے تین مرتبہ اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر کہا اور پھر ان کے پاؤں کے نیچے سے تختہ ہٹا دیا گیا اور پھانسی کا عمل تمام ہوتے ہی وہ ابدی نیند سو گئے۔

صدام حسین نے یقیناً جبر واستبداد کے ساتھ حکومت کی، قوم وامت کو شدید نقصان پہنچایا، بھیانک جرائم کا ارتکاب کیا، ملت کے لیے لاتعداد تباہیوں کا ذریعہ بنے، اپنی رعایا کو مجموعی طور پر ناخوش رکھا، عدل انصاف کے اپنے تراشیدہ پیمانے پر ہی عمل کیا۔ اسرائیل اور امریکہ کو صرف دھونس دھمکی دی اور جب وہ اس قابل تھے کہ دونوں میں سے کسی کو کوئی کانٹا چبھا سکتے تھے، تو اپنے ابنائے مذہب وثقافت وتاریخ یعنی عربوں کے ایک ملک پر حملہ وقبضہ کے ذریعے، دنیا کے بیش تر مسلمانوں کو اپنا حریف بنا لیا۔

جب پھانسی دی گئی تو شیعہ (جو اُن سے بہ طور خاص اِس لیے پرخاش رکھتے تھے کہ وہ سنّی تھے) اور وہ سنی عرب بھی یقیناً خوش ہوے ہوں گے جنھیں اُن کے طرزِ حکمرانی نیز کویت پر حملے اور قبضے سے ہمہ گیر اذیت ہوئی تھی اور سب سے زیادہ خوشی امریکہ کے بدنامِ زمانہ صدر بش اور اُن کے صلیبی وصہیونی ہم خیالوں کو ہوئی کہ اُنھیں یہ محسوس ہوا کہ انھوں نے عراق میں اپنی ناکامیوں کو یکلخت کامیابیوں میں تبدیل کر لیا ہے؛ لیکن اُنھیں جلد ہی یہ محسوس ہو گیا کہ اُن کا خواب ابھی بھی شرمندۂ تعبیر ہونے کے قریب بھی نہیں۔

صدام حسین کی پھانسی سے سب سے بڑا اسبق — جیسا کہ دنیا کے اکثر صحافیوں، قلم کاروں اور دانش وروں نے کہا ہے — ان عربی اور مسلمان حکمرانوں کو لینا چاہیے جو اِس وقت امریکہ کے ایجنٹ بنے ہوے ہیں اور صہیونی وصلیبی منصوبوں کی تکمیل کا نہ صرف ذریعہ بنے ہوے ہیں؛ بلکہ تکمیل کی راہ کی ساری رکاوٹوں کو ایک ایک کر کے ہٹانے میں جٹے ہوے ہیں اور ''گلیم بوذر ودلقِ اویس وچادرِ زہرا'' کو بیچ کھانے کے جذبۂ بے پناہ سے اِس طرح سرشار ہیں کہ لگتا ہے کہ اپنی کھالوں میں نہیں سما رہے ہیں۔ یہ وقت ان کے اِس سچائی پر غور کرنے کا ہے کہ وہ صدام سے زیادہ ''ناسمجھ'' ''سرپھرے'' اپنے پاؤں پر آپ کلھاڑی چلانے والے نہیں ہو سکتے۔ امریکہ نے صدام حسین کے اِن ''اوصاف'' سے بھرپور طور پر فائدہ اٹھایا؛ لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ صدام حسین اب سرتابی دکھا رہا ہے اور اس کے صلیبی وصہیونی منصوبے کو اپنے آخری انجام تک پہنچانے میں اس کا ساتھ نہیں دے رہا؛ بلکہ اب خطرہ ہے کہ وہ بہت سے رازہائے سربستہ سے پردہ نہ اٹھا

دے، جس کی وجہ سے امریکہ کی جگ ہنسائی ہوا اور اقوامِ عالم کو اُس کے استعماری عزائم کے تانے بانے کی جان کاری ہوجائے، تو صدام حسین کے ملک، ان کی قوم، ان کی طاقت اور بالآخر ان کی ذات کو بہ عجلت تمام ٹھکانے لگا دیا گیا۔

پکڑے جانے کے بعد صدام عرصۂ تک زندہ رہے، کسی کو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ''ہنی مون'' والے امریکی دنوں کے راز و نیاز کی بات کو واشگاف کیوں نہیں کیا؟ تو یہ عرض ہے کہ وہ تمام تر امریکی گرفت میں تھے، کیا پتہ اُن کے دماغ و دل کو سائنس کی ترقی کے اِس دور میں کس طرح استعمال کیا گیا، کیا عجب ہے کہ انھیں وہی بولنے دیا گیا جو امریکہ بلوانا چاہتا تھا، ان سے وہی کچھ کہلوایا گیا جس سے امریکہ کو سبکی نہ ہو۔ آج کل دل اور دماغ پر قریب اور دور سے دواؤں اور آلات کے ذریعے اِس طرح کنٹرول کیا جاسکتا ہے کہ بڑے سے بڑے روایتی جادوگر بھی ششدر رہ جائیں گے۔ روے زمین پر اسرائیل اور امریکا سے بڑا شیطان اِس وقت غالباً خود اصل شیطان بھی نہ ہو؛ کیوں کہ گرو گڑ ہی رہ جاتا ہے اور چیلا عموماً شکر بن جاتا ہے۔

بالیقین صدام گنہ گار تھے؛ انھوں نے ہمالیائی جرائم کیے؛ انھوں نے سنگ دلی، تشدّد، سخت گیری، جبر و اکراہ اور استبداد کی بہت بری سطح پر اُتر کر حکومت کی؛ حکمرانی کے پورے دورانیے میں دوست سے زیادہ دشمن کو جنم دیے؛ ساتھ ہی کچھ اچھے کام بھی کیے، جو اُن کی برائیوں کے نیچے دب گئے۔ یقیناً اُن کا محاسبہ ہونا چاہیے تھا اور سزا بھی ملنی چاہیے تھی؛ لیکن یہ دونوں کام کسی امریکہ، کسی اسرائیل، ان کے کارندوں اور ان کے غلامانِ باوفا کا نہیں تھا۔ یہ کام خود اُن کی آزاد قوم، آزاد ملک اور امتِ عربیہ کا تھا کہ وہ بہ وقتِ تقاضا اُن کا محاسبہ کرتی اور مناسب سزا تجویز کرتی۔ سات سمندر پار سے، بغیر بلائے، طاقت کے زور پر، کسی ملک پر قبضہ کرکے، اس کے حکم راں کو پھانسی پر چڑھانے کی جو طرح بش اور اُن کے ہم نواؤں نے ڈالی ہے، تو کیا خود اِسی کی رو سے بش صاحب نے مسلمانوں اور عربوں کے لیے طاقت ور ہوجانے کے بعد، اس بات کا جواز نہیں پیدا کردیا ہے کہ وہ اُن کے ملک پر اِسی طرح حملہ اور قبضہ کرکے اُن کو تختۂ دار پر چڑھا دیں۔ یا اِس وقت جو ملک امریکہ سے ٹکر لے سکتے ہیں، اگر وہ سنجیدہ ہوجائیں اور بش کے ملک پر حملہ کرکے انھیں پکڑ کے صدام سے بھی زیادہ برے انداز میں انھیں جہنم رسید کردیں، تو خود اُن کے رویّے کی روشنی میں انھیں یا اُن کے باپ کو یا اُن کے شرارت پیشہ ٹولے کو اعتراض کرنے کا کوئی حق ہوسکتا ہے۔ بش نے انتہائی خطرناک راہ اختیار کی ہوئی ہے، دنیا والے اُن کے خلاف شور تو مچاتے ہیں؛ لیکن کوئی

بڑی طاقت اُن کا گریبان پکڑ کے اُن کو راہ راست پر لانے کو تیار نہیں ہوتی۔

عالمی برادری کے نفاق، دوہرے پیمانے پر عمل آوری، تفریق کی سیاست، مسلمانوں اور غیرمسلموں کے درمیان الگ الگ طرزِ عمل اور ظلم کو صرف ایک حد تک ظلم کہنے اور ظلم کے سر چڑھ جانے کے بعد اس کو ''انصاف'' کا نام دے دینے کے سلوک سے؛ امتِ مسلمہ کا غصہ دیدنی بن گیا ہے۔ دہشت گردی کے جس بھوت کو مارنے کے لیے بش اور اُن کے ناپاک ٹولے نے انجانے سمتوں میں رتوندی والے اونٹ کی طرح ٹامک ٹوئیے مارتے رہنے کا رویّہ اپنایا ہوا ہے، تو یہ معرکہ امریکہ اور عالمی برادری کے مذکورہ منافقانہ اور متضاد طرزِ عمل کی وجہ سے کسی طرح بھی سر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ امریکہ اور دنیا کے وہ ممالک جو امریکہ کی روش میں کسی نہ کسی طرح قولاً یا فعلاً اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، وہ اس وقت جتنے غیرمحفوظ ہوگئے ہیں، اتنے غیرمحفوظ وہ کبھی نہ تھے۔

عالمی برادری اور بہ طورِ خاص امریکہ اپنی موجودہ روش پر قائم رہ کر کسی فوت شدہ مقصد کو حاصل کرسکتا ہے نہ کسی مطلوبہ امن و سکون سے بہرہ یاب ہوسکتا ہے۔ ظلم کی راہ ہمیشہ بڑی کٹھن رہی ہے، ہے اور رہے گی۔ امریکہ اِس ڈگر کو جتنی جلدی چھوڑ دے، اُسی قدر اُس کے حق میں بھلا ہوگا اور دنیا والوں کو بھی سکون کی سانس لینے کا موقع ملے گا۔

❁ ❁ ❁

مدارس اسلامیہ اور علماء دین کی ذمہ داری

از: میرزاہد مکھیالوی
جامعہ فلاح دارین الاسلامیہ بلاسپور، مظفرنگر

مدارس اسلامیہ کی اہمیت وافادیت اور تاریخی حیثیت کسی بھی صاحب علم ذی شعور انسان پر مخفی نہیں، علمی و دینی خدمات کے ساتھ ملک کی ترقی وسلامتی کے لئے بھی مدارس کا نمایاں کردار رہا ہے، وطن عزیز کی خاطر قربانی دینے کیلئے مدارس اور علماء کا قائدانہ کردار ملک کی جدوجہد آزادی سے لے کر آج تک تاریخ کا ایک قابل فخر اور زریں حصہ ہے۔ مدارس اسلامیہ امت مسلمہ کی وہ متاع عزیز ہیں جن کے ساتھ اس کا ملّی تشخص اور دین ومذہب کی بقاء کا سلسلہ مربوط ہے، یہ دینی ادارے اسلامی تہذیب وثقافت اور اخلاقی اقدار کا نمونہ ہیں، علماء دین جو ملت کے رہنما ہیں انھوں نے اوّل دن سے ہی اپنے فرض منصبی کو بخوبی پورا کیا اور دینی مراکز ومدارس کی بنیادیں ڈالنے، ان کی آبیاری کرنے اور پروان چڑھانے میں بڑی مشقتیں برداشت کیں، مختلف قسم کی مشکلات سے انہیں دوچار ہونا پڑا خود اپنے ہی لوگوں کی جانب سے موانع اور مسائل پیش آئے لیکن ہمارے اکابر واسلاف نے ہمت نہیں ہاری بلکہ متواتر اپنی جدوجہد کو جاری رکھا یہاں تک کہ اللہ رب العزت نے آسانیوں اور فلاح وکامیابی کے دروازے کھول دئے۔

راقم الحروف کے سامنے ماضی قریب کی تازہ مثال استاذ العلماء حضرت مفتی نصیر احمد صاحب قدس سرہ کی ہے، حضرت موصوف ۱۹۹۲ء تک مدرسہ مفتاح العلوم جلال آباد مظفرنگر یوپی کے صدر مفتی رہے۔ ادارہ کے بانی وروح رواں حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خاںؒ جلال آبادی کی سرپرستی میں چالیس سال تک فقہ وفتاوی کی مثالی خدمات انجام دیں، تدریسی مصروفیتوں اور دارالافتاء کے باوقار وحساس شعبہ کی ذمہ داری کے ساتھ انھوں نے مظفرنگر، باغپت، میرٹھ وغیرہ کے دیہی علاقوں میں دو درجن سے زائد مدرسے قائم کئے، اس کے لئے انہیں قریہ قریہ پیدل بھی سفر کرنے پڑے، لوگوں کی تلخ کلامی اور ناشائستہ حرکتوں سے بھی سابقہ پڑا، طرح طرح سے مخالفتیں کی گئیں، لیکن وہ مرد مجاہد ہر موقعہ پر فولادی پیکر بن گئے اور عزم واستقلال

کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

یقیناً حضرت مفتی صاحبؒ ملت اسلامیہ کے بڑے محسن تھے کہ انھوں نے ناخواندہ قوم کو جہالت وبددینی کی تاریکیوں سے نکالنے اور دینی تعلیمی رجحان پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا، باری تعالیٰ انہیں اس اساسی خدمت کے عوض اپنی شایان شان اجر عطاء فرمائے۔ آمین۔

نومولود مدرسوں کا سیل رواں

یہ حقیقت سب کے سامنے ہے کہ اس وقت گاؤں بستیوں اور شہروں میں نئے نئے مدرسے بکثرت قائم کئے جارہے ہیں، ہر بستی اور شہر میں دینی ضرورت کے تحت مدرسہ کا قیام بلاشبہ ایک بنیادی اور خوش آئند اقدام ہے، لیکن ایسے نومولود مدرسوں کی تعداد بھی کم نہیں جن کا مقصد خدمت دین کے بجائے فخر ونمود اور مقابلہ آرائی ہے، اسی لئے بعض چھوٹے چھوٹے گاؤں دیہات میں کئی کئی مدرسے چل رہے ہیں اور برادریوں میں منقسم ہیں کہ یہ مدرسہ فلاں برادری کا، اس مدرسہ کے کارکنان فلاں برادری والے ہیں، وغیرہ۔

یقیناً یہ افسوس کا مقام ہے کہ مدارس اسلامیہ جو درحقیقت اسلامی قلعے اور پوری ملت کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں جن کا مقصد اصلی خدمت دین اور اشاعت دین ہے، جن سے ہمیشہ اتحاد ویکجہتی، اخوت وہمدردی اور انسانیت کا پیغام دیا جاتا رہا آج وہ دینی ادارے گروہ بندی میں بٹ کر رہ گئے، جب ہم لوگوں کا جو دین کے خادم اور پیشوا سمجھے جاتے ہیں یہ حال ہوگا تو عوام الناس کہاں تک پہنچیں گے ظاہر ہے، اس صورت حال سے یقیناً ہماری نئی نسلوں میں منفی اثرات پیدا ہوں گے، ضرورت اس کی ہے کہ ہم لوگ اس سطحی فکر اور گھٹیا سوچ سے اوپر اٹھ کر کام کریں اور اپنے مقام ومرتبہ کو پہچانیں اپنے وقار ومعیار مقتدا اور پیشوا ہونے کا پاس ولحاظ رکھیں۔ نیز مدارس کے قائم کرنے اور تعمیر کرنے میں اسلاف کے طرز عمل کو اسوہ بنائیں ان کو ناک کا مسئلہ نہ بنائیں بلکہ ہم خدامِ دین کا ہر ہر عمل خلوص وللّٰہیت سے معمور ہونا چاہئے، ہمارا کوئی بھی جذباتی اقدام ایسا نہ ہو کہ جس پر عوام الناس کی انگلیاں اٹھیں اور ہم لوگ ان کی محفلوں کا موضوع بن جائیں اللہ ہمیں توفیق عمل سے نوازے۔

نئے نئے جامعات اور دار العلوموں کا قیام امت مسلمہ کیلئے لمحہ فکریہ

فخر ونمائش اور مقابلہ آرائی کیلئے قائم ہونے والے مدرسوں کے بارے میں ایک المیہ یہ ہے

که ایسے نوعمر مکاتب کے ذمہ دار محدود و مختصر جگہ میں قائم اپنے چھوٹے سے مکتب کو جامعہ، اور دار العلوم جیسے الفاظ سے موسوم کرکے بلاوجہ سستی شہرت حاصل کرنے کیلئے بے تاب رہتے ہیں، ایسے لوگوں کا طور طریق اور طرز عمل نہ معلوم کتنے مسلم بھائیوں کے لئے خداع کا باعث بنتا ہے چونکہ ان کا مقصد مدرسہ بنا کر دینی خدمت کرنا نہیں بلکہ انھوں نے ایک دو حجروں یا چند گز زمین کو جامعہ یا دار العلوم کا نام دے کر ملت کو گمراہ کرنا اور شکم پروری کو مقصود بنایا ہے اس لئے وہ ایک آدمی کو برائے نام پڑھانے کیلئے اس ٹھکانہ پر چھوڑ دیتے ہیں اور متعدد افراد چندہ کی رسیدات بیگ میں ڈال کر وصولی کیلئے نکل جاتے ہیں اور صرف رمضان شریف ہی میں نہیں بلکہ پورے سال متمول حضرات کے دروازوں پر چکر لگاتے نظر آتے ہیں، فراہمیٔ چندہ کے لئے ان کی دن رات کی کوششوں اور محنتوں کا دائرہ صرف ضلعی اور صوبائی سطح تک محدود نہیں رہتا بلکہ ملک بیرون ملک تک ان کے اسفار ہوتے ہیں۔ اور وہ اس چھوٹے سے مکتب کیلئے جہاں نہ دار الاقامہ کا کوئی وجود ہے اور نہ وہاں کسی ایک بھی طالب علم کیلئے قیام وطعام کا نظم، چند مدرسین اور کچھ مقامی طلباء اور بعض جگہ تو صرف ایک ہی مدرس مقامی چند طلباء کو گھیر کر وقت گذاری کرتا ہے۔ اور کئی افراد مل کر اس کیلئے زکوۃ کی خطیر رقم جمع کرکے لاتے ہیں، جسے وہ بے خوف وخطر نہایت دلیری کے ساتھ بلا کسی تملیک وغیرہ کے اپنے اخراجات سفر اور تنخواہوں میں استعمال کرتے ہیں اس طرح کی غیر شرعی سطحی حرکتوں کے باعث نہ معلوم کتنے اصحاب خیر لوگوں کی زکوۃ اہل حق تک نہ پہنچنے کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہے۔

راقم السطور کے علم میں ایسی ایک نہیں بلکہ متعدد نظیریں ہیں۔ ایک بستی میں پہلے سے ایک بڑا ادارہ معیاری تعلیم وتربیت کے ساتھ جاری ہے۔ ایک صاحب نے اسی مدرسہ سے متصل ۱۰۰ گز زمین خرید کر ایک چھوٹا سا حجرہ بنا کر ایک حافظ کو وہاں چھوڑ رکھا ہے اور پانچ یا چھ افراد پر مشتمل ایک عملہ پورے سال اس جگہ کے نام پر چندہ کرنے میں مصروف رہتا ہے، مزید براں ایسے واقعات بھی سامنے آتے ہیں کہ بعض لوگ کاغذی اور جیبی مدرسے چلا رہے ہیں کہ ان کے مدرسہ کا وجود جس کا وہ چندہ کرتے ہیں صرف کاغذوں اور جیبوں تک ہے خارج میں نام ونشان نہیں اور وہ بے دھڑک زکوۃ وصول کرکے بے دریغ ذاتیات میں استعمال کرتے ہیں۔ جو بلاشک انما یاکلون فی بطونهم نارًا کا مصداق بن رہے ہیں، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ اس طبقہ کے حضرات کے دلوں سے خوف خدا گویا بالکل رخصت ہو گیا، کیا انہیں اللہ تعالیٰ کے روبرو حاضری اور حساب کے بارے میں تردد ہے؟ جس دنیا طلبی کے لئے وہ دینی لبادہ اوڑھ کر امت کو دھوکہ دے رہے ہیں کیا وہ مردار اور ذلیل دنیا ہمیشہ ان کے ساتھ رہنے والی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسے پیشہ

ور لوگوں کی وجہ سے اہل علم حضرات کی پوری صف داغدار ہو رہی ہے علماء کی جماعت اور دینی خدام کا وقار مجروح ہو رہا ہے۔

پیشہ ور سفیروں کے منفی اثرات

بے اعتمادی کی اس فضا کے اثرات سے صحیح کام کرنے والے حضرات بھی متاثر ہو رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ رمضان المبارک وغیرہ کے مہینے میں واقعی اور صحیح مدارس کے نمائندے جب کسی صاحب خیر کے یہاں پہنچتے ہیں تو وہ بھی بعض اوقات شک کے دائرے میں آجاتے ہیں اور مالداروں کی طعن وتشنیع سے محفوظ رہنا ان سنجیدہ اور باغیرت سفراء کیلئے بڑا مشکل مسئلہ بن جاتا ہے نیز بعض اہل خیر لوگوں کے یہاں تقسیم چندہ میں ایسی بدنظمی اور غیر ذمہ دارانہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ اصل مدارس والے محروم رہ جاتے ہیں اور غیر مستحق لوگ اپنی چرب زبانی اور چالاکی کے باعث اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں لہٰذا متمول حضرات کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زکوۃ اہل حق تک پہنچانے میں تحقیق وتفتیش سے کام لیں خواہ اس کے لئے انہیں باقاعدہ سفر کرنا پڑے یا اپنا کوئی نمائندہ بھیجیں۔ اس سلسلہ میں کسی مدرسے والے کی روایت پر قطعاً بھروسہ نہ کریں چونکہ مدارس سے وابستہ حضرات میں بعض افراد کی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ ان سے اگر کسی ادارہ کے بارے میں کوئی پوچھ لے کہ فلاں مدرسہ کیسا ہے؟ کیا آپ فلاں مدرسہ کو جانتے ہیں؟ تو ہم لوگوں کا مزاج کچھ ایسا بن چکا ہے کہ ہمارے جوابات میں عموماً برائی کا پہلو غالب ہوتا ہے ایک مدرسہ والا دوسرے مدرسہ کی تحقیر وتنقیص میں اپنی عزت افزائی تصور کرتا ہے، حالانکہ اس طریق میں دونوں ہی کی حقارت وتذلیل لازم آتی ہے۔

حضرت مرشد الامت مفتی مہربان علی شاہ بڑوتیؒ کے بقول کہ ”آج ہر مدرسہ والا اپنے کام پر خوش ہے دوسرے مدرسہ کے کام کو سراہنے اور اس کے متعلق حوصلہ افزاء کلمہ خیر کہنے کا مزاج ختم ہوتا جارہا ہے۔ کلُّ حِزْبٍ بما لديهم فرحُون کا ہر طرف مشاہدہ ہوتا ہے اگر کسی جگہ دینی کام ہو رہا ہے تو اس سے مسرت ہونا ایمانی تقاضا ہے۔ اگر کسی دینی کام میں آپ تعاون نہیں کر سکتے تو کم از کم برائی بھی تو نہ کریں۔“

حضرت محی السنہ مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ”دین ایک جسم کے مانند ہے، جسم کے اعضاء الگ الگ ہوتے ہیں اور علیحدہ علیحدہ ان کے کام ہوتے ہیں۔ کان کی ذمہ داری سننا، آنکھوں کا کام دیکھنا، ناک کا استعمال سونگھنے کیلئے ہوتا ہے، ایک عضو دوسرے عضو کا

کام انجام نہیں دے سکتا آنکھ کا کام اگر ناک سے لینا چاہیں تو نہیں لے سکتے ہر عضو کی مستقل اپنی ضرورت ہے اور وہ جسم کی خدمت انجام دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح دین کے مختلف شعبے اور میدان ہیں۔ کوئی تبلیغی لائن سے دین کی خدمت کر رہا ہے، کوئی دینی مدرسہ کی شکل میں دین کی خدمت میں مصروف ہے اور کوئی خانقاہی انداز سے مصروف عمل ہے مقصد سب کا ایک ہے وہ دین کی خدمت کرنا۔

اہل مدارس کا بنیادی نکتہ محنت

حصول مالیات کے سلسلہ میں ہمارے اسلاف کا طریقہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے مدرسہ کے مالی استحکام وترقی اور اس سلسلہ کی محنت وسعی کو ہمیشہ دوسرے درجہ پر رکھا ہے، اپنی پوری توجہ کا مرکز طلبہ کی تعلیم وتربیت کو بنایا اور ہر موقعہ پر تعلیمی محنت کو اول درجہ دیا۔ لیکن دور حاضر کے ارباب مدارس کی صورت حال اس طریق سے مختلف نظر آتی ہے مدارس کے منتظم حضرات کی نظر تکثیر چندہ کی طرف ہوتی ہے، معیار تعلیم اور طلبہ کی اخلاقی تربیت کی جانب سے بالکل غفلت بری جاتی ہے اس کا لازمی اثر طلبہ کی صلاحیتوں کے ضعف وانحطاط اور اخلاقی بگاڑ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم لوگ اس جذبہ کے ساتھ بچوں پر تعلیمی وتربیتی محنت کریں کہ ہم ان کے روشن مستقبل کے معمار ہیں ان کے سرپرستوں نے ہمارے اوپر اعتماد کرتے ہوئے اپنے جگر پاروں کو ہمارے حوالہ کیا ہے۔ ان طلبہ کی باضابطہ تربیت کر کے ان کی آئندہ زندگی کو ہم قیمتی بنا سکتے ہیں اور ہماری بے فکری وبے توجہی ان بچوں کی زندگی کو تاریک اور ضائع بھی کر سکتی ہے۔ ہم لوگ ہر بچہ پر یہ خیال کر کے محنت کریں کہ ہم ایک بچہ پر نہیں بلکہ پورے ایک مدرسہ پر محنت کر رہے ہیں چونکہ یہی بچے مستقبل کے مہتمم، منتظم اور استاذ ہیں، جیسی تعلیم وتربیت ہم ان کی کریں گے ویسی ہی یہ اپنے ماتحتوں کی کریں گے، ہمارے ذہن ودماغ میں یہ فاسد خیالات نہ آئیں کہ زیادہ روک ٹوک کرنے اور مضبوط اصول وضوابط اختیار کرنے سے بچے، بھاگ جائیں گے یا داخلے کم ہوں گے تو اس کا اثر چندہ پر ہوگا ہرگز ایسا نہیں طلبہ دوسو نہ رہ کر سورہ جائیں گے لیکن یہ طلبہ محنتی جفاکش اور نظام الاوقات کے پابند بنیں گے۔ اصولی بات یہ ہے کہ ہماری نظر معیار پر ہو نہ کہ تعداد پر۔

دینی خدام اپنی اصلاح کا فکر کریں

ارباب مدارس کی ایک بڑی کمزوری باہمی اختلاف وانتشار کا ہونا ہے جسکے باعث بعض اوقات

مدرسوں میں بڑے فتنے رونما ہوتے ہیں جس کی وجہ سے مدرسہ کا وقار مجروح ہونے کے ساتھ مدرسہ کے طلبہ اور عوام پر نہایت غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس نوعیت کے واقعات کی وجہ سے ادارہ اپنے تعلیمی سفر کی منزل سے بہت دور چلا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں محقق العصر حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی چند تجاویز ذیل میں مذکور ہیں جو مدارس واہل مدارس کے لئے اکسیر ہیں۔

(۱) تمام مدارس میں تصوف واحسان کو باضابطہ نصاب کا جز بنایا جائے۔

(۲) اساتذہ وطلباء پر لازم کیا جائے کہ وہ ہفتہ میں کم ازکم ایک مرتبہ جمع ہوکر بزرگانِ دین اور بالخصوص اکابر علماء دیوبند کے حالات وملفوظات کا اجتماعی طور پر مطالعہ کریں اس میں حضرت تھانویؒ کی ارواح ثلاثہ، تذکرۃ الرشید، حیات قاسمی، تذکرۃ الخلیل، حیات شیخ الہند، اشرف السوانح، اور حضرت شیخ الحدیث صاحب قدس سرہ کی ''آپ بیتی'' کا اجتماعی مطالعہ خاص طور پر مفید ہوگا۔

(۳) ہر مدرسہ کے مہتممین کے لئے کسی شیخ طریقت سے باقاعدہ اصلاح وتربیت کا تعلق قائم کرنا ضروری سمجھا جائے اور اساتذہ کے تقرر اور ترقی وغیرہ میں ان کے اسی پہلو کو بطور خاص نظر میں رکھا جائے۔

(۴) جس مدرسہ کے قریب کوئی صاحب ارشاد بزرگ موجود ہوں، وہاں کے اساتذہ اور طلبا ان کی صحبت وخدمت کو غنیمت کبریٰ سمجھ کو اختیار کریں اور کبھی کبھی مدرسہ میں ان کے اجتماعی وعظ ونصیحت کا اہتمام کیا جائے۔

امید ہے کہ انشاء اللہ اس قسم کے اقدامات سے مدارس کی فضاء بہتر ہوگی اور ہم اپنے جس مرکز سے رفتہ رفتہ ہٹتے جارہے ہیں اس کی طرف لوٹنے میں مدد ملے گی۔ (درس نظامی کی کتابیں کیسے پڑھائیں، ص:۴۶)

حضرت مولانا مدظلہم کی تجاویز کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ مدارس کی اصل روح کا احیاء اور ان میں عمل وعرفانی فضاء قائم ہونے کیلئے ضروری ہے کہ دینی خدام اپنی اصلاح کی فکر کریں اور اپنے محاسبہ کا معمول بنائیں۔ اس کیلئے باضابطہ اپنا کوئی مشیر اور مرشد مقرر کریں اس چیز سے جہاں مدرسہ کے نظام تعلیم وتربیت میں بہتری اور نکھار پیدا ہوگا ساتھ ہی روحانی سفر بھی جاری رہے گا اور رفتہ رفتہ معرفت خداوندی حاصل ہوگی جو نعمت کبریٰ اور مقصود مومن ہے۔

اللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی مِنَ الْفِعْلِ وَالنِّیَّۃِ ۔

مغربی ممالک اسلام سے خوف زدہ کیوں؟

از: محمد اللہ خلیلی قاسمی
شعبۂ انٹرنیٹ، دارالعلوم دیوبند

ابھی نصف صدی قبل جبکہ پوری دنیا میں برطانوی شہنشاہیت کا ڈنکا بج رہا تھا اس وقت برطانوی بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہماری حدودِ سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا (گو آج اس کا یہ حال ہو کہ وہاں کبھی سورج دکھائی نہ دیتا ہو)۔ اس وقت ایک مسلمان یورپ و امریکہ سے اس قدر خائف و مرعوب تھا کہ وہ سوچ تک نہیں سکتا تھا کہ وہ ان حکمراں اقوام کی سرزمین پر اپنی بستیاں بسائے گا اور ان کو اپنے مذہب کی طرف دعوت دے گا۔ مسلمان ایک طرف ان کی سائنسی ترقی سے مرعوب تھے تو دوسری طرف ان کی سامراجیت سے دم بخود۔ لیکن آخر کار برطانوی شہنشاہیت کا طلسم ٹوٹا اور سارے مسلم آبادی والے ممالک ایک ایک کر کے آزاد ہوتے گئے۔ دوسری عالم جنگ کے نتیجے میں ایشیا و افریقہ پر فرانس اور دیگر یورپی اقوام کی گرفت بھی ڈھیلی ہوئی اور سارے غلام ممالک آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہوتے گئے۔ گو ایک طرف سوویت یونین کا عفریت وسط ایشیا پر اپنا آہنی پنجہ گاڑے رہا لیکن عالم اسلام کے اکثر حصوں میں ایک طویل نیند اور قیامت کی بے ہوشی کے بعد بیداری اور ترقی کی لہر پیدا ہوگئی تھی۔ مسلمان اعلیٰ عصری تعلیم کی طرف مائل ہونے لگے تھے اور استعماریت کی تخریب کاریوں کی تلافی میں سرگرم ہو چلے تھے۔ کچھ تو استعماریت کا شاخسانہ تھا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ سے لے کر مزدور مسلمان یورپ و امریکہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے اور کچھ تعلیم وغیرہ کے لیے نقل مکانی کر رہے تھے۔

یہ رجحان بیسویں صدی کے نصف اخیر میں کافی شدت اختیار کر گیا۔ جس کی وجہ سے دیکھتے دیکھتے یورپ و امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ نیز عالم اسلام میں پیدا ہونے والی بیداری کی وجہ سے مسلمانوں میں دینی دعوت کا مزاج اور علیحدہ شناخت کا تصور عام ہوتا گیا۔ اس

سے بھی مسلمانوں کو یورپ امریکہ کی سرزمین پر بہت سے ہمنوا ملتے گئے جن سے ان کی عددی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ امریکہ میں اسی لاکھ، فرانس میں ساٹھ لاکھ، برطانیہ میں بیس لاکھ، اس کے علاوہ کناڈا، جرمنی اور یورپ کے دیگر ملکوں میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ گذشتہ چند دہائیوں کے اندر ہی یورپ کے قلب میں البانیہ، بوسنیا ہرزیگوونیا جیسی مسلم ریاستیں اور مقدونیہ و بلغاریہ جیسی کثیر مسلم آبادی والی ریاستیں وجود میں آچکی ہیں۔ چناں چہ یورپ و امریکہ جہاں ہمیشہ سے عیسائی و یہودی کلچر موجود تھا اب وہاں اسلام ایسی صورت حال اختیار کر گیا ہے کہ اسے کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

۱۱/ستمبر کو امریکہ پر حملوں کا ایک مثبت پہلو یہ رہا کہ مسلمان ایک بار پھر موضوع بحث بن گئے۔ پنٹاگن اور ڈبلیو ٹی سی پر حملہ آوروں کا مذہب، تہذیب اور ان کی تعلیم پوری دنیا خصوصاً امریکہ و یورپ کی عوام کی توجہ و دلچسپی کا محور بن گئی۔ تاریخ میں پہلی بار بھاری تعداد میں قرآن کریم کے نسخے امریکی و یورپی مارکٹوں میں کثرت سے بکے اور ختم ہوگئے۔ یونیورسٹیوں میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق پی ایچ ڈی کرنے والوں کا تانتا لگ گیا اور یورپ و امریکہ کے سیکڑوں اداروں نے اسلامک اسٹڈیز کے شعبے قائم کیے۔ اسلام یورپ و امریکہ میں پہلے ہی سے پنپ رہا تھا، ان حالات نے اسے کسی قدر مناسب آب و ہوا پہنچادی کہ اس کے پھلنے پھولنے کے ذرائع خود پیدا ہوگئے۔ اس لیے آج یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مغرب میں اسلام سب سے زیادہ مقبول اور تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن گیا ہے۔ گو مسلمانوں میں اکثر تعداد ان کی ہے جو آبائی طور پر مسلمان ہیں اور مستقل وہیں سکونت اختیار کر لی ہے لیکن ان میں امریکی و یورپی مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد شامل ہے۔

مشرق سے مغرب کے خوف کی تاریخ کافی پرانی اور عیسائیت و اسلام کی چشمک کی جڑیں خاصی گہری ہیں۔ عہد فاروقی ہی میں مسلمانوں نے عیسائیت و یہودیت کے سب سے بڑے مرکز یروشلم و شام وغیرہ کو فتح کر لیا تھا۔ دوسری صدی ہجری میں مسلمان یورپ کے آخری مغربی سرے پر اندلس میں اسلامی حکومت کا علم لہرا چکے تھے جس میں آج کا پورا اسپین اور پرتگال و فرانس کا بڑا حصہ شامل تھا۔ وہ تو فرانس کے کچھ جیالوں نے مسلمان فوجوں کا راستہ روک دیا تھا ورنہ نہ جانے یہ طوفان کب کا پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہوتا۔ بعد میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا جو کہ روم کے بعد دنیا کا سب سے بڑا عیسائی مرکز تھا۔ اور صلیبی جنگوں کا حال تو سب کو معلوم

ہے جب اسلام وعیسائیت کی طویل ترین جنگ میں ایوبی حکمت وفراست نے عیسائیوں کو دھول چاٹنے پر مجبور کردیا۔ اسلام اور عیسائیت کے درمیان اس طویل کشمکش نے تاریخی حیثیت اختیار کرلی۔ صلیبی جنگوں کے گہرے زخم آج بھی اہل یورپ کے دل ودماغ میں اس قدر تازہ ہیں کہ عیسائی والدین، اساتذہ، میڈیا اور سیاست داں اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے تئیں اپنے جذبات کو اپنی نئی نسل تک بحفاظت پہنچائیں۔

صلیبیوں نے گو فوجی ودفاعی میدان میں اپنی شکست تسلیم کرلی لیکن ثقافتی وتہذیبی جنگ انھوں نے جاری رکھی۔ عداوت ونفرت کی اس آگ کو نام نہاد محققین اور مستشرقین نے خوب ایندھن فراہم کیا اور مزعومہ تحقیق (Research) کے پس پردہ اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے اندر برپا ہونے والے اقتصادی انقلاب نے انھیں مزید وسائل سے مالا مال کردیا جس سے مغربی حکومتوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ ذرائع ابلاغ کی ترقی کے بعد اس مشن میں کافی تیزی آگئی۔ اسی دوران ایک اہم واقعہ یہ رونما ہوا کہ برطانیہ نے فلسطین میں جو کہ اس کی نوآبادیات تھا ایک ناجائز اسرائیلی ریاست قائم کردی اور یہودیت وعیسائیت کی روایتی وتاریخی کشمکش کو مسلمانوں کی طرف پھیر دیا۔ یہودیوں کو، جنھیں تاریخ میں ہمیشہ مسلمانوں کے ہی دامن عافیت میں امن وسکون کی زندگی نصیب ہوئی، بڑے شد ومد کے ساتھ یہ باور کرادیا گیا کہ مسلمان ہی ان کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

عالم عیسائیت اگرچہ فوجی محاذ پر اسلام کو نہ مٹا سکا لیکن اس کا اندازہ تھا کہ وہ اپنے جھوٹے پروپیگنڈوں، تہذیبی یلغار اور ثقافتی جنگ میں مسلمانوں پر ضرور غالب آئے گا۔ لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ اسلام ہر محاذ اور ہر میدان میں عیسائیت کے مدمقابل کھڑا ہوا ہے۔ سوویت یونین کے تاروپود بکھر جانے کے بعد اگر کوئی سیاسی، اقتصادی، سماجی اور اخلاقی نظام ہے جو عیسائیت اور مغربیت کو چیلنج کرسکے تو وہ صرف اور صرف اسلام ہے۔ آج اسلام، مسلمانوں خصوصاً عربوں کے خلاف نفرت وعداوت کا جو بازار گرم ہے وہ اسی Islamophobia (اسلام سے خوف کی بیماری) کا ایک حصہ ہے۔ اگر آج مغربی دنیا اسلام سے خائف ہے تو اس کا یہ خوف بے بنیاد نہیں۔ اگر وہ طالبان کی کمزور حکومت سے خائف تھی تو محض اس لیے کہ وہ ایک مضبوط تر سیاسی نظام کے قائل تھے۔ اگر آج سوڈان پر پابندیاں عائد ہیں تو محض اس لیے کہ وہ ایک علیحدہ معاشی نظام کو

فروغ دینا چاہتے ہیں۔ اگر آج عالم عرب، ایران، اور برصغیر ہند کی دینی تعلیم گاہیں اور ادارے مغربی ملکوں کو ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے تو اس کے علاوہ اس کی اور کیا وجہ ہے کہ یہ ایک صالح اور تعمیری سماجی واخلاقی نظام کے نقیب ہیں۔

وہ دیکھ رہے ہیں کہ آج مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ارب ہے۔ روئے زمین کی مجموعی آبادی کا چوتھا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہ دنیا کے ایک بڑے رقبے پر آباد ہیں۔ ۵۴ ملین مربع میل کا ایک چوتھائی حصہ ان کے قبضے میں ہے اور روئے زمین کے سرسبز وشاداب خطے ان کی سکونت میں ہیں جنھیں تقریباً تمام قدیم تہذیبوں کا مرکز ومحور ہونے کا شرف حاصل ہے۔ عالم اسلام زمین کے ایک اہم اور وسیع رقبے پر مشتمل ہے۔ جنوبی خط استوا سے پھیلتے ہوئے وسط ایشیا میں ۵۵ خط عرض سے بھی زائد حصے اس کی قدرت وتصرف میں ہیں۔ مختلف آب وہوا کے تین منطقے مسلمانوں سے آباد ہیں۔ منطقۂ حارہ کا منتشر حصہ، منطقۂ صحراویہ اور منطقۂ متوسطہ ان کی تگ وتاز اور بود وباش کا مرکز ہے۔ اسی لیے عالم اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس خطے میں متنوع نباتات پائی جاتی ہیں اور زراعتی پیداوار کی نوع بنوع اقسام یہاں موجود ہیں۔ فوجی میدان میں اسلحہ کی طاقت کے اعتبار سے عالم اسلام گو بہت پیچھے ہے لیکن افراد ووسائل کے لحاظ سے اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ فوجی وسائل میں پہلے نمبر پر پٹرول ہے جس کی پیداوار کا تناسب عالمی پیداوار کے مقابلہ میں ۶۰٪ ہے اور زیر زمین ذخائر (Oil-reserves) عالمی ذخائر کے مقابلے میں ۸۰٪ سے بھی زیادہ ہیں۔ عالمی پیداوار کے مقابلہ میں عالم اسلام میں ۱۵٪ لوہا، ۲۵٪ تانبہ، ۴۰٪ کروم کی معدنیات، ۵۶٪ رانگا، ۲۳٪ المونیم، ۱۰٪ سیسہ، ۲۵٪ فاسفیٹ اور دوسری بہت سی معدنیات پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اہم ترین آبی گذرگاہیں جو تجارت ودفاع وغیرہ میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں وہ سب عالم اسلام میں واقع ہیں۔ بحرابیض متوسط تین براعظموں کے درمیان رابطہ کا ذریعہ ہے۔ جبل الطارق کا درہ بحراٹلانٹک اور بحرمتوسط کے درمیان واقع ہے۔ نہر سویز بحراحمر کو بحرمتوسط سے ملاتی ہے۔ باب المندب کا درہ جو بحراحمر اور خلیج عدن کے درمیان وصل کا کام دیتا ہے۔ ملاکا کا درہ جو جزیرہ سوماترا کو جزیرہ نما ملایا سے الگ کرتا ہے۔ یہ سب تجارتی اور فوجی وحربی جگہیں ہیں جنھوں نے قدیم وجدید تاریخ کے ہر دور میں تجارتی راستوں اور فوجی حملوں کے نقطۂ نظر سے فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ عالم اسلام میں ترکی والجزائر سے لے کر افغانستان اور وسط ایشیائی ممالک تک جنگجو، طاقت آزما اور بہادر افراد کی کمی نہیں ہے۔

مغربی دنیا اب تک مختلف ذرائع سے سیاسی، سماجی، فوجی اور اقتصادی سطح پر مسلمانوں پر حاوی رہی ہے۔ لیکن ایک طرف مسلمانوں میں بیداری پیدا ہونے کے بعد انھیں یہ خوف لاحق ہوگیا ہے کہ اگر عالم اسلام کو کچھ لائق اور ژرف نگاہ قائد میسر آگئے اور انھوں نے اپنی بکھری قوتوں کا استعمال کرنا سیکھ لیا تو وہ دن دور نہیں جب کہ مغرب کی قیادت کا طلسم چکنا چور ہوکر بکھر جائے گا اور عالم اسلام قیادت و جہاں بانی کی نئی بلندیاں طے کرتا ہوا نظر آئے گا۔ دوسری طرف اہل مغرب کو خود اپنے ملکوں میں پیر تلے زمین کھسکتی نظر آرہی ہے، مسلمان پورے اسلامی تشخص اور تہذیبی شناخت کے ساتھ ہر میدان میں پورے یورپ و امریکہ میں اپنا وجود تسلیم کرا رہے ہیں۔ ان اسباب کے پیش نظر اگر یورپ میں 'اسلام سے خوف' (Islamophobia) کی لہر دوڑ گئی ہے تو یہ بے بنیاد نہیں۔

❁ ❁ ❁

نابغہ روزگار ہستی جواَب مرحوم ہے
مولانا سید اسعد مدنیؒ

از: عادل صدیقی

۶/فروری ۲۰۰۶ء بروز دوشنبہ شام پونے چھ بجے اپولو ہسپتال نئی دہلی میں امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ کی وفات ہوگئی۔ بظاہر یہ ایک سال کا عرصہ ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ابھی کل کی ہی بات ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کے شب و روز جس انداز پر نوع انسانی کی خدمت کے لئے وقف کررہے تھے اس کی وجہ سے وہ حیات جاودانی کے مالک بن گئے۔ اصلاح معاشرہ کا پروگرام ہو، دینی مدارس کے حوالے سے مسلمان بچوں کو صراط مستقیم پر لانے کا عمل ہو، ترقی نسواں ہو، تحفظ ختم نبوت ہو، امارت شرعیہ کا قیام ہو، دین اسلام کی اشاعت کے لئے جدید ذرائع ابلاغ کی ضرورت یا بحث ہو، راجیہ سبھا میں اقلیتوں کے مفادات کی نمائندگی ہو، ہندو مسلم اتحاد کا موضوع ہو غرضیکہ دین و دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو آپ کا مرکز توجہ نہ بن سکا ہو۔ مختصراً یہ کہ آپ کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع وعریض تھا۔

مولانا سید اسعد مدنی کی پیدائش ۲۷/اپریل ۱۹۲۸ء مطابق ۶/ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ بروز جمعہ دیوبند میں ہوئی۔ آپ نے مشہور عالمی ادارے دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۴۵ء میں فراغت حاصل کی۔ بچپن میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک آپ نے مدینہ منورہ میں قیام کیا ۱۹۵۰ء میں مدینہ منورہ سے واپسی ہوئی اور دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۲ء تک تقریباً بارہ سال آپ نے دارالعلوم میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۰ء میں ہی آپ جمعیۃ علماء اترپردیش کے صدر بن گئے اور چار سال تک یہ ذمہ داری نبھائی۔ ۹/اگست ۱۹۶۳ء کو آپ جمعیۃ علماء کے ناظم عمومی بن گئے اور دس سال تک اس منصب پر فائز رہے۔

۱۱/اگست ۱۹۷۳ء کو آپ جمعیۃ علماء کے صدر بنے اور ۳۳ سال تک اس منصب عظیم پر فائز رہے۔ ۱۹۶۸ء میں آپ کو راجیہ سبھا کی رکنیت مل گئی۔ آپ تین بار راجیہ سبھا کے رکن بنے۔ تقریباً ۱۸/سال تک اس منصب پر فائز رہے۔ اس کے علاوہ مختلف تنظیموں اور ادارہ سے بھی آپ کی وابستگی نے آپ کو ہمہ وقت مصروف رکھا۔ آپ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے موثر رکن تھے۔ اس کے علاوہ مسلم یونی ورسٹی کورٹ سے بھی وابستہ رہے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ سے وابستہ ہوکر مسلمانوں کے تعلیمی واقتصادی مسائل کو حل کرنے کی موثر کوشش انجام دیں، لیکن امارت شرعیہ کا قیام آپ کا عظیم الشان کارنامہ تھا۔ اس ادارے کے توسط سے آپ نے اپنی قوت فیصلہ اور جہد مسلسل کا ایسا بیش قیمت کارنامہ انجام دیا جس کی وجہ سے آپ نے ایسی تاریخ مرتب کرڈالی جو آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ مولانا اسعد مدنیؒ نے ۱۸ سال تک راجیہ سبھا میں مسلمانوں کے تعلق سے آواز بلند کی اور حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسلمانوں کے تعلیمی و اقتصادی، ثقافتی مسائل کے حوالے سے گفتگو کی۔

اصلاح معاشرہ کے نقطۂ نظر سے آپ نے ٹی، وی اور ویڈیو کے مہلک اثرات سے قوم کو آگاہ کرایا، آپ کا نظریہ یہ تھا کہ اس ملک میں جب انگریزوں نے قدم جمائے تو انھوں نے مسلمان بچوں کے دلوں سے مذہبی جذبات نکالنے کی اسکیم بنائی۔ مسلمان بچوں کو زبان اور لباس وغیرہ کے ذریعے عیسائی بنانے کی اَن تھک کوششیں کی گئیں۔ انگریز مشینری ہمیشہ سے اس بات پر حیران ہیں کہ مسلمان زبان، لباس، خوراک وغیرہ میں ہمارے ہم نوا بن جاتے ہیں مگر تبدیلی مذہب کے حوالے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا اس کے لئے وہ مدارس اسلامیہ کی تعلیم کو ذمہ دار مانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج بھی امریکہ میں اسلام کے مطالعے کا شوق بڑھا ہوا ہے، وہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ کیا فلسفہ ہے کہ انسان اس دنیا میں آکر عیش وآرام حاصل کرنے کے لئے تمام آسائشیں مہیا کرنے پر دن رات زور لگاتا ہے مگر مسلمانوں کو موت کا تصور ہر وقت ان کو ان آسائشوں سے دور رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ٹی وی صحت کے لئے بھی تباہ کن ہے جیسا کہ مشہور جرنلسٹ اور عیسائی مشن کی معزز رکن ڈاکٹر این ویگھورنے لکھا ہے۔ آپ لکھتی ہیں کہ ”سچائی تو یہ ہے کہ ٹیلی ویژن ایک طرح کی ایکسرے مشین ہے۔ انسان کے نازک اعضا پر اس کے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں ٹی، وی سیٹ کے سامنے بیٹھ کر پروگرام دیکھتے ہیں۔ امریکہ کے بوسٹن نامی شہر کے صرف ایک ہسپتال میں خونی کینسر کا شکار چھ سولڑکے اور لڑکیاں زیر علاج ہیں۔“

مولانا سید اسعد مدنی کی تقاریر میں عورتوں کی ترقی اور بہبود پر خاص زور ہوا کرتا تھا آپ بخاری شریف کے حوالوں سے اولاد کی تعلیم وتربیت اوران کے اخلاق وکردار کی ذمہ داری کے سلسلے میں عورتوں کی ذمہ داریوں پر بخوبی روشنی ڈالتے تھے۔

مختصراً یہ کہ مولانا سید اسعد مدنیؒ نے اپنی زندگی کے پچپن سال ملک وقوم کی بلالحاظ مذہب ونسل خدمت کے لئے وقف کئے۔ آپ کی شخصیت شجر سایہ دار تھی جس کے تحت معاشرہ کے سبھی لوگ فیض حاصل کرتے تھے۔ دسمبر ۱۹۵۷ء میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی وفات کے بعد جو خلا ہوگیا تھا، اس کا پورا ہونا محال دکھائی دے رہا تھا۔ کسی کو گمان نہ تھا کہ اسعد مدنی کا فیض اس قدر عام ہوجائے گا کہ آپ کی قائدانہ صلاحیتیں عوام الناس کو اتنے بڑے پیمانے پر فائدہ پہنچائیں گی کہ فی الواقعی وہ مولانا حسین احمد مدنی کے صحیح جانشین کہلائیں گے۔

آپ کی وفات پر ملک وبیرون ملک ہر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے شخص نے جس طرح افسوس ظاہر کیا اس سے آپ کی مقبولیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اتراکھنڈ کے وزیر اعلیٰ نرائن دت تیواڑی نے کہا کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی روایت کی پاسداری کرکے مولانا اسعد مدنی نے جس طرح اپنی زندگی کو عملی نمونہ بنا کر پیش کیا وہ قابل تحسین ہے۔ اس خاندان نے جدوجہد آزادی میں علماء کے ساتھ مل کر جو قربانیاں دیں، اس کے لئے ہم ہمیشہ ان کے مقروض رہیں گے۔

صدر جمعیۃ علمائے پاکستان مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ:

عالم اسلام ایک ممتاز اوراہم شخصیت سے محروم ہوگیا۔ ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔

یہی نہیں وزیر اعظم ہند ڈاکٹر من موہن سنگھ، صدر کانگریس محترمہ سونیا گاندھی اور ملک کے سبھی دانشوروں نے اس حادثہ فاجعہ پر اپنے دلی غم کا اظہار کیا۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

❁ ❁ ❁

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۹۱	ربیع الاوّل ۱۴۲۸ھ مطابق اپریل ۲۰۰۷ء	شمارہ: ۴

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۰ روپے، سالانہ -/۱۰۰ روپے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۶۰۰ روپے

بنگلہ دیش سے سالانہ -/۱۲۵ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۵۰ روپے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411077577 *(EDITOR)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman, Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P. Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	حضور اکرم ﷺ کے اخلاق حسنہ کے		
۳	کچھ اہم پہلو	حمید اللہ قاسمی	۷
۴	ضروری وضاحت	ادارہ	۱۰
۵	حج میں رمی جمار کے اوقات: ایک شرعی جائزہ	اختر امام عادل القاسمی	۱۱
۶	قادیانیت کا مکروہ چہرہ!	مولانا سعید احمد جلال پوری	۲۶
	سلاطین ہند کے عہد میں		
۷	غیر مسلموں کی شرعی حیثیت	محمد شمیم اختر قاسمی	۴۴
	مسئلہ آبادی یا حرص وہوس	ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی	۵۲

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا نورالحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مکتبہ معاویہؓ داؤدوالا ڈاکخانہ کرم علی والا، براستہ شجاع آباد ضلع ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان وپاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک میں مدرسوں سے وابستہ علماء وفضلاء کی مجاہدانہ خدمات اوران کے قائدانہ اقدامات سے سفید فام سامراج اچھی طرح واقف تھے اس لئے مدرسوں کی جانب سے ان کا ذہن کبھی صاف نہیں رہاوہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ ان مدارس کے نظام تعلیم وتربیت میں ایسی تبدیلی کردی جائے کہ حب الوطنی، حریت فکر اور مذہب سے گرویدگی کا جذبہ انکے اندر سے ختم ہوجائے اپنی اس مخفی خواہش کو بروئے عمل لانے کے لئے انھوں نے اپنی جیسی تدبیریں بھی کیں؛ مگر براہ راست مدارس میں مداخلت یا کھلی مخالفت اورقوم وملت کے لئے انہیں نقصان دہ اور خطرناک بتانے کی غلطی سے اپنے آپ کو بچائے رکھتے تھے بلکہ اس کے برعکس موقع بموقع اسلامی درسگاہوں کی علمی، ثقافتی، معاشرتی خدمات کا دبے لفظوں میں سہی اعتراف بھی کرتے تھے۔

مگر آج کے آزاد بھارت میں جو دستوری لحاظ سے جمہوریت اور سیکولر نظام کا پابند ہے، آئین وقانون کی رو سے جہاں پر مذہبی ولسانی اکائیوں کو اپنے مذہبی تعلیمی ادارے قائم کرنے اور انہیں بغیر کسی خارجی مداخلت کے چلانے کا مکمل حق حاصل ہے، ایک خاص فکر وذہن اور موہوم سیاسی تحفظات کے تحت ملک کی اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کی مذہبی تعلیم گاہوں کو سرزمین ہند سے نیست ونابود کردینے یا کم ازکم ان کے دینی وثقافتی کردار کو پامال کردینے کی ایک عرصہ سے حکومتی سطح پر مہم چلائی جارہی ہے، مغربی سیاست کے ماہر ''میکاوَلی'' کی اس تھیوری کے مطابق کہ دشمن کو مارنے سے پہلے ضروری ہے کہ اسے خوب بدنام کیا جائے۔ اعلیٰ انسانوی قدروں کوفروغ دینے والے ان مدرسوں کوقومی مجرم بنانے کی ناروا سازشیں رچی جارہی ہیں اور ملک کے وہ عناصر دہشت گردی جن کا شیوہ اورخوں ریزی وسفا کی جن کا پیشہ ہے جن کی جارحیت سے ارض وطن کا چپہ چپہ رنگین ہے امن وآشتی کے ان گہواروں کودہشت گردی کا اڈہ بتاتے ہیں، چنانچہ بی، جے، پی

کے زیرقیادت این، ڈی، اے کی سابقہ حکومت نے اپنے دوراقتدار میں وزارت داخلہ کی سرپرستی میں گروپ آف منسٹرس کی ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جوآج بھی وزارت داخلہ کے ریکارڈ پر موجود ہے اس کمیٹی میں سابق وزیر دفاع جارج فرنانڈیز بھی شامل تھے، اس کمیٹی نے دینی مدارس سے متعلق ایک تفصیلی رپورٹ داخل دفتر کی تھی اس رپورٹ میں مدارس کی بڑھتی ہوئی تعداد پرتشویش کا اظہار کیا گیا تھا۔ نیز مدارس پر الزام لگایا گیا تھا کہ ان میں طلبہ کودہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے، بالخصوص سرحدی اضلاع کے مدارس کوآئی، ایس، آئی کی آماجگاہ بھی بتایا گیا تھا، دینی مدارس کے ذرائع آمدنی پرسوال کھڑا کیا گیا تھا۔ ان خودساختہ اورمن گھڑت مجرمانہ سرگرمیوں سے مدارس کو پاک وصاف کرنے کے لئے رپورٹ میں متعدد اقدامات تجویز کئے گئے تھے اس میں ایک یہ بھی تھا کہ ''مدارس کی جدیدکاری'' کی جائے۔

این ڈی اے حکومت اپنے دوراقتدار میں نہ جانے کیوں اس تجویز کو نافذ نہیں کرسکی۔ جدید سیاست کی تہہ داریوں سے واقف لوگوں کا کہنا ہے کہ بھاجپائی سرکار کی اس تجویز کواب ''یوپی اے'' کی موجودہ حکومت عملی جامہ پہنانے کی فکر میں ہے اوروزارت فروغ انسانی وسائل کی جانب سے ''مرکزی مدرسہ بورڈ'' کی تشکیل کا اعلان اسی کی تمہید اور پہلا قدم ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

کانگریس پارٹی کی اب تک کی تاریخ سے یہ بات بڑی حدتک ہم آہنگ بھی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس پارٹی میں اس کے ابتدائے قیام سے ایک ایسا عنصر ہمیشہ سے موجود رہا ہے جوخود کانگریس پارٹی کے اصول وضوابط کے برخلاف تنگ نظری وفرقہ پرستی کوسیکولر نظریات پر ترجیح دیتا ہے۔ کانگریس پارٹی کے اس عنصر نے ہمیشہ فرقہ پرستی اورفرقہ پرست تنظیموں کوتقویت پہنچائی ہے، بابری مسجد کے مقفل دروازے کوکھلوانے، بابری مسجد کی سرزمین پر آنجہانی راجیو گاندھی سے سیلانواس کرانے اور بابری مسجد کی قدیم تاریخ کے منہدم کرانے میں اس عنصر کا اہم کردار رہا ہے۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ اسی عنصر کے زیراثر مدارس کے نظام میں بہتری لانے اورانہیں مروجہ تعلیمی ضرورت کے مطابق بنانے کے خوشنما عنوان سے مدارس پر شکنجہ کسنے کی یہ مہم شروع کی گئی ہو ورنہ آزادی کے وقت سے آج تک تو ہماری قومی حکومتیں (جن میں کانگریس پارٹی سرفہرست ہے) مسلمانوں کو زندگی کے ہر نفع بخش شعبے سے دھکے مار کر پیچھے دھکیلتی رہی ہیں (جسے خود حکومت کی قائم کردہ سچر کمیٹی نے اس طرح مدلل کرکے واضح کردیا ہے کہ اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں باقی بچی ہے) آخر اپنے اس دیرینہ رویہ کے برخلاف حکومتِ وقت کو مدرسوں کی فلاح وبہبود کا یہ اچانک خیال کیسے آگیا۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

اگران ساری باتوں سے آنکھیں بند کرکے (جو اگرچہ خلاف عقل وتجربہ ہے) حکومت کے اس اقدام کو نیک نیتی پر ہی محمول کرلیا جائے پھر بھی سرکار کی جانب سے مرکزی مدرسہ بورڈ کی تشکیل کے اس اقدام کو درست اور مدارس دینیہ کے حق میں مفید نہیں کہا جاسکتا ہے؛ کیونکہ کسی عمل کے صحیح اور مفید ہونے کے لئے صرف نیک نیتی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کام بجائے خود مبنی بر مصلحت اور نفع بخش ہو جبکہ مرکزی مدرسہ بورڈ کا قیام درج ذیل اسباب وجوہ کی بناء پر مدارس کے لئے نفع بخش کم اور نقصان دہ زیادہ ہے۔

(۱) آئین بھارت کی دفعہ ۲۶ الف وبا، کی رو سے مسلم اکائی کو اپنے مذہبی ادارے قائم کرنے اور بغیر کسی خارجی مداخلت کے انھیں چلانے کا حق حاصل ہے۔ سرکار کے قائم کردہ مرکزی بورڈ سے منسلک وملحق ہوجانے کے بعد ان کا یہ حق بہر حال مجروح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(۲) ملک کی مختلف ریاستوں میں حکومت کی زیر سرپرستی مدارس بورڈ عرصہ سے قائم ہیں ان بورڈوں سے ملحق مدارس کی انتظامی، تعلیمی اور دینی زبوں حالی عالم آشکارا ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ مرکزی بورڈ سے ملحق ادارے اس زبوں حالی کا شکار نہیں ہوں گے۔

(۳) یہ ایک امر واقعہ ہے کہ سرکاری اداروں میں آئے دن تجاویز وترمیمات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان بدلتی ہوئی قراردادوں کے ساتھ مدارس سکون واطمینان سے اپنے تعلیمی وتربیتی امور کو کیونکر باقی رکھ سکیں گے۔

(۴) مسلم اقلیتوں نے جو عصری تعلیمی ادارے قائم کئے ہیں ان کے ساتھ حکومت اور اس کے اہل کاروں کا رویہ غیر منصفانہ وجانبدارانہ ہے، ان اداروں کی منظوری جوئے شیر لانے کے مرادف ہے، ان پر اقلیتی سرٹیفکیٹ کے لزوم کا جابرانہ حکم جاری کردیا گیا ہے، نیز ان کی نشستوں پر پچاس فیصد غیر اقلیتی طلبہ کے داخلہ کے لئے حکومت بیجا کوشش میں لگی ہوئی ہے۔ پھر ان اداروں کی انتظامیہ میں بیجا دخل اندازی بھی کی جارہی ہے۔ سرکار کے مرکزی بورڈ سے ملحق ہوجانے کے بعد مدارس اس قسم کے غیر منصفانہ طرز عمل سے دوچار نہیں ہوں گے اس کی ضمانت نہیں دی جاسکتی ہے۔

(۵) اگر یہ بات مان لی جائے کہ موجودہ حکومت دینی مدارس سے وابستہ علما وطلبہ کی خیرخواہ ہے اور انھیں کی فلاح وبہبود کے لئے یہ بورڈ قائم کررہی ہے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ آئندہ بھی یہی بہی خواہ سرکار موجود رہے گی۔ اور کوئی ایسی سرکار نہیں آئے گی جو فرقہ پرست اور

مسلم بیزار ہو۔ ایسی صورت میں سرکاری بورڈ کے شکنجے میں کسے ان مدرسوں کا کیا حال ہوگا وہ دن کے اجالے کی طرح ظاہر ہے۔

(۶) اس جمہوری وسیکولر ملک میں دینی مدارس کے آزادانہ نظام کے بنیادی مقاصد یہ ہیں:

(الف) قرآن وسنت اور دیگر اسلامی علوم ثقافت کی حفاظت اور مسلم معاشرہ کا ان سے ربط وتعلق برقرار رکھنا۔

(ب) مساجد ومدارس کے نظام کو قائم واستوار رکھنا اور اس اہم مقصد کے لئے رجال کار تیار کرنا۔

(ج) یورپ کی فکری وتہذیبی یلغار کے بالمقابل اسلامی عقائد واعمال اور طرز معاشرت کا تحفظ اور انہیں پروان چڑھانا، مالک کائنات اور خدائے وحدہ لاشریک لہ کے فرمان "فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ" کے تحت مسلمان اس کے مکلّف ہیں کہ مسلم سماج ومعاشرہ میں ایسا بندوبست کریں جس سے مسلمانوں کی ایک جماعت خالص کتاب وسنت اور فقہ اسلامی کی تعلیم حاصل کرسکیں یہ مدارس دینیہ اسی حکم الٰہی کے عملی مظاہر ہیں جن کا اپنی اصلی حالت میں برقرار رہنا اسلامی معاشرہ کے تسلسل کے لئے ضروری ہے۔ جبکہ مرکزی مدرسہ بورڈ سے ملحق ہوجانے کے بعد مدارس اپنا یہ کردار بحالہ باقی نہیں رکھ سکیں گے۔

ان وجوہ واسباب کی بناء پر ہم سمجھتے ہیں کہ مرکزی مدرسہ بورڈ سے مدارس دینیہ کا الحاق ان کی عرفی حیثیت اور ملی کردار کے لئے سم قاتل ہے۔ بورڈ کے جال میں پھنسنے کے بعد وہ اپنے اصلی وجود کو برقرار نہیں رکھ پائیں گے۔

آخر میں ہم اپنی حکومت سے بھی مخلصانہ اپیل کرتے ہیں سچر کمیٹی سے یہ بات واضح ہوچکی ہے مسلم طلبہ کا صرف چار فی صد ہی مدارس ومکاتب کا رخ کرتا ہے باقی ۹۷ یا ۹۸ فیصد بچوں میں سے نصف سے زائد بچوں کو اسکول کا منھ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے حکومت اگر واقعی مسلم اقلیت (جو فی الحقیقت دوسری اکثریت ہے) کی فلاح وبہبود چاہتی ہے تو ان ناخواندہ مسلم آبادی کو جہالت کے اندھیرے سے نکالنے کی جانب خصوصی توجہ کرے اور باقی نصف جو سرکاری اسکولوں کالجوں میں زیر تعلیم ہیں ان کے تعلیمی معیار کے بلند کرنے اور انھیں اعلیٰ تعلیم کی سہولیات فراہم کرنے کے لئے منصوبہ بنائے۔ کیونکہ یہ حکومت کی نوازشوں کے اولین مستحق ہیں۔

رہے یہ مذہبی مدارس جو حکومت پر بغیر بوجھ بنے اپنے طور پر ملک وملت کی غیر معمولی خدمت انجام دے رہے ہیں انھیں بیجا بورڈ کے شکنجے میں کسنے کی فکر چھوڑ دے کیونکہ اس سے خود حکومت کی سیکولر شبیہ بھی خراب ہوگی اور مسلم معاشرہ میں بھی اضطراب وبے چینی بڑھے گی۔

حضور اکرم ﷺ کے اخلاق حسنہ کے کچھ اہم پہلو

از: حمید اللہ قاسمی، جوری، سنت کبیر نگر (یوپی)

اخلاق کا لفظ ذہن میں آتے ہی ایک ایسا خاکہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے کہ جس کو ہر آدمی اپنانے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ اخلاق انسان کا ایک ایسا جز ہے کہ جس کے اندر یہ صفت پائی جاتی تو سمجھ لیجیے کہ وہ کامل انسان ہے، اخلاق ایک ایسی دوا ہے جو دل ودماغ دونوں کو غذا پہنچاتا ہے، رسول پاک ﷺ نے علم اور عبادت کی زینت اخلاق کو قرار دیا ہے، قیامت کے دن مومن کے میزان عمل میں کوئی چیز حسن اخلاق سے زیادہ باوزن نہیں ہوگی، اسی طرح مومن اپنے حسن اخلاق ہی کی وجہ سے ہمیشہ روزہ رکھنے اور تہجد گزار کا مرتبہ حاصل کرلیتا ہے، مسلم شریف کی روایت ہے کہ ''نیکی حسن اخلاق کا نام ہے اور برائی وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تمہیں ناپسند ہو کہ لوگ اسے جانیں۔'' (رواہ مسلم وابوداؤد)

ترمذی شریف میں ایک جگہ نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اخلاق کے اعتبار سے سب سے اچھا ہو'' چنانچہ عظمت اخلاق آخری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ہے، سارے انبیاء اخلاق کی تعلیم دینے کے لیے دنیا میں آئے، مگر آپ ﷺ اس ہدایت کے آخری رسول ہیں، یا یوں سمجھئے کہ قرآنی نظریہ اخلاق ہے اور رسول ﷺ نمونہ اخلاق ہیں، جب نظریہ عمل میں ڈھلتا ہے تو کمی بیشی عموماً ہوجاتی ہے، مگر اخلاق کا نظریہ جتنا معقول اور مستحکم ہے اتنا ہی مستحکم اخلاق کا نمونہ بھی ہے، اسی لیے دنیا کے بیشتر مفکرین اور معلّمین کی نظر میں اخلاق کا درس خوشنما نظر آتا ہے، مگر جب ان کے قریب جائیے تو فکر وعمل کا تضاد اور گفتار وکردار کا اختلاف سامنے آتا ہے؛ لیکن رسول پاک ﷺ کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی گفتار جتنی پاکیزہ ہے، کردار اتنا ہی پاکیزہ نظر آتا ہے، تعلیم جتنی روشن نظر آتی ہے، سیرت اتنی صیقل دکھائی دیتی ہے، کہیں پر کوئی جھول یا کسی قسم کا کھوٹ نہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ واقعی اس اعزاز کے مستحق تھے؛ کیوں کہ وہ

کون سا خلق حسن ہے جو آپ کی ذات گرامی میں نہیں تھا، حیاء جس کو تمام اخلاق میں سب سے افضل اور عظیم ترین خلق قرار دیا گیا ہے، آپ ﷺ کی عملی زندگی میں اس کے دخل کا یہ حال تھا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ ایک باکرہ اور بے نکاح لڑکی اپنے پردے میں جس قدر حیا کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ رسول اکرم ﷺ حیادار تھے۔

غصہ کو دبانا اور ضبط کرنا بڑی اعلیٰ صفت ہے جو برسوں کی ریاضت کے بعد کسی کو حاصل ہوتی ہے، اس کے فضائل بیان کردینا تو آسان ہے مگر اس پر عمل کرنا بڑا مشکل ہے؛ لیکن آپ ﷺ کے اندر یہ اعلیٰ صفت کوٹ کوٹ کر بھی ہوئی تھی، اگر سیرت کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو اس کی مثال قدم قدم پر ملیں گی، آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا جب مکہ سے ہجرت کرکے (اونٹ پر سوار ہوکر) مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہورہی تھیں، تو راستہ میں ہبار بن اسود نامی ایک شخص نے انہیں اتنی تیزی سی نیزہ مارا کہ وہ اونٹ سے گرپڑیں، حمل ساقط ہوگیا، اس صدمہ سے تاب نہ لاسکیں اور اللہ کو پیاری ہوگئیں، رسول اکرم ﷺ کو جب اس حادثہ کی خبر ہوئی تو آپ بہت غضب ناک ہوئے اور آپ کو اس بات سے بہت صدمہ ہوا، جب بھی اس حادثہ کی یاد تازہ ہوجاتی تو آب دیدہ ہوجاتے؛ لیکن جب ہبار بن اسود اسلام لے آئے اور معافی کی درخواست کی، تو آپ ﷺ نے انھیں معاف کردیا۔

اسی طرح وحشی بن حرب جن کی ذات سے اسلامی تاریخ کے تلخ ترین حادثہ کی یاد وابستہ ہے، کہ جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ومشفق چچا کو قتل کیا تھا؛ لیکن جب انھوں نے اسلام لاکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کا اسلام تسلیم فرمالیا، پھر آپ ﷺ نے ان سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل کی کیفیت دریافت فرمائی، جب انھوں نے واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ پر گریہ طاری ہوگیا اور فرمایا وحشی! تمہارا قصور معاف ہے؛ لیکن تم میرے سامنے نہ آیا کرو، تمہیں دیکھ کر پیارے شہید چچا کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

وفا - انسانی اور ایمانی صفت ہے جس کے اندر وفا نہ ہو وہ یقیناً انسانیت اور ایمان کے کمال سے محروم ہے قرآن میں بدعہدی کو یہود جیسی مردود قوم کی صفت بتایا گیا ہے اور ایفائے عہد کو مومنوں، متقیوں اور اللہ کے نبیوں کی صفت قرار دیا گیا ہے، آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ میں ایک اخلاق یہ بھی ہے کہ آپ ہمیشہ وفائی کرتے تھے بے وفائی اور عہد شکنی نہیں کرتے تھے، حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ مجھے قریش نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

کسی کام سے بھیجا (یہ اس وقت کی بات ہے جب میں اسلام سے محروم تھا) جب میں نے آپ کی زیارت کی تو فوراً میرے دل میں اسلام کی محبت بیٹھ گئی، چنانچہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! خدا کی قسم اب میں یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا، مگر آپ ﷺ نے فرمایا ''نہ تو میں وعدہ خلافی کرتا ہوں اور نہ عہد شکنی کرتا ہوں اور نہ ہی غلاموں کو روکتا ہوں، فی الوقت تم واپس چلے جاؤ البتہ اگر تمہارے دل میں یہی جذبہ، یہی ارمان، یہی تمنا، یہی خواہش رہی تو پھر واپس چلے آنا'' چنانچہ میں اس وقت تو چلا گیا؛ لیکن بعد میں خدمت اقدس میں حاضر ہوکر اسلام قبول کرلیا۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اخلاق حسنہ کی دولت سے تڑپتی انسانیت کی غمخواری کی، اپنے ازلی وابدی دشمنوں کو پتھر کے جواب میں پھولوں کا گلدستہ پیش کیا، نفرت کے اندھیروں میں الفت ومحبت کی شمع روشن کی، آپسی تفرقہ بازی اور دائمی بغض وعداوت کی بیخ کنی کرکے بھائی چارگی اور الفت ومحبت کے چشمے بہائے، یہی نہیں بلکہ ذرا دو قدم آگے بڑھ کر فتح مکہ کی تاریخ کے اوراق کو الٹ کر دیکھئے کہ آپ ﷺ مکہ میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوتے ہیں، صحابہ کرام کی دس ہزار جمعیت آپ کے ساتھ ہے، صحابہ اعلان کرتے ہیں ''الیوم یوم الملحمۃ'' آج بدلے کا دن ہے، آج جوش انتقام کو سرد کرنے کا دن ہے، آج شمشیر وسناں کا دن ہے، آج گذشتہ مظالم کے زخموں پر مرہم رکھنے کا دن ہے، آج ہم اپنے دشمنوں کے گوشت کے قیمے بنائیں گے، آج ہم ان کی کھوپڑیوں کو اپنی تلواروں پر اچھالیں گے، آج ہم شعلۂ جوالہ بن کر خرمن کفار کو جلاکر بھسم کردیں گے اور گذشتہ مظالم کی بھڑکتی چنگاری کو ان کے لہو سے بجھائیں گے۔

لیکن تاریخ شاہد ہے اور زمین وآسمان گواہی دیتے ہیں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا، رحمت نبوی جوش میں آئی اور زبان رسالت کی صدائیں لوگوں کے کانوں سے ٹکراتی ہیں ''لاتثریب علیکم الیوم واذھبوا انتم الطلقاء'' کہ جاؤ تم سب آزاد ہو، تم لوگوں سے کسی قسم کا بدلہ نہیں لیا جائیگا، یہ تھا آپ کا اخلاق کریمانہ، یہ تھا آپ کے اخلاق حسنہ کا اعلیٰ نمونہ، جس کی مثال سے دنیا قاصر ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے عالم انسانیت کو اخلاقیت کا وہ اعلیٰ نمونہ پیش کیا جس کی گواہی باری تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں ''انک لعلی خلق عظیم'' ایک جگہ خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اخلاقیت کی گواہی دیتے ہوئے فرماتے ہیں ''انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق'' مجھے تو اس لیے بھیجا گیا ہے تاکہ میں نیک خصلتوں اور مکارم اخلاق کی تکمیل کروں، اسی کو سراہتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کے اخلاق حسنہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتی

ہیں: ''کان خلقه القرآن''۔

لہٰذا جو مکارم اخلاق آپ کو خالق کونین کی طرف سے مرحمت ہوئے تھے اور جن کی تکمیل کے لیے آپ کو اس دنیا میں بھیجا گیا تھا وہ مکلّف مخلوق کی فطرت کے جملہ مقتضیات کے عین مطابق تھے اور جن کا مقصد صرف یہی نہ تھا بلکہ ان کے ذریعہ روحانی مریضوں کو ان کے بستروں سے اٹھایا جائے اور اٹھنے والوں کو چلایا جائے اور چلنے والوں کو تیزی سے دوڑایا جائے اور دوڑنے والوں کو روحانی کمال اور اخلاقی معراج کی غایۂ قصویٰ تک اور سعادت دنیوی ہی نہیں؛ بلکہ سعادت دارین کی سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا جائے۔

بیشک نبی پاک ﷺ کی زندگی اخلاق حسنہ سے بھری پڑی ہے، جسے آج ہمیں اس نازک ترین حالات میں اپنانے کی ضرورت ہے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اخلاق کی تعلیم دوسروں کو دیں اور خود بھی اس پر عمل پیرا ہوں اور نبی کریم ﷺ کے طرز عمل پر اپنی زندگی کو سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں؛ کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اخلاق حسنہ کو اپنانے کے بعد ہمارے لیے بھی اخلاقیت کی بلند اور دشوار گزار گھاٹی پر چڑھنا آسان ہوجائے گا۔

❁ ❁ ❁

ضروری وضاحت

شمارہ ماہ فروری کے مضمون ''ضروریات دین ہر مسلمان کی پہچان ہے'' کے عنوان میں کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کے بعد (پ۲۶ع۶/۱۲) میں حوالہ غلطی سے شائع ہوگیا ہے۔ جس پر ادارہ معذرت خواہ ہے۔ مکمل کلمہ ایک ساتھ قرآن کی کسی آیت میں نہیں ہے۔ البتہ متفرق آیتوں سے مکمل کلمہ قرآن سے ثابت ہے۔

ضروری وضاحت

شمارہ ماہ فروری کے مضمون ''ضروریات دین ہر مسلمان کی پہچان ہے'' کے عنوان میں کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کے بعد (پ۲۶ ع۱۲/۶) میں حوالہ غلطی سے شائع ہوگیا ہے۔ جس پر ادارہ معذرت خواہ ہے۔ مکمل کلمہ ایک ساتھ قرآن کی کسی آیت میں نہیں ہے۔ البتہ متفرق آیتوں سے مکمل کلمہ قرآن سے ثابت ہے۔

حج میں رمی جمار کے اوقات: ایک شرعی جائزہ

از: اختر امام عادل القاسمی

''رمی جمار'' حج کے معروف اعمال میں سے ہے، ''رمی'' کے لغوی معنی ہیں، پھینکنا، ڈالنا، الزام لگانا، بات اڑانا۔ (القاموس المحیط للفیروزآبادی، لسان العرب لابن منظور، الصحاح للجوہری، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۵۰/۲۳)

قرآن کریم میں یہ لفظ دونوں ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے، اور ''رمی جمار'' کے معنی ہیں چھوٹے کنکر پھینکنا۔ (بدائع الصنائع للکاسانی ۳۲۳/۲)

شریعت کی اصطلاح میں ''رمی جمار'' کی تعریف ہے۔

وفی عرف الشرع ھو القذف بالحصی فی زمان مخصوص ومکان مخصوص وعدد مخصوص. (بدائع الصنائع ۳۲۳/۲)

ترجمہ: مخصوص وقت میں، مخصوص مقام پر مخصوص گنتی کے ساتھ کنکر پھینکنا۔

جمرات تین ہیں:

(۱) جمرۂ اولیٰ، اس کو جمرۂ ''صغریٰ'' بھی کہتے ہیں، منیٰ میں مسجد خیف کے بعد یہ پہلا اور قریب ترین جمرہ ہے۔

(۲) جمرۂ ثانیہ، اس کو جمرۂ ''وسطیٰ'' بھی کہتے ہیں، اس لئے کہ یہ جمرۂ اولیٰ اور جمرۂ عقبہ کے درمیان واقع ہے۔

(۳) جمرۂ عقبہ، اس کو جمرۂ ''کبریٰ'' بھی کہتے ہیں، یہ مکہ کی طرف منیٰ کا آخری جمرہ ہے۔

دس، گیارہ، بارہ، تیرہ ذی الحجہ کی تاریخ میں پانچ (یا اس سے زائد) ہاتھ کی دوری سے ان جمرات پر سات سات کنکریاں پھینکنے کو حج کی اصطلاح میں ''رمی جمار'' کہتے ہیں۔ (ہدایہ مع فتح القدیر ۴۹۹/۲) اگر کنکریاں جمرات پر نہ پڑیں، اور اس کے قریب تین ہاتھ یا کم از کم ایک ہاتھ کے فاصلہ پر گر جائیں، تو بھی رمی جمرات کے حکم کی تعمیل ہو جائے گی۔ (فتح القدیر ۴۹۹/۲)

حکمت رمی

رمی دراصل ایک یادگاری عبادت ہے، جو شیطانی اور باطل طاقتوں سے اظہارِ نفرت کے لئے، علامتی طور پر اس امت میں باقی رکھا گیا ہے، اس حکم کے پیچھے ایک یادگار واقعہ ہے، جس کا ذکر حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں آیا ہے، بیہقی میں، حضرت ابن عباسؓ کی روایت آئی ہے، فرماتے ہیں کہ

''جب حضرت ابراہیمؑ حکم الٰہی (بیٹے کی قربانی) کی تعمیل کے لئے چلے تو شیطان جمرۂ عقبہ کے نزدیک سامنے آیا، تو آپ نے اسے سات کنکریاں ماریں، یہاں تک کہ وہ زمین میں دھنس گیا، پھر دوسرے جمرہ کے پاس نظر آیا تو آپ نے دوبارہ اسے سات کنکریاں ماریں، یہاں تک کہ وہ زمین میں دھنس گیا، پھر تیسرے جمرہ کے پاس سامنے آیا تو آپ نے سہ بارہ اسے سات کنکریاں ماریں، یہاں تک کہ وہ زمین میں دھنس گیا، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ شیطان کو پتھر مارنے کی کارروائی دراصل حضرت ابراہیمؑ کی اتباع میں ہے۔ (السنن الکبریٰ لابی بکر احمد بن الحسین البیہقیؒ، باب ما جاء فی بدؤ الرمی ۱۵۳/۵)

گویا رمی جمار امت اسلامیہ کی طرف سے شیطان اور تمام باطل قوتوں کے خلاف اجتماعی نفرت کا علامتی مظاہرہ ہے، جو ہر سال پابندی کے ساتھ انجام دیا جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام، ملّی اور دینی طور پر ہمارے روحانی باپ ہیں، اور باپ کے خلاف شیطان نے جس فریب کی کوششیں کی تھیں اور بار بار مزاحمت سے بھی باز نہیں آیا تھا تو اس عظیم باپ کے تمام فرزندوں پر لازم کر دیا گیا کہ وہ اس شیطانی مزاحمت کا اجتماعی مقابلہ کریں، تو جمرات دراصل شیطانی قوتوں کی یادگار ہیں۔ ان ستونوں میں کچھ رکھا ہوا نہیں ہے، اصل یہ مقامات ہیں جہاں اللہ کے دشمن (شیطان) نے اللہ کے دوست (حضرت ابراہیم) کو شکار کرنے کی کوششیں کی تھیں۔

اس طرح اس دین میں امر بالمعروف اور حب فی اللہ کے اجتماعی مواقع کی طرح نہی عن المنکر اور بغض فی اللہ کے بھی اجتماعی مواقع فراہم کئے گئے، کہ جب تک ان دونوں کا توازن امت میں صحیح طور پر قائم نہ ہو، وہ راہ اعتدال پر گامزن نہیں رہ سکتی ہے۔

دنیا کے مذاہب میں اسلام واحد مذہب ہے، جہاں ظلمت و وحشت، اور ضلالت و سرکشی کے خلاف علامتی نفرت کا اجتماعی مظاہرہ ہوتا ہے، پس یہ دین فطرت اور صراطِ مستقیم ہے، ''اِنَّ ھٰذا صراطی

مستقیماً فاتبعوہ“ ترجمہ:”بلاشبہ میرا یہ راستہ سیدھا ہے اس کی اتباع کرو! اسی میں کامیابی ہے“

حکم شرعی

”رمی جمار“ اکثر علماء کے نزدیک واجب ہے، حج کے ارکان یا فرائض میں شامل نہیں ہے۔ (بدائع الصنائع ۳۲۲/۲)

امام زہریؒ، علامہ ابن حزمؒ اور بعض علماء ظواہر کو اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک یہ فرض ہے۔ (المحلی لابن حزم کتاب الحج مسئلہ ۸۳۵، الموسوعۃ الفقہیہ ۱۵۱/۲۳) مگر اس قول کو مخالفِ اجماع قرار دیا گیا ہے۔

رمی جمار کے وجوب کے لئے متعدد روایات پیش کی جاتی ہیں: مثلاً:

❁ حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ۱۰؍ ذی الحجہ کو اپنی سواری پر سوار ہو کر رمی فرما رہے تھے اور ارشاد فرما رہے تھے: ”خذوا عنّی مناسککم“ .

مجھ سے اپنے مناسک سیکھ لو، اس لئے کہ میں نہیں جانتا، شاید اس حج کے بعد دوبارہ حج نہ کرسکوں۔ (صحیح مسلم کتاب الحج ۴۴/۹)

❁ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں وقوف فرمایا، تا کہ لوگوں کے سوالات کے جواب دیں، ایک آدمی نے سوال کیا، کہ میں نے بے شعوری میں ذبح سے پہلے ہی حلق کرلیا، تو آپ نے ارشاد فرمایا اب ذبح کرلو کچھ حرج نہیں۔ ایک دوسرے شخص نے پوچھا کہ میں نے رمی سے قبل قربانی کرلی، آپ نے فرمایا کہ رمی کرلو کچھ حرج نہیں۔ (بخاری مع الفتح ۱۸۰/۱، مسلم ۹۴۸/۲)

امر وجوب کے لئے ہوتا ہے، اور اخبار آحاد سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی، نیز اس میں نیابت جاری ہوسکتی ہے، جبکہ ارکان وفرائض میں نیابت نہیں ہوسکتی۔

رمی کا وقت

شریعت نے رمی کے لئے ایک وقت مقرر کیا ہے، رمی کے لئے چار یوم مقرر ہیں: ۱۰/۱۱/۱۲/۱۳؍ ذی الحجہ، پہلے دن کو یوم النحر اور بقیہ تین دن کو ”ایام تشریق“ کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

واذکروا اللّٰہ فی ایام معدودات فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیہ، ومن تاخر فلا اثم علیہ لمن اتّقٰی واتقو اللّٰہ واعلموا انکم الیہ تحشرون. (بقرہ:۲۰۳)

ترجمہ: اور اللہ کا ذکر کرو (بعد رمی) مخصوص دنوں میں جو پہلے دو دنوں میں جلدی کر کے چلا جائے تو کوئی گناہ نہیں، اور جو دیر سے جائے تو کوئی گناہ نہیں۔ اس کے لئے جو تقویٰ اختیار کرے۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم اسکے پاس جمع کئے جاؤ گے۔

البتہ ان تمام دنوں کے وظائف میں فرق ہے، اور اس سلسلہ میں احادیث کے مضامین متنوع وارد ہوئے ہیں، جن کی بنا پر فقہاء کے درمیان بھی بعض چیزوں میں اختلاف رائے واقع ہوا ہے، جس کی مختصر تفصیل پیش کی جارہی ہے۔

رمی بتاریخ ۱۰؍ ذی الحجہ

۱۰؍ ذی الحجہ کو باتفاق فقہاء صرف جمرۂ عقبہ (بڑے جمرہ) کی رمی واجب ہے، اس کا وقت کب سے شروع ہوتا ہے، اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ صبح صادق ہی سے اسکا وقت شروع ہوجاتا ہے، اور دوسرے دن کی صبح صادق تک اس کا وقت جواز باقی رہتا ہے، البتہ وقت مسنون طلوع آفتاب کے بعد سے زوال تک ہے، زوال کے بعد سے غروب تک وقت جواز ہے، کوئی کراہت نہیں، اور غروب آفتاب کے بعد سے گیارہ کی صبح صادق تک یا دس کی صبح صادق سے طلوع آفتاب تک کا وقت بھی وقت جواز ہے، مگر کراہت سے خالی نہیں۔ (ہدایہ مع الفتح لابن ہمام ۵۱۱/۲، ردالمحتار ۴۷۴/۳)

مگر وقت جواز میں یہ کراہت غیر معذورین کے لئے ہے، اگر کوئی شخص کسی عذر (مرض کمزوری، ازدحام وغیرہ) کی بنا پر غیر مسنون اوقات میں رمی کرے تو کچھ کراہت نہیں۔

شامی لکھتے ہیں:

ویکرہ للفجر ای من الغروب الی الفجر وکذا یکرہ قبل طلوع الشمس بحر وھذا عند عدم العذر فلا اساء ۃ برمی الضعفۃ قبل الشمس ولا برمی الرعاۃ لیلاً کما فی الفتح. (ردالمحتار ۴۷۴/۳)

علامہ شامی نے ایک ضابطہ ذکر کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ واجب کا ترک اگر کسی عذر کی بنا پر ہو تو اس کے ترک پر کچھ واجب نہیں ہے، البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر کسی ممنوع فعل کا ارتکاب ہو، مثلاً سلا ہوا کپڑا پہن لے تو اس پر تاوان ہے، اور اخیر میں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ جو شخص بغیر عذر کے فجر سے قبل رمی کرلے تو اس نے برا کیا، مگر اس پر کچھ نہیں ہے۔ مذہب حنفی کے اکثر فقہاء کا مذہب اسی طرح ہے۔ (ردالمحتار لابن عابدین ۴۶۹/۲)

حضرت امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ رمی کا وقت پہلے دن زوال تک ہی ہے، اس کے بعد قضا ہوجاتی ہے، کیونکہ بعد کے تینوں دنوں میں رمی کا وقت زوال سے شروع ہوتا ہے، اور نصف آخر میں اس کا وقت رہتا ہے، تو پہلے دن رمی کا وقت زوال تک رہنا چاہئے، تا کہ نصف اول میں اس کی ادائیگی ہو۔ (المبسوط ۴/۶۴، بدائع الصنائع ۲/۳۲۳، ۳۲۴)

❁ اگر کوئی شخص گیارہویں ذی الحجہ کی صبح صادق تک رمی نہ کرے تو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قضا کے ساتھ دم بھی واجب ہوگا، قضا کا وقت پورے ایام تشریق ہیں۔

صاحبین کے نزدیک دم واجب نہیں ہوگا، حضرت امام شافعی کی بھی یہی رائے ہے، دراصل صاحبین کے نزدیک رمی کوئی موقت عمل نہیں ہے۔ (بدائع ۲/۳۲۶)

❁ مالکیہ کی رائے آغاز وقت کے بارے میں وہی ہے، جو حنفیہ کی ہے۔ یعنی ۱۰؍تاریخ کی صبح صادق سے رمی کا وقت جواز شروع ہوجاتا ہے، ایک روایت میں امام احمد کی رائے بھی یہی ہے، مگر ان کا مشہور مسلک اس کے خلاف ہے، البتہ انتہائے وقت کے سلسلہ میں ان کی رائے مختلف ہے، ان کے نزدیک غروب آفتاب پر رمی کا وقت ختم ہوجاتا ہے، اس کے بعد قضا کے ساتھ دم بھی ادا کرنا ہوگا۔ (شرح الکبیر ۲/ ۲۸، شرح الرسالہ بحاشیہ العدوی ۱/ ۴۷۷، بحوالہ الموسوعۃ الفقہیہ)

❁ شافعیہ کے نزدیک یوم النحر کی نصف شب ہی سے رمی کا وقت جواز شروع ہوجاتا ہے، بشرطیکہ اس سے قبل وہ وقوف عرفہ کرچکا ہو ان کے نزدیک وقت کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے۔

(۱) افضل وقت: طلوع آفتاب سے زوال تک۔

(۲) وقت اختیار: زوال سے غروب آفتاب تک۔

(۳) وقت جواز: آخری ایام تشریق تک۔ (المجموع للنووی ۲/۱۶۲، فتح الباری ۳/ ۵۲۸)

❁ حنابلہ نے وقت کی صرف دو قسمیں کی ہیں: ان کے نزدیک بھی رمی کا وقت نصف شب سے شروع ہوجاتا ہے۔

(۱) مگر افضل وقت طلوع آفتاب کے بعد سے زوال تک ہے۔ (۲) اور وقت جواز زوال سے غروب تک ہے، غروب کے بعد وقت ختم ہوجاتا ہے۔ (المغنی مع الشرح الکبیر ۳/ ۴۴۳، ۴۴۹، المقنع ۱/ ۴۵۶، زاد المعاد لابن قیم ۲/ ۲۵۸، ۲۵۹)

متعلقہ روایات پر ایک نظر

اس سلسلے میں جو روایات کتب حدیث میں آتی ہیں، اور جن کو ائمہ کرام نے اپنے پیش نظر

رکھا ہے۔ ایک نظر ان پر بھی ڈال لینا مناسب ہوگا۔

❁ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ہم لوگ جب مزدلفہ پہنچے تو حضرت سودہ نے اپنے جسم کے بھاری پن کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لی کہ وہ لوگوں کی بھیڑ سے قبل منیٰ روانہ ہوجائیں، رسول اللہ ﷺ نے انہیں اجازت مرحمت فرمادی اور وہ راتوں رات منیٰ پہنچ گئیں، اور ہم لوگ صبح تک مزدلفہ ہی میں مقیم رہے۔ صبح جب تمام لوگوں کے ساتھ حضرت عائشہ منیٰ پہنچیں، اور وہاں انسانوں کا ہجوم دیکھا تو فرماتی تھیں کہ کاش سودہ کی طرح میں بھی رات ہی چلی آتی تو مجھے بے پناہ خوشی ہوتی۔ (بخاری حدیث نمبر ۱۶۸۰، مسلم ۱/ ۴۱۶، حدیث نمبر ۱۲۹۰)

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ مزدلفہ سے منیٰ راتوں رات آنے کی اجازت ہے، مگر اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ حضرت سودہ نے منیٰ آکر رمی بھی رات ہی میں کرلی تھی، روایت خاموش ہے، ممکن ہے کہ صبح صادق کے بعد ہی رمی کی ہو، جیسا کہ دوسری روایات سے سمجھ میں آتا ہے، اور پہلے اس لئے پہنچ گئیں کہ تا کہ پہلے مرحلے میں فارغ ہوجائیں، اگر ایسا ہے تو حنفیہ کے نقطۂ نظر سے بھی کچھ حرج نہیں۔ اس لئے کہ صبح صادق کے بعد وقت جواز شروع ہوجاتا ہے۔

❁ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے گھر کے کمزور لوگوں کو اور سارا ساز وسامان رات ہی میں منیٰ بھیج دیا تھا، ان سامانوں کے ساتھ حضرت ابن عباس بھی تھے، مگر آپ نے چلتے وقت حکم فرمایا: "لا ترموا الجمرة حتیٰ تصبحوا" (شرح معانی الآثار للطحاوی ۲/ ۲۱۷)

ترجمہ: صبح سے قبل رمی نہ کرنا۔

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ رات میں منیٰ پہنچ جانے کے بعد بھی ان کو حکم دیا گیا کہ صبح سے قبل رمی نہ کی جائے۔ اس روایت سے پہلی روایت کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔

❁ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے مروی ہے کہ وہ مزدلفہ پہنچ کر نماز میں مشغول ہوگئیں، تھوڑی دیر کے بعد اپنے غلام سے کہا کہ بیٹے دیکھو! چاند غائب ہوگیا؟ غلام نے کہا نہیں، وہ پھر نماز میں مشغول ہوگئیں، اور تھوڑی دیر کے بعد پھر دریافت کیا کہ، چاند غائب ہوگیا؟ غلام نے کہا ہاں! انھوں نے کہا تو پھر یہاں سے کوچ کرو، وہاں سے وہ منیٰ پہنچیں، اور منیٰ پہنچنے کے بعد پہلے جمرۂ عقبہ کی رمی کی اور رمی کے بعد اپنی قیام گاہ پہنچ کر فجر کی نماز ادا کی، غلام نے حضرت اسماء سے کہا کہ شاید ہم نے اندھیرے ہی میں رمی کرلی ہے، انھوں نے کہا بیٹا! رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو اس کی اجازت دی ہے۔ (ابوداؤد ۲/ ۴۸۱)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند ڈوبنے کے بعد حضرت اسماء منیٰ کے لئے روانہ

ہوئیں اور منیٰ پہنچنے تک صبح صادق کا آغاز ہورہا تھا، مگر بہت اندھیرا تھا، انھوں نے نماز سے قبل رمی کرلی، اس لئے کہ صرف ایک جمرہ کی رمی کرنی تھی، اور پھر اپنی قیام گاہ پہنچ کر نماز ادا کی، رمی اور نماز فجر میں کوئی زیادہ وقفہ نہیں تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی رمی صبح صادق کے بعد ہوئی تھی، ان کے غلام کو شبہ اس بنا پر ہوا کہ سویرا کھلا نہیں تھا، اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا تھا، اور اوپر کی روایت میں آچکا ہے کہ حضور ﷺ کی ہدایت تھی کہ صبح سے قبل رمی نہ کی جائے، تو حضرت ام سلمہ نے جواب دیا کہ عورتوں کے لئے اس حد تک اجازت اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت اسماء نے کوچ کی تیاری چاند ڈوبنے کے بعد کی، اور دسویں رات کا چاند کم از کم، آٹھ گھنٹے سے قبل نہیں ڈوبتا۔ اس لحاظ سے اندازہ یہ ہے کہ چاند کم از کم رات کے قریب تین بجے غروب ہوا ہوگا، اس کے بعد تیاری میں کچھ وقت صرف ہوا ہوگا، پھر سفر کا مرحلہ طے ہوا ہوگا، اس طرح کم از کم چار بجے سے قبل منیٰ نہیں پہنچ سکی ہوں گی، اور چار بجے صبح صادق ہونا مستبعد نہیں۔ اور اس طرح راتوں رات سفر کرنا اور بالکل اندھیرے میں رمی کرنے کی اجازت خواتین اور معذورین کے لئے ہے۔

اس میں کوئی کراہت نہیں جیسا کہ اس کی توجیہ خود حضرت اسماء نے کی، کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو اس کی اجازت دی ہے، یعنی عورتیں ازدحام کے خوف سے اگر تنگی محسوس کریں تو مزدلفہ کا وقوف ترک کرکے راتوں رات منی جاسکتی ہیں، اور صبح کو ہجوم کا اندیشہ ہو تو اندھیرے ہی میں رمی کرسکتی ہیں، اور یہ حکم صرف عورتوں ہی کے لئے نہیں بلکہ بیماروں، کمزوروں اور دیگر معذورین کے لئے بھی ہے، فقہاء حنفیہ کے یہاں بھی اس کی گنجائش عذر کی صورت میں نظر آتی ہے، ابن عابدین شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

قلت وهو شامل لخوف الزحمة عند الرمي فمقتضاه انه لو دفع ليلاً ليرمي قبل دفع الناس وزحمتهم لاشيء عليه، لكن لا شك ان الزحمة عند الرحمة وفى الطريق قبل الوصول اليه امر محقق فى زماننا فيلزم منه سقوط واجب الوقوف بمزدلفة فالاولى تقييد خوف الزحمة بالمرأة — لكون ذلك عذرًا ظاهرًا فى حقها يسقط به الواجب بخلاف الرجل او يحمل على ما اذا خاف الزحام فدفع ليلاً فلا شيء عليه.

(رد المحتار ۳/ ٤٦٩)

ترجمہ: میری رائے یہ ہے کہ اس میں بوقت رمی کی بھیڑ بھی شامل ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی رات ہی میں روانہ ہوجائے، تاکہ لوگوں کی بھیڑ سے قبل رمی کرسکے تو اس پر کچھ عائد نہیں ہوگا، لیکن ظاہر ہے کہ رمی کے وقت کی بھیڑ ہو یا راستے کی ہمارے دور میں یہ لازماً ہوتی ہے،

تب تو وقوف مزدلفہ کا حکم سب ہی کے لئے ساقط ہوجانا چاہئے، اس لئے بہتر ہے کہ اس میں عورتوں کی قید لگائی جائے کہ بھیڑ کا خوف عورتوں کے لئے عذر ہے مردوں کے لئے نہیں، الّا یہ کہ بیمار ہو یا بہت زیادہ کمزور ہو، یا اور کوئی شدید عذر ہو، اور اس کی وجہ سے وہ رات ہی میں مزدلفہ سے منیٰ آجائے تو اس پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔

❁ بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت آتی ہے کہ وہ اپنے گھر کے کمزور لوگوں (عورتوں اور بچوں) کو آگے ہی سے منیٰ روانہ کردیتے تھے، اور باقی لوگ رات کو مزدلفہ میں قیام کرتے تھے، اور جب چاہتے ذکر الٰہی میں مصروف رہتے، پھر وہ امام کے ٹھہرنے اور لوٹنے سے قبل روانہ ہوجاتے تو کچھ لوگ منیٰ میں صبح کی نماز کے وقت پہنچتے اور کچھ نماز کے بعد، اور جو جس وقت پہنچتا اسی وقت جمرہ پر کنکریاں مار لیتا، حضرت ابن عمرؓ فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں کے بارے میں یہ اجازت دی ہے۔ (اللؤلؤ والمرجان کتاب الحج حدیث نمبر ۸۱۷، بحوالہ رمی جمار کے وقت میں توسیع/ ۲۶، ڈاکٹر سلطان صلاح الدین)

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ صبح صادق کے بعد بھی رمی کرنا جائز ہے، اور اگر کوئی شخص یہ ہجوم کے ڈر سے ایسا کرے تو اس کے لئے اس وقت میں رمی کرنا بلا کراہت جائز ہے۔

❁ حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم رمى الجمرة يوم النحر ضحى ورمى فى بقيّة الايام بعد الزوال (بخارى باب رمى الجمار ۳/ ۵۷۹، مسلم باب بيان استحباب الرمى / ۱۳۰۰، ترمذى باب الرمى يوم النحر ضحىً حديث نمبر ۸۹٤)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس ذی الحجہ کو چاشت کے وقت (طلوع آفتاب کے بعد) رمی فرمائی اور اس کے بعد کے دنوں میں زوال کے بعد، یہ وقت مسنون ہے، اور باتفاق فقہاء سب سے افضل وقت ہے، مگر مضبوط اور توانا اور صاحب توفیق بندوں کے علاوہ عام لوگوں کے لئے اس فضیلت کو حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔

❁ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندان بنی عبدالمطلب کے لوگوں سے ارشاد فرمایا:

أبنيّ لا ترموا الجمرة حتى تطلع الشمس .

ترجمہ: بیٹے! جمرۂ عقبہ کی رمی طلوع آفتاب سے قبل مت کرو۔ (سنن کبریٰ للبیہقی ۱۳۲/۵، سنن دار قطنی ۲۷۳/۲، ابن ماجہ حدیث ۳۰۲۵، المجتبیٰ من السنن للنسائی باب النهى عن رمى جمرة العقبة قبل طلوع الشمس ۲۷۰/۵، ۲۷۲)

❁ اس حدیث میں تلقین کی گئی ہے کہ ممکن طور پر وقت افضل میں رمی کی کوشش کرنی چاہئے۔ حضور ﷺ کے اس حکم کے مخاطب آپ ہی کے خاندان کے نوجوان لڑکے ہیں، جو مضبوط بھی تھے اور خاندانی شرافت کا تقاضا بھی تھا کہ وقت افضل کو وہ ہاتھ سے جانے نہ دیں۔

❁ حضرت ابن عباس ہی کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں دن میں رمی نہ کرسکا اور شام ہونے کے بعد رمی کی، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کچھ حرج نہیں۔ (بخاری مع الفتح ۵۶۸/۳، باب اذا رمیٰ بعد ما امسیٰ)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غروب آفتاب کے بعد رمی کا وقت باقی رہتا ہے، اور جو لوگ کسی وجہ سے دن میں رمی نہ کر پائیں تو ان کے لئے شام کے بعد رات میں بھی رمی کرنے کی گنجائش ہے۔

❁ چنانچہ ایک دوسری روایت بھی حضرت ابن عباس ہی سے منقول ہے کہ:

ان النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم رخص للرعاۃ ان یرموا لیلاً.

ترجمہ: نبی کریم ﷺ نے چرواہوں کو رات میں رمی کرنے کی اجازت دی ہے۔ (المجتمع للبیہقی ۲۶۰/۳، الکبیر للطبرانی حدیث نمبر ۱۱۳۷۹، مسند بزاز حدیث ۱۱۳۹)

ان روایات سے مجموعی طور پر جو تاثر ابھرتا ہے کہ رمی کا اصل وقت جواز صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور شام کے بعد رات میں بھی باقی رہتا ہے، جو حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے، اسی طرح روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پورا وقت ایک حکم میں نہیں ہے؛ بلکہ اس میں افضل و غیر افضل کی تقسیم پائی جاتی ہے، نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عذراً ادائیگی کی صورت میں پورے وقت میں سے کسی بھی حصے رمی کرنے کی گنجائش ہے اور اس پر کچھ تاوان واجب نہیں۔

ایام تشریق میں رمی

یوم النحر کے بعد ۱۱/۱۲/۱۳ر کی تواریخ میں تینوں جمرات کی رمی کی جاتی ہے، اور تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ افضل وقت ہر دن کے زوال سے لے کر غروب تک ہے، اختلاف وقت جواز میں ہے۔

جمہور فقہاء کے نزدیک ۱۱/۱۲ر کی تواریخ میں زوال سے قبل رمی کرنا جائز نہیں ہے، حنفیہ کی مشہور روایت بھی یہی ہے۔ (بدائع الصنائع ۳۲۴/۲، شامی ۴۸۰/۳، الشرح الکبیر ۴۸/۲،۵۰ شرح الرسالہ ۴۸۰/۱، الایضاح

/۴۰۵، نہایت المحتاج ۴۳۲/۲، مغنی الحقائق ۵۰۷/۱، المغنی ۴۵۲/۳، الشرح الکبیر سے المغنی تک حوالہ الموسوعہ سے لئے گئے ہیں)

مگر امام ابوحنیفہ کی ایک دوسری روایت یہ ہے کہ ان دو دنوں میں زوال سے قبل بھی جائز ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جس طرح یوم النحر میں زوال سے قبل رمی کا وقت ہے تو دوسرے دنوں میں بھی اس کی وقتیت باقی رہنی چاہئے۔ (بدائع الصنائع ۳۳۴/۲، ردالمحتار ۴۸۱/۳)

بعض حنابلہ کا بھی یہی قول نقل کیا جاتا ہے۔ (الفروع ۵۱۸/۳، بحوالہ الموسوعۃ الفقہیہ /۱۵۸) جمہور علماء کے پیش نظر فعل رسول ﷺ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے زوال کے بعد رمی فرمائی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ:

كنّا نتحين فاذا زالت الشمس رمينا . (بخاری مع الفتح ۵۷۹/۳)

ترجمہ: ہم انتظار کرتے جب سورج ڈھل جاتا تو ہم رمی کرتے تھے۔

حضرت جابر کی روایت پہلے آچکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر میں چاشت کے وقت اور دیگر دنوں میں، زوال کے بعد رمی فرمائی۔ (مسلم ۹۴۵/۲، مطبوعہ الحلبی)

مگر ہمارے دور میں لوگوں کے ہجوم کو دیکھتے ہوئے رفع حرج کے لئے امام ابوحنیفہؒ سے منقول دوسری روایت زیادہ قابل لحاظ معلوم ہوتی ہے، اور روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ فعل رسول کو سنیت اور فضیلت پر محمول کیا جائے اور باقی وقت کو وقت جواز قرار دیا جائے۔

انتہائے وقت جواز

اسی طرح ان تواریخ میں وقت جواز کے اختتام کے سلسلے میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، شافعیہ اور حنابلہ کی رائے میں وقت کا اختتام ۱۳ر تاریخ کو غروب آفتاب پر ہوتا ہے، اس دوران کسی بھی دن میں رمی کرنے سے رمی ادا ہوجاتی ہے، اور اس کو قضا نہیں قرار دیا جائے گا، شافعیہ کا قول اصح یہی ہے، البتہ ترتیب کی رعایت ضروری ہے، اگر کوئی چھوٹی ہوئی رمی کو ۱۳ر کے غروب آفتاب تک بھی پورا نہ کرسکے تو اس کی رمی فوت ہوجائے گی، اور اس پر فدیہ واجب ہوگا۔ (الام ۲۴/۲، الایضاح /۴۰۷، نہایت المحتاج ۴۳۵/۲، ۴۳۶، مغنی المحتاج ۵۰۸/۱، ۵۰۹، المغنی ۴۵۵/۳، الفروع ۵۱۸/۳، ۵۱۹، بحوالہ الموسوعۃ الفقہیہ ۱۵۹/۲۳)

مالکیہ کے یہاں اس باب میں سب سے زیادہ تنگی ہے، وہ پورے ایام تشریق میں رمی کو زوال سے غروب آفتاب تک محدود کرتے ہیں، ان کے نزدیک غروب کے بعد رمی کا وقت ختم ہوجاتا ہے، اگر کوئی غروب تک رمی نہ کرے تو قضاء کے ساتھ دم بھی واجب ہوگا۔ (الشرح الکبیر ۵۱/۲،

شرح الرسالۃ مع الحاشیہ ۱/۴۷۷، ۴۸۰)

مگر حنفیہ کے پیش نظر وہ روایات ہیں جن میں آپ نے چرواہوں کو رات میں رمی کرنے کی اجازت دی۔ (طبرانی کبیر حدیث نمبر ۱۱۳۷۹، مسند بزار رقم ۱۱۳۹)

علامہ کاسانی لکھتے ہیں کہ چرواہوں کے ساتھ رعایت کسی عذر کی بنا پر نہیں تھی اس لئے کہ عذر کی صورت میں نائب بنانے کی اجازت ہے، اگر فی الواقع وقت نہیں رہتا تو ان کو نائب بنانے کا حکم دیا جاتا، لیکن مغرب کے بعد اجازت دینا وقت میں گنجائش کو ظاہر کرتا ہے۔ (بدائع الصنائع ۲/۳۲۴)

حنفیہ کی رائے توسع واعتدال کی حامل ہے

اسی طرح حنفیہ کے یہاں بڑی حد تک توسع اور اعتدال ملتا ہے، آخری دن (۱۳/ذی الحجہ) کی رمی میں بھی جمہور علماء کے مقابلے میں حضرت امام ابوحنیفہ کے یہاں بہت توسع ہے، ائمہ ثلاثہ اور حنفیہ میں، امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک آخری دن بھی زوال سے قبل رمی کی اجازت نہیں ہے، جبکہ سب اس پر متفق ہیں کہ غروب آفتاب سے رمی کا وقت ختم ہوجاتا ہے، اور قضا کی بھی مدت باقی نہیں رہ جاتی ہے، یعنی ہر شخص کو زوال سے غروب ہی تک کے دوران رمی کرلینی ہے، ورنہ رمی فوت ہوجائے گی۔ اور دم واجب ہوگا۔ (حوالہ جات سابقہ)

مگر حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ چونکہ یہ آخری اور روانگی کا دن ہے، اگر کوئی شخص غروب کے بعد منیٰ سے روانہ ہو تو راستہ میں اس کے لئے دشواریاں پیش آسکتی ہیں، اس لئے چاہے تو زوال سے قبل ہی، رمی کرکے فارغ ہوجائے۔ (بدائع ۲/۳۲۶)

امام احمد سے بھی ایک روایت اسی مضمون کی نقل کی گئی ہے۔ (الموسوعہ ۲۳/۱۵۸)

شامی نے زوال سے قبل رمی کو کراہت کے ساتھ جائز کہا ہے۔ (ردالمحتار ۳/۴۸۰) مگر بعض متاخرین حنفیہ نے حج کے موقع پر انسانی ہجوم اور وقت کی تنگ دامانی کو دیکھتے ہوئے امام ابوحنیفہ کے اس قول کو زیادہ لائق ترجیح قرار دیا ہے۔ (الموسوعۃ الفقھیہ میں البحر العمیق، ارشاد الساری، اور کتاب المناسک لملاعلی قاری ۱۶۱ وغیرہ کے حوالوں سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے)

فھو قول مختار یعمل به بلا ریب وعلیه عمل الناس وبه جزم بعض الشافعیة حتی زعم الاسنوی انه المذهب. (۲۳/۱۵۸)

ترجمہ: یہی قول مختار ہے بلاشبہ اسی پر عمل کیا جائے گا، اور لوگوں کا عمل اسی پر ہے، اور بعض شوافع نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے، بلکہ اسنوی تو اس کو اصل مذہب قرار دیتے ہیں۔

موسوعہ کے مرتب نے اپنے خیال کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

والاخذ بهذا مناسب لمن خشی الزحام ودعته الیه الحاجة لاسیّما فی زماننا. (۲۳/۱۵۸)

ترجمہ: جس شخص کو بھیڑ کا اندیشہ ہو اور کوئی حاجت درپیش ہو اس کے لئے اسی قول کو اختیار کرنا مناسب ہے، بالخصوص ہمارے دور میں۔

مشکلات کو حل کرنے کی ضرورت ہے

اس تفصیل کی روشنی میں اس سلسلے میں رکھنے والے سوالات اور مشکلات کو حل کیا جاسکنا، آج کل حجاج کی بڑھتی ہوئی مقدار کے پیش نظر رمی جمار کے موقع پر بڑا ہجوم ہوجاتا ہے، جو سخت ترین انتظامات کے باوجود قابو سے باہر ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں بعض مرتبہ بڑے حادثات رونما ہوتے ہیں مثلاً ۱۴۱۸ھ میں کم از کم (۳۷۵) اور ۱۴۲۴ھ میں (۲۵۰) حجاج شہید ہوئے، جیسا کہ عالمی اخبارات اور ریڈیو سے نشر ہوا، حاجیوں کی یہ تعداد آئندہ اور بھی بڑھ سکتی ہے، حکومت سعودیہ نے اپنی مجبوریوں کے باعث حجاج کی تعداد کی تحدید کررکھی ہے، مگر دنیا میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، اور اشاعت اسلام کے پیش نظر یہ تحدید بالیقین اسلام کی آفاقیت کے منافی ہے، اور اس تحدید میں مزید توسیع کی ضرورت ہے۔

اس لئے آج کے دور میں بالیقین رمی کے پورے نظام کا جائزہ لینا چاہئے، اور لوگوں کی جان ومال کی حفاظت، حج کی سعادت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت اور ملت اسلامیہ کو خفت وبدنامی سے بچانے کیلئے توسیع کا وہ راستہ اختیار کرنا چاہئے، جو ائمہ اربعہ میں سے کسی کے معتبر قول کے مطابق ممکن ہو، اس لئے کہ

(۱) اولاً رمی جمار فرض نہیں، واجب ہے، یہی وجہ ہے کہ بوقت ضرورت اس معاملے میں اپنا نائب بنانے کی اجازت ہے، جبکہ ارکان وفرائض میں نیابت جاری نہیں ہوسکتی۔ (فتح القدیر لابن ہمام ۲/۴۹۵) اور انسانی جانوں کی حفاظت فرض ہے، اسلئے واجب کیلئے فرض کو ضائع نہیں کیا جائیگا۔

(۲) حضرت سلیمان بن عمرو بن الاحوص اپنی ماں کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں، فرماتی ہیں کہ:

رأیت رسول الله صلی الله علیه وسلم یرمی الجمرة من بطن الوادی وهو راکب یکبر مع کل حصاة ورجل من خلفه یستره. فسألت عن الرجل فقالوا: الفضل بن عباس، وازدحم الناس فقال علیه الصلوٰة والسلام یایها الناس لا یقتل بعضکم

بعضاً و اذا رميتم الجمرة فارموا بمثل حصى الخذف. (ابوداؤد حدیث ۱۹۶۶، ابن ماجہ حدیث ۳۰۲۸، احمد ۳/۵۰۳، نصب الرایۃ ۳/۷۵)

ترجمہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ بطن وادی سے سوار ہوکر جمرہ کو رمی فرمارہے تھے، اور ہر تلبیہ کے ساتھ تکبیر فرماتے تھے، اور ایک صاحب آپ کے پیچھے ڈھال بنے ہوئے تھے میں نے ان کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ''فضل بن عباسؓ'' ہیں، لوگوں کا ہجوم آپ نے ملاحظہ فرمایا تو ارشاد فرمایا کہ ''اے لوگو! کوئی کسی کو جانی نقصان نہ پہنچائے، رمی جمرہ کرو تو چھوٹی کنکریوں سے کرو''

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر ازدحام فطری چیز ہے۔ اس لئے جانی نقصان کا اندیشہ بہرحال ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ رمی جمار کے دوران کسی کی جان تلف نہ ہونی چاہئے۔

اس ارشادِ عالی کا تقاضا ہے کہ رمی جمار میں ایسے نظام کو اختیار کیا جائے گا جس میں تحفظ جان کی زیادہ سے زیادہ ضمانت ہو، اس لئے ایک طرف منیٰ میں مکانی توسیع کی کوشش تیز ہونی چاہئے تو دوسری طرف ایسے مسلک فقہی کو اختیار کیا جانا چاہئے جس میں فطری اعتدال دین کے روح ومزاج کی رعایت وتحفظ جان کی ضمانت اور لوگوں کے لئے وسعت وراحت کا سامان موجود ہو۔

(۳) نیز ضرورت اور حرج کے موقع پر شریعت نے جو وسعت دی ہے اس سے بھی استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

ما يريد الله ليجعل عليكم من حرج. (المائدہ:۶)

ترجمہ: اللہ نہیں چاہتے کہ تم کو حرج میں ڈالے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وما جعل عليكم في الدين من حرج. (الحج:۷۸)

ترجمہ: دین میں تمہارے لئے اللہ نے تنگی نہیں پیدا کی۔

نیز ارشاد ہے:

يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر. (البقرة:۱۸۵)

ترجمہ: اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتے ہیں دشواری نہیں چاہتے۔

اسی چیز کو فقہاء نے مختلف ضابطوں کے تحت بیان کیا ہے۔

۞ مثلاً: اذا ضاق الامر اتّسع .

ترجمہ: جب تنگی آتی ہے تو وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔

۞ المشقة تجلب التيسير .

ترجمہ: دشواری آسانی لے کر آتی ہے۔ (الاشباہ والنظائر)

شریعت کے اس نظریہ اتساع کا تقاضا یہ ہے کہ حرج وتنگی کے سنگین مواقع پر حتی الامکان توسع کا راستہ اختیار کیا جائے۔

زیادہ قابل قبول مسلک

علماء نے لکھا ہے، ضرورت کے وقت کسی بھی مذہب فقہی پر عمل وفتویٰ کی گنجائش ہے۔ جس کے لئے کچھ حدود اور ضوابط مقرر کئے گئے، لیکن بحیثیت مجموعی ائمہ اربعہ میں حضرت امام ابوحنیفہ کا مسلک اس باب میں زیادہ محتاط، معتدل اور توسع کا حامل ہے، جیسا کہ گذشتہ سطور میں آراء کی تشریح کے دوران اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مثلاً حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ۱۰؍ذی الحجہ کو صبح صادق سے دوسرے دن کے صبح صادق تک رمی کا وقت ہے، جو کافی وسیع وقت ہے۔

حضرت امام شافعی نے نصف شب ہی سے مانا ہے، اور مزید توسع دی ہے، مگر اس میں ایک طرف وقوف مزدلفہ کا حکم متاثر ہوتا ہے، دوسرے کوئی مضبوط اور واضح دلیل اس موقف کے لئے نہیں ہے، اور کام صبح صادق کے وقت کو مان کر بھی حل ہوسکتا ہے۔ اس لئے احتیاط یہ ہے کہ نصف شب سے رمی کا آغاز نہ کیا جائے کہ ممکن ہے اللہ کے نزدیک یہ قبل از وقت رمی قرار پائے۔

۱۱/۱۲/۱۳؍ کی تواریخ میں بھی حضرت امام ابوحنیفہ ایک روایت کے مطابق صبح صداق سے رمی کا وقت مانتے ہیں، اور رات کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں، جس سے بڑی آسانی ہوجاتی ہے۔ دوسرے فقہاء زوال سے قبل رمی کا وقت نہیں مانتے ہیں۔ مالکیہ نے وقت رمی کو اور بھی زیادہ مختصر کردیا ہے، اور اس کو صرف غروب تک محدود کیا ہے۔

سوالات کے جوابات

اس لحاظ سے حضرت امام ابوحنیفہ کا مذہب آسان اور دین کے مزاج اور زمانہ سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اس روشنی میں:

(۱) ۱۰؍ذی الحجہ کی رمی طلوع آفتاب سے قبل صبح صادق سے کی جاسکتی ہے۔

(۲) ۱۱/۱۲؍ذی الحجہ کی رمی طلوع صبح صادق سے کرنے کی گنجائش ہے۔

(۳) ۱۲/۱۱/ذی الحجہ کی رمی غروب آفتاب کے بعد بلا کراہت جائز ہے۔

(۴) ۱۳/ذی الحجہ کی صبح صادق سے قبل منیٰ سے نکل جائے تو حرج نہیں لیکن صبح صادق کے بعد رمی کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔اسلئے اس پر رمی لازم ہوجائے گی، اگر رمی نہ کرے گا تو دم لازم ہوگا۔

بہتر یہ ہے کہ جس نے ۱۳/کو نہ کیا ہو وہ ۱۲/ کے غروب آفتاب سے قبل منیٰ چھوڑ دے، غروب کے بعد نکلنا مکروہ ہے،مگر تاوان واجب نہیں ہوگا،اور اگر تاخیر ہجوم کی وجہ سے ہوئی ہوتو کراہت نہیں ہوگی، البتہ رمی زوال سے قبل بھی کرسکتا ہے، شامی نے اسے مکروہ لکھا ہے۔ (ردالمحتار۳/۴۸۱)مگر بعض متاخرین حنفیہ نے آج کے حالات میں اسی کو قابل ترجیح کہا ہے۔

(۵) بہت زیادہ بوڑھے، بیمار،معذوراور خواتین کے لئے احتیاط یہ ہے کہ ۱۰/ذی الحجہ کو صبح صادق میں اندھیرے ہی رمی کریں اس میں کوئی کراہت نہیں ہے،اس لئے کہ وقت میں بہت گنجائش ہے،البتہ اگر معذورین کو اندیشہ ہو کہ وہ صبح کے بعد ہجوم کی وجہ سے رمی نہ کرسکیں گے تو مناسب یہ ہے کہ وہ رمی کے لئے اپنا نائب مقرر کریں اور خود رمی کیلئے نہ جائیں اور نہ نصف شب کے بعد رمی کریں کیونکہ نیابت کی شریعت نے اجازت دی ہے،اس لئے رمی کو قبل از وقت کے خطرہ میں ڈالنا بہتر نہیں۔

منیٰ میں حجاج کے قیام کی شرعی حیثیت

(۱/۲/۳) رمی کے درمیان حاجیوں کو منیٰ میں قیام کرنا مسنون ہے، واجب نہیں،اس لئے منیٰ کے حدود میں قیام کرنا اگر کسی عذر کی وجہ سے ممکن نہ ہوتو دوسری جگہ قیام کرنا بلا کراہت جائز ہے،البتہ بلا عذر منیٰ کے حدود سے باہر قیام کرنا مکروہ ہے۔(ردالمحتار۳/۴۷۹)

والله أعلم بالصواب علمه أتم وأحكم

قادیانیت کا مکروہ چہرہ!

کینیڈا سے قادیانیوں کے پندرہ سوالات اوران کا جواب

از: مولانا سعید احمد جلال پوری
مدیر ماہنامہ بینات کراچی، پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

گزشتہ دنوں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے کارکن اور سیالکوٹ کے مبلغ مولانا فقیر اللہ اختر صاحب کا ایک مکتوب موصول ہوا، جس کے ساتھ بے نام کا ایک سوال نامہ بھی منسلک تھا، اس سوال نامہ میں پوری امت مسلمہ، دنیا بھر کے مسلمانوں، اسلام کے نام لیواؤں اور حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے والوں کو مخاطب کرکے اس کے جواب کا مطالبہ تھا۔

یہ بھی مولانا فقیر اللہ اختر صاحب کے ہی خط سے معلوم ہوا کہ یہ سوال نامہ دراصل کینیڈا کے قادیانیوں نے کینیڈا میں رہائش پذیر ایک مسلمان نوجوان کو دیا اور کہا کہ اس کا جواب دو۔ چنانچہ وہ سوال نامہ پھرتا پھراتا مولانا فقیر اللہ اختر صاحب کے پاس پہنچا، تو انھوں نے راقم الحروف سے اس کے جواب کی فرمائش کی۔

بلاشبہ اس کا تو مجھے پہلے بھی علم، بلکہ یقین تھا کہ قادیانیت، اسلام کی ضد ونقیض ہے اور جس طرح آگ و پانی، اور دن ورات کا اجتماع محال ہے، ٹھیک اسی طرح قادیانیت اور اسلام کا اکٹھا ہونا بھی محال ہے۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ قادیانی سیدھے سادے مسلمانوں کو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے نام سے دھوکا دیتے ہیں، ورنہ انہیں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ.... سے جتنا بغض، عداوت اور نفرت ہے، شاید دنیا کے کسی بدترین کافر ومشرک کو بھی ان سے اتنا بغض وعداوت نہ ہوگی۔

بلاشبہ اس خط کو پڑھنے کے بعد قادیانی امت کی اسلام دشمنی اور نبی امی ﷺ سے ان کی دلی نفرت وعداوت علم الیقین سے نکل کر عین الیقین کے درجہ میں آگئی۔

یقین جانئے! کہ اگر اس سوال نامہ کے ساتھ مولانا فقیر اللہ اختر صاحب کا تعارف نامہ اور قادیانیوں کے روایتی سوالات نہ ہوتے تو شاید دوسرے سیدھے سادے مسلمانوں کی طرح، میں بھی اس کو کسی متعصب عیسائی، یہودی، پرلے درجے کے کسی ملحد، اسلام دشمن کافر اور مشرک کی دریدہ دہنی قرار دیتا۔

بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال نامہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو قادیانی دجل، فریب، الحاد، زندقہ اور ان کے گھناؤنے کردار سے ناآشنا تھا، یا وہ ان کے منافقانہ ظاہری ”حسن اخلاق“ سے متاثر تھا، اس سے کم ازکم اس پر قادیانیت کی اسلام دشمنی اور پیغمبر اسلام سے ان کا بغض اور دلی عداوت کھل کر سامنے آجائے گی، اور قادیانیوں کے مکروہ چہرہ کی اس نقاب کشائی کے بعد کم ازکم قادیانی، کسی مسلمان کو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے نام پر دھوکا نہیں دے سکیں گے۔ لیجئے! پہلے مولانا فقیر اللہ اختر صاحب کا خط اور مسیلمہ کذاب کے جانشین، مسیلمہ پنجاب کے نام لیواؤں کا غلاظت بھرا سوال نامہ پڑھئے:

”مخدومی ومکرمی جناب حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری صاحب

السلام علیکم!

امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ گزارش یہ ہے کہ ایک تحریر حاضر خدمت ہے، کینیڈا میں ہمارے ایک مسلمان بچے کو یہ تحریر مرزائیوں/قادیانیوں نے دی ہے۔ اس تحریر کو پڑھ کر اس کے ترتیب وار جامع، موزوں اور پراثر جوابات تحریر فرمادیں اور اس کی ایک کاپی مجھے بھیج دیں تاکہ اسے کنیڈا بھیج کر اپنے مسلمان بھائیوں کو قادیانی فتنہ سے بچایا جاسکے اور ان کے ذہنوں کو اس گندگی سے بچایا جاسکے۔ امید ہے کہ آپ شفقت فرمائیں گے۔ مزید یہ کہ اگر کینیڈا میں ہماری جماعت کا کوئی اہم کارکن یا عہدیدار ہو تو اس کا نام، پتا اور فون نمبر ارسال کردیں تاکہ ہمارے مسلمان بھائی ان سے راہ نمائی حاصل کرسکیں۔

والسلام.... دعاگو، فقیر اللہ اختر

خادم عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت سیالکوٹ“

قادیانیوں کا سوال نامہ:

”ا:- لوگوں کی راہنمائی اور ہدایت کی ضرورت صدیوں رہی اور اس مقصد کیلئے اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں پیغمبر بھیجے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ ایک لاکھ تیس ہزار پیغمبر بھیجنے کے بعد حضرت محمد

پر ہی نبوت ختم کردی گئی؟ کیا بعد میں آنے والی صدیوں میں لوگوں کو ہدایت وراہنمائی کی ضرورت نہیں تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ حضرت محمد نے رہتی دنیا تک اپنی اہمیت برقرار رکھنے کے لئے خود ہی آخری نبی ہونے کا دعویٰ کردیا ہو؟

۲:- جب حضرت محمد اوران کے پیروکار اپنا آبائی مذہب تبدیل کرکے مسلمان ہوسکتے ہیں تو ایک مسلمان کیوں اپنا مذہب تبدیل نہیں کرسکتا؟ دوسرا مذہب اختیار کرنے پر اسے مرتد قرار دے کر اس کے قتل کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟ کیا اس حکم سے یہ تاثر نہیں ملتا کہ مذہبی تبدیلی کی اجازت دینے سے حضرت کو مسلمانوں کی تعداد میں کمی کا خدشہ تھا؟ کیا یہ حکم اس امر کا غماز نہیں ہے کہ حضرت نے مذہب کے فروغ کیلئے ''اسلام بذریعہ تبلیغ'' کے بجائے ''خاندانی یا موروثی اسلام'' کو ترجیح دی؟ کیونکہ بذریعہ آبادی اسلام پھیلانے کا یہ سب سے آسان اور موثر فارمولا تھا، جیسے جیسے آبادی بڑھے گی، مسلمان خود بخود بڑھتے چلے جائیں گے، جو تبدیلی چاہے، اسے قتل کردیا جائے، کیا یہ انصاف کے تقاضوں کے منافی نہیں؟

۳:- حضرت محمد نے اپنے خاندان یعنی آلِ رسول کو زکوٰۃ کی رقم دینے سے کیوں منع کیا ہے؟ کیا اس سے خاندانی بڑائی اور تکبر کی نشاندہی نہیں ہوتی؟ کیا رسول کا خاندان افضل اور باقی سب کمتر ہیں؟ بحیثیت انسان میں خاندانی افضلیت یا بڑائی تسلیم نہیں کرتا۔ خود حضرت محمد کا قول ہے کہ تم میں افضل وہ ہے جس کے اعمال اچھے ہیں، تو پھر یہ قول ان کے اپنے خاندان پر کیوں لاگو نہیں ہوتا؟

۴:- حضرت محمد نے جہاد کا حکم کیوں دیا؟ جہاد کو اسلام کا پانچواں ضروری رکن کیوں قرار دیا؟

۵:- مالِ غنیمت کے طور پر دشمن کی عورتیں مسلمانوں کیلئے کیوں حلال قرار دیں؟ کیا عورتیں انسان نہیں، بھیڑ بکریاں ہیں، جنہیں مالِ غنیمت کے طور پر بانٹا جائے اور استعمال کیا جائے؟

۶:- مذہب کے نام پر قتل وغارت گری کو جہاد قرار دے کر اسے اسلام کا پانچواں بنیادی رکن بنانے کی سزا ماضی کے لاکھوں، کروڑوں معصوم انسان بے شمار جنگوں کے نتیجے میں اپنی جان مال سے محروم ہوکر بھگت چکے ہیں اور عراق، افغانستان جنگ کی شکل میں آج بھی بھگت رہے ہیں، آخر اس ''جہاد'' کو بذریعہ اجتہاد ''جارحیت'' کے بجائے ''دفاع'' کے لئے کیوں استعمال نہیں کیا جاتا؟

۷:- حضرت محمد نے مرد کے مقابلے میں عورت کی گواہی آدھی کیوں قرار دی؟

۸:- والدین کی جائیداد سے عورت کو مرد کے مقابلے میں آدھا حصہ دینے کا کیوں حکم دیا؟ کیا عورت، مرد کے مقابلے میں کمتر ہے؟

۹:- حضرت محمد نے خود نو شادیاں کیں اور باقی مسلمانوں کو چار پر قناعت کرنے کا حکم دیا؟ اس میں کیا مصلحت تھی؟

۱۰:- شریعت محمدی میں مرد اگر تین بار طلاق کا لفظ ادا کرکے ازدواجی بندھن سے فوری آزادی حاصل کرسکتا ہے تو اسی طرح عورت کیوں نہیں کرسکتی؟

۱۱:- حضرت محمد نے حلالہ کے قانون میں عورت کو کسی بے جان چیز یا بھیڑ یا بکری کی طرح استعمال کئے جانے کا طریقہ کار کیوں وضع کیا ہے؟ طلاق مرد دے اور دوبارہ رجوع کرنا چاہے تو عورت پہلے کسی دوسرے آدمی کے نکاح میں دی جائے، وہ دوسرا شخص اس عورت کے ساتھ جنسی عمل سے گزرے، پھر اس دوسرے شخص کی مرضی ہو، وہ طلاق دے تو عورت دوبارہ پہلے آدمی سے نکاح کرسکتی ہے؟ یعنی اس پورے معاملے میں استعمال عورت کا ہی ہوا، مرد کا کچھ بھی نہیں بگڑا، اس میں کیا رمز پوشیدہ ہے؟

۱۲:- حضرت محمد نے قصاص ودیت کا قانون کیوں وضع کیا؟ مثال کے طور پر اگر میں قتل کردیا جاتا ہوں، اور میرے اپنی بیوی یا بہن بھائیوں سے اختلافات ہیں تو لازماً ان کی پہلی کوشش یہی ہوگی کہ میرے بدلے میں زیادہ سے زیادہ خون بہا لے کر میرے قاتل سے صلح کرلیں اور باقی عمر عیش کریں، میں تو اپنی جان سے گیا، میرے قاتل کو پیسوں کے عوض یا اس کے بغیر معاف کرنے کا حق کسی اور کو کیوں تفویض کیا گیا؟ کیا اس طرح سزا سے بچ جانے پر قاتل کی حوصلہ افزائی نہیں ہوگی؟ کیا پیسے کے بل بوتے پر وہ مزید قتل وقتال کے لئے اس معاشرے میں آزاد نہیں ہوگا؟ پچھلے دنوں سعودی عرب میں ایک شخص، ایک پاکستانی کو قتل کرکے سزا سے بچ گیا، کیونکہ مقتول کے اہل خانہ نے کافی دینار لے کر قاتل کو معاف کردیا تھا۔ اس قانون کے نتیجے میں صرف وہ قاتل سزا پاتا ہے، جس کے پاس قصاص کے نام پر دینے کو کچھ نہ ہو۔ پاکستان ہی کی مثال لے لیں، قیام سے لے کر اب تک، باحیثیت افراد میں سے صرف گنتی کے چند اشخاص کو قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا ملی، وہ بھی اس وجہ سے کہ مقتول کے ورثا قاتل کی نسبت کہیں زیادہ دولت مند تھے۔ لہٰذا انھوں نے خون بہا کی پیشکش ٹھکرادی۔ اس قانون کا افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ جب کوئی باحیثیت شخص کسی کا قتل کردیتا ہے تو قاتل کے اہل وعیال ورشتہ دار، مقتول کے ورثا پر طرح طرح سے دباؤ ڈالتے ہیں اور دھمکیاں دیتے ہیں، جس پر ورثا قاتل کو معاف کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ کیا حضرت محمد نے اس قانون کو وضع کرکے ایک امیر شخص کو براہ راست ''قتل کا لائسنس'' جاری نہیں کیا؟

۱۳:- اور اسی طرح کے بے شمار سوالات میرے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ کیا ان کے

بارے میں پوچھنا توہین رسالت کے زمرے میں آتا ہے؟

۱۴:- جو حضرات ''ہاں'' کہیں گے، ان سے صرف یہی عرض کرسکتا ہوں کہ حضرت محمد جب ایک رات میں ساتوں آسمانوں کی سیر کرسکتے ہیں، چاند کو دو ٹکڑے کرسکتے ہیں، اتنے بڑے مذہب کے بانی اور خدا کے سب سے قریبی نبی ہیں، تو کیا وہ خود مجھے ان سوالات کی پاداش میں مناسب سزا نہیں دے سکتے؟ اگر ہاں! تو اے میرے مسلمان بھائیو! مجھ پر اور میری طرح کے دیگر انسان مسلمانوں پر رحم کرو اور حضرت محمد کو موقع دو، کہ وہ خود ہی ہمارے لئے کچھ نہ کچھ مناسب سزا تجویز فرمادیں گے۔

۱۵:- یاد رکھو! ایک مسلمان کا خون دوسرے پر حرام ہے اور کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ ایک مسلمان کو صرف اس کی سوچ اور عقائد کی بنا پر کافر قرار دیدے۔ یہ تو تھا اسلامی فرمان، اب ایک انسانی فرمان بھی سن لیں کہ ''دنیا کے کسی بھی مذہب سے کہیں زیادہ انسانی جان قیمتی ہے۔''

وماعلینا الاالبلاغ۔''

اس غلاظت نامہ کی خواندگی کے بعد ایک سچے مسلمان اور عاشق رسول کے دل کی کیا کیفیت ہوگی؟ ہر مسلمان اس کا بخوبی اندازہ لگاسکتا ہے!!! تاہم مسلمانوں کو اس سے پریشان نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ سانپ کا کام ڈسنا اور بچھو کی سرشت ڈنک مارنا ہی ہے۔ اسلئے جو لوگ قادیانی کفر سے آشنا ہیں، ان کو یقیناً اس پر کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا ہوگا۔ ہاں! البتہ جو لوگ قادیانیت کے بارہ میں کسی غلط فہمی کا شکار تھے یا وہ قادیانیت کو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ نتھی کرنے کی غلطی کے مرتکب تھے، بلاشبہ ان کو اس تحریر سے اپنی غلط فہمی کا شدید احساس ہوا ہوگا، بلکہ بدترین دھچکا لگا ہوگا!!!۔

اگرچہ قادیانی سوالات شروع میں یک جا آگئے ہیں، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر جواب سے پہلے متعلقہ سوال نقل کرکے اس کا جواب درج کیا جائے تاکہ سوال و جواب دونوں قاری کے ذہن میں مستحضر رہیں۔ چنانچہ اس سوال نامہ کا پہلا سوال تھا:

سوال (۱) ''لوگوں کی راہنمائی اور ہدایت کی ضرورت صدیوں رہی اور اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں پیغمبر بھیجے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ ایک لاکھ تیس ہزار پیغمبر بھیجنے کے بعد حضرت محمد ہی پر نبوت ختم کردی گئی؟ کیا بعد میں آنے والی صدیوں میں لوگوں کو ہدایت و راہنمائی کی ضرورت نہیں تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ حضرت محمد نے رہتی دنیا تک اپنی اہمیت برقرار رکھنے کے لئے خود ہی آخری نبی ہونے کا دعویٰ کردیا ہو؟''

جواب: یہ قادیانیوں کا پرانا اور گھسا پٹا سوال ہے اور اس کا متعدد اکابر نے مختلف انداز میں جواب دیا ہے، مگر جس کو نہ ماننا ہو، اس کا اشکال کبھی بھی ختم نہیں ہوسکتا۔ تاہم اس سلسلہ میں عرض ہے کہ:

بلاشبہ ہر دور میں امت کو ہدایت و رہنمائی کی ضرورت رہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے امت کی راہنمائی کے لئے نبی بھی بھیجے، اور جب تک امت کو نبی کی راہنمائی کی ضرورت رہی، اللہ تعالیٰ یکے بعد دیگرے نبی بھیجتے رہے، لیکن جوں ہی نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کو ختم نبوت کے اعزاز سے سرفراز فرمایا گیا اور کسی دوسرے نبی کی ضرورت نہ رہی، تو اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا کہ اب مزید کسی دوسرے شخص کو نبی نہیں بنایا جائے گا، اور ارشاد فرمایا کہ:

''ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللّٰہ وخاتم النبیین وکان اللّٰہ بکل شیء علیماً'' (الاحزاب:۴۰)

ترجمہ: ''محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن اللہ کے رسول ہیں، اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔''

اس ارشاد الٰہی سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی ختم نبوت کا اعلان حضرت محمد ﷺ نے از خود نہیں فرمایا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے بہ نفس نفیس اس کا اعلان فرمایا ہے، اس لئے قادیانیوں کا یہ کہنا کہ: ''کہیں ایسا تو نہیں کہ حضرت محمد نے رہتی دنیا تک اپنی اہمیت برقرار رکھنے کے لئے خود ہی آخری نبی ہونے کا دعویٰ کردیا ہو؟'' سراسر ہرزہ سرائی اور آنحضرت ﷺ کی ذات عالی پر بہتان وافتراء ہے۔

صرف یہی ایک آیت نہیں، بلکہ قریب قریب ایک سو سے زائد آیات میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی ختم نبوت کا اعلان فرمایا ہے، ملاحظہ ہو ''ختم نبوت کامل'' مولفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ۔

رہی یہ بات کہ اب کسی دوسرے نبی کی ضرورت کیوں نہیں رہی؟ اور آپ ﷺ کو آخری نبی کیوں قرار دیا گیا؟ اس کا جواب بھی اللہ تعالیٰ نے اسی آیت میں خود ارشاد فرمادیا کہ: اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کی ضرورت و عدم ضرورت کی حکمت کو خوب جانتے ہیں، اس پر کسی کو لب کشائی کی اجازت نہیں، لہٰذا اب قادیانیوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے براہ راست پوچھیں، اس کی قوت قاہرہ کی آہنی دیوار سے سر پھوڑیں اور احتجاج کریں کہ آپ نے حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی کیوں قرار دیا؟

الغرض قادیانیوں کا یہ اعتراض مسلمانوں یا حضرت محمد ﷺ کی ذات پر نہیں، بلکہ براہ

راست قرآن کریم اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے۔

چلئے! اگر ایک لمحہ کے لئے قادیانیوں کا یہ سوال صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے، تو کیا کل کسی کو اس کا حق بھی ہوگا کہ وہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے پہلے اور نوح، شیث، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بعد میں کیوں مبعوث فرمایا؟ اسی طرح کیا نعوذ باللہ! کسی کو یہ کہنے کا حق بھی ہوگا؟ کہ:

''کہیں ایسا تو نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے رہتی دنیا تک اپنی اہمیت برقرار رکھنے کیلئے خود ہی اللہ کے خلیفہ اور انسانیت کے باپ ہونے کا دعویٰ کردیا ہو؟''

اگر کسی کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی... اور یقیناً نہیں دی جاسکتی... تو کسی کو حضور ﷺ کی ختم نبوت کے خلاف لب کشائی کی اجازت کیونکر دی جاسکتی ہے؟ قادیانیو! اگر ہمت ہے تو اس کا جواب دو، ورنہ اس ہرزہ سرائی کے بعد کھلا اعلان کرو کہ ہمارا قرآن، حدیث، اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان نہیں ہے۔

(۲) نئے نبی، نئی شریعت اور نئی کتاب کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے، جب پہلے نبی کی نبوت، دین، شریعت اور کتاب منسوخ ہوجائے، جبکہ حضرت محمد ﷺ کا دین، کتاب، نبوت اور شریعت قیامت تک کے لئے ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:

۱- "الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا." (المائدہ:۳)

ترجمہ: ''آج میں پورا کرچکا تمہارے لئے دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین۔''

۲- "انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون" (الحجر:۹)

ترجمہ: ''ہم نے ہی اتاری ہے یہ نصیحت اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔''

۳- "وما ارسلناك الا رحمة للعالمین" (الانبیاء:۱۰۷)

ترجمہ: ''اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کرکر جہان کے لوگوں پر۔''

۴- "یا ایها الناس انی رسول الله الیکم جمیعا." (الاعراف:۱۵۸)

ترجمہ: ''اے لوگو! میں رسول ہوں اللہ کا تم سب کی طرف۔''

۵- "وما ارسلناك الا کافة للناس بشیرًا و نذیرًا." (سبا:۲۸)

ترجمہ: ''اور جو تجھ کو ہم نے بھیجا سو سارے لوگوں کے واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو۔''

۶- "ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه" (آل عمران:۸۵)

ترجمہ: ''اور جو کوئی چاہے سوا دین اسلام کے اور کوئی دین، سو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا۔''

ان تمام آیات میں جب آنحضرت ﷺ کے دین وشریعت کو مدار نجات، آپ ﷺ پر نازل کی گئی کتاب کی قیامت تک حفاظت وصیانت، آپ ﷺ کی ذات کو قیامت تک کے تمام انسانوں کے لئے رحمت اور آپ ﷺ کو سب انسانوں کے لئے نبی، رسول، بشیر اور نذیر بنا کر بھیجے جانے کا اعلان فرمایا گیا، تو معلوم ہوا کہ جس طرح امت کو صدیوں سے نبی ورسول کی ہدایت وراہنمائی کی ضرورت تھی، آج بھی برقرار رہے اور اس کا انتظام بھی اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی نبوت، رسالت، دین، شریعت اور کلام الٰہی یعنی قرآن پاک کی شکل میں فرما رکھا ہے۔

(۳) اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ پہلے انبیاء اور ان کی شریعتوں کی مثال چراغ کی تھی اور آنحضرت ﷺ کی نبوت وشریعت کی مثال سورج کی ہے اور جب سورج نکل آتا ہے تو نہ صرف یہ کہ سارے چراغ بے نور ہوجاتے ہیں، بلکہ ان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، لہٰذا اگر سورج نکلنے کے بعد کوئی ''عقل مند'' یہ کہے کہ اب چراغ کیوں نہیں جلائے جاتے؟ اور انسانیت کی راہنمائی کیلئے چراغوں سے روشنی کیوں نہیں حاصل کی جاتی؟ اور سورج کی موجودگی میں چراغوں سے روشنی حاصل نہ کرنا انسانیت کو روشنی سے محروم رکھنے کی سازش کے مترادف ہے، بتلایا جائے کہ ایسے ''عقل مند'' کو کیا نام دیا جائے گا؟ اور اس شخص کے اس ''حکیمانہ مشورہ'' کو مانا جائے گا؟ یا اسے کسی دماغی ہسپتال میں داخل کیا جائے گا؟

(۴) ایک لمحہ کے لئے اگر قادیانی بزرجمہروں کی اس برخود غلط ''دل سوزی'' کو مان بھی لیا جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ اگر واقعی اس کی ضرورت تھی؟ تو آنحضرت ﷺ کے بعد کی تیرہ صدیاں اس سے خالی کیوں گزریں؟ اور اس طویل ترین دور میں امت کو نئے نبی کی ضرورت کیوں محسوس نہیں ہوئی؟ اسی طرح پھر مرزا غلام احمد قادیانی کے بعد قادیانی امت کو اس ''خیر'' سے کیوں محروم رکھا گیا؟ اور قادیانیوں کو غلام احمد قادیانی کے بعد کسی نئے نبی کی ضرورت کیوں محسوس نہ ہوئی؟

(۵) اگر انسانیت کی راہنمائی کیلئے نبوت کی ضرورت تھی، تو نئی نبوت کے ساتھ ساتھ نئی شریعت کی ضرورت کیوں محسوس نہ کی گئی؟ اس لئے اگر نبوت وشریعت کی ضرورت تھی، تو پھر چشم بددور مرزا غلام احمد قادیانی نے ظلّی اور بروزی نبی ہونے کا دعویٰ کیوں کیا؟ کھل کر صاحب شریعت ہونے کا دعویٰ کیوں نہ کیا؟ هاتوا برهانکم ان کنتم صادقین.

سوال (۲) ''جب حضرت محمد اور ان کے پیروکار اپنا آبائی مذہب تبدیل کرکے مسلمان

ہوسکتے ہیں تو ایک مسلمان کیوں اپنا مذہب تبدیل نہیں کرسکتا؟ دوسرا مذہب اختیار کرنے پر اسے مرتد قرار دے کر اس کے قتل کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟ کیا اس حکم سے یہ تاثر نہیں ملتا کہ مذہبی تبدیلی کی اجازت دینے سے حضرت کو مسلمانوں کی تعداد میں کمی کا خدشہ تھا، کیا یہ حکم اس امر کا غماز نہیں ہے کہ حضرت نے مذہب کے فروغ کے لئے ''اسلام بذریعہ تبلیغ'' کے بجائے ''خاندانی یا موروثی اسلام'' کو ترجیح دی، کیونکہ بذریعہ آبادی اسلام پھیلانے کا یہ سب سے آسان اور موثر فارمولا تھا، جیسے جیسے آبادی بڑھے گی، مسلمان خود بخود بڑھتے چلے جائیں گے، جو تبدیلی چاہے، اسے قتل کردیا جائے، کیا یہ انصاف کے تقاضوں کے منافی نہیں؟''

جواب: دین ومذہب کی تبدیلی پر سزائے ارتداد کے اسلامی قانون پر اگر کسی کو بالفرض اعتراض کا حق ہوتا تو اس کے حق دار وہ لوگ تھے جو کسی آسمانی دین ومذہب کے پیروکار ہوتے؟ یا ان کے دین ومذہب کی کوئی اساس وبنیاد ہوتی، جیسے یہود ونصاریٰ وغیرہ۔ رہے وہ لوگ جن کے دین ومذہب کی کوئی اساس وبنیاد ہی نہیں؛ بلکہ ان کا وجود ہی برخود غلط ہے، ان کو اس بحث میں حصہ لینے یا اس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟

۲- کیا کسی ملک کی قانون ساز اسمبلی اور عوام کے نمائندہ ایوان کی جانب سے جارح اقوام، افراد، چوروں اور ڈاکوؤں کے خلاف قانون سازی پر، چوروں اور ڈاکوؤں یا جارح اقوام کو یہ حق دیا جائے گا کہ وہ یہ اعتراض کریں کہ ہمارے خلاف قانون کیوں بنایا گیا ہے؟ اور ہماری آزادی پر قدغن کیوں لگائی گئی ہے؟ یا اسی طرح ملک کے اُچکوں، بدمعاشوں اور سماج دشمنوں کو یہ حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ ہماری چوری، بدمعاشی اور ڈاکازنی پر سزا کا قانون پاس ہوا ہے تو چوری، ڈکیتی اور بدمعاشی سے توبہ کرنے والوں کے خلاف بھی سزا کا قانون بنایا جائے؟ لہٰذا جس طرح جارح اقوام، چوروں، ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کو، ان کی بدمعاشی اور بدامنی کے خلاف قانون سازی پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، ٹھیک اسی طرح سارقین نبوت، مرتدوں اور زندیقوں کے خلاف قانون ارتداد کی ترتیب ونفاذ پر، ان مرتدین کو بھی دین ودیانت اور عقل وشریعت کی رو سے کسی قسم کے اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے، بلکہ انکا تحفظ، چوروں، بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کے تحفظ کے مترادف، اور ان کی سرکوبی بدمعاشوں کی سرکوبی کی مانند ہے۔

۳- جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہودی اور عیسائی اپنا مذہب بدل کر مسلمان ہوں تو ان پر سزائے ارتداد کا اجرا نہیں ہوتا، تو... نعوذ باللہ! مسلمانوں کے مرتد ہوکر یہودی، عیسائی یا کسی دوسرے دین کو اپنانے پر یہ سزا کیونکر جاری ہوتی ہے؟ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ:

(الف) بائبل میں بھی مرتد ہونے والے کی سزا قتل ہی ہے، چنانچہ خروج: باب ۲۲، آیت: ۲۰ میں ہے: ''جو کوئی واحد خداوند کو چھوڑ کر کسی اور معبود کے آگے قربانی چڑھائے وہ بالکل نابود کردیا جائے۔''

(ب) جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ یہودی، عیسائی یا دوسرے مذاہب کے لوگ اپنا مذہب بدلیں تو ان پر سزائے ارتداد کیوں جاری نہیں کی جاتی؟ اصولی طور پر ہم اس سوال کا جواب دینے کے مکلّف نہیں ہیں، بلکہ ان مذاہب کے ذمہ داروں، بلکہ ٹھیکے داروں کا فرض ہے کہ وہ اس کا جواب دیں۔

تاہم قطع نظر اس کے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ طرزِ عمل صحیح ہے یا غلط؟... اتنی بات تو سب کو معلوم ہے کہ دنیائے عیسائیت... یہودیت بھی اپنے باطل ومنسوخ شدہ دین کے بارہ میں شدید تعصب کا شکار ہے، اس لئے کہ اگر وہ اپنے دین ومذہب کے معاملہ میں تنگ نظر اور متعصب نہ ہوتی تو آج دنیا بھر کے مسلمان اور امت مسلمہ، ان کے ظلم وتشدد کا نشانہ کیوں ہوتی؟

اس سے ذرا اور آگے بڑھئے! تو یہودیت کے تعصب کا اس سے بھی اندازہ ہوگا کہ انبیائے بنی اسرائیل کا قتل ناحق، ان کی اسی تنگ نظری کا شاخسانہ اور تشدد پسندی کا منہ بولتا ثبوت ہے، ورنہ بتلایا جائے کہ حضراتِ انبیائے کرامؑ کا اس کے علاوہ کون سا جرم تھا؟ صرف یہی ناں کہ وہ فرماتے تھے کہ پہلا دین وشریعت اور کتاب منسوخ ہوگئی ہے اور اب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے ذریعہ نیا دین اور نئی شریعت آچکی ہے اور اسی میں انسانیت کی نجات اور فوز وفلاح ہے۔

اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں کے ذمہ قرض ہے، وہ بتلائیں کہ حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہما السلام کو کیوں قتل کیا گیا؟ آخر ان معصوموں کا کیا جرم تھا؟ اور کس جرم کی پاداش میں ان کا پاک وپاکیزہ اور مقدس لہو بہایا گیا؟

اس کے علاوہ یہ بھی بتلایا جائے کہ حضرت عیسیٰ روح اللہ کے قتل اور ان کے سولی پر چڑھائے جانے کے منصوبے کیوں بنائے گئے؟

مسلمانوں کو تنگ نظر اور سزائے ارتداد کو ظلم کہنے والے پہلے ذرا اپنے دامن سے حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام اور لاکھوں مسلمانوں کے خونِ ناحق کے دھبے صاف کریں اور پھر مسلمانوں سے بات کریں۔

(ج) یہ تو طے شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانیت کی ہدایت وراہنمائی کے لئے حضراتِ انبیائے کرامؑ اور رسلؑ بھیجنے کا سلسلہ شروع فرمایا، جس کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی تو اس کی

انتہا، تکمیل اور اختتام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات پر ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ ان تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے دین وشریعت اور کتب کی کیفیت یکساں تھی یا مختلف؟

اگر بالفرض تمام انبیائے کرام کی شریعتیں ابدی وسرمدی تھیں، تو ایک نبی کے بعد دوسرے نبی اور ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟

مثلاً: اگر حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت ابدی وسرمدی تھی اور اس پر عمل نجاتِ آخرت کا ذریعہ تھا تو اس وقت سے لے کر آج تک تمام انسانوں کو حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت کا تابع ہونا چاہئے تھا، اگر ایسا ہے تو پھر یہودیت وعیسائیت کہاں سے آگئی؟

لیکن اگر بعد میں آنے والے دین، شریعت، کتاب اور نبی کی تشریف آوری سے، پہلے نبی کی شریعت اور کتاب منسوخ ہوگئی تھی... جیسا کہ حقیقت بھی یہی ہے... تو دوسرے نبی کی شریعت اور کتاب کے آجانے کے بعد سابقہ شریعت اور نبی کی اتباع پر اصرار وتکرار کیوں؟

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جب دوسرا نبی، شریعت اور کتاب آجائے اور پہلا دین، شریعت اور کتاب منسوخ ہوجائے، تو اس منسوخ شدہ دین، شریعت، کتاب اور نبی کے احکام پر عمل کرنا یا اس پر اصرار کرنا خود بہت بڑا جرم اور اللہ تعالیٰ سے بغاوت کے مترادف ہے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی ملک کے قانون میں ترمیم کردی جائے یا اس کو سرے سے منسوخ کردیا جائے اور اس کی جگہ دوسرا جدید آئین وقانون نافذ کردیا جائے، اب اگر کوئی عقلمند اس نئے آئین وقانون کے بجائے منسوخ شدہ دستور وقانون پر عمل کرتے ہوئے نئے قانون کی مخالفت کرے، تو اسے قانون شکن کہا جائے گا یا قانون کا محافظ وپاسبان؟

لہٰذا اگر کسی ملک کا سربراہ ایسے عقل مند کو رائج ونافذ جدید آئین وقانون کی مخالفت اور اس سے بغاوت کی پاداش میں باغی قرار دے کر بغاوت کی سزا دے، تو اس کا یہ فعل ظلم وتعدی ہوگا؟ یا عدل وانصاف؟ کیا ایسے موقع پر کسی عقل مند کو یہ کہنے کا جواز ہوگا کہ اگر جدید آئین وقانون کو چھوڑنا بغاوت ہے تو منسوخ شدہ آئین وقانون کو چھوڑنا کیونکر بغاوت نہیں؟ اگر جدید آئین سے بغاوت کی سزا موت ہے تو قدیم ومنسوخ شدہ آئین کی مخالفت پر سزائے موت کیونکر نہیں؟

(د) جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ گزشتہ انبیائے کرام علیہم السلام کے ادیان اور ان کی شریعتیں منسوخ ہوچکی ہیں، اس سلسلہ میں گزشتہ سطور میں عقلی طور پر ثابت کیا جاچکا ہے کہ سابقہ انبیاء کی شریعتوں پر عمل باعث نجات نہیں، ورنہ نئے دین، نئی شریعت اور نئے نبی کی ضرورت ہی

کیوں پیش آتی؟ تاہم سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام میں سے ہر ایک نے اپنے بعد آنے والے دین وشریعت اور نبی کی آمد سے متعلق اپنی امت کو بشارت دی ہے اور ان کی اتباع کی تلقین بھی فرمائی ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

”واذ اخذ اللّٰہ میثاق النبیین لما آتیتکم من کتاب وحکمة ثم جاء کم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن به ولتنصرنه.“ (آل عمران:۸۱)

ترجمہ: ”اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم، پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتاوے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤگے اور اس کی مدد کروگے۔“

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت انجیل کے علاوہ خود قرآن کریم میں بھی موجود ہے کہ:

”ومبشرًا برسول یأتی من بعدی اسمه احمد.“ (الصف:۶)

ترجمہ: ”اور خوشخبری سنانے والا ایک رسول کی جو آئے گا میرے بعد، اس کا نام ہے احمد“

اسی طرح بائبل میں استثنا، باب:۱۸، میں ہے:

”خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا۔“

اسی طرح اسی باب میں مزید ہے:

”اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں، میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔“ (استثنا، باب:۱۸، آیت:۱۷، ۱۸)

چنانچہ سابقہ انبیائے کرام میں سے کسی نے یہ نہیں فرمایا کہ میری نبوت اور دین وشریعت قیامت تک کے لئے ہے اور میں قیامت تک کا نبی ہوں، دنیائے یہودیت وعیسائیت کو ہمارا چیلنج ہے کہ اگر کسی نبی نے ایسا فرمایا ہے، تو اس کا ثبوت لاؤ: ”قل هاتو برهانکم ان کنتم صادقین“ ہمارا دعویٰ ہے کہ صبح قیامت تک کوئی یہودی اور عیسائی اس کا ثبوت پیش نہیں کرسکے گا۔

جب کہ اس کے مقابلہ میں آقائے دوعالم حضرت محمد ﷺ کو قیامت تک کے تمام انسانوں کیلئے نبی بنا کر بھیجا گیا اور آپ ﷺ کا آخری نبی اور خاتم النبیین فرمایا گیا، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

۱- ”قل یا ایها الناس انی رسول اللّٰه الیکم جمیعًا“ (الاعراف:۱۵۸)

ترجمہ: ''تو کہہ: اے لوگو! میں رسول ہوں اللہ کا تم سب کی طرف۔''

۲- ''وما ارسلناك الا رحمة للعالمين'' (الانبیاء:۱۰۷)

ترجمہ: ''اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کرکر جہان کے لوگوں پر۔''

۳- ''ما كان محمد ابا احد من رجالكم ولكن رسول الله وخاتم النبيين'' (الاحزاب:۴۰)

ترجمہ: ''محمد باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں میں سے، لیکن رسول ہے اللہ کا اور خاتم النّبیین''

۴- ''وما ارسلناك الا كافة للناس بشيرًا ونذيرًا.'' (سبا:۲۸)

ترجمہ: ''اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا، سو سارے لوگوں کے واسطے خوشی اور ڈر سنانے کو۔''

اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے خود بھی فرمایا:

۱- ''انا خاتم النبيين لا نبي بعدي.'' (ترمذی، ج:۲،ص:۴۵)

ترجمہ: ''میں خاتم النّبیین ہوں، میرے بعد کوئی کسی قسم کا نبی نہیں۔''

۲- ''انا آخر الانبياء وانتم آخر الامم.'' (ابن ماجہ،ص:۲۹۷)

ترجمہ: ''میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔''

۳- ''لو كان موسىٰ حيًا ما وسعه الا اتباعي.'' (مشکوٰۃ،ص:۳۰)

ترجمہ: ''اگر موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری پیروی کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔''

اب جب کہ قرآن کریم نازل ہو چکا اور حضرت محمد ﷺ تشریف لے آئے، تو ثابت ہوا کہ آپ ﷺ، اللہ کے آخری نبی ہیں اور قرآن کریم اللہ کی آخری کتاب ہے، لہٰذا آپ ﷺ کے دین وشریعت کا سکہ قیامت تک چلے گا، اس لئے جو شخص اس جدید ورائج قانون اور آئین الٰہی کی مخالفت کرے گا اور سابقہ منسوخ شدہ دین وشریعت یا کسی خودساختہ مذہب، جیسے موجودہ دور کے متعدد باطل وبے بنیاد ادیان ومذاہب... مثلاً: ہندو، پارسی، سکھ، ذکری، زرتشتی اور قادیانی وغیرہ... میں سے کسی کا اتباع کرے گا، وہ باغی کہلائے گا۔ دین وشریعت، قرآن وسنت اور عقل ودیانت کی روشنی میں اس کی سزا وہی ہوگی جو ایک باغی کی ہونی چاہیے، اور وہ قتل ہے۔

اسی لئے قانونِ ارتداد پر قادیانیوں کی طرف سے یہ اعتراض خالص دجل وفریب اور دھوکا ہے کہ:

''کیا اس حکم سے یہ تاثر نہیں ملتا کہ تبدیلی مذہب کی اجازت دینے سے حضرت کو مسلمانوں کی تعداد میں کمی کا خدشہ تھا، حضرت نے مذہب کے فروغ کے لئے اور اسلام بذریعہ تبلیغ کے بجائے خاندانی یا موروثی اسلام کو ترجیح دی، کیونکہ بذریعہ آبادی اسلام پھیلانے کا یہ سب سے آسان اور موثر فارمولا تھا، جیسے جیسے آبادی بڑھے گی، مسلمان خود بخود بڑھتے چلے جائیں گے، جو تبدیلی چاہے اسے قتل کردیا جائے۔''

کیونکہ یہ قانون مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے لئے نہیں، بلکہ اسلام دشمنوں کی راہ روکنے کیلئے ہے، اسلئے کہ کسی ملک میں انسداد بغاوت اور جرائم کی روک تھام کا قانون کسی ملک کے شریف شہریوں کے خلاف نہیں، بلکہ بدمعاشی کی روک تھام کے لئے وضع کیا جاتا ہے۔

اگر قادیانی فلسفہ کو تسلیم کرلیا جائے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ کسی جرم کی روک تھام پر قدغن لگانا یا اس پر کڑی سزاؤں کا نفاذ، اس کی علامت ہے کہ اس ملک کے شریف شہریوں کے بدمعاش اور جرائم پیشہ ہونے کے خوف سے وہ قوانین نافذ کئے گئے ہیں؟ حالانکہ مہذب دنیا میں کہیں ایسا نہیں ہوتا، بلکہ ہر نیک دل حکمراں اور شفیق باپ اپنی رعایا اور اولاد کو برائی کے نتائج سے آگاہ کرتا ہے، بعض اوقات ازراہ خیرخواہی ان کو سزا بھی دیتا ہے اور معاشرہ کے بدکرداروں کے خلاف قانون سازی کرتا ہے اور اس کی خلاف ورزی پر سخت سے سخت تدبیر کرتا ہے۔

اس سے ذرا مزید آگے بڑھئے تو اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی کفر وشرک پر عذاب وعقاب اور جہنم کی شدید سزا کا قانون مرتب فرمارکھا ہے، کیا نعوذ باللہ! اللہ تعالیٰ کو بھی اپنے ماننے والوں کی تعداد میں کمی کا اندیشہ تھا؟ اور اس نے بھی ان کی تعداد بڑھانے کیلئے اس فارمولا کو ترجیح دی ہے؟ اور بذریعہ آبادی اپنے ماننے والوں کی تعداد بڑھانے کے آسان اور موثر فارمولا پر عمل کیا ہے؟ کہ جیسے جیسے آبادی بڑھے گی، اللہ تعالیٰ کے ماننے والے خود بخود بڑھتے چلے جائیں گے؟ بتلایا جائے کہ کیا ایسا کہنا عقل ودیانت کے مطابق ہے؟ قانون ارتداد پر اعتراض کرنے والوں کو سوچنا چاہئے کہ ان کا یہ اعتراض کہاں تک جاتا ہے؟

دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں سرے سے جرم وسزا کا کوئی قانون ہی نافذ نہیں ہونا چاہئے، اگر ایسا ہو تو کیا اس سے معاشرہ انارکی، طوائف الملوکی، انتشار، تشدد اور بدامنی کی لپیٹ میں نہیں آجائے گا؟ جو لوگ ایسا مطالبہ کریں، کیا سمجھا جائے کہ وہ انسانیت کے دوست ہیں یا دشمن؟

سوال (۳) ''حضرت محمد نے اپنے خاندان یعنی آلِ رسول کو زکوٰۃ کی رقم دینے سے

کیوں منع کیا ہے؟ کیا اس سے خاندانی بڑائی اور تکبر کی نشاندہی نہیں ہوتی؟ کیا رسول کا خاندان افضل اور باقی سب کمتر ہیں؟ بحیثیت انسان میں خاندانی افضلیت یا بڑائی تسلیم نہیں کرتا۔ خود حضرت محمد کا قول ہے کہ تم میں افضل وہ ہے جس کے اعمال اچھے ہیں، تو پھر یہ قول ان کے اپنے خاندان پر کیوں لاگو نہیں ہوتا؟''

جواب: عدل وانصاف کا تقاضا ہے کہ اگر کسی کٹر سے کٹر مخالف میں بھی کوئی خوبی اور کمال نظر آئے، تو اس کا اعتراف کرنا چاہئے، مگر باطل پرستوں کے ہاں اس کے برعکس یہ اصول ہے کہ جب کسی سے برخاش، بغض، عداوت یا دلی نفرت ہو، تو انہیں اس کی خوبیوں میں بھی سو، سو نقائص نظر آتے ہیں اور نہ صرف اس کے محاسن وخوبیوں کو نقائص ومعائب بنا کر پیش کیا جاتا ہے، بلکہ ان پر حرف گیری کی جاتی ہے۔ قادیانیوں کے مذکورہ اعتراض میں بھی ذات نبوی ﷺ سے بغض وعداوت کا یہی فلسفہ کارفرما ہے۔

ورنہ اگر دیکھا جائے تو آنحضرت ﷺ نے اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لئے زکوٰۃ و صدقات کو حرام قرار دے کر جہاں امت کے غرباء اور فقراء پر احسان فرمایا ہے، وہاں اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لئے تنگی اور مشکلات پیدا فرمائی ہیں، اس لئے کہ:

۱- زکوٰۃ تو ہر صاحب نصاب مسلمان پر واجب ہے اور اس کی ادائیگی اس کے ذمہ فرض ہے، اگر زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے خاندان کے لئے حلال ہوتے تو ہر مسلمان کی خواہش ہوتی کہ میری زکوٰۃ سیّد دوعالم ﷺ، آپ کے خاندان اور آل واطہار کے مصرف میں آئے، اس سے ذات نبوی ﷺ اور آپ کا خاندان تو آسودہ حال ہوسکتا تھا، مگر اس کے ساتھ، ساتھ مسلمان غرباء اور فقراء مالی تنگی اور تنگ دستی کا شکار ہوجاتے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے اپنی ذات، آل، اولاد اور خاندان کے مفادات کی قربانی دی اور اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو مشقت میں ڈال کر امتِ مسلمہ کے غرباء اور فقراء کے منافع کو پیش نظر رکھا۔

۲- اسی طرح آپ ﷺ نے اپنے لئے اور اپنی آل واطہار کے لئے ہدیہ وعطیہ قبول کرنے میں بھی اپنی ذات اور اپنے خاندان کے مالی منافع کو مزید محدود فرمادیا ہے، کیونکہ ہدایہ وعطیہ دینے کی نہ تو ہر مسلمان میں استعداد واستطاعت ہوتی ہے اور نہ ہی ہر کسی کو اسکا ذوق ہوتا ہے۔ نتیجتاً آپ ﷺ کا خاندان مالی تنگی اور عسر کے ساتھ ساتھ زہد وتکشف کا خوگر رہے گا، اور یہی آنحضرت ﷺ کی خواہش اور دلی دعا تھی، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ اس کی دعا فرمائی کہ:

"اللّٰھم اجعل رزق آل محمد قوتاً، متفق علیہ" (مشکوٰۃ ص:۴۴۰)

ترجمہ: ''اے اللہ! میرے خاندان کا رزق بقدر کفایت ہو۔''

۳- دیکھا جائے تو آنحضرت ﷺ کا اپنی ذات اور اپنے خاندان کے لئے زکوٰۃ وصدقات کو حرام قرار دینے کا راز یہ تھا کہ اگر آپ ﷺ خود اپنی ذات یا اپنے خاندان کے لئے صدقات و زکوٰۃ لینا حلال قرار دیتے، تو احتمال تھا کہ اسلام دشمن اور قادیانیوں جیسے ملاحدہ وغیرہ یہ اعتراض کرتے کہ حضرت محمد ﷺ نے ...نعوذ باللہ!... زکوٰۃ وصدقات کا حکم اپنی ذات اور اپنے خاندان کی مالی آسودگی کے لئے دیا ہے، جب ہی تو ...نعوذ باللہ!... وہ زکوٰۃ پر پل رہے ہیں۔

اسی حکمت کے تحت آنحضرت ﷺ نے زکوٰۃ کے مصرف کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"توخذ من اغنیائھم و ترد فی فقراء ھم" (ابوداؤد، ص:۲۳، ج:۱)

ترجمہ: ''(مالِ زکوٰۃ) ان کے اغنیاء سے لے کر ان کے فقراء پر خرچ کیا جائے۔''

چنانچہ اس حکم سے آپ ﷺ نے اس اعتراض وبدگمانی کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند کردیا اور واضح کردیا کہ زکوٰۃ وصدقات کے اجراء سے مقصود اپنی ذات یا خاندان کی معاشی آسودگی نہیں؛ بلکہ ان کے فوائد ومنافع، زکوٰۃ وصدقات دینے والے مسلمانوں کے غریب وفقیر متعلقین ہی کی طرف لوٹائے جائیں۔

۴- چونکہ جو لوگ بلاضرورت مانگ کر یا زکوٰۃ وصدقات پر زندگی گزارنے کے عادی ہوجاتے ہیں، عموماً ان میں تقویٰ، طہارت، حمیت، غیرت، شجاعت اور دوسرے اخلاق فاضلہ برقرار نہیں رہتے یا کم از کم کمزور پڑ جاتے ہیں، اور عام مشاہدہ بھی یہی ہے کہ عام طور پر ایسے لوگوں کی ہمتیں پست ہوجاتی ہیں، وہ محنت، مشقت اور کسبِ مال سے جی چراتے ہیں، عیش کوشی، راحت پسندی اور آرام طلبی ان کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے، سستی وکاہلی ان کے رگ وریشہ میں سرایت کرجاتی ہے جس کی وجہ سے ایسے لوگ معاشرہ میں بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ اس لئے اندیشہ تھا کہ کہیں خاندانِ نبوت کے دشمن اس کو آڑ بنا کر ذاتِ نبویؐ کے خلاف زبان طعن کھول کر اپنی دنیا وآخرت نہ برباد کر بیٹھیں۔

انسانوں کے دین وایمان کی بربادی کے اسی خطرہ کے پیشِ نظر آنحضرت ﷺ نے اپنی آل واطہار اور خاندان کے لئے زکوٰۃ وصدقات کو حرام قرار دے کر اپنی آل، اولاد اور خاندان پر معاشی وسعت کے دروازے بند کرکے ایک طرف ان کیلئے معاشی تنگی پیدا کی تو دوسری طرف بہت سوں کے ایمان واسلام کو بربادی سے بچالیا۔

۵- پھر اس کا بھی امکان تھا کہ کہیں میرا خاندان محض قرابت نبوی کی وجہ سے لوگوں کی زکوٰۃ

وصدقات کو اپنا حق نہ سمجھ بیٹھے، یا کہیں اس کی نگاہ لوگوں کے مال زکوٰۃ وصدقات پر ہی نہ ٹک جائے، اس لئے زکوٰۃ وصدقات کو سرے سے ان پر حرام قرار دے دیا گیا۔

۶- اس کے علاوہ عین ممکن ہے کہ خاندانِ نبوت پر زکوٰۃ وصدقات حرام قرار دینے کی یہ حکمت ہو کہ میرا خاندان ذلیل دنیا اور معمولی رزق کی خاطر مسلمانوں کی نگاہ میں ذلیل وخوار نہ ہوجائے، یا لوگوں کی زکوٰۃ وصدقات پر تکیہ کرکے حصولِ رزق میں کاہل وسست نہ پڑ جائے، اس لئے آپ ﷺ نے ان پر زکوٰۃ وصدقات کو حرام قرار دے کر انہیں محنت ومجاہدہ سے بقدر کفایت رزق حاصل کرنے اور امورآخرت کی طرف متوجہ فرمایا۔

حیرت ہے کہ قادیانیوں کو ایک طرف آقائے دوعالم ﷺ کے اس زہد وتکشف اور اپنی ذات سے لے کر اپنی آل، اولاد اور خاندان کے لئے کفاف وقناعت کے طرز عمل پر تو اعتراض ہے، مگر دوسری طرف اُنہیں مسیلمہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کے اس بدترین کردار اور مال بٹورنے کے سو، سوغلیظ حیلوں، بہانوں اور بیسیوں قسم کے چندوں پر کوئی اعتراض نہیں۔

اگر قادیانی امت تعصب اور عناد کی عینک اتار کر ایک لمحہ کے لئے اپنے انگریزی نبی مرزا غلام احمد قادیانی کی مالی حالت پر غور کرتی، تو اس پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی کہ سیالکوٹ کی عدالت میں کلرکی کرنے والے ایک معمولی شخص کی فیملی، رائل فیملی کیسے بن گئی؟ اور اس کا خاندان دنیا کے امیر ترین خاندانوں میں کیسے شامل ہوگیا؟ اور اس کے پاس اس قدر وافر مقدار میں مال ودولت کہاں سے آگئی؟ اور ان کی زمینوں اور جائیدادوں کی اسٹیٹس کہاں سے نازل ہوگئیں؟

بلاشبہ قادیانی امت خود ہی مرزائی نبوت کی شریعت کی روشنی میں بتلاسکتی ہے کہ یہ سب قادیانی چندہ مہم کی برکت ہے، کیونکہ قادیانی شریعت میں تو قبر بھی چندہ کے عوض فروخت ہوتی ہے، اس لئے کہ جو قادیانی وقف زندگی، وقف جدید، وقف فلاں، وقف فلاں کا چندہ نہ دے سکیں، انہیں قادیانی ''بہشتی مقبرہ'' میں دفن ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ جس کا معنی یہ ہے کہ جو قادیانی، بہشتی مقبرہ کا چندہ نہ دے پائے دوسرے لفظوں میں وہ جہنمی مقبرہ میں دفن ہوگا، گویا مرزا جی کو چندہ نہ دینے والے قادیانی اس دنیا میں ہی جہنمی ہیں۔

قادیانیو! حضرت محمد ﷺ اور آپ کے خاندان کے زکوٰۃ وصدقات استعمال نہ کرنے پر تو تمہیں اعتراض ہے، لیکن افسوس! کہ تمہیں اپنے نبی کے کنجریوں کی کمائی ہضم کرنے اور اُسے شیر مادر سمجھ کر ہڑپ کرجانے پر کوئی اشکال نہیں، آخر کیوں؟ قادیانیو! تمہارا نبی زندگی بھر دونوں

ہاتھوں سے چندہ سمیٹتا رہا اور ساری زندگی مالی تنگی کا رونا بھی روتا رہا، سوال یہ ہے کہ آج اس کی فیملی اور خاندان رائل فیملی کیسے بن گیا؟

قادیانیو! تمہارے نبی کی ساری زندگی دوسروں کے مال پر نظر رہی، جبکہ ہمارے نبی آقائے دوعالم ﷺ کی زندگی دنیائے دنی سے دامن چھڑانے میں گزری، چنانچہ آپ نے فرمایا: ہمیں تمہارے مال کی نہیں ایمان واعمال کی ضرورت ہے۔

قادیانیو! تمہارے ہاں غریب کی کوئی حیثیت نہیں، چندہ دینے والے تمہارے ہاں بہشتی ہیں اور غریب جہنمی ہیں، اور تم قبروں کو بیچتے ہو، جبکہ ہمارے نبی اور ان کے امتیوں نے قبر فروشی کا کاروبار نہیں کیا، بلکہ ہمارے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"فمن مات وعليه دين ولم يترك وفاءً فعليَّ قضاء ه ومن ترك مالاً فلورثته، متفق عليه." (مشکوٰۃ،ص:۳۶۳)

ترجمہ: ''اگر کوئی مسلمان فوت ہوجائے اور اس پر کوئی قرضہ ہو تو اس کا میں (محمد ﷺ) ذمہ دار ہوں اور اگر مال چھوڑ جائے تو اس کا مال اس کے وارثوں کا ہے۔''

ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: "لا نورث ماتركناه صدقة، متفقه عليه." (مشکوٰۃ ص:۵۵)

ترجمہ: ''ہم جماعت انبیاء جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں وہ ہمارے خاندان میں بطور وراثت تقسیم نہیں ہوتا، بلکہ وہ صدقہ ہے۔''

قادیانیو! بتاؤ!!! مرزا غلام احمد کی جائیداد اس کے خاندان کے علاوہ کہاں خرچ کی گئی؟ اگر قادیانیوں میں ذرہ برابر بھی شرم وحیا، یا عقل ودانش کی کوئی رمق ہوتی تو وہ نبی اُمی ﷺ کی ذات ستودہ صفات پر اعتراض کرنے کی بجائے دنیا کے پجاری اور انگریز کے حواری نبی مرزا غلام احمد قادیانی پر دوحرف بھیج کر اس سے اظہار برأت کرتے۔ (جاری)

تیسری قسط:

سلاطین ہند کے عہد میں غیر مسلموں کی شرعی حیثیت

از: محمد شمیم اختر قاسمی
ریسرچ اسکالر شعبہ سنی دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ذمیوں کے لیے لباس کا مسئلہ:

اسلامی حکومت میں مقیم ذمیوں کے لباس کا مسئلہ ہمیشہ موضوع بحث بنا رہا ہے۔ غیر مسلم حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے ذمیوں کو الگ قسم کا لباس پہنا کر ان کی تذلیل و تحقیر کی ہے۔ یہ غلط فہمی دراصل اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ان لوگوں نے اسلامی احکامات کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ یہاں چند جزئیات ذمیوں کے لباس کے سلسلے میں پیش کیے جاتے ہیں، اس کے بعد اس لباس کو زیب تن کرانے کی اصل غرض و غایات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ غالبًا اس قسم کا پہلا واقعہ حیرہ کے معاہدہ میں پیش آیا کہ ذمیوں کا لباس مسلمانوں کے مشابہ نہ ہو، کتاب الخراج میں ہے: ولهم كل ما لبسوا من الذى اِلّا ذمّى الحرب من غير ان يتشبهوا بالمسلمين(۱۰۲) (ان کو حق حاصل ہے کہ جیسا لباس چاہیں زیب تن کریں، مگر فوجی لباس پہننے سے احتراز کریں اور مسلمانوں سے لباس میں مشابہت اختیار نہ کریں) دمشق میں جب معاہدہ ہوا تو خود عیسائیوں نے اپنی شرائط میں اس تجویز کو شامل کرکے پیش کیا کہ ”ہم مسلمانوں سے ان کے لباس میں کسی قسم کی مشابہت اختیار نہ کریں گے، نہ ٹوپی میں، نہ عمامہ میں، نہ جوتوں میں اور نہ مانگ نکالنے میں“ (۱۰۳)

اس طرح کے احکامات جو مختلف کتب فقہیّہ میں ملتے ہیں، اس سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ اس سے ذمیوں کی تحقیر ہوتی ہے؛ بلکہ دونوں قوموں یا مختلف ملکوں میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے یہ احکام جاری کیے گئے تھے۔ نیز مسلمانوں کے لیے بھی ضروری تھا کہ وہ غیر مسلموں کے سے تشبہ اختیار نہ کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں مولانا مودودی(۱۰۴) نے جو بحث کی ہے اس سے ان

اعتراض کی عقدہ کشائی ہوتی ہے جو غیر مسلم بغیر سوچے سمجھے اس قسم کے اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

”لباس کے تشابہ میں جو مفاسد پوشیدہ ہیں ان سے اسلام غافل نہیں ہے، خصوصیت کے ساتھ محکوم قوموں میں اکثر یہ عیب پیدا ہوجایا کرتا ہے کہ وہ اپنے قومی لباس اور اپنی قومی معاشرت کو ذلیل سمجھنے لگتے ہیں اور حاکم قوم کا لباس اور طرز معاشرت اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ غلامانہ ذہنیت آج بھی دنیا کی محکوم قوموں میں موجود ہے۔ خود ہندوستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ بے شمار ہندی نژاد حضرات انگریزی لباس بڑے شوق کے ساتھ پہنتے ہیں اور اسے پہن کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ گویا ترقی کے کسی بہت ہی اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ گئے ہیں، حالانکہ کسی انگریز نے کبھی ہندوستانی لباس نہیں پہنا اور آمر خالص انگریزی سوسائٹیوں میں کبھی پہنا بھی ہے تو تفاخر کے لیے نہیں بلکہ تفنن اور مسخرہ پن کے لیے نفسیات محکومیت کے اس نکتہ کو ائمہ اسلام خوب سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے اہل الذمہ کو تشبہ بالمسلمین سے منع کرکے ان کی تذلیل و تحقیر نہیں کی بلکہ ان کی قومی عزت و شرافت کو برقرار رکھا۔ ممکن ہے کہ اس قسم کے قوانین بعض لوگوں کی نگاہ میں موجب حقارت ہوں، مگر ہمارے نزدیک اس میں کوئی تحقیر نہیں ہے؛ بلکہ ہم بہت خوش ہوتے کہ اگر ہمارے انگریز حکمراں بھی ہم کو یورپین لباس اور طرز معاشرت اختیار کرنے سے حکماً منع کردیتے۔“ (۱۰۵)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اگر ذمیوں کے لباس کے سلسلے میں احکام نافذ کیے تھے کہ وہ عرب کے لباس استعمال نہ کریں۔ اس کے برعکس انھوں نے اہل عرب کو بھی عجم کی وضع سے پرہیز کرنے کی تاکید کی تھی۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ عتبہ بن فرقد کو ایک فرمان کے ذریعہ تاکید کی کہ:

”تم کو اپنے باپ اسمٰعیل کا لباس پہننا چاہیے، خبردار عیش طلبی اور اہل عجم کی وضع نہ اختیار کرو، موزہ اور جامہ پہننا چھوڑ دو۔“ (۱۰۶)

تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بھی واضح طور پر نظر آتی ہے کہ مسلمان جہاں جہاں پہنچے اور انکی حکومتیں قائم ہوئیں۔ انھوں نے مفتوح قوم کا لباس استعمال کرنا شروع کردیا۔ مثلاً جب سندھ میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو سلاطین اور فرمارواؤں نے اور عام مسلمانوں نے ہندوؤں کی وضع اختیار کی۔ ابن حوقل نے سندھ اور منصورہ کے مسلمانوں کے لباس کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:

”یہاں کے مسلمانوں کا لباس عراق جیسا ہے، لیکن یہاں کے بادشاہوں کی وضع

ہندوراجاؤں کے قریب قریب ہے۔ یہی جغرافیہ داں کھیسایت کے متعلق لکھتا ہے
کہ یہاں کے مسلمان اور کافروں کی ایک وضع ہے، دونوں ایک سالباس پہنتے ہیں
اور بال بڑے رکھتے ہیں۔'' (۱۰۷)

اس کے علاوہ سلاطین ہند نے بھی ہندوستان میں اپنی حکومت کے قیام کے بعد ہمیشہ ہندوستانی لباس استعمال کرتے رہے اور عام مسلمانوں کا بھی یہی طرز عمل رہا۔ دھوتی جو خاص ہندوؤں کا لباس ہے مسلمانوں نے اسے بھی استعمال کیا اور بعض سلاطین نے تو مختلف قسم کے زیورات بھی استعمال کیے، ہندوراجاؤں مہاراجاؤں کی طرز پر۔ چنانچہ لباس کے تشابہ کے سلسلے میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ کم عقلی اور ناخواندگی کی ایک بڑی دلیل ہے۔ انہیں سوچنا چاہیے تھا کہ:

''اگر ان کا لباس ذلت اور تحقیر کی علامت ہوتا تو مسلمان ذلت اور تحقیر کو کیوں گوارا کرتے، عباسیوں کی سلطنت کا آغاز درحقیقت منصور کے عہد سے سمجھا جاتا ہے، اس نے دربار کے لیے جو ٹوپی اختیار کی وہ وہی مجوسیوں کی ٹوپی تھی جو خاص ان کی قومی علامت تھی۔ معتصم باللہ جسکے زمانے میں دولت عباسیہ پورے شباب پر پہنچ چکی تھی، اس نے بالکل شاہان عجم کی وضع اختیار کرلی تھی۔ مورخ مسعودی نے لکھا ہے کہ:

''وہ ٹوپی اوڑھنے، پگڑی باندھنے اور ساز وسامان رکھنے میں رئیسانِ عجم کی تقلید کا بہت شائع تھا، چنانچہ اس کو دیکھ کر سب نے اس کی وضع اختیار کرلی اور اس وضع کا نام معتصمی پڑ گیا۔'' (۱۰۸)

مذہبی آزادی

شروع میں عرض کیا جاچکا ہے کہ وہ علاقے جس کو ذمیوں نے آباد کیا اور اس میں لوگوں کو بسایا وہاں وہ اپنی مرضی سے اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرسکتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ مسلم علاقے جہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے اور جس کو مسلمانوں نے بنایا ہے اور بسایا ہے وہاں اپنی مرضی سے کوئی عبادت خانہ نہیں بناسکتے۔ اور نہ وہاں وہ ایسے کوئی امور انجام دیں گے جس سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہو اور مسلمانوں کی تذلیل وتحقیر ہوتی ہے۔ (۱۰۹) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس سلسلے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ جو شہر مسلمانوں کے خاص آباد کردہ ہیں وہاں غیر مذہب والوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ گرجا اور بت خانہ بنائیں، یا سنکھ بجائیں۔ باقی جو قدیم شہر

ہیں وہاں ذمیوں سے جو معاہدہ ہے مسلمانوں کو اس کا پورا کرنا ضروری ہوگا۔ (۱۱۰)

باوجود اس حکم کے مسلمانوں کے عہد میں بالخصوص ان شہروں میں جس کو مسلمانوں نے بسایا اور آباد کیا کثرت سے گرجا تعمیر ہوئے۔ اس کی واضح مثال عراق ہے جس کو مسلمانوں نے بسایا تھا۔ قاہرہ میں جو گرجے ہیں وہ مسلمانوں ہی کے عہد میں بنے۔ اس کے علاوہ بہت سے پرانے معبد کی مرمت اور جدید کاری ہوئی۔ یہاں پھر اس بات کو دہرایا جاتا ہے کہ جزیہ کی وصولی کے ساتھ ہی انہیں ہر قسم کی آزادی حاصل ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں کافی شہادتیں ملتی ہیں کہ جب دونوں قوموں میں صلح اور معاہدہ، یا مسلمانوں نے کسی ملک پر فتح حاصل کی تو معاہدہ اور جزیہ کے تعین کے وقت یہ باتیں منظور کیں کہ:

''مسلمانوں اور ذمیوں سے جزیہ کی بنا پر جو صلح ہوئی، اس شرط پر ہوئی تھی کہ ان کی خانقاہیں اور گرجے شہر کے اندر ہوں یا باہر برباد نہ کیے جائیں گے اور یہ کہ ان کا کوئی دشمن ان پر چڑھ آئے تو ان کی طرف سے مقابلہ کیا جائے گا اور یہ کہ وہ تیوہاروں میں صلیب نکالنے کے مجاز ہیں، چنانچہ تمام شام اور حیرہ (باستثنا بعض مواضع کے) ان ہی شرائط پر فتح ہوا اور یہی وجہ ہے کہ خانقاہیں اور گرجے اسی طرح چھوڑ دیئے گئے اور برباد نہیں کیے گئے۔''

حضرت خالد نے ایک صلح اس شرط پر کیا کہ:

لایهدم لهم بیعة و لا کنسیة وعلی ان یضربوا نواقیسهم فی ای ساعة شاؤا من لیل او نهار الا فی اوقات الصلوٰة وعلی ان یخرجوا الصلبان فی ایام عیدهم".

(ان کے گرجے برباد نہ کیے جائیں، وہ نماز کے وقتوں کے سوا، رات دن میں جس وقت چاہیں ناقوس بجائیں اور تمام تیوہاروں میں صلیب نکالیں۔)

امصار مسلمین کن علاقوں کو کہا جائے گا

بدائع صنائع میں ذمیوں کے شخصی ومذہبی معاملات میں جو توسیع ملتی ہے اس سے بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے ذمیوں کو کس فراوانی سے حقوق عطا کیے ہیں۔

''جو بستیاں اور مقامات امصار مسلمین میں سے نہیں ہیں، ان میں ذمیوں کو شراب و خنزیر بیچنے اور صلیب نکالنے اور ناقوس بجانے سے نہیں روکا جائے گا خواہ وہاں مسلمان کتنی ہی کثیر تعداد میں آباد ہوں۔ البتہ یہ افعال امصار مسلمین میں مکروہ ہیں

جہاں جمعہ وعیدین اور حدود قائم کی جاتی ہوں... رہا وہ فسق جس کی حرمت کے وہ بھی قائل ہیں، مثلاً زنا اور دوسرے تمام فواحش جوان کے دین میں بھی حرام ہیں تو اس کے اظہار سے ان کو ہر حال میں روکا جائے گا خواہ امصار مسلمین میں ہوں یا خود ان کے اپنے امصار ہوں۔''

مسلم ممالک میں مقیم غیر مسلموں کے متعلق جو چند شرعی ممانعت کے احکام ملتے ہیں وہ کسی عصبیت یا اور کسی اور وجہ سے نہیں ہیں بلکہ اس ممانعت کا منشایہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے جذبات اور ان کی دینی حمیت کا تھوڑا سا خیال رکھیں، ان کے مذہب کی حرمت کو پامال نہ کریں، وہ کسی مسلم آبادی میں اس طرح کا مظاہرہ نہ کریں جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوں اور فتنہ وفساد کی آگ بھڑک اٹھے۔

یہاں اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ امصار مسلمین کن علاقوں کو کہا جائیگا۔ ہندوستانی تناظر میں ایسا کوئی علاقہ شروع میں نہیں تھا جس پر اس قسم کی تعریف منطبق ہوتی ہو۔ اس سلسلے میں اس بات کا خیال بہرحال ضروری ہے کہ اس میں وہ علاقے آجاتے ہیں جہاں کے باشندے اسلام قبول کرلیں، مثلاً مدینہ منورہ، طائف، یمن، نیز اس میں وہ شہر بھی آجاتے ہیں جن کا پہلے وجود نہ تھا بلکہ مسلمانوں نے ہی وہاں کی زمینوں کو تقسیم کرکے وہاں اقامت اختیار کی مثلاً کوفہ، بصرہ اور اسی ضمن میں سرحدی علاقے بھی آتے ہیں۔ اس تعریف میں وہ علاقے بھی آجاتے ہیں جو مسلمانوں کی فوجی قوت کے ذریعے فتح کرے اور امام فتح کے بعد ان علاقوں کو وہاں کے اصل باشندوں کے حوالے کردینا مناسب نہ خیال کرے بلکہ فاتحین میں اس علاقہ کو تقسیم کردے جیسے رسول اللہ ﷺ نے اہل حیرہ کے ساتھ معاملہ کیا تھا۔

محمد بن قاسم کا برتاؤ ذمی اور معاہد کے ساتھ

مسلمان جہاں جہاں پہنچے اور اپنی حکومت قائم کی بزور طاقت یا صلح ومعاہدہ کے ذریعہ وہاں انھوں نے ذمیوں اور معاہدین کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھا اور انہیں ہر قسم کی آزادی، بلکہ ان کے اصل حقوق سے بھی تجاوز کرکے انہیں خوش رکھنے کی کوشش کی نہ صرف یہ کہ انھوں نے ان کے پرانے معبدوں کو قائم رکھے بلکہ نئے معبدوں کی تعمیر کی بھی اجازت دی۔ اس کے علاوہ ان کے اخراجات کے لیے کافی مقدار میں جائیدادیں وقف کردیں تاکہ یہاں نظام بہتر طریقے سے انجام پاسکے۔ نیز مجاوروں اور پادریوں کے لیے روزینے بھی مقرر کیے۔ اور جب محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا تو

برہمنوں کو مندر میں پوجا پاٹ کرنے اور نذر ونیاز چڑھانے کی فراخ دلی سے جو اجازت دی اس کی تفصیل چچ نامہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں سید طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں کہ:

''اب رہا مسئلہ محمد بن قاسم کا برہمنوں اور مندروں کے ساتھ برتاؤ کا۔ اس کی نسبت اس زمانہ کے ہندو مورخوں نے تسلیم کیا ہے کہ انھوں نے ہندوؤں کے مندر وغیرہ نہیں توڑے۔ زمانہ قدیم میں عام خیال یہ تھا کہ ہر قوم کے دیوتا جنگ کے وقت اپنی اپنی قوم کو مدد دیتے ہیں، پس جب کوئی قوم فتح پاتی تو اس قوم کے معبود کی طاقت دیکھ کر مفتوح قوم کے لوگ فاتح قوم کا مذہب اختیار کرلیتے۔ اسی کلیہ کے مطابق راجہ داہر کے مارے جانے پر جب ہندوستان کے لوگ مسلمان ہونے لگے تو محمد بن قاسم نے دوسرے روز اعلان کردیا کہ جو شخص چاہے اسلام قبول کرے اور جو چاہے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، ہماری طرف سے کوئی تعرض نہ ہوگا۔ برہمن آباد فتح ہونے پر مندروں کے پجاری محمد بن قاسم کے پاس گئے اور کہا کہ ہندوؤں نے مسلمان سپاہیوں کے ڈر سے بتوں کی پوجا کے لیے مندروں میں آنا کم کردیا ہے جس سے ہماری آمدنی میں فرق آگیا ہے۔ مندروں کی مرمت بھی نہیں ہوتی ہے، تم انہیں درست کرادو اور ہندوؤں کو مجبور کرو کہ وہ مندروں میں آکر پوجا پاٹ کریں۔''

یہ سن کر خلیفہ سے بذریعہ خط کے استصواب کیا گیا جواب آنے پر محمد بن قاسم نے اعلان کردیا کہ دان، پن، دکشنا، بھینٹ جس طرح پہلے دیتے تھے اب بھی دیں۔ اپنے مندروں میں آزادانہ پوجا پاٹ کریں، سرکاری مال گزاری میں سے تین روپیہ فی صدی برہمنوں کے لیے الگ خزانے میں جمع کیا، اس روپیہ کو برہمن جس وقت چاہیں اپنے مندروں کی مرمت اور ضروری سامان کے لیے خزانہ سے لے سکتے ہیں۔ پھر سب سے بڑے پنڈت کو رانا کا خطاب دے کر ان کو امور مذہبی کا مہتمم اور افسر مقرر کردیا۔''

محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے فوراً بعد ہی اس کے عفو ودرگذر اور صلح وامان کے خاور کھل گئے۔ جو انکے مقرر حدود سے بھی زیادہ تھے جس سے حجاج بن یوسف کو خطرہ لاحق ہونے لگا کہ اگر محمد بن قاسم اسی طرح رواداری سے کام لیتا تو کوئی بعید نہیں کہ دشمن اسے کمزوری پر محمول کرنے لگے اور پھر یہاں مسلمانوں کو ناکامی سے ہم کنار ہونا پڑے، چنانچہ حجاج نے قاسم کو خط لکھ کر آگاہ کیا کہ امان دینے میں زیادہ فراخ دلی سے کام نہ لیا جائے، بلکہ انہیں اتنی ہی رعایت دی جائے جسکے وہ مستحق ہیں۔

”چچازاد بھائی! آپ کا پرمسرت خط ملا، پڑھ کر بے انتہا محظوظ ہوا۔ یہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم جن اصولوں پر عمل درآمد کررہے ہو وہ بالکل شروع کے مطابق ہیں، لیکن سنتا ہوں کہ تم نے چھوٹے بڑے سب کو یکساں امان دے دی ہے، دوست دشمن میں کوئی تمیز نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کافر جہاں ہیں قتل کرڈالو، خوب یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کا حکم واجب العمل ہے۔ امان دینے کے لیے اس قدر دریادلی نہ کرو، اس طرح امان دینے سے آئندہ کارروائی رک جائے گی، حالاں کہ تم اس کے ذمہ دار بنا کر بھیجے گئے ہو۔ آئندہ سوائے ذی عزت لوگوں کے کسی دشمن کو پناہ نہ دینا ورنہ تمہارے بے انتہا رحم کو لوگ کمزوری تصور کریں گے اور تمہاری شوکت جاتی رہے گی۔“

محمد بن قاسم کے فیاضانہ سلوک کا سندھ کے برہمنوں پر خاصا مثبت اثر پڑا، اور بہت سے لوگ مسلمان ہونے لگے۔ اور برہمنوں نے ملکی انتظامات وانصرام میں داخلہ حاصل کرکے بڑے خوش گوار ماحول پیدا کیے۔ مال گزاری وغیرہ کے اصول کرنے کا حق بھی انھی لوگوں کے ذمہ رہنے دیا۔ اس رعایت سے وہ لوگ نہ صرف خوش تھے؛ بلکہ ان لوگوں نے جگہ جگہ پہنچ کر اس عفو ودرگزر اور حسن سلوک کا تذکرہ اور پرچار کیا، جس سے اور بھی ماحول خوش گوار ہوتا گیا اور بہت سے لوگ اطاعت گزاری پر مجبور ہوئے۔ وہ جہاں پہنچتے اپنے ہم قوموں کو یہ کہہ کر اطاعت گزاری کا درس دیتے کہ:

”ہماری سلطنت تباہ ہوگئی اور فوجی طاقت جاتی رہی، اب ہم میں مقابلہ کی تاب نہیں ہے یقیناً ہم گھر سے نکال دیئے جاتے اور تمام جائدادوں سے محروم ہوتے، فقط حاکم قوم کی مروت اور عدل وانصاف سے ہم اس وقت بھی معزز عہدوں پر ہیں اور ہر چیز ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ یا تو ہم لوگ اہل وعیال کو لے کر ہندوستان ہجرت کرجائیں، ایسی صورت میں ہم لوگ بالکل مفلس ہوجائیں گے، کیوں کہ تمام جائدادیں اسی جگہ چھوڑنی پڑیں گی اور یا پھر مطیع رہ کر جزیہ ادا کریں اور آرام وعزت سے زندگی بسر کریں۔“

ایفائے عہد کی بے نظیر مثال

مسلمانوں نے جب کسی سے کوئی عہد کرلیا تو پھر ہر ممکن کوشش کی کہ اس کو برقرار رکھا جائے۔ ہندوستان کی فتح کے تناظر میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ جس کے پاس ولحاظ کرنے میں محمد بن قاسم کو متذبذب ہونا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ کچھ مفسد لوگ عفو ودرگزر کے باوجود بھی ماحول کو

ناخوشگوار بنانے کی کوشش کررہے تھے، جن کو کسی طرح گرفتار کرکے محمد بن قاسم کے سامنے پیش کیا گیا، ان کی نازیبا حرکت کے پیش نظر محمد بن قاسم نے ان لوگوں کے قتل کا حکم جاری کردیا۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ اگر میری اور میرے بال بچوں کی جاں بخشی کی ضمانت دی جائے تو میں ایک عجیب بات ظاہر کروں گا، جس سے اب تک مسلمانوں کا واسطہ نہیں پڑا ہوگا، مگر اس عجیب بات کا انکشاف صرف سپہ سالار کے سامنے کروں گا۔ اس بات سے اسلامی عساکر نے سمجھا کہ کسی اہم واقعہ کا یہ انکشاف کرنے والا ہے۔ یا پھر کسی خزانے کا پتہ دینے والا ہے۔ اس لیے اس کی درخواست قبول کرلی گئی۔ اور اسے تحریری امان دے دیا گیا۔ امان حاصل کرتے ہی اس نے اپنے بال کھولے، داڑھی اور مونچھ کے بال کھینچ کر لمبے کیے، پھر پلیٹ کر اپنے پاؤں کے انگوٹھے کو گدی تک لے گیا اور ناچنے لگا۔ وہ ناچتا جاتا اور کہتا جاتا کہ دیکھو کیسی عجیب بات ہے آج تک کسی نے ایسا نہ دیکھا ہوگا۔ اس کی اس حرکت پر مسلمان حیرت زدہ ہوئے اور یہ اس کا فریب شمار کرکے اس کا قتل کرنا چاہا کہ اس قسم کا تماشا کوئی ایسی چیز نہیں، مگر محمد بن قاسم نے ایفائے عہد کی فی الحال تکمیل کرتے ہوئے اس کا قتل کرنے کے بجائے اس کے تمام متعلقین کے ساتھ اسے نظر بند کردیا اور قتل کو ملتوی کردیا۔ پھر اس معاملہ کی اطلاع حجاج کو کی۔ حجاج اپنے درباری علماء سے استفسار کیا، جواب ملا کہ اس کو آزاد کردیا جائے تاکہ معاہدہ کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اور مثال میں صحابہ کے عہد کا ایک ایسا ہی واقعہ پیش کیا۔ پھر حجاج نے محمد قاسم کو اطلاع کی کہ اسے رہا کردیا جائے۔ چنانچہ اس فریبی اور مکار کو رہا کردیا گیا۔

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس فریب کے باوجود محمد بن قاسم نے اس کے تمام حواری کے رہا کردیا۔ اس سے زیادہ عفو ودرگذر اور رواداری کی اور کیا مثال ہوسکتی ہے۔ یہی وہ بے مثال رواداری ہے کہ سندھیوں کی نظر میں محمد بن قاسم محبوب بن گئے، جن کی آواز پر وہ جان دینے کو ہروقت تیار رہتے تھے۔ اور جب انھیں قید کرکے واسط کی جیل میں بھیجا جارہا تھا تو یہاں کے لوگ غم میں آنسو بہائے اور جب ان کا انتقال ہوگیا تو یادگار کے طور پر ان کا مجسمہ بنایا۔ اس محبت اور رواداری سے ہندو مسلمانوں میں اس قدر قریبی تعلقات قائم ہوگئے کہ خاص عرب میں مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں میں ہندو شریک ہوتے تھے چنانچہ برہمنوں کا ایک خاندان اپنے آپ کو اسی بنا پر حسینی برہمن کہتا ہے کہ بقول ان کے ان کے بزرگوں نے کربلا میں سادات کا ساتھ دیا تھا۔

مسئلہ آبادی یا حرص و ہوس

از: ڈاکٹر ایم. اجمل فاروقی
۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

۱۳، ۱۴، ۱۵/فروری ۲۰۰۷ء کو انڈونیشیا میں خاندانی منصوبہ بندی پر سہ روزہ کانفرنس منعقد کی گئی، جس میں ہندوستان، بنگلہ دیش، پاکستان، چین، ایران، ترکی، تھائی لینڈ، اردن، شام، تنزانیہ سمیت ۱۴ ملکوں کے ۱۲۵ مسلم شرکاء نے شرکت کی تھی۔ بعض ذمہ داروں کے خیالات اس طرح سامنے آئے:

یہ کانفرنس اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مسلمان صرف جذباتی امور کی طرف ہی توجہ نہیں کرتے بلکہ ترقی اور خوش آئند تغیرات کے تعلق سے بھی ان کا گہرا تعلق ہے۔ (پروفیسر اختر الواسع جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندوستان) انڈونیشیا کے وزارت برائے مذہبی امور کے ڈائریکٹر جنرل نصیرالدین عمر نے کہا کہ: ''مذہبی سرپرستی کے بغیر خاندانی منصوبہ بندی کو کامیاب بنانا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ خاندانی منصوبہ بندی کو مذہبی حوالہ سے ہی مسترد کیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ آبادی فنڈ کے ایشیا کے ڈائریکٹر سلطان اے. عزیز نے مشورہ دیا کہ ''مسلم ملکوں کو چاہیے کہ وہ مذہبی تعلیمات کو غلط طریقہ سے عام نہ کریں اور جانبدارانہ تہذیبی اصولوں کو چھوڑ دیں۔ یہ چیزیں معاشرتی بہبود اور خاندانی منصوبہ بندی کی راہ میں حائل ہیں۔ انھوں نے مذہبی رہنماؤں کو خاندانی منصوبہ بندی سے بہرہ ور کرنے پر زور دیا اور کہا کہ مذہبی انتہا پسندی کے موجودہ ماحول میں اب وقت آگیا ہے کہ معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے شعبوں میں مسلم قیادت سامنے لائی جائے۔'' (۱۹/۲/۲۰۰۷ء یو. این. آئی بحوالہ ہندوستان ایکسپریس)

سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جو پروگرام، فلسفہ، رجحان مغرب میں ناکام ہوجاتا ہے وہ مشرق اور وہ بھی مسلم مشرق میں پھیلانے کی کوشش اتنے بڑے اداروں کی طرف سے کیوں ہوتی ہیں؟ آج

جب مغرب شراب نوشی، سگریٹ نوشی، فری سیکس اور خاندانی منصوبہ بندی، ڈبہ بند اشیاء خورد و نوش، کیمیاوی کھاد سے پیدا کی گئی غذائی اجناس سے توبہ کررہا ہے تو عین یہی چیزیں مشرقی ممالک کو درآمد کی جارہی ہیں۔ اگر ہم صرف خاندانی منصوبہ بندی کی بات کریں تو تجربہ اور تاریخ یہ بتارہا ہے کہ مغرب کو اس کے سخت تباہ کن طویل المدت سنگین نتائج درپیش ہیں۔ آج وہاں کی آبادی میں ادھیڑ اور بوڑھے لوگوں کا تناسب زیادہ ہوگیا ہے۔ وہاں کام کرنے والی عمر کے افراد جو ۱۶-۳۵ سال کے درمیان ہوں انکا تناسب لگاتار کم ہورہا ہے۔ کئی ممالک میں شرح پیدائش اور شرح اموات برابر آنے کا ڈر ہے۔ نتیجتاً ان ممالک میں باہری لوگوں کو مجبوراً بلانا پڑ رہا ہے۔ جرمنی، فرانس، ہالینڈ، اسپین، برطانیہ ہرجگہ ہی مسئلہ درپیش ہے۔ سماج کو رواں دواں رکھنے کے لئے ان کے پاس آدمی نہیں ہیں۔ جو لوگ ایشیا، لاطینی امریکہ، افریقہ، مشرقی یوروپ سے وہاں اس کمی کو پورا کرنا جارہے ہیں اس سے وہاں دوسری طرح کے مسائل پیدا ہورہے ہیں۔ وہ لوگ اِن سے کام بھی لینا چاہتے ہیں اور انہیں برداشت بھی کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ایشیا میں جن ممالک چین، جاپان، سنگاپور نے خاندانی منصوبہ بندی پر کامیابی سے عمل کیا وہاں آج یہ حالت ہے کہ حکومتیں مستقبل کے رجحانات سے ڈر رہی ہیں۔ جاپان اور سنگاپور بچہ پیدا کرنے کے لئے ہر طرح ترغیبات اور سہولیات دے رہے ہیں مگر جن نوجوانوں کو موج مستی اور "Figure" خراب ہونے کا ڈر ہوگیا ہے وہ واپس گھر کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چین نے سب سے زیادہ جبریہ خاندانی منصوبہ بندی کا "Single child" ''واحد اولاد'' پروگرام کامیابی سے چلایا وہ بھی مغرب کی ایماء پر اور آج وہاں خطرہ کی گھنٹی بجنی شروع ہوگئی ہے یعنی بچیوں کی تعداد بچوں سے کم ہورہی ہے اور یہی حال ہمارے ملک کا بھی ہے۔ جب ہمارے یہاں آبادی میں کمی کے ساتھ لڑکیوں کی تعداد بھی غیر متناسب انداز میں کم ہورہی ہے خوشحالی والی، زیادہ تعلیم یافتہ اور پیسہ والی ریاستوں پنجاب، ہریانہ، گجرات، ہماچل پردیش، دہلی، چنڈی گڑھ سب میں تشویشناک انداز میں لڑکیوں کا تناسب کم ہورہا ہے بعض مقامات پر یہ ایک ہزار مردوں پر ۷۵۰ خواتین تک پہنچتا ہے اور انہیں بیویاں بہار اور بنگال سے درآمد کرنی پڑ رہی ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی دراصل ایک ناکام اور انسانیت دشمن نظریہ ہے جسے منظّم انداز میں مخصوص طبقہ کے ذریعہ آگے بڑھایا جارہا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے لئے جو بھی دلائل ہیں وہ دراصل رشوت خور، کمیشن خور، مغرب زدہ حکمرانوں کا ایک ہتھکنڈہ ہے جو وہ اپنے مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے اپناتے ہیں۔ مغرب

کے پاس سرمایہ اور ٹکنالوجی ہے مگر انسانی دولت کی محرومی ہے۔اس لئے وہ اپنی برتری بنائے رکھنے کے لئے مشرق کی دولت، قدرتی وسائل اور انسانی وسائل کو بھی کم یا ختم کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے طرح طرح کے خوش کن، گمراہ کن تھیوریاں اور فلسفہ ایجاد کرتا رہتا ہے۔جبکہ یہ انسانیت دشمن طاقتیں غریب ممالک کو مشورہ دیتی ہیں کہ اپنے ملکوں میں تعلیم پر، حفظان صحت میں، اشیاء خورد و نوش پر، کھانا پکانے کی گیس پر سرکاری مدد کم کرو مگر یہی ممالک غریب ملکوں کو اپنی مہنگی غیر ضروری اشیاء تعیش خریدنے پر آمادہ کرنے میں۔کار، A.C.، کوکا کولا، میک اپ کا سامان خریدو۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ہتھیار خریدو۔اپنی عوام کو سڑک، بجلی، پانی، تعلیم، علاج پر خرچ کرنے کے لئے بڑھتی آبادی کا رونا روتے ہیں مگر ہتھیار خریدنے کے لئے اکساتے ہیں۔آج ایسا کیوں ہے کہ دنیا میں ہتھیار خریدنے والے تمام بڑے ملک ایشیا سے ہیں۔(سعودی عرب، ہندوستان اور چین، دوبئی) جب کہ ماہرین زراعت، ماہرین اقتصادیات ثابت کر چکے ہیں کہ اصل مسئلہ آبادی Population نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ تقسیم ناقص اور غیر ضروری خرچ (Distribution & Consumerisms) کا ہے۔دنیا میں انسانی ضروریات کی تمام چیزیں قدرتاً مہیا ہیں۔مگر جہاں سے حضرت انسان کا عمل دخل شروع ہوتا ہے وہیں سے انسانیت کی مشکلیں ذخیرہ اندوزی، سٹہ بازی، اسمگلنگ، بلیک مارکٹنگ وغیرہ کی شکل میں شروع ہوجاتی ہیں۔یہاں تک کہ دام بڑھانے کے لئے غذائی اجناس کو ضائع بھی کردیا جاتا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ ماہرین کا کہنا ہے کہ زمین پر آبادی کا نہیں بلکہ اسراف Consumption کا بوجھ بڑھ رہا ہے۔مثلاً یہ کہ ایک امریکی ۱۲۷ بنگلہ دیشیوں کے برابر قدرتی وسائل کا استعمال کرتا ہے تو آبادی کم ہونے کے باوجود امریکی ہوا، پانی، بجلی، پٹرول، گیس ہر دولت کا زیادہ استعمال کرکے دھرتی پر زیادہ گندگی اور کثافت Pollution پھیلاتے ہیں۔کیا یہ سوچنے کا مقام نہیں ہے کہ ہمارا ملک جب آزاد ہوا تو غذائی اجناس کی قلت تھی ۱۹۷۰ء تک یہ ہی رہی ہے۔اس کے بعد کے سبز انقلاب نے جب کہ آبادی کئی گنا بڑھ گئی تھی غذائی قلت کو ختم کردیا۔مگر یہ قلت گذشتہ دو چار سالوں سے حکومتوں کی ترجیحات زراعت سے ہٹا کر سروس اور انڈسٹری کی طرف ہوجانے سے پھر نظر آرہی ہے۔یہی حال پوری دنیا کا ہے۔غریب ملکوں کو مغربی ممالک اور اس کے غلام ادارہ اقوام متحدہ ورلڈ بینک، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ، W.H.O. نے بہکا رکھا ہے۔یہ مالی ادارہ غریب ممالک سے یہ تو کہتے ہیں کہ غریب عوام کو سرکاری رعایت Ssubsidy پر تعلیم، دوا، گیس، پٹرول نہ دو مگر یہ نہیں کہتے

کہ ہتھیار نہ خریدو، کار نہ خریدو، A.C. نہ خریدو بلکہ ان غیر ضروری اشیائی خرید پر تو قرضہ دے کر اکساتے ہیں۔ہندوستان کی جب آبادی کم تھی تو شرح ترقی کم تھی مگر آج ایک ارب سے زیادہ آبادی کے باوجود شرح ترقی ۹٪ ہے۔اور عموماً ملک غذائی اجناس میں خود کفیل ہے۔چین اور ہندوستان کی ترقی کے لئے امریکی ماہر اقتصادیات جیفری سچ Geoffry Sach اور نوبل انعام یافتہ ماہر اقتصادیات پروفیسر امریتہ سین کا کہنا ہے کہ یہ سب ہندوستان اور چین کی انسانی دولت Skilled Human resource کی بدولت ہوا ہے اور اگر ان کی آبادی اور اس کی پرورش پر اسی طرح دھیان دیا گیا تو ۲۰۵۰ء تک یہ ممالک امریکہ کو پیچھے چھوڑ دیں گے۔ان ماہرین کا مشورہ یہ ہے کہ ترقی پذیر کثیر آبادی والے ممالک کو دراصل اپنی انسانی دولت پر پیسہ خرچ کرنا چاہئے تاکہ اس کی قیمت مزید بڑھے۔اُن کا کہنا ہے کہ اِن ممالک کو اپنے یہاں تعلیم، خوراک، صحت پر زیادہ خرچ کرنا چاہئے اور اسلحہ اور دفاع وغیرہ پر خرچ کم کرنا چاہئے۔آج یہ حال ہے کہ امریکہ جیسا ترقی یافتہ دولت مند ملک غریبوں کی تعلیم، صحت کے عوامی بجٹ کی رقم کاٹ کر دفاعی خرچ پورا کررہا ہے۔عراق کی جنگ پر وہاں ہونے والے بالواسطہ اور بلاواسطہ خرچ کا اندازہ نوبل پرائز یافتہ معیشت داں جوزف سٹگلٹز نے ۲۰ کھرب ڈالر اور ٹیمپل یونیورسٹی امریکہ حساب کے پروفیسر جان ایلن پاؤلس نے ۱۰ کھرب ڈالر لگایا ہے۔موصوف کا کہنا ہے کہ اتنی رقم اگر پوری دنیا کے لوگوں میں تقسیم کی جائے تو ہر ایک کو ۱۵۰۰ ڈالر مل جائیں گے۔جبکہ اقوام متحدہ کے صحت اور خوراک کی امداد اور ہنگامی امداد کے اداروں کے بجٹ محض ۵-۸ ارب ڈالر سالانہ ہوتے ہیں جن سے غریب ممالک کے کروڑوں بچوں، بیماروں، ان پڑھوں، معذوروں اور مصیبت زدگان کی مدد ہوسکتی ہے مگر یہ ۵-۸ ارب ڈالر اقوام متحدہ کو نہیں مل پاتے۔جبکہ انہیں ممالک کے حکمراں ۴-۵ ارب ڈالر کے ہتھیار آرام سے خرید لیتے ہیں۔پاکستان، ہندوستان اور افغانستان کے زلزلہ زدگان کی امداد کے لئے درکار ۸-ارب ڈالر کا ایک تہائی بھی اکٹھا نہیں ہوا۔وہاں بمبار طیاروں، میزائیلوں، بموں، نیوکلیائی پن ڈبیاں خریدنے کے لئے پیسہ کی کمی نہیں ہے۔اگر آبادی بڑھتی ہے اور اس پر سرمایہ لگایا جاتا ہے تو وہ پیداوار بڑھاتی ہے وہ کھیت بھی بڑھاتی ہے تو پیداوار کی ضرورت ہوتی ہے کھیت، کھلیان، فیکٹری، کارخانہ زیادہ مال اور پیداوار بڑھاتے ہیں اس سے روزگار بڑھتا ہے۔اس طرح ایک طرف پیداوار بڑھتی ہے دوسری طرف روزگار بڑھتا ہے۔اب اس مشینی زمانہ میں آپ تیز رفتاری سے کارخانوں میں پیداوار بڑھاتے ہیں سائنسی طریقوں سے

جانوروں، مچھلیوں، مرغیوں وغیرہ کی افزائش بڑھاتے ہیں کھیتوں میں پیداوار بڑھاتے ہیں اور دوسری طرف آبادی کم کرتے ہیں تو انہیں کون استعمال کرے گا؟ جب یہ استعمال نہیں ہوں گے تو کارخانہ کیسے چلیں گے؟ جب کارخانہ نہیں چلیں گے تو روزگار کیسے پیدا ہوگا؟ آج کل بازار کی تلاش ہر ترقی یافتہ ملک کو ہے پہلے بھی تھی جب منڈی کی تلاش میں انگریزوں اور دیگر یوروپی اقوام نے دنیا کو غلام بنایا تھا۔ ایک انتہائی خود غرضانہ اور مکارانہ سوچ ہے کہ ہم مشینوں سے مال پیدا کرتے رہیں نسل پیدا کوئی اور کرے اور اُن کے اس مال کو جو اکثر غیر ضروری ہے اسے استعمال کرکے اُن کی معیشت کو طاقت پہنچاتا رہے۔ تو ایسے دنیا کیسے چلے گی؟ اگر ساری دنیا ''واحد اولاد'' فارمولہ کو اپنا لے گی تو کام کرنے کے لئے پیداوار کے لئے لوگ کہاں سے آئیں گے؟

خاندانی منصوبہ بندی کے حوالہ سے خواتین کی صحت کا بہت بڑا مسئلہ اٹھایا جاتا ہے جسے تجربہ خود رد کردیتا ہے اور سائنس اس کی نفی کرتی ہے کہ کم بچہ ہونے سے یا بالکل نہ ہونے سے خواتین زیادہ صحت مند ہوتی ہیں۔ اس کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے آج جو نسل ۴۰-۵۵ سال کی عمر کے مرحلہ میں ہے وہ دیکھ لے کہ اس کے والدین جن کے اوسطاً ۸-۱۰ بچہ ہوتے تھے وہ زیادہ صحت مند ہیں یا آج ''ہم دو ہمارے دو'' یا ''ہم دو ہمارا ایک'' والے زیادہ صحت مند ہیں؟ اس مسئلہ میں بھی جتنی سائنسی تحقیقات آئی ہیں وہ خاندانی منصوبہ بندی کے عمومی نظریہ کی حمایت نہیں کرتی ہیں۔ آج خواتین کی اموات اگر زچگی، حمل یا وضع حمل کے دوران ہورہی ہیں تو کیا کروڑوں خواتین سالانہ پستان، رحم اور خصیہ الرم کے کینسر سے نہیں فوت ہورہی ہیں؟ دراصل زندگی کو ٹکڑوں میں بانٹ کر اپنے محدود اور تغیراتی علم کے بل بوتے ہانکنے کی یہ سب خرابیاں ہیں۔ جنہیں ہم ایک خرابی کو دس ناقص خرابیوں سے دور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق ہے۔ امت مسلمہ کو جس کے پاس فاطر کائنات اور رب کائنات کی دی ہوئی رہنمائی ہے اسے اہل مغرب کے ایجنڈہ پر چلنے کی بجائے وہاں پر ہتھیاروں کی تجارت، عالمی مسئلہ ماحولیاتی آلودگی، پانی کی کم ہوتی مقدار، ایڈس اور دوسرے امراض خبیثہ کی کثرت، رشتوں میں کمزوری، خاندان کے بکھراؤ، ذہنی عدم اطمینان وسکون، غیر فطری ہم جنس شادیاں وغیرہ جیسے مغربی تہذیب کے ''تحفوں'' پر بحث شروع کرائیں اور ان کے سامنے نسخۂ کیمیا سے رہنمائی پیش کریں۔

❁ ❁ ❁

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۹۱ | ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ مطابق مئی ۲۰۰۷ء | شمارہ: ۵

نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند-۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ-/۱۰ روپئے، سالانہ-/۱۰۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ-/۶۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ-/۱۲۵ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم-/۱۵۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411077577 *(EDITOR)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman, Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P. Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	غزواتِ نبوی اور انسانی اقدار	فاروق اعظم عاجزؔ کھگڑیاوی	۶
۳	کاش ہم بھی درسِ عبرت حاصل کریں	مصلح الدین قاسمی	۱۵
۴	قادیانیت کا مکروہ چہرہ!	مولانا سعید احمد جلال پوری	۱۹
۵	سلاطین ہند کے عہد میں غیر مسلموں کی شرعی حیثیت	محمد شمیم اختر قاسمی	۳۳
۶	انٹرنیٹ کی ہلاکت خیزیاں اور ان سے بچنے کی تدابیر	مولانا مفتی محمود زبیر قاسمی	۳۸
۷	رپورٹ اجلاس ششم مجلس عاملہ رابطہ مدارس...	(مولانا) شوکت علی قاسمی بستوی	۴۲

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات مولانا نور الحسن ولد عبدالستار صاحب (مرحوم) مکتبہ معاویہؓ داؤد والا ڈاکخانہ کرم علی والا، براستہ شجاع آباد ضلع ملتان کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

اس بات کی وضاحت بارہا کی جاچکی ہے کہ ہماری دینی درسگاہوں کا اصل موضوع علوم کتاب وسنت ہیں، انھیں کی افہام وتفہیم، تعلّم وتعلیم، توضیح وتشریح، تعمیل واتباع اور تبلیغ ودعوت اور ایسے رجال کار پیدا کرنا ہے جو اس تسلسل کو قائم رکھ سکیں بس یہی ان مدارس کا مقصود اصلی ہے۔

ماضی قریب میں ان تعلیم گاہوں نے اس عظیم امانت کی حفاظت اور اس قابل صد فخر وراثت کو اگلی نسلوں تک منتقل کرنے میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے وہ ہماری علمی وثقافتی تاریخ کا ایک زریں باب ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف اپنے وپرائے سبھی کرتے ہیں اور آج کے انتشار پذیر اور مادی فروغ کے دور میں بھی یہ اسلامی مدارس اپنے وسائل وذرائع کے مطابق مصروفِ عمل ہیں اور ملت اسلامیہ کی اولین واہم ترین بنیادی ضرورت کی کفالت کررہے ہیں۔ اور اس سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کفروشرک کے گھٹاٹوپ اندھیرے اور مذہب بیزاری کے اس ماحول میں اسلامی تہذیب وثقافت اور دینی رسوم عبادت کے جو روشن آثار نظر آرہے ہیں وہ انھیں دینی درسگاہوں کی خدمات کا ثمرہ ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث ایک لازوال وغیر متبدل حقائق ہیں۔ اسی کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زمانہ ہر آن تغیر پذیر ہے اور ہر جدید دور اپنے جلو میں نئے نئے مسائل لے کر آتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ انسانی افکار ونفسیات میں بھی فرق آجاتا ہے، پھر جدید علوم کی ترقیات اور سائنسی ایجادات واکتشافات دنیا کا رنگ بدلتے رہتے ہیں جس کے زیر اثر اس تغیر آباد عالم میں ان لازوال علوم کی امین وحامل امت کو نئے حالات وواقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور علوم نبوت کے داعی ومحافظ ہونے کی حیثیت سے ہر دور کے تقاضوں اور اس کے

چیلنج کا مقابلہ اس احتیاط سے کرنا پڑتا ہے کہ اصل مقصود پر آنچ نہ آنے پائے۔ چنانچہ ہر دور میں اساطین امت نے وقت کے تقاضوں کے تحت تعلیمی خانوں میں جو رنگ بھرا اور حذف واضافہ حک وترمیم کا جو بھی عمل کیا وہ اس چابکدستی احتیاط اور بالغ نظری کے ساتھ کیا کہ اصل امانت یعنی منصوص ومنقول کی پوری پوری حفاظت اور اس کی روح کی بقا کا کلی طور پر اہتمام کیا اور کسی جہت سے بھی علوم دینیہ کی حیثیت اور مقام ومرتبہ کو مجروح نہیں ہونے دیا۔

خود ہمارے اکابر رحمہم اللہ وکثر اللہ امثالہم نے اپنے عہد میں دارالعلوم دیوبند اور دیگر اسلامی درسگاہوں کے لئے نظام تعلیم کا جو نقشہ مرتب فرمایا تو حالات وزمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی اساس اگرچہ رائج الوقت نصاب ''درس نظامی'' ہی پر رکھی مگر اس کمالِ بصیرت کے ساتھ کہ کتاب وسنت کی بالادستی کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ اسلاف کے اسی طرز فکر اور طریقۂ کار کی پیروی کرتے ہوئے ابھی ماضی قریب میں دارالعلوم دیوبند کے ارباب حل وعقد نے ملک کے صاحب نظر علماء اور دینی علوم میں مہارت وتجربہ رکھنے والے اصحاب درس فضلاء کے مشورہ اور اتفاق سے مدارس دینیہ کے نصاب درس ونظام تعلیم میں مفید ترمیم اور حذف واضافہ کیا ہے جس میں علوم کتاب وسنت کی بالادستی کو قائم رکھتے ہوئے تقاضائے وقت کے مناسب بعض ایسے علوم وفنون کا اضافہ کیا گیا ہے۔ جو پہلے نصاب میں شامل نہیں تھے۔

ان سب کے باوجود ہمدردان ملت کا ایک طبقہ مدارس دینیہ کے رائج نظام تعلیم کو ناقص، غیر مفید اور ان کے فضلاء کو وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر اور سماج کے لئے غیر نفع بخش بتاتا ہے، اور قوت کے ساتھ یہ تحریک چلارہا ہے کہ مدارس دینیہ اپنے مقصد وموضوع اور طرز فکر وعمل کے برخلاف کتاب وسنت کو چھوڑ کر یا کم از کم انھیں ثانوی درجہ میں رکھ کر دیگر سرکاری ونیم سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نہج پر اپنا نظام تعلیم ونصاب درس مرتب کریں۔ ہمارے مدارس کے انہی ناصحین کی کرم فرمائیوں سے شہ پاکر موجودہ حکومت مرکزی مدرسہ بورڈ کے عنوان سے مدارس کو یرغمال بنانے کے لئے جال بچھارہی ہے جس میں پھنس کر مدارس اپنی اسلامی روح کو باقی نہیں رکھ پائیں گے۔ اس مدرسہ بورڈ کے قیام کا مقصد اصلی بھی یہی ہے کہ ان دین کے سرچشموں کے سوتوں کو بند یا کم از کم کسی طرح گدلا کردیا جائے۔

قدیم وجدید کے اختلاف فکر ونظر کا یہ سلسلہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اس کی کڑیاں عہد غلامی سے جڑی ہوئی ہیں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اسی

اختلاف نظریات کے دو الگ الگ مظہر ہیں۔ اور دونوں نظریوں کے حق میں اب تک اس قدر لکھا اور کہا جاچکا ہے کہ اب کسی جانب سے بھی اس پر اضافہ دشوار ہے اس لئے کیا اچھا ہوتا کہ مسلم اقلیت کے معاش ومعاد کے فکر سے پریشان حکومت اور ہمارے یہ ہمدردان قوم وملت مدارس دینیہ کو مطعون اوران کے فضلاء کو بے حیثیت کرنے کی جدوجہد کے بجائے اپنے جہد وعمل کا رخ قوم کے ان نونہالوں کی طرف پھیر دیتے جو دینی علوم اور عصری فنون دونوں سے برگشتہ ہیں اور آج بھی جب کہ ہر چہار جانب سے تعلیم کی اہمیت کا چرچا ہورہا ہے ایسے بچوں کی تعداد زیادہ ہے جو یا تو سرے سے تعلیم گاہوں کا رخ بھی نہیں کرتے یا ابتدائی وثانوی مرحلہ میں پہنچ کر تعلیمی سلسلہ کو منطقع کرکے گھر بیٹھ رہتے ہیں۔ جیسا کہ سچر کمیٹی نے اعداد وشمار کے ذریعہ اس کو یوں عیاں کردیا ہے کہ اس سے کسی ذی ہوش کو انکار نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر یہ ہمدردان ملت، قوم کے ایسے بچوں کو حصول تعلیم کی جانب متوجہ اور راغب کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو یہ قوم کی ایک عظیم خدمت ہوگی اور خود ان کے نقطۂ نظر کے مطابق (ان قدیم دینی درسگاہوں کو ان کے موضوع ومنہاج سے ہٹاکر) جو مقاصد وفوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں اس صورت میں ملت کے ایک بڑے حصہ کو ذہنی و عملی انتشار میں مبتلا کئے بغیر کئی گنا زائد وہ فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اور اگر اس تگ ودو اور تقریر وتحریر کا مقصد مدارس دینیہ کے خلاف محض پروپیگنڈہ اور قدیم وجدید کے پرانے اور کسی حد تک مردہ مسئلے کو پھر سے زندہ کرنا ہے تو ہمارے ان دانشوروں کو یہ بھولنا نہیں چاہئے کہ ارباب مدارس اس بارے میں تہی دامن نہیں ہیں ان کے منہ میں بھی زبان اور ہاتھ میں قلم ہے۔ اور محض بلند بانگ دعووں اور سخن طرازیوں کے بجائے ان کی پشت پر علمی، دینی اور معاشرتی اصلاح و خدمات کی ایک مضبوط ومستحکم تاریخ ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں الجھ کر انتشار پذیر ملت کو مزید انتشار میں مبتلا کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں اس سلسلے میں ہمارا نظریہ تو بس یہ ہے۔

لوگ سمجھیں ہمیں محروم وقار و تمکیں
وہ نہ سمجھیں کہ مری بزم کے قابل نہ رہا

❁ ❁ ❁

غزواتِ نبوی اور انسانی اقدار

از: فاروق اعظم عاجزؔ کھگڑیاوی
شریک دورۂ حدیث دارالعلوم دیوبند

محسنِ انسانیت ﷺ کی پاکیزہ سیرت کے پیرایہ میں اسلامی تعلیمات ایک جامع ومکمل دستورِ حیات ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی روشن سیرت سے انسانی معاشرہ میں ایک حیرت انگیز انقلاب اور انسانیت کی خشک کھیتیوں میں سرسبزی وشادابی آئی؛ لیکن آپ کے بے مثال اخلاق وکردار اور انسانیت نوازی انتہائی روشن ونمایاں ہے۔

یوں تو آپ پوری دنیا کے لئے سراپا رحمت بن کر آئے تھے لیکن جنگ جیسے نازک موڑ پر بھی بجائے اس کے کہ رحم وکرم۔ عدل وامن اور عفودرگذر کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا، ایسے مواقع پر آپ کی یہ صفات اور زیادہ روشن ہوکر سامنے آتی ہیں۔

چناں چہ آپ کا جنگی رویہ اور قیدیوں کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا تھا اور آپ کے ذریعہ طے شدہ جنگی اصولوں میں انسانی جان کی کس قدر اہمیت لوگوں کے دلوں پر بٹھائی گئی، اور آج امن ومساوات کا ڈھنڈورہ پیٹنے والی مہذب ومتمدن قوم کا نظریۂ جنگ کیا ہے؟ ان کے پاس چند دفعات قابلِ ستائش ہیں بھی تو کس کی دین ہیں؟ اور اس کے پس پردہ قوتِ تنفیذ کس قدر کارفرما ہے؟ ذیل کی سطور میں انھیں حقائق سے پردہ اٹھایا جائے گا۔

غزوۂ نبوی یا فطری جنگ کا فلسفہ: قانونِ اسلام یا احکامِ الٰہی میں سے ہر حکم کی بنیادی طور پر دو جہتیں ہیں: مصالح کا حصول، مفاسد کا دفع۔ مثلاً کسب حلال کرو تو چوری ڈکیتی اور حرام کاری سے بچوگے۔ چوری ڈکیتی میں گرفتار ہوئے تو مستحق سزا۔

جس طرح انسانی زندگی میں معمولی مرض کا قبل از وقت علاج کیا جاتا ہے اور جب چھوٹی سی پھنسی جان لیوا پھوڑے کی صورت اختیار کرلیتی ہے تو اس حالت میں پورے جسم کو دائمی سکون پہنچانے کے لئے انسانی بدن کے اس حصہ پر نشتر لگانا ناگزیر ہوجاتا ہے، کبھی تو مریض خود یہ کام انجام دیتا ہے اور کبھی اس کی معاونت کے لیے پورے خاندان کی محنتیں اس کے ساتھ لگی ہوتی ہیں۔ انسانی

معاشرہ کی مثال بھی جسم انسانی ہی کی سی ہے، اگر جسم صحت مند ہے تو سوچ، فکر اور عمل کی قوتیں بھی صحت مند رہیں گی ورنہ وہ چلتا پھرتا ہڈیوں کا ڈھانچہ کہلائے گا۔

انسان کی معاشرتی زندگی میں اس کے جان ومال، عزت وآبرو، ایمان واعمال وغیرہ کو جو چیز بھی آزمائش وخطرے میں ڈالے وہ فتنہ ہے اور اسی زندگی میں جو شئے ناہمواری پیدا کردے وہ فساد ہے، ان دونوں کا سدّ باب ایک ایسا انسانی فریضہ ہے جن کا کوئی انکار نہیں کرسکتا، اور اس کے لیے تگ ودو اور طاقت وقوت کا استعمال بھی عین فطرت کے مطابق ہے۔ قرآن کہتا ہے: فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ کسی کا قتل اس کی ذات سے متعلق ہوتا ہے لیکن فتنہ کا تعلق اجتماعیت سے ہے اور پورے معاشرہ کے خطرے میں پڑجانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

غور وخوض کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ طاقت وہتھیار کے صحیح استعمال پر اپنی انسانی زندگی کا مدار ہے۔ انسان اگر اپنی روزمرہ کی زندگی کا بہ نظر غائر مطالعہ کرے تو اس کا زاویۂ فکر اسی نقطہ پر پہنچے گا کہ ہر مثبت شے اپنے بالمقابل منفی شے سے آمادۂ جنگ اور برسرِ پیکار ہے، جیسے دوا کا استعمال جسمانی بیماریوں کے خلاف ایک جنگ ہے۔ اسی طرح تہذیب وتمدن کی دنیا میں جہالت وناشائستگی کا قلع قمع کرنے کے لیے تعلیم وتربیت سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

اب جو جنگ فطرت کے مطابق انسانی معاشرہ کے جانی ومالی اور اخلاقی تحفظ کے لیے فتنۂ وفساد کی سرکوبی کرتی ہے اس کو فطری جنگ کہا جائے گا، اور اس کو جہاد اسلامی اور غزوۂ نبوی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ تعلیمات نبوی سے ملنے والے اس اصول کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ فطری جنگ کا اصل ہدف کیا ہے؟ اس کے مقاصد دولت واقتدار کا حصول، جذبۂ انتقام کی تسکین، یا نفسانی خواہشات کی تکمیل اور نسل کشی نہیں بلکہ اس کا ہدف اصلی صرف اور صرف انسانیت کی سربلندی، آدمیت کا قیام اور اخلاقی قدروں کی حمایت ہے اور انسان کو اس کا پیدائشی حق وفرض ”جیو اور جینے دو“ کو ٹھوس کرکے اس میں خوشگواری پیدا کرنا ہے۔ درحقیقت اسلام کا پورا نظام ہی انسانی زندگی کی بقا اور اس کی شادابی کے لیے ہے۔

غیر فطری جنگ کی حقیقت: اسی کے ساتھ غیر فطری جنگ کا منظرنامہ بھی دیکھتے جایئے، اس جنگ میں بہیمیت کا انتہائی گہرا رنگ ہوتا ہے، انسانی قدریں مفقود ہوتی ہیں اور حرص وہوس، نفسانیت اور حصول اقتدار ہی کا غلبہ ہوتا ہے، پھر عورت کیا، بچے کیا، بوڑھے، معذور اور بیمار کیا ہر ایک کو تختہ مشق بنایا جاتا ہے، ہر طرف خون خرابہ کا دور دورہ ہوتا ہے، وقت کی کوئی قید نہ حملوں کا کوئی

اصول وضابطہ اور نہ ہی کسی مقدس مقام کا کوئی احترام۔ انھیں کی بے ضابطگی کو قرآن نے انتہائی مدلل انداز میں اس طرح ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مالک ارض وسما اور رب حکیم فطری جنگوں کے ذریعہ فسادیوں اور شرانگیزوں کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کا انتظام نہ فرماتے تو نہ کوئی دیر وکلیسہ، چرچ وگرجا گھر، اور نہ ہی کوئی عبادت گاہ وسجدہ گاہ محفوظ رہ پاتی اور یہ شری لوگ زمین کی خوشگواریوں کو خاک میں ملا کر فتنہ وفساد سے اسے آلودہ کرڈالتے۔

عہد نبوی سے قبل فطرت کے خلاف ہونے والی جنگوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ عرب کی غیر متمدن قوم کی جنگ، روم وایران کی متمدن قوموں کی جنگ۔

غیر متمدن قوم کا طرز جنگ: اس قوم کے نزدیک انسانی جان کی کوئی قدر واہمیت نہ تھی، اور جنگ ان کا قومی پیشہ بن گیا تھا، ادنیٰ ادنیٰ بات پر شمشیریں بے نیام ہوجاتیں، ایک پشت سے دوسری پشت کی طرف یہ جنگیں منتقل ہوتی رہتی تھیں، انتقامی جذبہ کی تسکین اور حرص وہوس کی تکمیل کے لیے تمام غیر انسانی سلوک روا رکھے جاتے بدعہدی، لاشوں کی بے حرمتی، ناک کان کاٹ کر اس کا ہار پہننا، دشمنوں کی کھوپڑیوں میں شراب پینے کی نذر ماننا، ان کو نذر آتش کردینا، قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرنا اور قتل کرادینا بلکہ انسانیت کے تمام حدود کو پار کرکے سنگدلی و درندگی کے اس چوراہے پر پہنچ گئے تھے کہ انسانی کلیجے چبا ڈالتے تھے اور اس سب پر طرہ یہ کہ اس کو فخر وشجاعت کا ذریعہ سمجھتے۔ اس طرح کی خونی داستان سے دور جاہلیت کی پوری شاعری بھری پڑی ہے جو اہل عرب کے نزدیک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

متمدن قوم کا نظریۂ جنگ: اس طرح کی صورت حال تو عرب جیسے اجڈ اور ان پڑھ قوم کی تھی لیکن جو قوم مہذب ومتمدن کہلاتی تھی اس کا جنگی رویہ بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا، ان کے شب وروز بھی ظلم وبربریت کی خونی داستان سے رنگین تھے، جنگ کے حوالہ سے کوئی اصول وقانون نہ تھا، زمین کے جس حصہ پر وہ چڑھ آئے وہاں قیامت صغریٰ برپا کردیتے، ان کے سپہ سالار کی حیثیت حضرت اسرافیل کی سی ہوتی اور اس کا حکم ''صور'' ہوتا جنگ کا بگل بجتے ہی یکساں طور پر بوڑھوں، بچوں، عورتوں، بیماروں، معذوروں، راہب وگوشہ نشینوں کو، فصلوں، باغات اور آبادیوں کو تہس نہس اور تہہ وبالا کردیا جاتا۔ ان کے اندر مذہبی عناد بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، متبرک مقامات کی بے حرمتی بھی جنگ کا ایک حصہ تھا، عیسائی، یہودی اور مجوسی میں سے جب بھی کوئی ایک دوسرے پر غالب آتا تو اس کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکتا، ہزاروں لاکھوں جانیں ضائع ہوجاتیں، سفراء کو بھی نہیں بخشا جاتا، بدعہدی بھی ایک عام چیز تھی؛ بلکہ نوشیرواں بادشاہ جس کی عدالت مشہور تھی اس کا دامن بھی

انسانی خون سے رنگین ہوئے بغیر نہ رہا۔ چنانچہ ۶۴۰ء میں اس نے شام کے دارالحکومت پر قبضہ کیا تو شہریوں کے قتل عام اور عمارتوں کے مسمار کرنے کا حکم دیا اور پوری آبادی کو قید کرکے خاکستر کردیا۔

اس مہذب قوم کے وحشیانہ کھیل اور خون تفریح کا سامان جنگی قیدی ہوا کرتے تھے، پہلے تو ان قیدیوں کو زنجیروں میں جکڑ دیتے پھر اذیت ناک سلوک کرکے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ ۶۱۱ء میں جب ہرقل کی بیوی کے جنازے میں جاتے ہوئے ایک لونڈی نے زمین پر تھوک دیا تو اسے اس ناقابل معافی گستاخی میں اپنی جان دے کر اس کی قیمت چکانی پڑی، اسی طرح جب قیصر روم شکست کھا کر ایران کا قیدی بنا تو اس کی پوری زندگی غلامی میں گزری اور مرنے کے بعد اس کی کھال کھینچوا کر بھس بھروا دیا گیا۔ (اخلاق رسول ۸۲/۲)۔

اور لطیفہ کی بات تو یہ ہے کہ یہ سارا ڈرامہ کسی اہم مقصد کے تحت اسٹیج نہیں دیا جاتا بلکہ صرف شہرت ونا موری کے حصول اور شاہانہ ہیبت وجلال کے اظہار کے لیے ہوتا تھا۔

بعثت نبوی اور آپؐ کی صفت رحمت: اسلامی آئین ہی کا دوسرا نام قانونِ الٰہی ہے اور اسی قانون کو قرآنی شکل میں رب کریم نے ۲۳/سالہ عرصہ میں اپنے انتہائی برگزیدہ بندہ محمد ﷺ پر اتارا، پھر اس معلّم کائنات نے اپنے تمام تر فضائل وکمالات کے ذریعہ خدا کی زمین پر اس کو نافذ کیا، اور بھٹکتی انسانیت کو صراط مستقیم پر گامزن کیا، دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچایا اور انسانی قدروں کی پامالی پر روک لگائی، زندگیوں میں اعتدال پیدا کیا، دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے کی معرفت اور اس کی اطاعت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں ابدی کامرانی کا مژدہ سنایا۔

چنانچہ فرمایا میں صرف عربوں کے لیے خدا کا نبی نہیں ہوں بلکہ انسانیت عامہ کے تمام افراد کے لیے نبی ہوں، میں تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، جو نصب العین میں لایا ہوں اس سے بہتر تمہارے لیے کوئی نہیں لایا۔ بس شرط یہ ہے کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کہہ لو کامیاب ہوجاؤ گے۔

دربار نبوی میں انسانی جان کی پاسداری: یوں تو آپ کی زندگی مکمل دستور حیات ہے زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس کو آپ نے تشنہ رکھا ہو؛ تاہم تاریخ رسالت کا سب سے روشن باب آدمیت کا قیام ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: ''تمام انسان انسانی حقوق میں برابر ہیں بشرطیکہ قانون کے پابند ہوں''۔ عدل کا مطلب یہی ہے کہ ہر شخص کو اس کا پورا پورا حق ملے اور اس میں رخنہ ڈالنے والوں کو سخت سزا دی جائے۔

قرآن میں بے شمار جگہوں پر عدل کا حکم اور سینکڑوں مقامات پر ظلم وسرکشی کی پرزور انداز میں مذمت کی گئی ہے اور اس پر کڑی ضرب لگائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلا امتیاز مذہب اور قبائل مشرکین اور

یہود ونصاریٰ آپ کے پاس اپنی شکایات لاتے، فیصلہ چاہتے اور انصاف لے کر واپس ہوتے، حق والوں کو حق ملتا اور مجرموں کو سزا۔

اسلامی جنگ کے اصول وضوابط: جنگ کے سلسلے میں حضور نے اولاً گذشتہ جنگی طریقوں کی اصلاح کی، اس کے بعد اس کے لیے ایسے پاکیزہ اصول طے کیے کہ یہی جنگ جس کا نام سنتے ہی روح کانپ اٹھتی تھی اور مفتوح قوم کھلی آنکھوں موت کا مشاہدہ کرنے لگتی تھی، انسانیت کی بے راہ روی اور اخلاقی، جانی اور مادی تحفظ کا ذریعہ بن گئی، اولاً صلح وامن سے کام لینے کی تاکید کی گئی اور انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں سخت شرائط کے ساتھ تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھی مسلسل تیرہ سال ظلم وستم کی چکی میں پستے رہے اور بغیر کسی جرم وخطا کے ان کو ان کے گھروں سے نکال کر جلاوطن کردیا گیا، لیکن جلاوطنی کے بعد بھی تعاقب جاری رہا تو انھیں جنگ کی اجازت دی گئی، لیکن اجازت اس طرح کہ امیر جیش کے حکم کے بغیر صف سے نکلنا بھی گوارہ نہ تھا، ناحق خون بہانے کی قطعاً اجازت نہیں دی گئی؛ بلکہ جو بالمقابل ہے اسی سے لڑو، لاشوں کو مثلہ نہ کرو، شب خون نہ مارو، اذیت دے کر قتل نہ کرو، راہبوں، گوشہ نشینوں، معذوروں، عورتوں، بچوں بوڑھوں کو نہ چھیڑو، عمارت نہ ڈھاؤ، پھلدار درخت نہ کاٹو، جو لوگ تمہارے قیدی بن جائیں ان سے حسن سلوک کا معاملہ کرو، ان کو کھانا کھلاؤ اور لباس کا خیال رکھو۔ قرآن نے قیدیوں کے کھانا کھلانے کو بہترین عمل قرار دیا ہے۔ پھر ارشاد ہوا آبادی کو نہ اجاڑو یہاں تک کہ فخر وغرور سے پُر نعرے بازی سے بھی حضور نے منع فرمایا۔

ان اصول اور طریقہ کار کو آپ اور آپ کے جاں نثار ساتھیوں نے عملی جامہ پہنا کر غیر مسلم قوم کے ظالمانہ جنگی طریقوں کی تمام راہیں مسدود کردیں، ان اصول وضوابط سے انسانی جان کی غیر معمولی قدر واہمیت اور اس کے احترام کا پتہ چلتا ہے۔

غزوات نبوی اور اسیرانِ جنگ: یوں تو آپ کی ذات انسانیت کے لیے سراپا رحمت اور مردوں کے مسیحا تھی لیکن آپ کی انسانیت نوازی جنگ جیسے نازک موڑ پر بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے بلکہ ایک قدم آگے ہی۔

غزوات نبوی کی تو ایک طویل فہرست ہے لیکن جنگی قیدیوں کے حوالہ سے یہاں صرف دو غزوے ہی کا تذکرہ کیا جائے گا جو اس سلسلے میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ غزوۂ بدر اور فتح مکہ۔ اس لیے کہ یہ قیدی ہی نہیں بلکہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے حضور اور اُن کے ساتھیوں کو پل بنا کر تیرہ چودہ سال کی طویل مدت تک ظلم وتعدی کے تمام سرحدوں کو پار کرکے وطن سے بے وطن کردیا، جب یہ پردیسی اجنبی شہر میں اطمینان کی سانس لینے لگے تو اس کو بھی قریش قوم ہضم نہ کرسکی اور مدینہ پر بھی

کاٹ کھانے کے لیے مار کھانے کے لیے چڑھ آئی لیکن رب برحق نے انھیں اوندھے منہ گراکر انتہائی شرمناک شکست سے دوچار کیا اور ستر قید ہوکر مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

غزوۂ بدر! لیکن قربان جایئے اس محسنِ انسانیت پر جس نے ان کی دوہری دشمنی کے باوجود ان کے ساتھ اچھے سلوک کی تلقین کرکے اپنے مختلف ساتھیوں میں تقسیم کردیا، تاریخ شاہد ہے کہ نبی کے ان دیوانوں نے مہمانوں کی طرح ان قیدیوں کی دیکھ بھال کی، خود کھجور پر اکتفا کرکے انھیں روٹی کھلائی، ایک قیدی ''ابوعزیز'' کا بیان طبری نقل کرتے ہیں، میں جن انصاریوں کے پاس قید تھا جب وہ لوگ صبح وشام میرے سامنے کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے، خود کھجوریں اٹھالیتے مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ کو واپس کردیتے۔

جب یہ قیدی مسجد میں لاکر باندھے گئے اور بندھے قیدی رات کو بندش کی تکلیف سے کراہ رہے تھے جس کی وجہ سے حضور ﷺ کی نیند اُڑ گئی اور آپ ﷺ پوری رات کروٹیں بدل رہے تھے، صحابہ نے یہ سمجھ کر کہ یہ بے چینی چچا کی وجہ سے ہو رہی ہے عباس کی بندش ڈھیلی کردی لیکن اس محسنِ اعظم نے تمام قیدیوں کے لیے یہ حکم جاری کیا اس لیے کہ درحقیقت اس کی بے تابی کے پس پردہ خونی رشتہ نہیں بلکہ انسانی ناطہ کارفرما تھا۔

ایک قیدی سہیل بن عمرو نہایت فصیح وبلیغ شخص تھا حضور کے خلاف ہمہ وقت زہرافشانی کرتا رہتا، حضرت عمرؓ نے ان کے دانت اکھڑوا دینے کا مشورہ دیا حضور نے سختی سے منع فرمایا، ان قیدیوں کے گندے کپڑوں کے بدلنے کا حکم دیا۔ جب ان اسیروں کے متعلق مشورہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے تمام کو تہہ تیغ اور عبداللہ بن رواحہؓ نے نذر آتش کردینے کا مشورہ دیا اور حضرت صدیقؓ نے فدیہ لے کر رہا کردینے کی رائے دی، محسنِ انسانیت نے آخری مشورہ پر فیصلہ فرمایا لیکن رحم وکرم کی بارش یہیں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس سراپا رحمت نے فدیہ میں بھی ان قیدیوں کی حیثیتوں کا مکمل لحاظ رکھا، چنانچہ جو صاحب ثروت تھے ان کا فدیہ مال طے ہوا، جو صاحب علم وفن تھے ان کی رہائی کا معاوضہ لکھانے پڑھانے کا کام سپرد ہوا اور جو اس قابل بھی نہ تھے اور بالکل تہی دست تھے ان کو عفو ودرگزر کا تحفہ دے کر ویسے ہی رہا کردیا۔

فتح مکہ: فتح مکہ انسانی اقدار کی حقیقی تاریخ کو ظاہر کرتا ہے، یہ دن تو انتقام کی پیاس بجھانے کا دن تھا، لیکن اس معلم کائنات ﷺ نے اپنے جانشینوں کی ایسی تربیت کی تھی کہ انھوں نے نقشۂ عالم پر آپ کی رحمت عالم ہونے کا ایسا اثر چھوڑا کہ چشم فلک نے دیکھ لیا کہ انسانیت کے سب سے بڑے محسن کے ایوانِ حق وانصاف میں انتقام پر انسانیت کا غلبہ ہے۔

جبکہ اس موقع پر اس عظیم فاتح کے ساتھ عظیم لشکر ہے، اسلحے ہیں، مکمل طاقت ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے سامنے ماضی کے دلخراش واقعات بھی ہیں، ''شعب ابی طالب'' کی تین سالہ قید وبند، آہ وبکا، بھوک وپیاس، اضطراب وبے چینی اور بے پناہ مصائب وآلام کی دردانگیز روداد بھی، تپتی ہوئی چٹانیں، شعلے اگلتے سنگریزے، کھجور کے کھردرے تنے، تانت کی رسیاں، راہ کے کانٹے، کوڑے کرکٹ، اونٹ کی اوجھ، گلے کے پھندے، چٹائیوں کے رول اور دھوئیں سب کے سب آج ایذارسانوں کے خلاف انتقام کے شرارے کو ہوا دے رہے تھے۔ انتقام انتقام!! کی صدائے بازگشت سے پوری فضا گونج رہی تھی، گردوپیش بھی اپنے زبان حال سے ہم نوائی کررہے تھے دشمنوں کو ہست سے نیست کرنے کا اس سے شاندار وخوشگوار کون سا موقع ہوسکتا تھا کہ دشمنوں کو خود اپنی تباہی کا یقین ہوگیا تھا اُس کے باوجود محسنِ انسانیت اور مُردوں کے مسیح ﷺ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہوکر بقائے انسانی کے اجزائے ترکیبی (امن ومساوات اور آزادی) کا اس طرح اعلان کرتے ہیں کہ انسانو! مکہ ہمیشہ سے دارالامان ہے کسی باخدا انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ آج کے بعد اس سرزمین میں خون بہائے اور اُس کی سرسبزی وشادابی کو نقصان پہنچائے آج جاہلیت کے خاندانی اور نسلی غرور کا خاتمہ کردیا گیا ہے تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ جاؤ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوجاؤ اب تم سب کے سب آزاد ہو!!!

ظلم وتعدی اور خون خرابے کے بجائے آج عفوودرگذر کا سیلاب آگیا تھا پھر کیا ہوا اس عظیم فاتح کی جوان بیٹی زینبؓ کا قاتل ہبار ابن الاسود محبوب چچا ''حمزہ'' کے خون سے ہولی کھیلنے والا حبشی اور اسی حمزہ کے کلیجے کو چبانے والی ہندہ اور دشمن اسلام ابوجہل کا بیٹا دشمن پیغمبر عکرمہ سب کو عفووکرم کا بے مثال اور عظیم تحفہ ملتا ہے عبداللہ ابن سرح، سارہ، کعب بن زہیر جیسے جانی دشمن کو بھی معافی کا پروانہ ملتا ہے، اتنی بڑی فتح کے موقع پر صرف حویرث بن نقیہ، عبدالعزی ابن خطل اور مقیس ابن صبابہ کو قتل کیا گیا وہ بھی قصاصاً نہ کہ فتح وظفر اور طاقت وقوت کے غرور پر۔

وہی عرب قوم جس کی بداطواری وبدکرداری مشہور عالم تھی جس کی بے راہ روی کی خونی داستان سے آج بھی انسانی دُنیا کانپ اُٹھتی ہے؛ لیکن یہی قوم جب نبی رحمت، سراپا حلم وعفو اور انسانیت کے عظیم محسن کے آغوشِ تربیت میں آتی ہے تو کل ۸/سال کی مدت میں اُس کی زندگی میں ایک حیرت انگیز انقلاب برپا ہوگیا باوجود تمام تر طاقت وقوت کے اپنے نبی کے حکم سے سرِ مو انحراف گوارہ نہ تھا، نبی کے ایک اشارے پر جان چھڑکنے کے لیے ہمہ وقت یہ قوم تیار وبیدار رہتی اور اُس کی زندگی کا ایک سانس بھی طریقۂ نبوی سے ہٹ کر نہیں نکلتا۔

غزوات نبویؐ اور موجودہ جنگی صورتِ حال: اب ہمیں دورِ حاضر کے تناظر میں غزوۂ نبوی اور غیر فطری جنگ کا تجزیہ کرنا ہوگا کہ اسلامی جنگوں کے اخلاقی دنیا پر کیا اثرات پڑے، اُس کے برخلاف دوسری جنگوں میں انسانی دنیا کی اخلاقی، مادی اور جانی اقدار میں کتنا بڑا بھونچال آیا۔

مثال کے طور پر پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں انسانیت سوزی کی دل دوز تاریخ اور ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد افغانستان اور عراق میں انسانی قدروں کی زبردست پامالی اور اُن کی کھوپڑیوں سے تیسری جنگ عظیم کے اُٹھتے شعلے۔

درحقیقت یہ جنگ نہیں بلکہ ظلم وعدوان اور انسانیت سوزی کی آخری شکل ہے، جس کی مختصر روداد یہ ہے کہ دونوں عظیم جنگوں میں ایک محتاط اندازے کے مطابق چار کروڑ انسانی جانیں تلف ہوئیں، اسلام کے خلاف دہشت گردی کے عنوان سے امن ومساوات اور انسانی قدروں کی دھجیاں اڑانے والوں نے افغانستان کے لاکھوں بے گناہ بچوں بوڑھوں اور عورتوں کو بم وبارود کے نذر کردیا اور ایک خوشگوار اور امن وامان کا گہوارہ ملک کو راکھ کی ڈھیر میں تبدیل کردیا، اُس کے بعد بھی جب پیاس نہ بجھی تو انسان نما بھیڑیوں کی للچاتی نگاہیں عراق کی طرف اُٹھیں اور وہاں کے تقریباً ۲ر لاکھ بے قصور انسانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھائی، ان درندوں نے ''ابوغریب'' جیل میں انسانی قدروں کا جس طرح مذاق اُڑایا اور اُڑا رہے ہیں کہ اُسے حیوانیت، سفاکیت اور شیطنت کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے؟ ان کے سیاہ کرتوت کی تعبیر کے لیے لغات کے ذخائر میں کوئی لفظ بھی نہیں۔ ان نفس پرستوں نے عین تہوار کے دن ایک ملک کے صدر کو اُسی کی زمین پر اذیت ناک موت کا ایسا تحفہ دیا کہ انسانی اقدار کے چیتھڑے اُڑ گئے، ہوس کی پجاری قوم نے ایک شخص، ایک ملک یا ایک مذہب پر تیشہ زنی نہیں کی بلکہ پوری اخلاقی دُنیا پر بزدلانہ حملہ کیا۔ اُس کے برعکس غزواتِ نبوی کا بھی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک فطری جنگ ہے اور اُس کے اندر ظلم وزیادتی سے پاک غیر جانبدارانہ حصول اور عدل ومساوات کی جو سچی تصویریں ملتی ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ گذشتہ قوم کی جنگی بے راہ روی ختم ہوئی بلکہ انسانی قدروں کو ایک نئی روح اور دائمی زندگی مل گئی۔

چناں چہ ایک تحقیق کے مطابق عہد نبوی کے تمام غزوات میں کل ۶۵۶۴ قیدی اور ۷۵۹ لوگ مقتول ہوئے اور مسلمانوں میں ۲۵۹ لوگ شہید اور ایک بزرگ قید ہوئے اور تاریخ گواہ ہے کہ دشمنوں کے ان قیدیوں میں سے ۶۳۴۸ قیدیوں کو اس نبی رحمت ﷺ نے غزوۂ حنین کے بعد بغیر کسی شرط کے رہا کردیا، صرف ایک شخص قصاصاً قتل ہوا پھر ۲۱۵ قیدیوں میں ۷۰ کو بدر میں فدیہ لے کر رہا کردیا گیا اُس کے بعد جبالِ تنعیم پر مسلمانوں پر حملہ کرتے ہوئے ۸۰ لوگ قید ہوئے اُن کو بھی اسی طرح رہائی ملی۔

واقعات وقرائن اورآپ کی ذات سے یقین ہے کہ بقیہ قیدی بھی رہااورآزاد ہوگئے ہوں گے۔کیا اُس وقت کے کسی قوم کے جنگی اُصولوں میں قیدیوں کی سزا کا غلامی اورقتل کے سوا کوئی تیسرا رُخ تھا؟ جہاں تک غلام اورلونڈی بنانے کی بات ہے تو اُس کے رموز واسرار کوبھی اچھی طرح سمجھنا چاہئے کہ پہلے قیدیوں کے تبادلہ کا کوئی تصورنہ تھا اس لیے اضطراراً اسلام نے غلامی کا حکم نہیں بلکہ اُس کی اجازت دی اوراسلام میں چونکہ عورتوں سے قتال جائز نہیں اور جنگوں میں بسا اوقات مرد سب کے سب مقتول ہوجاتے تھے اوراُن کی عورتیں بے سہارا اور بے یارومددگار ہوجاتی تھیں اس لئے اُن کے حق میں اس سے زیادہ مناسب کوئی طریقہ نہ تھا کہ امیر اُن عورتوں کولشکر کے ذمہ لگادے جواُن کی کفالت کرسکے۔

اگر اسلام کا یہی نظریہ ہوتا تو پھر جگہ جگہ غلام لونڈی کی آزادی و رہائی پر بے شمار فضائل کی خوشخبری اوراجرعظیم کا وعدہ نہ کیا جاتا اورنہ ہی اُن سے حسن سلوک کی تاکید اورغلطیوں کے نظرانداز کا حکم دیا جاتا لیکن اسلام نے مختلف حربوں سے ان کی آزادی کا سامان مہیا کیا اور معاشرہ میں اُن کو ایک مقام عطا کیا۔ یہ وہ اسباب وعوامل ہیں جن سے پوری طرح یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ تعلیم نبوی نے غلامی کا تصورنہیں بلکہ درحقیقت اُس کوختم کیا لیکن یکبارگی نہیں بلکہ اپنے مزاج کے مطابق بتدریج یہ کام کیا۔ایسے اشخاص کی ایک طویل فہرست ہے جوآزاد ہوکر بعد میں بڑے بڑے مناصب پرفائز ہوئے اورایک دُنیا اُن سے سیراب ہوئی۔

اس قدر ٹھوس اورمکمل قوتِ نافذہ رکھنے والا اس دنیا کا کوئی قانون ہوسکتا ہے؟ اسلام کے علاوہ دوسرے ایوانوں میں عمل ومساوات اورانسانی اقدار کے اُوجھل نقوش ملتے بھی ہیں تو وہ حیاتِ محمدی ہی سے مستعار لئے گئے ہیں لیکن عملی میدان میں پھر بھی وہ اپاہج ہی ہیں اوراُن کے تنفیذی قوت کی سوئی صفر پر....سیرت محمدی ﷺ کے یہ وہ روشن حقائق ہیں جومتعصب قوم اورامن ومساوات کے نام پرسفاکیت کے علمبرداروں کودعوت فکر دیتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

مراجع:

(۱)اصح السیر : حکیم مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب داناپوریؒ (۲) سیرت المصطفیٰ: مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ
(۳) سیرت نمبر (ماہنامہ ''نقوش''لاہور) (۴) رحمت للعالمین: قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوریؒ
(۵) سیرت النبی: علامہ شبلی وعلامہ سید سلیمان ندویؒ (۶) اخلاق رسول: مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب دہلی
ودیگراخبارورسائل وغیرہ۔

کاش ہم بھی درسِ عبرت حاصل کریں

از: مصلح الدین قاسمی
استاذ ادبِ عربی شاہی/مرادآباد

بسا اوقات کوئی دل سوز تقریر، نصیحت آمیز واقعہ اور کوئی چبھتا ہوا جملہ انسان کی زندگی میں ایسے گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے جو رفتارِ زمانہ اور مرورِ ایام کے باوجود بھی باقی رہتے ہیں؛ بلکہ وہی واقعہ اور جملہ اس کی زندگی کا رخ متعین کردیتا ہے، اس کی شخصیت کی تعمیر وتزئین اور اس کے موقف کی تعیین کرتا ہے، نتیجتاً ایک دن اُس کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے کہ اگر اُس تقریر، واقعے اور اس جملے کے انمٹ نقوش اس کی ذات میں نہ ہوتے تو اس کی وہ حیثیت نہ ہوتی جو اِس وقت ہے اور نہ ہی وہ اُن کارناموں کو عملی جامہ پہنا پاتا جس کی اسے توفیق ملی۔

کسی رسالے میں ایک واقعہ پڑھا تھا کہ فارسی کے مشہور شاعر مرزا قتیل (بے دل) نے ایک عارفانہ نظم لکھی جو کسی طرح ایران پہنچ گئی، وہاں ایک صاحب بہت متاثر ہوئے اور باقاعدہ مرزا صاحب کی زیارت وملاقات کے لیے ہندوستان آئے، جب مرزا صاحب کے دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ مرزا صاحب داڑھی منڈا رہے ہیں، انھوں نے حیرت واستعجاب سے عرض کیا: ”آغا ریش می تراشی“ (جناب! آپ بھی داڑھی منڈاتے ہیں) مرزا صاحب نے شوخی سے جواب دیا: ”بلے ریش می تراشم، دل کسے نمی تراشم“ (ہاں! داڑھی تراشتا ہوں کسی کا دل نہیں دکھاتا ہوں) —— بے دِل صاحب کے مخاطب بھی صاحبِ دل ہی تھے، نہایت عاجزی وانکساری اور دردمندی سے ”بے دِل“ سے مخاطب ہوئے اور بولے: ”ہاں، ہاں! آپ کسی کا دل نہیں دکھاتے لیکن داڑھی منڈا کر اور سنتِ رسول کو ڈھا کر اپنے پیارے رسول محمد عربی ﷺ کے دل پر آرے ضرور چلاتے ہیں۔“

دل سے نکلی ہوئی یہ بات ”بے دل“ کے ”دل“ پر گری، لیکن بجلی بن کر نہیں، ابر رحمت بن کر، اور انھیں پانی پانی کرگئی، حاضر جوابی اور شوخی کی جگہ ندامت وشرمندگی نے لے لی، اور اس نے بے دِل کو ایسا ”بیکل“ کردیا کہ داڑھی نہ منڈانے کا فیصلہ کئے بغیر انھیں چین نہ آیا، فوراً گناہ کا اقرار کرتے ہوئے گویا ہوئے:

جزاک اللہ چشمم باز کردی مرا با جانِ جاں ہم راز کردی

اللہ تمھیں جزائے خیر دے تم نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے محبوب سے باخبر کردیا۔

ایک جملے نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کردیا، دل کی دنیا ہی بدل ڈالی اور ان کی زندگی میں ایسے گہرے نقوش ثبت کردیئے جو خود ان کے لیے بھی باعثِ سعادت بنے اور دوسروں کے لیے درسِ عبرت ہیں۔

آؤ تھوڑی دیر کے لیے دل پر پتھر رکھ کر سوچیں، تصور کریں کہ ہمارے اعمال بھی حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش ہیں، اعمال کی اس گٹھری میں کیا کچھ نہیں ہے، جھوٹ، غیبت، بہتان، چغلی، حسد، خیانت، بغض، عداوت، بہتان تراشی، دل آزاری، بددیانتی، ناپ تول میں کمی، وعدہ خلافی، ایذارسانی سب کچھ ہے، نہ امر بالمعروف کی فکر، نہ نہی عن المنکر سے کوئی واسطہ، نہ دل میں خدا کا خوف، نہ عمل میں کوئی احتیاط، فواحش ومنکرات کے رسیا، طاعات وعبادات سے بیزار، نہ ہماری زبانوں سے کوئی محفوظ، نہ ہمارے ہاتھوں سے کوئی مامون، حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، دونوں کی حق تلفی اور دونوں شکوہ سنج —— ان کرتوتوں کا احاطہ کیوں کر ممکن ہو اور ان کے بیان کی تاب قلم کہاں سے لائے؟ علامہ اقبال نے ہمارے انھیں کرتوتوں کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں یہود یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کر شرمائیں ہنود
یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

واقعہ بھی یہی ہے سب کچھ ہونے کے باوجود ہم حقیقی اسلام سے کوسوں دور ہیں، وہ اسلام جو ظاہر و باطن میں یکسانیت کا تقاضا کرتا ہے، جو زبان وہاتھ سے بھی دوسروں کو ایذارسانی کی اجازت نہیں دیتا، وہ اسلام جو چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی تعظیم کا حکم دیتا ہے، وہ اسلام جو ناداروں، یتیموں اور مسکینوں کی دیکھ ریکھ اور ان کے دکھ درد میں شرکت کا حکم دیتا ہے، وہ اسلام جو بھوکوں کو کھانا کھلانے، سلام کو عام کرنے، نیکی پھیلانے اور برائیوں سے روکنے کا حکم دیتا ہے، وہ اسلام جو راستے سے بھی تکلیف دہ چیز کے دور کرنے کا حکم دیتا ہے، وہ اسلام جو اپنے ماننے والوں کو مساوات اور اتحاد واتفاق کی تعلیم دیتا ہے، وہ اسلام جو امن وسلامتی اور زندگی کے تمام شعبوں میں انسان کو انسانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ آج ہمارے اندر اِسی حقیقی اسلام کی کمی ہے۔

چنانچہ جب ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کا اسلام صرف نماز تک محدود ہے، اور دوسرے کچھ لوگوں کا حال یہ ہے کہ نماز کے ساتھ کچھ اور بھی دینی کام انجام دے لیتے ہیں لیکن جب تقریبات اور رنج وغم کے مواقع میں اسلامی قانون بتایا جاتا ہے اور تجارت ومعیشت کے احکام سنائے جاتے ہیں تو کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں اور منکر ہوجاتے ہیں، اور احکامِ

اسلام پر عمل کرنے سے جی چراتے ہیں؛ بلکہ بعض تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارے روزی کا معاملہ ہے (گویا روزی کمانے کے بارے میں اسلام کا کوئی قانون ہی نہیں) العیاذ باللہ۔

یہ صورتِ حال مسلمانوں کے تقریباً تمام ہی طبقے میں ہے کہ جو قرآنی حکم اپنے فائدے کے مطابق ہوا سے تو ماننے کے لیے تیار ہیں اور جو حکم طبیعت کے خلاف ہو، اپنے مفاد کے موافق نہ ہوا سے نہیں مانتے، حاکم ومحکوم، سرمایہ دار، فیکٹری کے مالک، مستاجر واجیر، کسان ومزدور سب ہی اپنے ذاتی منافع، اپنی آرار، قبیلوں کے رواج اور سرداروں کے فیصلوں کو ترجیح دیتے ہیں، قرآن کی طرف دیکھنے کو تیار نہیں ہوتے، یہ ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے لیے ایک بڑا المیہ ہے۔ قرآن کریم میں اللہ ربّ العزت نے پورے طور پر اسلام میں داخل ہونے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِى السِّلْمِ كَافَّةً ص وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ ط إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ o فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (سورۂ بقرہ/ آیت: ۲۰۸-۲۰۹)

(اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے قدموں کے پیچھے نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، سو اگر تم لغزش کھاجاؤ بعد اس کے کہ تمہارے پاس واضح دلیلیں آچکی ہیں تو جان لو کہ اللہ رب العزت زبردست حکمت والا ہے۔)

آیت کریمہ میں اہلِ ایمان کو مخاطب بنایا گیا ہے اور ایمان کا واسطہ دے کر فرمایا گیا ہے کہ اگر تم واقعی مومن ہو تو اسلام کے احکام کو پورا پورا قبول کرو، حاکم ہو یا محکوم، بڑا ہو یا چھوٹا، شہری ہو یا دیہاتی، تاجر ہو یا کاری گر، کارخانے دار ہو یا مزدور وکسان، سب اسلام پر پوری طرح چلیں، کوئی بھی کسی دوسرے کا منھ نہ دیکھے، ہر ایک اپنی ذمے داری کو سامنے رکھے۔ اور پوری طرح اسلام میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نماز وروزہ حج وزکاۃ کے علاوہ معیشت ومعاشرت، تجارت وسیاست، سفر وحضر، دوکان ومکان، آفس وبازار، رنج وغم، خوشی ومسرّت غرضے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں احکامِ اسلام کو اپنائیں، دوچار کاموں ہی میں اسلام کو محدود نہ رکھیں۔

یہاں یہ ذکر کردینا بھی مناسب ہے کہ دینِ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، اسلام کے علاوہ کوئی ایسا دین نہیں ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہو، دنیا کتنی بھی ترقی کرجائے اور کیسے ہی حوادث ونوازل کا ظہور ہوجائے ان سب کا حکم اسلام میں موجود ہے، اور وہ شخص جو اپنے آپ کو مومن کہتا ہے اور سرکار دوعالم ﷺ سے محبت کا دم بھرنے والا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ تمام احکامِ شرعیہ کو اپنی عملی زندگی میں اپنائے، اپنے ظاہر وباطن دونوں کو سدھارنے اور سنوارنے کی کوشش کرے؛ بلکہ خدا اور رسول ﷺ کا ایسا سچا اور حقیقی عاشق بن جائے کہ اپنے ہر ایک عمل کو خدا ورسول کی رضا میں رنگنے

بغیر اسے چین وسکون نہ آئے۔

مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ کتنے ایسے لوگ ہیں جو محبِّ رسول اور عاشقِ رسول ہونے کے دعوے دار ہیں، لیکن وہ اپنے عمل، طرزِ معاشرت اور اپنی ہیئت وشکل سے سرکار دوعالم ﷺ کا دل دکھانے میں کوئی تأمل نہیں کرتے، چناں چہ کتنے ایسے لوگ ہیں جو کھلے عام داڑھی منڈاتے ہیں اور ان کا دل ذرا بھی نہیں پسیجتا کہ وہ حضور ﷺ کی سنت کی توہین کرکے آپ ﷺ کا دل دکھاتے ہیں، اور بعض لوگ تو ایسے ہیں جنھیں اگر سمجھایا جائے تو برا مان جاتے ہیں اور الٹے جواب دینے لگتے ہیں کہ کیا داڑھی ہی میں اسلام ہے؟ ایسے لوگوں کو اگر یہ جواب دیا جائے تو کیا غلط ہوگا؟ کہ اسلام تو ہر اسلامی چیز میں ہے، فرائض و واجبات کا تو خیر بڑا درجہ ہے مستحبات تک میں اسلام ہے، داڑھی تو بڑی چیز ہے اس میں اسلام کیوں نہیں ہے؟ بلکہ اسلام تو سنت کے مطابق استنجا کرنے میں بھی ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ فرمایا، کرکے دکھایا سب میں اسلام ہے۔

آؤ مرزا ''بے دل'' کے واقعے کو ہم ایک بار پھر پڑھیں، شاید ہمارے دل میں بھی وہ بات اترے اگر ہمارے دل میں رسولِ خدا ﷺ کے تئیں گہری عقیدت ہو، اور اگر بے دل کی بات ہمارے دل پر اثر انداز نہ ہو تو ہمیں خود کے ''بے دل'' ہونے پر شبہ نہ ہونا چاہیے۔

کسی بدبخت کی جانب سے اگر رسولِ خدا ﷺ کی شان میں گستاخی ہو تو ہماری غیرت جوش میں آجاتی ہے اور بلا شبہ آنا ہی چاہیے، ایک مومن اہانتِ رسول کو کیسے برداشت کرسکتا ہے؟ لیکن خدارا ذرا اِس حقیقت پر بھی تو ٹھنڈے دل سے غور کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کا دل دکھانے کے مجرم ہم بھی تو ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ گستاخانِ رسول زبان وقلم سے اِس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں اور ہم اپنی غفلتوں اور بداعمالیوں سے رسول اللہ ﷺ کے لیے قلبی اذیت کا باعث بنتے ہیں— مگر سوال یہ ہے کہ پھر ہماری غیرت جوش میں کیوں نہیں آتی اور ہمیں اپنے اوپر غصہ کیوں نہیں آتا؟

ہم یہ بھی تو دیکھیں کہ روز مرّہ کی زندگی میں اخلاقی قدروں کے زوال کے باوجود بھی آج تک یہ پاس ولحاظ باقی ہے کہ ہماری کسی کوتاہی یا لغزش کا علم کسی ایسی شخصیت کو نہ ہونے پائے جس سے ہمارا عقیدت ومحبت کا تعلق ہے۔ کیا رسولِ خدا ﷺ کی ذات اقدس سے بڑھ کر بھی عقیدت ومحبت کا حقدار کوئی ہوسکتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر اس سلسلے میں کوتاہی کیسی؟

ضرورت اِس بات کی ہے کہ ''رسولِ خدا ﷺ کا دل دکھانے کے تو ہم بھی مجرم ہیں'' کا احساس اپنے اندر جگائیں، جس لمحہ یہ احساس جاگ اٹھے گا ہم بھی مرزا بے دل کی طرح بیکل ہوا ٹھیں گے، اور دل کی کایا پلٹ جانے اور من کی دنیا بدل جانے میں انشاء اللہ دیر نہ لگے گی۔

❁ ❁ ❁

دوسری قسط:

قادیانیت کا مکروہ چہرہ!

کینیڈا سے قادیانیوں کے پندرہ سوالات اور ان کا جواب

از: مولانا سعید احمد جلال پوری
مدیر ماہنامہ بینات کراچی، پاکستان

سوال: (۴) ”حضرت محمد نے جہاد کا حکم کیوں دیا؟ جہاد کو اسلام کا پانچواں ضروری رکن کیوں قرار دیا؟“

جواب: دیکھا جائے تو اس اعتراض کے پیچھے بھی مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی امت کی انگریز حکومت کی نمک خواری کا جذبہ کارفرما ہے، ورنہ مرزائیوں اور تمام دنیا کو معلوم ہے کہ جہاد کا حکم حضرت محمد ﷺ نے نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مرزائیوں، قادیانیوں اور ان کے باوا غلام احمد قادیانی کا اسلام اور قرآن پر نہ صرف یہ کہ ایمان نہیں؛ بلکہ ان کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

(۲) اگر قادیانی، قرآن کریم کو مانتے ہوتے اور اسے اللہ کا کلام سمجھتے ہوتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ اگر آنحضرت ﷺ نے از خود جہاد کا حکم دینا ہوتا تو مکی دور میں اس کا حکم دیتے، جبکہ مسلمان کفار و مشرکین کے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے، اگر جہاد کا معاملہ آپ ﷺ کے قبضہ میں ہوتا تو آپ ﷺ اپنے جاں نثاروں کو صبر کی تلقین کیوں فرماتے؟ حبشہ کی ہجرت کی اجازت کیوں دی جاتی؟ اپنا آبائی گھر چھوڑ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کیوں فرماتے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کفار اور مشرکین مکہ کے مظالم کیوں برداشت کرتے؟

(۳) ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو قرآن کریم میں جس طرح مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کرنے اور اس طرف متوجہ کرنے کے لئے فرمایا ہے، اس سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم مسلمانوں کے لئے قلت تعداد کے باعث ثقیل تھا، اور ان کے لئے جہاد کا حکم بجالانا کسی قدر مشکل تھا، چنانچہ مندرجہ ذیل آیات میں مسلمانوں کو جہاد کی طرف

متوجہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

الف: ”اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا، وان الله على نصرهم لقدير“. (الحج:۳۹)

ترجمہ: ”حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں، اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔“

ب: ”يا ايها النبی حرض المومنين على القتال، ان يكن منكم عشرون صابرون يغلبوا مأتين، وان يكن منكم مائة يغلبوا الفا من الذين كفروا بانهم قوم لا يفقهون“. (الانفال:۶۵)

ترجمہ: ”اے نبی شوق دلا مسلمانوں کو لڑائی کا، اگر ہوں تم میں بیس شخص ثابت قدم رہنے والے تو غالب ہوں دو سو پر اور اگر ہوں تم میں سے سو شخص تو غالب ہوں ہزار کافروں پر اس واسطے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔“

ج: ”كتب عليكم القتال وهو كره لكم، وعسىٰ ان تكرهوا شيئًا وهو خيرلكم، وعسىٰ ان تحبوا شيئًا وهو شرلكم، والله يعلم وانتم لاتعلمون“. (البقرہ:۲۱۶)

ترجمہ: ”فرض ہوئی تم پر لڑائی اور وہ بری لگتی ہے تم کو، اور شاید کہ تم کو بری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے حق میں اور اللہ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے۔“

ان آیات اور اسی طرح کی دوسری متعدد آیات سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ جہاد کا حکم آنحضرت ﷺ کی جانب سے نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا، چونکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد تھوڑی تھی، اور وہ ایک عرصہ سے کفار کے مظالم کی چکی میں پس رہے تھے، اور مسلمان بظاہر کفار کی تعداد اور قوت وحشمت سے کسی قدر خائف بھی تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ ان کو جہاد پر آمادہ کیا جائے اور باور کرایا جائے کہ وہ کفار کی عددی کثرت سے خائف نہ ہوں بلکہ مسلمانوں کا ایک فرد کفار کے دس پر بھاری ہوگا۔

(۴) اسی طرح یہ بھی واضح کیا گیا کہ مسلمانوں کو یہ احساس بھی نہیں رہنا چاہئے کہ اب تک تو ہمیں کفار کے مظالم پر صبر کی تلقین کی جاتی رہی اور ان کی جانب سے دی جانے والی تکالیف و اذیتوں پر صبر و برداشت کا حکم تھا تو اب جوابی، بلکہ اقدامی کارروائی کا حکم کیونکر دیا جارہا ہے؟ تو فرمایا گیا کہ یہ صبر و برداشت ایک وقت تک تھی، اب اس کا حکم ختم ہوگیا ہے اور جہاد و قتال کا حکم اس لئے دیا جارہا ہے کہ اب تمہارے صبر کا امتحان ہو چکا اور کفار کے مظالم کی انتہا ہو چکی۔

نیز یہ کہ چونکہ اس وقت کفار، مشرکین اور ان کے مظالم، اشاعتِ اسلام میں رکاوٹ تھے اور وہ فتنہ پردازی میں مصروف تھے، اس لئے حکم ہوا کہ: ”**وقاتلوھم حتی لاتکون فتنة**“ یعنی کفار سے یہاں تک قتال کرو کہ کفر کا فتنہ نابود ہوجائے۔

اسی طرح اس مضمون کو دوسری جگہ یوں ارشاد فرمایا گیا:

الف: ”یاایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم ومأوٰھم جھنم وبئس المصیر.“ (التوبہ:۷۳)

ترجمہ: ”اے نبی! لڑائی کر کافروں سے اور منافقوں سے اور تندخوئی کر ان پر اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بڑا ٹھکانا ہے۔“

ب: ”قل ان کان آبائکم وابنائکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارة تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللّٰہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللّٰہ بامرہ، واللّٰہ لایھدی القوم الفسقین“ (التوبہ:۲۴)

ترجمہ: ”تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال، جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری، جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو، تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں، تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم اور رستہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔“

ان آیات سے بھی واضح طور پر معلوم ہوا کہ جہاد کا حکم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے، بلکہ اس میں شدت کی تاکید ہے، اور جو لوگ اپنی محبوبات و مرغوبات کو چھوڑ کر جہاد کا حکم بجا نہیں لائیں گے، وہ اللہ کے عذاب کا انتظار کریں۔ بتلایا جائے کہ اگر اللہ کا رسول، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا مسلمان اس حکم الٰہی کو بجالائیں اور نصوص قطعیہ کی وجہ سے اُسے فرض جانیں تو اس میں اللہ کے نبی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مسلمانوں کا کیا قصور ہے؟ نیز یہ بھی بتلایا جائے کہ جو لوگ طبعی خواہش اور نفس کے تقاضا کے خلاف سب مرغوبات و محبوبات کو چھوڑ کر اللہ کا حکم بجالائیں، وہ قابلِ طعن ہیں یا وہ، جو دنیاوی مفادات اور انگریزوں کی خوشنودی کی خاطر اللہ کے حکم کو پس پشت ڈال دیں؟

بلاشبہ قادیانیوں کا یہ اعتراض ”اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے“ کے زمرے اور مصداق میں آتا ہے۔

(۵) اس سے ہٹ کر مشاہدات، تجربات، عقل اور دیانت کی روشنی میں اگر دیکھا جائے، تو اللہ کے باغیوں اور اللہ کی مخلوق پر ظلم وستم ڈھانے والوں کے خلاف جہاد یا اعلان جنگ عین قرینِ قیاس ہے۔

اس لئے کہ دنیا کے دو پیسے کے بادشاہوں میں سے کسی کے خلاف اس کی رعایا کا کوئی فرد اعلان بغاوت کردے تو پہلی فرصت میں اس کا قلع قمع کیا جاتا ہے اور ایسے باغی کے خلاف پورے ملک کی فوج اور تمام حکومتی مشینری حرکت میں آجاتی ہے تاآنکہ اس کو ٹھکانے نہ لگا دیا جائے۔

اور مہذب دنیا میں ایسے باغیوں سے کسی قسم کی رعایت برتنے کا کوئی روادار نہیں ہوتا، اور نہ ہی ان کے حق میں کسی کو سفارش کرنے کی اجازت ہوتی ہے، بلکہ اگر ایسے باغی گرفتار ہوجائیں اور سو بار توبہ بھی کرلیں تو بھی ان کی جان بخشی نہیں ہوتی، اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی قوم، برادری یا افراد، خالق و مالک کائنات اور رب العالمین سے بغاوت کریں، اور خلقِ خدا پر، سکون واطمینان کے ساتھ زندگی گزارنے کا راستہ بند کردیں، تو کیا اس رب العالمین اور مالک ارض وسما کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی فوج کے ذریعہ ان شوریدہ سروں کا علاج کرے اور ان کو ٹھکانے لگائے؟ دیکھا جائے تو جہاد کا یہی مقصد ہے، اور یہ عدل وانصاف کے عین مطابق ہے۔

(۶) پھر جہاد صرف شریعت محمدی ہی میں شروع نہیں ہوا بلکہ اس سے قبل دوسرے انبیاء کی شریعتوں میں بھی مشروع تھا، جیسا کہ بائبل میں ہے:

”پھر ہم سے مڑکر بسن کا راستہ لیا اور بسن کا بادشاہ عوج اور عؔی میں اپنے سب آدمیوں کو لے کر ہمارے مقابلہ میں جنگ کرنے کو آیا، اور خداوند نے مجھ سے کہا: اس سے مت ڈرو کیونکہ میں نے اس کو اور اس کے سب آدمیوں اور ملک کو تیرے قبضہ میں کردیا ہے، جیسا تو نے اوریوں کے بادشاہ سیحون سے جو حسبون میں رہتا تھا کیا، ویسا ہی تو اس سے کرے گا؟ چنانچہ خداوند ہمارے خدا نے بسن کے بادشاہ عوج کو بھی اس کے سب آدمیوں سمیت ہمارے قابو میں کردیا اور ہم نے ان کو یہاں تک مارا کہ ان میں سے کوئی باقی نہ رہا، اور ہم نے اسی وقت اس کے سب شہر لے لئے اور ایک شہر بھی ایسا نہ رہا جو ہم نے ان سے نہ لے لیا ہو... اور جیسا ہم نے سیحون کے بادشاہ سیحون کے ہاں کیا ویسا ہی ان سب آباد شہروں کو مع عورتوں اور بچوں کے بالکل نابود کرڈالا۔“ (استثنا، باب:۳، آیت:۱، ۲، ۳، اور ۶)

اسی طرح باب:۲، آیت:۱۰ تا ۱۴ میں ہے:

”جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا، اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک تیرے لئے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باج گزار بن کر تیری خدمت کریں، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ

کریں بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو، اس کا محاصرہ کرنا اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کردے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کرڈالنا، لیکن عورتوں اور بال بچوں اور چوپائیوں اور اس شہر کے سب مال اور لوٹ کو اپنے لئے رکھ لینا اور تو اپنے دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھ کو دی ہو، کھانا۔‘‘

سوال (۵) ’’مالِ غنیمت کے طور پر دشمن کی عورتیں مسلمانوں کے لئے کیوں حلال قرار دیں؟ کیا عورتیں انسان نہیں بھیڑ بکریاں ہیں، جنہیں مالِ غنیمت کے طور پر بانٹا جائے اور استعمال کیا جائے؟‘‘

جواب: دشمن سے لڑائی، قتال اور جہاد کی صورت میں ان کے جو افراد گرفتار ہوجائیں وہ قیدی کہلاتے ہیں، پھر اگر مسلمان فوج کے کچھ افراد مخالفین کے ہاتھوں گرفتار ہوجائیں تو کفار قیدیوں سے تبادلہ کرکے مسلمانوں کو چھڑایا جائے گا، اس کے علاوہ جو بچ رہیں گے، ان کو غلام اور لونڈیاں قرار دے کر انہیں مسلمان فوجیوں میں بطور مال غنیمت تقسیم کردیا جائے گا، اس کا نام ہے: ’’غلامی کا مسئلہ‘‘۔

غلامی کے اس مسئلہ پر عام طور پر اسلام دشمن یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ یہ بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے، اور مسلمانوں کی جانب سے یہ انسانوں پر ظلم ہے۔

اس عنوان سے عیسائی دنیا اور انسانی حقوق کے نام نہاد علم بردار بھی اعتراض کیا کرتے ہیں، قادیانیوں کا اس مسئلہ پر اعتراض کرنا دراصل اپنے عیسائی آقاؤں کی ہم نوائی اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے مترادف ہے؛ بلکہ ان کے منہ کی بات چھین کر اپنے منہ سے نکالنے کی مانند ہے، جبکہ قادیانیوں اور ان کے آقاؤں کو معلوم ہونا چاہئے کہ غلامی کا مسئلہ اسلام نے جاری نہیں فرمایا؛ بلکہ یہ قبل از اسلام عیسائیوں اور یہودیوں میں بھی جاری تھا، چنانچہ غلاموں اور لونڈیوں کا تذکرہ خود بائبل میں بایں الفاظ موجود ہے:

الف: ’’اور یعقوب نے لابن سے کہا کہ میری مدت پوری ہوگئی، سو میری بیوی مجھے دے تاکہ میں اس کے پاس جاؤں تب لابن نے اس جگہ کے سب لوگوں کو بلاکر جمع کیا اور ان کی ضیافت کی، ... اور لابن نے اپنی لونڈی زلفہ، اپنی بیٹی لیاہ کے ساتھ کردی کہ اس کی لونڈی ہو۔‘‘

(پیدائش، باب:۲۹، آیت:۲۱ تا ۲۴)

ب: باب:۳۰، آیت:۹ میں ہے:

’’اور لیاہ کی لونڈی زلفہ کے بھی یعقوب سے ایک بیٹا ہوا۔‘‘

ج: استثناء باب:۲۳، آیت:۱۵،۱۶ میں ہے:

’’اگر کسی کا غلام اپنے آقا کے پاس سے بھاگ کر تیرے پاس پناہ لے تو تو اسے اس کے آقا کے حوالہ نہ کردینا۔‘‘

اس کے علاوہ قبل از اسلام مشرکین مکہ میں بھی غلامی کا رواج تھا، بلکہ یہود ونصاریٰ سے لے کر کفار ومشرکین مکہ تک سب ہی لوگ غلاموں اور لونڈیوں کو کسی انسانی سلوک کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ لوگ ایک آزاد انسان کو پکڑ کر زبردستی غلام بنا کر بیچ دیتے تھے۔ جبکہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کی شدید مذمت فرمائی اور قرآن کریم نے مسلمانوں کو غلاموں کے ساتھ اسی طرح کے حسنِ سلوک اور نیک برتاؤ کی تلقین اور تاکید فرمائی، جس طرح کے وہ اپنے والدین کے ساتھ سلوک کے روادار تھے۔ ملاحظہ ہو ارشادِ الٰہی:

”واعبدوا اللّٰه ولاتشركوا به شيئًا وبالوالدين احسانًا وبذى القربىٰ واليتمٰى والمساكين والجار ذى القربىٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبيل وما ملكت ايمانكم، ان اللّٰه لايحب من كان مختالًا فخورًا۔“(النساء:۳۶)

ترجمہ: ’’اور بندگی کرو اللہ کی اور شریک نہ کرو اس کا کسی کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور قرابت والوں کے ساتھ اور یتیموں اور فقیروں اور ہمسایہ قریب اور ہمسایہ اجنبی اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر کے ساتھ اور اپنے ہاتھ کے مال یعنی غلام باندیوں کے ساتھ، بے شک اللہ کو پسند نہیں آتا اترانے والا بڑائی کرنے والا۔‘‘

دیکھا جائے تو اس آیت شریفہ میں دو قسم کے احکام ایک ہی جگہ اور ایک ہی سیاق وسباق میں بیان کئے گئے ہیں، ایک: اللہ تعالیٰ کی عبادت اور دوسرے: اس کی مخلوق سے حسنِ سلوک اور نیکی کا برتاؤ کرنا۔ پھر دوسرے حصہ میں بطور خاص کچھ ایسے لوگوں کو مخصوص کرکے بیان کیا گیا ہے، جن کے ساتھ انسان نیکی میں بے اعتنائی برتتا ہے، تاکہ ان کی طرف زیادہ توجہ ہو۔ گویا ان دونوں احکام کو ایک ہی جگہ بیان کرنے کا مقصود یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا، اس کا شریک نہ ٹھہرانا اسلام لانے کے لئے ضروری ہے، ویسے ہی اس کی مخلوق کے ساتھ نیکی کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ شریعت کے یہی دو اہم اجزاء ہیں، ایک اللہ تعالیٰ سے سچا تعلق، اس کی طاعت وعبادت اور دوسرے اس کی مخلوق کے ساتھ نیکی کا معاملہ۔

پس جہاں بائبل میں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک سے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہا گیا، وہاں قرآن کریم میں ان کے ساتھ سلوک کو اس قدر ضروری قرار دیا گیا ہے، جیسے والدین کے

ساتھ حسن سلوک کو، لہٰذا جیسے والدین کے ساتھ حسن سلوک ضروری ہے ویسے ہی غلاموں کے ساتھ حسن سلوک بھی ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت، والدین کے ساتھ حسن سلوک اور غلاموں کے ساتھ نیک برتاؤ کو ایک ہی آیت میں اور ایک ہی قسم کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ غلامی کا مسئلہ اگرچہ پہلے سے جاری تھا، جس کو اسلام نے بھی بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر باقی رکھا، مگر دنیائے عیسائیت اور کفر وشرک کی زیادتیوں سے ہٹ کر اسلام نے مسلمانوں کو ان کے ساتھ حسن معاشرت کا درس دیا اور اس کی تاکید کی، چنانچہ غلاموں کے ساتھ مسلمانوں کی جانب سے حسن سلوک کی اس اظہر من الشّمس حقیقت کا کوئی دشمنِ اسلام بھی انکار نہیں کرسکتا، یہی وجہ ہے عیسائی مصنف ہلیو اپنی کتاب ڈکشنری آف اسلام میں کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ:

''یہ بالکل صاف امر ہے کہ قرآن شریف اور احادیث میں غلاموں کے ساتھ نیکی کرنے کی بڑے زور کے ساتھ تاکید کی گئی ہے۔''

غلاموں کے ساتھ اسی حسن برتاؤ اور اسلام میں ان کی اسی اہمیت وعظمت کو دیکھ کر ایک صحابی رسول یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ:

"والذی نفسی بیده لولا الجهاد فی سبیل الله والحج وبرّ اُمّی لاحببت ان اموت وانا لملوك".

ترجمہ: ''قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر جہاد فی سبیل اللہ، حج اور اپنی ماں کی خدمت کا معاملہ نہ ہوتا تو میں پسند کرتا کہ میں غلامی کی حالت میں مروں۔''

یہ ایک آزاد اور صحابی رسول کی آرزو اور تمنا ہے، کیونکہ آنحضرت ﷺ نے غلاموں کے ساتھ جس حسن سلوک کا حکم دیا اور جس طرح اس کی تاکید فرمائی، اس کو دیکھ کر کون ایسا ہوگا جو اپنے آپ کو غلام نہ بنالیتا، چنانچہ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

"ان اخوانکم خولکم جعلهم الله تحت ایدیکم فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه مما یأکل ولیلبسه مما یلبس ولا تکلفوهم ما یغلبهم فان کلفتموهم فاعینوهم." (صحیح بخاری، ص:۹، ج:۱)

ترجمہ: ''یعنی یہ تمہارے بھائی تمہارے خدمت گار ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے قبضہ میں دیا ہے، بس جس شخص کا بھائی اس کے ہاتھ کے نیچے یعنی قبضہ میں ہو، اسے چاہئے کہ جو چیز وہ

خود کھائے، اسے بھی وہی کھلائے، اور جو لباس خود پہنتا ہے، اسے بھی اسی طرح کا پہنائے اور ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو اور اگر ان کی طاقت سے زیادہ کوئی بوجھ ڈالو تو اس میں ان کی مدد کرو۔''

غرض غلامی کا رواج یہودیت، عیسائیت، ہندومت، تمام یورپی اقوام اور قبل از اسلام کفار ومشرکین سب کے ہاں تھا، مگر غلاموں کے ساتھ حسن سلوک، ان کے حقوق کی پاسداری اور ان کی آزادی کی اہمیت پر جس قدر اسلام اور پیغمبر اسلام نے زور دیا ہے دیگر مذاہب میں اس کا دسواں حصہ بھی نہیں پایا جاتا ہے۔

دیکھا جائے تو اسلام کو غلامی کے مسئلہ میں طعن وتشنیع کا نشانہ بنانے والوں کا دامن اس مسئلہ میں سب سے زیادہ داغدار ہے، کیونکہ اسلام کے سوا کسی مذہب میں بھی غلاموں کے اخلاقی اور معاشرتی کسی قسم کے حقوق کا ذرہ بھر تذکرہ نہیں تھا، بلکہ بائبل میں تو صرف غلاموں کو اس کی تلقین تھی کہ وہ اپنے آقاؤں کی ایسی اطاعت کریں، جیسے کوئی عیسائی اپنے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کیا کرتا ہے اور غلاموں کو تلقین تھی کہ اگر کوئی اپنے آقا کے پاس سے بھاگ جائے تو واپس اپنے آقا کے پاس چلا جائے، اس کے مقابلہ میں غلاموں کے آقاؤں کو ایسی کوئی ہدایت نہ تھی کہ وہ اپنے غلاموں کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں؟ اور نہ ہی اس پر کوئی قدغن تھی کہ کوئی شخص کسی آزاد کو غلام بنالے، یہی وجہ ہے کہ افریقہ کے نیگروؤں کو عیسائیوں کے ہاں پکڑ پکڑ کر غلام بنایا جاتا تھا۔ چنانچہ غلامی کی رسم ختم کرنے کے دعویداروں کے منہ پر اس سے زیادہ زوردار طمانچہ کیا ہوگا کہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ:

''۱۴۴۲ء میں گنزلس نے دس غلام پرتگال کے شاہزادہ ہنری کو بطور تحفہ پیش کئے۔ ۱۴۴۳ء میں نینز ٹریسٹن افریقہ کے لئے ایک مہم پر بحری راستہ سے روانہ ہوا اور چودہ غلاموں کو لے کر واپس آیا، افریقہ کے لوگ فطرتاً ان حملوں کو ناپسند کرتے تھے، جوان کو غلام بنانے کی غرض سے کئے جاتے تھے۔ یورپین تاجر اپنے حملوں کے عذر پیدا کرنے کے لئے اہل افریقہ میں آپس میں جنگ کرادیتے تھے۔ ۱۵۶۲ء میں سرجان ہاکنگ گونیا کے لئے روانہ ہوا اور تین سو غلام حاصل کئے، پھر ان کو فروخت کرکے انگلینڈ چلا آیا۔ فرانسیسی، اسپینی اور ڈچ ان سب کے ہاں غلاموں کی تجارت کا سلسلہ برابر جاری رہا، لیکن انگریزوں کے ہاں اس کا سراغ چارلس کے اس فرمان تک نہیں ملتا، جو اس نے ۱۶۳۱ء میں افریقہ کمپنی کے نام اس مضمون کا لکھا تھا کہ: وہ

برطانوی علاقوں کے لئے افریقی غلام مہیا کرے۔ ۱۶۴۰ء میں تیرہویں لوئس نے ایک فرمان اس مضمون کا شائع کیا کہ تمام وہ افریقی جو فرانس کی نوآبادیات میں سکونت رکھتے ہیں، بہرحال غلام بنائے جاسکتے ہیں۔ ۱۶۵۵ء میں کرومویل نے جمیکا کو اسپین والوں سے چھینا تو دیکھا کہ وہاں پندرہ سو سفید فام اور اتنے ہی نیگرو غلام موجود ہیں اور خود وہاں کے رہنے والوں کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ ۱۶۶۲ء میں تیسری افریقہ کمپنی قائم ہوئی، اس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی مغرب کی ہندوستانی نوآبادیات میں تین ہزار غلام سالانہ مہیا کئے جائیں۔ ۱۶۷۹ء اور ۱۶۸۹ء کے درمیان صرف دس برس کی مدت میں کم وبیش ساڑھے چار ہزار غلام ہر سال برطانوی نوآبادیات میں آباد کئے جاتے رہے۔ فرانس کرو نے ۷/مارچ ۱۶۸۷ء کو ان غریبوں کی سرگزشت لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ: ''اس جگہ کی سب سے بڑی تجارت ان غلاموں کی ہے جن کو یہاں لایا جاتا ہے، یہ لوگ یہاں بالکل مادرزاد برہنگی کے ساتھ آتے ہیں اور ان کے گاہک ان کا منہ کھول کھول کر دیکھتے ہیں اور ان کا امتحان گھوڑوں اور چوپاؤں کی طرح کرتے ہیں۔'' ۱۷۱۳ء میں انگریزوں اور اسپینیوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، اس کی رو سے انگلینڈ نے اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ اسپین والوں کو تیس سال تک برابر چار ہزار آٹھ سو غلام سالانہ مہیا کرتا رہے گا، غلاموں کی تجارت سے جو نفع حاصل ہوتا تھا، انگلینڈ اور اسپین دونوں کے بادشاہ اس میں ایک حصہ کے شریک تھے۔ افریقہ کے غلاموں کی تجارت کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ ۱۷۸۸ء میں جب غلامی کے انسداد کے لئے پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا گیا تو اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت افریقہ سے ہر سال دولاکھ غلام لے جائے جاتے تھے، جن میں سے ایک لاکھ امریکا وغیرہ اور بقیہ افریقہ کے مشرقی ساحل سے ایران اور کچھ تھوڑے سے وسط افریقہ سے ترکی اور مصر لے جائے جاتے تھے۔'' (بحوالہ اسلام میں غلامی کا تصور، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ص:۴۶)

غلامی کو ختم کرنے کے نام نہاد دعویداروں کے بلند وبانگ دعوؤں کے باوجود، ان کے پاس اس وقت بھی پچاس لاکھ غلام موجود تھے، جبکہ مسلمانوں کے ہاں غلامی کا تصور کبھی کا معدوم ہوچکا تھا، چنانچہ ۱۶/اپریل ۱۹۳۸ء کے اخبار نیشنل کال کی ایک خبر ملاحظہ ہو:

''جنیوا میں جمعیت اقوام کی مشورہ کمیٹی جو چند ممبران پر مشتمل ہے اور جو غلامی کے

مسئلہ پر غور وخوض کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے، اس نے ۳۰/مارچ سے ۱۲/اپریل ۱۹۳۸ء تک اپنے اجلاس کئے، ۱۹۳۰ء لیگ اسمبلی لارڈ سیسل نے برطانوی حکومت کی نمائندگی کرتے ہوئے فرمایا کہ: دنیا میں اب بھی کم از کم پانچ ملین یعنی پچاس لاکھ غلام موجود ہیں، یہ سب اس کے باوجود ہے کہ ۱۹۲۶ء میں جمعیت اقوام کی مجلس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ دستخط کرنے والی حکومتیں جن کی تعداد ۲۸ تھی، اپنے اپنے علاقوں میں غلاموں کی تجارت کو تشدد آمیز حکمت عملی سے کام لے کر بالکل ختم کردیں گی۔ ان حکومتوں میں امریکا کی ریاست ہائے متحدہ بھی شامل تھیں، اس مشورہ کمیٹی کے تقرر کا یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ غلام حاصل کرنے کے لئے جو باقاعدہ اور منظّم حملے ہوتے تھے، وہ رک گئے۔'' (بحوالہ اسلام میں غلامی کا تصور، ص:۴۸)

قارئین اور خصوصاً قادیانی بتلائیں کہ غلامی کی لعنت کو رواج دینے والے مسلمان ہیں؟ یا ان کے آقا عیسائی؟ اسلام میں غلامی کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ مسلمان فوج کفار سے جنگ کرے اور کفار مرد وخواتین گرفتار ہوکر آئیں، تو انہیں غلام ولونڈی بنالیا جائے اور بس۔ اس کے علاوہ اسلام نے دوسری تمام صورتوں کو ناجائز وحرام قرار دیا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو اس صورت میں بھی غلامی کا طوق کفار نے اپنے گلے میں خود ہی ڈالا ہے، ورنہ پیغمبر اسلام ﷺ کی، مسلمان فوجیوں کو یہ ہدایت تھی کہ: کسی علاقہ کے فتنہ پرور کفار سے جہاد کے وقت عین میدان کارزار میں بھی پہلے انہیں اسلام کی دعوت دی جائے، مان جائیں تو فبہا، ورنہ دوسرے نمبر پر ان کو کہا جائے کہ بے شک تم اپنے مذہب پر رہو، مگر اسلامی مملکت کے پُرامن شہری بن کر رہو، اور اسلامی حکومت کو جزیہ اور ٹیکس دیا کرو، چنانچہ اگر وہ اس کے لئے راضی ہوجائیں تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ان کی جان، مال اور عزت کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں پر فرض ہے۔ جزیہ دینے کے باوجود بھی اگر کسی مسلمان نے ان کے ساتھ زیادتی کی تو پیغمبر اسلام ﷺ کا فرمان ہے کہ:

"... الا من ظلم معاهدًا او تنقصه او كلفه فوق طاقته او اخذ منه شيئاً بغير طيب نفس فانا حجيجه يوم القيامة". (ابوداؤد، ص:۷۷، ج:۲)

یعنی کل قیامت کے دن میں اس غیر مسلم ذمی کی طرف سے بارگاہ الٰہی میں زیادتی کرنے والے مسلمان کے خلاف اس غیر مسلم کے وکیل صفائی کا کردار ادا کروں گا۔

گویا اس سے واضح ہوا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ نے کفار ومشرکین کی حریت وآزادی

پر قدغن لگانے اور ان کو غلام بنانے کی حتی الامکان ممانعت فرمائی ہے، لیکن اگر کوئی کوتاہ قسمت غیر مسلم، اسلام کی طرف سے دی گئی ان لازوال سہولیات سے فائدہ نہیں اٹھاتا، تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ خود ہی اپنی حریت وآزادی کا دشمن اور اسے ختم کرنے کا ذمہ دار ہے۔

اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی بادشاہ یا حکومت نے اعلان کیا ہو کہ جو شخص ناحق قتل اور ڈاکازنی کا مرتکب پایا گیا، اُسے زندگی بھر جیل میں رہنا ہوگا۔ اب اگر کوئی بدنصیب حکمِ شاہی کے علی الرغم ان جرائم کا مرتکب پایا جائے اور حکومت اُسے عمر قید کی سزا سنادے تو اس سزا کا ذمہ دار وہ مجرم ہے یا حکومتِ وقت؟ کیا ایسی صورت میں حکومت قابلِ ملامت ہے یا وہ مجرم؟

بہرحال غلامی کا رواج تو پہلے سے ہی تھا، اب مسلمانوں کے سامنے دو شکلیں تھیں، یا تو وہ بھی جنگ میں گرفتار ہو کر آنے والے قیدیوں کو سابقہ ظالم اقوام کی طرح یکسر قتل کردیتے، یا انہیں زندہ رکھ کر ان کو دنیا کی زندگی سے نفع اٹھانے اور آخرت کے معاملہ میں غور وفکر کا موقع دیتے! ظاہر ہے کہ دوسری صورت ہی قرینِ عقل وقیاس ہے۔

پھر غلاموں کو زندہ رکھ کر یا تو یورپی اقوام کی طرح ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا، یا پھر انہیں مسلم معاشرہ کا حصہ بننے، مسلمانوں میں شادی بیاہ کرنے اور اسلامی معاشرہ کی لازوال خوبیوں سے سرفراز ہونے کا موقع فراہم کیا جاتا۔ چنانچہ اسلام نے غلاموں کے ساتھ شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نکاح کے معاملہ میں مسلمان غلاموں کو مشرکین پر اور مسلمان لونڈیوں کو کافر ومشرک خواتین پر ترجیح دی۔ (البقرہ:۲۲۱،۲۲۲) اور ان کے حقوق بھی متعین فرمائے۔

عیسائیوں اور قادیانیوں کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ مسلمان، لونڈیوں کے ساتھ بلا نکاح جنسی تعلقات کیوں قائم کرتے ہیں؟

اگر کوئی مسلمان یہ اعتراض کرتا تو شاید قابلِ سماعت ہوتا، مگر وہ لوگ، جن کی جنسی بے راہ روی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو، جن کے ہاں نکاح کی بجائے زناکاری وبدکاری کو قانونی تحفظ حاصل ہو اور جن کے بڑے، چھوٹے اس بلا میں گرفتار ہوں، ان کو اس اعتراض کا کیا حق پہنچتا ہے؟ بہرحال ہم اس کا بھی جواب دیئے دیتے ہیں:

الف: ہم نے گزشتہ صفحات میں بائبل کے حوالہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ: ”لابن نے اپنی لونڈی زلفہ، اپنی بیٹی لیاہ کے ساتھ کردی کہ اس کی لونڈی ہو“ اسی طرح: ”اور لیاہ کی لونڈی زلفہ کے بھی یعقوب سے ایک بیٹا ہوا۔“ بتلایا جائے اس میں لونڈی سے نکاح کا کہاں تذکرہ ہے؟ ایسے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارہ میں وارد اس تصریح میں کہ: سلیمان کی سات سو بیویاں

اور تین سو کنیزیں تھیں۔ (سلاطین:۱۱-۳) میں بیویوں اور کنیزوں میں فرق کیوں کیا گیا؟ اور کنیزوں سے ان کے نکاح کا کہاں تذکرہ ہے؟

ب: غلام اور لونڈیاں جب مسلمانوں کے قبضہ میں آگئیں تو ظاہر ہے ان کا اپنے اپنے سابقہ ملک وقوم اور رشتہ داروں سے تعلق منقطع ہوگیا، اب یا تو انہیں یوں ہی جنگی قیدیوں کی طرح زندگی بھر اذیت میں رکھا جائے اور ان کے جنسی تقاضوں کو یکسر نظر انداز کردیا جائے... جو بالکل ناجائز اور ظلم ہوگا... یا پھر انہیں بدکاری وزناکاری کی اجازت دے دی جائے، جس سے شاید ان کی جنسی تسکین تو ہوجائے گی، مگر اس سے جہاں ان کی دنیا وآخرت برباد ہوگی اور وہ معاشرہ پر بدنما داغ ہوں گے، وہاں وہ مسلم معاشرہ میں گندگی، غلاظت اور معاشرتی بے راہ روی کا ذریعہ بھی بنتے، اس لئے اسلام نے تباینِ دارین (مسلم وکافر ملک کے درمیان دوری) کو طلاق یا بیوگی کے قائم مقام تصور کرتے ہوئے استبراءِ رحم (رحم کی صفائی) کا حکم دے کر لونڈیوں کے مالکوں کو حکم دیا کہ یا تو ان کا کسی اچھی جگہ عقدِ نکاح کردیا جائے یا پھر حق ملکیت کی بنا پر ان کی جنسی تسکین کا خود انتظام کریں، اس سے جہاں ان کی فطری ضرورت پوری ہوگی، وہاں اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جب آقا اور مالک اپنی باندی اور مملوکہ سے گھر کے تمام کاموں میں امداد لے گا اور ساتھ ہی اس کے ساتھ ہم بستر ہوگا تو نفسیاتی طور پر باندی کی حیثیت بالکل ایک خادمہ اور اجنبیہ کی سی نہیں رہے گی؛ بلکہ وہ اس کے ساتھ ایک گونہ انسیت ومحبت محسوس کرے گا اور یہ احساس مالک ومملوکہ کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کا باعث ہوگا، پھر اگر اس باندی سے بچہ بھی پیدا ہوگیا تو یہ ام ولد یعنی اس کے بچوں کی ماں بن جائے گی اور مالک کی موت پر وہ آزاد ہوجائے گی، جس سے معلوم ہوا کہ مالک کے باندی سے اس جنسی تعلق کا سراسر فائدہ باندی ہی کو ہے اور اس کے حق میں ہی مفید ہے، کیونکہ اس سے باندی کی آزادی کی ایک راہ نکلتی ہے اور وہ اپنے آقا ومالک کے گھر میں گھر کی مالکہ کی حیثیت سے رہنے کی حق دار ہوگی۔

بتلایا جائے عیسائی معاشرہ کسی باندی کے ساتھ اس حسن سلوک کا روادار ہے؟... نہیں، قطعاً نہیں... بلکہ وہ تو اپنی منکوحہ کو بھی داشتہ کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج مغرب اور مغربی معاشرہ میں نکاح پر زنا کو ترجیح حاصل ہے۔

ج: غلام اور باندی کے اپنے آقا ومالک کے ساتھ رہنے میں ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان کے اخلاق کی تربیت ہوگی اور ان کی تعلیم وتربیت کا ذریعہ بنے گا، یہی وجہ ہے کہ سوائے چند استثنائی صورتوں کے، مسلمانوں کے پاس آنے والے کافر ومشرک غلاموں اور لونڈیوں میں سے

نہ صرف یہ کہ سب مسلمان ہوگئے بلکہ ان میں سے بہت سے حضرات کو مسلمانوں کی ریاست وامارت کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، جو جیش اسامہ کے امیر تھے، ایک غلام زادہ تھے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نمائندہ اور شاہ مصر کے دربار میں جانے والے وفد کے سردار حضرت عبادہؓ حبشی اور غلام تھے، اس کے علاوہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا بیت المقدس کی فتح کے موقع پر اپنے غلام کو سواری پر سوار کرکے، اس کی سواری کے ساتھ ساتھ بھاگنا، کیا اس بات کی کافی دلیل نہیں کہ اسلام اور پیغمبر اسلام نے غلاموں کے بارہ میں مسلمانوں کو ہدایات اور ان کے حقوق کی پاسداری کی خصوصی تلقین فرمائی تھی، جس سے ان کی حیثیت بلاشبہ کسی آزاد سے کچھ کم نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض غلاموں کو جب ان کے مالکوں کی طرف سے آزادی کی اطلاع ملتی تو بجائے خوش ہونے کے اس پر روتے تھے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو جب ان کے والدین تلاش کرتے کرتے بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ سے ان کو ساتھ لے جانے کی درخواست کی اور آپ ﷺ نے ان کو والدین کے ساتھ جانے اور نہ جانے کا اختیار دے دیا تو انھوں نے آزادی اور والدین کے ساتھ جانے پر غلامی اور حضور ﷺ کی خدمت میں رہنے کو ترجیح نہیں دی؟ کیا اب بھی عیسائیوں، قادیانیوں کو مسلمانوں کے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک پر اعتراض کا حق ہے؟

سوال (۶) ”مذہب کے نام پر قتل وغارت گری کو جہاد قرار دے کر اسے اسلام کا پانچواں بنیادی رکن بنانے کی سزا ماضی کے لاکھوں کروڑوں معصوم انسان بے شمار جنگوں کے نتیجے میں اپنی جان مال سے محروم ہوکر بھگت چکے ہیں اور عراق، افغانستان جنگ کی شکل میں آج بھی بھگت رہے ہیں، آخر اس ”جہاد“ کو بذریعہ اجتہاد ”جارحیت“ کے بجائے ”دفاع“ کے لئے کیوں استعمال نہیں کیا جاتا؟“

جواب: اس سوال کا جواب کسی قدر چوتھے سوال کے جواب کے ضمن میں آچکا ہے اور ثابت کیا جاچکا ہے کہ جہاد کا حکم حضرت محمد ﷺ نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔

نیز یہ بھی واضح ہوچکا ہے کہ اسلام نے جہاد کا حکم کفر وشرک کے فتنہ کے استیصال کے لئے دیا ہے اور یہ عقل وانصاف کے عین مطابق ہے، اگر دنیا کے دو پیسے کے حکمراں، اپنی مخالفت اور بغاوت کرنے والوں کی سرکوبی، ان کے فتنہ کو ختم کرنے اور اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے لاکھوں انسانوں کا خون بہا سکتے ہیں تو مالک ارض وسما کی ذات، جس نے جنوں اور انسانوں کو اپنی طاعت وعبادت کے لئے پیدا فرمایا تھا، اگر وہ (جن وانس) اس سے بغاوت کا ارتکاب کریں تو کیا اس

ذات کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے نمائندوں اور اپنی سپاہ کے ذریعہ ان کی سرکوبی کرے؟ اسلامی جہاد کے نام پر نام نہاد قتل وغارت گری کا طعنہ دینے والوں کو شاید یہ یاد نہیں رہا کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی پوری ۲۳ سالہ نبوی تاریخ گواہ ہے کہ اس عرصہ میں صرف ساڑھے تین سو مسلمانوں شہید ہوئے اور اس سے کچھ زیادہ کفار بھی کام آئے، نامعلوم اس کے مقابلہ میں ان کو اسلام دشمنوں کی انسانیت کشی کی تاریخ کے سیاہ کارنامے کیوں بھول جاتے ہیں؟ اور انہیں یہ کیوں یاد نہیں رہتا کہ مسلمانوں کو دہشت گرد اور جہاد کو دہشت گردی کہنے والے درندوں نے کس قدر انسانوں کو تہ تیغ کیا ہے؟

ہیروشیما، ناگاساکی میں لاکھوں انسانوں کا قتل عام، بوسنیا ہرزیگوینا میں مختصر عرصہ میں پانچ لاکھ انسانوں کو موت کی نیند سلانا، فلسطین، بیروت، افریقہ، افغانستان، عراق اور لبنان کی حالیہ تباہی، کن کے ہاتھوں ہورہی ہے؟

قادیانیو! اپنے آقاؤں سے پوچھو، کہ اس وقت روس، امریکا اور دنیا بھر کی عیسائیت ویہودیت کون سے جہاد کے نام پر انسانیت کشی کا کارنامہ انجام دے رہی ہے؟

کیا جرمنی کے ہٹلر کی انسان کشی بھی جہاد کے نام پر تھی؟ اسی طرح ویتنام اور وسط ایشیا میں آدم دشمنی کس نے کی؟ کیا اس کو بھی اسلام اور اسلامی جہاد کا نتیجہ قرار دیا جائے گا؟

قادیانیو! اگر تمہارے اندر ذرہ بھر شرم وحیا کی رمق اور انسانیت سے خیرخواہی ہے تو ڈوب مرو، اور جہاد کو مطعون کرنے کے بجائے اپنے آقاؤں سے کہو کہ انسانیت کشی کے اس بدترین کھیل سے باز آجائیں۔

دیکھا جائے تو جہاد کا مقدس فریضہ ایسے ہی درندوں کو سبق سکھانے اور ان کی راہ روکنے کا مؤثر ذریعہ ہے، مگر چونکہ تمہارے آقاؤں نے کہا کہ یہ دہشت گردی ہے، اس لئے تم اور تمہارے باوا مرزا غلام احمد قادیانی اس کو حرام قرار دینے کے لئے گزشتہ سو سال سے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کرنے میں مصروف ہو۔

مگر میرے آقا کا فرمان ہے کہ: ”**الجهاد ماض الى يوم القيامة**“ (مجمع الزوائد، ص:۱۰۶، ج:۱) (جہاد قیامت تک جاری رہے گا) اور اس کے ذریعہ مسلمان، عیسائیوں اور قادیانیوں کی راہ روکتے رہیں گے۔

❁ ❁ ❁

چوتھی قسط:

سلاطین ہند کے عہد میں غیر مسلموں کی شرعی حیثیت

از: محمد شمیم اختر قاسمی
ریسرچ اسکالر شعبہ سنی دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سلاطین غزنوی کا ہندوؤں کے ساتھ برتاؤ

محمد بن قاسم کے بعد محمود غزنوی نے ہندوستان پر حکومت کی، لوگ اس کے متعدد حملوں کا ذکر خوب بڑھا چڑھا کر اور مرچ مصالحہ لگا کر کرتے ہیں۔ مگر ان کے حملوں کے وجوہات کو یکسر فراموش کردیتے ہیں یا جان بوجھ کر چھپا دیتے ہیں۔ یہ میرا دعویٰ ہے کہ اگر راجہ جے پال اس کے والد سبکتگین کو مجبور نہ کرتا کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہو تو شاید اتنی جلدی غزنوی خاندان ہندوستان کی طرف متوجہ ہوکر اسے غزنی سلطنت کا حصہ نہ بناتے۔ باوجود اس کے وہ اپنے متعدد حملوں اور ہندوؤں کی طرف کی جانے والے عہد و پیمان کی خلاف ورزی کے بعد بھی اس نے ہندوؤں کے حقوق کو تسلیم کیا اور ہر جگہ اعلان معافی کے بعد غیر مسلموں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا اور انہیں اعلیٰ عہدے پر فائز کیا۔ اور جس کے رہنے اور اس کی سہولت کے لیے اس نے اپنی سلطنت کے قریب ایک مستقل بستی بسادی جس میں وہ آزادانہ طریقے سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ان دونوں سپاہیوں اور قائدوں کی فوج میں ہندو اور مسلمان سپہ سالار اور لشکر ہوتے تھے:

> ”کیوں کہ یہ لڑائیاں خالص سیاسی نہ تھیں اور مذہبی یا قومی نہ تھیں۔ اس لیے ایک طرف سرحدوں کے مسلمان راجہ جے پال کے ساتھ ہوکر سلطان محمود کے خلاف لڑتے تھے تو دوسری طرف محمود کی ہندو فوجیں راجاؤں کے خلاف لڑتی تھیں۔ چنانچہ شیخ حمید راجہ جے پال کی فوج کا کمانڈر تھا، برخلاف اس کے کوٹ کی لڑائی میں قلعہ بھیم کا ہندو راجہ محمود کے ساتھ تھا، اور اس لڑائی کے بعد دس ہزار ہندو محمود کی فوج میں داخل ہوئے جن کا سپہ سالار سوبند رائے تھا۔ اسی طرح تھانیسر کی لڑائی میں محمود کے ساتھ بارہ ہزار ہندو تھے۔ جب قنوج، مہابن اور برن (بلند شہر) پر فوج کشی ہوئی تو راجہ کشمیر برابر سلطان محمود کی رہبری کررہے تھے۔ حتیٰ کہ سب سے زیادہ مشہور سومناتھ کی لڑائی میں سمندر کی طرف سے جو حملہ کیا گیا اس میں ہندو سپاہی کشتیوں پر سوار تھے اور یقینی بات یہ ہے کہ اس زمانہ کے ہندو نہ کمزور تھے نہ بزدل اور نہ بے حمیت، جو اپنے مذہب کے خلاف محمود کے ساتھ ہوجاتے؛ بلکہ جرأت، مردانگی اور فراخ دلی میں ترک مسلمان کے جوڑ کے تھے۔“ (ہندو مسلم ..۔ ۱۸۷)

سلطان محمود کے بعد جب حکومت اس کی اولاد میں منتقل ہوئی تو اس زمانے میں بھی بڑے عہدے دار ہندو ہی تھے۔ جب سلطان مسعود کے نائب احمد نیالتگین نے شرکشی کی تو تمام مسلمان درباریوں کو چھوڑ کر سلطان مسعود نے ایک ہندو سردار تلک نامی کو متعین کیا جس نے احمد کو شکست دی۔ اسی سردار نے سلطان مسعود کی طرف سے راجہ ہانسی کے خلاف لڑ کر قلعہ ہانسی کو فتح کیا۔

غزنوی سلاطین کے بعد سلاطین غوری کے زمانہ میں بھی غیر مسلموں کے حقوق اور ان کی شرعی حیثیت کا پاس ولحاظ کیا گیا۔ اور حتیٰ المقدور کوشش کی گئی کہ غیر مسلموں سے جنگ میں اور دوسرے معاملات میں بھی شرع کی خلاف ورزی نہ کی جائے جس کی واضح مثال یہ ہے کہ جب شہاب الدین غوری انہلواڑہ کی فتح میں ناکام ہوکر غزنیں میں مقیم ہوا اور اپنی شکست کا انتقام لینے کے لیے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا تو کسی نے عرضی لکھ کر بھیجی کہ انہلواڑہ میں ایک مشہور سوداگر ہے، جس کا نام وسالہ ابہر ہے، وہ ہمیشہ لاکھوں کا مال تجارت کی غرض سے ان علاقوں میں بھجوایا کرتا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی اس کا دس لاکھ کے قریب کا مال غزنیں میں آیا پڑا ہے۔ اگر بادشاہ سلامت چاہیں تو اس مال کو ضبط کرکے خزانہ میں بھجوایا جاسکتا ہے، اس سے نہ صرف خزانہ معمور ہوگا بلکہ شاہی شان وشوکت میں اضافہ ہوگا۔ سلطان نے عرضی کی پست پر لکھ کر روانہ کردیا کہ وسالہ ابہر کا یہ مال اگر انہلواڑہ میں ہوتا اور وہاں اس پر قبضہ کیا جاتا تو ہمارے لیے حلال ہوتا، لیکن غزنیں میں اس مال پر قبضہ کرنا ہمارے لیے حرام ہے، کیونکہ وہ میری پناہ میں ہے۔

عہد سلطنت میں غیر مسلموں کے حقوق

عہد سلطنت یا سلاطین دہلی کے عہد کئی اعتبار سے ممتاز نظر آتا ہے کہ اس عہد میں ملک کی تعمیر

وترقی اور مسلم حکومت کے استحکام ودوام کے ساتھ مختلف علوم وفنون کی ترویج واشاعت ہوئی اور جس میں علوم فقہیہ کو عروج حاصل ہوا۔اس عہد میں فقہا کی اتنی کثرت تھی کہ ہرطرف فقہی مسائل کا چرچا اور غلغلہ تھا اور خود بادشاہ وقت کو علوم فقہیہ سے کافی دلچسپی تھی۔ بالخصوص عہد فیروزشاہی کے ممتاز فقہا میں شیخ اسحاق مغربی، شیخ حسین بن احمد بخاری، شیخ عثمان چشتی اودھی، مولانا جمال الدین دہلوی، شیخ حسن صنعانی، داؤد بن حسین شیرازی، مولانا نجم الدین سمرقندی، شیخ حسین یوسف سمرقندی، نجم الدین انتشار نیشاپوری وغیرہ ہیں۔اس کے عہد میں جو فقہی کتابیں معرض وجود میں آئیں ان میں فتاویٰ تاتارخانیہ، فتاویٰ فیروزشاہی، تحفۃ النصائح، طرفۃ الفقہاء، فوائد فیروزشاہی کے علاوہ اور بھی دوسری کتابیں تحریر کی گئیں نیز درسیات کی متعدد فقہی کتابوں کے شروح وحواشی زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ان کتابوں میں غیرمسلموں کے ساتھ ذمیوں اور حربیوں کے حقوق اوران کے مسائل کو زیر بحث لاکر ہندوستانی تناظر میں ان کی شرعی حیثیت متعین کی گئی اور پھر اس پر عمل درآمد کیا گیا۔ بطور مثال اور نمونہ کے یہاں صرف ایک استفتا نقل کیا جاتا ہے جس میں ذمیوں کے مسائل اوران کے حقوق کی وضاحت کی گئی ہے۔ جو فتاویٰ فیروزشاہی میں ہے:

سوال: اگر کوئی ذمی مسلمانوں کو سلام کرے تو کیا مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ وہ وعلیک کہہ کر اس کا جواب دے؟

جواب: ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں۔

سوال: اگر کوئی ذمی مسلمانوں کو اپنے گھر مہمان کی حیثیت سے بلائے، جب کہ دونوں کے مابین تجارتی تعلقات اور دوستی کے کچھ بھی تعلق نہیں، تو کیا اس مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ ذمی کے گھر اس کا مہمان بن کر جائے؟

جواب: مہمان بن سکتا ہے۔

سوال: کیا کوئی ذمی بیمار پڑجائے تو کیا مسلمان کو اس کی عیادت کے لیے جانا جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب: جائز ہوگا۔

سوال: مشرکوں اور ذمیوں کے برتن میں کھانا پینا مکروہ ہے یا نہیں؟

جواب: مکروہ ہے۔

سوال: اگر کوئی مسلمان ذمی فقیر کو صدقہ دیتا ہے تو شریعت کی رو سے اس کا دینا جائز ہوگا کہ نہیں۔

جواب: جائز ہوگا۔

سوال: اگر کفارہ میں کسی ذمی کو کھانا دیا جائے تو یہ جائز ہوگا کہ نہیں؟

جواب: جائز ہوگا۔

سوال: اگر کوئی کافر خداتعالیٰ سے دعا کرتا ہے تو کیا یہ کہنا جائز ہوگا کہ اس کی دعا قبول ہو۔

جواب: جائز ہوگا۔

اس استفتا سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے ذمیوں کے حقوق کا کس حد تک اور کتنی کشادہ دلی سے خیال رکھا اوراس کے لیے کتنی سہولتیں فراہم کیں۔ باوجود اس کے بعض معترضین یہ پروپیگنڈہ پھیلاکر ہندومسلم تعلقات کو ناخوش گوار بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ سلاطین دہلی کے عہد میں غیرمسلموں کو دباکر رکھا گیا۔انھیں عہدے اور مناصب سے محروم کردیا گیا اور انھیں طرح طرح سے ستایا گیا اور مندروں کو مسمار کیا گیا اور ہندوؤں کے مذہبی میلوں کو بند کردیا گیا۔ان تمام الزامات واتہام اور غلط فہمی کو یہاں دور کرنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ چند غلط فہمیوں کو یہاں دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جہاں تک مذہبی میلوں پر پابندی لگانے کی بات ہے، معلوم ہونا چاہیے کہ ان میلوں ٹھیلوں میں عوام کے ازدہام کی وجہ سے بہت سی سماجی برائیوں کو شہ مل رہی تھی، کیونکہ مردوزن کا اختلاط ہوتا تھا، جس کے نتیجے میں اوباش قسم کے لوگ برائیوں اور سماجی برائیوں کے مرتکب ہوتے تھے، چنانچہ سلطان وقت نے اس کے انسداد کے لیے ان میلوں کے انعقاد پر پابندی عائد کی۔ نہ صرف غیرمسلموں کے میلوں ٹھیلوں پر پابندی لگائی بلکہ مسلمانوں کے عرش کے موقعے پر عورتوں کی حاضری کو بھی موقوف کردیا۔ اسی طرح دہلی سے متصل ملوہ بستی میں ایک کنڈ تھا، جہاں ایک مندر تعمیر کیا گیا، جہاں ہندوؤں کی ایک جماعت مخصوص دنوں میں اپنے حواریوں کو ساتھ لے کر جمع ہوتے اور گھوڑے ساتھ ہوتے جو ہتھیار وغیرہ سے لیس ہوتے تھے، اس موقعے پر عورتیں اور بچے بھی بڑی تعداد میں وہاں اکٹھا ہوتے اور بت پرستی کرتے، یہاں پر ایک میلہ کا سا سماں ہوتا۔ اس جم غفیر کو دیکھ کر مسلمانوں کا ایک گروہ بھی یہاں پہنچتا۔ جس کی خبر سلطان کو ہوئی تو اس نے اس کے خلاف تادیبی کارروائی کرائی اور سرغنہ لوگوں کا قتل کروایا۔

اسی طرح فیروزشاہ کے عہد میں کچھ مندر مسمار کیے گئے جو ملکی مصالح اور عوام کی فلاح وبہبود کے پیش نظر رکھ کر توڑا گیا، اس کے علاوہ اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کچھ علاقوں

میں مندر توڑے گئے۔ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ جو علاقے مسلمانوں کے آباد کردہ ہیں اور جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں ہیں وہاں ہندو کوئی نئے مندر کی تعمیر نہیں کرسکتے۔ اس عہد میں جن مندروں کو توڑا گیا وہ مسلمانوں کے علاقے میں تعمیر ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ مندر جنگ کے موقعے پر توڑے گئے اور کچھ مندر اس لیے توڑے گئے کہ وہ بداخلاقی اور منکرات کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ جس کے متعلق ڈاکٹر ایشور ٹوپا لکھتے ہیں کہ: فیروز شاہ نے اسلامی قانون کے تحت اور دوسری طرف پبلک کی بھلائی کے پیش نظر ان مندروں کو توڑا۔

سلطان محمد تغلق کے خلاف ایک ہندو امیر نے عدالت میں دعویٰ کیا کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بلاسبب مار ڈالا ہے۔ قاضی نے سلطان کو اپنی عدالت میں طلب کیا، وہ بغیر کسی پندار کے قاضی کی عدالت میں پہنچا، جاکر سلام کیا۔ قاضی کو پہلے سے کہلا بھیجا تھا کہ وہ عدالت میں آئے تو اس کی تعظیم نہ کی جائے۔ وہ قاضی کے سامنے ملزم کی حیثیت سے کھڑا ہوا۔ قاضی نے حکم دیا کہ سلطان مدعی کو راضی کرے، ورنہ قصاص کا حکم ہوگا۔ سلطان نے مدعی کو راضی کیا، تو اس کی گلوخلاصی ہوئی۔ اس فیصلہ سے اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ مسلم فرمارواؤں نے سلطنت کے غیرمسلموں کو کتنی آزادی اور مراعات دے رکھی تھی۔

❁ ❁ ❁

انٹرنیٹ کی ہلاکت خیزیاں اوران سے بچنے کی تدابیر

مولانا مفتی محمود زبیر قاسمی، حیدرآباد
استاذ دار العلوم رحمانیہ و منتظم مجلس علمیہ آندھراپردیش

انسانی اقدار روز بروز روبہ زوال ہیں، اخلاق وکردار کی گراوٹ روز افزوں ہے، بعض طبقوں کی جانب سے اپنے حقیر مفادات کے حصول کے لیے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی جارہی ہے، یہ مسئلہ اس وقت اور سنگین ہوجاتا ہے جب نوجوان نسل کی بات آتی ہے؛ کیونکہ یہ کسی بھی قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں، کسی بھی قوم کے انقلاب میں گراں قدر حصہ انھی نوجوانوں کا ہوتا ہے، دوسری طرف نوجوان عقل کے کچے اور جذبات کے اندھے ہوتے ہیں، جس طرف ان کی عقل چل گئی، چل گئی... جیسی بھی ان کی فکر بن گئی، بن گئی... زندگی کا یہ دور بڑا نازک ہوتا ہے... اس مرحلہ میں آدمی بنتا بھی ہے بگڑتا بھی ہے، جونقوش اس وقت مرتب ہوتے ہیں، زندگی بھر کے لیے ہوتے ہیں، کل حشر کے میدان میں بھی بطورِ خاص زندگی کے اس حصہ کے اعمال کی باز پرس ہوگی۔ (الحدیث)

لن تزول قدما عبدٍ يوم القيامة حتى يسئل عن أربع خصال، عن عمره فيما أفناه، وعن شبابه فيما ابلاه، وعن ماله من اين اكتسبه وفيما أنفقه وعن علمهِ ماذا عمل فيه. (الترغيب والترهيب: ٤/٢١٤)

کسی شخص کے قدم قیامت کے دن اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہٹیں گے جب تک کہ چار باتوں کی اس سے پوچھ گچھ نہ ہوجائے: (۱) عمر کہاں لگائی؟ (۲) جوانی کہاں گنوائی؟ (۳) مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ (۴) علم پر کہاں تک عمل کیا؟

جس قوم کے جوانوں میں عقابی روح بیدار رہتی ہے، کچھ کرگزرنے کا جذبہ ان میں انگڑائی لینے لگتا ہے تو تاریخ بتاتی ہے کہ وہ قوم ترقی کی معراج پر ہوتی ہے اور جس قوم کے جوان خوابیدگی کا شکار ہوجاتے ہیں، وہ قوم روز افزوں تنزل کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔

سائنس وٹکنالوجی کی دم بخود ترقی نے جہاں نئے، نئے ایجادات اور انکشافات سے دنیا کے

لیے سہولیات اور معلومات کا انبار لگادیا، وہیں اس نے دنیائے شہوت پرستی کے لیے نئی راہیں بھی کھول دیں، مواصلاتی دوریوں نے سمٹ کر جہاں انسانیت کو آسانیاں دیں، وہیں نفسانی خواہشات کے دیوانوں کو تسکین کا سامان بھی کیا، چند دن قبل شائع شدہ اخباری رپورٹ کے مطابق ''کچے گوشت'' کی دلالی کا کاروبار بھی انٹرنیٹ پر زور وشور سے ہورہا ہے، جس میں مالدار اوران میں بالخصوص نوجوان نسل کو مائل کیا جارہا ہے اور بڑی بھاری رقومات ان سے حاصل کی جارہی ہیں؛ بلکہ اس بہانے Debit اور Credit کارڈس کے نمبرس حاصل کرتے ہوئے اوران کے Passwords کو محفوظ کرتے ہوئے کھاتے خالی کیے جارہے ہیں... یعنی اخلاق وایمان کی بربادی کے ساتھ مال کی بھی بربادی... اس کے علاوہ بیسیوں ویب سائٹس فحش مناظر اور لٹریچر سے بھری ہیں... جذبات مشتعل بھی کیے جارہے ہیں اوراس کی تسکین کے لیے دلالی بھی کی جارہی ہے۔

حکومت کی جانب سے انفارمیشن ٹکنالوجی کو فروغ دینے کے لیے مختلف اقدامات کیے جارہے ہیں؛ لیکن انتہائی بے ہودہ اور فحش ویب سائٹس کو بند کرنے کے لیے کسی بھی طرح کا اقدام نہیں کیا گیا اور نہ ہی انٹرنیٹ فراہم کرنے والوں نے اپنی اخلاقی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اس طرح کی ویب سائٹس کو بند کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجہ میں ایسا لگتا ہے جیسے بے حیائی اور فحاشی کا سیلاب امڈ آیا ہے اور بالخصوص نوجوان نسل اس کی زد میں ہے۔

بی بی سی ٹیلی ویژن نے اس سلسلہ میں ماہرینِ نفسیات اور عام شہریوں کے درمیان ۲۰۰۳ء سے قبل ایک مباحثہ کا اہتمام کیا، جس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۵رفیصد سے زائد افراد ہیجان انگیز اور عریاں مواد سے دل بہلاتے ہیں، اسی مباحثہ میں اس رپورٹ کا بھی افشار کیا گیا کہ ۹رفیصد برطانوی لوگ فی ہفتہ گیارہ گھنٹے جنسی تصاویر دیکھتے ہیں، یہ رپورٹ آج سے چار سال قبل کی ہے، جب انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کا شیوع اس قدر نہیں تھا، غریب طبقے کے مقابلے میں مالدار لوگ انٹرنیٹ پر شہوانیت کے نت نئے طریقے سیکھ رہے ہیں، جنسی طور پر ایک دوسرے کو تکلیف دے کر خوش ہونا، ہم جنس پرستی، جانوروں سے تعلقات، چھوٹے بچوں، بچیوں، عورتوں، بوڑھوں، ماں، بہن، بیٹی کے ساتھ عمل قوم لوط، زنا بالجبر اور دیگر کئی طرح کی چیزیں مالدار اور انٹرنیٹ سے مربوط نوجوان نسل سیکھ رہی ہے، جس کو وہ اپنے معاشرے اور بیویوں کے ساتھ کرنے کی کوشش کررہے ہیں، جس سے رشتوں کا تقدس بھی پامال ہورہا ہے اور شادی شدہ جوڑے بے کیفی کی زندگی گزار رہے ہیں، رپورٹ کے مطابق اس وقت امریکہ میں کئی لاکھ جوڑے ایسے ہیں جن کی ازدواجی زندگی انٹرنیٹ کی وجہ سے تباہ ہوچکی ہے، ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت انٹرنیٹ پر دس لاکھ سے زائد عریاں تصاویر

موجود ہیں اور ایک لاکھ سے زائد عریاں فلمیں انٹرنیٹ سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

یہ تو ان بے ہودہ اور غلط پروگراموں کی ہلکی سی جھلک ہے، حقیقتاً ایسے بہت سے پروگرام انٹرنیٹ پر کمپیوٹر کے ذریعہ دستیاب ہیں جنھیں دیکھ کر شرافت آنکھیں بند کرلیتی ہے۔

ماں باپ اور سرپرست پوری احساس ذمہ داری کے باوجود اپنی نوجوان نسل کو اس طرح کے فواحش سے روکنے میں بہت کم کامیاب ہیں... بالخصوص پڑھا لکھا طبقہ، ان کے یہاں اگر بچوں کو انٹرنیٹ کے استعمال سے روکا جائے تو معلومات کے ایک اہم ذخیرہ سے وہ محروم رہیں... اگر اپنے گھر انٹرنیٹ رکھیں تو ان کی نگرانی کیسے کی جائے؟ اور ان کو فحش ویب سائیٹس سے کیسے بچایا جائے... انٹرنیٹ کے استعمال کنندگان جانتے ہیں کہ انٹرنیٹ نے دنیا کو ایک گاؤں کی شکل دے رکھی ہے، یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جس سے کروڑہا افراد بیک وقت مربوط اور ایک دوسرے کے خیالات اور سہولتوں سے استفادہ کرسکتے ہیں، یہاں ہر اہم عالمی چیز آپ کو مل جاتی ہے، اس کی معلومات، تعارف اور توضیحات بس ایک ''کلک'' کی محتاج، کسی بھی اہم مسئلہ کی عقدہ کشائی چند منٹوں میں ہوجاتی ہے، دنیوی میدان کی بہت کم چیزیں ایسی ہیں جو انٹرنیٹ پر دستیاب نہ ہوں، معلومات کے حصول کی اتنی بڑی سہولت سے اگر آپ ان کو روکنا چاہیں تو یہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے اور حصول تعلیم کے ذرائع سے روکنے کا الزام بھی آپ کے سر لگادیا جائے گا۔

یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ دین محض نماز، روزے اور دیگر عبادات ہی کا نام نہیں بلکہ زندگی کے ہر عمل اور ہر حرکت کے لیے دینِ اسلام میں رہنمائی موجود ہے اور بحیثیت مسلمان ہمیں ان کا اتباع بھی لازم ہے۔

لہٰذا اس تعلق سے اعتدال کی راہ یہ ہے کہ اسلامی حدود میں رہتے ہوئے اس کا استعمال ہو اور اس کے برے اثرات سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں، آپ کو یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی اور آپ مسرور بھی ہوں گے کہ انٹرنیٹ کے مختلف پروگرام چلانے کے لیے جہاں بہت سے سافٹ ویر ہیں، وہیں چند ایک پروگراموں اور Sex Based Sites کو (Blook) بند کرنے کے لیے بھی چند ایک سافٹ ویر موجود ہیں۔

اگر آپ کے نیٹ فراہم کرنے والے مخصوص اور غیر شرعی ویب سائیٹس کو بند کرنے کی کوئی سہولت نہ دیں تو آپ مندرجہ ذیل سافٹ ویرس کی مدد سے جو مارکیٹ میں دستیاب بھی ہیں، نامناسب، غیر اخلاقی، فحش اور اسلام مخالف ویب سائیٹس کو بند کرسکتے ہیں، ان سافٹ ویرس کے نام حسبِ ذیل ہیں:

(1) Cyber Sitter.(2) Net Nanny. (3) Cyber Petrol.

(4) Norton Internet Security. (5) Mcafee Parental Control.

ان سافٹ ویرس کو اپنے کمپیوٹر پر انسٹال Instal کریں، اس کے بعد ان کی Setting کریں، یہ فحش ویب سائیٹس کو بلاک (بند) کردیتے ہیں، دراصل یہ سافٹ ویرس بھی غیر اسلامی ویب سائیٹس کو بنیادی طور پر بند نہیں کرتے لیکن ان میں ایسے آپشنز (Options) ہوتے ہیں جن کی مدد سے آپ کسی بھی غیر شرعی اور فحش ویب سائیٹ کو بند اور Blook کرسکتے ہیں، ان سافٹ ویرس کی سیٹنگ (Setting) مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔

سافٹ ویر کی مدد سے فحش اور غیر اسلامی لٹریچر سے بچنے کا یہ طریقہ ان حضرات کے لیے تھا، جہاں حکومت اور نیٹ فراہم کرنے والے ادارے اس طرح کی ویب سائیٹس کو بلاک (بند) کرنے کی کوئی سہولت اپنے صارفین کے لیے فراہم نہ کیے ہوں، ان کے بالمقابل ترقی یافتہ ممالک میں اقامت پذیر لوگوں کے لیے یہ مسئلہ آسان ہے، وہ اس طور پر کہ ان ممالک کے لوگ جب انٹرنیٹ کا کنکشن (Connection) خریدیں تو اس وقت اس کمپنی سے جس سے انٹرنیٹ خرید رہے ہیں یہ کہیں کہ ہمیں Parental Control چاہیے یا اگر انٹرنیٹ خریدتے وقت کمپنی کوئی فارم پر کروالے تو اس میں Parental Control پر ٹک لگادیں، اس طریقہ پر جب آپ اُس انٹرنیٹ فراہم کرنے والی کمپنی کے صارف بنیں گے تو آپ کے گھر استعمال ہونے والے کمپیوٹر پر فحش مواد پر مبنی ویب سائیٹس نہیں کھلیں گے۔

انٹرنیٹ کی مضرتوں سے بچنے کے لیے مذکورہ بالا طریقوں کو اختیار کرنا اور اپنے گھر والوں کے ایمانی، اسلامی، اخلاقی اور تہذیبی اقدار کے تحفظ کے لیے ان کی مسلسل نگرانی ناگزیر ہے؛ ورنہ انٹرنیٹ سے ضرررساں تعلق قائم کرتے ہوئے آپ یہ بھی ضرور سوچ لیں کہ آپ اپنے گھر والوں کے مذہب، تہذیب اور اخلاق کی تباہی کے ذمہ دار بھی ہیں، آپ کی بچی کسی اجنبی سے بات کرے تو کیا آپ بے تعلق رہ سکتے ہیں؟ آپ کا بچہ گلیوں میں نکل کر اجنبیوں سے راہ ورسم بڑھائے تو کیا آپ خاموش رہیں گے؟ یقیناً ہرگز نہیں؛ لیکن یقین کریں کہ انٹرنیٹ پر گھر بیٹھے یہی سہولتیں فراہم کی جارہی ہیں، شیطان اور اس کے پیروکار گھروں میں گھس کر ہمیں تباہ کررہے ہیں اور ہماری نسلوں کو بے حیائی اور بدچلنی پر برانگیختہ کررہے ہیں۔

اس ٹکنالوجی سے اور اس پر موجود علمی مواد سے فائدہ اٹھانے کے وقت یہ بات ضرور سامنے رہنی چاہیے کہ اس کے فاسد مواد اور نقصانات سے کس طرح بچا جاسکتا ہے۔

رپورٹ اجلاس ششم مجلس عاملہ
رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند

ازقلم: (مولانا) شوکت علی قاسمی بستوی
ناظم عمومی رابطہ مدارس اسلامیہ واستاذ دارالعلوم دیوبند

رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس عاملہ کا اجلاس مہمان خانۂ دارالعلوم دیوبند میں حضرت اقدس مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب زیدمجدہم مہتمم دارالعلوم دیوبند وصدر رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کی زیرصدارت مورخہ ۱۲رذی قعدہ ۱۴۲۷ھ مطابق ۴ردسمبر ۲۰۰۶ء کو جناب مولانا قاری محمد آفتاب صاحب امروہوی استاذ تجوید دارالعلوم دیوبند کی تلاوت قرآن پاک سے ساڑھے آٹھ بجے صبح شروع ہوا، حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب نائب مہتمم دارالعلوم زیدمجدہم نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی مدظلہم نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے حضرت صدر اجلاس زیدمجدہم کی جانب سے افتتاحیہ پیش فرمایا۔

افتتاحیہ میں حضرت صدر اجلاس دامت برکاتہم نے دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس اسلامیہ کے اغراض ومقاصد اوران کی روشن خدمات اور کارناموں پر روشنی ڈالی اور موجودہ حالات کے تناظر میں مدارس اسلامیہ اوران کے ذمہ داران ووابستگان پر فرقہ پرستوں اور فسطائی عناصر کی جانب سے لگائے جانے والے بے بنیاد الزامات اوران کے کردار ووقار کو مجروح کرنے کی منصوبہ بند کوششوں اور سازشوں پر اپنی گہری تشویش کا اظہار فرمایا، حضرت والا نے مرکزی حکومت کی جانب سے مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام کی تجویز مدارس کے نصب العین اور روح کے یکسر منافی قرار دیا اور اسے مدارس کو حکومت کے زیرکنٹرول لانے اوران کے نصاب ونظام میں بنیادی تبدیلی کرنے کی سمت ایک خطرناک قدم سے تعبیر فرمایا، حضرت والا نے اپنے افتتاحیہ میں مدارس اسلامیہ کے نظام تعلیم وتربیت کو بہتر اور چست بنانے اور باہمی ربط واتحاد کو فروغ دینے کے لیے

ضابطۂ اخلاق کی پابندی پرزور دیا، اسی کے ساتھ خطبۂ افتتاحیہ میں رابطہ مدارس کی صوبائی شاخوں کو فعال بنانے کی تاکید بھی کی گئی۔

خطبۂ افتتاحیہ کے بعد حسب پروگرام حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری زیدمجدہم استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے نظام تعلیم وتربیت کے موضوع پر نہایت ہی وقیع خطاب میں فرمایا کہ آج عام طور پر مدارس اسلامیہ کی تعلیم کا معیار گرتا جارہا ہے، طلبہ کی استعداد کمزور ہوتی جارہی ہے مجلس کو اس کا جائزہ لینا چاہیے اور اسباب انحطاط پر غور کرکے انھیں دور کرنے کی کوشش کی جانی ضروری ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ طلبہ کی استعداد اور لیاقت میں جب بہتری ہوگی جب تین چیزوں کا اہتمام والتزام کیا جائے گا۔(۱) طلبہ عزیز ہونے والے سبق کا مطالعہ کرکے آئیں (۲) پوری توجہ اور انہماک سے سبق پڑھیں اور استاذ کے درس کو سنیں، سمجھیں (۳) پھر پڑھے ہوئے سبق کا مذاکرہ اور تکرار کریں۔

آپ نے فرمایا کہ معیار تعلیم بلند کرنے کے لیے اساتذہ کی فنی مہارت ضروری ہے، ماہر فن اساتذہ کی قدردانی کی جائے، جس فن سے جس استاذ کو مناسبت ہو اس فن کی کتابیں دی جائیں اور فنی ترقی کے لیے فضا کو سازگار بنایا جائے، ہمت افزائی کی جائے۔ ہمارے مدرسوں کا نصب العین مردم سازی ہے اس پر بھرپور توجہ کی ضرورت ہے، نصاب تعلیم سے متعلق حضرت مولانا نے فرمایا کہ سب سے پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ ہمارے نصاب تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ ہمارے نصاب تعلیم کا مقصد تفقہ فی الدین ہے اس لیے علوم قرآن وحدیث میں پختہ صلاحیت پیدا کرنا ضروری ہے۔ علوم عالیہ کو تو چھیڑا نہیں جاسکتا، ہاں علوم آلیہ میں تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ اور دینی تربیت پر بھی خصوصی توجہ مبذول رکھنے کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند زیدمجدہم نے ضابطۂ اخلاق کے موضوع پر اپنے خطاب میں حمد وصلاۃ کے بعد فرمایا:

حضرت مہتمم صاحب زیدمجدہم کے خطبۂ افتتاحیہ میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ ضابطۂ اخلاق کو رابطہ مدارس اسلامیہ سے مربوط تمام مدارس میں نافذ کیا جائے، نظام کو چست اور فعال بنایا جائے۔ مدرسے سے متعلق تین چیزیں ہیں: (۱) انتظامیہ جس کے سربراہ مہتمم صاحب یا مجلس شوریٰ ہوتی ہے، (۲) اساتذہ، (۳) طلبہ۔ اگر سب اپنے مفوضہ فرائض دستور کے مطابق انجام دیں تو یہی ضابطۂ اخلاق کی پابندی ہے۔ مثلاً ذمہ داران وارکان صائب الرائے ہوں، مدرسین

اپنی تدریس میں مخلص ہوں، طلبہ میں جدوجہد کا جذبہ اور لگن ہو، سب کو ضابطۂ اخلاق کا پابند بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہر مدرسے کا ایک دستور ہو جس میں سب کے حقوق وفرائض کی تفصیل ہو اور سب اس کی پابندی اپنے لیے ضروری سمجھیں۔ ضابطۂ اخلاق کے سلسلہ میں مزید وضاحت کے بعد آپ کے مدارس کے خلاف جاری مہم کے سلسلہ میں فرمایا کہ: آج مدارس اسلامیہ کے خلاف چاروں طرف سے حملے ہورہے ہیں، جب کہ یہ مدارس اسلام اور علوم اسلامیہ کی حفاظت اور اسلامی تشخص کے بقاء کے مضبوط قلعے ہیں، اگر ہم مدارس کے علماء وذمہ داران مضبوط ہوتے تو ان کو حملے کرنے میں دشواری ہوتی۔

اس کے بعد ایجنڈے کی دفعات پر اجتماعی غور وخوض شروع ہوا، اور سب سے پہلے سابقہ اجلاس کی کارروائی ناچیز نے پڑھ کر سنائی، اور حضرت صدر اجلاس نے کارروائی رجسٹر پر اپنے توثیقی دستخط ثبت فرمائے۔ پھر احقر نے ہی مرکزی دفتر رابطہ مدارس کی رپورٹ پیش کی جس میں رابطہ مدارس کے مرکزی دفتر اور صوبائی شاخوں کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ بحمد اللہ اس پر اظہار اطمینان کیا گیا۔

بعد ازاں ایجنڈے کی مختلف دفعات کے تعلق سے حضرات اراکین گرامی نے اپنے خیالات پیش کیے۔

حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب زید مجدہم ناظم تعلیمات دارالعلوم وصدر جمعیۃ علماء ہند نے فرمایا کہ: ساری دنیا میں مدارس اسلامیہ کو نشانہ بنایا جارہا ہے، اصل نشانہ قرآن وحدیث کی تعلیم ہے۔ بعض عرب ممالک کے نصاب سے دینی مضامین کم کرادیئے گئے ہیں۔ مرکزی حکومت نے مرکزی مدرسہ بورڈ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کا مقصد مدارس کی روح کو ختم کردینا ہے، بہار میں اور دیگر کئی صوبوں میں تجربہ کیا جاچکا ہے۔ صوبائی بورڈ سے ملحق مدرسے اپنی حقیقت کھوچکے ہیں۔ وسیع پیمانے پر یہی کام مدارس مخالف لوگ پورے ملک میں کرنا چاہتے ہیں، اس وقت ضروری ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں تمام مدارس کے علماء وذمہ داران کو جمع کیا جائے اور مدارس اسلامیہ کے کل ہند اجلاس عام میں مرکزی مدرسہ بورڈ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جائے اور فیصلہ لیا جائے تاکہ مدارس کو حکومت کی گود میں جانے اور سرکاری امداد قبول کرنے سے روکا جاسکے۔

حضرت مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی زید مجدہم رکن شوریٰ دارالعلوم نے فرمایا کہ تمام مدارس اسلامیہ کے اجلاس کی جو تجویز حضرت مولانا سید ارشد مدنی زید مجدہم نے رکھی ہے وہ بہت

ضروری اور برمحل ہے، اس سے قبل مجلس شوریٰ میں بھی میں نے یہ تجویز رکھی تھی کہ مدارس اسلامیہ کا کل ہند اجلاس بلایا جائے۔ اس سے مدارس میں بیداری بھی پیدا ہوگی اور مسلک کا تحفظ ہوسکے گا۔ دارالعلوم کی اصول ہشت گانہ کو خوب عام کیا جائے، اور بلا کسی تحریک کے زیادہ سے زیادہ مکاتب قائم کیے جائیں۔ حضرت مولانا غلام رسول صاحب خاموش کارگزار مہتمم دارالعلوم مدظلہ نے بھی مرکزی مدرسہ بورڈ کو مدارس کے لیے نقصان دہ قرار دیا اور کل ہند اجتماع کی ضرورت پر زور دیا۔

حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب زید مجدہم استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے فرمایا کہ مدرسہ بورڈ کی مضرتوں کو نشان زد کرکے اہل مدارس کو ان سے آگاہ کرایا جائے۔ مثلاً جو نصاب بنے گا اس سے دینی عناصر کو کم کرکے ہندی انگریزی زبان، اور نئے علوم داخل کرائے جائیں گے۔ جیسا کہ الہ آباد بورڈ کے نئے نصاب میں کیا گیا ہے۔

حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی زید مجدہم رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے فرمایا کہ مرکزی مدرسہ بورڈ کے خلاف دارالعلوم میں مدارس اسلامیہ کا کل ہند اجلاس منعقد کیا جائے لیکن اس میں وقت لگے گا۔ مرکزی مدرسہ بورڈ کے سلسلہ میں تجویز کا مطالعہ کرکے رابطہ مدارس کا فوری ردعمل اور دارالعلوم کا نقطۂ نظر اخبارات میں دیا جانا چاہیے اور ذمہ داران مدارس کو تاکید کی جانی چاہیے کہ وہ حکومت کے دام فریب میں نہ آئیں۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی زید مجدہم استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے فرمایا کہ: اس وقت یورپ اور امریکہ اسلام دشمنی میں اندھے ہوچکے ہیں، ان کی کوشش ہے کہ مدارس اسلامیہ کو ختم کردیا جائے۔ مرکزی مدرسہ بورڈ کا قیام درحقیقت مدارس کے کردار کو ختم کردینے کی سازش ہے، جو لوگ ہمارے وجود کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ان کو ہمارے مدارس کی کیوں فکر ہونے لگی۔ مدارس کو بیدار کرنے اور ان کو خطرات سے بچانے کے لیے جو کام دارالعلوم کرسکتا ہے وہ کوئی اور نہیں کرسکتا۔ اس لئے اس سلسلہ میں مدارس کا اجلاس عام دارالعلوم میں بلایا جائے، اس سلسلہ میں تجویز آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی زید مجدہم رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم نے، مدارس اسلامیہ کے زیر انتظام مکاتب دینیہ کے قیام کے حوالہ سے فرمایا کہ مکاتب دینیہ کے قیام کے سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے ایک تجویز پاس کی تھی، جو آپ حضرات تک پہنچ چکی ہے۔ کہ ہر مدرسہ مکاتب کے قیام وانتظام پر اپنے سالانہ بجٹ کا دس فیصد حصہ خرچ کرے، جامعہ اشاعت العلوم اکل کوا شروع سے اس پر توجہ دے رہا ہے۔ اس وقت جامعہ کے زیر انتظام سترہ سو

مکاتب چل رہے ہیں، جن میں ہزاروں بچے پڑھ رہے ہیں اور ہر بچے پر ڈھائی سو روپیہ سالانہ خرچ اوسطاً آتا ہے، مکاتب کے قیام کے عنوان سے بھی امت سے تعاون لیا جاسکتا ہے۔ امت آپ کی ہر بات قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ ضرورت ہے صحیح معنوں میں پوری دیانت داری و اخلاص کے ساتھ کام کرنے کی، ہم اپنا حساب و کتاب صاف رکھیں، انشاء اللہ کبھی مدارس کو مالی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اجلاس میں غور وخوض کے بعد طے پایا کہ ہر مدرسہ اپنے وسائل کے بقدر مکاتب دینیہ کے قیام اور ان کی نگرانی کی طرف توجہ دے اور اگر ممکن ہو تو اپنے بجٹ کا دس فیصد حصہ مکاتب کے لیے مخصوص کردے۔

ایجنڈے کی مختلف دفعات پر غور وخوض کے دوران دیگر حضرات ارکان مجلس عاملہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ جناب مولانا احمد دیولوی صاحب صدر رابطہ مدارس گجرات نے گجرات میں مدارس اسلامیہ کو درپیش مسائل پر روشنی ڈالی، اور صوبائی ذمہ داروں کی طرف سے مدارس کے سلسلہ میں گورنر کو جو میمورنڈم پیش کیا گیا اور مدارس کے تحفظ کا مطالبہ کیا گیا، اس کے پس منظر اور نتائج سے مجلس عاملہ کو روشناس کرایا اور یہ رائے بھی پیش کی کہ حکومت کے ذمہ داروں سے ملاقات کرکے رابطہ کی طرف سے ان کو میمورنڈم پیش کیا جانا مفید ہوگا۔

جناب مولانا قاری شوکت علی صاحب مہتمم جامعہ اعزاز العلوم ویٹ غازی آباد نے فرمایا کہ فرقہ پرستوں نے مدارس اسلامیہ کو اتنا بدنام کردیا ہے کہ جب مدارس کے سلسلہ میں ذمہ داران حکومت سے بات کی جاتی ہے کہ ان کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں تو وہ تذبذب کا شکار رہتے ہیں اور ان کا ذہن صاف نہیں رہتا، لیکن ہمیں اپنا حوصلہ بلند رکھنا چاہیے اور مدارس کے تحفظ کے سلسلہ میں تدابیر اختیار کرنی چاہیے۔ جناب مولانا حکیم محمد عرفان صاحب حسینی کلکتہ نے، اپنی مرسلہ تجویز میں فرمایا کہ پچھلے چند دنوں میں دورۂ حدیث قائم کرنے والے مدارس کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے اس پر روک لگنی ضروری ہے، اسی طرح کوئی بھی شخص کسی مدرسے سے الگ ہونے کے بعد کہیں بھی مدرسہ کھول لیتا ہے اس پر کنٹرول کی ضرورت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مدارس کے نصاب میں دستور ہند کا اردو ترجمہ داخل نصاب ہونا چاہیے تاکہ طلبہ کو دستور اور مسلمانوں اور اقلیتوں کے بنیادی حقوق اور ان کے حصول کا طریقہ معلوم ہو۔ مجلس میں مولانا موصوف نے مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام کی مخالفت کی اور فرمایا کہ بورڈ قائم کرنے کے لیے کل جو سرکاری میٹنگ بلائی گئی تھی اس کا دعوت نامہ میرے پاس آیا تھا اور صدیقی صاحب کا فون بھی آیا

لیکن میں نے کہا کہ میں اس کا شدید مخالف ہوں، میں شریک نہ ہوں گا، کہ شرکت بھی تعاون ہے۔ جناب مولانا عبدالقوی صاحب مہتمم جامعہ اشرف العلوم حیدرآباد نے فرمایا کہ مدارس اسلامیہ کے خلاف ملکی سطح پر جو لوگ فتنے اور غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ مدارس میں کیا ہوتا ہے، اور ان کا دہشت گردی سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ میمورنڈم وغیرہ پیش کرنے سے اچھے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں میڈیا پر توجہ دینے کی ضرورت ہے جو شکوک وشبہات پیدا کیے جارہے ہیں ان میں ذرائع ابلاغ کا بڑا دخل ہے۔ مدارس کے سلسلہ میں جو مضامین ہم شائع کرتے ہیں، جوابات دیتے ہیں وہ صرف اردو اخبارات میں شائع ہوتا ہے۔ ہمیں ہندی اور انگریزی اخبارات میں مضامین کی اشاعت پر توجہ دینا چاہیے۔

جناب مولانا محمد شمس الدین صاحب قاسمی استاذ دارالعلوم شاہ ولی اللہ بنگلور نے فرمایا کہ محترم مولانا زین العابدین صاحب کو کرناٹک رابطہ کا ذمہ دار اور صدر بنایا گیا ہے، اب رابطہ مدارس کو فعال بنانے کی توجہ شروع ہوئی ہے۔ پورے صوبے کے مدارس اسلامیہ کو رابطہ سے مربوط کرنے کے لیے مہم شروع کردی گئی ہے۔ جناب جسٹس سہیل صدیقی صاحب بنگلور بھی آئے تھے، ذمہ داران مدارس کو انھوں نے مدعو کیا اور مدرسہ بورڈ کے فوائد بیان کیے، میں نے اس موقع پر کہا کہ تمام مدارس اسلامیہ کا مرکز دارالعلوم دیوبند ہے، اکابر دارالعلوم دیوبند نے جو نصاب تعلیم جاری کیا ہے وہی ہمارے یہاں بھی رائج ہے۔ نصاب تعلیم، نظام تعلیم وغیرہ میں ہم پورے طور پر دارالعلوم دیوبند کے تابع ہیں انھوں نے مزید کہا کہ حکومت کی طرف سے اگر کوئی مفید اور نتیجہ خیز چیز آئے تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے اور اس کی تائید بھی کرنی چاہیے مثلاً سچر کمیٹی کی سفارشات میں مسلمانوں کی تعلیمی وسماجی ترقی کے سلسلہ میں جو اقدامات تجویز کیے گئے ہیں، ہمیں ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے اور ان کے نفاذ کے لیے حکومت پر زور ڈالنا چاہیے۔

جناب مولانا عبدالہادی صاحب مہتمم مدرسہ نورالعلوم ہرہرپور نے تدریب المعلمین کا نظام قائم کرنے، طریقۂ تعلیم درست کرنے اور مکاتب کے قیام پر مزید توجہ دینے پر زور دیا۔ اسی طرح طلبہ کے قیام وطعام اور اساتذہ کے مشاہرے پر بھی خصوصی توجہ کی تاکید فرمائی۔

جناب مولانا رحمت اللہ صاحب میر قاسمی مہتمم دارالعلوم بانڈی پورہ وصدر رابطہ مدارس جموں کشمیر نے فرمایا کہ مدارس کے بارے میں جو کچھ ہورہا ہے یہ صرف مقامی اور ملکی مسئلہ نہیں ہے، یہ ایک بین الاقوامی سازش ہے، بڑی طاقتوں کی طرف سے ڈور ہلائی جارہی ہے اس لیے کوئی

اقدام کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح اور وسیع پیمانے پر غور وخوض کرلیا جانا ضروری ہے۔

جناب مولانا ظفیر الدین صاحب صدر رابطہ مدارس دہلی نے طلبہ کے داخلہ کا نظام بہتر بنانے پر زور دیا اور فرمایا کہ ہمیں مدارس کے تحفظ پر توجہ مرکوز رکھنی ہے تاکہ کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے فرقہ پرستوں کو مدارس اسلامیہ کو بدنام کرنے کا موقع ملے۔

جناب مولانا عبدالقادر صاحب ناظم اعلیٰ تنظیم المدارس آسام نے آسام کے دینی مدارس کی صورت حال بیان کی، کہ ہمارے یہاں بھی سرکاری افسران ذمہ داران کو تنگ کرتے ہیں مدارس میں آنے جانے والے لوگوں پر نظر رکھتے ہیں۔ اس لیے ذمہ داران کو بیحد محتاط رہنے اور مدارس کے نظام کو صاف وشفاف بنائے رکھنے کی ضرورت ہے۔

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ جو اور حضرات اجلاس میں شریک ہوئے ان میں حضرت مولانا عبدالحق صاحب اعظمی، حضرت مولانا قمرالدین صاحب گورکھپوری، حضرت مولانا نور عالم صاحب امینی، حضرت مولانا محمد احمد صاحب قاسمی، جناب مولانا عبدالہادی صاحب پرتاپ گڈھ، جناب مولانا قاری شوکت علی صاحب ویٹ، جناب مولانا اشہد رشیدی صاحب مرادآباد، جناب مولانا احمد بزرگ صاحب ڈابھیل، جناب مولانا ممتاز صاحب شملہ، جناب مولانا قاری امین صاحب پوکرن، جناب مولانا محمد قاسم صاحب پٹنہ، جناب مولانا رحمت اللہ صاحب میر قاسمی کشمیر، جناب مولانا محمد الیاس صاحب پیپلی مزرعہ ہریانہ، جناب مولانا خلیل الرحمٰن صاحب قاسمی مہاراشٹر، جناب مولانا عبدالقدوس صاحب نمائندہ جناب مولانا صدیق اللہ صاحب چودھری کلکتہ، جناب مولانا سراج الحق صاحب نمائندہ مولانا عبدالعزیز صاحب نیپال، جناب مولانا عبداللہ صاحب قاسمی نمائندہ جناب مولانا حسین احمد صاحب پونچھ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

ایجنڈے میں شامل مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال اور اجتماعی غور وخوض کے بعد ۸۔ تجاویز اتفاق رائے سے منظور کی گئیں۔ تجاویز کا متن حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی زید مجدہم نائب مہتمم دارالعلوم نے پیش کیا، حضرت ناظم اجلاس مولانا قاری محمد عثمان صاحب زید مجدہم نائب مہتمم دارالعلوم نے رابطہ مدارس اسلامیہ سے مربوط مدارس کے لیے مجوزہ ضابطہ اخلاق کی دفعات پڑھ کر سنائیں جن کو اتفاق رائے سے منظور کیا اور ضابطہ اخلاق کے نفاذ کا فیصلہ کیا گیا۔

اجلاس میں فدائے ملت امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی رکن شوریٰ دارالعلوم وصدر جمعیۃ علماء ہند کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا اور دعائے مغفرت کی گئی۔ ان کے

علاوہ حضرت مولانا محمد اسمٰعیل موٹا صاحبؒ رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم، نیز والدہ ماجدہ حضرت مولانا غلام رسول صاحب زید مجدہم کارگزار مہتمم دارالعلوم، جناب اخلاق الرحمٰن صاحب برادر زادہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم، اور جناب مولانا مفتی کفیل الرحمٰن صاحب نشاط عثمانی مفتی دارالعلوم دیوبند، جناب مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی اور جناب مولانا محمد عارف صاحب سنبھلیؒ اساتذۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء، اور جناب مولانا سراج الساجدین صاحب صدر رابطہ مدارس صوبہ اڑیسہ کے انتقال پر ملال پر بھی رنج والم کا اظہار کیا گیا، دعائے مغفرت کی گئی اور تجویز تعزیت منظور کی گئی۔

جناب مولانا محمد جابر صاحب مدظلہ کو اڑیسہ رابطہ مدارس کا صدر اور رکن عاملہ رابطہ مدارس طے کیا گیا، صدر اجلاس حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم کی دعا پر ایک بجے دوپہر کو اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

منظور شدہ تجاویز کا متن اور ضابطۂ اخلاق پیش خدمت ہے:

تجاویز

منظور کردہ

اجلاس ششم مجلس عاملہ
رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند

منعقدہ: ۱۲/ذیقعدہ ۱۴۲۷ھ مطابق ۴/دسمبر ۲۰۰۶ء بروز پیر

تجویز (۱)

مرکزی مدرسہ بورڈ کا قیام، مدارس کی آزادی کو ملک گیر سطح پر سلب کرنے کی سازش

مجلس عاملہ رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کا یہ اجلاس مرکزی حکومت کی جانب سے مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس سے اتفاق کو کسی بھی درجہ میں مناسب نہیں سمجھتا، اجلاس کی نظر میں یہ کوشش درحقیقت وسیع پیمانے پر مدارس کی آزادی کو سلب کرنے اور ان کے آزادانہ کردار پر قدغن لگانے کی ایک سازش ہے۔ جب کہ مدارس اور تعلیمی اداروں کا قیام

اوران کے نصاب ونظام کے سلسلہ میں مکمل آزادی ہمارا دستوری حق ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مدارس کوعصری ضروریات سے ہم آہنگ کرنے کے نام پر کی جانے والی یہ کوششیں مدارس کی بنیادی روح کے سراسر منافی ہیں، مدارس اسلامیہ کا مقصد جس قسم کے خدام دین تیار کرنا، اورنسل نو میں جس دینی ذہن کی آبیاری کرنا ہے، مذکورہ کوششیں اس کو بالکل مخالف سمت میں لے جانے والی ہیں، اس لئے یہ اجلاس تمام ارباب مدارس سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اس قسم کی ترغیبات سے بے نیاز رہ کر مدارس کے صاف وشفاف دینی کردار کو استحکام بخشیں اور دین وملت کے لئے نیک نہاد اور پاک باز خدام کی تیاری کے اپنے نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے سرگرم عمل رہیں۔

تجویز ﴿۲﴾ مدارس اسلامیہ کے نمائندہ اجلاس کی ضرورت

رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس عاملہ کا یہ اہم اجلاس، حکومت ہند کی جانب سے مرکزی مدرسہ بورڈ کے قیام کے بعد دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام دیوبند میں تمام مدارس اسلامیہ عربیہ کے نمائندہ اجلاس کی ضرورت محسوس کرتا ہے تا کہ مرکزی مدرسہ بورڈ کے بارے میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد راہ عمل متعین کی جاسکے اور مدارس اسلامیہ عربیہ کی مشکلات اور دیگر مسائل پر اجتماعی غور وفکر سے فیصلہ کیا جائے۔

تجویز ﴿۳﴾ صوبائی سطح پر رابطہ مدارس کو فعال بنانے پر زور

مجلس عاملہ رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کا یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ جس طرح رابطہ کا نظام مرکزی سطح پر فعال وسرگرم عمل ہے اسی کی روشنی میں صوبائی سطح پر اس نظام کو کارفرما کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے تا کہ اس مبارک وفاقی عمل کا دائرہ وسیع ہو اور اس کے فوائد دیگر مدارس تک عام ہوں، اسی ضرورت کے پیش نظر اجلاس کے ایجنڈے میں بھی اس کو شامل کیا گیا ہے، یہ اجلاس صوبائی ذمہ داران سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ وہ طے شدہ نظام کی روشنی میں صوبائی شاخوں کو منظم فرمائیں اور عملی طور پر ان کی سرگرمیوں کا آغاز فرمائیں۔ نیز اپنی کارکردگی کی رپورٹ باقاعدگی کے ساتھ مرکزی دفتر کو ارسال فرمائیں۔

تجویز ﴿۴﴾ مدارس اسلامیہ کے آزادانہ کردار کی حفاظت

مجلس عاملہ رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کا یہ اہم اجلاس مدارس اسلامیہ کے ذمہ دار حضرات کو

نہایت اہمیت کے ساتھ اس بات کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ ملت اسلامیہ کی ہمہ جہتی خدمت، خاص طور پر نئی نسل کو اسلامی تعلیم سے آراستہ کرنے اور امت مسلمہ کے ایمان کی بقاء و تحفظ کے عظیم الشان فریضہ کی ادائیگی، اسلامی مدارس کے آزادانہ کردار ہی کی مرہون منت ہے۔

ان مدارس نے دارالعلوم دیوبند کے منہاج کے مطابق روز اول ہی سے دین وایمان پر ملت اسلامیہ کو استوار وکاربند رکھنے کا جو لازوال تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے وہ تاریخ اسلام کا ایک روشن باب ہے، یہ حیرت انگیز اور بے مثال کردار، مدارس کو ہر قسم کی حکومتی امداد سے آزاد رکھنے کی بدولت ہی ممکن ہوسکا ہے، اس تاریخی کردار پر روک لگانے کے لئے آج طرح طرح کے خوبصورت عنوانات کے تحت مدارس کو جال میں پھانسنے کی کوششیں جاری ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ اجلاس، مدارس اسلامیہ سے مؤکد اپیل کرتا ہے کہ وہ ہر قسم کے حکومتی تعاون سے مکمل اجتناب کریں، خواہ وہ کسی عمومی گرانٹ کی شکل میں ہو یا خاص طور پر کمپیوٹر کی تعلیم، ایک ٹیچر کی تنخواہ یا طلبہ کے ناشتہ یا کھانے میں تعاون کے عنوان سے ہو، کیوں کہ اس قسم کی کوئی بھی امداد، مستقبل میں، مدارس اسلامیہ کے نظام میں حکومتی مداخلت کی راہ ہموار کرسکتی ہے۔

تجویز ﴿۵﴾

نصاب تعلیم کی بنیادی روح کی حفاظت اور نصاب میں حتی الامکان یکسانیت

نصاب تعلیم میں تبدیلی کی آوازیں وقتاً فوقتاً اس طبقہ کی جانب سے اٹھتی رہتی ہیں جس کو اسلامی مدارس کے مقاصد تاسیس سے نہ واقفیت ہے نہ ہمدردی، آج کل بھی ناعاقبت اندیش حلقوں کی جانب سے اس قسم کے مطالبے ازسرنو سامنے آرہے ہیں اس لئے رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کی مجلس عاملہ کا یہ اجلاس اس بات کو ایک بار پھر نہایت قوت کے ساتھ دہرانا ضروری سمجھتا ہے کہ مدارس اسلامیہ کا قیام، امت مسلمہ کی اقتصادی ترقی یا معاشی خوش حالی کے لئے نہیں ہوا ہے بلکہ ان مدارس کا مقصد، ایسے رجال کار تیار کرنا ہے جو ستائش کی تمنا یا صلے کی پروا سے قطعاً بے نیاز ہوکر دین متین کے دفاع وتحفظ کا فریضہ انجام دیں، اسلامی علوم وفنون کے ماہر اور اسلام کی حقیقی روح سے واقف ہوں اور اپنی دینی وروحانی طاقت اور علمی مہارت سے اسلام دشمن طاقتوں اور فرق باطلہ کے سیلاب بلاخیز پر بند باندھ سکیں۔ اس قسم کے علماء مخلصین اور خدام دین کی تیاری کے لئے مدارس اسلامیہ کا نصاب آج بھی کافی ہے، بشرطیکہ پورے اخلاص واحتساب کے ساتھ اس

نصاب کی تعلیم وتدریس اور طلبہ کی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔اس لئے یہ اجلاس نصاب تعلیم میں کسی بھی بنیادی تبدیلی کو یکسر مسترد کرتا ہے اور مدارس اسلامیہ سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ وہ اپنے یہاں دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم نافذ کریں تاکہ یکسانیت کے ساتھ اجتماعی طور پر منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہونا ممکن ہو۔

تجویز ﴿۶﴾ مغرب کی اسلام مخالف یلغار کی مذمت

اسلام کے خلاف مغرب کی سازش اور اس کے لئے تمام وسائل کے استعمال کی کوشش ایک مسلسل عمل ہے جس میں آج کل تیزی لائی جارہی ہے۔فکری ونظریاتی یلغار کے ساتھ ساتھ طاقت کے ناجائز استعمال کا تسلسل آج کی ایک شرمناک حقیقت ہے، اسی کے ساتھ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے اور ان کے زخموں پر نمک پاشی کرنے کا گھناؤنا عمل بھی بڑھتا جارہا ہے جس میں گذشتہ دنوں عیسائی مذہبی رہنما تک مبتلا ہوگئے۔مجلس عاملہ رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کا یہ اجلاس اس قسم کی تمام سازشوں اور چیرہ دستیوں کی سخت الفاظ میں مذمت کرتا ہے اور تمام انصاف پسند طاقتوں سے اس صورت حال کے خلاف متحد اور سرگرم عمل ہونے کی اپیل کرتا ہے۔

تجویز ﴿۷﴾ مدارس کے ضابطہ اخلاق کے نفاذ کی ضرورت

اسلامی مدارس کو اپنا بہترین کردار ادا کرنے کے لئے اپنے داخلی نظام کو بہتر بنانے کی بھی شدید ضرورت ہے اس کام کو آسان بنانے کے لئے ایک ضابطہ اخلاق برائے مدارس اسلامیہ، منظور کیا گیا ہے۔مجلس عاملہ کا یہ اجلاس رکن مدارس سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ وہ اس ضابطہ اخلاق کو اپنے یہاں نافذ کریں تاکہ مردم سازی کے میدان میں وہ اپنا کردار بہتر طریقے پر ادا کرسکیں اور مدارس کے متعلق منفی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کے لئے کسی نکتہ چینی کا موقع باقی نہ رہے۔

تجویز ﴿۸﴾ مدارس اسلامیہ کے زیر انتظام مکاتب دینیہ کا قیام

یہ حقیقت محتاج دلیل نہیں ہے کہ تعلیم وتربیت اور دینی ومذہبی ذہن سازی کے لئے مکاتب دینیہ کی بنیادی اہمیت ہے۔انہیں مکاتب سے مدارس اسلامیہ عربیہ کو بھی درمیانی اور اعلیٰ تعلیم کیلئے افراد ملتے ہیں۔اور تعلیمی سلسلہ منقطع ہوجانے یا تعلیم کی دوسری لائن اختیار کرنے کی صورت میں کم از کم بنیادی دینی تعلیم سے بقدر ضرورت واقفیت ہوجاتی ہے۔اور دین وعقیدہ کی حفاظت کی راہ

ہموار ہوجاتی ہے۔

اسی بنا پر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند اور مجلس عاملہ رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کی طرف سے اس سے قبل بھی مدارس اسلامیہ کو اس جانب متوجہ کیا گیا ہے کہ ہر مدرسہ اپنے وسائل کے بقدر مکاتب دینیہ کے قیام اور ان کی نگرانی کی طرف توجہ دے۔اگر ممکن ہو تو اپنے بجٹ کا دس فیصد حصہ مکاتب کے لئے مخصوص کردے۔یہ اجلاس ارباب مدارس کو اپنی اس ذمہ داری کی طرف ایک بار پھر متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

تجویز ﴿۹﴾ تجویز تعزیت

مجلس عاملہ رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کا یہ اجلاس ان اکابر وعلماء کرام کے سانحۂ ارتحال پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے جو گذشتہ اجلاس کے بعد واصل بحق ہوئے۔جن میں سرفہرست، امیر الہند فدائے ملت، حضرت اقدس مولانا سید اسعد مدنی نوراللہ مرقدہ کی ذات گرامی ہے، حضرت موصوف کو باری تعالیٰ نے جن اوصاف وخصوصیات سے بہرہ ور کیا تھا آج ان کی کوئی مثال نہیں ہے، ان کا تدبر، دوراندیشی، اصابت رائے، قوت فیصلہ، فتنوں کو دور سے بھانپ لینے کی صلاحیت، جوش عمل، تقویٰ طہارت، ریاضت ومجاہدہ، جہد مسلسل، حق گوئی، شجاعت و بہادری، جرأت و ہمت، بے مثال عزیمت، وسعت نظر، اور سوز دروں ایسی صفات ہیں جنھوں نے ان کو ملت اسلامیہ کا بے بدل رہنما بنادیا تھا، وہ ہر وقت سرگرم عمل رہتے تھے ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف تھا، ان کی ذات گرامی دارالعلوم دیوبند اور تمام مدارس اسلامیہ کے لئے پشتیبان کی حیثیت رکھتی تھی، وہ رابطہ مدارس اور اس کی سرگرمیوں سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے، مجلس عاملہ کا گذشتہ اجلاس ان کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا آج ہم ان کی طاقت ور شخصیت سے محروم ہیں۔دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو ان کی خدمات پر اپنے شایان شان اجر سے نوازے اور اس نازک موقع پر ملت اسلامیہ کی دستگیری فرمائے، آمین۔

اسی طرح یہ اجلاس دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے موقر رکن حضرت مولانا اسمٰعیل موٹا صاحب (گجرات) کے سانحۂ ارتحال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے، موصوف ملت کے ایک مخلص خادم اور دارالعلوم دیوبند کے بہی خواہ تھے، بہت سی دینی وعلمی خدمات ان سے وابستہ تھیں، حق تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

علاوہ ازیں یہ اجلاس، دارالعلوم دیوبند کے مخلص، یکسو، سادہ دل اور مستعد مفتی حضرت مولانا مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی رحمہ اللہ کے حادثۂ وفات پر بھی اظہارِ غم کرتا ہے، موصوف نہایت پرہیزگار اور صاف وشفاف شخصیت کے مالک تھے، چند ماہ قبل اچانک داغ مفارقت دے گئے۔

نیز رابطہ کی مجلس عاملہ کے ایک رکن حضرت مولانا سراج الساجدین صاحب (اڑیسہ) جو رابطہ کے صوبائی صدر بھی تھے انتقال فرماگئے، موصوف صوبہ اڑیسہ کے ایک فعال اور معروف عالم دین تھے، مختلف دینی خدمات میں مصروف تھے، یہ اجلاس ان کے حادثۂ وفات پر اظہارِ تعزیت کرتا ہے۔

اسی طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے دو ممتاز علماء حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی اور حضرت مولانا محمد عارف سنبھلی رحمہما اللہ کے حادثۂ انتقال پر بھی یہ اجلاس اظہارِ تعزیت اور دعائے مغفرت کرتا ہے۔

نیز چند دن پہلے دارالعلوم دیوبند کے کارگذار مہتمم حضرت مولانا غلام رسول خاموش صاحب دام ظلہم کی والدہ محترمہ اور حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کے بھتیجے جناب اخلاق الرحمٰن صاحب بھی انتقال فرماگئے، یہ اجلاس ان دونوں حضرات سے تعزیت کرتا ہے اور مرحومین کے لئے دعاء مغفرت کرتا ہے۔

❁ ❁ ❁

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضابطۂ اخلاق
برائے
مدارس متعلقہ رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ
دارالعلوم دیوبند

(۱) مربوط مدارس اسلامیہ کے نظم ونسق کو درست اور بہتر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہر مدرسہ، رابطہ مدارس کے تجویز کردہ اصول وضوابط کی پابندی کے ساتھ ساتھ اپنا نظام اپنے طے شدہ دستور کے مطابق چلائے، نظم باضابطہ اور بہتر بنانے کے لئے مدرسہ کا اپنا دستور اور لائحۂ عمل ہونا ضروری ہے جس کی دفعات کی روشنی میں نظام استوار رکھا جائے۔

(۲) مربوط مدارس کے ذمہ دار حضرات باہمی تعاون وتناصر کے جذبہ کو فروغ دیں، اتحاد واتفاق کی فضا قائم کی جائے، ہر قسم کی آپسی رسّاکشی اور مخالفت سے گریز کیا جائے کہ باہمی منافرت یوں بھی بری چیز ہے اور موجودہ حالات میں مدارس کے مخالفین کو مدارس میں مداخلت کا موقع مل سکتا ہے۔

(۳) ذمہ داران مدارس آپس میں ایک دوسرے کے متعلق منفی اظہار خیال سے گریز کریں۔

(۴) اربابِ انتظام اور اساتذہ کرام میں اتحاد ویگانگت، باہمی رواداری اور اعتماد کی فضا قائم رکھی جائے، بدگمانی اور آپسی چپقلش سے مدرسے کا ماحول پراگندہ ہوتا ہے۔

(۵) مدارس کا نظم ونسق اربابِ شوریٰ کے مشورے اور دستور کے مطابق چلانے کی کوشش کی جائے۔

(۶) اختلاف کی صورت میں مدرسے کے مفاد کو پیش نظر رکھا جائے اور ہر ایسی کوشش سے اجتناب کیا جائے جس سے مدرسے کا مفاد متاثر ہوتا ہو، مدرسے کے مفادات کو مقدم رکھ کر ایثار وقربانی کے جذبہ سے کام لیا جائے اور اپنی رائے اور نظریہ پر اصرار نہ کرکے خوش اسلوبی کے ساتھ نزاع کو ختم کردیا جائے۔

(۷) مدارس کے کردار کو ہر قسم کی خارجی مداخلت سے آزاد رکھنے کے لئے ہر قسم کی حکومتی امداد سے اجتناب کیا جائے۔

(۸) مدارس اسلامیہ دین کی حفاظت کے قلعے اور اسلامی علوم کے سرچشمے ہیں، ان کا بنیادی مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہے جو ایک طرف اسلامی علوم کے ماہر، دینی کردار کے حامل اور فکری اعتبار سے صراط مستقیم پر گامزن ہوں، دوسری طرف وہ مسلمانوں کی دینی واجتماعی قیادت کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں اس لئے ضروری ہے کہ مدارس اپنے نظام تعلیم وتربیت کو مزید بہتر بنائیں، طلبہ کی تربیت اور استعداد سازی پر بھرپور توجہ دی جائے، اساتذہ کے انتخاب میں صلاحیت اور صالحیت اور طلبہ کے انتخاب میں کمیت سے زیادہ کیفیت کا لحاظ رکھا جائے۔

(۹) دارالاقامہ کے نظام کو چست بناکر طلبہ کی اخلاقی تربیت ونگرانی کا اہتمام کیا جائے، خصوصاً نماز باجماعت کے اہتمام اور وضع قطع کی درستی پر خصوصی توجہ فرمائی جائے۔ داخلہ کے وقت سابقہ مدرسہ کا تصدیق نامہ لازم قرار دیا جائے اور اس معاملے میں احتیاط کو عمل میں لایا جائے۔

(۱۰) اساتذہ کے عزل ونصب اور طلبہ کے اخراج وداخلہ کے بارے میں مدرسہ کے طے شدہ دستور کی پابندی کی جائے۔

(۱۱) طلبہ واساتذہ کے مسلک صحیح (مسلک دیوبند) پر کاربند ہونے کا لحاظ رکھا جائے، اور طلبہ سے ذمہ داران تک مدرسے سے متعلق تمام لوگ، شعائر دین کی پابندی کا خاص اہتمام کریں۔

(۱۲) امتحانات کے نظام کو چست اور درست نیز اصول پر مبنی بنایا جائے۔

(۱۳) معاشرہ سے مربوط رہنے کی کوشش کی جائے، معاشرہ میں پیدا ہونے والی، عقیدہ وعمل کی خرابیوں کی اصلاح کے لئے اپنے تمام وسائل استعمال کئے جائیں۔ فرق باطلہ کی تردید منظم انداز میں کی جائے۔

(۱۴) اسلامی مدارس اور مذہب اسلام کے دشمنوں کی سازشوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔

(۱۵) موجودہ دور میں مدارس پر لگائے جانے والے دہشت گردی وغیرہ کے بے بنیاد الزامات کے ازالے کے لئے، علاقہ کے غیر متعصب برادران وطن اور مقامی حکام سے رابطہ رکھا جائے، وقتاً فوقتاً ان کو مدعو کرکے مدارس کے حالات و خدمات اور مذہب اسلام کے امتیازات وخصوصیات سے روشناس کرایا جائے۔ خاص طور پر علماء مدارس کی ملکی وملی خدمات سے ان کو واقف کرایا جائے۔

(۱۶) اجمالی طور پر حدیث شریف **کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ** کو پیش نظر رکھ کر نہایت دیانت وامانت، اخلاص وللّٰہیت، بیدار مغزی وحوصلہ مندی، مستعدی وجانفشانی کے ساتھ دین متین کی خدمت کے مبارک جذبہ کے ساتھ مدارس کا نظام چلایا جائے۔

(۱۷) مدارس میں تحریر وتصنیف کا ماحول بھی بیدار کیا جائے اور تحریر کی راہ سے بھی دین متین کی خدمت انجام دی جائے۔

منظور کردہ: مجلس عاملہ رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند

منعقدہ: ۱۲/ذی قعدہ ۱۴۲۷ھ مطابق ۴/دسمبر ۲۰۰۶ء

❀ ❀ ❀

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۹۱ | جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ مطابق جون ۲۰۰۷ء | شمارہ: ۶

نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند- ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۰ روپے، سالانہ -/۱۰۰ روپے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۶۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۱۲۵ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۵۰ روپے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411077577 *(EDITOR)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبرشمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام حنفی ہوں گے؟	عمر فاروق لوہاروی (لندن)	۷
۳	دار العلوم دیوبند کا نصاب تعلیم اور نظام تعلیم وتربیت	مولانا شوکت علی قاسمی بستوی	۱۴
۴	افتتاحیہ اجلاس شم مجلس عاملہ رابطہ مدارس...	مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب	۲۸
۵	قادیانیت کا مکروہ چہرہ!	مولانا سعید احمد جلال پوری	۳۲
۶	سلاطین ہند کے عہد میں غیر مسلموں کی شرعی حیثیت	محمد شمیم اختر قاسمی	۴۴
۷	نو فیصد شرح ترقی ۔نٹھاری ۔نوئیڈا اور...	ڈاکٹر اجمل فاروقی	۴۹
۸	حیدرآباد کی مکہ مسجد میں بم دھماکہ	.....	۵۶

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

وطن عزیز کو سامراج کے پنجۂ استبداد سے رہائی دلانے والے ملک کے معماروں نے جب آزاد ہندوستان کا آئین وضع کیا تو بلا امتیاز ذات ونسل اور زبان ومذہب ملک میں بسنے والی ساری اکائیوں کے زندگی سے متعلق جملہ حقوق کا بھرپور تحفظ کیا اور مذہب، زبان، نسل کی بنیاد پر کسی طرح کے فرق کو روا نہیں رکھا جس سے ان کی وسعت قلبی، فکرونظر کی بلندی اور ملک وقوم کے حق میں بےلوث جذبۂ اخلاص ومحبت کا پتہ چلتا ہے۔

لیکن انھیں کے پیرو اور نام لیوا جب مسند اقتدار پر براجمان ہوئے تو اپنی تنگ نظری اور تنگ ظرفی کی بناء پر دستور کے تحفظات کو نظر انداز کردیا ہمارے ملک کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ آج تک کی ساری قومی حکومتیں ملک کی اقلیتوں بالخصوص مسلم اقلیت (جو صحیح معنوں میں دوسری اکثریت ہیں) کے ساتھ نہ صرف امتیازی سلوک کرتی چلی آرہی ہیں بلکہ ان کی زندگی کی راہوں میں اڑچنیں پیدا کرتی رہی ہیں۔ ملک کے اقتدار پر قابض اس گروہ کی غفلت شعاریوں بلکہ قانون وانصاف سے عاری اس ظالمانہ رویہ کو خود حکومت کی قائم کردہ سچر کمیٹی نے اس طرح طشت ازبام کردیا ہے کہ اسے کسی حیلہ وتدبیر سے چھپایا نہیں جاسکتا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اس جمہوری سیکولر ملک میں اپنے مذہب، زبان، کلچر اور تہذیب وثقافت کی حفاظت کے لیے اپنے ادارے قائم کرنا ملک کے ہر باشندہ کا دستوری حق ہے۔ اپنے اسی حق کی بنیاد پر مسلمانوں نے اپنے مدارس اور مذہبی ادارے قائم کررکھے ہیں مگر ہماری قومی حکومتیں ان مدارس کو نگاہ غلط انداز سے دیکھنے کی عادی ہوگئی ہیں اور مسلمانوں سے ان کے اس آئینی حق کو چھین لینے کے لیے ہر طرح کی خلاف قانون اور ناجائز تدبیریں کرتی رہتی ہیں۔ انھیں تدبیروں میں

ایک نئی تدبیر ''مرکزی مدرسہ بورڈ'' کے نام سے ''مرکزی وزارت تعلیم وفروغ انسانی وسائل'' کی جانب سے کی جارہی ہے۔

اب تک جھوٹ، فریب، جبر، ظلم اور خلاف قانون وآئین فیصلوں کے ذریعہ ان مدارس پر قدغن لگانے اور انھیں بے جان بنادینے کی ناکام کوششیں کی جاتی رہی ہیں مگر اب شاطران سیاست نے سیم وزر کی لالچ کے اسلحہ سے مدارس پر شب خون مارنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ ایک ایسا دام ہم رنگ زمیں ہے جس کا صحیح ادراک بادی النظر میں نہیں ہوگا اس لئے خدانخواستہ اگر مدارس اس میں پھنس گئے تو پھر کبھی اس جال سے آزاد نہیں ہوسکیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین ومذہب کے یہ سرچشمے ہمیشہ کے لیے خشک ہوجائیں گے اور اس کے بعد ملت اسلامیہ ہند کا انجام کیا ہوگا اس کے تصور سے روح ایمانی تھرّا جاتی ہے۔

وقت کا تقاضا تھا کہ ''مرکزی مدرسہ بورڈ'' اور اس کے مالی وظائف کے پردے میں چھپی تباہ کاریوں کو پورے طور پر برہنہ کیا جائے تاکہ اصل مدارس اس سے اپنے دامن کو بچائے رکھیں۔ چنانچہ اسی تقاضا کے تحت دارالعلوم دیوبند نے طے کیا کہ اوّل وہلہ میں ایک مختصر نمائندہ اجلاس بلایا جائے اس تجویز کے تحت ۱۳/۱۴ مئی کو دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر یہ اجلاس انعقاد پذیر ہوا۔ جس میں ملک کی ساری ریاستوں سے تین ہزار مدارس کے تقریباً ساڑھے تین ہزار نمایندے شریک ہوئے۔ اگر دعوت نامہ کے اجراء میں مزید توسع اختیار کیا گیا ہوتا تو مجمع اس سے کئی گنا زیادہ ہوتا۔ علاوہ ازیں ملک کی اہم مسلم تنظیموں کے ذمہ دار حضرات نے بھی دارالعلوم دیوبند کے ساتھ اس مسئلہ میں یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجلاس میں شرکت کی اور دارالعلوم کے موقف کی مکمل تائید وتصویب کی بالخصوص اس موقع پر حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب قدس سرہ کے جانشین وخلف الصدق حضرت مولانا محمد سالم صاحب کی تشریف آوری اور دارالعلوم دیوبند کے اسٹیج سے ان کے خطاب نے شرکائے اجلاس کے اندر ایک تازہ زندگی پیدا کردی۔

اپنی پیرانہ سالی اور عوارض کے ہجوم کے باوجود حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم اجلاس کے ہر چھوٹے بڑے امور کی نگرانی خود کررہے تھے۔ آپ کا خطبہ صدارت بڑا فکر انگیز اور اپنے موضوع پر اس قدر جامع تھا کہ بجا طور پر اسے ایک دستاویز کہا جاسکتا ہے۔ بعد میں جس قدر تقریریں ہوئیں کہنا چاہئے کہ اسی خطبہ کی توضیح وتشریح اور تائید وتصویب سے متعلق رہیں۔

ایک خاص بات جو اجلاس میں محسوس کی گئی وہ یہ تھی کہ مدارس کے حق میں سرکاری مرکزی

مدرسہ بورڈ کی مضرت پر گویا کہ تمام شرکاء کو شرح صدر ہو گیا تھا کیونکہ اس سلسلے میں کسی نے کوئی ادنیٰ شبہ بھی پیش نہیں کیا جسے تائیدِ غیبی ہی کہا جائے گا۔ نیز اس طرح کے اجلاسوں میں عام طور پر جوش و خروش کا مظاہرہ ہوتا ہے اس اجلاس میں جوش پر ہوش غالب تھا اور مقررین حضرات نے بڑے پروقار انداز میں زیرِ مسئلہ پر غور وفکر کی دعوت دی اور اس کے نتائج سے آگاہ کیا۔

آخری اجلاس میں تجاویز پیش ہوئیں جو بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے متفقہ طور پر منظور کرلی گئیں۔ اس طرح ملک کے مقتدر علماء کا اتفاق ہو گیا کہ یہ سرکاری مدرسہ بورڈ مدارس دینیہ کے لئے قطعی طور پر مفید نہیں بلکہ انتہائی نقصان دہ اور مضرت رساں ہے جس سے پرہیز اور اجتناب ہی میں مدارس کے لیے خیر وفلاح ہے۔ ذیل میں مرکزی مدرسہ بورڈ سے متعلق منظور شدہ تجویز کا متن پیش کیا جارہا ہے۔ بقیہ تجاویز مفصل رپورٹ کے ضمن میں ملاحظہ سے گذرے گی۔ انشاء اللہ

تجویز

مرکزی مدرسہ بورڈ کی تجویز، مدارس اسلامیہ کی حقیقی روح پر سنگین حملہ

ہندوستان کے مدارس اسلامیہ عربیہ کا کل ہند اجلاس عام، مرکزی حکومت کی جانب سے مدرسہ بورڈ قائم کئے جانے کی تجویز کو حد درجہ تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے، اور نہایت قوت وصراحت کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ یہ تجویز، مدارس اسلامیہ کے بنیادی مقاصد کے منافی اور ان کی تعلیمی سمت سفر کو بدلنے اور فکری آزادی پر قدغن لگانے کی ایک خطرناک کوشش ہے، جسے قبول نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ مدارس کا نصب العین، فروغ دین، تحفظ قرآن وسنت، اشاعت علوم دینیہ اور ایسے مخلص رجال کار تیار کرنا ہے، جو اگلی نسلوں تک اس عظیم امانت کو منتقل کرسکیں۔

ظاہر ہے کہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے وہی طریقۂ کار مفید وکارآمد ہوسکتا ہے جو اسلاف سے وراثتاً ہمیں ملا ہے اور صدیوں کا آزمودہ ہے جس کے تحت مدارس اسلامیہ اس سیکولر ملک میں تحفظ علوم دین کی عظیم خدمت انجام دینے کے ساتھ ایسے تاریخ ساز مردان کار تیار کرنے میں کامیاب رہے ہیں جنھوں نے نہ صرف ملت اسلامیہ کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا بلکہ امن پسند، ایماندار، فرض شناس اور محبّ وطن شہری کی حیثیت سے تمام ہی اہل وطن کے لئے مشعل راہ کا

کردار ادا کیا۔

اس لئے یہ ملک گیر اجلاس محسوس کرتا ہے کہ مدارس اسلامیہ کو اپنے مذکورہ مقاصد عالیہ کے حصول کے لیے، پہلے سے زیادہ اپنے اکابر کے منہاج پر استقامت کے ساتھ سرگرم عمل ہوجانا چاہئے اور ان پر لازم ہے کہ وہ مدرسہ بورڈ اور اس قسم کی ہر ایسی کوشش کو مسترد کردیں جس کا مقصد ان کو علم وعرفان کی کارگاہوں کے بجائے روزی روٹی مہیا کرنے والے کارخانوں میں تبدیل کرکے معنوی موت سے ہمکنار کرنا ہے۔

اسی کے ساتھ مدارس کا یہ عظیم اجتماع مرکزی حکومت سے اپیل کرتا ہے کہ وہ مذہبی تعلیم وتبلیغ سے متعلق، اقلیتوں کو دستور میں دئے گئے حقوق کا صحیح معنوں میں احترام کرے اور اس تجویز کو واپس لے کر اپنے سیکولر پسند وجمہوریت نواز ہونے کا عملی ثبوت دے اور مدارس اسلامیہ کو اپنا نام نہاد مالی تحفہ دینے کے بجائے سچر کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں اقلیتوں کے ان لاکھوں بچوں کی تعلیم کا انتظام کرے جو ہر قسم کی تعلیم سے محروم ہیں نیز اقلیتوں کے عصری تعلیمی اداروں کو مزید مستحکم وفعال بنانے کی جانب خصوصی توجہ دے اور جن مقامات میں اس قسم کے ادارے نہیں ہیں وہاں نئے ادارے قائم کرے نیز مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کے لئے ضروری اقدامات کرے۔

مدارس دینیہ کا یہ عظیم ملک گیر اجتماع یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی بھی ایسی صورت مدارس کے لیے ناقابل برداشت ہوگی، جس سے ان مدارس کی خودمختار حیثیت اور آزادی مجروح ہو، اور صدیوں کے آزمودہ طریقۂ کار میں رخنہ پڑے کیوں کہ ایسی کوئی بھی مداخلت آگے چل کر مدارس کو ان کے اصل دینی مقاصد سے ہٹادے گی اور ان کی تعلیمی روح اور ڈھانچہ کو درہم برہم کردے گی، ان وجوہ سے یہ اجتماع مرکزی مدرسہ بورڈ کی تجویز کو مسترد کرتا ہے۔

❁ ❁ ❁

کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام حنفی ہوں گے؟

از: عمر فاروق لوہاروی (لندن)

امت محمدیہ کا اس بات پر اجماع ہے، کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قرب قیامت میں باوصف نبوت تشریف لائیں گے، تو اپنی شریعت پر عمل نہیں کریں گے، بلکہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت پر عمل کریں گے۔ اور یہ مضمون کئی روایات میں نصاً یا اشارتاً بیان ہوا ہے، ان روایات کی تخریج امام احمد، امام بزار، امام طبرانی، امام بیہقی، امام ابوحاتم ابن حبان بستی اور حافظ ابن العساکر جیسے حضرات محدثین رحمہم اللہ نے اپنی اپنی کتابوں میں کی ہے۔

اب سوال یہ ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شریعت محمدیہ کا علم کس طرح ہوگا؟ کیا آپ ائمہ متبوعین میں سے کسی امام کی تقلید کریں گے، اوران کے مسلک کے مطابق فیصلے کریں گے؟

اس سلسلے میں بعض حضرات حنفیہ کہتے ہیں، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تقلید کریں گے، فقہ حنفی پر عمل کریں گے، اوراسی کے مطابق فیصلے فرمائیں گے۔

لیکن یہ قول بے بنیاد ہے۔ اوراس میں ایک جلیل القدر پیغمبر کی تنقیص ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے امت کو خود اپنے بارے میں ایسے انداز سے مدح ومنقبت بیان کرنے سے تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے، جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص لازم آتی ہو، تو حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مناقب ومحاسن بیان کرتے ہوئے ایسی مبالغہ آرائی کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے، جو کسی جلیل القدر نبی اوررسول کی تنقیص کو مستلزم ہو؟ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا علم وعمل اور فضل وکمال مسلَّم ہے، لیکن پیغمبر بالآخر پیغمبر ہے، اس لیے اس ناقابل انکار حقیقت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام علم وفضل میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یقیناً بڑھے ہوئے ہیں۔

علامہ محمد علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو اختیار کیا ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد فقہ حنفی کے مطابق فیصلے فرمائیں گے۔ چنانچہ حضرت موصوف حضرت امام

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب بیان کرتے ہوئے ''الدر المختار'' میں تحریر فرماتے ہیں:

وحسبك من مناقبه اشتهار مذهبه ما قال قولاً الّا اخذ به امام من الائمة الأعلام وقد جعل اللّٰه الحكم لاصحابه وأتباعه من زمنه الیٰ هذه الايام الیٰ ان يحكم بمذهبه عيسیٰ عليه السلام. (الدر المختار مع رد المحتار، ص:۴۲، ج:۱)

''اے مخاطب! تجھے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مناقب میں سے آپ کے مذہب کا مشہور ہونا کافی ہے۔ آپ نے جو بھی بات ارشاد فرمائی، اس کو (آپ کے اصحاب میں سے) ائمہ اعلام میں سے کسی نہ کسی امام نے اختیار کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے اصحاب اور متبعین کیلئے آپ کے زمانے سے تادمِ ایں تحریر عہدۂ قضا کو مقرر فرمایا، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ کے مذہب کے مطابق فیصلے فرمائیں گے۔''

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وكأنه اخذه مما ذكره اهل الكشف ان مذهبه آخر المذاهب انقطاعاً... لكن لا دليل فی ذلك علیٰ ان نبی اللّٰه عيسیٰ علیٰ نبينا وعليه الصلاة والسلام يحكم بمذهب ابی حنيفة وان كان العلماء موجودين فی زمنه فلا بد له من دليل. (رد المحتار علی الدر المختار، ص:۴۲، ج:۱)

''گویا صاحب الدر المختار نے اس مضمون کو اہلِ کشف کی اس بات سے مستنبط کیا ہے، کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب دیگر مذاہب کے مقابلے میں سب سے آخر میں ختم ہوگا... لیکن اس میں اس امر پر کوئی دلیل نہیں ہے، کہ نبی اللہ عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کے مطابق فیصلے فرمائیں گے، اگرچہ علماء ان کے زمانے میں موجود ہوں گے، پس اس امر کے اثبات کے لیے دلیل درکار ہے۔''

درحقیقت علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے قہستانی کے اتباع میں اس قول کو اختیار کیا ہے۔ اور قہستانی کے متعلق علامہ عبدالحئی فرنگی محلی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ شامی رحمہ اللہ کی کتاب ''تنقیح الفتاویٰ الحامدیۃ'' کے حوالہ سے لکھا ہے:

والقهستانی كجارف سيل وحاطب ليل خصوصا واستفاده الیٰ كتب الزاهدی المعتزلی. (مقدمہ عمدۃ الرعایہ، ص:۱۱)

''قہستانی سیلاب میں بہہ جانے والے اور اندھیرے میں لکڑی جمع کرنے والے ہیں،

بالخصوص وہ جس وقت زاہد معتزلی کی کتابوں سے کسی بات کو لیتے ہیں۔‘‘

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لقد صدق عصام الدين فى حق القهستانى انه لم يكن من تلامذة شيخ الاسلام لا مِن اعاليهم و لا مِن ادانيهم انما كان دلّال الكتب فى زمانه و لا كان يعرف بالفقه وغيره بين اقرانه ويؤيده انه يجمع فى شرحه هذا بين الغث والسمين والصحيح والضعيف من غير تحقيق وتدقيق فهو كحاطب ليل الجامع بين الرطب واليابس فى الليل . (مقدمہ عمدۃ الرعایہ،ص:۱۱ بحوالہ شم العوارض فی ذم الروافض)

’’عصام الدین نے قہستانی کے متعلق بالکل درست فرمایا ہے، کہ وہ شیخ الاسلام (الہروی) کے نہ بڑے شاگردوں میں تھے نہ چھوٹے؛ بلکہ وہ اپنے وقت میں کتابوں کے ایجنٹ تھے، اور ان کی اپنے ہم عصر علماء کے درمیان علمِ فقہ یا کسی دوسرے علم میں شہرت نہ تھی۔ عصام الدین کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے، کہ قہستانی اس کتاب شرح مختصر الوقایہ (یعنی جامع الرموز) میں بے سوچے سمجھے غلط اور صحیح، بیکار اور درست ہر طرح کی باتیں جمع کر لیتے ہیں، وہ تو ایسے ہیں جیسے اندھیرے میں لکڑی چننے والا، جو خشک وتر میں تمیز نہیں کر پاتا ہے۔‘‘

’’انیس الجلساء‘‘ کے حوالہ سے صاحبِ نبراس نے اس سلسلے کا ایک خُرافہ نقل کر کے اس کی زوردار تردید کی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں:

تعجب خیز باتوں میں سے ایک بات وہ ہے، جو بعض منسوب الی العلم نے ایک کتاب میں ذکر کی ہے، جس کا نام ’’انیس الجلساء‘‘ رکھا ہے، کہ حضرت خضر روزانہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے پاس تشریف لے جاتے تھے، اور آپ سے علومِ شریعت حاصل کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا پانچ سال کے بعد انتقال ہوگیا، تو حضرت خضر علیہ السلام امام صاحب کی قبر پر جانے لگے اور آپ سے علم حاصل کرنے لگے، یہاں تک کہ دوسرے پچیس سال میں مکمل علومِ شریعت کو حاصل کرلیا، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو حکم فرمایا، کہ وہ امام ابوالقاسم قشیری کے پاس جائیں، اور امام ابوحنیفہ سے حاصل کردہ علوم ان کو سکھائیں۔ تو حضرت خضر نے تیس سال میں جو کچھ حاصل کیا تھا، وہ ان کو تیس سال میں سکھا دیا۔ اس لیے قشیری علم وکرامات میں یگانۂ روزگار ہوگئے۔ انھوں نے ایک ہزار کتابیں تصنیف کیں اور ان کو ایک صندوق میں رکھا، اور اپنے شاگرد کو حکم دیا، کہ وہ اس صندوق کو دریائے جیحوں میں ڈال دے۔ شاگرد نے تعمیلِ حکم کی۔ اس نے

دیکھا کہ پانی شق ہوا، اوراس سے صندوق لینے کے لیے ایک ہات نمودار ہوا۔ شاگرد نے شیخ ابوالقاسم سے اس معمہ کے بارے میں دریافت کیا، تو انھوں نے فرمایا، کہ جب حضرت عیسیٰ بن مریمؑ آسمان سے نزول فرمائیں گے، تو کُتبِ شریعتِ محمدیہ کو تلاش کریں گے اور انہیں نہیں پائیں گے، تو جبریل علیہ السلام حاضر ہوکر عرض کریں گے، کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے، کہ آپ دریائے جیحوں پر تشریف لے جائیں اور وہاں دوگانہ ادا کرکے کہیں: کہ اے صندوق کے امین! میں عیسیٰ ہوں، مجھے صندوق دے دے۔ تو وہ صندوق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سپرد کردے گا، اور آپ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب پر عمل کریں گے۔ صاحب نبراس فرماتے ہیں کہ یہ بڑا بہتان ہے۔ اور کوئی عقلمند آدمی اس بات میں شک نہیں کرے گا، کہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) مجتہدین سے کم درجہ نہیں ہوں گے۔" (النبراس، ص:۲۸۰)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے "المشرب الوردی فی مذہب المہدی" میں جہاں اس بات کی تردید کی ہے، کہ حضرت مہدی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تقلید کریں گے، وہیں مذکورہ بالا بے بنیاد قصہ کی تردید کی ہے، اور لکھا ہے، کہ اس واقعہ کو نقل کرنا بھی جائز نہیں ہے، مگر یہ کہ اس کا ابطال وتردید مقصود ہو۔

پھر جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام حنفی نہیں ہوں گے، اسی طرح شافعی، مالکی یا حنبلی مسلک کے پیروکار بھی نہ ہوں گے۔ گویا ائمہ متبوعین میں سے کسی امام کے مقلد نہیں ہوں گے۔ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

كيف يظن بنبيّ انه يقلد مذهبا من المذاهب، والعلماء يقولون: إن المجتهد لا يقلد مجتهدا، فاذا كان المجتهد من آحاد الامه لا يقلد، فكيف يظن بالنبى انه يقلد؟

(الحاوی للفتاویٰ، ص:۱۴۸، ج:۲)

"نبی کے بارے میں کیسے یہ گمان کیا جاسکتا ہے، کہ وہ مذاہب میں سے کسی مذہب کی تقلید کریں گے؛ حالاں کہ علماء فرماتے ہیں کہ ایک مجتہد کسی دوسرے مجتہد کی تقلید نہیں کرسکتا ہے۔ جب مجتہد جو امت کے افراد میں سے ایک فرد ہے، تقلید نہیں کرسکتا، تو پھر نبی کے متعلق کیسے یہ گمان کیا جاسکتا ہے، کہ وہ تقلید کریں گے؟"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب مقلد نہیں ہوں گے، تو پھر آپ بعض علماء کے خیال میں مجتہد مطلق ہوں گے، جیسے حضرت مہدی مجتہد مطلق ہوں گے۔ لیکن امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ

علیہ فرماتے ہیں: کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اجتہاد ہی سے فیصلے فرمائیں گے، یہ متعین نہیں ہے۔ اس کے بعد موصوف نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے شریعتِ محمدیہ کے احکام کی معرفت کے ممکنہ چار طریقے تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائے ہیں۔ مختصراً وہ چار طریقے حسب ذیل ہیں:

(۱) ممکن ہے تمام انبیاء علیہ السلام کو اپنے اپنے زمانے میں وحیِ الٰہی سے سابقہ اور لاحقہ تمام شریعتوں کا علم ہوتا ہو۔ چنانچہ احادیث وآثار میں وارد ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد کی بشارت دی، اور آپ ﷺ کی شریعت کے کچھ مسائل ذکر فرمائے، جو اپنی شریعت سے الگ تھے۔ اور اسی طرح کی بات حضرت موسیٰ اور حضرت داؤد علیہما السلام کے لیے بھی واقع ہوئی ہے۔

(۲) یہ بھی ممکن ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام احادیث کی مراجعت کے بغیر محض قرآن مجید کو دیکھ کر شریعت محمدیہ سے متعلق تمام احکام کو سمجھ لیں، جس طرح خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ نے ان احکام کو قرآن مجید سے سمجھا تھا۔ اس لیے کہ قرآن مجید جمیع احکامِ شرعیہ کو متضمن ہے، جس کو رسول اللہ ﷺ نے مخصوص فہم خداداد سے سمجھا، پھر احادیث میں اپنی امت کے لیے اس کی تشریح فرمائی۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی ہیں، اس لیے بعید نہیں، کہ رسول اللہ ﷺ کی طرح آپ بھی محض قرآن مجید سے احکامِ شرعیہ کو سمجھ لیں۔

(۳) امام ابونصر تاج الدین سبکی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شمار باوصفِ نبوت رسول اللہ ﷺ کی امت میں ہے، اور آپ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمرہ اور جماعت میں شامل ہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپ کے ساتھ ایمان اور تصدیق کی حالت میں ملاقات ثابت ہے۔ اسی لیے حافظ ابوعبداللہ الذہبی رحمہ اللہ نے ''تجرید اسماء الصحابۃ'' میں لکھا ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی بھی ہیں اور صحابی بھی۔ اور صحابۂ کرام میں سب سے آخر میں (نزول کے بعد) وفات پانے والے ہیں۔ اس اعتبار سے ممکن ہے، کہ نبی ﷺ سے ملاقات کے وقت آپ سے براہِ راست آپ کی شریعت کے احکام معلوم کیے ہوں۔

(۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول کے بعد روحانی طور پر رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کریں گے۔ اس لیے ممکن ہے، کہ آپ سے براہِ راست ضرورت کے احکامِ شریعت حاصل کریں۔ اس طرح آپ کو نہ اجتہاد کی ضرورت پیش آئے گی اور نہ حفّاظِ حدیث میں سے

کسی کی تقلید کی۔

ایک سائل کے سوال کے جواب میں امام سیوطی رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا چار ممکنہ طریقے ذکر فرمائے، جن میں چوتھا طریق خود موصوف کی رائے تھی، اس کے بعد اس کی تائید کے طور پر تحریر فرمایا، کہ اس کی ایک مدت کے بعد میں ایک سوال پر مطلع ہوا، جو شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا تھا۔ صورت سوال یہ تھی، کہ سیدنا رسول اللہ ﷺ کے ارشاد "ینزل عیسیٰ بن مریم فی آخر الزمان حکمًا" (حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام آخری زمانے میں حاکم بن کر نزول فرمائیں گے) کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ کیا عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن عظیم اور ہمارے نبی ﷺ کی احادیث کے حافظ ہوں گے، یا اُس زمانہ کے علماء سے کتاب وسنت کو حاصل کریں گے اور ان میں اجتہاد کریں گے؟ اس سلسلے میں کیا حکم ہے؟ تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ علیہ نے ان الفاظ سے جواب دیا — اور انھیں کی تحریر سے میں نے نقل کیا — کہ:

لم ینقل لنا فی ذلك شيء صریح، والذی یلیق بمقام عیسیٰ علیه السلام انه یتلقی ذلك عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم، فیحکم فی امته بما تلقاه عنه، لانه فی الحقیقة خلیفة عنه ـ والله اعلم۔ (ترجمہ) "اس سلسلہ میں ہمارے سامنے کوئی صریح چیز منقول نہیں ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے مقام کے شایانِ شان بات یہ ہے، کہ آپ رسول اللہ ﷺ سے احکام کو حاصل کریں گے، اور آپ سے حاصل کردہ احکام کے مطابق امتِ محمدیہ میں فیصلے فرمائیں گے، اس لیے کہ آپ حقیقت میں رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ ہوں گے۔ واللہ اعلم (الحاوی للفتاویٰ، ص:۱۴۸ تا ص:۱۵۴ و ص:۱۵۷، ج:۲)

راقم الحروف کہتا ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو احکامِ شریعت محمدیہ کا علم کس طرح ہوگا؟ اس کے متعلق ایک احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے: ویعلمه الکتب والحکمة والتوراة والانجیل" (آل عمران:۴۸) (اور اللہ ان کو کتاب وحکمت اور توراۃ وانجیل کی تعلیم فرمادیں گے) اس میں "الکتٰب" سے قرآن مجید اور "الحکمۃ" سے سنت والی تفسیر مراد لی جائے، اور کہا جائے کہ اہتمامِ شان کے لیے توراۃ وانجیل سے کتاب وحکمت کو لفظاً مقدم کیا گیا ہے۔ گویا نزول کے بعد خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کتاب وسنت کی تعلیم فرمادیں گے۔ اور یہ بات اتنی قطعی ہے، کہ قرآن مجید میں دوسرے مقام پر توراۃ وانجیل کی تعلیم کے ساتھ ساتھ کتاب وحکمت کی تعلیم کو بھی فعل ماضی کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

چنانچہ ارشادِ باری ہے: "واذ علّمتك الكتاب والحكمة والتوراة والانجيل" (المائدہ:۱۱۰) (اور جب کہ میں نے تم کو کتاب وحکمت اور توراۃ وانجیل تعلیم کیں)۔

سطورِ بالا سے یہ بات واضح ہوگئی، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قُربِ قیامت میں نزول کے بعد شریعتِ محمدیہ پر عمل کریں گے، یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے، لیکن قرآن وسنت میں اس بارے میں کوئی تصریح نہیں ہے، کہ آپ کو شریعتِ محمدیہ کا علم کس طرح ہوگا؟ اس سلسلے میں حضرات علماء کرام نے ائمہ متبوعین میں سے کسی امام کی تقلید کے علاوہ جو طریقے ذکر فرمائے ہیں، وہ سب بدرجۂ امکان واحتمال ہیں، لہٰذا اس کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک معاملہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ائمہ متبوعین میں سے کسی امام کی تقلید کا، تو اس کے لیے جہاں نقل ندارد ہے، وہیں عقلِ صحیح بھی اس کو روا نہیں رکھتی ہے، کیونکہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تنقیص لازم آتی ہے، لہٰذا کشف وغیرہ سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حنفی ہوں گے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے تو حضرت مہدی کے متعلق جنھوں نے لکھا ہے، کہ وہ حنفی ہوں گے، اس کو بھی "غلو" قرار دیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا پورا ملفوظ ہی نظرِ قارئین کردوں۔ "ملفوظاتِ حکیم الامت" میں ہے:

"ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! بعض لوگوں نے یہ مشہور کیا ہے، کہ امام مہدی نقشبندی ہوں گے (حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے) فرمایا کہ یہ تو میں نے نہیں سُنا؛ البتہ بعض حنفیوں نے لکھا ہے کہ وہ حنفی ہوں گے، مگر یہ غلو ہے۔ غالباً یہ ہوگا کہ امام مہدی کا اجتہاد امام صاحب کے اجتہاد پر منطبق ہوجائے گا۔ باتیں دعوے کی دل کو نہیں لگتیں، اس میں تو ایک گونہ اہانت ہے امام مہدی کی۔ ان کا طرز صحابہ کا سا ہوگا، وہ نہ نقشبندی ہوں گے نہ چشتی نہ حنفی۔ وہ تو دین کے ہر شعبہ میں خود مستقل شان رکھتے ہوں گے۔" (ملفوظات حکیم الامت، ص:۹۰، ج:۵، ملفوظ:۹۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام حضرت مہدی سے بلاشبہ بڑھا ہوا ہے، اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حنفی کہنا یا لکھنا بدرجۂ اولیٰ غلو ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مجتہد مطلق ماننے کی تقدیر پر بالفرض آپ کا کل یا اکثر اجتہادات حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادات پر منطبق ہوجائے، تب بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہرگز ہرگز حنفی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے بیانات وتحریرات میں اس طرح کی تعبیر استعمال کرنے سے کلی طور پر احتراز کرنا چاہیے۔ واللہ الموفق

❁ ❁ ❁

دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم اور نظام تعلیم وتربیت

از: مولانا شوکت علی قاسمی بستوی
استاذ دارالعلوم دیوبند و ناظم عمومی رابطہ مدارس اسلامیہ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین محمد وآلہ وصحبہ أجمعین وبعد!

اسلام اور علم: اسلام دین رحمت ہے جو ساری انسانیت کی دینی ودنیاوی فلاح وکامیابی کا ضامن ہے۔ اسلام مکمل ضابطۂ حیات اور دستور زندگی بھی ہے جس میں زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے، لیکن اس سے مستفید اور فیض یاب ہونے کیلئے علم کی ضرورت ہے۔ علم ہی وہ کنجی ہے جس سے اسلام کے دینی، علمی، ثقافتی، ملی اور روحانی اثاثے تک رسائی ہوسکتی ہے، اسلام میں علم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ محسن انسانیت، سرور عالم ﷺ پر پہلی وحی میں درج ذیل پانچ آیات نازل ہوئیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے پڑھنے کا حکم فرمایا ہے:

”اقرأ بِاسم رَبّك الذی خَلَقَ ، خَلَقَ الانسانَ مِن عَلَقٍ، اِقْرأ وربُّك الاَ کرَمُ ، الذی علَّمَ بالقَلَمِ، علَّمَ الإنسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ“ (۱)

سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا ”انما بُعِثْتُ مُعَلِّمًا“ (۲) مجھے بھیجا ہی گیا ہے معلّم بنا کر۔

علم کی اسی اہمیت کے پیش نظر محسن انسانیت ﷺ نے مکی زندگی میں تمام تر دشواریوں کے باوجود قرآن کریم کی تعلیم کا نظم فرمایا، پھر مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد، مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی، تو اس میں ایک مخصوص صفہ (چبوترہ) اس لئے بنایا گیا تاکہ صحابہ کرامؓ وہاں قیام فرما کر، قرآن وحدیث اور دینی مسائل کی تعلیم حاصل کرسکیں، صفہ: اسلامی تاریخ کا پہلا مدرسہ قرار پایا۔ مشکوٰۃ نبوت سے براہ راست فیض یاب ہونے والے یہ حضرات صحابہؓ، جزیرۃ العرب ہی نہیں بلکہ دنیا کے اطراف واکناف میں پہنچے اور قرآن وحدیث کے انوار وبرکات سے دنیا کو معمور فرمایا۔ مسجد

کے زیرسایہ دینی تعلیم وتربیت کا نظام قائم کیا، جہالت و ناخواندگی کا قلع قمع کیا اور علوم قرآن وحدیث کی روشنی سے چپے چپے کو فیض یاب اور مستنیر کیا، امام ابومحمد عبدالرحمٰن بن ابی احاتم رازیؒ نے کتاب الجرح والتعدیل کے مقدمہ میں لکھا ہے:

''حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، عالم اسلام کے اطراف واکناف، بلاد وامصار اور سرحدوں میں امارت، قضاء اور تبلیغ احکام کے سلسلہ میں پھیل گئے، اوران میں سے ہر ایک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا، دیکھا اور یاد کیا تھا سب کو عام کیا، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عمل کیا، لوگوں کو فرائض، احکام، سنن، حلال وحرام کی تعلیم کے لئے، حسن نیت اور تقرب خداوندی کے جذبے کے ساتھ اپنے آپ کو وقف کردیا اور اسی میں زندگی بسر کی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھالیا۔(۳)

حضرات صحابۂ کرامؓ کے اسوۂ حسنہ کو امت کے بعد کے افراد نے بھی مشعل راہ بنایا اور دینی تعلیم کی نشرواشاعت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں، خود ہندستان میں جب مسلمانوں کے قدم پہنچے تو انھوں نے یہاں کے چپے چپے کو علم کی روشنی سے مالامال کردیا، ہر دور میں اسلامی علوم کی تعلیم واشاعت کا خصوصی نظام قائم رہا، سلاطین ہند نے دینی تعلیم کے فروغ کے لئے انتظامات کئے، جگہ جگہ حکومت کے زیرانتظام ونگرانی مدرسے قائم کیے گئے، سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے، دیگر سلاطین کے عہد میں بھی دینی تعلیم کی نشرواشاعت کا اہتمام جاری رہا۔(۴)

مغلیہ دورحکومت میں بھی تعلیم کی ترویج کا خاص انتظام کیا گیا، علماء ومشائخ کا بڑا پاس ولحاظ تھا، مدارس کے لیے جاگیریں وقف تھیں، علماء کرام کے وظائف جاری تھے۔ ان اسلامی مدارس میں بنیادی طور پر جن علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی ان میں، صرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، فلسفہ، کلام، حدیث، اصول حدیث، تفسیر اور اصول تفسیر شامل تھے۔کبھی ان فنون کے ساتھ ہیئت، حساب، اقلیدس، طب، ادب، انشاء، فرائض، اخلاق، تصوف اور مناظرہ وغیرہ کی تعلیم بھی دی گئی تھی۔(۵)

اس قدیم نصاب تعلیم کو پڑھ کر جو عظیم شخصیات پیدا ہوئیں ان میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اور حضرت حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ سب سے فائق اور ممتاز ہیں۔ قدیم نصاب میں شامل جن علوم وفنون کا پہلے تذکرہ کیا گیا، ان میں وقفہ وقفہ سے، تغیر وتبدل ہوتا رہا ہے،

حضرت امام اکبر شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے جس نصاب کے ذریعہ تعلیم حاصل کی اس کی درسی کتابوں کا تذکرہ انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح: الجزء اللطیف میں یوں کیا ہے:

''نحو میں کافیہ، شرح جامی۔ منطق میں شرح شمسیہ، شرح مطالع۔ فلسفہ میں شرح ہدایت الحکمۃ، کلام میں شرح عقائد نسفی مع حاشیہ خیالی اور شرح مواقف، فقہ میں شرح وقایہ، ہدایہ (کامل) ہیئت وحساب میں بعض مختصر رسائل، طب میں موجز القانون، حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح سوائے کتاب البیوع سے کتاب الآداب کے تھوڑے حصے تک، صحیح بخاری کتاب الطہارۃ تک، تفسیر میں: بیضاوی اور تفسیر مدارک کا ایک حصہ۔'' (۶)

اکثر کتابیں آپ نے اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سے ہی پڑھیں، پھر حجاز مقدس تشریف لے گئے اور شیخ ابوطاہر مدنی وغیرہ سے استفادہ کیا۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری فرماتے ہیں کہ:

''حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ، سرزمین ہند کے ان اکابر میں سے ہیں، جن کی نظیر نہ صرف اپنے عصر میں اور نہ صرف ہندوستان میں؛ بلکہ بہت سے قرون وممالک اسلامیہ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی، حضرت موصوف بقول حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، بانی دارالعلوم دیوبند، ان افراد میں سے ہیں کہ سرزمین ہند میں اگر صرف شاہ ولی اللہ ہی پیدا ہوئے، تو ہندوستان کے لئے یہ فخر کافی تھا۔ (۷)

علامہ شبلی نعمانیؒ تاریخ علم الکلام میں لکھتے ہیں کہ: ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد خود انہیں کے زمانہ میں مسلمانوں میں جو عقلی تنزل شروع ہوا تھا اس کے لحاظ سے یہ امید نہ رہی تھی کہ پھر کوئی صاحب دل ودماغ پیدا ہو، لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانے میں، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا جن کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے۔ (۸)

درس نظامی: حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے جس نصاب کے مطابق تعلیم پائی تھی وہی نصاب جزوی فرق کے ساتھ ان کے عہد میں دینی مدارس میں رائج تھا، اس میں پہلے بھی اصلاح وترمیم ہوئی اور بعد میں بھی جزوی ترمیمات کی گئیں لیکن نصاب کی روح باقی رہی، بعد میں یہی نصاب ''درس نظامی'' کے نام سے موسوم ہوا کیوں کہ اسے حضرت شاہ صاحب کے ہم عصر اور جلیل القدر فاضل حضرت ملا نظام الدین صاحب سہالویؒ (پیدائش: ۱۰۸۵ھ، وفات

۱۱۶۱ھ) نے فرنگی محل لکھنؤ کے مدرسے کے لیے قدیم نصاب میں چند تبدیلیوں اور کتابوں کے اضافے کے بعد مرتب کیا تھا، ملا نظام الدین سہالویؒ، حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے محقق اور بلند پایہ عالم تھے، فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کے لیے مقرر مجلس علمی کے وہ اہم رکن تھے، درس نظامی میں شامل فنون اور کتابیں حضرت مولانا عبدالحئی حسنیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تصریح کے مطابق حسب ذیل تھیں:

علم صرف: میزان، منشعب، پنج گنج، زبدۃ، صرف میر، فصول اکبری اور شافعیہ ابن حاجب۔

علم نحو: نحو میر، شرح مأۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح ملا جامی۔

بلاغت: صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی۔

منطق: سلم العلوم، میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال۔

فلسفہ: شرح میبذی علی ہدایۃ الحکمۃ، شرح صدرا، شمس بازغہ، ملا محمود جون پوری۔

ریاضی: خلاصۃ الحساب، باب التصحیح تحریر اقلیدس کا مقالہ اول۔

فقہ: شرح وقایہ کا نصف اوّل، اور ہدایہ کا نصف ثانی۔

اصول فقہ: نور الانوار، تلویح، مقدمات اربعہ تک، اور مسلم الثبوت، مبادی کلامیہ تک۔

علم کلام: تفتازانی کی شرح عقائد، تا بحث سمعیات۔

محقق دوانی کی شرح عقائد کا جزء اوّل، میر زاہد شرح مواقف تا بحث امور عامہ۔

تفسیر: جلالین شریف، بیضاوی سورۂ بقرہ۔ تا بحث امور عامہ۔

مناظرہ: رشیدیہ۔

حدیث: مشکوٰۃ المصابیح تا کتاب الجمعہ۔(۹)

حضرت ملا نظام الدینؒ کے مرتب کردہ اور رائج کردہ اس نصاب تعلیم کو معقولات ومنقولات میں گہرائی ورسوخ اور علوم وفنون متداولہ میں فضل وکمال کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا اور ملک کے بیشتر مدارس میں اسے قبول عام حاصل ہوا، اس میں جہاں اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ اسلامی علوم وفنون میں مہارت پیدا ہو، وہیں دنیاوی ضروریات کا بھی قدرے لحاظ تھا، اور اسی نصاب سے بعض عصری علوم پڑھ کر حکومتی اداروں اور دفاتر میں لوگوں کو ملازمت بھی مل جاتی تھی۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے مطابق اس نصاب میں دفتری زبان فارسی نثر وانشاء وغیرہ کی بیسیوں کتابیں داخل اور حساب وخطاطی پر بھی توجہ اسی لئے دی جاتی تھی تاکہ کاروبار حکومت اور

دفتری ضروریات کیلئے بھی افراد تیار ہوسکیں۔ یہ نصاب ۱۸۳۵ء تک ملک کے بیشتر مدارس میں رائج رہا۔(۱۰)

۷/مارچ ۱۸۳۵ء لارڈ میکالے کی صدارت میں مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی زبان میں تعلیم کے مسئلہ کو طے کرنے کیلئے بنی کمیٹی کا اجلاس ہوا، اراکین میں اختلاف رائے تھا، ایک فریق انگریزی زبان میں تعلیم دیئے جانے کا مخالف تھا دوسرا حامی، دونوں فریق کے ووٹ برابر ہوئے تب لارڈ میکالے نے اپنے فیصلہ کن ووٹ انگریزی زبان کی تعلیم کی تائید میں دیا اور اس طرح انگریزی کے اجراء کا فیصلہ ہوگیا، اور لارڈ میکالے کا نظریہ تعلیم ملک پر تھوپ دیا گیا۔

اس تعلیمی پالیسی کے پس پردہ کیا مقاصد تھے وہ لارڈ میکالے کی زبانی سنئے:

''ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو، مگر مذاق رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔'' (۱۱)

حضرات اکابر دیوبند نے لارڈ میکالے کے نظریہ تعلیم کو ناکام بنانے اور اعلیٰ تعلیمی و تربیتی مقاصد کے لیے دارالعلوم دیوبند قائم فرمایا، کہ ایسے افراد تیار کیے جائیں جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی، ایرانی، ترکستانی، افغانی وغیرہ ہوں لیکن ذہن و فکر اور دل و دماغ کے اعتبار سے حجازی اور محمدی ہوں۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام: برطانوی سامراج کے خلاف ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی ناکام ہوچکی تھی، علماء حق کو چن چن کر قتل کیا جارہا تھا، سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہوچکا تھا، شاطران فرنگ پورے برصغیر پر اپنا قبضہ جما چکے تھے، اسلامی سطوت خاک میں مل چکی تھی، مسلمانوں کے دین و ایمان پر شب خوں مارا جارہا تھا، اسلامی تہذیب کے نقوش مٹنے لگے تھے، پوری ملت اسلامیہ مایوسی و کس مپرسی کا شکار تھی، اسلامی نظام تعلیم ختم ہوچکا تھا، برطانوی تعلیمی پالیسی کا نفاذ ہورہا تھا، برصغیر کو دوسرا اسپین بنانے اور اسلام اور مسلمانوں کو دیس نکالا دینے کی تمام تیاریاں مکمل کرلی گئی تھیں کہ دیوبند کے افق سے امید کی روشن کرن پھوٹی، اللہ تعالیٰ نے برصغیر میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی، اسلام اور علوم اسلامیہ کی حفاظت کا سامان پیدا فرمایا اور حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ (متوفی ۱۲۹۷ھ) اور ان کے رفقاء کار حضرات کے دلوں میں دارالعلوم دیوبند کی شکل میں اسلامی قلعہ کی تعمیر کا الہام فرمایا اور ۱۵/محرم ۱۲۸۳ھ، مطابق ۳۰/مئی ۱۸۶۶ء کو ایک

مبارک و مسعود ساعت میں دیوبند میں اس کی داغ بیل ڈال دی گئی۔

یہ داغ بیل، کن مبارک ہاتھوں سے ڈالی گئی، سنئے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ صاحب فرماتے ہیں:

''یہ صالح ہستیاں منتخب روزگار تھیں، خدارسیدہ تھیں، انہیں نور بصیرت حاصل تھا، یہ عرفانِ شریعت سے آراستہ تھیں اور یہ اس مؤمنانہ فراست، حکیمانہ صلاحیت اور ملہمانہ بصیرت کا کرشمہ تھا کہ خداوند قدوس کے حکم سے دیوبند کی خاک پر علوم نبوت کی ایک درسگاہ عالم وجود میں آگئی، بادی النظر میں یہ ایک حقیر درس گاہ تھی لیکن فی الحقیقت یہ علوم معرفت کا عظیم سرچشمہ تھا اس میں بڑی جامعیت تھی، بڑی ہمہ گیریت تھی، یہ ایک دانش کدہ تھا، علم وعرفان کا مرکز عظیم اور امن وتقویٰ کا مظہر جلیل تھا، فکر وعمل کی بہترین جلوہ گاہ تھی، اور اس طائفہ ولایت کے سرخیل حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے، کون محمد قاسم؟ جو اشارۂ ربانی کے رمز شناس تھے، جن کے باطنی محاسن اور جن کے اخلاقی مکارم نے کفر کی ظلمتوں کا سینہ چیر کر اس میں نور ایمان پیوست کیا تھا، اور ان کے باطنی شعور اور فکری بلوغ سے ظلمت کدۂ ہند میں وحی الٰہی کی روشنی پھیلانے کا انتظام ہو رہا تھا، پھر یہ اسلام کا بطل جلیل تنہا نہ تھا اس کی معاونت کے لیے دیگر رجال کار بھی تھے وہ کون؟ وہ حاجی سید عابد حسینؒ تھے وہ مولانا ذوالفقار علیؒ تھے وہ مولانا فضل الرحمانؒ تھے، یہ وہ بندگان خدا تھے جن کی اصابت فکر، جن کی جلالت علم اور جن کی فراست وفہم پر ماہ وپروین گواہ تھے۔ (۱۲)

دارالعلوم دیوبند کیا ہے؟: دارالعلوم دیوبند علوم کتاب وسنت کا امین، متاع دین و دانش کا نگہبان، اسلامی تعلیمات وروایات کا پاسبان، علم وعرفان کا سنگم، ہندوستان میں تحفظ دین کی اولین کوشش کا مظہر جمیل، علماء حق کے جذبۂ ایثار وقربانی کی لازوال یادگار، اکابر کی آہ سحرگاہی ودعائے نیم شبی کا ثمرہ اور اسلام کی بقاء وتحفظ کا وہ عظیم مرکز ہے جس نے اسلامی علوم وفنون کی تعلیم واشاعت، ملک وملت کی دینی ودنیاوی قیادت، تزکیہ اخلاق، وعظ وتذکیر، تصنیف وتالیف، صحافت وخطابت، دعوت وارشاد، اور ملک کی آزادی کے سلسلے میں جو زریں خدمات انجام دیں ہیں وہ تاریخ کا روشن باب ہے، قیام دارالعلوم کے وقت منظّم کوشش جاری تھی کہ ہندوستان سے اسلام اور مسلمانوں کو رخت سفر باندھنے پر مجبور کردیا جائے، یہ دارالعلوم ہی تھا جس نے منظّم سازش کو ناکام بنایا اور ہندوستان کو دوسرا اندلس بنانے سے بچالیا۔

قیام کے اغراض و مقاصد: دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بنیادی مقاصد میں یہ بات

شامل تھی کہ لارڈ میکالے نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو نظام تعلیم نافذ کیا تھا اسے ناکام بنا کر اسلامی علوم وفنون کی حفاظت کی جائے۔ ایسے جاں نثار وسرفروش علماء کی کھیپ تیار کی جائے جو سخت سے سخت حالات میں علوم کتاب وسنت کی تعلیم واشاعت، اسلامی تعلیمات کی حفاظت، ملک وملت کی تعمیر وترقی اور مسلمانوں کی اصلاح کی خدمات انجام دے سکیں، دارالعلوم دیوبند کے دستور اساسی میں دارالعلوم کے قیام کے مقاصد درج ذیل بیان کیے گئے ہیں:

(۱) قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد وکلام اور ان علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنون آلیہ کی تعلیم دینا، مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا اور رشد وہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینا۔

(۲) اعمال واخلاق اسلامیہ کی تربیت اور طلبہ کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

(۳) اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دین کا تحفظ اور اشاعت اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر وتقریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ سے خیر القرون اور سلف صالحین جیسے اخلاق واعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

(۴) حکومت کے اثرات سے اجتناب واحتراز، اور علم وفکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

(۵) علوم دینیہ کی اشاعت کے لیے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق۔

مقاصد تاسیس سے ہم آہنگ نصاب تعلیم: دارالعلوم دیوبند کا قیام امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کی تحریک دعوۃ واصلاح کی بنیاد پر مسلم معاشرے کی دینی، ملی اور دعوتی ضرورتوں کی تکمیل، علوم کتاب وسنت کی حفاظت واشاعت، دینی عقائد وشعائر کی صیانت اور سرمایۂ ملت کی پاسبانی اور دیگر مذکورہ بالا اغراض ومقاصد کے لیے عمل میں آیا تھا، اس لیے اس کا نصاب تعلیم خالص دینی تجویز کیا گیا، یہ وہی نصاب تھا جو درس نظامی کے نام سے موسوم تھا، اسی میں خاصا ردوبدل کرکے اسے دارالعلوم دیوبند کے لیے تجویز کردیا گیا، پھر ۱۲۸۳ھ میں نصاب تعلیم پر نظر ثانی کی گئی، فارسی نصاب کو عربی سے الگ کردیا گیا اور عربی کا نصاب اس طرح مقرر کیا گیا کہ اس دور کے ذہین طلبہ اس کو چھ سال میں مکمل کرلیں، مگر پھر ۱۲۹۰ھ میں دوبارہ غور کیا گیا اور عربی نصاب تعلیم کو آٹھ سالہ بنادیا گیا، دارالعلوم کی رودادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پھر ۱۳۰۲ھ میں دوبارہ نصاب تعلیم زیر غور آیا اور اس میں جزوی ردوبدل کیا گیا اس کے بعد بھی

مختلف اوقات میں اس طرح کی ترمیمات کی جاتی رہیں۔

نصاب تعلیم کے سلسلہ میں حضرات اکابر دیوبند کے طرز عمل سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ انھوں نے نصاب تعلیم کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا تھا پہلے مرحلے میں جسے اس دور میں شعبہ فارسی و ریاضی کہا جاتا تھا اور جسے آج کی اصطلاح میں مدرسہ ابتدائیہ کہنا چاہیے، ان تمام چیزوں کی رعایت تھی جن کی ایک انسان کو اپنی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، اس دور میں چونکہ فارسی ملک کی رائج زبان تھی اس لیے مدرسہ ابتدائیہ میں فارسی ادب، بلاغت اور انشاء کا عنصر غالب تھا، لیکن اس کے علاوہ حساب، تاریخ، جغرافیہ، اقلیدس، اخلاق تصوف وغیرہ کے ذریعہ طالب علم کو اتنا علم اور تربیت کے ذریعہ اس کو ایسا مزاج دیا جاتا تھا کہ اگر وہ تعلیم منقطع کردے تو معاشرے کا ایک تعلیم یافتہ دیندار فرد شمار کیا جائے اور اگر وہ علوم عصریہ کی راہ اختیار کرے تو دین سے بیزار نہ ہو اور علوم عربیہ عالیہ میں داخل ہو تو اکابر دارالعلوم کو اسلام کی مختلف النوع خدمات کے لیے جن مجاہدین اور علماء راسخین کی ضرورت ہے ان کا فرد کامل بن جائے۔

اردو دینیات و فارسی کا نصاب: دارالعلوم دیوبند میں شعبہ اردو دینیات اور فارسی میں ٦ سالہ نصاب آج بھی رائج ہے اس نصاب میں حروف شناسی، بنیادی عقائد، گنتی، قرآن شریف، اردو، دینیات، کلمہ حفظ کرانا، نمازوں کی عملی مشق، ہندی، جغرافیہ، حساب، تاریخ اسلام، قواعد اردو، فارسی، انگلش، ادب فارسی، ادب اردو، سائنس، معلومات عامہ، تاریخ اکابر دارالعلوم وغیرہ مضامین ہیں۔ (مطبوعہ نصاب درجہ دینیات وفارسی، دارالعلوم)

عربی درجات کا نصاب: عربی درجات کے لیے آٹھ سالہ نصاب کچھ تغیرات کے بعد وہی درس نظامی ہے، اس نصاب کو منتخب کرنے کی وجہ اس کی خصوصیات ہیں کہ اس کے پڑھنے والوں میں دقت نظر، اور قوت مطالعہ پیدا ہوجاتی ہے یعنی اگر کوئی محنتی اور باذوق طالب علم اس نصاب کو ذوق وشوق اور تحقیق کے ساتھ مکمل کرلیتا ہے تو اس کو اگرچہ فراغت کے ساتھ ہی تحقیق کا درجہ حاصل نہیں ہوجاتا لیکن اس میں یہ صلاحیت ضرور پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ آئندہ اپنی جدوجہد اور مطالعہ سے جس فن میں چاہے کمال پیدا کرسکتا ہے، اس نصاب کی کتابیں حضراتِ علماء متاخرین کی مرتب کردہ ہیں اور ان میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اختصار کے ساتھ کتاب اپنے موضوع کے تمام مباحث ومسائل وجزئیات پر محیط ہو، تاکہ طالب علم زیردرس موضوع کی تمام بحثوں پر حاوی ہوجائے۔

حضرت مولانا عبدالحئی صاحب حسنی لکھنویؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ فرماتے ہیں: اس (درس نظامی) نصاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ طالب علموں میں امعان نظر اور قوت مطالعہ پیدا کرنے کا اس میں بہت لحاظ رکھا گیا ہے اور جس کسی نے تحقیق سے پڑھا ہو تو اس کو پڑھنے کے ساتھ ہی اگرچہ کسی مخصوص فن میں کمال حاصل نہیں ہو جاتا لیکن یہ صلاحیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ آئندہ اپنی محنت سے جس فن میں چاہے اچھی طرح کمال پیدا کرے۔(۱۳)

ماضی میں اسی نصاب تعلیم سے ایسے نابغۂ روزگار علماء پیدا ہوئے جن کے رسوخ فی العلم، مقام تحقیق اور کمال علم کا پورے عالم اسلام نے اعتراف کیا ہے۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رقم طراز ہیں:

''بحمداللہ اس وقت بھی ہندوستان کے قدیم نصاب سے جو لوگ پیدا ہو رہے ہیں ہندوستان ہی نہیں ہندوستان کے باہر بھی اسی علم میں جس میں ہندوستان کی بضاعت سب سے زیادہ مزجاۃ سمجھی جاتی تھی، یعنی فن حدیث، اسی کے متعلق قسطنطنیہ کے فاضل جلیل جو کمالی عہد سے پہلے غالباً کسی ممتاز دینی منصب سے سرفراز تھے، ان کا نام علامہ محمد زاہد ابن الحسن کوثری ہے۔ خاکسار نے ان کے چند رسائل مختصرہ دیکھے ہیں جن سے ان کی تبحر اور علمی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے اس وقت ان کا شمار، اسلامی ممالک خصوصاً حنفی دائرے کے ممتاز ترین علماء میں ہے اس ترکی اور مصری فاضل نے حضرت الاستاذ العلامہ الامام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب صدر دائرۃ الاہتمام دارالعلوم دیوبند کی شرح مسلم (فتح الملہم) جب دیکھی تو مولانا کو ایک خط لکھا جو شرح مسلم جلد ثالث کے آخر میں چھاپ دیا گیا ہے، اس خط میں علامہ کوثری مولانا کو خطاب کرکے اعتراف کرتے ہیں، ''انتم یامولانا فخر الحنفیۃ فی ھذا العصر حقا'' چودہویں صدی میں سارے حنفی ممالک کا فخر ایک ہندی عالم، بیرون ہند کا ایک جلیل القدر ومسلم الثبوت فاضل قرار دیا گیا ہے۔(۱۴)

علام اسلام کے بلند پایہ مفسر، محقق عالم اور صاحب طرز علامہ سید رشید رضاؒ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، جلسہ استقبالیہ میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے عربی زبان میں برجستہ خطاب فرمایا اور دارالعلوم دیوبند کے علمی مذاق ومزاج کی تشریح فرمائی، تو حضرت علامہ رشید رضا بے حد متاثر ہوئے، جس کا اظہار انھوں نے اپنی جوابی تقریر میں بھی کیا اور اپنے مجلّہ ''المنار'' میں بھی اپنے گراں قدر تاثرات تحریر فرمائے۔

جنرل سلیمان لکھتے ہیں: سات سال کے درس یعنی درجۂ فضل کے ایک ہندوستانی طالبعلم

اپنے سر پر جو آکسفورڈ کے فارغ التحصیل طالب علم کی طرح علم سے بھرتا ہوا ہے دستار فضیلت باندھتا ہے اور اسی طرح ...سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بوعلی سینا وغیرہ پر گفتگو کرسکتا ہے جس طرح آکسفورڈ کا کامیاب طالب علم۔(۱۵)

دارالعلوم دیوبند کا مزاج و مذاق: اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے اس نصاب تعلیم کو پڑھ کر اور اس کے اکابر رحمہم اللہ کے فہم وفراست، زہد وتقوی، اخلاص و للّٰہیت اور خدمت خلق وغیرہ کمالات سے استفادہ کے نتیجے میں ایسی نابغۂ روزگار اور عبقری شخصیات پیدا ہوئیں جو کسی اور ادارے سے پیدا نہیں ہوئیں، اس کی وجہ دارالعلوم دیوبند کے امتیازات وخصوصیات ہیں، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: پہلی خصوصیت یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند ایک درس گاہ نہیں بلکہ ایک خاص نظریہ اور ایک طرز عمل اور تحریک کا نام ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ دین سمجھانے کے لیے کتاب اللہ اور رجال اللہ دونوں بھیجتا رہا ہے، اکابر دیوبند نے بھی نصاب تعلیم پر اکتفاء نہ کیا؛ بلکہ علمی و دینی تربیت پر بھی پوری توجہ دی، یہاں سے فارغ ہوکر نکلنے والے صرف ظاہری علوم سے آراستہ نہیں ہوتے بلکہ وہ عملی اعتبار سے بھی سچے اور پکے مسلمان ہوتے تھے، جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آجاتا تھا جن کی ہر نقل وحرکت اسلام کی نمائندگی کرتی تھی، دن کے وقت یہاں علوم کے چرچے ہوتے اور رات کے وقت یہاں کا گوشہ گوشہ اللہ کے ذکر وتلاوت قرآن سے گونجتا تھا، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ علمائے دیوبند فضل وکمال تبحر علمی کے ساتھ ساتھ تواضع وللّٰہیت کا پیکر تھے، امانت وتقویٰ کا مجسمہ تھے، اسی طرح دارالعلوم دیوبند کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس نے اپنے مسلک اعتدال کی طرف دعوت اور دوسروں پر تنقید کے سلسلہ میں پیغمبرانہ اسلوب اختیار کیا جس میں مخالف کو زیر کرنے کے بجائے اس کی دینی خیرخواہی کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔(۱۶)

دارالعلوم نے دنیا کو کیا دیا: دارالعلوم دیوبند اور اس کا فکر، جامعیت کبریٰ محمدیہ کا وارث اور سہ گانہ مقاصد بعثت تلاوت قرآن کریم، کتاب وحکمت اور تزکیہ کا امین وداعی رہا ہے، دیوبند کی تشکیل جن پرنور اور مبارک بنیادوں پر ہوئی اور منہاج نبوت کا جو عظیم ورثہ اسے میسر آیا اس کی وجہ سے دیوبندیت کا ہیولی، قرآن وسنت کی سلف صالحین کے محتاط رنگ میں تشریح، فقہ حنفی کی محدثانہ طرز میں توضیح، سلوک وتصوف کی طریق نبوت کے مطابق تصریح اور معارف وحقائق دینی کی حکیمانہ پیشکش، توحید خالص، اتباع سنت، حب الٰہی عشق رسول اور جملہ اہل سلاسل کے

احترام سے وجود میں آیا، غیرت ایمانی نے احقاق حق، ابطال باطل، اشاعت دین، حفاظت ناموس رسالت رد بدعات اور حریت و جہاد کا جذبہ بخشا، دیوبندیت کے ان بنیادی جواہر کی بنا پر ان اعاظم رجال اور اساطین علم وعمل اور نفوس قدسیہ کو وجود بخشا، قرون متاخرہ میں ان کی مثال شاذ ہے بیسیوں ایسی ہستیوں کے نام بلا تکلف لیے جاسکتے ہیں جن میں ہر ایک بذات خود جامعہ علم، دائرۂ فضیلت، مجمع الفضائل، مرجع خلائق اور اپنی ذات میں انجمن بلکہ امت تھی، علوم وفنون کی ریاست وامامت انہیں زیبا تھی، ورع وتقویٰ نے ان سے زینت پائی تھی۔

اگر ایک طرف تعلیم کے رخ سے احادیث مبارکہ کا تداول اور چلن اور صحاح ستہ بلکہ دیگر بعض کتب احادیث کا دور دورہ، بستی بستی، قریہ قریہ پھیل گیا۔ قرآن کریم کے ترجمہ اور تفسیر کا ذوق گھر گھر پہنچا، عربی زبان وادب کو فروغ نصیب ہوا۔ احناف کی فقہی مستند کتابوں کا چلن مدرسہ کی ضرورت ٹھہرا، عقلی ونقلی علوم میں مہارت، سرمایۂ افتخار بنی تو دوسری طرف اکابر دیوبند کے سلاسل تصوف وسلوک اقصائے عالم میں پھیل گئے اور اصلاح وتجدید کے علمبرداروں نے معاشرے کی اصلاح اور مسلمانوں کی دینی وملی رہ نمائی کا گراں قدر فریضہ انجام دیا۔ (الرشید، دارالعلوم دیوبند نمبر)

نصاب دارالعلوم پر ایک نظر: جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، اکابر دیوبند نے دارالعلوم کیلئے جو نصاب تعلیم پسند فرمایا وہ بنیادی طور پر ''درس نظامی'' ہے، لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ دارالعلوم کا نصاب بعینہ درس نظامی نہیں ہے بلکہ اس میں خاصا حذف واضافہ کرکے ہی اسے نافذ کیا تھا پھر مرحلہ وار اس میں تغیرات اور اچھی تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں۔

اس وقت جو نصاب تعلیم دارالعلوم دیوبند وملحقہ مدارس میں جاری ہے یہ وہ نصاب ہے جو ۱۴۱۵ھ میں بعض جزوی ترمیمات کے بعد مرتب کیا گیا ہے۔ مورخہ ۲۰، ۲۱ر محرم ۱۴۱۵ھ کو دارالعلوم دیوبند میں مدارس اسلامیہ عربیہ کا کل ہند اجتماع منعقد ہوا جس میں دیگر موضوعات کے علاوہ نصاب تعلیم بھی زیر بحث آیا اور اجتماع نے اپنی تجویز (۱) میں ایک نمائندہ نصاب کمیٹی کی تشکیل کی سفارش کی جو نصاب تعلیم پر غور کرے اور مجوزہ ترمیمات واضافات کوملحوظ رکھتے ہوئے ایک جامع نصاب کا خاکہ تیار کرے، چنانچہ پہلے مجلس تعلیمی دارالعلوم دیوبند نے نصاب پر غور کیا اور بعض جزوی ترمیمات کی سفارش کی پھر حضرات اساتذہ دارالعلوم کی ایک ۹ نفری کمیٹی نے غور وخوض کے بعد اور کچھ ترمیمات کیں، بعد ازاں نمائندہ نصاب کمیٹی کے ارکان حضرت مولانا قاری محمد اطہر صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا رشید الدین صاحب مرادآباد، حضرت مولانا برہان

الدین صاحب سنبھلی استاذ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، حضرت مولانا محمد سلمان صاحب مظاہری ناظم اعلیٰ مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب گجرات، حضرت مولانا محمد رضوان صاحب قاسمی حیدرآباد، حضرت مولانا محمد اشتیاق صاحب مظفر پور پٹنہ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدراس، حضرت مولانا نوح صاحب کیرالا، حضرت مولانا مشہود صاحب دہلی، حضرت مولانا احمد علی صاحب آسام، اور حضرت مولانا عبدالحق صاحب آسام، اور ۹/ اساتذۂ دارالعلوم نے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب زید مجدہم مہتمم دارالعلوم دیوبند کی صدارت میں منعقد اپنی نشستوں میں ۱۹/ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۵ھ کو طویل غور وخوض کیا اور نصاب تعلیم کا ایک خاکہ مرتب کیا، اساتذۂ دارالعلوم میں جو حضرات بحیثیت رکن شریک رہے وہ ہیں: حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب صدرالمدرسین، حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری، حضرت مولانا قمرالدین صاحب گورکھپوری، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب اعظمی، حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری، حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب، حضرت مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی، حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری، حضرت مولانا نور عالم امینی صاحب، راقم السطور شوکت علی قاسمی بستوی بھی تمام مجلسوں میں شریک رہا۔ یہ مجوزہ نصاب ۲۰، ۲۱، ۲۲/ جمادی الاولیٰ کے کل ہند اجلاس مدارس اسلامیہ عربیہ میں پیش ہوکر منظور ہوا، اور دارالعلوم اور ملحقہ مدارس میں جاری ہوا۔

درجات عربیہ کا یہ ۸ سالہ نصاب ہے، ذیل میں جماعت وار مضامین کا جائزہ پیش ہے۔

سال اول میں: سیرت رسول کریم، صرف، نحو، تمرین عربی، تجوید پارۂ عم حفظ، تصحیح مخارج کے ساتھ ربع اوّل۔

سال دوم میں: نحو، صرف، تمرین عربی، فقہ، منطق (آسان منطق) مرقات، تجوید مع مشق پارۂ عم، خوش نویسی۔

سال سوم میں: ترجمہ قرآن کریم، سورہ قٓ سے آخر تک، حدیث، فقہ، نحو، عربی ادب، تمرین عربی، اسلامی اخلاق، منطق (شرح تہذیب) تجوید۔ مطالعہ: خلافت راشدہ۔

سال چہارم میں: ترجمہ قرآن سورۂ یوسف سے سورۂ ق تک، حدیث، بلاغت، اصول فقہ، منطق (قطبی) تاریخ خلافت بنی امیہ، خلافت عباسیہ، خلافت ترکیہ، مبادی: علم مدنیہ، جغرافیہ عالم، جغرافیہ جزیرۃ العرب، تجوید، پانچ پاروں کا اجراء۔

سال پنجم میں: ترجمہ قرآن از ابتدا، تاختم سورۂ یونس، فقہ، بلاغت، اصول فقہ۔علم ادب: عقائد، منطق (سلم)، تجوید، تاریخ سلاطین ہند، سلطان محمود غزنوی سے ۱۹۴۷ء تک۔

سال ششم میں: تفسیر جلالین، فقہ، اصول تفسیر، اصول فقہ، عربی ادب، تجوید، فلسفہ (مبادی الفلسفہ بعدہ میبذی) مطالعہ سیرت (اصح السیر)

سال ہفتم میں: حدیث شریف، اصول حدیث، فقہ، عقائد، فرائض، تجوید، مطالعہ: المذاہب الاسلامیہ۔

سال ہشتم میں: کتب حدیث: بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، ابوداؤد شریف، نسائی شریف، ابن ماجہ شریف، طحاوی شریف، شمائل ترمذی شریف، مؤطا امام مالک، مؤطا امام محمد ان کے علاوہ تجوید ومشق۔

بڑے شدومد سے یہ راگ الاپا جاتا ہے کہ: دارالعلوم دیوبند وملحقہ مدارس میں قدیم فرسودہ درس نظامی رائج ہے جس میں معقولات کی کتابوں کی بھرمار ہے اور کتب دینیہ خال خال ہیں کہا جاتا ہے کہ: اس نصاب میں قرآن کریم کی تفسیر کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے، لے دے کے صرف تفسیر جلالین اور بیضاوی شریف کا کچھ حصہ شامل نصاب ہے، لیکن آپ ملاحظہ فرمائیں تیسری جماعت سے ہی تفسیر (ترجمہ قرآن) داخل ہے، سال سوم، چہارم وپنجم میں قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر شامل ہے۔ اس طرح تین سالوں میں پورے قرآن کریم کا اردو ترجمہ مختصر تفسیر اور نحوی و صرفی اجراء وغیرہ مکمل کرایا جاتا ہے۔ پھر تجوید سال اول سے سال ہشتم تک ہر سال لازمی ہے، اسی طرح فقہ کی کتابیں سال اول وہشتم کے علاوہ تمام جماعتوں میں ہیں اور ہشتم یعنی دورۂ حدیث شریف میں بھی فقہ السنہ امتیازی شان سے پڑھایا جاتا ہے۔ نیز سیرت، اخلاقیات عقائد کی کتابیں بھی خاصی تعداد میں شامل نصاب ہیں۔ درس نظامی کا ایک نقص یہ بھی بیان کیا جارہا ہے کہ اس میں تاریخ داخل نہیں ہے، آپ نے دیکھا دارالعلوم کے نصاب میں اسلامی اور ملکی تاریخ کی کتابیں کئی داخل ہیں۔ پہلے درس نظامی میں کل دو ہی کتابیں حدیث کی رہی ہوں گی، لیکن اب تو کل ۱۳؍کتابیں ہیں۔ تین دورۂ حدیث سے قبل اور باقی دورۂ حدیث میں، اور حدیث شریف تو دارالعلوم دیوبند میں اس شان سے بحمد اللہ پڑھائی جاتی ہے کہ شاید ہی کہیں اور اس طرح پڑھائی جاتی ہو، اور اس طرح شب و روز قال اللہ و قال الرسول ﷺ کی صدائیں شاید ہی کہیں بلند ہوتی ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

ایک بات یہ بھی کہہ دی جاتی ہے کہ دارالعلوم میں ادب عربی پر توجہ نہیں ہے۔ پہلے درس نظامی میں واقعی یہ خلا تھا لیکن اللہ تعالیٰ جزاء خیر عطا فرمائے، استاذ گرامی، عربی زبان وادب کے عبقری ومثالی معلم حضرت مولانا وحید الزماں صاحب قاسمی کیرانویؒ کو۔ انھوں نے تمرین عربی کا مکمل کورس تیار فرمایا، مختلف معاجم اور لغات، مرتب فرمائیں اور عربی زبان وادب کے فروغ کا سامان پیدا فرمادیا، اب سال اول و دوم وسوم میں مسلسل تمرین عربی داخل ہے، اور حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ کی نفحۃ العرب، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کی القرأۃ الواضحۃ کے تینوں حصے، حضرت مولانا نور عالم صاحب امینی کی مفتاح العربیہ، اسی طرح بہت سے ملحقہ مدارس میں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب کی قصص النّبیین، القرأۃ الراشدہ وغیرہ کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں، ضرورت ہے کہ دیگر مدارس کے ذمہ داران بھی اس جانب خصوصی توجہ مبذول فرمائیں، رہیں منطق وفلسفہ کی کتابیں تو دارالعلوم کے نصاب میں منطق کی کل پانچ اور فلسفہ کی ۲ ہی کتابیں موجود ہیں۔ بعض کرم فرما حضرات کا اصرار ہے کہ یہ بھی کیوں رکھی جائیں؟ انہیں بھی نکال دیا جانا چاہیے، تو اس بارے میں حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ کا ارشاد نقل کردینا بہتر ہوگا۔

فرماتے ہیں: منطق اور فلسفے کی تعلیم سے متعلق بعض حضرات یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ یونانی فلسفے کے زوال کے بعد ان مضامین کو پڑھانے کی چنداں حاجت باقی نہیں رہی، لیکن ہمارے نزدیک یہ بات بوجوہ درست نہیں، ان مضامین کی اہمیت کے لئے تنہا یہ بات بھی کافی ہے کہ ہمارے اسلاف کی کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ بالخصوص اصول فقہ انہیں علوم کی اصطلاحات اور منطقی انداز واسلوب پر مشتمل ہے، اس کو ٹھیک سمجھنے اور اس سے استفادے کے لئے منطق اور فلسفہ کی واقفیت ضروری ہے، آج تفسیر کبیر جیسے دریائے علم سے استفادہ اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ انسان منطق اور فلسفہ کا علم رکھتا ہو، لہٰذا ان مضامین کا یکسر ختم کردینا ہمارے نزدیک نقصان دہ ہوگا۔ لیکن ان مضامین کو اسی حد تک پڑھانا چاہئے جس حد تک وہ اسلامی علوم کے لیے زینے کا کام دیں۔ (۱۸)

(باقی آئندہ)

افتتاحیہ

اجلاس ششم مجلس عاملہ
رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند

منعقدہ: ۱۲/ذی قعدہ ۱۴۲۷ھ مطابق ۴/دسمبر ۲۰۰۶ء بروز پیر

بمقام مہمان خانہ دارالعلوم دیوبند

از: حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم
مہتمم دارالعلوم دیوبند وصدر رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين وبعد:

اللہ تبارک وتعالیٰ کا بڑا فضل وکرم ہے کہ اس نے ہمیں صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی توفیق ارزانی فرمائی اور اسلام کی حفاظت واشاعت، علوم اسلامیہ کی تعلیم وترویج کے مراکز اور دین مبین کے روشن میناروں یعنی مدارس اسلامیہ کی خدمت کی سعادت بخشی اور ان ہی دینی مدارس اور تعلیم گاہوں کے مسائل پر باہمی تبادلۂ خیالات، غور وخوض اور فیصلے کیلئے ہم سب کو یہاں جمع ہونے کا موقع میسر فرمایا، اس پر مسرت موقع پر بندہ اپنی اور خدام دارالعلوم دیوبند کی جانب سے آپ حضرات کا صمیم قلب سے خیر مقدم کرتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے جذباتِ تشکر پیش کرتا ہے کہ آپ حضرات نے رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم کی مجلس عاملہ کے اس اہم اجلاس میں شرکت کے لیے اپنا قیمتی وقت فارغ فرمایا اور زحمت سفر برداشت کر کے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے۔ بندہ اس موقع پر معذرت خواہ بھی ہے کہ ہم خدام دارالعلوم کوشش کے باوجود آپ کا حق خدمت ادا نہ کر سکے۔

حضرات گرامی قدر! آپ حضرات بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے اکابر رحمہم اللہ نے دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارس اسلامیہ کے قیام کی تحریک بڑے صبر آزما اور پرآشوب حالات میں برپا کی تھی۔ان مدارس کے قیام کے مقاصد میں اسلام کی حفاظت وصیانت، علوم کتاب وسنت کی تعلیم واشاعت، سرمایہ ملت کی نگہبانی، اسلام کا تحفظ ودفاع، باطل تحریکات اور فتنوں کی سرکوبی، ملت اسلامیہ کی دینی قیادت، ملک وملت کی تعمیر وترقی اور دینی وملّی ضروریات کی تکمیل کے لیے رجال کار اور مخلص افراد کی تیاری شامل تھی۔ان مدارس اسلامیہ کی کوکھ سے قابل قدر اور لائق فخر فرزندوں اور سپوتوں نے جنم لیا اور ایسے نفوس قدسیہ تیار ہوئے جنھوں نے بے سروسامانی اور حالات کی تمام تر نامساعدت اور سنگینی کے باوجود ایسی زریں خدمات انجام دیں جو تاریخ کا روشن باب ہے۔ یہ حضرات علوم اسلامیہ میں رسوخ ومہارت، مسلک حق کے بارے میں تصلب اور وسعت نظر کے ساتھ مومنانہ فراست، الہامی بصیرت، خلوص وللّٰہیت، تواضع وفروتنی اور اتباع سنت کا پیکر تھے اور ملک وملت کی بے لوث خدمت کے جذبے سے سرشار تھے — فضلاء مدارس کی انھی مختلف النوع، ہمہ جہت اور گوناگوں خدمات کا فیض ہے کہ ملک کے چپے چپے میں مدارس و مکاتب سرگرم ہیں۔مسلمانوں میں اسلام اور تعلیمات اسلام سے وابستگی اور شیفتگی میں اضافہ ہورہا ہے۔اسلامی بیداری فروغ پارہی ہے۔قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند ہورہی ہیں۔دعوت وتبلیغ کی مساعی جمیلہ بارآور ہورہی ہیں، نوجوانوں میں دینی جذبات پروان چڑھ رہے ہیں۔اور مدارس اسلامیہ اپنی بے سروسامانی اور بعض کمزوریوں کے باوجود نئی نسل کی آب یاری میں مصروف ہیں۔دینی اقدار وشعائر کا احترام عوام میں بڑھ رہا ہے اور فرزندان توحید کے نام پر مرمٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار نظر آتے ہیں۔

مدارس اسلامیہ کی اسی اہمیت اور ملک میں حقیقی اسلامی روح اور اسپرٹ کی بقاء وتحفظ کے سلسلہ میں مدارس اسلامیہ کے اسی روشن اور موثر ترین کردار اور اسلامیان ہند میں ان کی بے حد اثر انگیزی کی وجہ سے ہی اسلام اور مسلم دشمن طاقتیں دینی مدارس کو برداشت نہیں کرپارہی ہیں۔ سابقہ فرقہ پرست مرکزی حکومت کے دور میں مدارس اسلامیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کچھ زیادہ ہی کیا گیا لیکن اس کے بعد بھی حالات یکسر تبدیل نہیں ہوئے، بلکہ عالمی حالات سے حوصلہ پاکر ملک کی فرقہ پرست طاقتوں اور فسطائی عناصر نے مدارس کے خلاف اپنی منصوبہ بند مہم پھر تیز کردی ہے۔تعلیم وتربیت کے ان مراکز اور محبّ وطن، جمہوریت پسند اور امن اور یک جہتی کو فروغ دینے

والے ان دینی مدارس کے قومی و دینی کردار و وقار کو مجروح کرنے کی مذموم کوششیں جاری ہیں۔ مفتیانِ کرام اور مدارس دینیہ سے وابستہ علماء کرام کے وقار و معتبریت کو داغ دار کرنے کے لیے ٹی وی چینل کا منصوبہ بند فتویٰ آپریشن اور سرکاری رپورٹ میں امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کو دہشت گردوں کا محفوظ مسکن و مرکز قرار دینا اس کی تازہ مثال ہے۔

پاسبانان ملت! موجودہ حالات پوری ملت اسلامیہ کے لیے عموماً اور مدارس اسلامیہ عربیہ کے لیے خصوصاً بڑے اندوہ ناک اور ہمت شکن ہیں۔ مدارس کی جدید کاری کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ نصاب تعلیم میں بنیادی تبدیلی اور عصری علوم کی شمولیت کا آوازہ پھر بلند کیا جانے لگا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق مرکزی حکومت مرکزی مدرسہ بورڈ قائم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ حقیقت میں مدارس اسلامیہ کی امداد اور علماء مدارس کی معاشی حالت کو سدھارنے کے خوبصورت عنوان کے بہانے قومی و دینی مدارس کو حکومت کے زیر کنٹرول لانے اور ان کے نظام اور نصاب میں اہم تبدیلیاں کرنے کی سمت ایک اہم قدم ہے، جس کے نہایت دوررس اثرات ہوسکتے ہیں، آج کی اس نشست میں مرکزی حکومت کی اس تجویز کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بھی لینا ہے۔

علماء عالی وقار ! رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے مقاصد میں مدارس اسلامیہ عربیہ کے معیار تعلیم و تربیت کو بہتر بنانا، باہمی ربط و اتحاد کو فروغ دینا، مدارس اسلامیہ کی بقاء و ترقی کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کرنا اور مدارس اسلامیہ کو درپیش داخلی و خارجی مسائل و مشکلات کے ازالہ کی کوشش کرنا شامل تھا۔ بحمد اللہ رابطہ کے زیر اہتمام منعقد مدارس اسلامیہ کے متعدد اجتماعات میں مذکورہ موضوعات زیر بحث آئے، اجتماعی تبادلۂ خیال ہوا، اور مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کی سمت پیش رفت بھی ہوئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ضرورت ہے کہ مدارس کے اندرونی نظام میں اصلاح کی جائے اور مقررہ نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے انتظامی، تعلیمی، تربیتی امور پر خصوصی توجہ دی جائے۔ خامیوں کو دور کیا جائے، نظام چست اور باضابطہ بنانے کے لیے ضابطۂ اخلاق کی پابندی بھی ضروری ہے۔ رابطہ کے دستور العمل میں اس کا ذکر موجود ہے آج کی مجلس میں ضابطہ اخلاق بھی طے کیا جانا ہے اور اس کے نفاذ کے بارے میں بھی غور وخوض ہونا ہے۔

اسی طرح مدارس اسلامیہ کے زیر انتظام دینی مکاتب کا قیام وقت کی اہم ضرورت ہے۔ بہت سے علاقے اب بھی ایسے ہیں جہاں بنیادی دینی تعلیم کا بندوبست نہیں کیا جاسکا ہے اور عیسائی

مشنریاں، قادیانی مبلغین اور دیگر باطل جماعتیں ان علاقوں میں سرگرم ہیں اور عوام کی جہالت اور تنگ دستی سے فائدہ اٹھا کر ان کو اپنے دام فریب میں الجھانے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔ اس صورت حال کے مقابلہ کے لیے زیادہ سے زیادہ مکاتب قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

دانشمندانِ ملت ! رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ کے کام میں وسعت پیدا کرنے اور اس کے اغراض ومقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے رابطہ کی مجلس عاملہ نے صوبائی شاخوں کے قیام اور ان کو فعال بنانے پر اپنے سابقہ اجلاسوں میں زور دیا ہے۔ چنانچہ بعض صوبوں میں رابطہ کا کام بڑے منظّم انداز میں ہورہا ہے، لیکن کئی صوبوں میں ابھی تک کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ صوبائی ذمہ داران حضرات سے میری گزارش ہے کہ براہ کرم اس جانب خصوصی توجہ فرمائیں، صوبائی رابطہ کی تشکیل کرکے کام کو آگے بڑھایا جائے تاکہ رابطہ کے فوائد کو عام کیا جاسکے، صوبائی رابطہ کو فعال بنانے کے طریقۂ کار پر غور بھی ایجنڈے میں شامل ہے۔

مدارس اسلامیہ کے خلاف اسلام دشمن طاقتوں کی ریشہ دوانیوں میں اضافہ ہورہا ہے، دینی تعلیم کے یہ ادارے ان کی آنکھوں میں بری طرح کھٹک رہے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ مدارس اسلامیہ کو ان کے نصب العین سے پھیر دیا جائے اور ان کے نصاب اور نظام میں ایسی بنیادی تبدیلی کردی جائے کہ ان کا بنیادی مقصد فوت ہوجائے، ورنہ ان مدارس اسلامیہ کو دہشت گردی اور بنیاد پرستی کا مرکز قرار دے کر ان پر پابندی عائد کردی جائے۔ ان کرب ناک حالات میں ہم خدام مدارس کو پوری بیدار مغزی اور تیقظ کے ساتھ حالات کا جائزہ لے کر مدارس اسلامیہ کے تحفظ اور ترقی کے لیے جامع لائحۂ عمل تیار کرنا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی ضروری ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران حضرات اپنے اپنے مدارس میں طلبہ عزیز کو فرق باطلہ کے تعاقب اور تردید کے لیے تربیت کا انتظام فرمائیں تاکہ طلبہ عزیز مسلک حق (دیوبندیت) کے خدوخال سے واقف ہوسکیں اور قرآن وسنت سے ماخوذ اس مسلک کے افکار وعقائد اور ان کے دلائل پر ان کی وسیع نظر ہو اور وہ باطل فرقوں کا بھرپور تعاقب کرسکیں۔

مجلس عاملہ کے آج کے اجلاس میں ہم حضرت فدائے ملت امیر الہند مولانا سید اسعد مدنی صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی کمی شدت سے محسوس کررہے ہیں

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

تیسری قسط:

قادیانیت کا مکروہ چہرہ!

کینیڈا سے قادیانیوں کے پندرہ سوالات اور ان کا جواب

از: مولانا سعید احمد جلال پوری
مدیر ماہنامہ بینات کراچی، پاکستان

سوال: ۷- ''حضرت محمد نے مرد کے مقابلے میں عورت کی گواہی آدھی کیوں قرار دی؟''

جواب: یہ اعتراض بھی قادیانیوں کی دنارت، سفاہت، جہالت اور لاعلمی بلکہ ان کی کوڑھ مغزی کا منہ بولتا ثبوت ہے، اس لئے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی آدھی گواہی کا حکم، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے نہیں، بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، دوسرے لفظوں میں یہی حکمِ الٰہی ہے، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

”واستشهدوا شهيدين رجالكم، فان لم يكونا رجلين فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشهداء ان تضل احداهما فتذكر احداهما الاخرى“ (البقرہ:۲۸۲)

ترجمہ: ''اور گواہ کرو دو شاہد اپنے مردوں میں سے، پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں، تاکہ اگر بھول جائے ایک ان میں سے تو یاد دلا دے اس کو وہ دوسری۔''

بلاشبہ اللہ تعالیٰ، مردوں اور عورتوں کے مالک و خالق ہیں اور وہ ان کی ظاہر و پوشیدہ صلاحیتوں، عقل و شعور اور حفظ و اتقان کو خوب جانتے ہیں، جب انھوں نے ہی عورت کی گواہی مرد کے مقابلہ میں آدھی قرار دی، تو کسی ایسے انسان کو، جو اللہ تعالیٰ کو خالق و مالک مانتا ہو، یا کم از کم اس کی ذات کا قائل ہو، اس حکمِ الٰہی پر اعتراض کا کوئی حق نہیں، ہاں اگر کوئی منکرِ خدا اور دہریہ اس حکمِ الٰہی پر اعتراض کرتا تو ہم اس کا جواب دینے کے مکلّف ہوتے۔

چونکہ قادیانیوں اور ان کے روحانی آباؤ اجداد عیسائیوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کا دعویٰ ہے، اس لئے ہم ان سے عرض کرنا چاہیں گے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کی ذات پر اعتراض

کرنے کی بجائے براہ راست اللہ تعالیٰ اور قرآن کریم پر اعتراض کریں اور زندقہ کے شیش محل سے باہر نکل کر سامنے آئیں، تاکہ لوگوں کو بھی معلوم ہو کہ قادیانیوں کا اللہ کی ذات اور قرآن کریم پر کتنا ایمان ہے؟ اور ان کے دعویٔ ایمان و اسلام کی کیا حقیقت ہے؟

بلا شبہ ہم یقین سے کہتے ہیں کہ قادیانی، زہر کا پیالہ پینا تو گوارا کرلیں گے مگر اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرسکیں گے۔

رہی یہ بات کہ عورت کی گواہی مرد کی نسبت آدھی کیوں قرار دی گئی؟ اور اس کی کیا حکمت و مصلحت ہے؟ تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اس کی حکمت و مصلحت قرآن و حدیث دونوں میں مذکور ہے، چنانچہ قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت میں صراحت و وضاحت کے ساتھ اس کی حکمت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

”ان تضل احداھما فتذکر احداھما الاخریٰ“ (البقرہ:۲۸۲)

ترجمہ:”تاکہ اگر بھول جائے ایک ان میں سے تو یاد دلادے اس کو وہ دوسری۔“

جس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ خواتین عدالتی چکروں کی متحمل نہیں ہیں، ان کی اصلی وضع گھر گرہستی اور گھریلو ذمہ داریوں کے نبھانے کے لئے ہے، اس لئے عین ممکن ہے کہ جب عورت عدالت اور مجمع عام میں جائے تو گھبرا جائے اور گواہی کا پورا معاملہ یا اس کے کچھ اجزاء اُسے بھول جائیں، اس لئے حکم ہوا کہ اس کے ساتھ دوسری خاتون بطور معاون گواہ رکھی جائے تاکہ اگر وہ بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلادے۔

۲-عورتیں عام طور پر مردوں کے مقابلہ میں کمزور ہوتی ہیں، ان کے دماغ میں رطوبت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے، اس لئے ان سے نسیان بھی زیادہ واقع ہوتا ہے، اور وہ بھول بھی جاتی ہیں، یہ ایک انسانی فطرت ہے، وگرنہ بعض عورتیں بڑی ذہین بھی ہوتی ہیں، اور بعض عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیت بخشی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ بعض اوقات مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ذہین بھی ثابت ہوتی ہیں، تاہم عام فطرت اور اکثریت کے اعتبار سے چونکہ عورت کا مزاج ”اعصابی“ ہوتا ہے، اس لئے وہ اکثر بھول جاتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دماغی کیفیت ہی ایسی بنائی ہے، لہٰذا دو عورتوں کو ایک مرد کے ساتھ رکھا گیا ہے۔

۳-عورتوں کے نقصان عقل کی تائید آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے، جو آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ میں فرمایا:

”مـا رأيت من ناقصات عقل و دين اغلب لذى لب منكن، قالت: يا رسول الله

وما نقصان العقل والدين؟ قال: اما نقصان العقل فشهادة امرأتين تعدل شهادة رجل، فهذا نقصان العقل، وتمكث الليالى ما تصلى و تفطر فى رمضان فهذا نقصان الدين"

(صحیح مسلم،ص:٦،ج:١)

ترجمہ: "میں نے عقل اور دین کے اعتبار سے ناقصات میں سے ایسا کوئی نہیں دیکھا، جو تم میں سے صاحبِ عقل کی عقل کو گم کردے؟ ایک خاتون نے عرض کیا: ہم ناقص عقل و دین کیوں ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: عورت کے نقصانِ عقل کی وجہ یہ ہے کہ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہے، اور اس کے نقصانِ دین کی وجہ یہ ہے کہ وہ (مہینہ کے) کچھ دنوں اور راتوں میں نماز نہیں پڑھتی اور رمضان میں روزہ نہیں رکھتی۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دو عورتوں کی شہادت کا ایک مرد کے برابر ہونا تو حکم الٰہی ہی ہے، البتہ اس کی حکمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمائی کہ یہ ان کے نقصانِ عقل کی بنا پر ہے، دیکھا جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وجہ اپنی طرف سے ارشاد نہیں فرمائی بلکہ دراصل یہ قرآن کریم کی آیت: "ان تضل احداهما فتذكر احداهما الاخرى" کی تفسیر وتشریح ہے۔

لہٰذا جو لوگ عورت کی گواہی کے مسئلہ پر یہ اشکال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عورت کی گواہی مرد کے مقابلہ میں نصف کیوں ہے؟ دیکھا جائے تو وہ لوگ حکم الٰہی کا مذاق اڑاتے ہیں۔

شاید کچھ لوگوں کو یہ خیال ہو کہ خواتین ایسی نہیں ہوتیں، بلکہ ان کو سب باتیں خوب یاد رہتی ہیں، تو وہ گواہی کے معاملہ میں کیوں بھول سکتی ہیں؟ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ تجربہ سے ثابت ہے کہ عموماً خواتین باتونی تو ہوتی ہیں، مگر وہ ادھر ادھر کی باتیں خوب یاد رکھتی ہیں، لیکن اصل بات اور معاملہ کی جزئیات بھول جاتی ہیں۔

۴- حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند نے عورت کی آدھی گواہی کے سلسلہ میں ایک عجیب وغریب نقطہ ارشاد فرمایا ہے، چنانچہ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"عجب نہیں کہ مجموعہ بنی آدم میں اوّل سے لے کر آخر تک دو تہائی عورتیں اور ایک تہائی مرد ہوں اور حکم ازلی نے باعتبار جہت تقابل کے بھی وہی حساب "للذكر مثل حظ الانثيين" بٹھا کر ایک مرد کو دو عورتوں کے مقابل رکھا ہو۔" (تفسیر معارف القرآن مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ ،ص:۴۲۵،ج:۱)

چنانچہ اگر اوّل سے آخر تک کی مردوں اور عورتوں کی تعداد کا کسی کو استحضار نہ بھی ہو تو دنیا بھر میں موجودہ عورتوں کی تعداد سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے، اس لئے کہ آج دنیا بھر میں عورتیں

مردوں کی نسبت بہت ہی زیادہ ہیں، اور غالباً اسی تناسب سے اللہ تعالیٰ نے دوعورتوں کی گواہی اور وراثت کو ایک مرد کے برابر رکھا ہے۔

ان تصریحات وتفصیلات کی روشنی میں واضح ہو جانا چاہئے کہ مرد کی نسبت عورت کی آدھی گواہی کا معاملہ کسی مسلمان کا خانہ زاد یا آنحضرت ﷺ کا وضع فرمودہ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اب جس کو اس پر اعتراض کرنا ہو، وہ ذاتِ الٰہی سے ٹکرلے اور اللہ تعالیٰ سے خود ہی نمٹے۔

سوال: ۸- ''والدین کی جائیداد سے عورت کو مرد کے مقابلے میں آدھا حصہ دینے کا کیوں حکم دیا؟ کیا عورت مرد کے مقابلے میں کمتر ہے؟''

جواب: یہاں بھی یہ امر پیش نظر رہنا چاہئے کہ میراث میں مرد کے مقابلہ میں عورت کو آدھا حصہ دینے کا حکم آنحضور ﷺ نے نہیں، بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

''للذکر مثل حظ الانثیین'' (سورۂ نساء:۱۱)

ترجمہ:''دوعورتوں کا حصہ ایک مرد کے برابر ہے۔''

بہرحال قادیانیوں کو تقسیم میراث کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی مخالفت اور انگریزوں کی حمایت میں مردوزن کی مساوات کا راگ نہیں الاپنا چاہئے، بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی حق وانصاف پر مبنی تقسیم پر سکوت اختیار کرنا چاہئے۔ یہ تو شاید قادیانیوں کو بھی معلوم ہوگا کہ انگریزی دورِاقتدار میں خود اسی متحدہ ہندوستان میں یہ قانون رائج ونافذ تھا کہ خواتین حقِ وراثت سے محروم تھیں، اور وراثت کی جائیداد اور زمین وغیرہ ان کے نام منتقل نہیں ہوسکتی تھی، دور کیوں جایئے! اسی انگریزی قانون کی وجہ سے میرے حقیقی دادا کی جائیداد سے میری پھوپھیاں تک محروم رہیں.... جنہیں ہندوستان کی آزادی اور قیامِ پاکستان کے بعد ان کا شرعی حصہ دیا جاسکا۔

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ قادیانیوں اور ان کے سرپرست عیسائیوں کو کبھی اس ظالمانہ قانون کے خلاف آواز اٹھانے کی بھی توفیق ہوئی؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں! تو انہیں اسلام کے عدل و انصاف پر مبنی قانون وراثت پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟

رہی یہ بات کہ اسلام نے خواتین کو وراثت میں مردوں کے مقابلہ میں آدھا حصہ کیوں دیا؟ اور اس کی کیا حکمت ہے؟ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ:

۱- مرد، عورتوں پر حاکم ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، چنانچہ اسی فضیلت کی وجہ سے مردوں کا حصہ دوہرا اور خواتین کا حصہ اکہرا ہے۔

۲-اسی کے ساتھ مردوں کے دوہرے حصہ کی وجہ یہ بھی ارشاد فرمائی گئی ہے کہ مرد، عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، جبکہ عورتیں، مردوں پر خرچ نہیں کرتیں، اس لئے مردوں کو دوہرا دیا گیا، چنانچہ ارشادالٰہی ہے:

”الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللّٰہ بعضھم علی بعض و بما انفقوا من اموالھم.“ (النساء:۳۴)

ترجمہ: ”مرد حاکم ہیں عورتوں پر، اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کئے انھوں نے اپنے مال۔“

یعنی مرد، عورتوں پر حاکم ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مرد عورتوں پر ان کی ضرورتوں کے لئے مال خرچ کرتے ہیں۔

گویا مردوں کو دوہرا حصہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ مرد کے ذمہ خرچہ نفقہ ہے اور عورت کے ذمہ کسی قسم کا کوئی نفقہ خرچہ نہیں۔

اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو عورت کو جو کچھ ملتا ہے وہ صرف اور صرف اس کا ذاتی جیب خرچ ہے اور اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو عورت کو مرد کی نسبت کہیں زیادہ ملتا ہے، اس لئے کہ خاتون جب تک نابالغ ہو، اس کا نفقہ خرچہ باپ، دادا، چچا، بھائی وغیرہ یا ان میں سے کوئی نہ ہو تو بیت المال کے ذمہ ہے، جب وہ بالغ ہو جائے اور اس کا نکاح ہو جائے، تو اس کے تمام اخراجات شوہر کے ذمہ ہو جاتے ہیں، نکاح کے موقع پر اسے جو حق مہر ملتا ہے، وہ بھی خالص اس کا جیب خرچ ہوتا ہے، اسی طرح باپ کی وفات پر اسے اپنے بھائیوں کی نسبت جو نصف جائیداد ملتی ہے وہ بھی اس کی ذاتی ملکیت اور جیب خرچ ہوگی، اگر اولاد ہو جائے اور شوہر کا انتقال ہو جائے تو شوہر کی جائیداد سے ملنے والا آٹھواں حصہ بھی اس کی ذاتی ملکیت اور جیب خرچ ہی ہوگا، اسی طرح اگر کل کلاں بیٹے یا بیٹی کا انتقال ہو جائے تو ان کی جائیداد میں سے ملنے والا چھٹا حصہ بھی اس کی جیب ہی میں جائے گا، جبکہ اسلام نے عورت کو خرچ کرنے کا کہیں بھی ذمہ دار نہیں ٹھہرایا، اس کے مقابلہ میں مرد کی ذمہ داریوں اور اخراجات کو دیکھا جائے تو وہ ہر جگہ خرچ ہی خرچ کرتا ہوا نظر آتا ہے، مثلاً: نکاح کے وقت حق مہر کی ادائیگی، بیوی کا نان نفقہ، بوڑھے والدین، چھوٹی اولاد، چھوٹے اور یتیم بہن بھائیوں، سب کا نفقہ خرچہ اس کے ذمہ اور اس کے فرائض میں شامل ہے، اب عورت کے مقابلہ میں مرد کی میراث کے دوہرے حصہ پر اعتراض کرنے والوں کو سوچنا چاہئے کہ نفع میں عورت ہے یا مرد؟ عورت و مرد کی مذکورہ بالا ذمہ داریوں کے اعتبار سے بتلایا

جائے کہ کس کا بینک بیلنس بڑھے گا؟ اور کون خرچ ہی خرچ کرتا رہے گا؟ کیا اب بھی اس تقسیم الٰہی پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق رہ جاتا ہے؟

سوال: ۹- ”حضرت محمد نے خود نو شادیاں کیں اور باقی مسلمانوں کو چار پر قناعت کرنے کا حکم دیا؟ اس میں کیا مصلحت تھی؟“

جواب: آنحضرت ﷺ کے تعدد ازواج کے مسئلہ پر عموماً یورپ کے مستشرقین اپنے تعصب، نادانی اور جہل مرکب کی وجہ سے اعتراض کیا کرتے ہیں، بلاشبہ قادیانیوں نے بھی ان سے مرعوب ہوکر ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے ان کے اعتراض کو اپنے الفاظ میں نقل کرنے کی ناپاک جسارت کی ہے، اگر قادیانیوں کا اسلام اور پیغمبر اسلام سے ذرہ بھر عقیدت کا تعلق ہوتا تو وہ ایسی دریدہ دہنی نہ کرتے، کیونکہ جس کو کسی سے محبت وعقیدت ہوتی ہے، اس کے بارہ میں وہ کسی اعتراض کے سننے کا روادار نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ جب قادیانیوں کے سامنے مرزا غلام احمد قادیانی کے اخلاق سوز کردار پر بات کی جائے تو وہ اس کے سننے کے روادار نہیں ہوتے اور اگر بالفرض ان کو مرزا جی کی کتب سے ایسے حقائق کے حوالے دکھائے جائیں تو وہ یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ حوالہ چیک کرنے کے بعد بات کریں گے۔

بہرحال قادیانیوں کے اشکال کہ: آنحضرت ﷺ کے لئے چار سے زائد شادیاں اور نکاح کیونکر جائز تھے؟ کے سلسلہ میں عرض ہے کہ:

الف: آنحضرت ﷺ کی ذات کو اپنی سطح پر رکھ کر نہیں سوچنا چاہئے کیونکہ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے امتیازی اوصاف وخصوصیات سے نوازا تھا، اگر آج کفار ومستشرقین کو آنحضرت ﷺ کی شادیوں پر اعتراض ہے، تو ان کے آباؤ اجداد اور مشرکین مکہ کو آپ ﷺ کی بشریت، نبوت، معراج اور غیر معمولی کمالات پر بھی اعتراض تھا، لہٰذا ہمارے خیال میں آنحضرت ﷺ کی شادیوں پر اعتراض کرنے والے بھی دراصل آپ ﷺ کی ذات، صفات اور کمالات کے منکر ہیں، مگر براہ راست اس کا اظہار کرنے کی بجائے یورپی مستشرقین کی زبان میں عقلی احتمالات پیش کرکے اپنی معصومیت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔

ب: جہاں تک آنحضرت ﷺ کی چار سے زائد شادیوں کے جواز کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ نے نہایت عمدہ جواب لکھا ہے اور ممکنہ اشکالات کو خوبصورتی سے حل فرمایا ہے، لہٰذا اس عنوان پر اپنی طرف سے کچھ لکھنے کی بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حضرت شہیدؒ ہی کا جواب نقل کردیا جائے، جو درج ذیل ہے:

''الغرض نکاح کے معاملہ میں بھی آپ ﷺ کی بہت سی خصوصیات تھیں اور بیک وقت چار سے زائد بیویوں کا جمع کرنا بھی آپ ﷺ کی انہی خصوصیات میں شامل ہے، جس کی تصریح خود قرآن مجید میں موجود ہے۔

حافظ سیوطیؒ ''خصائص کبریٰ'' میں لکھتے ہیں کہ: ''شریعت میں غلام کو صرف دو شادیوں کی اجازت ہے اور اس کے مقابلے میں آزاد آدمی کو چار شادیوں کی اجازت ہے، جب آزاد کو بمقابلہ غلام کے زیادہ شادیوں کی اجازت ہے، تو پھر آنحضرت ﷺ کو عام افرادِ امت سے زیادہ شادیوں کی کیوں اجازت نہ ہوتی۔''

متعدد انبیاء کرام علیہم السلام ایسے ہوئے ہیں جن کی چار سے زیادہ شادیاں تھیں، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں منقول ہے کہ ان کی سو بیویاں تھیں اور صحیح بخاری (ص:۳۹۵، ج:۱) میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سو یا ننانوے بیویاں تھیں۔ بعض روایات میں کم وبیش تعداد بھی آئی ہے۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجرؒ نے ان روایات میں تطبیق کی ہے اور وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے یہاں تین سو بیویاں اور سات سو کنیزیں تھیں۔ (فتح الباری ص:۳۶۰)

بائبل میں اس کے برعکس یہ ذکر کیا گیا ہے کہ: سلیمانؑ کی سات سو بیویاں اور تین سو کنیزیں تھیں۔ (۱-سلاطین:۱۱-۳)

ظاہر ہے کہ یہ حضرات ان تمام بیویوں کے حقوق ادا کرتے ہوں گے، اس لئے آنحضرت ﷺ کا نو ازواج مطہرات کے حقوق ادا کرنا ذرا بھی محل تعجب نہیں۔

آنحضرت ﷺ کی خصوصیات کے بارے میں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو چالیس جنتی مردوں کی طاقت عطا کی گئی تھی اور ہر جنتی کو سو آدمیوں کی طاقت عطا کی جائے گی... اس حساب سے آنحضرت ﷺ میں چار ہزار مردوں کی طاقت تھی۔ (فتح الباری ص:۳۷۸)

جب امت کے ہر مریل سے مریل آدمی کو چار تک شادیاں کرنے کی اجازت ہے تو آنحضرت ﷺ کے لئے، جن میں چار ہزار پہلوانوں کی طاقت ودیعت کی گئی تھی، کم از کم سولہ ہزار شادیوں کی اجازت ہونی چاہئے تھی۔

اس مسئلہ پر ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کرنا چاہئے کہ ایک داعی اپنی دعوت مردوں کے حلقہ میں بلاتکلف پھیلا سکتا ہے، لیکن خواتین کے حلقہ میں براہ راست دعوت نہیں پھیلا سکتا، حق

تعالیٰ شانہ نے اس کا یہ انتظام فرمایا ہے کہ ہر شخص کو چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے، جو جدید اصطلاح میں اس کی پرائیویٹ سیکریٹری کا کام دے سکیں اور خواتین کے حلقہ میں اس کی دعوت کو پھیلا سکیں... جب ایک امتی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے یہ انتظام فرمایا ہے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو قیامت تک تمام انسانیت کے نبی اور ہادی ومرشد تھے، قیامت تک پوری انسانیت کی سعادت جن کے قدموں سے وابستہ کردی گئی تھی، اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت و رحمت سے امت کی خواتین کی اصلاح وتربیت کے لئے خصوصی انتظام فرمایا ہو تو اس پر ذرا بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ حکمت وہدایت کا یہی تقاضا تھا۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت وجلوت کی پوری زندگی کتاب ہدایت تھی، آپ کی جلوت کے افعال واقوال کو نقل کرنے والے تو ہزاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین موجود تھے، لیکن آپ کی خلوت وتنہائی کے حالات امہات المومنین کے سوا اور کون نقل کرسکتا تھا؟ حق تعالیٰ شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ان خفی اور پوشیدہ گوشوں کو نقل کرنے کے لئے متعدد ازواج مطہرات کا انتظام فرمادیا، جن کی بدولت سیرت طیبہ کے خفی سے خفی گوشے بھی امت کے سامنے آگئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت وجلوت کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب بن گئی، جس کو ہر شخص ہر وقت ملاحظہ کرسکتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو کثرتِ ازواج اس لحاظ سے بھی معجزۂ نبوت ہے کہ مختلف مزاج اور مختلف قبائل کی متعدد خواتین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی سے نجی زندگی کا شب وروز مشاہدہ کرتی ہیں اور وہ بیک زبان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس وطہارت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خشیت وتقویٰ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلوص وللّٰہیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ اخلاق واعمال کی شہادت دیتی ہیں، اگر خدانخواستہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی میں کوئی معمولی سا جھول اور کوئی ذرا سی بھی کجی ہوتی تو اتنی کثیر تعداد ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی موجودگی میں وہ کبھی بھی مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی کی پاکیزگی کی یہ ایسی شہادت ہے جو بجائے خود دلیل صداقت اور معجزۂ نبوت ہے... یہاں بطور نمونہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں، جس سے نجی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس وطہارت اور پاکیزگی کا کچھ اندازہ ہوسکے گا، وہ فرماتی ہیں:

"میں نے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ستر نہیں دیکھا اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی میرا ستر دیکھا۔"

کیا دنیا میں کوئی بیوی اپنے شوہر کے بارے میں یہ شہادت دے سکتی ہے کہ مدۃ العمر انھوں

نے ایک دوسرے کا ستر نہیں دیکھا اور کیا اس اعلیٰ ترین اخلاق اور شرم وحیا کا نبی کی ذات کے سوا کوئی نمونہ مل سکتا ہے؟

غور کیجئے! کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی کے ان ''خفی محاسن'' کو ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے سوا کون نقل کرسکتا ہے؟'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل، ص:۲۷۶، ج:۹)

سوال: ۱۰- ''شریعت محمدی میں مرد اگر تین بار طلاق کا لفظ ادا کرکے ازدواجی بندھن سے فوری آزادی حاصل کرسکتا ہے تو اسی طرح عورت کیوں نہیں کرسکتی؟''

جواب: مرد اور عورت کو اللہ تعالیٰ نے مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے، چنانچہ جسمانی ساخت سے لے کر ذہنی اور فکری استعداد تک وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے جسمانی ونفسیاتی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کو اسی حساب سے تقسیم فرمایا ہے، مثلاً خواتین جسمانی اعتبار سے کمزور اور نرم ونازک ہوتی ہیں، جبکہ مرد، ان کے مقابلہ میں سخت جان اور محنت کش ہوتے ہیں، اس لئے شریعت مطہرہ اور اسلام نے خواتین کو بہت سی پُر مشقت ذمہ داریوں سے آزاد رکھا ہے، مثلاً: خواتین پر جمعہ نہیں، جماعت نہیں، جہاد نہیں، امامت نہیں، قیادت وسیادت نہیں، اور کسب معاش نہیں، اسی فطری اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے خواتین کو ماہواری آتی ہے، ان کو حمل ٹھہرتا ہے، وہ بچے جنتی ہیں، بچوں کو دودھ پلاتی ہیں، ان کی طبیعت میں مرد کی نسبت زیادہ متاثر ہونے کی استعداد وصلاحیت ہے، ان میں برداشت کا مادہ کم ہوتا ہے، ان کو غصہ بہت جلدی آتا ہے اور وہ اپنی فطری ضرورت کی تکمیل کی خاطر ماں باپ کا گھر چھوڑ کر اپنے شریک حیات کے ساتھ خوش وخرم زندگی گزارتی ہیں، وغیرہ۔ اس لئے مرد کو، قوام وحاکم اور عورت کو اس کے ماتحت اور دست نگر کا درجہ دیا گیا۔

اسلام نے ان کی انہیں فطری صلاحیتوں کے باعث ان پر کم سے کم بوجھ ڈالا ہے، چنانچہ اسلام نے خواتین کو کسب معاش کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا، بلکہ اسے گھر کی ملکہ بنایا، گھر کی چاردیواری کے معاملات اس کے سپرد فرمائے اور گھر کی چاردیواری کے باہر تمام امور مرد کے ذمہ قرار دیئے، کسب معاش مرد کی ذمہ داری ہے، خاتون کے نان، نفقہ، لباس، پوشاک، علاج معالجہ اور سکونت و رہائش کا انتظام بھی مرد کے ذمہ قرار دیا، اور ان دونوں کو ایک دوسرے کے حقوق وذمہ داریوں کی طرف متوجہ فرماکر فرمایا: ''ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف وللرجال علیهن درجة'' (البقرہ:۲۲۸) یعنی ان خواتین کے حقوق بھی اسی طرح ہیں، جس طرح ان پر مردوں کے حقوق ہیں، معروف طریقہ کے ساتھ، اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کی فضیلت حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مرد کو ہنگامۂ دنیا و بازار، تجارت، معاش، قیادت و سیادت اور حکومت و امامت کا ذمہ دار بنایا تو خواتین کو گھر میں رہتے ہوئے انسانیت سازی کا کارخانہ حوالہ کیا، اور فرمایا گیا:

”اذا صلت خمسها و صامت شهرها و احصنت فرجها و اطاعت بعلها فلتدخل من ایّ ابواب الجنة شاء ت.“ (مشکوٰۃ:۲۸۱)

یعنی عورت گھر میں رہ کر اپنے اللہ، رسول کے حقوق بجالائے، پانچ وقت کی نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے تو جنت کے آٹھوں دروازوں میں سے جس سے چاہے داخل ہوجائے۔

مگر یورپ کے مستشرقین کو عورت کا یہ اعزاز، عزت وعظمت اور سکون واطمینان برداشت نہیں، انھوں نے عورت کے حقوق کی پاسداری اور علمبرداری کی آڑ میں اس کو گھر سے نکال کر ہنگامۂ بازار میں لاکھڑا کیا، انھوں نے اس بے چاری سے اپنی فطری خواہشات تو پوری کیں، مگر اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری سے جان چھڑانے کے لئے اسے بھی بازار و کارخانہ کی راہ دکھائی۔

چنانچہ انھوں نے اپنے انہی مذموم مقاصد کی تکمیل کی خاطر عورت کو یہ راہ سجھائی کہ جس طرح ہمارا دل بھر جاتا ہے اور ہم عورت کو ٹھوکر مار کر گھر سے نکال دیتے ہیں، اسی طرح اگر عورت کا دل بھر جائے تو وہ بھی اپنی مرضی سے کسی دوسرے مرد کی راہ دیکھے، دیکھا جائے تو اس ”خیرخواہی“ کے پیچھے بھی عورت دشمنی کا یہ راز ہے کہ کل کلاں عورت کے اس دھتکارے جانے پر ہمیں کوئی مورد الزام نہ ٹھہرائے اور ہم نت نئی خاتون کو اپنی خواہش اور ہوس کا نشانہ بناتے پھریں، اس سے اپنی جنسی ضرورت پوری کریں اور اسے چلتا کردیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ و امریکہ میں زنا کو نکاح پر ترجیح دی جاتی ہے، کیونکہ نکاح کرنے کی صورت میں عورت، مرد کی جائیداد کی حق دار ہوجاتی ہے، جبکہ زنا کاری کی غرض سے ایک ساتھ رہنے میں مرد پر عورت کے کوئی حقوق نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ اس کی جائیداد میں حصہ دار ہوتی ہے، لہٰذا مرد جب چاہے اس کو دھکا دے کر فارغ کرسکتا ہے۔ کیا کبھی عورت کے حقوق کی دہائی دینے والوں نے عورت کے اس بدترین استحصال کے خلاف بھی آواز اٹھائی؟

جبکہ اسلام نے میاں بیوی کے نکاح کے بندھن کو زندگی بھر کا بندھن قرار دیا ہے، پھر چونکہ اندیشہ تھا کہ عورت اپنی فطری کمزوری، جلد بازی سے اس بندھن کو توڑ کر در، در کی ٹھوکریں نہ کھائے، اس لئے فرمایا کہ اس معاہدۂ نکاح کے فسخ کا حق مرد کے پاس ہی رہنا چاہئے، چنانچہ اس

عقد کو باقی رکھنے کے لئے خصوصی ہدایات دی گئیں اور فرمایا گیا کہ اگر خدانخواستہ خواتین کی جانب سے ایسی کسی کمی کوتاہی کا مرحلہ درپیش ہو تو مردوں کو اس عقد کے توڑنے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے؛ بلکہ دونوں جانب کے بڑے بوڑھوں اور جانبین کے اکابر و بزرگوں کو بیچ میں ڈال کر اصلاح کی فکر کرنی چاہئے، چنانچہ فرمایا گیا:

”والتی تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن فی المضاجع واضربوهن فان اطعنکم فلا تبغوا علیهن سبیلا، ان اللّٰه کان علیًا کبیرًا، وان خفتم شقاق بینهما فابعثوا حکمًا من اهله وحکما من اهلها ان یریدا اصلاحاً یوفق الله بینهما، ان اللّٰه کان علیماً خبیرا.“ (النساء:۳۵)

ترجمہ: ”اور جن کی بدخوئی کا ڈر ہو تم کو، تو ان کو سمجھاؤ اور جدا کرو سونے میں اور مارو پھر اگر کہا مانیں تمہارا تو مت تلاش کرو ان پر راہ الزام کی، بے شک اللہ ہے سب سے اوپر بڑا، اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں، تو کھڑا کرو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے، اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرادیں تو اللہ موافقت کردے گا ان دونوں میں، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے۔“

ہاں اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ عورت کا اس مرد کے ساتھ گزارا نہ ہو سکے یا شوہر ظلم و تشدد پر اتر آئے تو ایسی صورت میں عورت کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ اسلامی عدالت یا اپنے خاندان کے بزرگوں کے ذریعہ اس ظالم سے گلوخلاصی کرا سکتی ہے۔

اس ساری صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس میں عورت کی عزت، عصمت اور عظمت کے تحفظ کو یقینی بنانا مقصود ہے، کیونکہ نکاح کے بعد مرد کا تو کچھ نہیں جاتا، البتہ عورت کے لئے کئی قسم کی مشکلات کھڑی ہو سکتی ہیں، مثلاً: خود اس کا اپنا بے سہارا ہو جانا، اس کے بچوں کی پرورش، تعلیم، تربیت، ان کے مستقبل اور اس کے خاندان کی عزت و ناموس کا معاملہ وغیرہ، ایسے بے شمار مسائل، اس بندھن کے ٹوٹنے سے کھڑے ہو سکتے ہیں، اور ان تمام مسائل سے براہِ راست عورت ہی دوچار ہوتی ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ عورت کو اس بندھن کے توڑنے کا اختیار نہ دیا جائے، تاکہ وہ ان مشکلات سے بچ جائے۔ بتلایا جائے کہ یہ عورت کی خیرخواہی ہے یا بدخواہی؟

مگر ناس ہو یورپ اور مستشرقین کی اندھی تقلید کا! کہ اس نے اپنے ذہنی غلاموں کو ایسا متاثر کیا کہ وہ ہر چیز کو ان کی عینک سے دیکھتے ہیں اور اسی زاویۂ نگاہ سے اسلامی احکام پر نقد و تنقید کے

نشتر چلاتے ہیں۔

بلاشبہ مرزائیوں کا یہ اعتراض بھی میرے خیال میں اپنے آقاؤں کی اندھی تقلید کا نتیجہ ہے، ورنہ شاید وہ بھی اپنی خواتین کو حق طلاق دینے کے روادار نہیں ہوں گے، اگر ایسا ہوتا تو ان کی عورتیں کب کی ان پر دوحرف بھیج کر جاچکی ہوتیں۔

آخر میں ہم خواتین کے حق طلاق کا مطالبہ کرنے والوں سے یہ بھی پوچھنا چاہیں گے کہ اگر آپ ہی کی طرح کا کوئی عقل مند کل کلاں یہ اعتراض کر بیٹھے کہ:

۱- اللہ میاں نے مردوں کی داڑھی بنائی ہے تو عورتوں کو اس سے کیوں محروم رکھا؟

۲- عورت اور مرد کے جنسی اعضا مختلف کیوں ہیں؟

۳- ہر دفعہ خواتین ہی بچے کیوں جنتی ہیں؟ مردوں کو اس سے مستثنیٰ کیوں رکھا گیا؟

۴- بچوں کو دودھ پلانے کی ذمہ داری عورت پر کیوں رکھی گئی؟

۵- عورت ہی کو حیض ونفاس کیوں آتا ہے؟

۶- حمل اور وضع حمل کی تکلیف مردوں کو کیوں نہیں دی گئی؟

تو بتلایا جائے کہ آپ ان سوالوں کا کیا جواب دیں گے؟ یہی ناں کہ یہ مردوں اور خواتین کی جسمانی ساخت اور فطری استعداد کا نتیجہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس کو جیسی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، اسی کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ فرمایا ہے۔

بالکل اسی طرح خواتین کے حقِ طلاق کے مطالبہ کا بھی یہی جواب ہے کہ جس ذات نے عورت اور مرد کو پیدا فرمایا ہے، اس نے ان کی صلاحیتوں اور جسمانی ساخت کے پیش نظر ہر ایک کے فرائض بھی تقسیم فرمائے ہیں، اس لئے اگر مردوں کے بچے نہ جننے، حمل، وضع حمل، رضاعت اور ان کو حیض ونفاس نہ آنے پر قادیانیوں اور ان کے روحانی آباؤاجداد یورپی مستشرقین کو کوئی اعتراض نہیں، تو مردوں کے حقِ طلاق پر انہیں کیونکر اعتراض ہے؟

❁ ❁ ❁

پانچویں قسط:

سلاطین ہند کے عہد میں غیر مسلموں کی شرعی حیثیت

از: محمد شمیم اختر قاسمی
ریسرچ اسکالر شعبہ سنی دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اورنگ زیب عالم گیر اور غیر مسلم

پورے مسلم حکمرانوں میں سب سے زیادہ تیموری حکمراں اورنگ زیب عالم گیر پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے اپنی حکومت میں شدت پسندی سے کام لے کر غیر مسلموں کو طرح طرح سے معتوب ورسوا کیا، حکومت کے عہدے ومناصب سے انھیں محروم رکھا اور نا منصفانہ طریقے سے جزیہ وصولی کا حکم جاری کیا۔ دراصل اس قسم کے اعتراضات والزامات اورنگ زیب پر اس لیے لگائے جاتے ہیں کہ اس نے بڑی کوشش کی کہ سلطنت کو اسلامی رنگ میں ڈھالا جائے اور سارے امور قوانین اسلام کی روشنی میں انجام پائیں۔ جس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ تاہم یہ کام اس کے لیے آسان بھی نہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ہندوستان میں اسلام کے تجدید واحیا کی بات نکلے گی تو اورنگ زیب کا نام نامی ضرور لیا جائے گا، جیسا کہ علامہ اقبال کی رائے بیان کرتے ہوئے علی میاں لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں اسلام کے تجدید واحیاء کی بات نکلی تو علامہ نے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور سلطان اورنگ زیب کی بڑی تعریف کی اور فرمایا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ اگر ان کا وجود اور ان کی جدوجہد نہ ہوتی تو ہندو تہذیب وفلسفہ اسلام کو اپنے اندر تحلیل کر لیتے۔''

غور کیا جا سکتا ہے کہ دہلی سلطنت کے زوال کے بعد باقاعدہ اور منظّم حکومت مغلوں کی قائم ہوئی۔ بابر اور ہمایوں کو ہندوستان میں اپنے قدم جمانے میں کافی وقت لگا، لیکن اکبر کو طویل مدت تک حکومت چلانے کا موقع ملا، مگر اس طویل مدت میں اس نے یا اس کے عہد میں اسلام کو جو

نقصان پہنچا اس کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جاسکتی۔ جہاں گیر بھی کسی حدتک اپنے باپ کے طور طریقے اور رسم ورواج پر عامل رہا۔ البتہ شاہ جہاں بادشاہ نے دین وشریعت کو فروغ دینے کی ضرور کوشش کی جس کی بنا پر وہ حامی اسلام کہلانے کا مستحق ہوا۔ پھر بھی اس زمانے میں اسلام کو پوری تقویت نہ مل سکی، کہ اسی کسمپرسی کے عالم میں اورنگ زیب عالم گیر نے بڑی کوڑ دھور کے بعد سلطنت تیموری پر قابض ہوا۔ چوں کہ وہ شروع سے دینی مزاج کا حامل تھا، اس لیے اس نے سال جلوس کے دوسرے سال ہی اس نے جو فرمان صادر کیے اس میں زور دیا کہ ہندوستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہو اور لوگوں کی زندگی قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگ۔

غیر مسلموں کے ذمے سلطنت کے عہدے اور مناصب

جہاں تک غیر مسلموں کو عہدے ومناصب سے الگ تھلگ رکھنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ترک سلاطین کے یہاں نسلی وخاندانی برتری کا تصور بہت تھا اور خاص کر دہلی سلطنت کے ابتدائی زمانے میں حکومت کے مزاج میں یہ تصور کافی پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس وقت انتظامیہ کے اہم عہدوں پر تقرری ہندنژاد مسلمانوں کے مقابلہ میں ترک نژاد اشخاص کو ترجیح دی جاتی تھی، اس لیے اس معاملہ میں ہندوؤں کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کیا گیا اسے اس صورت حال کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔ باوجود اس کے اس عہد میں حکومت کی انتظامیہ میں شمولیت ہندوؤں کی بہت تھی۔ مثلاً محکمہ مالیات بالخصوص محاصل کے شعبہ میں ان کی بھرتی ہوتی رہی۔ خراج اور دوسرے محاصل کی تحصیل میں ہندو سردار اور مقامی روسا کا عمل دخل زیادہ رہا۔ خود سلطان فیروز شاہ کے محافظی دستہ میں راجپوت شامل تھے اور اس دستہ کا سربراہ بھی ایک ہندو تھا۔ اسی طرح سرکاری ٹکسال کا افسر اعلیٰ ہندو ہی تھا۔

یہ امر بھی ملحوظ رکھا جائے بعض سلاطین کے عہد میں زبان کی ناواقفیت کی بنا پر سلطنت کے عہدے اور سرکاری امور ان کے ذمے نہ سپرد کیے جانے کی ایک اہم وجہ تھی، لیکن مسلم بادشاہوں نے اس کی تلافی کے لیے غیر مسلموں کو فارسی زبان سکھانے کا بندوبست کیا تاکہ وہ ملازمتوں میں حصہ پاسکیں اور حکومت کے کاموں میں شریک ہوسکیں، جس کی واضح مثال یہ ہے کہ:

”جب سلطان سکندر لودھی نے دیکھا کہ اہل کاران وعہدیداران میں ہندو نظر نہیں آتے تو اس نے ہندوؤں کو ان کا یہ حق دینا چاہا، مگر معلوم ہوا کہ ہندو فارسی زبان

سے بالکل ناواقف ہیں اور اس وقت کوئی ہندو بھی ایسا نہیں جو فارسی جانتا ہو۔ چنانچہ سلطان نے سب سے پہلے برہمنوں کو بلاکر ان سے فارسی پڑھنے کو کہا۔ انھوں نے اپنی مذہبی ضروریات اور مصروفیتوں کے پیش نظر انکار کردیا۔ پھر چھتریوں سے کہا گیا، مگر یہ فوجی زندگی ہی کو اپنے لیے سربلندی کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ انھوں نے بھی اظہار مجبوری کیا، ویش قوم کے لوگ تجارت سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، یہ خدمت مذہباً ان پر فرض تھی وہ بھی اس ذمہ داری کو قبول نہ کرسکے۔ اعلیٰ قوموں میں کایستھوں نے فارسی کو اپنے عروج کا ذریعہ بنایا اور فارسی پڑھنے پر آمادہ ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے فارسی زبان سیکھ کر مسلمانوں کے عہد سلطنت میں زبردست عروج حاصل کیا اور بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے علوم میں اتنی دستگاہ بہم پہنچائی کہ ان علوم کا درس دینے لگے۔

چوں کہ اس زمانہ تک سرکاری زبان فارسی ہوگئی تھی اور تمام دفتری کام اسی زبان میں انجام پاتے تھے، زبان کی ناواقفیت کی بنا پر غیرمسلم سرکاری عہدوں میں نہیں تھے۔ باوجود سلطان سکندر ایک کٹر مذہبی انسان ہونے کے اسے یہ فکر دامن گیر ہوئی ہندو بھی ہماری رعایا ہے اس لیے زبان دانی کے مسئلہ کو حل کرکے حکومت کے امور اور عہدے ان کے سپرد کیے جائیں۔ کسی بادشاہ وقت کو اپنی رعایا کے لیے اتنی فکر ہو اسے کیوں کر فراموش کیا جانا چاہیے۔

باوجود اس رواداری کے اسے بھی ایک کٹر اور سنی مسلمان کے خانہ میں شامل کرکے اسے ہندوکش اور متعصب قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے مندر مسمار کیے جس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ کروکشتر کے تالاب میں ہندو بکثرت جمع ہوتے اور اشنان کرتے۔ سکندر نے چاہا کہ اس کنڈ کو تباہ کرکے اس اجتماع کو روک دے۔ اس زمانہ کے ایک عالم مولانا عبداللہ سے استفسار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ قدیم رسم کو روکنا اور قدیم بت خانہ کو منہدم کرنا بالکل جائز نہیں، سکندر کو یہ جواب پسند نہ آیا، وہ سمجھا کہ طرف داری کا فتویٰ ہے۔ اپنی برہمی کا اظہار کیا، لیکن انھوں نے بڑی جرأت اور صفائی سے فرمایا کہ میں نے شریعت کا مسئلہ بیان کردیا، اگر شریعت کی پروا نہیں تو پھر پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس جواب کے بعد سلطان نے اپنا ارادہ ترک کردیا۔

جزیہ توہین آمیز ٹیکس ہرگز نہیں:

جو حضرات صرف جزیہ کو لے کر یا انہدام منادر کو لے کر غیرمسلموں کی طرف داری کرتے

ہوئے یہ آواز بلند کرتے ہیں کہ ان افعال سے ہندو مسلمانوں کی بہ نسبت پست اور کمزور ہوگئے ان کی سماجی اور معاشی حیثیت گھٹ گئی۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ محمد بن قاسم کے بعد سے ہندوستان میں جب تک مسلمانوں کی حکومت رہی صرف تین سلاطین کے عہد میں جزیہ کی وصولی ہوئی۔ ورنہ بیشتر سلاطین کے عہد میں ان پر سے یہ بوجھ جو شرعی نوعیت کا تھا ہٹا رہا۔ باوجود اس کے تینوں سلاطین کے عہد میں غیرمسلم بخوشی جزیہ ادا کرتے رہے اور اپنے آپ کو کسی بھی طرح کا کمتر شہری تصور نہ کرتے تھے۔ حالانکہ تمام سلاطین کے عہد میں شریعت کا دارومدار اور اس کی افہام و تفہیم کی ساری ذمہ داری علماء کے ذمہ سپرد تھی اور وہ شریعت کی روشنی میں اس کا نفاذ بھی کرنے کے خواہاں تھے، مگر کسی سلاطین نے سیاسی مفاد کے تحت اس کو نافذ نہیں کیا۔ چنانچہ سید صباح الدین کا یہ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیا جائے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس ٹیکس کی وصولی سے غیرمسلموں کو کیا کیا فوائد حاصل ہوئے:

> ''اسی طرح جزیہ کو ایک توہین آمیز ٹیکس سمجھا جاتا ہے اور یہ محض اس لیے کہ سلاطین اور علماء دونوں نے اس کے روشن پہلو کی وضاحت پوری طرح نہیں کی۔ جزیہ دراصل اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو اسلامی حکومت اپنی غیرمسلم رعایا سے اس خدمت کے معاوضہ میں وصول کرتی ہے کہ وہ ان کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حقوق کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ اس ٹیکس کے لینے کے بعد حکومت ہر طرح سے ذمیوں کے جان و مال کی نگرانی کرتی تھی اور ایسا کرنا اس کے مذہبی فریضہ میں داخل تھا اور جو حکومت ان کی حفاظت کرنے سے قاصر رہتی اس کو جزیہ وصول کرنے کا حق نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ کسی عالم یا فقیہہ نے جزیہ کا کچھ اور مطلب بتایا تو یہ اس کا قصور ہے، ٹیکس کا نقص نہیں۔ علماء کے اصرار کے باوجود مسلمانوں کے پورے دور حکومت میں صرف تین حکمرانوں علاء الدین خلجی، فیروز تغلق اور اورنگ زیب کے عہد میں یہ ٹیکس لگایا گیا اور اس زمانہ میں یہ ٹیکس اتنا اشتعال انگیز نہیں سمجھا گیا جتنا اب طرح طرح کی موشگافیوں سے سمجھا جانے لگا ہے۔ اس زمانے کے تمام راجہ اس کو اور ٹیکسوں کی طرح ایک ٹیکس سمجھ کر ادا کردیا کرتے تھے اور کسی حال میں وہ اپنے کو کمتر درجہ کا شہری تسلیم نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ اب یہی بتایا جاتا ہے کہ ٹیکس غیرمسلموں کو سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے ہٹا کر گری ہوئی حالات میں

رکھنے کے لیے عائد کیا جاتا تھا۔ مگر جب ہاتھ میں تلوار موجود تھی تو ایسا کرنے کے لیے ٹیکس لگانے کی کیا ضرورت تھی اور ایسے مورخ کی کوئی وقعت نہیں ہوگی جو یہ تسلیم نہ کرے کہ ملک گیری کے سلسلے میں مسلمانوں کی تلوار تو خوب چمکی لیکن ملک داری میں ان کی تلوار ہمیشہ نیام میں رہی، وہ میدان جنگ میں خواہ کیسی ہی خوں ریزی کرتے لیکن جنگ کے بعد معتدل روش اختیار کرلیتے؛ کیوں کہ ملک کی زراعت اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی، اونچے عہدے دار تو مسلمان ضرور تھے لیکن دوسرے تمام عہدے ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہوتے تھے، کیوں کہ ان کی مدد کے بغیر حکومت کا ڈھانچہ کھڑا نہیں ہوسکتا تھا۔ اور اگر ان کے ساتھ رواداری سلوک نہ کیا جاتا تو تھوڑی تعداد اور قلیل فوج کی مدد سے ہر جگہ مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔''

❁ ❁ ❁

بقیہ افتتاحیہ اجلاس ششم مجلس عاملہ

مدارس اسلامیہ کے تحفظ وترقی اور ان کو درپیش مسائل ومشکلات کے حل سے حضرۃ المرحوم کو خاص دلچسپی تھی، مدارس کی تعمیر وترقی سے ان کو بے حد لگاؤ تھا۔ رابطہ مدارس اسلامیہ عربیہ دارالعلوم دیوبند کے قیام واستحکام میں ان کے نمایاں کردار کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے انھوں نے ملک وملت کی تعمیر وترقی، مسلمانان ہند کے حقوق کی بازیابی، امن وسلامتی کے استحکام، فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام، بابری مسجد کی بازیابی، مسلم پرسنل لاء کے تحفظ، مکاتب اسلامیہ کے قیام وانتظام، مدارس اسلامیہ اور اوقاف کی حفاظت وصیانت وغیرہ کے سلسلہ میں ان کی زریں خدمات کے لازوال نقوش تاریخ ہند کی پیشانی پر ہمیشہ ثبت رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات اور کارناموں کو قبول فرمائے، اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو مدارس اسلامیہ کے تحفظ اور تعمیر وترقی کے لیے باہمی مشورے اور غور وخوض کے ذریعہ مفید اور نتیجہ خیز فیصلوں تک پہنچنے اور درپیش مسائل ومشکلات کے ازالے کے لیے جامع لائحۂ عمل تیار کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

❁ ❁ ❁

نو فیصد شرح ترقی - نٹھاری - نوئیڈا اور انسانیت کی منزل

از: ڈاکٹر اجمل فاروقی
۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

''انڈیا چمک رہا ہے'' ہماری G. D. P. 9.2% کے حساب سے ترقی کررہی ہے۔ ہماری بچت 28% ہوگئی ہے، ۱۵- ارب ڈالر کا بیرونی سرمایہ ہمارے یہاں ایک سال میں لگایا گیا ہے۔ لوگ ہوٹلوں میں کھانا کھارہے ہیں۔ ہوائی جہازوں میں سفر کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ کاروں، A. C. کی بکری بڑھ رہی ہے۔ اندرونِ ملک و بیرون ملک ہندوستانی سیاحوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ شاپنگ ہال کھل رہے ہیں۔ اگلے ۴۵ سالوں میں امید ہے کہ ہماری اقتصادیات امریکی اقتصادیات کے برابر ہوجائے گی۔

اور یہ بھی ہمارے یہاں ہی ہورہا ہے

۱- نٹھاری میں جو شرمناک اور بربریت انگیز حرکت سامنے آئی ہے وہ نوئیڈا کے لئے نئی نہیں ہے۔ ۳۰؍ جولائی ۲۰۰۶ء کو ایک ٹی. وی چینل نے اسی نوئیڈا کے سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر اجے اگروال، کروکشیتر کے ڈاکٹر سریش بھولا اور بریلی کے ڈاکٹر اروندا گروال کے خلاف اسٹنگ آپریشن کیا۔ خبر کے مطابق یہ لوگ کروکشیتر کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں بچوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر انہیں بھیک مانگنے کے لائق بناتے تھے۔ ڈاکٹر اگروال پیسہ لے کر بھکاری بنانے کا کام کافی عرصہ سے کررہے تھے۔ (امراجالا ۳۰/۷/۲۰۰۶ء)

۲- پنجاب کے پٹیالہ ضلع کے پٹران قصبہ کے صاحب نرسنگ ہوم کے پیچھے ایک کنویں سے اسقاط شدہ جنین کی بڑی تعداد میں دستیابی ہوئی ہے۔ پچھلے تین ماہ میں ۳۵-۳۰ ضائع شدہ جنین وہاں پولیس کو مل چکے ہیں۔ نرسنگ ہوم کے مالک ڈاکٹر پریتم سنگھ اور اس کی بیوی ''امرجیت کور'' کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ آگے تفتیش جاری ہے۔ (11/8/06 Toi)

۳- ملک میں فروخت ہونے والی 20% دوائیں نقلی ہوتی ہیں۔ نقلی دواؤں کا کاروبار چار ہزار کروڑ تک پہنچ گیا ہے اس کے کاروبار میں ایک سال میں ایک ہزار کروڑ کی ترقی ہوئی ہے۔ یہ اطلاع انڈین چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے تازہ جائزہ میں بتائی گئی ہے۔ جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ 60% نقلی دوائیں ایسی ہوتی ہیں جن میں دوا، بالکل ہی نہیں ہوتی 19% غلط اجزاء سے بنتی ہیں اور 16% میں ٹیلکم پاؤڈر جیسے نقصان دہ مواد شامل ہوتے ہیں۔ جبکہ اس جرم پر نگاہ رکھنے کے لئے گاؤں سے لیکر دہلی تک لاکھوں لوگوں کا سرکاری کوالیفائڈ انسپکٹروں اور ڈاکٹروں کا عملہ متعین ہے۔ (ہندوستان ایکسپریس ۱۱/۱/۲۰۰۷ء)

۴- سنامی کی ہلاکت خیزیوں نے بھی انسانی ضمیر کو جگانے میں کامیابی حاصل نہیں کی چنئی کے شمال میں ارناوورگاؤں میں وہاں کے ماہی گیروں نے پیٹ پالنے کیلئے اپنے جسم کے قیمتی اعضاء کی فروخت کا سہارا لیا کیونکہ ان کی آبادیوں کو سمندر نے نگل لیا تھا اور ان کے پاس ماہی گیری کیلئے کچھ بچا نہیں تھا۔ چنئی پولیس کے سربراہ نے بتایا کہ اب تک ۱۰۰ کے لگ بھگ معاملات سامنے آئے ہیں جن میں زیادہ تر خواتین ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے ڈاکٹروں کے ساتھ مل کر یہ کام کیا۔ زیادہ تر نے اپنے گردے Rs 40000 - Rs 60000 میں فروخت کئے جبکہ ان سے وعدہ ایک لاکھ سے زیادہ کا کیا گیا تھا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۷/۱/۲۰۰۷ء)

مذکورہ بالا دونوں رخ ہماری تصویر کے ہی ہیں۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیا اس چمک اور کالکھ میں کوئی رشتہ ہے؟ ایک ہی سماج کی بیک وقت دو متضاد تصویریں بھیانک، انسانیت کش، انسانیت سوز تصویریں کیوں ابھر رہی ہیں۔ ایک ہی سماج میں ایک ہی طرح کے لوگ بڑے لوگ، اعلیٰ تعلیم یافتہ، ڈاکٹر، وکیل، سرمایہ دار، مذہبی رہنما، سرکاری عملہ کے اعلیٰ افسران۔ لگتا ہے گلوبلائزیشن، مادہ پرستی اور خدا بیزاری کے نتیجہ میں انسان ہونے کی سطح سے نیچے اتر آئے ہیں۔ دولت کی فراوانی ہمیں لگاتار نشہ میں بدمست کر رہی ہے۔ اور ہر نو دولتیا اپنے آپ کو مختارِ کل سمجھ رہا ہے، قانون سے اوپر سمجھ رہا ہے اور بے خوف ہے۔ اس کی تصدیق اُن لاتعداد واقعات سے ہوتی ہے جب انتہائی قیمتی گاڑیوں میں بیٹھ دھنا سیٹھوں کے بالغ نابالغ بچے، فٹ پاتھ پر سوتے بدقسمت محروموں کو روندتے چلے جاتے ہیں یا سڑک پر چلتی دوشیزاؤں کو اٹھا کر گاڑیوں میں ڈال کر شہروں کی سڑکوں پر ان کی عزتوں اور عصمتوں سے کھلواڑ کر کے کاروں سے دھکا دے دیتے ہیں۔ جیسے کہ آج کے ۲۰۰ سال پہلے کے جاگیرداروں اور نوابوں کے لئے مشہور تھا وہ آج ترقی یافتہ ۲۱ ویں صدی میں پڑھے لکھے، ماڈرن، روشن خیال لوگ کر رہے ہیں۔ اکیلی راجدھانی دہلی میں سال نو کی ہڑدنگ بازیوں کے موقع پر ۲۰۰

لوگوں کی گرفتاری گہرے ہوتے اندھیرے کا پتہ دیتی ہے اور یہاں پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا ہم واقعی ترقی کررہے ہیں؟ کیا یہی خوشحالی ہے جس کا خواب ہم آنے والی نسلوں اور محروموں کو دکھاتے ہیں؟ کیا ہم واقعی مہذب ہورہے ہیں؟ جو کچھ ہورہا ہے اس کے اسباب وذرائع پر بار بار بحث کی ضرورت ہے تاکہ ہم ہمارا سماج ہماری سرکار اور اس کے چلانے والے اپنے رویہ، خیالات اور ترجیحات پر نظر ثانی کریں۔ مگر آگے بڑھنے سے پہلے ایک تصویر کے ایک اور اہم رخ کی طرف بھی دھیان دلانا چاہتا ہوں جو فی الحال بحث کا موضوع نہیں ہے مگر بحث سے بہت زیادہ متعلق ہے وہ یہ کہ صرف معاشی اور اقتصادی لحاظ سے بھی یہ تیز رفتار ترقی کی پٹری ہر ایک پر مہربان نہیں ہے۔ یہ بھی ہندوستان کے خوشحال اور اعلیٰ متوسط طبقہ پر ہی مہربان ہے۔ باقی کو تو صرف جھوٹن Tichledown effct ہی مل رہا ہے۔ آج بھی ہندوستان کی آبادی کا 5% تقریباً خالی پیٹ سوتا ہے وہ Rs 19/= روزانہ پر زندگی گذارتا ہے اس سے بھی بڑی تعداد Rs 45/= سے کم کے زمرہ میں آتی ہے۔ کروڑوں بیمار، معذور بغیر علاج کے مرجاتے ہیں۔ لاکھوں حاملہ عورتیں دوران وضع حمل بغیر علاج کے مرجاتی ہیں۔ صرف ایک مہینہ میں ہندوستان کے ایک چھوٹے علاقہ میں دو کسان یومیہ (ماہانہ) ۶۲ کے حساب سے خودکشی کی۔ سال ۲۰۰۶ء میں .... میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد 1050 تھی، لاکھوں بچے اسکولوں کے بجائے سڑکوں، ڈھابوں، گھروں اور ریلوے اسٹیشنوں کا رخ کرتے ہیں تاکہ پیٹ کی آگ بجھا سکیں۔ اس چکا چوند کی مار میں کروڑوں بیٹیاں جہیز کی بڑھتی مانگ کو پورا نہ کرسکنے اور اتنی لمبی، گوری اور Stylish نہ ہوسکنے کی وجہ سے گھروں میں گھٹ رہی ہیں جتنی لمبی، گوری، Stylish ہندی، انگریزی کے اخباروں، T.V اور میگزینوں کے صفحات اور اسکرین پر دکھائی جاتی ہیں۔ ان محروم، بھوکے، مجبور انسانوں کے جذبات، خواہشات اور امنگوں کے بھڑکانے کے تمام لوازمات موجود ہیں مگر ان کی تسکین کا کوئی سامان نہیں اور ہے تو وہ متمول طبقہ کی جھوٹن اور اترن کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ایک تصویر اور بھی ہے جو اس چمک کو دھندلا کرتی ہے وہ ہے اس ترقی کی قیمت جو ہم بین الاقوامی سیاست میں ادا کررہے ہیں کہ وہ طاقتیں جو اس وقت دنیا کے نظام پر حاوی ہیں وہ ناراض نہ ہوجائیں اور ہم پالے میں صحیح طرف کھڑے ہوں یعنی مضبوط مقابل کے حمایتی کے طور پر تاکہ ہمیں بھی انعام ملے۔ چاہے وہ بیرونی سرمایہ کاری کا ٹکڑا ہو، بیرونی ٹھیکوں کا ٹکڑا ہو، ٹکنالوجی کی مدد کا ہو یا اپنی مارکیٹ کھولنے کا ٹکڑا ہو۔ ہم لگاتار اپنی خودداری، انا اور غیر جانبداری کا سودا کررہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ خودداری، عزت نفس اور اخلاقی برتری مفت میں نہیں ملتی اس کی بھی قیمت ہوتی ہے جو ہمارے حکمراں

اعلیٰ ذات طبقہ کے مفاد میں نہیں ہے وہ حقیقت پسندی کے نام پر اسے خام خیالی، احمقوں کی جنت اور خوابوں کی دنیا بتاتا ہے کہ تعمیر چمک دمک (شاپنگ مال، پانچ ستارہ ہوٹل، سیاحوں سے بھرے عریاں مناظر والے ساحل سمندر) کے خالی پیٹ اخلاقیات اور گاندھی گیری کا نعرہ دینے میں مزہ کیا ہے؟

اب تھوڑا تفصیل سے اِس بحث کی طرف چلتے ہیں جو نفس مضمون سے سیدھا تعلق رکھتی ہے وہ یہ کہ ہمارے سماج میں خوشحالی، خوشی، عزت اور کامیابی کا معیار کیا ہے؟ ان معیارات کا موجد اور مبلغ کون ہے؟ کیا یہ معیارات انسانیت کی حقیقی ترقی، کامیابی اور خوشحالی کے ضامن ہیں؟ ان معیارات کے حصول کی قیمت انسانیت کیا ادا کر رہی ہے یہ بھی دیکھا جانا ضروری ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ گلا کاٹ تہذیب کی فکری بنیاد یوروپ نے عیسائیت کے جبر کے ردعمل کے طور پر رکھی اور یہ کہا کہ دنیا میں اصل چیز مادّہ اور عقل ہے۔ عقل کے بہترین استعمال سے مادّہ کو استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ ترقی اور موج مستی حاصل کرنا ہی انسانیت کا مقصد ہے۔ اور جو بھی بات ماورائے مادّہ ہے یا غیر محسوس اور غیبی ہے وہ جھوٹ اور بکواس ہے وہ انسانوں کو بہکانے اور انہیں ٹلانے کا ڈھکوسلہ ہے۔ اسی فکر نے پورے مغرب میں پچھلے ۳۰۰ سالوں میں پرورش پائی اور اس کے نتیجہ میں مادی کامیابیاں حاصل کیں اور اِسی مغرب نے ان مادّی کامیابیوں کے بل بوتے پر مشرق کو غلام بنایا، ذہنی غلامی بھی اور جسمانی غلامی بھی۔ اور جیسا کہ یہ فطری قانون ہے کہ غالب اور طاقتور کی بات، عقیدہ، تہذیب سب کچھ غالب ہوتی ہے سو جسمانی آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی غلام قوموں کی ذہنی غلامی نہیں گئی کیوں کہ تب تک ظالم آقاؤں نے اپنی تعلیم اور تہذیب کے نظام کے ذریعہ ایک پوری نسل کو جو حکمراں اور غالب تھی اپنے قبضہ میں کرلیا۔ جس طبقہ کی سوچ اپنے آقاؤں سے بھی زیادہ گہری ہوئی اور محدود و خود غرضانہ تھی۔ اور کم و بیش یہی طبقہ آج تمام ترقی پذیر ممالک میں حکمراں اور غالب ہے۔ جو تہذیب یہ بتاتی ہے کہ یہ دنیا ہی سب کچھ ہے یہاں جو برت لیا، حاصل کرلیا، بھگت لیا وہ ہی تمہارا ہے اور کل کیا ہے کسی نے دیکھا ہے؟ تو لازماً ایسا ماحول پورے سماج میں بنتا ہے جو بچہ بچپن سے پیدا ہوتا ہے اس کے کان میں ہوش سنبھالنے کے بعد یہی آواز پڑتی ہے کہ خوب پڑھو خوب پیسہ کماؤ تو موج کروگے آرام سے رہوگے وہ آنکھ کھولتے ہی دیکھتا ہے کہ ہر طرف مادّہ کی چمک ہے۔ ممّی صبح تیار ہوکر آیا کو سمجھا کر بن ٹھن کر باہر چلی گئیں پاپا کو تو جانا ہی تھا واپسی میں ممّی خوبصورت کھلونا یا قیمتی چاکلیٹ لے آئیں اور پاپا بھی لے آئے اس طرح صبح سے شام تک کی قربت، ممتا اور محبت کے عوض چند مادّی چیزیں اس کی جھولی میں ڈال دی جاتی ہیں۔ اگر دولت مند ہے تو ایسا ہے اور اگر غریب ہے تو بھی ماں کی ممتا سے محروم اور بدلہ میں پیٹ بھر کھانا بھی نہیں ملتا، ٹافی، چاکلیٹ اور قیمتی کھلونے تو

دور کی باتیں ہیں۔عمر کے بڑھنے کے ساتھ اسکول، کالج، معاشرہ، اخبار اور اسکول کے نصاب، ٹیچروں کی زندگیاں ان کی تہذیب اُن کی مخلصانہ مادہ پرستانہ ترجیحات اور تشویق کی روزانہ خوراکیں ہماری نئی نسل کو جو کچھ بنارہی ہیں وہی تصویریں ہیں جو ہم نٹھاری نوئیڈا B.M.W. کیس، جسیکا لال قتل کیس، شوانی بھٹناگر قتل کیس، گردوں کی خرید وفروخت قابل ڈاکٹروں کے ذریعہ اوراعلیٰ طبقہ کی خواتین کے ذریعہ جسم فروشی اور جسم کی عریاں نمائش کے بدلے دولت حاصل کرنے کی شکل میں ظاہر ہورہی ہے۔یہ دراصل پورے معاشرے کی پلائی گئی اُس گھُٹی کا مجموعی اثر ہے جو پیدا ہونے سے بلوغت تک کثیر مقدار میں معاشرہ کا ہر ادارہ یا حصہ پلاتا ہے۔جس میں خاص طور سے میڈیا اور نظامِ تعلیم وتفریح بہت اہم رول ادا کررہے ہیں۔جو نئی نسل اور پوری نوع انسانی کو انسانی ساخت اور فطرت میں پوشیدہ شیطانی خواہشوں اور ترغیبات کو دن رات اکسارہی ہیں اور پھیلارہی ہیں۔اللہ رب العالمین نے جس کا دعویٰ کیا ہے کہ ”کیا وہی نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا؟(الـمـلـك)“ہمیں اپنی ہدایت میں بتادیا ہے کہ ”لوگوں کے لئے مرغوباتِ نفس- عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، جانور اور زرعی زمینیں- بڑی خوش آئند بنادی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چندروزہ زندگی کے سامان ہیں حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ اللہ کے پاس ہے(آل عمران:۱۴)اس حقیقت کو اللہ رب العالمین نے مختلف انداز سے بار بار ذہن نشین کرایا ہے کہ دنیا کی زندگی کے بظاہر عیش وآرام انسانوں کو مرغوب اور محبوب بنادیئے گئے ہیں اور انسانوں میں اللہ نے شیطانی اور رحمانی دونوں صفات بھی رکھ دی ہیں۔اوران کی طرف رہنمائی کے لیے کتاب ورسول کا نظام پیدا کیا۔اب انسانوں کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے اندرکون سی صفات اورکون سی راہ کا انتخاب کرتے ہیں۔اللہ نے ارشاد فرمایا:”ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا ہم نے اسے راستہ دکھادیا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔(الدہر:۲)

شیطان انسانوں سے جھوٹے وعدہ کرتا ہے انہیں جھوٹی امیدیں دلاتا ہے۔شیطان کے محبوب ترین ہتھکنڈوں کے بارے میں اللہ نے اپنے بندوں کوخبردار کیا ”اے لوگو جو ایمان لائے ہوشیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔اس کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ اسے فحش اور بدی کا ہی حکم دے گا۔“(النور:۲۱)”اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہ شراب، جوا، آستانے، پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں ان سے پرہیز کرو امید ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگی۔شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان عداوت اور دشمنی ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد اور نماز سے روک دے پھر کیاتم اِن چیزوں سے باز رہوگے؟(المائدہ:۹۱)

جب یہ تعلیمی نظام یہ ذرائع ابلاغ یہ معاشرہ اس کی تہذیب، ادب سب کچھ انسان کو دن رات زیادہ سے زیادہ صارف Consumer بنانے پر آمادہ ہے۔ اس معاشرہ میں اسی کی قیمت ہے جو زیادہ قوت خرید رکھتا ہے اوراس کا اظہار کرسکتا ہے۔ اس معاشرہ میں دن رات گلا کاٹ مقابلہ پیدا کیا جارہا ہے کہ ''اس کی قمیص میری قمیص سے اُجلی کیوں'' تو انسان کو سکون کیسے ملے گا؟ دنیا میں عیش وآرام کے جتنے مظاہر ہیں اچھا لباس، اچھا گھر، سواری، خوردونوش، سالانہ تفریحی سفر یہی کل کائنات ہے زندگی کا مقصد یہی ہے۔ انہیں کے حصول میں آج انسان گود سے گور تک پریشان ہے۔ اور سکون کسی کو نہیں ہے۔ آج خوشحالی اور ترقی کا پیمانہ کیا ہے؟ معاشرہ میں بجلی کی کھپت فی کس کتنی ہے؟ پٹرول کی فی کس کھپت کتنی ہے، پانی کی فی کس کھپت کتنی ہے؟ تیل گھی کی پروٹین کی وغیرہ وغیرہ کھپت کتنی ہے؟

اس لئے آج معاشرہ ہر چیز کو مادّہ سے تولتا ہے کوئی بھی کام کرنے میں یا نہ کرنے میں کیا مادی فائدہ یا نقصان ہوگا یہ محرک ہمارے ہر کام کے پیچھے ہوتا ہے۔ بوڑھے ماں، باپ، رشتہ دار، ساس سسر کی خدمت کیوں کی جائے؟ جائیداد تو ملنی ہی ہے۔ معذور، مجبور، غریب پر دولت کیوں لگائی جائے؟ لندن سے خبر ہے کہ وہاں نگہداشت بزرگاں اب ایک انڈسٹری بن گئی ہے اوراس انڈسٹری کے بڑے حصہ کو بنگلور میں منتقل کردیا گیا ہے۔ کیونکہ یہاں کم خرچ پر زیادہ خدمات مل جاتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اہل خانہ زندہ ہیں مگر ان کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ ان کے لئے وقت فارغ کرسکیں۔ اس تہذیب نے ہم کو یہی بتایا ہے کہ زندگی موج مستی کا نام ہے جس طرح حاصل کرسکتے ہو کرو۔ اور موج مستی کے لیے پیسہ چاہیے وسائل چاہئیں اور وہ صرف جائز ذرائع سے نہیں حاصل ہوسکتے۔ اس لئے سماج میں بدعنوانی، رشوت خوری، لوٹ مار، جھوٹ، فریب، اغوا اور نہ جانے کیا کیا فروغ پاتا ہے۔ اوراس دریا میں ہر ایک غوطہ لگانے کو مجبور ہوتا ہے کیونکہ سماج میں نکوّ بننے کا دباؤ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ اسے سماج کی اکثریت برداشت نہ کرکے اسی ریلہ میں بہہ کر شیطانی ایجنڈہ کا شکار ہوجاتی ہے۔ آج کل خاص طور سے .T.V نے جس طرح انسانی فطرت میں پوشیدہ شیطانیت کو ابھارنے کا سیاہ کارنامہ انجام دیا ہے اسے ہر کس وناکس محسوس کررہا ہے۔ خاص طور سے اشتہاروں اور سیریل نے انسانوں کو ارذل ترین مخلوق بنانے اور اشیاء وسیکس کا غلام بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں ۶۰ سالوں میں صاف پانی، بیت الخلاء، اسکول، ہسپتال اور سواری کی سہولت نہیں پہنچی ہیں وہاں شیطان کے ایجنٹوں نے جنسی اور مادّی بھوک بڑھانے کے لئے .T.V صرف ۱۵؍سالوں میں پہاڑ، میدان، جنگل، گاؤں، جھگی جھونپڑی ہر جگہ پہنچادیئے۔ اوراس طرح انسانوں کی دوڑ دھوپ، ترجیحات، پسند ناپسند، اچھا برا، مقصد زندگی سب کو

اپنے مطابق ڈھال دیا ہے۔اور انسان بیچارہ بری طرح پس رہا ہے۔وہ اپنے ضمیر کو کچل رہا ہے وہ اپنی فطرت سے بغاوت کرر ہا ہے وہ انسان کے اعلیٰ مقام سے گر کر حیوانوں کی طرح اپنی خواہشات کو دوسروں کی قسمت پر پورا کرر ہا ہے۔اور کہہ رہا ہے کہ انسانیت ترقی کر رہی ہے،خوشحالی آرہی ہے۔ حالانکہ پورا انسانی معاشرہ اس کی قیمت ادا کرر ہا ہے۔کہیں بھی سکون چین واطمینان نہیں ہے۔جو ممالک سب سے زیادہ امیر ہیں''خوش'' رہنے کے عالمی سروے میں اُن کا مقام بہت نیچے ہے۔کم دولت مند ممالک کے لوگ زیادہ خوش ہیں۔پھر ہمیں یہ بھی سوچنا ہوگا کہ ہماری یہ موج مستیاں کب تک کے لیے ہیں؟ کیا ہم ہمیشہ جوان رہیں گے؟ اگر رہیں گے تو بھی کیا ہمیشہ زندہ رہیں گے؟ اِن سب سوالات کے جوابات نفی میں ہیں دولت، جوانی، بنگلہ، کار، عیش عیاشی سب وقتی ہیں موت سب کا خاتمہ کردے گی پھر عارضی وقتی موج مستی کے لیے اور وہ بھی جو پورے انسانی معاشرہ کو نہیں مل سکتی بلکہ اکثریت کی قیمت پر معمولی اقلیت ہی موج مستی کو حاصل کرسکتی ہے تو انسانیت کیوں نہ اپنے لئے اعلیٰ اور لامتناہی کامیابی کے حصول کو اپنا مقصد زندگی بنائے۔تاکہ دنیا میں سبھی انسان پرامن پرسکون زندگی گذار سکیں۔وہ زندگی جو ظلم، حرص، حوس، لالچ، حسد سے پاک ہو۔جس میں اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے لیے بھی احترام اور انصاف موجود ہو۔اللہ رب العالمین نے اس کے حصول کے لیے انسانوں کو دعوت دی ہے''خوب جان لو یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی ہے۔اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال واولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات دیکھ کر کاشت کار خوش ہوگئے پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہوگئی پھر وہ بھس بن کررہ جاتی ہے۔اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور خوشنودی ہے۔دنیا کی زندگی ایک دھوکہ کے سوا کچھ نہیں۔دوڑ واور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان وزمین جیسی ہے۔ جوکہ مہیا کی گئی ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں۔(الحدید: ۲۱-۲۰) کیونکہ دنیا کی زندگی اور یہاں کے وسائل محدود ہیں اور انسان کی آرزوئیں اور خواہشیں لامحدود ہیں ان کو پورا کرنے کے لیے ایسا جہاں درکار ہے جہاں زمان، مکان اور وسائل بھی لامحدود ہوں۔وہ جہانِ آخرت ہی جس کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کا شوق اللہ نے یوں دلایا ہے''جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔''(المطففین:۲۶)

❋ ❋ ❋

حیدرآباد کی مکہ مسجد میں بم دھماکہ

مہتمم دارالعلوم مولانا مرغوب الرحمن کا مذمتی بیان

دیوبند:۱۹رمئی ۲۰۰۷ء

حیدرآباد میں ۱۸رمئی بروز جمعہ چار مینار علاقے کی تاریخی مکہ مسجد میں ہوئے بم دھماکے میں جولوگ جاں بحق ہوئے یا جوزخمی ہوئے اور جن میں بچے بھی شامل ہیں اس پراپنی شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن نے ملک میں فرقہ وارانہ امن کو شدید نقصانات پہنچانے والی اس حکمت عملی کی مذمت کی اوراس کومنصوبہ بند سازش کا ایک حصہ بتایا۔آپ نے مرحومین کے خاندان والوں سے اظہارتعزیت کیا اور زخمی افراد سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کے لئے دعائے صحت کی۔آپ نے حکومت سے اپیل کی کہ مرحومین اور زخمی افراد کے خاندان والوں کومعقول معاوضہ ادا کیا جائے۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے فرمایا سال گذشتہ ستمبر میں مہاراشٹر کے حساس شہر مالیگاؤں کی جامع مسجد میں بم دھماکے ہوئے تھے اس سے بھی پہلے مہاراشٹر میں جالنا اور پربھنی قصبات میں مسجدوں کونشانہ بنایا گیا تھا۔پچھلے سال اپریل میں دلی کے علاقہ جامع مسجد میں بم دھماکہ یہ سب ایک منصوبہ بند سازش کا ہی حصہ ہیں۔مولانا نے فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک میں لاء اینڈ آرڈر کے بغیر ترقی کا خواب کیسے پورا ہوگا اور حکومت کیوں آنکھوں پر پٹی چڑھائے ہوئے ہے۔

مولانا مرغوب الرحمٰن نے اپنے بیان میں حکومت سے کہا کہ وہ محض دلی،مغربی بنگال،ممبئی میں ہائی الرٹ پراکتفا نہ کرے بلکہ تفتیش کے بعدان سازشوں کا پردہ فاش کرے اوراس روایتی اندازِفکر سے گریز کرے کہ اس کے درپردہ محض دہشت گرد تنظیموں کا ہاتھ ہے۔

جاری کردہ: دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

شمارہ: ۷	جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ مطابق جولائی ۲۰۰۷ء	جلد: ۹۱

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ۔ ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۰ روپئے، سالانہ -/۱۰۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۶۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۱۲۵ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۵۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411077577 *(EDITOR)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman, Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P. Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

صفحہ	نگارش نگار	نگارش	نمبر شمار
۳	حبیب الرحمٰن اعظمی	حرفِ آغاز	۱
۸	رشید احمد فریدی	حدیث اربعین اور اربعینات کا تعارف	۲
۱۹	مولانا ابوالخیر سید حمد اللہ بختیاری	''امام اعظم اور تصوف'' (ایک اجمالی مطالعہ)	۳
۲۲	ذاکر اعظمی/الریاض	اسلامی اعتدال پسندی کا امریکی معیار: ایک چشم کشا رپورٹ	۴
۲۹	ریحان ظفر صدیقی	شیر میسور ٹیپو سلطان شہیدؒ کے کارنامے	۵
۳۳	مولانا سعید احمد جلال پوری	قادیانیت کا مکروہ چہرہ!	۶
۴۴	مولانا شوکت علی قاسمی بستوی	دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم اور نظام تعلیم و تربیت	۷

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

آج کل امریکہ اور اس کی ہم نوا حکومتیں اور خبر رساں ایجنسیاں اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح بڑے شد و مد سے استعمال کررہی ہیں اسلام دشمن یہ طاقتیں اپنے اس بے بنیاد اور غلط پروپیگنڈہ کے ذریعہ عالمی برادری کو یہ باور کرانا چاہتی ہیں کہ عصر حاضر میں امن عالم کے لیے سب سے بڑا خطرہ اسلام اور اسکے پیرو مسلمان ہیں، افسوس و حیرت تو اس پر ہے کہ اہنسا کا پجاری ہندوستان اپنے حکمرانوں کی غلط سوچ کی بناء پر آج امریکہ و اسرائیل کی اسلام مخالف سرگرمیوں میں ان کا ہم نوا اور شریک کار بن گیا ہے۔ جبکہ امریکہ اور اسرائیل کے جارحانہ رویے اور عالمی برادری پر اپنی بالادستی جتانے کیلئے اپنے سے کمزور ملکوں کے خلاف بغیر کسی معقول وجہ کے سفاکانہ اقدامات کے پیش نظر کوئی منصف مزاج اور حقیقت پسند انھیں دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد یقین کیے بغیر نہیں رہ سکتا، رہا آزاد ہندوستان کی حکومتوں اور اس کے اہل مناصب اور کارپردازوں کا معاملہ تو ملک کی اقلیتوں اور کمزور طبقوں کے خلاف ان کے ظلم و جبر اور دہشت گردیوں کی داستان بڑی طویل ہے، جہاں حکومتوں کے زیر سایہ تیس ہزار سے زائد مسلم کش فسادات ہوچکے ہیں جن میں نہ جانے کتنے زندہ انسانوں کو نذر آتش کردیا گیا، نہ جانے کتنے معصوم بچوں اور کمزور عورتوں کو تہہ تیغ کردیا گیا اور دہشت گردی کا ایسا کھلا مظاہرہ کیا گیا کہ دنیا چیخ پڑی، مگر ان اسلامی دہشت گردی کا رونا رونے والوں کی آنکھ تک نہ پسیجی، دہشت گردوں کا یہ ٹولہ اپنے جرائم سے دنیا کی نگاہیں پھیرنے کی غرض سے اسلامی دہشت گردی کا واویلا مچارہا ہے اور اپنے سرکاری ذرائع کی بناء پر ملک میں جب بھی کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے اسے مذہب اسلام اور قوم مسلم سے جوڑ دیا

جاتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا دہشت گردی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے، بلکہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے تو بیجا نہیں ہوگا کہ دنیائے مذاہب میں دہشت گردی کا سب سے بڑا مخالف اگر کوئی مذہب ہے تو وہ اسلام ہی ہے۔

کیونکہ ادیان وملل کی طویل فہرست میں اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس کی ہر چیز میں دہشت ووحشت کی بجائے شفقت ورحمت نمایاں ہے اس کا خدا ''رب العالمین'' تمام عالم کا پالنے والا ہے ''رحمٰن ورحیم'' ہے اس کے خدا کی تمام صفتوں میں رحمت ورافت غالب ہے، اس کی آسمانی کتاب قرآن حکیم میں تین سو سے زائد آیتوں میں صفت رحمت کا ذکر ہے حتیٰ کہ اس کتاب مقدس کی ابتداء ہی اسم ذات اللہ کے بعد رحمٰن ورحیم سے ہوتی ہے۔ جس میں صاف لفظوں میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ ''کَتَبَ رَبّکم عَلٰی نَفْسِہٖ الرَّحْمَۃَ'' تمہارے رب اور پالنہار نے اپنے اوپر رحمت ثبت کرلی ہے۔

جس کی صلائے عام ہے کہ خدائے رؤف ورحیم کے قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں اوراس کے احکام کے توڑنے والوں کو بھی اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیے: ''قُلْ یٰعِبَادِیَ الذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِہِمْ لاَ تَقْنَطُوا مِن رَحْمَۃِ اللّٰہ اِنَّ اللّٰہ یَغْفِر الذُنوبَ جمیعًا اِنَّہٗ ھو الغَفُور الرَّحِیْمُ'' اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اعلان کردیجئے کہ میرے جن بندوں نے نافرمانی کرکے اپنے اوپر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں بیشک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے بلاشبہ وہی بخشنے والا رحمت والا ہے۔

ایک حدیث پاک میں اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں کی تعبیر ان الفاظ میں کی گئی ہے: ''رحمتی سبقت علی غضبی'' (میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے) پہاڑ کے برابر گناہ بھی رحمت خداوندی کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

مذہب اسلام کا رسول اور ہادی وپیغمبر بھی ''رحمت للعالمین'' اور سراسر رحمت وشفقت ہے اللہ پاک کا ارشاد ہے: ''وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَۃً للعالمین'' ہم نے آپ کو تمام عالم کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''انا نبی الرحمۃ، انا رسول الرحمۃ'' میں نبیٔ رحمت اور رسول رحمت ہوں، ایک اور حدیث میں فرمایا گیا: ''انا رحمۃ مھداۃ'' میری ذات سراپا رحمت ہے جو خلق خدا کو منجانب خدا بطور عطیہ مرحمت کی گئی ہے۔

مذہب اسلام دشمنوں کے ساتھ بھی بے انصافی کو پسند نہیں کرتا اور جادۂ انصاف پر قائم

رہنے کی تاکید کرتا ہے: "یا ایُّها الذین آمنوا کونوا قوامین لِلّٰہِ شُهداء بِالقسطِ ولا یجرمنّکم شنآنُ قومٍ علیٰ الّا تعدلُوا اِعدلُوا هُو اقربُ لِلتّقوٰی واتّقوا اللّٰه اِنّ اللّٰه خبیرٌ بما تعملُونَ" اے ایمان والو آمادہ رہو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی، اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو، انصاف کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے اور اللہ سے ڈرتے رہو اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔

مذہب اسلام کی امن پسندی اور عفوودرگذر کا یہ عالم ہے کہ وہ ذاتی معاملات میں انسانی نفسیات کا لحاظ کرکے اگرچہ مظلوم کو اس کا حق دیتا ہے کہ وہ چاہے تو برابر کا بدلہ لے لے، لیکن اسی کے ساتھ عفوودرگذر کو بدلہ لینے سے بہتر قرار دیتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو اس پر اجروثواب کی بشارت دیتا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے: "وجزاء سیّئةٍ سیّئةٌ مثلُها فمن عفا واصلح فاجرُه علی اللّٰهِ انّه لایُحبُّ الظّالِمین" اور برائی اور ظلم وزیادتی کا بدلہ ویسے ہی برائی ہے، لیکن جو شخص معاف کردے اور صلح وصفائی کرلے تو اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا: "وَاِنْ عاقبتُم فعاقِبُوا بمثل ما عُوقِبتُم بِهٖ ولئِن صبرتُم لهُوَ خیرٌ لِلصابِرین" اور اگر تم پر سختی کی گئی تو تم بھی ویسی ہی سختی کرلو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی، اگر تم صبر سے کام لو تو وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔

نبی رحمت ﷺ کا پاک ارشاد ہے: "لا تکونوا امّعة تقولون : ان احسن الناس احسنّا، وان ظلموا ظلمنا، ولکن وطنُو انفسکم، ان احسن الناس ان تحسنوا وان اساؤا فلا تظلموا" تم دوسروں کی دیکھا دیکھی عمل نہ کرو کہ یوں کہنے لگو اگر لوگ ہمارے ساتھ بھلائی کریں تو ہم بھی ان کے ساتھ بھلائی کریں اور اگر لوگ ہمارے ساتھ ظلم کا برتاؤ کریں تو ہم بھی ان پر ظلم کریں بلکہ تم اپنے آپ کو اس بات پر قائم رکھو کہ اگر لوگ بھلائی کریں تو تم بھی بھلائی کرو اور اگر لوگ براسلوک کریں تب بھی تم ظلم نہ کرو۔

خود نبی کریم ﷺ کا طرز حیات یہ تھا کہ ما انتقم رسول الله صلی الله علیه وسلم لنفسه فی شيء قط اِلّا ان تنتهك حرمة اللّٰه فینتقم بها للّٰه" آپ ﷺ نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، البتہ جب اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کا ارتکاب کیا جاتا تو آپ

صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا حکم ٹوٹنے کی وجہ سے سزا دیتے تھے۔

چنانچہ سیر کی کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک اجنبی مہمان آیا، آپ نے اسے کھانا کھلایا اور سونے کا انتظام بھی فرمادیا وہ شخص بدنیتی و دشمنی کے ساتھ آپ کے یہاں آیا تھا، چنانچہ صبح سویرے بستر پر غلاظت کرکے قبل اس کے کہ لوگ بیدار ہوں اٹھ کر چلا گیا صبح کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خبرگیری کو آئے اور بستر پر غلاظت دیکھی تو اپنے دست مبارک سے اسے دھویا پھر دیکھا کہ وہ شخص جاتے ہوئے اپنی تلوار وہیں بھول گیا ہے، کچھ دور جاکر اسے اپنی تلوار یاد آئی تو آہستہ آہستہ واپس آیا کہ ابھی لوگ سورہے ہوں گے میں تلوار لے کر واپس چلا جاؤں گا، مگر اس نے دیکھا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مبارک ہاتھوں سے بستر کو صاف کررہے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسے دیکھا تو بجائے اس کے کہ اس کی اس ناپسندیدہ حرکت پر اسے ڈانٹیں یا دھمکائیں نہایت نرمی سے فرمایا تم اپنی تلوار بھول گئے تھے، یہ رکھی ہے لے لو آپ کے اس سلوک کریمانہ پر وہ بیساختہ پکار اٹھا اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمدا رسول اللہ“ یہ ہے اسلام کی تعلیم اور ہادیٔ اسلام کا طرز عمل۔

اسلام ظلم وتشدد کو ایک لمحہ کے لیے بھی روا نہیں رکھتا، اس کے نزدیک ظلم وتشدد سے انسانی فطرت مسخ ہوجاتی ہے، معاشرہ تباہ ہوجاتا ہے اور دنیا ویران ہوجاتی ہے اس لیے قرآن حکیم میں عدل وانصاف کی توصیف وتعریف سے کہیں زیادہ ظلم کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ قرآن کے نزدیک ظالم ہدایتِ الٰہی سے محروم ہوجاتا ہے: ”وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ عَذَابًا اَلِیْمًا“ ہم نے ظلم کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب تیار کررکھا ہے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”اتقوا الظلم فان الظلم ظلمات یوم القیامة“ ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن اندھیرا ہوجائے گا، ایک حدیث میں ارشاد ہے: ”اتقوا من دعوة المظلوم فانھا لیس بینھا و بین اللہ حجاب“ مظلوم کی بددعا سے بچو کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں، چنانچہ حدیث پاک کے مفہوم کو کسی نے یوں نظم کیا ہے:

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از در حق بہر استقبال می آید

اسلام کے نزدیک ساری مخلوق اللہ کی ایک کنبہ ہے اور سب کے ساتھ بھلائی کا حکم دیتا ہے الخلق کلھم عیال اللہ فاحب الخلق عند اللّٰہ من احسن الی عیالہ ساری مخلوق اللہ کا

کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے پیاری وہ مخلوق ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ اسلام سارے انسانوں کو انسانیت کے رشتہ سے بھائی مانتا ہے اور ان کو بھائیوں کی طرح باہمی اتحاد و اتفاق کے ساتھ رہنے کی تلقین کرتا ہے: ”لا تقاطعوا و لا تدابروا و لا تباغضوا و لا تحاسدوا و کونوا عباد اللّٰہ اخوانا“ ایک دوسرے سے تعلقات نہ توڑو، ایک دوسرے سے منھ نہ پھیرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور خدا کے بندو بھائی بھائی بن جاؤ۔

انسان تو انسان ہیں اسلام جانوروں کو بھی ایذا، پہنچانے اور تکلیف دینے کی بتاکید ممانعت کرتا ہے۔ آنحضرت ﷺ بیان فرماتے ہیں کہ ایک عورت کو محض اس بنا پر عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ کر اس کا کھانا پینا بند کر دیا تھا، جس سے وہ مرگئی، جانوروں پر شفقت کی یہ انتہا ہے کہ غصہ اور جھنجھلاہٹ میں بھی انھیں کوسنے اور ان پر لعنت بھیجنے تک کی ممانعت ہے۔ اسلام کی ہدایت ہے کہ جو جانور جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس سے وہی کام لینا چاہیے۔

غرضیکہ اسلام کی تعلیمات واحکامات سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ ایک دین رحمت ہے اسلام میں ظلم و جبر، دہشت گردی اور جارحیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے جو لوگ اسلام دشمنی میں اس کی جانب دہشت گردی کو منسوب کرتے ہیں ان کا یہ رویہ بجائے خود ایک دہشت گردی ہے، اس لیے انھیں اپنے اس ناروا رویے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

❁ ❁ ❁

حدیث اربعین اور اربعینات کا تعارف

از: رشید احمد فریدی
مدرسہ مفتاح العلوم، تراج، سورت

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین الذی خلق الانسان فی اطوار الاربعین والصلوۃ والسلام علی من بعث علی رأس الاربعین وعلی من صحبه وتبعه باحسان الی یوم الدین.

جمع وحفاظتِ قرآن مجید کے بعد احادیث نبویہ اور سنن رسول اللہ ﷺ کے جمع وضبط، حفاظت وصیانت پر جن احوال وظروف اور ارشاداتِ خاتم الانبیاء نے صحابہ کرام اور تابعین عظام کو آمادہ کیا ہے اُن میں اُن بشارتوں کا بھی ایک خاص مقام ہے جن کی وجہ سے علمائے امت کیلئے صحرائے احادیث کے سنگ پاروں اور بحر آثار کے قطروں کو محفوظ کرنا ایک اہم علمی وظیفہ اور دینی خدمت بن گیا۔ مثلاً نضّراللّٰہ عبدًا سمع مقالتی فحفظها و وعاها واداها الخ، اور نضّر اللّٰہ امرأ سمع منّا شیئا فبلّغه کما سمع الخ ، اور من حفظ علی امتی اربعین حدیثا من امر دینها بعثه اللّٰہ یوم القیامة فی زمرة الفقهاء والعلماء. وغیرہا۔

نبیٔ رحمت ﷺ نے چالیس حدیثوں کے حفظ ونقل پر جو عظیم بشارت دی ہے اس کے پیش نظر خیر القرون سے اب تک بے شمار لوگوں نے احادیث کی حفاظت کی اور زبانی یا تحریری طریقہ سے دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کیا، چنانچہ فن حدیث کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ کتب احادیث کے اقسام میں محدثین نے ایک خاص قسم ''اربعینات'' بھی ذکر کی ہیں اِن اربعینات کا تعارف پیش کرنے سے قبل مذکورہ بالا حدیث اربعین کے کچھ متعلقات ذکر کرنا مناسب اور مفید ہوگا۔

یہ حدیث امام محی الدین ابوزکریا یحیٰی بن شرف نووی رحمہ اللہ کے بقول کئی صحابہ کرام حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، معاذ بن جبلؓ، انس بن مالکؓ، ابوہریرہؓ، ابوسعید خدریؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ وغیرہم سے مختلف الفاظ کے ساتھ کئی طرق سے مروی ہے۔ حضرت

ابوالدرداءؓ کی روایت میں ”کنتُ له یوم القیامة شفیعًا و شهیدًا“ ہے۔ ابن مسعودؓ کی روایت میں ”قیل له اُدخُلِ الجنة من اَیِّ ابوابِ الجنة شِئتَ“ آیا ہے۔ ابن عمرؓ کی روایت میں کُتِب فی زمرة العلماء و حُشِر فی زمرة الشهداء“ منقول ہے۔ اور ابوسعید خدریؓ کی روایت میں ”اَدخَلتُه یوم القیامة فی شفاعتی“ وارد ہے۔ نیز بعض روایت میں ”اربعین حدیثا من السنة، یا مِن سنتی“ کا لفظ ہے۔ اور بعض میں ”من حفظ علی امتی“ کے بجائے ”من حمل مِن امتی“ کا لفظ پایا جاتا ہے۔ (جامع الصغیر للسیوطی، الاربعین للنووی)

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث تیرہ (۱۳) صحابہ کرام سے وارد ہوئی ہے۔ ابن جوزیؒ نے اپنی کتاب علل میں اُن تمام کی تخریج کی ہے، اور امام منذری نے اس حدیث پر مستقل رسالہ تصنیف کیا ہے اور میں نے املاء میں اس کی تلخیص کی ہے ایک جزء میں حدیث کے تمام طرق کو جمع کیا ہے۔ (فیض القدیر، ج:۶،ص:۱۵۵)

علامہ عبدالرؤف مناوی صاحب فیض القدیر حدیث کے الفاظ مختلفہ کے مابین جمع و تطبیق یا حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اربعین کے حفظ کرنے والے قیامت کے دن مختلف المراتب ہوں گے بعضوں کا حشر زمرۂ شہداء میں اور بعضوں کو علماء میں اور بعض کو بحیثیت فقیہ و عالم اٹھائیں گے اگرچہ وہ دنیا میں ایسا نہیں تھا۔ (شرح اربعین لابن دقیق العید)

فقیہ ابواللیث سمرقندی نے بستان العارفین میں حضرت جابرؓ کی روایت سے حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ چالیس حدیثوں کو اگر کوئی ازبر (حفظ) کرلے تو یہ اس کے حق میں چالیس ہزار درہم صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔ اور بعض روایت میں یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حدیث کے بدلے قیامت کے دن اسے نور عطا فرمائیں گے۔ (بستان،ص:۱۰۴)

حدیث اربعین کا حکم

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے جامع الصغیر میں بحوالہ ابن النجار اس حدیث کو نقل کرکے اس پر صحیح کی علامت لگائی ہے البتہ محققین کا اتفاق ہے کہ یہ خبر اپنے جمیع طرق کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ قال ابن حجر ... ثم جمعت طرقه فی جزء لیس فیها طریق تسلم من عِلة قادحة. (فیض القدیر)

و اتفق الحفاظ علی انه حدیث ضعیف و ان کثرت طرقه. (اربعین للنووی)

مگر چونکہ فضائل میں عمل بالضعیف درست ہے خصوصاً جبکہ کثرت طرق وغیرہ امور سے

حدیث میں قوت آجاتی ہے۔ وقد اتفق العلماء علی جواز العمل بالحدیث الضعیف فی فضائل الاعمال (اربعین للنووی) قال ابن عساکر الحدیث روی عن علیؓ ... وابی سعیدؓ باسانید فیھا کلھا مقال لیس للتصحیح فیھا مجال لکن کثرۃ طرقہ تقوّیہ (فیض القدیر، ج:۶،ص:۱۵۴) یہی وجہ ہے کہ فضیلت وثواب کی تحصیل اور سعادت اخروی کے حصول کی خاطر علمائے امت نے اربعین پر اتنی تصنیفات وتالیفات کی ہیں کہ لا تُعد ولا تُحصٰی.

تنبیہ: متقدمین ومتأخرین اصحابِ حدیث کا عمل بالحدیث الضعیف کے جواز پر قولاً اتفاق اور خیرالقرون سے اب تک بغیر فترت کے ہر زمانہ میں علماء کا اس عظیم بشارت کے پیش نظر حدیث اربعین کا حفظ ونقل یا تصنیف وتالیف پر عملاً اجماع ایک مسلّم حقیقت ہے اس تواتر عملی اور اجماعِ قولی کے مقابل غیر مقلدین کا نظریہ اوران کا شور وشغب کہ ''فضائل میں بھی ضعیف حدیث پر عمل جائز نہیں ہے'' لا یُعبأبہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ آفتاب عالم تاب کے سامنے ٹمٹماتا چراغ کا وجود سچ پوچھئے تو خوداس کی ذات کیلئے باعث شرمندگی ہے پس اہل حدیث ہونے کا دعویٰ کرنے والے (غیر مقلدین) اگرحدیث میں فہم صحیح کی اہلیت اور عمل بالحدیث کی لیاقت پیدا کرکے سبیل المومنین یعنی اہل السنۃ والجماعۃ کی طرح حقائق کوتسلیم کرتے ہیں تو یہ ان کے حق میں نفع ہے اور آخرت میں سودمند ہوگا۔ ورنہ کہیں سبیل المومنین سے روگردانی اور کنارہ کشی اللہ کی ناراضگی کا سبب بن کر غضبِ الٰہی کا ذریعہ نہ بن جائے۔

عمل بالاربعین کی لطیف صورت

علامہ مناوی فرماتے ہیں کہ اربعین کا پہلا عدد ۱ رُبع عشر ہے پس جس طرح حدیثِ زکوٰۃ ربع عشر بقیہ مال کی تطہیر پر دلالت کرتی ہے اسی طرح ربع عشر پر عمل بقیہ احادیث کو غیر معمول بہا ہونے سے خارج کردیتا ہے۔ چنانچہ بشر حافیؒ فرماتے تھے اے اصحاب حدیث ہر چالیس میں سے ایک حدیث پر عمل کرلو۔ (شرح اربعین لابن دقیق العید)

امام نووی فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے اِس سلسلہ میں عبداللہ بن مبارکؒ نے تصنیف کی ہے پھر محمد بن اسلم طوسی عالم ربانی نے پھر حسن بن سفیان نسائی نے اور امام ابوبکر آجری، ابوبکر اصفہانی، دارقطنی، حاکم، ابونعیم اور ابوعبدالرحمٰن سلمی وغیرہم متقدمین ومتأخرین کی بڑی تعداد نے تصنیف کی ہے۔ نیز ہر ایک کے اغراض ومقاصد مختلف اور طرز انتخاب بھی جداگانہ ہے کسی نے

اصولِ دین کے مضمون کو بنیاد بنایا، کسی نے فروعی مسائل سے تعرض کیا۔ کسی نے جہاد میں حصہ لیا تو کسی نے زہد اختیار کیا۔ اور کسی نے آداب زندگی کو مطمح نظر رکھا تو کسی نے خطبہ کو موضوع بنایا۔ بعض نے اختصار وایجاز کا طریق اختیار کیا تو بعض نے جوامع الکلم کو ظاہر وروشن کیا۔ بعض نے صحتِ احادیث کا التزام کیا تو بعض نے حَسن وضعیف روایت کو بھی جگہ دی۔ حتی کہ بعض نے صرف اس کا اہتمام کیا کہ احادیث طعن وقدح سے سالم ومحفوظ ہو خواہ کسی بھی مضمون سے متعلق ہو۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ بعضوں نے جدت طرازی، غرابت پسندی اور تلون مزاجی کا بھی ثبوت دیا ہے جس سے پڑھنے والوں کو علمی بالیدگی، ذہنی نشاط اور قلبی انشراح کا ہونا ظاہر ہے تاکہ سنت پر عمل کا داعیہ پیدا ہو غرضیکہ جس نے بھی امت کی نفع رسانی کیلئے چالیس احادیث اُن تک پہنچائی اور خود بھی دین پر قائم اور عمل پیرا رہا وہ ان شاء اللہ اس فضیلت کا مستحق ہوگا۔ (فیض القدیر، ج:۶، اربعین نووی)

صاحب کشف الظنون علامہ مصطفیٰ بن عبداللہ معروف بکاتب چلپی متوفی ۱۰۶۷ھ نے حضرت عبداللہ بن مبارک سے اپنے زمانہ تک کے مشاہیر علماء میں سے تقریباً ۷۵ علماء کی نوّے (۹۰) سے زائد اربعینات کا ذکر کیا ہے ان میں سے یہاں چند کا تعارف ان کی مختلف الجہتہ موضوع کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) اربعین لابن المبارک المتوفی ۱۸۱ھ: امام نووی فرماتے ہیں کہ میرے علم کے مطابق یہ پہلی اربعین ہے جو تصنیف کی گئی ہے۔

(۲) اربعین لابی بکر البیہقی: امام ابوبکر شمس الدین احمد بن حسین الشافعی البیہقی متوفی ۴۵۸ھ کی تصنیف ہے اس میں سو احادیثِ اخلاق کو ۴۰؍ابواب پر مرتب فرمایا ہے۔

(۳) اربعین الطائیہ: ابوالفتوح محمد بن محمد بن علی الطائی الہمدانی متوفی ۵۵۵ھ کی ہے اس میں مصنف نے اپنی مسموعات میں سے چالیس حدیثیں چالیس شیوخ سے املا کرائی ہیں اس طرح پر کہ ہر حدیث الگ صحابی سے ہے پھر ہر صحابی کی سوانح حیات ان کے فضائل اور ہر حدیث کے فوائد مشتملہ، الفاظ غریبہ کی تشریح اور پھر چند مستحسن جملے ذکر کئے ہیں اس کتاب کا نام اربعین فی ارشاد السائرین الی منازل الیقین رکھا بقول علامہ سمعانیؒ کتاب بہت خوب اور عمدہ ہے جس کا تعلق علوم حدیث، فقہ ادب اور وعظ سے ہے۔

(۴) اربعینات لابن عساکر: ابوالقاسم علی بن حسن الدمشقی الشافعی متوفی ۵۷۱ھ نے کئی اربعین لکھی ہیں: (۱) اربعین طوال، (۲) اربعین فی الابدال العوال، (۳) اربعین فی الاجتہاد فی

اقامۃ الحدود، (۴) اربعین بلدانیہ۔ اربعین طوال میں چالیس ایسی طویل حدیثیں جمع کی ہیں جو نبیٔ اکرم ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی اور صحابہ کرام کے فضائل کو بھی بتلاتی ہیں۔ ساتھ ساتھ ہر حدیث کی صحت وسقم کو بھی ظاہر کیا ہے۔

(۵) اربعین بلدانیہ: ابوطاہر احمد بن محمد السّلفی الاصبہانی متوفی ۵۷۶ھ نے چالیس حدیثیں چالیس شیوخ سے چالیس شہروں میں جمع کی ہیں۔ ابن عساکر نے ان کی اتباع میں ایسی بھی ایک اربعین لکھی اور اس پر یہ اضافہ کیا کہ وہ حدیثیں چالیس صحابہ کرام سے چالیس بابوں میں ذکر کیا۔ چونکہ ہر حدیث کے مالہ وماعلیہ پر کلام بھی کیا ہے اس سے ہر باب گویا مستقل کتابچہ بن گیا ہے۔

اربعین بلدانیہ اور بھی بہت سے محدثین نے لکھی ہیں۔

(۶) اربعین فی اصول الدین: امام فخرالدین محمد بن عمر الرازی متوفی ۶۰۶ھ نے اس کو اپنے فرزند محمد کے لئے تالیف کیا تھا جسے علم کلام کے چالیس مسائل پر مرتب کیا ہے۔

(۷) الاربعین فی اصول الدین: ابوحامد محمد بن محمد الغزالی متوفی (...) کی ہے جو تصوف کے مسائل پر مشتمل ہے۔

(۸) الاربعین: موفق الدین عبداللطیف بن یوسف الحکیم الفیلسوف البغدادی متوفی ۶۲۹ھ نے طب نبوی پر جمع کیا ہے۔

(۹) الاربعین: محمد بن احمد الیمنی البطّال متوفی ۶۳۰ھ نے اس میں صبح وشام کے اذکار ذکر کئے ہیں۔

(۱۰) الاربعین المختارہ فی فضل الحج والزیارۃ: حافظ جمال الدین الاندلسی متوفی ۶۶۳ھ کی ہے۔ (اس نوع کی ایک اربعین شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کی بھی ہے)

(۱۱) اربعین للنووی: ابوزکریا محی الدین یحییٰ بن شرف النووی الشافعی متوفی ۶۷۶ھ نے تالیف کی ہے اس میں امام نووی نے متقدمین علماء کے مقاصد منفردہ کو یکجا کردیا ہے یعنی ایسی حدیثوں کا انتخاب فرمایا ہے جو دین وشریعت کے اصول وبنیاد ہیں اور اعمال واخلاق کی اَساس اور تقویٰ وپاکیزگی کیلئے مدار ہیں نیز صحت کا بھی التزام کیا ہے بلکہ اکثر احادیث صحیحین سے ماخوذ ہیں۔ اخیر میں اربعین پر دو کا اضافہ کرکے غالبًا ان عدد الاربعین للتکثیر لا للتحدید کی طرف اشارہ کردیا۔

چونکہ یہ اربعین جامع المقاصد تھی اس لئے بعد کے علمائے فحول نے اس کی تشریح وتوضیح کی

طرف خصوصی توجہ مبذول کی ہے علامہ چلپی نے تقریباً ۲۰ شارحین کا ذکر کیا ہے جن میں ایک علامہ ابن حجر عسقلانی بھی ہیں جنھوں نے احادیث کی تخریج کی ہے۔اس کی ایک عمدہ شرح علامہ ابن دقیق العید کی بھی ہے مگر کشف الظنون میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

(۱۲) اربعین لابن الجزری: شمس الدین محمد بن محمد الجزری الشافعیؒ متوفی ۸۳۸ھ نے اس میں ایسی چالیس حدیثیں ذکر کی ہیں جو اصح، افصح اور اوجز ہیں۔

(۱۳) اربعینات للسیوطی: علامہ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے کئی اربعین تالیف کی ہیں ایک فضائل جہاد میں، ایک رفع الیدین فی الدعاء میں۔ایک امام مالک کی روایت سے۔ایک روایت متباینہ میں۔

(۱۴) اربعین عدلیہ: شہاب الدین احمد بن حجر المکی متوفی ۹۷۳ھ نے اپنی سند سے ایسی چالیس احادیث جمع کی ہیں جو عدل وعادل سے متعلق ہیں۔

(۱۵) الاربعین عشاریات الاسناد: قاضی جمالد الدین ابراہیم بن علی قلقشندی الشافعی متوفی ۹۶۰ھ نے تصنیف کی ہے اس میں انھوں نے ایسی چالیس روایات املاء کرائی ہیں جو سند کے اعتبار سے عالی ہیں اگرچہ حسن کے درجہ تک نہیں پہنچی ہیں۔

(۱۶) اربعین لابن العربی: محی الدین محمد بن علی متوفی ۶۳۸ھ نے اسے مکہ میں جمع کیا اس شرط کے ساتھ کہ اس کی سند اللہ تبارک وتعالیٰ تک پہنچتی ہے (یعنی بواسطۂ رسول اللہ ﷺ) پھر اس کے بعد اور چالیس روایتیں اللہ تعالیٰ سے نقل کی ہیں اس طرح کہ اسکی سند بغیر حضور ﷺ کے واسطہ کے اللہ تک پہنچتی ہے۔

(۱۷) اربعین طاش کبری زادہ: احمد بن مصطفیٰ الرومی متوفی ۹۶۸ھ نے اس میں ایسی چالیس حدیثیں ذکر کی ہیں جو حضور ﷺ سے بطور مزاح ودل بستگی کے صادر ہوئی ہیں۔

(۱۸) اربعین یمانیہ: محمد بن عبدالحمید القرشی متوفی....کی ہے جو یمن کے فضائل پر مشتمل ہے۔

(۱۹) اربعین لخویشاوند: ابوسعید احمد بن الطّوسی متوفی ...کی ہے اس میں فقراء اور صالحین کے مناقب میں ۱۴۰ احادیث بیان کی ہیں۔

(۲۰) اربعین قدسیہ: حسین بن احمد بن محمد التبریزی متوفی ...نے ایسی احادیث کا انتخاب کیا ہے جن کا تعلق اسرار عرفانی اور علوم لدنی سے ہے پھر صوفیاء کے مذاق کے مطابق اس کی شرح کی ہے اور ساتھ ساتھ چالیس حدیث قدسی مع شرح کے اضافہ کیا ہے اس کتاب کا نام

مفتاح الکنوز ومصباح الرموز ہے۔

(۲۲،۲۱) الاربعین فی فضائل عثمانؓ، الاربعین فی فضائل علیؓ: یہ دونوں ابوالخیر رضی الدین القزوینی متوفی...کی ہیں۔

(۲۳) الاربعین فی فضائل العباسؓ: ابوالقاسم حمزہ بن یوسف السہمی الجرجانی متوفی ۴۲۷ھ کی ہے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ متوفی ۱۴۰۲ھ نے بھی لامع الدراری کے مقدمہ میں کئی اربعینات کا ذکر کیا ہے منجملہ یہ ہے۔

(۲۴) اربعین عالیہ: شیخ الاسلام حافظ احمد بن حجر العسقلانی الشافعی متوفی ۸۵۲ھ کی ہے اس میں انھوں نے صحیحین میں سے ایسی چالیس حدیثیں ذکر کی ہیں جن میں مسلم کی سند بخاری کی سند سے عالی ہے اس کے علاوہ اربعین متباینہ اور اربعین نووی کی تخریج وغیرہ بھی ہے۔

(۲۵) الاربعین الالٰہیہ: حافظ ابوسعید خلیل بن کیکلدی متوفی ۷۶۱ھ نے کئی اربعینات تالیف کی ہیں ایک یہی جو تین جزوں میں ہے دوسری الاربعین فی اعمال المتقین ۴۶/اجزاء میں اور الاربعین المعنعنہ ۱۲/جزوں میں ہے۔

(۲۶) اربعین: مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ نے ایسی چالیس احادیث کا انتخاب فرمایا ہے جو قلیل المبانی وکثیر المعانی یعنی جوامع الکلم کے قبیل سے ہیں۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کے والد ماجد مولانا یحییٰ کاندھلوی ''مفید الطالبین'' کی جگہ یہی اربعین کا درس دیا کرتے تھے (شاہ صاحب کی اِس اربعین کا منظوم ترجمہ مولانا ہادی علی لکھنویؒ نے کیا ہے جو تسخیر کے تاریخی نام سے موسوم ہے۔ یہ اربعین رسالہ ''المسلسلات'' میں شامل ہوکر مطبوع ہے۔

مولانا ابوسلمہ شفیع احمدؒ شیخ الحدیث والتفسیر مدرسہ عالیہ کلکتہ متوفی ۱۴۰۶ھ نے اپنی مضمون ''ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات'' میں اور مضمون کے تکملہ میں محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ نے مزید چند اربعین کا ذکر کیا ہے اور یہ سب علمائے برصغیر کی خدماتِ علم حدیث کی ایک کڑی ہے۔

(۲۷) اربعین (چہل حدیث): حکیم الامت مولانا اشرف علی التھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ نے صرف مسلم شریف کی حدیث معمر عن ہمام بن منبہ عن ابی ہریرہ عن النبی ﷺ کو جمع کیا ہے یہ تمام احادیث کی سند ایک ہے۔

(۲۸) اربعین عن مرویات نعمان سید المجتهدین: مولانا محمد ادریس نگرامی متوفی ۱۳۳۱ھ نے ایسی چالیس حدیثیں جمع فرمائی ہیں جو امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت سید المجتہدین کی مرویات میں سے ہیں۔

امیر المومنین فی الحدیث حضرت ابن المبارکؒ کی اربعین سے لیکر اب تک کے ذخیرہ اربعینات میں سے مشت نمونہ از خروارے صرف چند کا تعارف پیش کیا گیا ہے استیعاب مقصود نہیں ہے۔

مذکورہ حدیث اربعین کے حفظ ونقل کی بشارت کے پیش نظر داعیہ پیدا ہوا کہ راقم الحروف بھی چالیس حدیثوں کو جمع کر کے لوگوں تک پہنچائے، مگر ایک خاص ندرت اور لطافت کے ساتھ کہ اس کی ہر حدیث میں اربعین کا ذکر مقصوداً ہوا ہو چنانچہ یہ مجموعہ تیار ہے۔ ان احادیث کو مفتی اعظم ہند حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہی نور اللہ مرقدہ نے ملاحظہ فرمایا اور راقم کی درخواست پر اپنے کلمات بابرکات کا تحفہ بھی عنایت فرمایا۔ نیز فقیہ النفس مفتی اعظم گجرات حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ کو یہ اربعین سنائی تھی حضرت نے تعجب آمیز خوشی کا اظہار فرمایا اور دعاؤں سے ضیافت فرمائی تھی۔

اِن اربعینات کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ صادقینِ امت یعنی حضرات صفیاء نے بغرض اصلاحِ قلب چلّہ کشی اور موجودہ دور میں اکابر تبلیغ نے امت کے عام افراد میں فکر آخرت پیدا کرنے اور اتباعِ سنت کی روح پھونکنے کیلئے خروج فی سبیل اللہ اربعین یوماً یا ثلثہ اربعینات کا جو نصاب مقرر فرمایا ہے یہ سب کس قدر کتاب وسنت کے موافق ہے۔ فجزاهم الله عن سائر الامة خير الجزاء.

الاربعون فی الاربعین

اس مجموعۂ اربعینات میں جو آپ کے پیش نظر ہے اور اس کا نام ''الاربعون فی الاربعین'' ہے اربعینات قرآنیہ بھی شامل ہیں اور بطور تبرک ابتداء میں لکھی گئی ہیں۔ اگر انہیں ''اربعين حديثاً'' میں شمار کرلیں تو پھر عدد الاربعين للتكثير لا للتحديد سمجھا جائے كما فعله النووی فی كتابه الاربعين نیز اِس جمع میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ حدیث لفظاً ومعناً موضوع نہ ہوالبتہ بعض احادیث ضِعاف ہیں سو اِن شاء اللہ اِن اربعینات کی تشریح وتوضیح کے موقع پر حدیث کی صحت و ضعف پر بھی اشارہ کردیا جائے گا تاکہ علمی اشکال مرتفع اور عملی خلجان دور ہوجائے، فقط۔

الف: واذ واعدنا موسی اربعین لیلة (پ:۱،بقرہ آیت:۵۱)

ب: قال فانها محرمة علیهم اربعین سنة یتیهون فی الارض (پ:۶،مائدہ آیت:۲۶)

ج: حتی اذا بلغ اشده وبلع اربعین سنة قال رب اوزعنی ان اشکر نعمتك (پ:۲۶، احقاف آیت:۱۵)

۱- من حفظ علی امتی اربعین حدیثا بعثه اللّٰه فقیهاً.

۲- ان خلق احدکم یجمع فی بطن امه اربعین نطفة ثم تکون علقة مثل ذلك ثم تکون مضغة مثل ذلك ثم یبعث اللّٰه الیه ملکا باربع کلمات الخ. (متفق علیه مشکوٰۃ:۲۰)

۳- کتب اللّٰه علیّ ان اعمله قبل ان یخلقنی باربعین سنة (مسلم:۱۹، مشکوٰۃ:۱۹)

٤- بُعِث رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لاربعین سنة (متفق علیه مشکوٰۃ:۵۲۱)

۵- بین المسجد الحرام والمسجد الاقصی اربعون سنة (مسلم:۱۹۹، مشکوۃ:۷۲)

٦- من صلی اربعین یوما فی جماعة یدرك التکبیرة الاولی کتب له براء تان (ترمذی،ج:۱،ص:۳۳، مشکوٰۃ،ص:۱۰۲)

۷- لو یعلم المارّ بین یدی المصلی ماذا علیه لکان ان یقف اربعین خیرله من ان یمر بین یدیه. (ترمذی،ص:٤۵، مشکوۃ،ص:۷٤)

۸- وقّت لنا فی قص الشارب وتقلیم الاظفار ونتف الابط وحلق العانة ان لا نترك اکثر من اربعین یوماً. (مسلم،ج:۱،ص:۱۲۹)

۹- من اتی عرّافا فسأله عن شیء لم یقبل له صلوة اربعین لیلة. (مشکوۃ:۳۹۳ عن مسلم)

۱۰- من شرب الخمر لم یقبل اللّٰه صلوة اربعین صباحاً. (ترمذی،ج:۲،ص:۸، مشکوۃ:۳۱۷)

۱۱- من اتی کاهنا فسأله عن شیء حجبت عنه التوبة اربعین لیلة فان صدقه بما قال کفر. (جامع الصغیر عن الطبرانی: ۲٤٦)

۱۲- من قتل معاهدًا لم یرح رائحة الجنة وان ریحها لتوجد من مسیرة اربعین عاما. (بخاری،ج:۱، ص:٤٤۸)

۱۳- ان رسول الله صلی الله علیه وسلم امر عبدالله بن عمرو ان یقرأ القرآن فی اربعین یوماً. (ترمذی،ج:۲،ص:۱۱۸)

۱٤- من صلی فی مسجدی اربعین صلاة لاتفوته صلاة کتب له براء ة من النار و

برأة من النفاق. (وفاء الوفاء، ج:۳، ص:٤٢٤ عن احمد والطبرانی)

۱۵- ما من رجل مسلم یموت فیقوم علی جنازته اربعون رجلا لایشرکون باللّٰه شیئاً إلاشفعهم اللّٰه فیه. (جامع الصغیر، ج:۱،ص:٤٧٢)

۱٦- یدخل فقراء المسلمین الجنة قبل اغنیائهم باربعین خریفاً. (ترمذی، ج:۲،ص:۵۸)

۱۷- سبق المهاجرون الناسَ باربعین خریفا الی الجنة. (جامع الصغیر،ج:٤،ص:۹۳ عن الطبرانی)

۱۸- تمام الرباط اربعون یوما ومن رابط اربعین یوما لم یبع ولم یشتر ولم یحدث حدثا خرج من ذنوبه کیوم ولدته امه. (جامع الصغیر، ج:۳،ص:۲٦۷ عن الطبرانی)

۱۹- ما بین النفختین اربعون. (متفق علیه، مشکوة:٤۸۱)

۲۰- ایما مسلم دعا بقوله لا اله الا انت سبحانك انی کنتُ من الظٰلمین اربعین مرة فمات فی مرضه ذلك اعطی اجر شهید وان برأ برأ وقد غفرله جمیع ذنوبه. (حصن:۱۷۷ عن الحاکم)

۲۱- یخرج الدجال فیمکث اربعین یوماً (ترمذی، ج:٦،ص:٤۷)

۲۲- ینزل عیسی بن مریم ویمکث فی الناس اربعین سنة. (طبرانی بحواله ترجمان السنة، ج:٤،ص:٤۲۳)

۲۳- من اخلص للّٰه اربعین صباحا اظهر اللّٰه ینابیع الحکمة من قلبه علی لسانه. (جامع، ج:٦،ص:٤۳)

۲٤- اربعون خصلة اعلاهن منحة العنز لا یعمل عبد بخصلة منها رجاء ثوابها وتصدیق موعدها الا ادخله اللّٰه تعالی بها الجنة. (جامع، ج:۱،ص:٤۷۲ عن البخاری و ابی داؤد)

۲۵- اعطی رسول اللّٰه ﷺ قوة اربعین رجلا. (معارف السنن:٤٦٧ عن الحلیه)

۲٦- الابدال بالشام وهم اربعون رجلا کلما مات رجل ابدل اللّٰه مکانه رجلا یُسقٰی بهم الغیث وینتصر بهم علی الاعداء ویصرف عن اهل الشام بهم العذاب. (جامع، ج:۳،ص:۱٦۹ عن احمد)

۲۷- ان ما بین مصراعین فی الجنة لمسیرة اربعین سنة. (جامع، ج:۳،ص:۵۱۹ عن مسند احمد)

۲۸- لسرادق الناس اربعة جدر کثافة کل جدار مسیرة اربعین سنة. (ترمذی، ج:۲،ص:۸۲، مشکوة:۵۰۳)

٢٩- حد الجوار اربعون دارا. (جامع،ج:٣،ص:٣٧٦ عن البيهقى)

٣٠- الشيب نور من خلع الشيب فقد خلع نور الاسلام فاذا بلغ الرجل اربعين سنة وقاه اللّٰه الادواء الثلثة الجنون والجذام والبرص. (جامع،ج:٤،ص:١٨٤ عن ابن عساكر)

٣١- من غسّل ميتا فكتم عليه غفر اللّٰه له اربعين مرة. (كنز العمال،ج:١٥،ص:٢٤٤، حاكم)

٣٢- رؤيا المومن جزء من اربعين جزءا من النبوة. (ترمذى)

٣٣- صلوة الجماعة تفضل صلاة احدكم اربعين درجة. (تنويرالحوالك،ج:١،ص:١٤٩)

٣٤- ما من حاكم يحكم بين الناس الاجاء يوم القيامة وملك آخذٌ بقفاه ثم يرفع رأسَه الى السماء فان قال اَلقِه القاه فى مهواة اربعين خريفا. (مسند احمد بحواله مشكوة:٣٢٥)

٣٥- اقامة حد من حدود اللّٰه تعالىٰ خير من مطر اربعين ليلة فى بلاد اللّٰه. (مشكوة:٣١٣ عن ابن ماجه والنسائى)

٣٦- من احتكر طعاما على امتى اربعين يوما وتصدق به لم يقبل منه. (جامع،ج:٦، ص:٣٥ عن ابن عساكر)

٣٧- لاتسبوا اصحاب محمد صلى اللّٰه عليه وسلم فلمقام احدهم ساعة يعنى مع النبى صلى اللّٰه عليه وسلم خير من عمل احدكم اربعين سنة. (شرح عقيدة الطحاوى،ج:٨،ص:٣٨٢ عن الانابة الكبرى)

٣٨- كانت الكعبة غثاء على الماءِ قبل ان يخلق السماء والارض باربعين سنة. (مرقاة،ج:١، ص:٤٧٨)

٣٩- لغزوة فى سبيل اللّٰه احبّ الىّ من اربعين حجة. (جامع،ج:٥،ص:٢٧٧)

٤٠- سألت اللّٰه فى ابناء الاربعين من امتى فقال يا محمد قد غفرت لهم قلتُ فابناء الخمسين قال ان قد غفرت لهم قلتُ فابناء الستين قال قد غفرت لهم قلتُ فأبناء السبعين قال يا محمد انى لاستحى من عبدى ان اعمرّه سبعين سنة يعبدنى لا يشرك بى شيئاً ان اعذّبه بالنار فاما ابناء الاحقاب فابناء الثمانين والتسعين فانى واقف يوم القيامة فقائل لهم اَدخِلوا من احببتم الجنة. (جامع،ج:٤،ص:٧٥ عن ابن حبان)

''امام اعظم اور تصوف''
(ایک اجمالی مطالعہ)

از: مولانا ابوالخیر سید حمد اللہ بختیاری
بانی و مہتمم مدرسہ عربیہ نعمان بن ثابت للبنات/ بنگلور

حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ کوفی تابعی قدس سرہٗ العزیز (متوفی ۱۵۰ھ م ۷۶۷ء بمقام بغداد) کی عظیم المرتبت شخصیت کے وسیع منظرنامے پر ایک پنہاں پہلو ''تصوف'' جو اکثر اصحاب فکر ونظر سے دور رہا۔ لیکن حیات اور کارناموں کے پس منظر پر اگر نظر عمیق سے دیکھیں تو یہ واضح ہوگا کہ اہل تصوف وسلوک نے اصلاح باطنی کے تعلق سے جو اصلاحی نصاب ترتیب دیا، اس سے بہت پہلے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس پر کاربند نظر آتے ہیں، اور پھر ان کی تمام زندگی کے تمام گوشوں پر احسان وسلوک کی کیفیات ومشاہدات اجاگر ملتی ہیں۔

لفظ تصوف اور اصطلاحی تصوف سے بہت پہلے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کی تصوفانہ عملی زندگی سے وابستگی کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ، صاحب درمختار علامہ محمد بن علی بن محمد بن عبدالرحمٰن حصکفیؒ (متوفی ۱۰/شوال ۱۰۸۸ھ بہ عمر ۶۳ سال) نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوعلی دقاق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

> ''میں نے علم تصوف حضرت شبلیؒ سے حاصل کیا، انھوں نے حضرت سری سقطیؒ سے اور انھوں نے حضرت معروف کرخیؒ سے اور انھوں نے حضرت داؤد طائیؒ سے اور انھوں نے علم تصوف اور حدیث وفقہ حضرت امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی تابعیؒ سے اخذ واستفادہ فرمایا۔''

متذکرہ چار عظیم شخصیات کا مقام ومرتبہ حلقہ تصوف میں صدیوں سے نمایاں حیثیت کا حامل

بن کر روشن ستارہ کے مانند ہے۔ امام محی الدین شرف الدین نوویؒ اپنے رسالہ ''المقاصد'' میں تصوف کے پانچ اصول ترتیب وار اس طرح لکھتے ہیں:

(۱) خلوت اور جلوت میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنا۔

(۲) اقوال وافعال میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنا۔

(۳) عروج واقبال اور پستی میں مخلوق خدا سے اعراض کرنا۔

(۴) قلیل وکثیر رزق پر اللہ عالیٰ سے راضی رہنا۔

(۵) خوشی ومسرت اور رنج وغم میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا۔

اور حضرت جنید بغدادیؒ (متوفی ۲۹۷ھ) طریقت کے پانچ اصول اس طرح فرماتے ہیں:

۱- دن کا روزہ۔

۲- شب میں قیام۔

۳- اخلاص عمل۔

۴- اعمال میں کامل رعایت۔

۵- ہر حالت میں اللہ تعالیٰ پر توکل۔

تمام مورخین اور تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ مذکورہ تمام خصوصیاتِ تصوف سے امام ابوحنیفہ تا حیات منسلک ومنہمک رہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ لفظ صوفی اور صوفیائے کرام کے سلاسل میں اسم استعمال نہیں کیا گیا۔ حضرت امام ابوحنیفہ اور صوفیاء کے تعلق سے عربی کتاب اہل الفتوحات والازواق کے مصنف نے اس طرح لکھا ہے:

> حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ صوفیائے کرام سے محبت فرمایا کرتے تھے (یعنی تقویٰ والوں سے) اوران کے قیام ومرتبہ کا احترام کرتے تھے (بحوالہ کتاب تصوف اور صوفیاء)۔

مستشرقین نے اسلامی علوم اور اسلامی تعلیمات کی اصل شکل وصورت کو بڑی چالاکی سے مسخ کرنے کی طرف خاص توجہ دی، اسی طرح انھوں نے اسلامی تصوف کو بھی مسخ کرنے پر بڑی کوششیں کی ہیں۔ ان کا علمی تعاقب اصحاب قلم اور اصحاب قلوب نے خوب کیا ہے۔ ان مخلصانہ کاوشوں کی بدولت اسلامی علوم اور فنون کی اصل شبیہ آج تک موجود ہے۔

تصوف کی دو تعبیرات کی جاسکتی ہیں، ایک اثبات اور دوسرا نفی، اثباتی پہلو میں بدعات و

رسومات سے مکمل اجتناب پایا جاتا ہے، اوراس میں قرآن وحدیث کی تعلیمات سے مکمل وابستگی اور وارفتگی نمایاں ہوتی ہے۔اور دوسرا پہلونفی ہے، جس میں مکمل بدعات اور خرافات (مشرکانہ کردار) نمایاں ہوتے ہیں۔

تعبیر دوم کی ابتدا، مستشرقین نے کی ہے، سادہ لوح مسلمان تعبیر دوم سے متاثر ہوکر تصوف کی تمام تعلیمات کو یکسر انکار کرتے بلکہ مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ساری زندگی علمی اور عملی تصوف سے لبریز تھی۔

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے تعلق سے تمام اہل سلاسل کا اتفاق ہے کہ امیر المومنین سے تصوف جاری ہوا، اورصوفیائے کرام کے سردار امیر المومنین رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے دادا (زوطی یا زوطی اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا نام نعمان رکھا گیا) کے عقیدت مندانہ تعلقات تھے۔اور نعمان کے گھر لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام ثابت رکھا گیا، نومولود ثابت کو نعمان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہاں لے گئے اور دعائیں لے کر لوٹ آئے، ثابت کو اللہ تعالیٰ نے لڑکا عطا کیا، اس کا نام نعمان رکھا گیا۔نعمان بن ثابت بن نعمان ہے، اس طرح امام ابوحنیفہ سے امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؓ سے خاص تعلق تھا، اور دوسرا خاص تعلق یہ تھا کہ امام ابوحنیفہ کے اساتذہ میں امیر المومنین آتے ہیں۔

ان دونوں خصوصیات سے آراستہ ہونے کی وجہ سے حضرت امام ابوحنیفہ کے تلمیذ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ شیخ سلاسل میں شامل اور کامل نظر آتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

اسلامی اعتدال پسندی کا امریکی معیار: ایک چشم کشا رپورٹ

از: ذاکر اعظمی/الریاض

حال ہی میں معروف امریکی تحقیقی ادارہ (RAND Corporation) جس کی سرپرستی حکومت امریکہ سالانہ 150 ملین ڈالر کے خطیر بجٹ سے کرتی ہے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے ایک تازہ ترین رپورٹ پیش کی ہے۔ مذکورہ رپورٹ کی تیاری میں تین سال کا عرصہ لگا جو ۲۱۷ صفحات پر مشتمل ہے اوراس کا عنوان ہے ”اعتدال پسند مسلم معاشرہ کا قیام“ (Building Moderate Muslim Networks) اس رپورٹ میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے جس جارحانہ انداز میں زہرافشانی کی گئی ہے وہ امریکہ اور اہل مغرب کے مذہبی تعصب اور انتہا پسندی کا آئینہ دار ہے۔ ذیل کی سطور میں ہم اس مبنی بر تعصب رپورٹ کے بارے میں تجزیہ پیش کرنے کی حتی المقدور کوشش کریں گے۔

اس تحقیقی رپورٹ کا لب لباب یہ ہے کہ عصر حاضر میں مغرب نواز اعتدال پسند مسلم قیادت کو کس طرح ابھارا جائے، مسلمانوں کو ان کے اصلی سرچشمے یعنی قرآن وسنت سے کس طرح برگشتہ کیا جائے، سیکولرزم اور مغربی افکار کو مسلم معاشروں میں کس طرح پروان چڑھایا جائے، وہ کون سے وسائل ہیں جو مسلم نوجوانوں کے دلوں میں ان کے مذہب کے تعلق سے شکوک وشبہات پیدا کرسکتے ہیں، اور ساری دنیا کے مسلمانوں کو اس بات پر کس طرح قائل کیا جائے کہ ان کی پستی اور زبوں حالی سے نجات صرف اور صرف امریکی اعتدال پسند اسلام کو اپنانے میں مضمر ہے۔

رپورٹ ہذا مسلم معاشروں میں ایک فکری ونظریاتی اسلامی انقلاب کی بات کرتی ہے جو امریکہ اور مغرب نواز ہو۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سے قبل امریکہ صوفیت اور تقلیدی اسلام

کو اہل مغرب کے لئے خطرہ نہیں تصور کرتا تھا، لیکن مذکورہ رپورٹ کی روشنی میں بلا کسی تفریق کے ساری دنیا کے مسلمانوں کو امریکہ اور اہل مغرب کے لئے بطور چیلنج پیش کیا گیا ہے جن کے خطرات سے نمٹنے کے لئے مسلم دنیا میں امریکہ کی جانب سے پیش کردہ اعتدال پسند اسلام یا امریکی اسلام کا انقلاب برپا کرنا ازحد ضروری ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد ہم اس رپورٹ میں زیر بحث آئے اہم نقطاط پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں:

اسلام کی تشکیل نو:

اس رپورٹ کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس کا مرکزی محور امریکہ کی عالمی سیاست ہے جس کا اصل ہدف شیعہ سنی اختلافات کو ہوا دینا، سعودی عرب اور دیگر مسلم ملکوں کے تئیں معاندانہ رویہ کو اختیار کرنا، اور نہ صرف اسلام پسندوں بلکہ پورے اسلامی معاشرہ کو امریکہ کا ہمنوا بنانا ہے تاکہ ساری دنیا کے مسلمان امریکہ سے کندھا سے کندھا ملا کر چل سکیں اور بقول امریکہ عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرسکیں۔ علاوہ ازیں مذکورہ رپورٹ اس بات پر زور دیتی ہے کہ کمیونزم کے سابقہ تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اعتدال پسند یا انتہا پسند مسلمان کے بجائے اسلام کے پورے ڈھانچہ کی اوورہالنگ (Overhauling) کی جائے اور سارے مسلمانوں کو ایک ہی زمرہ میں شمار کیا جائے اور انہیں اہل مغرب کے لئے ایک کھلا چیلنج تصور کیا جائے۔

واضح رہے کہ مذکورہ ادارہ کی ۲۰۰۴ء کی رپورٹ نے بش انتظامیہ کو شفارشات پیش کی تھیں کہ اسلام پسند یا شدت پسند مسلمانوں کے خلاف جنگ کو جیتنے کے لئے اشترا کی ذہن رکھنے والے مسلم گروپوں کی بھرپور مدد کی جائے تاکہ وہ شدت پسندوں سے برسرپیکار ہوکر ساری اسلامی دنیا میں اعتدال پسندی اور جدیدیت کے نام پر امریکہ اور مغرب کے مفادات کو تحفظ فراہم کرسکیں۔ اس کے برعکس موجودہ رپورٹ اعتدال پسند مسلم نیٹ ورک کے قیام کی پرزور اپیل کرتی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا اصل مقصد اب نفس اسلام کو ہی تبدیل کرنا ہے کیونکہ سابقہ تجربات کی روشنی میں مسلمان خواہ اعتدال پسند ہو یا شدت پسند وہ بحیثیت مجموعی اس شریعت محمدی پر ایمان رکھتا ہے جس پر ان کی دنیا وآخرت کی کامیابی کا سارا دارومدار ہے۔ لہٰذا اسلام کے ڈھانچہ کو تبدیل کیے بغیر مسلمانوں کی مذہبی سوچ میں تبدیلی پیدا کرنا سعی لاحاصل ہے۔

اعتدال پسندی کا امریکی معیار کیا ہے؟

مذکورہ رپورٹ کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ رپورٹ ہذا

اسلام پسندوں، شدت پسندوں اور (Radical) مسلمانوں کے درمیان دانستہ طور پر شکوک و شبہات پیدا کرتی ہے اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ لبرل اور اعتدال پسند مسلمانوں (Moderate and Liberal Muslims) کو ہر طرح کی مالی اور فکری امداد فراہم کی جائے، بحیثیت مجموعی اس رپورٹ کی روشنی میں امریکی اعتدال پسندی کی تعریف صرف ان مسلمانوں پر صادق آتی ہے جو امریکہ کی جانب سے وضع کردہ اعتدال پسندی کی مندرجہ ذیل شرائط پر پورے اترتے ہوں:

۱- اسلامی شریعت کے نفاذ کو غیر ضروری سمجھنا۔

۲- اس بات پر ایمان رکھنا کہ عورت شوہر کے بجائے (Boy Friend) کو اختیار کرنے میں کلی طور پر آزاد ہے۔

۳- اقلیتی مذہب سے تعلق رکھنے والے شخص کے مسلم اکثریت والے ملک کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کو جائز تصور کرنا۔

۴- لبرل مسلمانوں کی حتی المقدور مدد کرنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا۔

۵- صرف دو طرح کے اسلامی رجحان کی تائید کرنا، ایک تقلیدی اسلام یعنی وہ مسلمان جو نماز کے علاوہ دین کے دوسرے امور سے بے بہرہ ہو، دوسرے وہ صوفی مسلمان جو قبر پرستی وغیرہ جیسی بدعات کو صحیح تصور کرتے ہیں۔ ان دونوں اسلامی رجحان کے علاوہ سارے اسلامی افکار کو وہابیت کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے۔

یاد رہے کہ اسلام کا یہ تصور شرق اوسط میں امریکہ کے سابق سفیر ڈینس روس کی اس سفارش کی روشنی میں وضع کیا گیا ہے جس میں سیکولر یا لبرل اسلام کے فروغ پر زور دیا گیا ہے، جس کا مقصد ایسی سیکولر تنظیموں کا قیام ہے جو ہو بہو وہی دینی اور سماجی خدمات انجام دیں جو عام طور سے اسلامی تنظیمیں انجام دیتی ہیں خواہ وہ طبی کیمپ کی صورت میں ہو یا یتیموں کی کفالت کا مسئلہ وغیرہ۔

مذکورہ رپورٹ کا سب سے مضحکہ خیز پہلو یہ ہے کہ اعتدال پسند مسلمان کے معیار کو جاننے کے لئے (۱۰) سوال وضع کئے گئے ہیں، جو مسلمان اس مندرجہ ذیل معیار پر پورا اترے گا وہی اعتدال پسند کہلائے گا۔

۱- وہی جمہوریت قابل قبول ہوگی جو مغرب کے معیار پر پورا اترے گی۔

۲- جمہوریت اسلامی اصول ومبادی سے متصادم ہے۔

۳- اسلامی شریعت کا نفاذ اعتدال پسند اور انتہا پسند مسلمان کے درمیان خط فاصل ہے۔

۴- اعتدال پسند مسلمان وہ ہے جو عورتوں کے حقوق کو عصر حاضر کے تناظر میں دیکھے نہ کہ رسول اللہ ﷺ کی فرمودات کی روشنی میں۔

۵- کیا آپ شدت پسندی کی تائید کرتے ہیں؟

۶- کیا آپ جمہوریت کو اس کے وسیع تر یعنی مغرب کے وضع کردہ انسانی حقوق کے تناظر میں دیکھتے ہیں (جو اباحیت اور ہم جنسی جیسے فظیع اعمال کو جائز تصور کرتا ہے)؟

۷- کیا آپ اس جمہوریت کے تعلق سے کچھ تحفظات رکھتے ہیں جو فرد کو تبدیلئ مذہب کی مکمل آزادی دیتی ہے؟

۸- کیا آپ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسان اپنا مذہب تبدیل کرنے میں پوری طرح سے آزاد ہے؟

۹- کیا آپ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ حکومت کی ذمہ داری صرف شریعت کے فوجداری (Criminal) پہلو کا نفاذ ہے؟ یا صرف شریعت کے سول کوڈ کو ہی نافذ کیا جانا چاہئے؟ کیا آپ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ اسلامی شریعت کے ماسوا دنیا کو دوسرے قوانین یعنی کمیونزم یا اشتراکیت وغیرہ کو اسلامی معاشرہ میں نافذ کیا جاسکتا ہے؟

۱۰- کیا آپ اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ اقلیت سے تعلق رکھنے والا شخص مسلم معاشرہ میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوسکتا ہے؟ کیا ایک غیر مسلم پوری آزادی کے ساتھ ایک اکثریتی مسلم ملک میں اپنی عبادت گاہ تعمیر کرسکتا ہے؟

انہیں سوالوں کے جوابات کی روشنی میں یہ متعین ہوگا کہ ایک مسلمان امریکی معیار کے مطابق اعتدال پسند ہے یا شدت پسند۔ علاوہ ازیں رپورٹ ہٰذا عالم اسلام میں پائے جانے والے اعتدال پسند مسلمانوں کی مندرجہ ذیل تین قسمیں بیان کررہی ہے:

۱- اشتراکی ذہن رکھنے والے لبرل مسلمان جو مذہب کو سیاست سے جدا تصور کرتے ہیں۔

۲- علمائے دین سے عداوت رکھنے والے جن کے لئے اس رپورٹ میں ''اتاترکین'' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور تونسیا کی حکومت کو اس کا ہمنوا شمار کیا گیا ہے۔

۳- وہ اسلام پسند جو مغربی جمہوریت اور اسلام کے مابین تصادم کو جائز تصور کرتے ہیں۔

اس ساری وضاحت کے بعد رپورٹ ہٰذا امریکہ کی نگاہ میں اعتدال پسند مسلمان کی تعریف

کچھ اس طرح کرتی ہے ''یعنی وہ مسلمان جو مزاروں کی زیارت کرتے ہیں، تصوف کے قائل ہیں اور دین میں اجتہاد کو ناجائز تصور کرتے ہیں۔''

رپورٹ کا ایک بڑا حصہ یعنی دس ابواب میں سے دو ابواب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ عالم اسلام میں پائے جانے والے مختلف گروہوں کی دامے درمے سخنے مدد کی جائے، اور اسلامی مراکز کو نظر انداز کیا جائے، اور ان مراکز کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے تاکہ امریکہ کی جانب سے مراعات یافتہ مغرب نواز اسلامی گروپ ایشیا اور یورپ میں پروان چڑھ سکیں، اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ نام نہاد امریکا کے ہمنوا خود ساختہ اسلامی گروپ اس قدر مضبوط ہوجائیں کہ پورا عالم اسلام معروف اسلامی مراکز اور اداروں کے بجائے انہیں گروہوں سے دین اسلام کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنے لگے اور نتیجہ امریکہ کی جانب سے پیش کردہ نام نہاد اعتدال پسند اسلام کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع مل سکے۔

رپورٹ کا چھٹا باب اس بات پر زور دیتا ہے کہ ایشیا اور یورپ میں پھیلے ان گروہوں کا تجزیہ کیا جائے، اس ضمن میں ان افراد اور جماعتوں کی فہرست پیش کی گئی ہے جن کے ساتھ مل کر کام کیا جاسکتا ہے اور انہیں ہر طرح کا مالی تعاون دیا جاسکتا ہے تاکہ وہ اسلام کی تصویر کو بگاڑ کر پیش کرسکیں، جس کی واضح مثال سعودی عرب کی ایک ویب سائٹ ہے جو اس بات کی تبلیغ کرتی ہے کہ کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کے بارے میں وارد احادیث ثابت شدہ نہیں ہیں۔ اس ویب سائٹ کو امریکہ بھرپور مالی تعاون دیتا ہے۔

مساجد کے کردار سے خوف:

رپورٹ کا پہلا باب یعنی مقدمہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ مسلمانوں کو مسجد سے دور رکھا جائے کیونکہ مسجد ہی وہ منبر ہے جس سے مسلم امہ اپنے دینی معاملات میں رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ اور اگر مسجد کے کردار کو مسخ کردیا گیا تو گویا اسلامی شریعت کا دائرہ کار از خود محدود ہوکر رہ جائیگا۔ لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لئے ان مبلغین کی مدد کرنا ضروری ہے جو مسجد کے باہر سے اپنی نام نہاد مذہبی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی جماعتوں کو فراہم کی جانے والی مالی امداد کی روک تھام ضروری ہے تاکہ ان کی سرگرمیاں محدود ہوکر رہ جائیں اور امریکہ کی جانب سے مراعات یافتہ اعتدال پسند یا تقلیدی اسلام کو ماننے والا گروپ پروان چڑھ سکے۔ واضح لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی بیخ کنی کے لئے ضروری ہے کہ خود مسلمانوں کے

اندر اسلام دشمنی کی تخم ریزی کی جائے اور عام مسلمانوں کو اعتدال پسندی کے نام پر دین اسلام سے متنفر کیا جائے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ رپورٹ کا دوسرا باب سرد جنگ کے فلسفہ کو اپنانے پر زور دیتا ہے جیسا کہ اس کا کامیاب تجربہ امریکہ نے اشتراکیت کو زیر کرنے کیلئے سابقہ سویت یونین میں کیا، بایں طور کہ کمیونسٹوں کے ایک گروہ کے اندر اس اشتراکی فکر کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکائی اور انہیں باہم دگر برسرِ پیکار کرکے اشتراکیت کے چڑھتے سورج کو ہمیشہ کے لئے روبہ زوال کردیا۔

رپورٹ کا تیسرا باب اس امر کو زیر بحث لاتا ہے کہ اشتراکیت کے خلاف سرد جنگ میں استعمال کیئے گئے حربے اور وہ حربے جو آج اسلامی فکر کو-نعوذ باللہ- صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے استعمال ہورہے ہیں کے مابین کیا بنیادی فرق یا یکسانیت ہے؟ رپورٹ اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ جس طرح سے اشتراکیت کے ساتھ تصادم کی نوعیت فکری تھی بالکل اسی طرح آج مغرب اور اسلام کے مابین محاذ آرائی اسی فکری انداز کی ہے، اور جب تک مسلمانوں کو فکری طور پر زیر نہیں کیا گیا، انھیں سیاسی وعسکری میدان میں شکست دینا امر محال ہوگا۔

رپورٹ کی روشنی میں جہاں تک اشتراکی نظام اور اسلامی فکر کے مابین اختلاف کی بات ہے وہ یہ کہ اشتراکیت کے مقاصد واضح تھے جس کی بیخ کنی قدرے آسان تھی، اس کے برخلاف اسلامی فکر کسی ایک گروہ یا جماعت تک محدود نہیں کہ ان کو ہدف بنا کر ان کے خلاف محاذ آرائی کی جاسکے۔ رپورٹ کی سب سے اہم سفارش یہ ہے کہ ان اسلامی ممالک کے ساتھ براہ راست تصادم نہ کیا جائے جن کے ساتھ امریکہ کے سیاسی اور اقتصادی مفادات وابستہ ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ سعودی عرب میں پائی جانے والی وہابی یا سلفی فکر کو امریکہ مغربی افکار کے خلاف سب سے زیادہ خطرناک تصور کرتا ہے، لیکن چونکہ سعودی عرب اور پڑوسی دیگر خلیجی ریاستوں کے ساتھ پٹرول کی صورت میں امریکہ کا بہت بڑا مفاد وابستہ ہے، لہٰذا ان ممالک کے ساتھ براہ راست تصادم امریکی حکومت کے مفاد میں نہیں؛ بلکہ ان ممالک پر فکری یلغار ہی کے ذریعہ امریکی اثر و رسوخ کو باقی رکھا جاسکتا ہے۔ شاید یہی بنیادی سبب ہے کہ رپورٹ بڑی صراحت کے ساتھ ذکر کرتی ہے کہ عالم عرب میں جمہوریت کے فروغ کے لئے امریکہ کو خاصی دشواریوں کا سامنا ہے، یا صحیح معنوں میں ان ممالک میں جمہوریت کا قیام امریکی مفاد کے ساتھ براہ راست متصادم ہے۔

پانچویں باب میں امریکہ بہ صراحت یہ اعتراف کرتا ہے کہ ماضی میں اس نے اردن اور

مغرب (مراکش) کی اعتدال پسند قوتوں کی تائید وحمایت کی (جن میں حزب العدالة والتنمية جیسی سیاسی پارٹیاں سرفہرست ہیں)، لیکن بقول رپورٹ ''افسوس اس بات کا ہے کہ جنہیں اعتدال پسند سمجھا گیا وہ کچھ اور نکلے''۔ اسی کے ساتھ یہ تحقیقی رپورٹ اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ تیل کی دولت سے مالامال خلیجی ممالک پر کس انداز سے دباؤ ڈالا جائے کہ فکری اعتبار سے وہ امریکی اعتدال پسندی کو گلے لگالیں۔

علاوہ ازیں رپورٹ ہذا میں بعض عرب اور خلیجی ممالک میں پائے جانے والے اعتدال پسندوں کی ایک فہرست پیش کی گئی ہے جن کو امریکہ کی ایجنڈے پر آمادہ کرنا آسان ہوگا، اس مقصد کے حصول کے لئے ایسے نام نہاد اعتدال پسند ٹی.وی چینل کا اجرا از حد ضروری ہے جو مغرب کے ساتھ تعایش (Co-exixtence) کی ترویج وتبلیغ کے فریضے کو بخوبی انجام دے سکے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہ رپورٹ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے بہت خطرناک اغراض ومقاصد کی حامل ہے جس میں صحیح اسلامی افکار کی جس جارحانہ انداز میں مذمت کی گئی ہے کسی صاحب غیرت مسلمان کے ضمیر کو جھنجوڑنے کے لئے کافی ہے۔ اس رپورٹ کا لب لباب ان وسائل کو زیر بحث لانا ہے جن کے ذریعہ مسلمانوں کو سوشل ازم یا الحاد کے راستے پر گامزن کرنا ہے۔ اس چھوٹے سے مضمون میں اس خطرناک رپورٹ کے اندر جس انداز سے اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے زہرافشانی کی گئی ہے کو سمونا دشوار گذار ہے، مگر اس رپورٹ کے مرتب کا یہ قول ''اس کا مقصد اسلام اور مغرب کے مابین براہ راست تصادم نہیں، بلکہ عالم اسلام کو آپس میں برسرپیکار کرنا ہے'' ہمیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے کافی ہے۔

﴿يُرِيدُونَ أَن يُطْفِؤُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ﴾ .

❁ ❁ ❁

شیرِ میسور ٹیپو سلطان شہیدؒ کے کارنامے

از: ریحان ظفر صدیقی
مقام کٹھری پچھّم محلّہ، بیگوسرائے (بہار)

مرہٹوں کی یورش اور ٹیپو کی کارروائیاں

حیدرعلی نے مرہٹوں کے ساتھ ایک سابق معرکے کا قضیہ ختم کرنے کیلئے انہیں ۵۰ لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف حیدرعلی کی پہلی جنگ کے بعد مرہٹوں نے اس خیال سے کہ دو سال تک انگریزوں کے ساتھ نبرد آزما رہنے کی وجہ سے حیدرعلی کی فوجی طاقت کمزور ہوتی چلی گئی ہے، مذکورہ رقم فوری طور پر ادا کرنے اور بصورت دیگر اس جنگ کے تمام مقبوضات واپس کرنے کا مطالبہ کرنے کے لیے سری رنگا پٹنم کا رُخ کیا۔ مادھوراؤ کی قیادت میں ایک لاکھ سواروں اور پچاس ہزار بندوقچیوں کا لشکر جرّار طمطراق کے ساتھ روانہ ہوا۔ حیدرعلی کو جب اس یورش کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنی فوج کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ تقسیم کیا اور ٹیپو سلطان سمیت کئی کمانڈروں کی قیادت میں کئی دستے مختلف اطراف میں متعین کردیئے اور مرہٹہ فوج کی بے حد کثرت اور اپنی فوجی قلت کے پیش نظر دفاعی جنگ کرنے اور شب خوں مارنے کی حکمت عملی اختیار کی۔

ٹیپو سلطان نے نہایت ذہانت، پھرتی اور بیدار مغزی کے ساتھ مرہٹہ افواج پر ایسے عجیب نفسیاتی اور جنگی مہارت سے بھرپور وار کیے اور شب خوں مارنے کی حکمت عملی کو ایسے احسن طریقے سے عملی جامہ پہنایا کہ مختصر عرصے میں ہزاروں مرہٹے ڈھیر ہوگئے اور ایک ماہ کا عرصہ گذرنے کے بعد بھی مرہٹہ افواج سری رنگا پٹنم میں داخل نہ ہوسکیں۔ اس اثناء میں مادھوراؤ کا جو کہ بوجہ علالت راستے ہی سے واپس ہوگیا تھا، پونا میں انتقال ہوا۔ اور اس کے جانشینوں میں اقتدار کا جھگڑا شروع

ہوا۔ اس صورت حال سے حیدرعلی کو فائدہ پہنچا اور انھوں نے آسان شرائط پر مرہٹہ سرداروں سے صلح کی اور ۱۷۷۰ء میں شروع ہونے والی اس مرہٹہ یورش کا خاتمہ ہوا۔ اور ۱۷۷۶ء میں جنگ کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل ہی ختم ہوگئی۔

انگریزوں کے ساتھ میسور کی دوسری جنگ

پہلی جنگ میں شکست کے بعد برطانوی سامراج کے ایوانوں میں ہلچل مچ گئی اور انگریزوں کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ حیدرعلی کی موجودگی میں ان کا ہندوستان پر مکمل قبضے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔ چنانچہ انھوں نے حیدرعلی کو اپنے راستے کا سب سے بڑا پتھر سمجھ کر ہٹانے کیلئے بھرپور تیاریاں شروع کردیں۔ انھوں نے حسبِ سابق نظامِ حیدرآباد نواب آرکاٹ اور مرہٹوں کو حلیف بنانے کیلئے رابطے شروع کئے۔ حیدرعلی نے بھی اس متحدہ محاذ کو توڑنے اور اس میں دراڑیں ڈالنے کی کوششیں کیں۔ اور مسلمان ہونے کے ناطے نظام حیدرآباد کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی لیکن نظام کی ناعاقبت اندیشی اور ہٹ دھرمی کے باعث انھیں ناکامی ہوئی۔ چنانچہ حیدرعلی نے انگریزوں کو مزید موقع نہ دینے کی غرض سے ۲۸/مئی ۱۷۸۰ء کو ۹۰ ہزار فوج کے ہمراہ سری رنگا پٹنم سے خروج کیا۔ انگریز بھی چونکہ نظام اور مرہٹوں کی حمایت نہیں لے سکے تھے اور تنہا حیدرعلی کے مقابلے میں آنا نہیں چاہتے تھے اس لئے انھوں نے صلح کا پیغام بھیجا لیکن حیدرعلی نے اسے مسترد کردیا۔ اپنی فوج کو حسب سابق تقسیم کیا اور ایک بڑے دستے کی کمان ٹیپو سلطان کو دی جس کی عمر اب ۲۹ سال ہوگئی تھی اور وہ جرأت و بہادری، ذہانت و مہارت میں اپنا سکہ جما چکا تھا۔ حیدری افواج مختلف علاقوں کو فتح کرتی ہوئی یولی لور کے مقام پر پہنچیں، جہاں ان کا مقابلہ کرنل بیلی کی زیر قیادت انگریز فوج سے ہوا۔ گھمسان کا رن پڑا اور کرنل بیلی کی فوج کو شکست ہوئی۔ ان کے سیکڑوں سپاہی مارے گئے اور ۳۶ بڑے افسران قید کیے گئے اور سری رنگا پٹنم جیل بھیج دیئے گئے۔ ایک دوسرے جنرل منزو نے جب بیلی کی شکست کی خبر سنی تو ہتھیار ڈال کر بھاگ گیا۔ ویلور پر بھی قبضہ ہوا، نواب آرکاٹ محمد علی کی فوجوں سے مقابلے کے بعد آرکاٹ فتح ہوا اور اس کے بڑے فوجی افسروں میں سے سید حامد راجہ بیر برادر میر جعفر صادق میسور افواج میں شامل ہوئے اور حیدرعلی نے انکے مناصب کا لحاظ رکھتے ہوئے اعلیٰ فوجی عہدوں پر فائز کیا۔ ۱۵/اگست ۱۷۸۱ء کو حیدرعلی مدراس پر جو کہ انگریزی فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ حملہ کیا اور انگریزوں کو زبردست جانی و مالی

نقصان پہنچایا۔اس دوران انگریز گورنر جنرل نے فوج کی کمان جنرل آئر کوٹ کے سپرد کی،لیکن وہ بھی زیادہ دیر نہ جم سکا۔ٹیپوسلطان نے اس جنگ میں مثالی جرأت و بہادری کا مظاہرہ کیا اور کئی اہم فوجی علاقے انگریزوں سے چھین کر سلطنتِ خداداد میں شامل کر لئے۔بدقسمتی سے اسی دوران ساحلی شہر ملبیار کے نائر قبیلے کے لوگوں نے بغاوت کی جس کو فرو کرنے کے لیے حیدرعلی نے ٹیپوسلطان کو ملبیار بھیجا۔ٹیپو نے مختصر مدت میں وہاں کی بغاوت ختم کردی،لیکن اسے احتیاطی تدبیر کے طور پر کچھ عرصہ مزید وہاں گذارنے کا حکم دیا گیا۔

حیدرعلی کی رحلت

ابھی انگریزوں کے ساتھ معرکہ آرائی جاری تھی اور حیدرعلی کی فتوحات کا سلسلہ بڑھتا جارہا تھا کہ حیدرعلی آرکاٹ کے محاذ پر بیمار پڑ گئے۔ان کے جسم میں سرطان کے دانے نکلے ہوئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مرض کی شدت کو دیکھ کر سلطان کو فوراً واپسی کے لیے خط لکھا۔ٹیپوسلطان خط پڑھ کر پائین گھاٹ کے مقام تک پہنچ گیا تھا کہ یکم محرم ۱۱۹۶ھ مطابق ۱۷۸۲ء کو حیدرعلی نے جان جانِ آفریں کے سپرد کی اور ٹیپوسلطان کیلئے ایک عظیم مشن کی تکمیل کا بوجھ چھوڑ کر دار بقا کی طرف کوچ کرگئے۔ إنا للّٰهِ وإنا إليه راجعون .

ٹیپو کی جانشینی

حیدرعلی نے انتقال کے وقت اپنے امراءِ سلطنت کو وصیت کی تھی کہ جس وفاداری کے ساتھ آپ لوگ میری خدمت انجام دے رہے تھے اسی طرح میرے بعد ٹیپوسلطان کی بھی اطاعت کریں۔ٹیپو نے سری رنگا پٹنم واپس پہنچ کر ۲۰؍محرم ۱۱۹۶ھ کو سلطنت خداداد کا اقتدار سنبھالا۔تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہونے سے قبل اپنی ماں کی خدمت میں حاضری دی،اس کی دعائیں لی۔دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے بارِامانت سنبھالنے کی توفیق کا استدعا کیا۔اور دربار میں آکر تخت شاہی پر مسند نشیں ہوئے۔دربارِ شاہی کی پہلی مجلس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔قاری نے سورۂ حشر کے آخری رکوع کی تلاوت کی اور جب اللہ تعالیٰ کا ارشاد لو انزلنا هذا القرآن پر پہنچے تو بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور پوری مجلس پر بہت دیر تک سکتہ طاری رہا۔تخت نشینی کے بعد ٹیپوسلطان نے اپنی رعایا کے نام (جن کی اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل تھی) جو پہلا سرکاری فرمان

جاری کیا اس میں اس کے نیک عزائم، اعلیٰ افکار اور رعایا کے ساتھ حسن سلوک اور ہمدردی کے جذبات کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے، فرمان کے چند اہم نکات درج ذیل تھے:

(۱) میں ٹیپو سلطان بحیثیت حکمراں ریاست میسور سلطنتِ خداداد اس بات کو اپنا فرض منصبی سمجھتا ہوں کہ بلاتفریق مذہب وملت اپنی رعایا کی اخلاقی اصلاح کروں اور ان کی خوشحالی اور معاشی وسیاسی ترقی کیلئے کوشاں رہوں۔

(۲) مسلمانوں کی دینی واخلاقی بنیاد پر اصلاح کیلئے خصوصی قدم اٹھاؤں۔

(۳) انگریزوں کو اس ملک سے باہر کرنے کیلئے جو ہمارے حقیقی دشمن ہیں پورے ہندوستان کے لوگوں کو متحد کروں۔

(۴) مظلوم وبے بس عوام کو جاگیرداروں اور زمینداروں کے ظلم وستم سے نجات دلاؤں اور عدل وانصاف کی بنیاد پر ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کروں وغیرہ وغیرہ۔

چوتھی قسط:

قادیانیت کا مکروہ چہرہ!

کینیڈا سے قادیانیوں کے پندرہ سوالات اوران کا جواب

از: مولانا سعید احمد جلال پوری
مدیر ماہنامہ بینات کراچی، پاکستان

سوال:۱۱-”حضرت محمد نے حلالہ کے قانون میں عورت کو کسی بے جان چیز یا بھیڑ بکری کی طرح استعمال کیے جانے کا طریقہ کار کیوں وضع کیا ہے؟ طلاق مرد دے اور دوبارہ رجوع کرنا چاہے تو عورت پہلے کسی دوسرے آدمی کے نکاح میں دی جائے، وہ دوسرا شخص اس عورت کے ساتھ جنسی عمل سے گزرے، پھر اس دوسرے شخص کی مرضی ہو، وہ طلاق دے تو عورت دوبارہ پہلے آدمی سے نکاح کرسکتی ہے؟ یعنی اس پورے معاملے میں استعمال عورت کا ہی ہوا، مرد کا کچھ بھی نہیں بگڑا، اس میں کیا رمز پوشیدہ ہے؟“

جواب: اگر دیکھا جائے تو قادیانیوں کا یہ اعتراض بھی سراسر بدنیتی اور جہالت پر مبنی ہے، اس لئے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ مروجہ حلالہ کے لئے عارضی نکاح کی آنحضرت ﷺ نے تعلیم و تلقین نہیں فرمائی، بلکہ اس کی قباحت وشناعت بیان فرمائی ہے، چنانچہ محض پہلے شوہر کے لئے عورت کو حلال کرکے طلاق دینے والے حلالہ کنندہ اور ایسا حلالہ کرانے والے دونوں کو ملعون قرار دیا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

”عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہ عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المحلل والمحلل لہ.“ (مسند احمد، ص:۴۵۰، ج:۱)

ترجمہ:”اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت فرمائی ہے حلالہ کرنے والے اور حلالہ کرانے والے پر۔“

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ تین طلاق دینے کے بعد خاتون اپنے شوہر کے لئے حرام ہوجاتی ہے اور بلاتحلیل شرعی ان دونوں کا آپس میں دوبارہ نکاح اور ملاپ نہیں ہوسکتا، تو یہ قرآن کریم کا مسئلہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے بیان فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

الف: "الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسريح باحسان." (البقرة:۲۲۹)

ترجمہ: ''طلاق رجعی ہے دوبار تک، اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بھلی طرح سے۔''

ب: "فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجاً غيره." (البقرہ:۲۳۰)

ترجمہ: ''پھر اگر اس عورت کو طلاق یعنی تیسری بار، تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا۔''

دراصل اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے نکاح کے اس بندھن کے توڑنے کے حق میں نہیں ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ ایک ہنستا بستا گھرانا طلاق کی وجہ سے اجڑ جائے۔ اسلئے طلاق اگر چہ مباح ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں مباح و جائز چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض و ناپسندیدہ ہے۔ اسلئے اس بندھن کو ٹوٹنے سے بچانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے تین طلاق کو آخری حد قرار دیا ہے، جبکہ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد نکاح ثانی کے بغیر مرد کے دوبارہ رجوع کرنے کے حق کو برقرار رکھا گیا، لیکن اگر کوئی انتہاپسند اپنی عجلت پسندی اور حماقت سے اس حد کو بھی پار کر جائے تو اس پر کوئی تعزیر اور تازیانہ ضرور ہونا چاہئے اور وہ تعزیر و تازیانہ یہ مقرر فرمایا کہ تم نے چونکہ اپنی بیوی کو بے قدر چیز اور نکاح کو کھیل بنا رکھا تھا، اسلئے تیسری طلاق کے بعد اب تمہارا اس عورت پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تیسری طلاق کی حد پار کرنے والے پر جب تعزیر و تازیانہ کے طور پر اس کی بیوی کو اس پر حرام قرار دے دیا گیا، تو دوسرے نکاح کے بعد وہ عورت اس کے لئے حلال کیوں قرار دے دی گئی؟ اس سلسلہ میں حافظ ابن قیمؒ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''اعلام الموقعین'' میں اس کی نہایت خوبصورت حکمت و علت بیان فرمائی ہے، چنانچہ حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

''تین طلاق کے بعد مرد پر عورت کے حرام ہونے اور دوسرے نکاح کے بعد پھر پہلے مرد پر جائز ہونے کی حکمت کو وہی جانتا ہے جس کو اسرار شریعت اور مصالح کلیہ الٰہیہ سے واقفیت ہو، پس واضح ہو کہ اس امر میں شریعتیں بحسب مصالح ہر زمانہ اور ہر امت کے لئے مختلف رہی ہیں۔ شریعت تورات نے طلاق کے بعد جب تک عورت دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے، پہلے مرد کا رجوع اس کے ساتھ جائز رکھا تھا اور جب وہ دوسرے شخص سے نکاح کر لیتی، تو پہلے شخص کو اس عورت سے کسی صورت میں رجوع جائز نہ تھا۔ اس امر میں جو حکمت و مصلحت الٰہی ہے، ظاہر ہے، کیونکہ جب مرد جانے گا کہ اگر میں نے عورت کو طلاق دیدی تو اس کو پھر اپنا اختیار ہو جائے گا، اور اس کے لئے دوسرا نکاح کرنا بھی جائز ہو جائے گا اور پھر جب اس نے دوسرا نکاح کر لیا تو مجھ پر

ہمیشہ کے لئے یہ عورت حرام ہو جائے گی۔ تو ان امور خاصہ کے تصور سے مرد کا عورت سے تعلق و تمسک پختہ ہوتا تھا، اور عورت کی جدائی کو نا گوار جانتا تھا۔ شریعت تورات بحسب حال مزاج امت موسوی نازل ہوئی تھی، کیونکہ تشدد اور غصہ اور اس پر اصرار کرنا ان میں بہت تھا۔ پھر شریعت انجیلی آئی تو اس نے نکاح کے بعد طلاق کا دروازہ بالکل بند کردیا۔ جب مرد کسی عورت سے نکاح کر لیتا تو اس کے لئے عورت کو طلاق دینا ہرگز جائز نہ تھا۔

پھر شریعت محمدیہ ﷺ آسمان سے نازل ہوئی جو کہ سب شریعتوں سے اکمل، افضل، اعلیٰ اور پختہ تر ہے اور انسانوں کے مصالح، معاش ومعاد کے زیادہ مناسب اور عقل کے زیادہ موافق ہے، خدا تعالیٰ نے اس امت کا دین کامل اور ان پر اپنی نعمت پوری کی، اور طیبات میں سے اس امت کے لئے بعض وہ چیزیں حلال ٹھہرائیں جو کسی امت کے لئے حلال نہیں تھیں، چنانچہ مرد کے لئے جائز ہوا کہ بحسب ضرورت چار عورت تک سے نکاح کر سکے، پھر اگر مرد و عورت میں نہ بنے تو مرد کو اجازت دی کہ اس کو طلاق دے کر دوسری عورت سے نکاح کر لے، کیونکہ جب پہلی عورت موافق طبع نہ ہو یا اس سے کوئی فساد واقع ہو اور وہ اس سے باز نہ آئے تو شریعت اسلامیہ نے ایسی عورت کو مرد کے ہاتھ اور پاؤں اور گردن کی زنجیر بنا کر اس میں جکڑنا اور اس کی کمر توڑنے والا بوجھ بنانا تجویز نہیں کیا اور نہ اس دنیا میں مرد کے ساتھ ایسی عورت کو رکھ کر اس کی دنیا کو دوزخ بنانا چاہا ہے۔

لہٰذا خدا تعالیٰ نے ایسی عورت کی جدائی مشروع فرمائی اور وہ جدائی بھی اس طرح مشروع فرمائی کہ مرد، عورت کو ایک طلاق دے، پھر عورت تین طہر یا تین ماہ تک اس مرد کے رجوع کا انتظار کرے، تاکہ اگر عورت سدھر جائے اور شرارت سے باز آجائے اور مرد کو اس عورت کی خواہش ہو جائے یعنی خدائے مصرف القلوب عورت کی طرف مرد کے دل کو راغب کردے تو مرد کو عورت کی طرف رجوع کرنے کا دروازہ بھی مفتوح رہے، تاکہ مرد عورت سے رجوع کر سکے اور جس امر کو غصہ اور شیطانی جوش نے اس کے ہاتھ سے نکال دیا تھا، اس کو مل سکے اور چونکہ ایک طلاق کے بعد پھر بھی جانبین کی طبعی غلبات اور شیطانی چھیڑ چھاڑ کا اعادہ ممکن تھا، اس لئے دوسری طلاق مدت مذکورہ کے اندر مشروع ہوئی، تاکہ عورت بار بار کی طلاق کی تلخی کا ذائقہ چکھ کر اور خرابی خانہ کو دیکھ کر دوبارہ اس قبیحہ کا اعادہ نہ کرے جس سے اس کے خاوند کو غصہ آوے اور اس کے لئے جدائی کا باعث ہو اور مرد بھی عورت کی جدائی محسوس کر کے عورت کو طلاق نہ دے۔

اور جب اس طرح تیسری طلاق کی نوبت آپہنچے، تو اب یہ وہ طلاق ہے جس کے بعد خدا کا یہ

حکم ہے کہ اس مرد کا رجوع اس عورت مطلقہ ثلاثہ سے نہیں ہوسکتا، اس لئے جانبین کو کہا جاتا ہے کہ پہلی اور دوسری طلاق تک تمہارا آپس میں رجوع ممکن تھا، اب تیسری طلاق کے بعد رجوع نہ ہوسکے گا، تو اس قانون کے مقرر ہونے سے وہ دونوں سدھر جائیں گے، کیونکہ جب مرد کو یہ تصور ہوگا کہ تیسری طلاق اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان بالکل جدائی ڈالنے والی ہے، تو وہ طلاق دینے سے باز رہے گا، کیونکہ جب اس کو اس بات کا علم ہوگا کہ اب تیسری طلاق کے بعد یہ عورت مجھ پر دوسرے شخص کے شرعی، معروف اور مشہور نکاح اور اس کی طلاق وعدت کے بغیر حلال نہ ہوسکے گی اور دوسرے شخص کے نکاح سے عورت کا علیحدہ ہونا بھی یقینی نہیں، پھر دوسرے نکاح کے بعد بھی جب تک دوسرا خاوند اس کے ساتھ دخول نہ کرلے، پھر اس کے بعد یا تو وہ مرجائے یا برضا ورغبت خود اُسے طلاق دیدے اور وہ عورت عدت نہ گزار لے، تب تک وہ اس کی طرف رجوع نہ کرسکے گا، تو اس وقت مرد کو اس رجوع کی ناامیدی کے خیال سے اور اس احساس سے ایک دوراندیشی پیدا ہوگی اور وہ خدا تعالیٰ کی ناپسندیدہ ترین مباح یعنی طلاق دینے سے باز رہے گا، اسی طرح جب عورت کو اس عدم رجوع کی واقفیت ہوگی تو اس کے اخلاق بھی درست رہیں گے اور اس سے ان کی آپس میں اصلاح ہوسکے گی، اور اس نکاح ثانی کے متعلق نبی علیہ السلام نے اس طرح تاکید فرمائی کہ وہ نکاح ہمیشہ کیلئے ہو، پس اگر دوسرا شخص اس عورت سے اپنے پاس ہمیشہ رکھنے کے ارادہ سے نکاح نہ کرے بلکہ خاص حلالہ ہی کیلئے کرے تو آنحضرت ﷺ نے اس شخص پر لعنت فرمائی ہے اور جب پہلا شخص اس قسم کے حلالہ کیلئے کسی کو رضامند کرے تو اس پر بھی لعنت فرمائی ہے۔

تو شرعی حلالہ وہ ہے کہ جس میں خود ایسے اسباب پیدا ہوجائیں کہ جس طرح پہلے خاوند نے اتفاقاً عورت کو طلاق دی تھی، اسی طرح دوسرا بھی طلاق دے یا مرجائے تو عورت کا عدت کے بعد پہلے خاوند کی طرف بلاکراہت رجوع درست ہے۔

پس اتنی سخت رکاوٹوں کے بعد پہلے خاوند کی طرف رجوع کے جواز کی وجہ مذکورہ بالا تفصیلات سے ظاہر وباہر ہے کہ اس میں عورت اور نکاح کی عزت وعظمت اور نعمت الٰہی کے شکر، نکاح کے دوام اور اس تعلق کے نہ ٹوٹنے کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے، کیونکہ جب خاوند کو عورت کی جدائی سے اس کے دوبارہ ملاپ کے درمیان اتنی ساری رکاوٹیں حائل ہوتی محسوس ہوں گی تو وہ تیسری طلاق تک نوبت نہیں پہنچائے گا۔'' (بحوالہ احکام اسلام عقل کی نظر میں از حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ)

رہی یہ بات کہ اس سلسلہ میں عورت ہی کو ان تمام مراحل سے کیوں گزارا گیا؟ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ شوہر ثانی سے نکاح کی شرط میں شوہر اول کو اس مفارقت وجدائی کا مزہ چکھانا مقصود

ہے اور یہ بتلانا مقصود ہے کہ بلا کسی ضرورت و مصلحت اور سوچے سمجھے طلاق دینے اور اپنے نفس کی خواہش سے مغلوب ہوکر اپنی بیوی کو علیحدہ کرنے کا یہ عذاب ہے، کیونکہ کوئی باغیرت مرد اس قدر اپنی تذلیل کو برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کے کسی غلط عمل کی وجہ سے اس کی بیوی دوسرے مرد سے نکاح کرے، اس کے بستر کی زینت بنے اور پھر وہ دوبارہ اس کے نکاح میں آئے۔

دیکھا جائے تو اس میں بھی اس خاتون کی عزت وتکریم کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس لئے کہ طلاق دہندہ مرد کو باور کرایا جارہا ہے کہ جس کو تم نے بے قدر سمجھا تھا، وہ ایسی بے قدر نہیں ہے، بلکہ وہ تو کسی دوسرے مرد سے نکاح کرکے باعزت زندگی گزارسکتی ہے، لیکن جب دوسرا شوہر اپنی مرضی سے اس کو طلاق دے دے یا وہ مرجائے اور پھر پہلا شوہر اس سے نکاح کی رغبت کرے گا تو آئندہ وہ اس عورت کی پہلے جیسی ناقدری نہیں کرے گا، بلکہ وہ اسے عزت وعظمت کا مقام دے گا۔اب بتلایا جائے کہ اس میں مرد کی توہین وتذلیل زیادہ ہے یا عورت کی؟

افسوس !!! کہ اس فطری مسئلہ پر اعتراض وہی لوگ کرتے ہیں جن کے ہاں عورت محض شہوت رانی کا ایک ذریعہ ہے، اور وہ اسے کسی شمع محفل اور داشتہ سے زیادہ حیثیت دینے کے روادار نہیں۔ قادیانیوں کی طرف سے یہ سوال دراصل اپنے آباؤاجداد یورپی مستشرقین سے مرعوبیت اوران کی ہم نوائی کا شاخسانہ ہے اور بس!

سوال: ۱۲-''حضرت محمد نے قصاص ودیت کا قانون کیوں وضع کیا؟ مثال کے طور پر اگر میں قتل کردیا جاتا ہوں، اور میرے اپنی بیوی یا بہن بھائیوں سے اختلافات ہیں تو لازماً ان کی پہلی کوشش یہی ہوگی کہ میرے بدلے میں زیادہ سے زیادہ خون بہا لے کر میرے قاتل سے صلح کرلیں اور باقی عمر عیش کریں، میں تو اپنی جان سے گیا، میرے قاتل کو پیسوں کے عوض یا اس کے بغیر معاف کرنے کا حق کسی اور کو کیوں تفویض کیا گیا؟ کیا اس طرح سزا سے بچ جانے پر قاتل کی حوصلہ افزائی نہیں ہوگی؟ کیا پیسے کے بل بوتے پر وہ مزید قتال کے لئے اس معاشرے میں آزاد نہیں ہوگا؟ پچھلے دنوں سعودی عرب میں ایک شیخ، ایک پاکستانی کو قتل کرکے سزا سے بچ گیا، کیونکہ مقتول کے اہل خانہ نے کافی دینار لے کر قاتل کو معاف کردیا تھا۔اس قانون کے نتیجے میں صرف وہ قاتل سزا پاتا ہے، جس کے پاس قصاص کے نام پر دینے کو کچھ نہ ہو۔ پاکستان ہی کی مثال لے لیں، قیام سے لے کر اب تک، باحیثیت افراد میں سے صرف گنتی کے چند اشخاص کو قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا ملی، وہ بھی اس وجہ سے کہ مقتول کے ورثا قاتل کی نسبت کہیں زیادہ دولت مند تھے۔لہٰذا انھوں نے خون بہا کی پیشکش ٹھکرادی۔اس قانون کا افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ جب

کوئی باحیثیت شخص کسی کا قتل کردیتا ہے تو قاتل کے اہل وعیال و رشتہ دار مقتول کے ورثا پر طرح طرح سے دباؤ ڈالتے ہیں اور دھمکیاں دیتے ہیں، جس پر ورثا قاتل کو معاف کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ کیا حضرت محمد نے اس قانون کو وضع کرکے ایک امیر شخص کو براہ راست ''قتل کا لائسنس'' جاری نہیں کیا؟''

جواب: اس سوال کے جواب سے پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ کسی انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان کے قتل ہوجانے کی دوصورتیں ہیں: ایک یہ کہ کسی نے جان بوجھ کر کسی کو جان سے ماردیا، دوم یہ کہ وہ کسی شکار وغیرہ کو مارنا چاہتا تھا، مگر غلطی سے اس کے نشانہ پر کوئی انسان آگیا، اور وہ مرگیا، یا اس نے سمجھا کہ سامنے والا ہیولا اور شبیہ کسی جنگلی جانور یا شکار کی ہے، مگر اتفاق سے وہ کوئی انسان تھا جو شکاری کی گولی کا نشانہ بن کر مرگیا، پہلی صورت کو قتل عمل کہتے ہیں جس کی سزا قصاص ہے، اور دوسری صورت قتل خطا کی ہے اور اس کی سزا دیت اور خوں بہا ہے، قتل عمد میں اگر مقتول کے وارث قصاص لینے کی بجائے فی سبیل اللہ، یا خوں بہا لے کر قاتل کی جان بخشی کرنا چاہیں تو شریعت نے ان کو اختیار دیا ہے... مگر اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ اگر بالفرض قاتل، قصاص سے بچ جائے تو حکومت بھی اس کو اس کی اس درندگی پر کوئی سزا نہ دے، یا اس کی درندگی کی روک تھام کے لئے اسے کسی مناسب تعزیر سے بھی بری قرار دے دے... یہی وہ صورت ہے جس پر قادیانیوں کو اعتراض ہے۔

مگر افسوس! کہ ان کا اعتراض کسی واقعی اور عقلی شبہ کی بنا پر نہیں ہے؛ بلکہ محض اپنے یورپی آقاؤں اور عیسائی محسنوں کی ہم نوائی اور خوشنودی حاصل کرنے کی ناکام کوشش ہے۔

اس لئے کہ قانون دیت وقصاص، جو دراصل قتل وغارت گری کے سد باب کا بہترین وموثر ذریعہ ہے، اس میں محض فرضی احتمالات کے ذریعے کیڑے نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو قصاص ودیت کے اس قانون کے نفاذ اور اس پر عمل درآمد کی صورت میں کسی طالع آزما کو کسی معصوم کی جان سے کھیلنے کی جرأت نہیں ہوسکتی۔

اس لئے کہ اگر گواہوں سے یہ ثابت ہوجائے کہ قاتل نے جان بوجھ کر اس جرم کا ارتکاب کیا ہے تو اس کو قصاصاً قتل کیا جائے گا، اور اگر کوئی قاتل اپنے اس جرم کی وجہ سے کیفر کردار کو پہنچ جائے تو اس سے پورے معاشرہ کو قتل وغارت گری سے نجات مل جائے گی اور آئندہ کسی قاتل کو اس گھناؤنے جرم کے ارتکاب سے پہلے سو بار سوچنا ہوگا کہ میں جو کام کرنے جارہا ہوں، اس کی سزا میں، میں خود بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا، لہٰذا اس جرم کے ارتکاب کا معنی یہ ہے کہ میں

اپنی موت کے پروانہ پر دستخط کرنے جارہا ہوں، اسی کو قرآن کریم نے یوں بیان فرمایا ہے:

”ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب“. (البقرۃ:۱۷۹)

ترجمہ: ”اور تمہارے واسطے قصاص میں بڑی زندگی ہے، اے عقلمندو!“

لیکن اگر قتل کی کسی واردات میں شواہد، قرائن اور گواہوں سے ثابت ہوجائے کہ واقعی، قاتل نے عمداً اس جرم کا ارتکاب نہیں کیا، تو اس صورت میں قاتل کو قصاصاً قتل تو نہیں کیا جائے گا، مگر چونکہ قاتل کی ہی غلطی سے مقتول کی جان ضائع ہوئی ہے، اس لئے بطور سزا اس پر یہ تاوان رکھا گیا ہے کہ مقتول کے ورثا کی اشک شوئی کے طور پر وہ مقتول کے وارثوں کو ایک انسانی جان کی قیمت: سو اونٹ یا ان کی قیمت ادا کرے گا، مثلاً: آج اگر ایک اونٹ کی قیمت ۲۵/ہزار روپے ہے تو سو اونٹ کی قیمت ۲۵ لاکھ روپے ہوگی، بھلا جو شخص ایک بار اپنی غلطی کی سزا ۲۵ لاکھ کی ادائیگی کی شکل میں بھگت لے گا، وہ آئندہ کتنا محتاط ہوجائے گا؟ اور اس کی نگاہ میں انسانی جان کی کتنی قدر و قیمت ہوگی؟

پھر چونکہ کسی مسلمان کا قتل معاشرہ کا انتہائی گھناؤنا جرم ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بہت ہی مبغوض و ناپسندیدہ ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

”ومن یقتل مومناً متعمدًا فجزآؤہ جھنم خالدًا فیھا.“ (النساء:۹۳)

ترجمہ: ”اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر تو اس کی سزا دوزخ ہے، پڑا رہے گا اسی میں۔“

اگرچہ جمہور علمائے امت اس کے قائل ہیں کہ کفر و شرک کے علاوہ ہر جرم معاف ہوسکتا ہے اور کسی جرم کی سزا ہمیشہ کے لئے جہنم کی شکل میں نہیں ہوگی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائیں گے، اس کے علاوہ جسے چاہیں گے معاف فرمادیں گے۔“

(النساء:۴۸)

مگر بہرحال اتنا تو ضرور ہے کہ ایسا شخص اگر بغیر توبہ کے مرگیا تو اسے کافی عرصہ تک جہنم میں جلنا ہوگا، اور ”خالدًا فیھا“ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ ایک عرصہ تک اسے جہنم کی سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

اس لئے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قاتل کا قصاصاً قتل ہوجانا یا دیت کا ادا کردینا اس کی آخرت کی سزا کا بدل نہیں ہے، لہٰذا اس کو ان دنیاوی سزاؤں کا سامنا کرنے کے بعد آخرت کی سزا سے بچنے کے لئے خلوص و اخلاص اور صدق دل سے توبہ بھی کرنا ہوگی، ورنہ اسے

آخرت کی سزا کا بہرحال سامنا کرنا ہوگا۔

مگر چونکہ قتل کے جرم میں حق اللہ کے ساتھ حق عبد بھی شامل ہے، اس لئے دنیاوی طور پر اس حق عبد کی وصولی کا اختیار مقتول کے ورثا کو ہی حاصل ہے، اگر وہ دعویٰ کریں گے تو شریعت ان کو ان کا حق دلائے گی اور اگر وہ اپنے اس حق سے دستبردار ہونا چاہیں، تو عقل و دیانت اور دین و شریعت انہیں اپنے اس حق کی وصولی پر مجبور بھی نہیں کرے گی، بلکہ مہذب دنیا کے کسی قانون میں یہ بات شامل نہیں کہ کوئی آدمی اپنے حق سے دستبردار ہونا چاہے اور قانون اسے دستبردار نہ ہونے دے۔

لہٰذا قادیانیوں اور ان کے ولیانِ نعمت عیسائیوں اور یورپ کے مستشرقین کی جانب سے یہ خدشہ پیش کر کے اس قانون دیت وقصاص پر اعتراض کرنا کہ: ''اگر مقتول کے وارثوں کی مقتول سے لڑائی اور اختلاف ہو تو ان کی پہلی کوشش ہوگی کہ مقتول کے قتل کے بدلے زیادہ سے زیادہ خون بہا لے کر صلح کرلیں اور زندگی بھر مزے کریں'' نہایت سفاہت و دنائت پر مشتمل ہے۔

اس لئے کہ اگر محض ان مفروضوں کی بنا پر کسی قانون کو موردالزام ٹھہرا کر اس کی افادیت کا انکار کیا جائے، تو بتلایا جائے کہ کون سا قانون اس سے مستثنیٰ ہوسکتا ہے؟

اگر ایسا ہو تو کیا دنیا میں کہیں عدل وانصاف اور جرم وسزا کا قانون روبہ عمل ہوگا؟ اگر جواب نفی میں ہے تو بتلایا جائے کہ کون سی عدالت، کون سا جج، کون سا وکیل، کون سی عدلیہ بلکہ ملک کا صدر، وزیراعظم یا بڑے سے بڑا عہدیدار اس بدگمانی سے مستثنیٰ یا محفوظ رہ سکتا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو پھر دنیا میں جرم وسزا کا قانون کیونکر نافذ ہوسکے گا؟ کیا دنیا میں کہیں عدل وانصاف کا وجود ہوگا؟

قادیانیو! ذرا عقل وہوش کے ناخن لو! اور اپنے یورپی محسنوں کی اندھی تقلید میں اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ پر ایسے لچر اعتراض نہ کرو کہ خود دنیائے کفر بھی تمہارے منھ پر تھوکنے پر مجبور ہوجائے۔

سوال: ۱۳- ''اور اسی طرح کے بے شمار سوالات میرے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ کیا ان کے بارے میں پوچھنا توہین رسالت کے زمرے میں آتا ہے؟''

جواب: اس سوال کا جواب سمجھنے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جس طرح پوری مہذب دنیا کا اصول ہے کہ جب تک کسی شخص کا زبان، بیان، اشارے کنائے اور شواہد وقرائن سے مجرم ہونا ثابت نہ ہوجائے، اس وقت تک وہ کسی سزا کا مستوجب نہیں ٹھہرتا، ٹھیک اسی طرح دین اسلام کا بھی یہی اصول ہے کہ جب تک کسی شخص کی گستاخی اور جرم قول، فعل، زبان، بیان، اشارے کنائے اور عمل کا روپ نہ دھار لے، اس وقت تک اسے مجرم باور نہیں کیا جائے گا، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہوکر

عرض کیا کہ:

"... انا نجد فی انفسنا ما یتعاظم احدنا ان یتکلم به قال اوقد وجدتموہ قالوا نعم قال ذاك صریح الایمان." (مشکوٰۃ:۱۸، بحوالہ صحیح مسلم)

یا رسول اللہ! ایسے ایسے بُرے خیالات آتے ہیں کہ گردن کٹانا تو گوارا ہے، مگر ان کا زبان پر لانا برداشت نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: یہی تو ایمان ہے۔ یعنی اگر بلا اختیار دل میں ایسے خیالات آئیں اور ان کو زبان پر نہ لایا جائے تو نہ تو وہ جرم ہیں اور نہ ہی توہین رسالت کے زمرے میں آئیں گے۔

اس تمہید کے بعد اب سمجھئے! کہ جب تک سائل کے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات نے زبان و بیان کے اظہار کی شکل اختیار نہیں کی تھی، وہ کسی جرم کے دائرے میں نہیں آتے تھے، مگر اب جب کہ سائل نے نہایت توہین و تنقیص کے انداز میں ان خیالات کو اظہار کا جامہ پہنا کر، ان کے ذریعہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کو تنقید کا نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے تو بلاشبہ یہ انداز توہین رسالت کے زمرے میں آئے گا، جس کا واضح قرینہ سائل کا توہین و تنقیص پر مبنی اگلا چودھواں سوال ہے، جس میں اس نے اس کا برملا اظہار کیا ہے کہ:

"حضرت محمد جب ایک رات میں ساتوں آسمانوں کی سیر کر سکتے ہیں، چاند کو دو ٹکڑے کر سکتے ہیں، اتنے بڑے مذہب کے بانی اور خدا کے سب سے قریبی نبی ہیں تو کیا وہ مجھے ان سوالات کی پاداش میں مناسب سزا نہیں دے سکتے؟"

گویا سائل نے نہایت جرأت، ڈھٹائی، بے باکی اور گستاخی کے انداز میں، آنحضرت ﷺ کے معجزہ معراج، شق قمر، خدا تعالیٰ کے قرب اور اسلام کے بانی ہونے کا صاف انکار کیا ہے، اس کے علاوہ سائل نے تضحیک کے انداز میں اپنی اس گستاخی پر براہ راست آنحضرت ﷺ سے سزا پانے کا مطالبہ کر کے گویا یہ باور کرانے کی ناپاک کوشش کی ہے کہ اس گستاخی پر تم تو کیا تمہارے جلیل القدر نبی بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بتلایا جائے کہ یہ گستاخی اور توہین رسالت کے زمرے میں کیونکر نہیں آئے گا؟ شاید سائل اور اس کے ہم نواؤں کو ہماری گزارشات یوں سمجھ نہ آئیں، تو ہم ان کو یہ معاملہ ایک مثال سے سمجھائے دیتے ہیں مثلاً یہ کہ:

اگر کوئی شخص صدر پاکستان جناب جنرل پرویز مشرف صاحب کے بارے میں کہے کہ: اس نے فلاں کام غلط کیا؟ فلاں معاملہ اس کا درست نہیں تھا، اس نے اقربا پروری سے کام لیا، اس نے اپنے مفادات کی خاطر اور اپنے اقتدار و مقبولیت کی خاطر یہ غلط کام کئے، اور پھر آخر میں یہ کہے کہ

اس قسم کے سوالات میرے ذہن میں آتے ہیں، کیا ان کا زبان پر لانا صدر کی توہین کے زمرے میں آئے گا؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو صدر صاحب اتنے بڑے عہدے کے حامل ہیں اور حاضر سروس جنرل اور پاکستان کے صدر بھی ہیں، تو کیا وہ مجھے ان سوالات واشکالات کی پاداش میں مناسب سزا نہیں دے سکتے؟ بتلایا جائے کہ کسی منچلے کا ایسا انداز صدر کی گستاخی میں آئیگا یا نہیں؟

سوال: ۱۴- ''جو حضرات ''ہاں'' کہیں گے، ان سے صرف یہی عرض کرسکتا ہوں کہ حضرت محمد جب ایک رات میں ساتوں آسمانوں کی سیر کرسکتے ہیں، چاند کو دوٹکڑے کرسکتے ہیں، اتنے بڑے مذہب کے بانی اور خدا کے سب سے قریبی نبی ہیں تو کیا وہ خود مجھے ان سوالات کی پاداش میں مناسب سزا نہیں دے سکتے؟ اگر ہاں! تو اے میرے مسلمان بھائیو! مجھ پر اور میری طرح کے دیگر انسان مسلمانوں پر رحم کرو اور حضرت محمد کو موقع دو، کہ وہ خود ہی ہمارے لئے کچھ نہ کچھ مناسب سزا تجویز فرمادیں گے۔''

جواب: جیسا کہ تیرھویں سوال کے جواب میں ہم عرض کرچکے ہیں کہ سائل کا یہ سوال اور سوال کا انداز! نہایت گستاخی، بے ادبی اور ڈھٹائی پر مشتمل ہے، اور یہ بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کے زمرے میں آتا ہے، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کا باعث ہوں، ان پر دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ (الاحزاب: ۵۷)

سائل کا یہ کہنا کہ: ''میرے مسلمان بھائیو! مجھ پر اور دیگر انسانوں پر رحم کرو اور حضرت محمد کو موقع دو کہ وہ خود ہمارے لئے مناسب سزا تجویز کریں'' بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی گستاخ، کسی ملک کے سربراہ یا صدر کی بدترین گستاخی کا ارتکاب کرے اور وہاں کی انتظامیہ اور پولیس سے کہے کہ مجھ پر رحم کرو اور ملک کے صدر یا سربراہ کو موقع دو کہ وہ میرے لئے کوئی مناسب سزا تجویز کرے۔ کیا خیال ہے اس ملک کی انتظامیہ اور پولیس اس کا راستہ چھوڑ دے گی یا یہ کہہ کر اسے کیفر کردار تک پہنچائے گی کہ اس گستاخی کی سزا صدر یا سربراہ مملکت نہیں بلکہ ملکی قانون و دستور کی روشنی میں ہم ہی نافذ کریں گے؟

بتلایا جائے کہ امریکا بہادر کے نام نہاد ''مسلمان باغیوں'' کو افغانستان و عراق سے پکڑ کر اور گوانتانا موبے لے کر ان کی اس ''گستاخی'' کی سزا صدر بش خود دے رہے ہیں یا اس کے آلۂ کار؟

بلاشبہ توہین رسالت کا قانون آج سے چودہ سو سال پہلے مرتب ہوچکا ہے اور گزشتہ چودہ صدیوں سے اس پر عمل ہوتا آرہا ہے اور پاکستان میں بھی ۱۹۸۴ء کے ایک صدارتی آرڈی نینس کے ذریعہ اس کا نفاذ ہوچکا ہے، لہٰذا اس گستاخ سائل سے ہم کہنا چاہیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

جگہ آپ کے خدام ہی تمہاری خدمت کے لئے موجود ہیں، اپنے شیش محل سے نکل کر سامنے آ کر گستاخی کیجئے! اور اپنا تماشا دیکھئے!!!

سوال: ۱۵- ''یاد رکھو! ایک مسلمان کا خون دوسرے پر حرام ہے اور کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ ایک مسلمان کو صرف اس کی سوچ اور عقائد کی بنا پر کافر قرار دیدے۔ یہ تو تھا اسلامی فرمان، اب ایک انسانی فرمان بھی سن لیں کہ ''دنیا کے کسی بھی مذہب سے کہیں زیادہ انسانی جان قیمتی ہے۔'' وما الینا الا البلاغ''۔ (نقل مطابق اصل... ناقل)

جواب: جی ہاں! ایک مسلمان کا خود دوسرے مسلمان پر حرام ہے اور اسلام نے ہی اس کی تعلیم دی ہے اور جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے، قرآن کریم نے اس پر سخت وعید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اور جو کوئی کسی مسلمان کو جان بوجھ کر اور ناحق قتل کرے، اسے ہمیشہ (یعنی طویل عرصہ) کے لئے جہنم میں جلنا ہوگا۔'' رہی یہ بات کہ کسی کو اس کی سوچ اور عقائد کی بنا پر کافر قرار دینے کا کسی کو حق نہیں، تو قادیانیوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی مخالفت کرنے والوں کو کافر، پکا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج کیوں قرار دیا؟ اسی طرح خود مرزا جی نے اپنے مخالفین کو جنگل کے سور اور ان کی بیویوں کو کنجریوں کا خطاب کیوں دیا؟ اسی طرح اپنے نہ ماننے والوں کو جہنمی کے ''اعزاز'' سے کیوں سرفراز فرمایا؟ اگر مرزائیوں کے مخالف مسلمان، سوچ اور عقائد کے اختلاف کی بنا پر کافر، مرتد، جہنمی اور جنگل کے سور ہیں، تو خود مرزائی پوری امت مسلمہ کی سوچ، چودہ صدیوں کے مسلمانوں اور کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم السلام سے اختلاف کرنے اور ان کی توہین وتنقیص کرنے کی وجہ سے کیونکر کافر نہیں ہوں گے؟

دیکھا جائے تو سائل کا یہ پورا سوال ہی اس کے دجل، تلبیس، دوغلا پن، نفاق اور سراسر جھوٹ پر مبنی ہے، اس لئے کہ اگر سائل کا اپنے اس قول پر اعتقاد ہوتا تو وہ سب سے پہلے اپنے آقاؤں کو اس کی تلقین کرتا، جو فلسطین، بیروت، لبنان، افغانستان، عراق اور کشمیر میں لاکھوں انسانوں کے بے جا قتل عام کا مرتکب ہیں۔ اگر قادیانی اپنے اس موقف میں سچے ہوتے تو بلاشبہ آج وہ دنیائے عیسائیت کی تائید وحمایت کی بجائے مظلوم مسلمانوں کے حق میں آواز اٹھا رہے ہوتے، مگر اخبارات ومیڈیا اس پر شاہد ہیں کہ قادیانی، عیسائیت، یورپ اور امریکا کی اس دہشت گردی پر نہ صرف خاموش ہیں، بلکہ در پردہ ان کی حمایت وتائید میں کوشاں ہیں۔

❀ ❀ ❀

دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم اور نظام تعلیم وتربیت

از: مولانا شوکت علی قاسمی بستوی
استاذ دارالعلوم دیوبند و ناظم عمومی رابطہ مدارس اسلامیہ

یہ تو ہشت سالہ عربی نصاب تعلیم پر ایک نظر تھی، دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد فضیلت کی سند دی جاتی ہے اس کے بعد کچھ خصوصی درجے بھی قائم ہیں مثلاً تکمیل افتاء، تدریب علی الافتاء، تکمیل تفسیر، تکمیل علوم، تکمیل ادب، تخصص فی الادب العربی، تخصص فی الحدیث الشریف، شعبۂ خوشخطی نیز چار سالہ تحفیظ القرآن اور پانچ سالہ اردو دینیات وفارسی کا نصاب علاحدہ ہے اسی طرح فراغت کے بعد یک سالہ کمپیوٹر ٹریننگ کورس اور دوسالہ انگریزی زبان وادب کی تعلیم کا نصاب بھی جاری ہے، فضلاء کو فرق باطلہ کے تعاقب وتردید کی تربیت بھی دی جاتی ہے اردو صحافت وانشاء کا ایک سالہ کورس بھی کئی سالوں سے چل رہا ہے۔

نصاب میں شامل علوم کی حیثیت: ہمارے اکابر علماء دیوبند نے جو نصاب جاری رکھا ہے اس میں شامل علوم دو طرح کے ہیں: (۱) علوم عالیہ (۲) علوم آلیہ۔ یعنی ایک، وہ علوم ہیں جو ضروری اور مقصود ہیں جن کی تعلیم واشاعت کے لئے دارالعلوم اور دیگر مدارس قائم کئے گئے ہیں یہ صرف چھ علوم اور ان کے متعلقات ہیں، قرآن وحدیث، فقہ، اصول تفسیر، اصول حدیث، اصول فقہ، باقی جو علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ علوم آلیہ ہیں جو پہلے علوم کے لئے ذرائع ہیں مقصود نہیں، کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے ”العلم ثلاثة: آية محكمة، سنة قائمة أو فريضة عادلة وما سوا ذلك فهو فضل“ [۱۹]، (۲) علم یعنی علم ضروری تین ہیں: (۱) قرآن کریم کی آیات کا علم (۲) احادیث شریفہ کا علم اور احکام (فریضہ عادلہ) کا علم ہے، اور ان کے علاوہ جو علوم ہیں وہ غیر ضروری (زائد) ہیں۔ اسی لئے دارالعلوم کے نصاب میں انہیں تینوں علوم پر زور دیا گیا ہے نیز قرآن کریم میں علم دین کو تفقہ سے تعبیر کیا گیا، اسی بناء پر ان علوم کو اہمیت دی

جاتی ہے، جن سے تفقہ فی الدین پیدا ہوتا ہے۔

عصری علوم کیوں شامل نصاب نہیں؟: دارالعلوم کے عربی درجات سے پہلے ۶ سالہ اردو دینیات فارسی کے نصاب میں ناظرہٴ قرآن کریم، اردو، ہندی، انگریزی زبان، حساب، جغرافیہ، تاریخ اسلام، ادب فارسی، ادب اردو، سائنس، معلومات عامہ، تاریخ اکابر دارالعلوم وغیرہ مضامین داخل ہیں لیکن عربی درجات خالص دینی مضامین پر مشتمل ہیں یا ان کے معاون مضامین پر لیکن ماضی میں بھی بعض حلقوں کی جانب سے اس پر تنقید کی جاتی رہی ہے اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور اسے نصاب کا بڑا نقص قرار دیا جاتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے نہج پر قائم مدارس اسلامیہ کا نصب العین اسلامی علوم وفنون کی تعلیم واشاعت اور مسلم معاشرہ کی دینی وملی ضروریات کی تکمیل ہے، ان کا مقصد سائنس داں، ڈاکٹر اور انجینئر فراہم کرنا نہیں ہے۔

مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں جدید عصری علوم کی پیوندکاری کا مشورہ یا مطالبہ نیا نہیں ہے قیام دارالعلوم دیوبند کے ۶ / سال بعد ۱۸۷۲ء میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح نے اپنی تقریر میں اس سلسلہ میں تین باتیں ارشاد فرمائیں: پہلی بات یہ کہ عصری تعلیم اور علوم جدیدہ کے لئے سرکاری مدارس پہلے سے موجود ہیں، ضرورت دینی تعلیم کے اداروں کی تھی، اس ضرورت کے پیش نظر، دینی تعلیم کے لئے دارالعلوم قائم کیا گیا ہے، دوسری بات یہ فرمائی کہ عصری علوم کی آمیزش دونوں کے لئے یکساں طور پر نقصان دہ ہے؛ نہ دینی علوم میں مہارت پیدا ہوگی نہ عصری علوم میں۔ کہ زمانہٴ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب کے حق میں باعث نقصان ثابت ہوگی، تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ علوم نقلیہ میں پختہ استعداد پیدا کرنے کے بعد اگر طلبہ مدارس سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں، تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ موید ہوگی۔ (۲۰)

عصری علوم شامل کرنے کا ایک فائدہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے فضلائے مدارس کی اقتصادی حالت بہتر ہوگی؛ چنانچہ بہت سے صوبوں میں سرکاری مدرسہ بورڈ قائم کئے گئے۔ ان سے دینی مدارس کو ملحق کیا گیا، ان کا نصاب مخلوط رکھا گیا، ان کے فضلاء کو سرکاری تنخواہ بھی دی گئی۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ ان اداروں نے اپنی افادیت، خودمختاری، علمی وفکری وانتظامی آزادی کھودی، وہ نرے سرکاری اسکول ہی بن کر رہ گئے۔ الا ماشاء اللہ۔ اب بڑے پیمانہ پر مرکزی حکومت نے مرکزی مدرسہ بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے؛ دینی مدارس میں حقیقی روح باقی

رکھنے کے سلسلہ میں کوشاں اور فکر مند حضرات علماء کرام قائدین عظام متفکرین، بڑے اداروں نے کھل کر اس کے نقصانات بیان کئے ہیں اور اس فیصلہ کی مخالفت کی ہے، جن میں مسلم پرسنل لا بورڈ، دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جمعیت علماء ہند، دارالعلوم وقف دیوبند، مظاہرالعلوم سہارنپور، تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، پیش پیش ہیں اور اسے مدارس اسلامیہ کو ان کے نصب العین سے پھیر دینے، مدارس کی روح ختم کردینے اور آزادی سلب کرنے کی سمت خطرناک قدم قرار دے رہے ہیں، اسی لئے اکابر دیوبند نے ہمیشہ سرکاری امداد سے اجتناب کی تاکید ہی کی ہے۔

اکابر دارالعلوم دیوبند کی، عصری علوم کے سلسلہ میں، رائے یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ کے عربی نصاب (فضیلت) کو نہ چھیڑا جائے اور اس میں عصری علوم کی پیوندکاری نہ کی جائے، ہاں عربی نصاب سے پہلے دینیات وغیرہ کے نصاب میں ضروری عصری علوم کو دارالعلوم دیوبند کے نہج پر دیگر مدارس میں شامل کیا جائے، نیز فراغت کے بعد فضلاء کے لئے انگریزی زبان وادب کی تعلیم کا نظم بھی قائم کیا جاسکتا ہے، یہاں یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ حضرات علماء کرام نے کبھی انگریزی زبان کی مخالفت نہیں کی ہے، ہاں انگریزی تہذیب وکلچر کی مخالفت پہلے بھی کی ہے اور اب بھی کررہے ہیں۔

دینی مدارس سے فراغت کے بعد مزید عصری تعلیم کے لئے دیگر عصری جامعات کی طرف بھی رخ کرنے کی اجازت حضرت نانوتویؒ نے بھی دی ہے۔ (روداد دارالعلوم ۱۲۹۰ھ، ص:۱۱۲ وخطبۂ صدارت اجلاس مدارس منعقدہ ۱۴۱۵ھ) کیوں کہ پہلے تجربہ کیا جاچکا ہے، نصاب سے بے جا چھیڑ چھاڑ کی گئی اور جوہری اور بنیادی تبدیلیاں کردی گئیں تو تفقہ فی الدین اور رسوخ فی العلم کے حامل رجال کار وافراد، علوم وفنون کے ماہرین ومحققین، محدثین، مفسرین، فقہاء، اور اصحاب بصیرت علماء پیدا نہیں ہوں گے، یوں بھی انحطاط کا دور ہے مردم گردی اور افراد سازی متاثر ہوچکی ہے، اگر اکابرؒ کے منہاج اور ان کے مزاج ومذاق کو خیرباد کہہ دیا گیا تو شخصیت وکردار کے حامل ''دل روشن'' اور ''زبان ہوش مند'' رکھنے والے، علماء حق پیدا نہیں ہوں گے اور حالت اس حد تک پہنچ جائے گی جو حضرت اکبرالہ آبادیؒ نے برطانوی سامراج میں تعلیم کی بیان کی ہے کہ؂

تعلیم جو دی جاتی ہے یہاں وہ کیا فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

نظام تعلیم: دارالعلوم قائم کرکے ہمارے اکابر نے ایسا نظام تعلیم پیش کیا جس سے باصلاحیت علماء، قوم وملت کے مخلص خادم اور فخرِ روزگار، افراد تیار ہوں، اس نظام کے حسب ذیل خدوخال ملحوظ رکھے گئے ہیں اور آئندہ ان پر سختی کے ساتھ کاربند رہنے کی تاکید کی گئی۔

(۱) مدارس دینیہ کا نظام عوامی چندہ کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ سرکاری امداد سے مکمل اجتناب برتا، تاکہ پوری آزادی اور مکمل سکون واطمینان کے ساتھ، مدارس کے نظام کو استوار رکھا جاسکے، اوراس سے سرموانحراف نہ کیا جائے، اس سلسلہ میں بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے اپنے اصول ہشت گانہ میں تاکید فرمائی ہے، چنانچہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب عثمانی فرماتے ہیں:

اسکے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کیلئے — کوئی سرمایہ بھروسے کا ذرا ہوجائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور تعلق کا چراغ — یوں سمجھ لینا کہ بے نور وضیاء ہوجائے گا

اس اصول پر عمل پیرا رہتے ہوئے ذمہ داران دارالعلوم نے حکومتی امداد سے اجتناب برتا ہے اور دوسرے مدارس کے ذمہ داران کو بھی یہی نہج اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔

(۲) نصاب تعلیم خالص دینی رکھا گیا ہے تاکہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کی جاسکے، اور ایسے افراد تیار ہوں جو علوم اسلامیہ کی حفاظت واشاعت اور اسلام کی حقیقی روح کے تحفظ اور معاشرے کی دینی ضرورت کی تکمیل کا فریضہ انجام دے سکیں۔

(۳) نظم ونسق کی بنیاد شوریٰ کو قرار دیا حضرت نانوتویؒ کے اصول ہشت گانہ میں اس کی صراحت بھی کی گئی ہے تاکہ مقاصد تاسیس سے ہم آہنگ نظام جاری کیا جاسکے، اور کوئی ناگوار بات پیش نہ آئے۔

(۴) طے کیا گیا کہ تعلیمی عملہ باہمی متفق المشرب ہو، اساتذہ صلاحیت اور صالحیت کے حامل رکھے جائیں جو طلبہ کی استعداد سازی اور کردار سازی کو اپنا نصب العین بنائیں۔

(۵) طلبہ عزیز کی خیرخواہی پیش نظر رہے، طلبہ کی تعلیمی وتربیتی ضروریات کی تکمیل کی جائے ان کے قیام وطعام کا بہتر نظم کیا جائے۔

(۶) تعلیم کے ساتھ طلبہ کی شبانہ روز تربیت پر خصوصی توجہ رکھی جائے، علماء دیوبند کے مسلک حق کے مطابق ان کی ذہن سازی کی جائے، فرق باطلہ کے تعاقب کی تربیت دی جائے، عقائد عبادات، اخلاق اور معاملات ومعاشرت میں اسلامی تعلیمات کو مشعل راہ بنانے پر زور دیا

جائے اور خدمت خلق کا جذبہ بیدار کیا جائے، ان کی شبانہ روز مصروفیات، اور سرگرمیوں پر نظر رکھی جائے، اور مخرب اخلاق امور سے بچنے کی تاکید کی جائے، ان سب امور کے انجام دینے کے لئے دارالاقامہ کے نظام کو چست بنایا جائے۔

(۷) مدارس کا نظم استوار رکھنے کے لئے دستور العمل تجویز کیا جائے اور اس کی پابندی ضروری سمجھی جائے۔

(۸) داخلہ، امتحانات، اسباق کی پابندی، مذاکرہ وتکرار کے نظام کو چست رکھا جائے۔

(۹) اساتذہ کرام دوران تدریس حل کتاب، استعداد سازی پر توجہ مرکوز رکھیں۔

(۱۰) دوران تدریس اختصار کے ساتھ کتاب حل کرنے کی کوشش کی جائے، کتاب کے مشکل مقامات حل کرنے میں پوری توجہ سے کام لیا جائے، طلبہ کو مآخذ سے روشناس کرانے کا اہتمام کیا جائے اور غیر ضروری بحثوں سے احتراز کیا جائے۔

(۱۱) نصاب کی تکمیل کرائی جائے، تدریس میں یکسانیت ہو، ماہانہ سہ ماہی اور ششماہی مقدار خواندگی مقرر کی جائے۔

(۱۲) جس استاذ کو جس فن سے زیادہ مناسبت ہو تدریس کے لئے اسی فن کی کتاب اس کے حوالہ کی جائے۔

(۱۳) امتحانات پوری احتیاط سے لئے جائیں درجۂ چہارم عربی کے امتحانات میں بالخصوص پوری احتیاط برتی جائے اور ان جماعتوں میں طلبہ کا اوسط حاضری دوسرے درجات سے بڑھا دیا جائے۔

(۱۴) ابتدائی تعلیم اچھے اور تجربہ کار اساتذہ کے سپرد کی جائے۔

(۱۵) اوّل، دوم اور سوم عربی کے طلبہ کا ماہانہ امتحان لیا جائے۔

(۱۶) سال چہارم عربی تک تمرین وانشاء پر زیادہ زور دیا جائے۔

(۱۷) مدرسین کو اسباق اتنے دیئے جائیں کہ وہ تدریس کی ذمہ داریوں سے صحیح طریقہ سے عہدہ برآ ہوسکیں۔

(۱۸) مدرسین کے انتخاب میں صلاح وتقویٰ، علمی استعداد، بلند اخلاقی معیار، سلامتی طبع، تدریس اور طلبہ کی تربیت سے دل چسپی کو ملحوظ رکھا جائے۔

(۱۹) اساتذہ، اعلیٰ کتابوں کی طرف مراجعت کرکے طلبہ میں اعلیٰ معیار پیدا کرنے کی

جدوجہد کریں۔

(۲۰) سال ششم عربی سے دورۂ حدیث شریف تک امتحانات کے پرچے عربی میں حل کرنے کی ترغیب دی جائے۔

(۲۱) طلبہ میں عربی ذوق پیدا کرنے کے لئے عربی مجلّات وصحف منگائے جائیں اور دارالمطالعہ قائم کیا جائے۔

(۲۲) طلبہ میں تقریر وخطابت کا ذوق پیدا کرنے کے لئے جمعہ کی رات میں خطابت کی مجلسیں منعقد کرنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے۔ ان میں سے بہت سے امور وہ ہیں جو گذشتہ چند سالوں میں مدارس اسلامیہ کے دارالعلوم میں منعقد اجلاسوں میں غور وخوض کے بعد نظام تعلیم کو چست وفعال بنانے کے لیے طے کئے گئے ہیں۔

نظام تربیت: دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور ذمہ داران حضرات نے تعلیم کے ساتھ تربیت پر خصوصی توجہ دی ہے، نظری تعلیم اور عملی تربیت کا حسین امتزاج ہی دارالعلوم دیوبند کا خصوصی امتیاز رہا ہے، شاعر حکیم، اکبرالہ آبادیؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں ❁ آدمی، آدمی بناتے ہیں

دارالعلوم نے اسلام کے اس پیغام کو دنیا میں عام کیا ہے کہ تعلیم برائے تعلیم نہیں بلکہ تعلیم برائے عمل ہونی چاہئے، یہی وجہ ہے کہ یہاں کے علماء درکفے جام شریعت، درکف سندان عشق کا مصداق رہے ہیں اور دارالعلوم کا یہی وہ مزاج ومذاق تھا جس نے شخصیت سازی ومردم گری میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے والد ماجد، حضرت مولانا محمد یٰسین صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے دارالعلوم دیوبند کا وہ دور دیکھا ہے جب اس کے ایک چپراسی سے لے کر صدر مدرس اور مہتمم تک ہر ہر شخص ولی کامل تھا، دن کے وقت یہاں مختلف علوم وفنون کے چرچے ہوتے تھے، اور رات کے وقت ذکر وشغل سے چپہ چپہ بقعۂ نور بنا رہتا تھا(۲۱) شاعر مشرق فرماتے ہیں:

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا، بے آہ سحر گاہی

حضرت مولانا مفتی محمد عثمان مدظلہ فرماتے ہیں دارالعلوم دیوبند کی نیو علم وعمل کے سنگم پر اٹھائی گئی تھی اور اس میں جس قدر توجہ، طلبہ کی علمی صلاحیت بڑھانے کی طرف دی جاتی تھی اس

سے زیادہ ان کی عملی تربیت اوران پرادا، ادامیں، اسلاف کا رنگ چڑھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا، وہاں دلوں میں خوف وخشیت کی آب یاری ہوتی تھی، وہاں عبادت کا ذوق پروان چڑھایا جاتا تھا، وہاں حلال وحرام بلکہ مکروہ ومستحب اور خلاف اولیٰ کا صرف علم نہیں بلکہ ان کی عملی فکر اوران کی اہمیت، دلوں میں جاگزیں کی جاتی تھیں، وہاں عبادات وطاعات کے علاوہ معاشرت، معاملات اوراخلاق کوسنت کے مطابق ڈھالا جاتا تھا، وہاں ایثار وتواضع، تحمل، بردباری، سادگی، اخلاص و للّٰہیت کے ملکات پیدا کیے جاتے تھے، وہاں ایک ایک فرد کے دل میں یہ بات بٹھادی جاتی تھی کہ علم برائے علم اس کا مطمح نظر نہیں اور نہ تحصیل علم کا مقصد، مال وجاہ کا حصول ہے بلکہ اصل مقصد اپنے آپ کواعلیٰ اسلامی اوصاف سے آراستہ کرنا اوراس کے بعد انہی اوصاف کودوسروں تک منتقل کرنا ہے، اس کے لئے وہاں ہرہر طالب علم کے لئے ضروری تھا کہ کسی نہ کسی مصلح سے اصلاح و تربیت کا خصوصی تعلق قائم کرے، آپ کوعلماء دیوبند میں جتنی شخصیات نظر آئیں گی، وہ سب کسی نہ کسی شیخ کی تربیت یافتہ اوران کی صحبت وخدمت سے فیض یاب تھیں۔(۲۲)

علماء دیوبند کی ہمہ جہت خدمات: علماء دیوبند نے جو ہمہ جہت خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ کا روشن باب ہے، انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت، علوم اسلامیہ، کی تعلیم واشاعت، ولی اللّٰہی منہاج پر دین وملت کی خدمت، اسلام دشمن طاقتوں اور باطل تحریکات کی سرکوبی، دینی تعلیم کی اشاعت کے لئے، مدارس ومکاتب کے قیام، ملک کوانگریزوں کے پنجہ استبداد سے دارگزار کرانے کے سلسلہ میں، کاروان حریت کی قیادت، مختلف علوم وفنون کی تالیف و تربیت سے اسلامی کتب خانہ کو مالا مال کرنے، عظمت صحابہ اورعزت اسلاف کی صیانت، منکرین ختم نبوت، ومنکرین حدیث وغیرہ کے تعاقب، بدعات وخرافات کی بیخ کنی، معاشرہ کی اصلاح و تجدید کی مساعی جمیلہ، دینی دعوت وتبلیغ کے فروغ، سرمایۂ ملت کی نگہبانی، اسلامی ثقافت کی پاسبانی، ملت اسلامیہ کی دینی، سیاسی اورملی قیادت کے حوالہ سے اپنی زریں خدمات اورتابناک کارناموں کے جولازوال نقوش تاریخ کی پیشانی پرثبت کئے ہیں وہ رہتی دنیا تک چمکتے رہیں گے اور پوری انسانیت کے لئے مینارۂ نور بنے رہیں گے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

دارالعلوم دیوبند کی یہ ہمہ جہت خدمات اس کی جن عظیم شخصیتوں اور مایہ ناز سپوتوں کے ذریعہ انجام پائیں، وہ پوری ملت اسلامیہ کے لئے سرمایہ افتخار تھیں، اتنی مدت میں اتنی عظیم، جلیل

القدر اور نادرۂ روزگار ہستیاں کسی اور ادارے میں پیدا نہیں ہوئیں، ذیل میں ہم چند اکابر کے اسماء گرامی پیش کررہے ہیں جن میں سے ہر شخصیت بذات خود آفتاب و ماہ تاب کا درجہ رکھتی ہے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، امام العصر علامہ انور شاہ کشمیریؒ، محدث جلیل حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، جانشین امام نانوتویؒ مولانا محمد احمد صاحب قاسمی نانوتویؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، متکلم اسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی، امام دعوت وتبلیغ مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ، جامع المعقول علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا فخرالحسن گنگوہیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ، محدث کبیر مولانا ظفر احمد عثمانیؒ، فقیہ العصر مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، مدبر اسلام حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین صاحب مرادآبادیؒ، مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوریؒ، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ، محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ، مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، مولانا مناظر حسن صاحب گیلانیؒ، مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ، مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ، مولانا خیر محمد جالندھریؒ، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ، مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادیؒ، مولانا جمیل احمد صاحب تھانویؒ، مولانا عبدالحق صاحب اکوڑویؒ، مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندیؒ، بقیۃ السلف مولانا محمد زکریا صاحب، مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادیؒ، مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ، فدائے ملت مولانا سید اسعد صاحب مدنیؒ، مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ، مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحبؒ، مولانا معراج الحق صاحب دیوبندیؒ، مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ، مولانا قاضی زین العابدین صاحب میرٹھیؒ وغیرہ۔

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم ☆ اذا جمعتنا یا جریر المجامع

نصاب کے متعلق چند گذارشات: دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم و تربیت کی جامعیت، اثر انگیزی اور شخصیت سازی میں اس کی بے حد کامیابی کی دلیل مذکورہ بالا شخصیات کے اسماء گرامی ہیں، جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح کسی ادارے کے تربیت یافتہ افراد، اور کسی نصاب کی فیض یافتہ حضرات سے ادارہ کی کارکردگی اور نصاب و نظام کی کامیابی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اس لئے نصاب میں کسی بنیادی تبدیلی کی

ضرورت نہیں ہے کیونکہ جو نصاب کے دینی و اسلامی مضامین ہیں وہی نصاب کی روح ہیں ان کو کم کرنا یا ثانوی درجہ دینا، نصاب کی روح کو ختم کرنے اور مدارس کو ان کے نصب العین سے پھیرنے کے مرادف ہوگا، لیکن نصاب سے مطلوبہ مقاصد پورے ہورہے ہیں یا نہیں، اس کا جائزہ لینے اور نصاب کو مقاصد تاسیس اور نصب العین کے حصول کے لئے فعال اور مزید موثر بنانے کے لئے غور وخوض اور تبادلہ خیالات ہوتے رہنا چاہئے اور اس کو مفید سے مفید تر بنانے اور بعض جزوی ترمیمات جو مقاصد سے ہم آہنگ ہوں، ان پر غور جاری رہنا چاہئے، اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام مدارس اسلامیہ عربیہ کی کل ہند تنظیم رابطہ مدارس اسلامیہ کے قیام ۱۴۱۵ھ سے لے کر اب تک متعدد اجلاس میں نصاب تعلیم اور مدارس کے متعلق موضوعات پر غور ہوا ہے، بہت سی مفید تبدیلیاں کی گئی ہیں، بعض حضرات نے اپنے مضامین وغیرہ میں بھی بعض اہم مشورے دیئے ہیں، بالخصوص جناب مولانا سید سلمان صاحب ندوی نے بھی اپنی قیمتی کتاب ''ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو'' میں بعض نہایت قیمتی اور مفید تجاویز پیش کی ہیں، اگرچہ ان کے ذکر کردہ خیالات و تجاویز میں بعض سے ممکن ہے اتفاق نہ کیا جاسکے۔ اس اہم کتاب میں دارالعلوم دیوبند کا تفصیلی نصاب درج کرنے کے بعد مولانا محترم فرماتے ہیں:

> ''ہر نئی چیز پر سر ہلا دینا اور کچھ رٹے ہوئے نام عبقری شخصیات کے، دہرانے لگنا، جن کی شخصیت سازی میں بہت سے عوامل کارفرما ہے، نہ عاقلانہ جواب ہے نہ کسی سنجیدہ غور وفکر کا پتہ دیتا''۔

مولانا موصوف کا یہ تبصرہ، خود مولانائے محترم کے سنجیدہ ذہن وفکر سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ جن عبقری شخصیات کے رٹے ہوئے نام پیش کئے جاتے ہیں ان کی شخصیت سازی میں جو بہت سے عوامل کارفرما رہے ہیں وہ ان کے سوا اور کیا ہیں جن پر سطور بالا میں روشنی ڈالی گئی ہے اور جو دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم و نظام تعلیم و تربیت کے خصوصی امتیازات ہیں، یہی وہ امتیازات تھے جن کی بناء پر خود حضرت مولانا عبدالحئی صاحب حسنیؒ نے صاحبزادہ محترم حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کو دارالعلوم دیوبند، تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا، انھوں نے یہاں کے اکابر حضرات اساتذہ کے فیوض و برکات سے اپنے دامن کو مالا مال کیا پھر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بخاری و ترمذی کے درس میں شرکت فرمائی اور ان کے علمی اور روحانی فیضان سے مستفیض

ہوئے، کون نہیں جانتا کہ حضرت مولانا ندویؒ میں جو عبقریت وجامعیت، ژرف نگاہی، دینی حمیت وغیرت، علمی رسوخ، زہدودنیا بیزاری وغیرہ کمالات وامتیازات تھے ان میں جہاں خاندانی روایات، جلیل القدر والدمحترم اور برادر اکبر حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی خصوصی تربیت، ندوۃ العلماء کا علمی ماحول وغیرہ امور کارفرما رہے ہیں، وہیں دارالعلوم دیوبند کی علمی، دینی اور روحانی فضا، حضرت شیخ الاسلامؒ اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری وغیرہ اکابر کی توجہات وعنایات کا بھی بے حد دخل رہا ہے۔

چند گذارشات:

(۱) عربی نصاب شروع کرنے سے پہلے ہر مدرسے میں، اردو دینیات اور پرائمری کی تعلیم ضروری قرار دی جائے اور دینیات کے ساتھ کم از کم درجہ پانچ تک پرائمری کا وہی نصاب پڑھایا جائے جو سرکاری اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے، امتحان بھی سرکاری بورڈ کے ذریعہ کرایا جائے اس کی تاکید دارالعلوم دیوبند میں منعقد اجتماع مدارس اسلامیہ کی ایک تجویز میں بھی کی گئی ہے اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ نے بھی اس کا مشورہ دیا ہے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر طالب علم دینی مضامین کے ساتھ بنیادی عصری مضامین پڑھ سکے گا۔

(۲) ہر مدرسے کے زیر انتظام زیادہ سے زیادہ مکاتب قائم کئے جائیں اور مذکورہ طریقے پر تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

(۳) مدارس اسلامیہ جو دارالعلوم دیوبند کے نہج پر ہیں وہ دارالعلوم کا مکمل نصاب نافذ کریں اور مذکورہ بالا نظام تعلیم وتربیت کی روشنی میں نظام قائم کریں۔

(۴) بہت سے مدارس میں عربی تمرین پر توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، ابتدائی درجات میں خاص طور پر عربی تعلیم اور بولنے لکھنے پر توجہ دی جائے، تاکہ عربیت کا ذوق فروغ پائے۔

(۵) فرق باطلہ کے تقابلی مطالعہ اوران کے تعاقب کی طلبہ کو تربیت دی جائے۔

(۶) نصاب میں شامل کتابوں کو جدید انداز میں طبع کرایا جائے، ذیلی عنوانات لگائے جائیں، رموز املاء کا استعمال کیا جائے، تمرینی سوالات کا اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

(۷) نحو وصرف وبلاغت وغیرہ کی تعلیم آسان انداز میں دی جائے، قواعد کے اجراء اور تطبیق پر زیادہ توجہ دی جائے، فلسفۂ نحو وصرف وبلاغت نہ پڑھایا جائے۔

(۸) تحریر وخطابت کے سلسلہ میں طلبہ کی رہ نمائی کی جائے، ان میں علمی، ادبی، اور دعوتی ذوق پیدا کیا جائے، مختلف موضوعات پر ان سے مقالے لکھوائے جائیں، تقریری مقابلے کرائے جائیں اور اسلام، مسلمانوں اور مدارس اسلامیہ کو درپیش چیلنجوں سے انہیں آگاہ رکھا جائے۔

نوٹ: اس مقالہ کا خلاصہ ناچیز نے جناب مولانا محمد سلمان ندوی زید فضلہ کے زیر اہتمام **جامعة الشيخ احمد بن عرفان الشهيد** کٹولی، ملیح آباد میں ''برصغیر کے مدارس اسلامیہ کا نصاب تعلیم ونظام تربیت'' کے موضوع پر مورخہ ۱۴، ۱۵، ۱۶ر محرم ۱۴۲۸ھ کو منعقد سیمینار میں پیش کیا، ہر مقالہ کے بعد مختصر وقفہ سوال وجواب وعلمی مناقشہ کا رکھا گیا تھا۔ اس مقالہ کے بعد بھی چند حضرات شرکاء سیمینار نے کچھ سوالات کیے ناچیز نے ان کے جوابات دیئے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مختصراً ان سوالات وجوابات کو بھی پیش کردیا جائے:

(۱) پہلا سوال یہ کیا گیا کہ مقالہ میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ دارالعلوم میں درس نظامی کا نصاب من و عن نافذ نہیں کیا گیا بلکہ اس میں ترمیم کرنے کے بعد نافذ کیا گیا، سوال یہ ہے کہ وہ ترمیم کیا تھی؟ ناچیز نے عرض کیا کہ ایک بنیادی تبدیلی تو یہی تھی کہ پہلے درس نظامی میں حدیث شریف کی صرف ایک کتاب مشکوٰۃ المصابیح تھی وہ بھی نامکمل، لیکن دارالعلوم میں دورۂ حدیث سے پہلے مشکوٰۃ شریف مکمل داخل کی گئی اور دورۂ حدیث شریف میں حدیث شریف کی دس کتابیں شامل درس کی گئیں، اور اب تو مشکوٰۃ سے پہلے دو مزید کتابیں، مشکوٰۃ الآثار اور الفیۃ الحدیث بھی داخل ہیں۔

(۲) دوسرا سوال یہ کیا گیا کہ درس نظامی میں بعض کتابیں ایسی ہیں جو نصاب کے لیے نہیں لکھی گئی ہیں اور نہ وہ داخل نصاب کیے جانے کے لائق ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ کسی کتاب کی نشان دہی کی جائے تو سائل محترم نے کہا کہ مثلاً ہدایہ! ناچیز نے عرض کیا کہ ہدایہ اسلامی قانون کی مقبول ترین کتاب ہے، جس کی اہمیت اپنوں اور غیروں نے تسلیم کی ہے۔ اسلامک لا پڑھانے کے لیے کتاب کا ترجمہ وکلاء کو بھی پڑھایا جاتا ہے۔ اسلامک فقہ، اور مسائل شریعت پر اتنی معتبر اور مستند کتاب کوئی اور نہیں لکھی گئی جس میں احکام شرعیہ کے نقلی اور عقلی دلائل بیان کیے گئے ہیں۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ نے آخر کیوں اسے نصاب کے لیے غیر موزوں سمجھا۔

(۳) ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ نے کہا کہ دارالعلوم کے نصاب کا مقصد پڑھنے والوں میں تفقہ فی الدین پیدا کرنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر عصری علوم نصاب میں کیوں شامل نہیں؟ احقر نے عرض کیا کہ اکابر دارالعلوم نے بعض ضروری عصری علوم کو عربی نصاب سے پہلے پڑھائے جانے والے دینیات و فارسی کے نصاب میں شامل رکھا ہے۔ البتہ عربی درجات کے نصاب (عالمیت) میں عصری علوم شامل نہیں تاکہ طلبہ علوم قرآن وسنت میں رسوخ پیدا کریں اور تمام تر توجہ انہی علوم کی تحصیل پر مرکوز رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نصاب کو پڑھ کر ایسے باکمال، محقق اور تبحر کے حامل علماء تیار ہوئے جن کی عظمت کا اعتراف عالمی شخصیات نے کیا ہے۔ علامہ رشید رضا مصری، صاحب تفسیر المنار دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے۔ یہاں سے وہ دیوبند بھی تشریف لے گئے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی رحمہ اللہ نے ایک جگہ نقل فرمایا ہے کہ علامہ رشید رضاؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے درس میں شریک ہوئے اور فرمایا: ما رأيت مثل هذا الشيخ الجليل قط" اور واپس مصر تشریف لے جانے کے بعد انھوں نے اپنے مجلّہ میں تحریر فرمایا:
ما قرّت عيني في الهند بمثل ما قرت برؤية جامعة ديوبند، ولو لم أرها لرجعت من الهند حزينا"
میں نے عرض کیا کہ فضیلت کے بعد عصری علوم کیلئے عصری جامعات کا رخ کیا جاسکتا ہے۔

(۴) ایک صاحب نے سوال کیا کہ دارالعلوم دیوبند میں جو ادب پڑھایا جاتا ہے اس سے طلبہ کو کیسے الفاظ کا ذخیرہ دیا جاتا ہے: قدیم یا جدید؟۔ ناچیز نے عرض کیا کہ ادب ہمارے نزدیک قرآن وحدیث کا خادم ہے اس لیے بنیادی طور پر ہم وہ الفاظ طالب علم کو دیتے ہیں جن سے وہ قرآن وحدیث کے الفاظ کو آسانی سے سمجھ لے لیکن ساتھ میں ہمارے یہاں طلبہ کو ایسے الفاظ کا ذخیرہ بھی دیا جاتا ہے جن سے وہ اپنے مافی الضمیر کو جدید اسلوب بیان میں پیش کرسکیں اور دوسروں کی جدید تعبیرات کو سمجھ بھی سکیں۔ میں دونوں کی ایک ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاویؒ دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز فرزند تھے، انھوں نے قدیم ذخیرۂ الفاظ وتعبیرات پر نہایت مستند لغت مصباح اللغات مرتب فرمائی جسے بڑا قبول عام حاصل ہوا، استاذ گرامی حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ نے جدید الفاظ وتعبیرات پر کئی لغات: القاموس الجدید عربی اردو، اردو عربی، اور القاموس الوحید مرتب

فرمائی۔ عربی زبان و ادب سے اشتغال رکھنے والے حضرات ان کی ضرورت، اہمیت اور افادیت ومقبولیت سے بخوبی واقف ہیں۔ بحمد اللہ اس علمی مناقشہ کو سامعین کرام نے پسند کیا، مقالہ کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے ناچیز نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ امریکہ اور اسرائیل کے دباؤ میں بعض عرب ممالک میں دینیات کے نصاب میں تخفیف کی گئی ہے۔ پاکستان پر بھی دباؤ ہے کہ وہ مدارس کے نصاب و نظام میں تبدیلی کرے۔ اگر ہم نے مدارس اسلامیہ کے نصاب میں کوئی بنیادی تبدیلی کی تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ یہ امریکہ وغیرہ کے دباؤ میں کیا جارہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ دارالعلوم اور ملحقہ مدارس کا نصاب اپنے مقاصد میں سوفیصد کامیاب ہے اس لیے اس میں کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت نہیں، جہاں تک جزوی تبدیلی کی بات ہے تو اس پر ماضی بعید میں بھی غور ہوتا رہا ہے اور پچھلے چند سالوں میں رابطہ مدارس اسلامیہ کے اجلاسوں میں غور وخوض کیا جاتا رہا ہے۔

❁ ❁ ❁

حواشی:

(۱) (العلق:۱تا۵)۔

(۲) سنن ابن ماجہ/ باب فضل العلماء۔

(۳) (تقدمۃ الجرح والتعدیل،ص:۸)۔

(۴) تاریخ دارالعلوم،ص:۲۷،ج:۱۔

(۵) نصاب تعلیم دارالعلوم دیوبند،ص:۱۔

(۶) رحمۃ اللہ الواسعۃ ۱/۳۷۔

(۷) الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر،ص:۳۶۰۔

(۸) رود کوثر،ص:۵۵۱۔

(۹) ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون،ص:۳۲۔

(۱۰) نظام تعلیم وتربیت۔

(۱۱) مسلمانوں کا روشن مستقبل،ص:۱۷۱۔

(۱۲) ہمارا تعلیمی نظام،ص:۱۳۴۔

(۱۳) ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون،ص:۳۱-۳۲۔

(۱۴) نظام تعلیم وتربیت،ص:۳۵۷،ج:۱۔

(۱۵) دیباچہ غالب نامہ ۱۴، نظام تعلیم وتربیت،ج:۱،ص:۳۶۰۔

(۱۶) الرشید، دارالعلوم نمبر،ص:۱۴۵۔

(۱۷) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت،ص:۲۴۲،ج:۱۔

(۱۸) درس نظامی،ص:۶۲۔

(۱۹) مشکوٰۃ شریف،ص:۳۵۔

(۲۰) روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۹۰ھ،ص:۱۱۲۔

(۲۱) مجالس مفتی اعظم،ص:۵۶۰۔

(۲۲) ہمارا تعلیمی نظام،ص:۹۳۔

❁ ❁ ❁

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

شمارہ: ۸	رجب-شعبان ۱۴۲۸ھ مطابق اگست ۲۰۰۷ء	جلد: ۹۱

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند- ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۰ روپئے، سالانہ -/۱۰۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۶۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۱۲۵ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۱۵۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411077577 *(EDITOR)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبرشمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	بدیہیات قرآن - حکمتیں اور فائدے	مولانا محمد عارف مبارکپوری	۷
۳	سیرت پاک ﷺ دعاؤں کی روشنی میں !	سعیدالظفر رامپوری	۱۷
۴	ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد باعثِ رحمت یا...	فاروق اعظم عاجزؔ کھگڑیاوی	۲۴
۵	ضروری اطلاع	....	۳۴
۶	اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگذر	ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی	۳۵
۷	فتنۂ قادیانیت کا سدباب اور علماء کی ذمہ داریاں	مولانا انصاراللہ قاسمی	۴۲
۸	امیرالہند مولانا سید اسعد مدنیؒ اور علی مسلم یونیورسٹی	محمد شمیم اختر قاسمی	۴۸

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

❁ ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔

❁ چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔

❁ پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔

❁ ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی حسبِ ذیل بیان کئے ہیں: (۱) تلاوت آیات (۲) تعلیم کتاب (قرآن) وحکمت (سنت) (۳) تزکیۂ قلوب۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہ عَلَی المؤمِنِینَ اِذْ بَعَثَ فِیھِمْ رَسُوْلاً مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ آیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ الآیۃ.

(اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر احسان فرمایا کہ ان میں بھیجا ایک رسول انھی میں سے پڑھتا ہے ان پر اس کی آیتیں اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے)

خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے مقصد بعثت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے: ”بُعِثْتُ مُعَلِّمًا“ اور ”بعثت لاتمم مکارم الاخلاق“ یعنی میں اس لئے بھیجا گیا ہوں تاکہ اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام وفرمان سے باخبر کروں اور انسانوں کو تمام مراتب شرک، معصیت اور نفسانی آلائشوں سے پاک وصاف کرکے انھیں اخلاق وکردار کے بلند مقام پر پہنچادوں۔

قرآن وحدیث کی ان تشریحات سے پتہ چلتا ہے کہ ”اسلام“ اور تعلیم وتزکیہ کی تاریخ ساتھ ساتھ چلتی ہے اسلام کا آغاز ہی تعلیم وتزکیہ کی ابتداء ہے اور ان میں باہم چولی دامن کا

ساتھ ہے، اس لئے اسلام بغیر علم وتزکیہ کے ایک جثہ بے روح ہے اور تزکیہ وتعلیم کا تصور بغیر اسلام کے ایک فریب محض ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی تبلیغ و دعوت کے ساتھ تعلیم وتزکیہ کا بھی پورا پورا اہتمام فرماتے تھے، مکہ کی زندگی جہاں مالک حقیقی کا نام لینا ہی سب سے بڑا گناہ اور فکر ورائے کی آزادی سنگین جرم تھا، شرک وکفر اور ظلم و جبر کی اس گھٹی ہوئی فضا میں آپ جہاں ایک طرف چل پھر کر اسلام کی دعوت کا فریضہ انجام دیتے تھے وہیں دوسری طرف دارارقم میں بیٹھ کر مسلمانوں کو کتاب وسنت کی تعلیم اور تزکیۂ اخلاق کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

ہجرت مدینہ کے بعد جب یک گونہ اطمینان نصیب ہوا اور آزادی کا ماحول میسر آیا مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ مسجد سے متصل جانب شمال الگ سے ایک مدرسہ اور تربیت گاہ بھی تعمیر کرائی جو اسلامی تاریخ میں ''صفۃ المسجد'' اور مختصر لفظوں میں ''صفہ'' کے نام سے معروف و مشہور ہے، یہ اسلام کی اولین اقامتی درسگاہ تھی جہاں طالبانِ علوم وتزکیہ کا ہمہ وقت قیام رہتا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت سے مستفیض ہوتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات خلفاء نے اس سلسلے کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کو مزید آگے بڑھایا بالخصوص خلیفۂ ثانی حضرت فاروق اعظم نے تو اسے مستقل نظام بنادیا، حکومتی سطح پر اس کوشش کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہ بطور خود بھی اپنی اپنی جگہوں پر تعلیم وتربیت اور تزکیۂ اخلاق کی خدمات انجام دیتے تھے گویا جو صحابی جہاں پہنچ جاتا تھا وہیں ایک مدرسہ اور خانقاہ قائم ہوجاتی تھی، چنانچہ ان حضرات کے تلامذہ یعنی حضرات تابعین حدیث، تفسیر، فقہ اور مغازی وسیر کے امام ہونے کے ساتھ زہد وتقویٰ اور مکارم اخلاق کے بھی پیکر ہوتے تھے، امام حسن بصری، امام محمد بن سیرین، سعید بن المسیب، امام زہری، امام اوزاعی وغیرہ حضرات تابعین کے تذکرے پڑھ کر دیکھ لیجئے ان کا ہر ہر فرد علمی عبقریت کے ساتھ اعمال واخلاق کا مجسمہ ملے گا۔

پھر یہ زریں سلسلہ حضرات تابعین ہی پر ختم نہیں ہوگیا بلکہ تراجم اور تذکروں کے

مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری تک علماء میں بالعموم یہی جامعیت موجود رہی کہ وہ بیک وقت محدّث، مفسّر، متکلم، ادیب اور مورّخ ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجے کے متقی وپارسا اور اصطلاحی الفاظ میں صوفی وشیخ ہوتے تھے، چوتھی صدی کے بعد اس جامعیت میں اضمحلال آنا شروع ہوگیا جو دھیرے دھیرے اس حد تک پہنچ گیا کہ علماء مختلف طبقات میں تقسیم ہوگئے اور ہر طبقہ کسی ایک فن کے ساتھ مخصوص ہوگیا لیکن علم وعمل میں توافق اور یکسانیت پہلے کی طرح قائم رہی، اگر کہیں اس میں تضاد یا کمی نظر آتی ہے تو وہ بالعموم انفرادی اور شخصی حد تک ہے جسے معاشرۂ علماء نے برداشت نہیں کیا اور ایسے شخص کو وہ اپنی جماعت میں شمار نہیں کرتے تھے۔

علم وعمل یا تعلیم وتزکیہ کا یہ باہمی ارتباط اسلامی ہند کے آخری عہد تک قائم رہا چنانچہ مسند ہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا خانوادہ جو اسی آخری دور کی یادگار ہے اس کا ایک ایک فرد علوم وفنون اور سلوک وتصوف کا جامع تھا بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ اس گنج گرانمایہ اور متاع گم گشتہ کو اگلی نسلوں تک پہنچانے میں اس خاندان نے تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

۱۸۵۷ء (۱۲۷۴ھ) کے سیاسی انقلاب نے مسلمانوں کی قوت وشوکت کے مناروں کے ساتھ ان کے تعلیمی وتربیتی مراکز کو بھی تہہ وبالا کردیا، اس اتھل پتھل کے وقت اسی خانوادۂ ولی اللّٰہی کے چند حاشیہ نشینوں اور فیض یافتوں نے اسلام اور اس کی روایات کی حفاظت کیلئے نہایت خاموشی کے ساتھ ''دیوبند'' جیسے کوردہ مقام میں ایک ایسے مدرسہ کی بنیاد رکھ دی جو بیک وقت مدرسہ اور خانقاہ دونوں کی ضرورت پوری کرے اور اسلام کے ایسے مبلغ و سپاہی تیار کرے جو ''فی اللیل رہبان، وفی النہار فرسان'' کے نمونہ ہوں، اور حضرات بانیین کے اخلاص نیت کی برکت سے تھوڑی ہی مدت میں یہ قصباتی مدرسہ اسلامیہ ایک عظیم بین الاقوامی دارالعلوم بن گیا اور اسکے علماء وفضلاء کو ایسی مقبولیت ومرجعیت حاصل ہوئی کہ ان کے سامنے کسی کا چراغ روشن نہ رہ سکا، حالانکہ علماء دیوبند کے علاوہ دیگر علمی حلقوں میں ایسے علماء فضلاء کی تعداد خاصی اس وقت موجود تھی جو تبحر علمی میں علماء دیوبند سے کسی طرح فروتر تھے لیکن علم وعمل یا عالمیت ومشیخت کی وہ جامعیت جو علماء دیوبند کی خصوصیت تھی ان میں یہ

حضرات ہمارے علماء کا مقابلہ نہ کرسکے اس لئے پیچھے رہ گئے۔

علم وعمل کی جامعیت ہی ''دارالعلوم دیوبند'' کی وہ خصوصیت ہے جس نے اسے ماضی میں چہار دانگ عالم میں شہرت ومقبولیت سے ہم کنار کیا اور آج بھی اس کی نیک نامی اسی جامعیت پر موقوف ہے، دارالعلوم کا یہ وہ منہاج اور نصب العین ہے جو اسے دیگر علمی اداروں سے ممتاز بناتا ہے، مقام شکر ہے کہ دارالعلوم کی موجودہ انتظامیہ اس بات کو پورے طور پر محسوس کرتی ہے اور اسی جامعیت کو برقرار رکھنے کی جدوجہد میں پوری طرح کوشاں ہے، بایں ہمہ ضرورت ہے کہ اس جانب مزید توجہ دی جائے اور اس سلسلے میں دیگر مسائل کے ساتھ اخلاقی تربیت کے لئے بطور خاص محاضرات کا نظم کیا جائے، ملک و بیرون ملک علماء ومشائخ کی خدمات حاصل کی جائیں تو یہ صورت مناسب حال اور بہت مفید ہوگی، انشاء اللہ، ہمت مرداں مدد خدا۔

❁ ❁ ❁

بدیہیات قرآن

حکمتیں اور فائدے

(۳)

از: مولانا محمد عارف مبارکپوری
شارجہ، متحدہ عرب امارات

۱- اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وما أنت بتابع قبلتهم وما بعضهم قبلة بعض، ولئن اتبعت أهواء هم من بعد ما جاءك من العلم انك اذا لمن الظالمين (بقرہ:۱۴۵)

’’اور نہ تو مانے ان کا قبلہ، اور نہ ان میں سے ایک مانتا ہے دوسرے کا قبلہ۔‘‘

یہ بدیہی طور پر معلوم ہے کہ آپ ﷺ ان کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے، اور پچھلے جملے (وما أنت بتابع قبلتهم) سے اس کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ پھر آیت کے اس ٹکڑے کا کیا فائدہ ہے؟ اس کے کئی جواب دیے گئے ہیں:

اول: امام زمخشری کہتے ہیں:

’’اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ آپ ﷺ ان کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے جس کی وضاحت (وما أنت بتابع قبلتهم) سے فرمادی ہے اس کے بعد آیت کا یہ ٹکڑا (ولئن اتبعت أهواءهم من بعد ما جاءك من العلم انك اذا لمن الظالمين) فرضی طور پر آیا ہے بایں معنی کہ اس حقیقت کی وضاحت اور اس کا آپ کو بہ خوبی علم ہونے کے باوصف اگر بالفرض آپ نے ان کے قبلہ کی پیروی کی تو آپ حددرجہ ظلم کرنے والوں میں ہوں گے۔ اس میں سامعین کے ساتھ لطف واکرام کا معاملہ کرنا ہے، حددرجہ کی تنبیہ ہے اور یہ کہ وضاحت کے باوجود اگر کوئی دلیل کو نظرانداز کرتا ہے، اور خواہش نفس کی پیروی کرتا ہے، تو اس میں اس کی حالت کی سنگینی کا اظہار ہے، نیز اس بات پر آمادہ اور برانگیختہ کرنا ہے کہ آدمی حق پر ثابت قدم رہے۔ یہ توجیہ ابن عاشور اور آلوسی نے بھی نقل کی ہے۔(۱)

اسی مفہوم کو ابوحیان نے اس طرح بیان کیا ہے:

''کسی چیز کے وقوع کو کسی شرط پر معلق کرنے کا تقاضا یہ نہیں کہ اس شرط کا وقوع ممکن ہے، مثلاً کوئی اپنی بیوی سے کہے کہ اگر تم آسمان پر چڑھ گئی تو تم کو طلاق۔ ظاہر ہے کہ آسمان پر چڑھ کر جانا محال ہے۔ اور مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے بارے میں فرمایا: (لا یعصون اللّٰہ ما أمرھم و یفعلون ما یؤمرون) (سورہ تحریم:۶)

''نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جو بات فرمائے ان کو اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم ہو۔''

اور پھر انہی کے بارے میں فرمایا: (ومن یقل منھم انی الہ من دونہ فذلك نجزیہ جھنم، کذلك نجزی الظالمین) (سورہ انبیاء:۲۹)

اور جو کوئی ان میں سے کہے کہ میری بندگی ہے اس سے ورے، سو اس کو ہم بدلہ دیں گے دوزخ، یونہی ہم بدلہ دیتے ہیں بے انصافوں کو۔''

اس کی وضاحت کے بعد اس طرح کے جو جملے آئے ہیں ان کا سمجھنا آسان ہے، اور اس سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ایسا ہونا محال ہے؛ اس لئے کہ جو چیز کسی محال پر معلق ہوتی ہے، وہ محال ہوتی ہے، اور اس جملہ کا معنی (جس سے بہ ظاہر واقع ہونا معلوم ہوتا ہے، حالاں کہ اس کا واقع نہ ہونا فرض کیا گیا ہے) یہ ہوجائے گا کہ آپ ظالم شمار نہ ہوں گے اور آپ ظالم نہ ہوں گے اس لیے کہ آپ ان کی خواہش نفس کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ آپ کا عمل اکارت ہوگا؛ اس لیے کہ آپ کا شرک کرنا محال ہے، اسی طرح کسی فرشتے کو جہنم میں نہیں بھیجا جائے گا؛ اس لیے کہ وہ الوہیت کا دعویٰ نہیں کرے گا۔ علماء نے کہا کہ اگر معصوم ذات کو کسی ایسی بات کا مخاطب بنایا جائے جس کا صدور اس سے ناممکن ہے، تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ اس سے مراد اس کی امت ہے، اس معصوم ذات کو مخاطب بنانے کی وجہ اس چیز کی ہولناکی بیان کرنا ہے تاکہ اس سے کوسوں دور رہا جائے۔ اس کی نظیر یہ قول ہے:

ایاك أعنی واسمعی یا جارتی.

''تم ہی مقصود ہو، سن لو اے میری پڑوسی عورت'' (۲)

دوم: یہ خطاب آپ ﷺ کو نہیں ہے؛ اس لیے کہ معلوم ہے کہ آپ ﷺ ایسا نہیں کریں گے، لہٰذا آپ ﷺ کو اس کا مخاطب بنانا درست نہیں۔ یہ قول رازی نے نقل کرنے کے بعد اس کو غلط قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''یہ قول غلط ہے؛ اس لیے کہ ہر ایسی چیز کہ بالفرض اگر رسول سے اس کا صدور ہو تو قبیح ہے (اور اکراہ پر مواخذ نہیں) تو وہ ممنوع ہے، گوکہ یہ بدیہی طور پر معلوم ہے کہ

آپ ﷺ ایسا نہیں کریں گے، اس کی دلیل کئی ایک امور ہیں:

۱- یہ کہ علم الٰہی میں جو چیز ایسی ہے کہ آپ ﷺ اس کو نہیں کریں گے، واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے نہ روکیں، اگر ایسا ہوتا تو یہ بھی ضروری ہوتا کہ علم الٰہی میں جس چیز کے بارے میں ہے کہ آپ اس کو کریں گے تو ضروری ہوتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا حکم نہ دیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ نبی ﷺ کو نہ کسی بات کا حکم ہو نہ کسی بات کی ممانعت، اور یہ بالاتفاق باطل ہے۔

۲- اگر پہلے سے نہی وتحذیر نہ ہوتی تو آپ ﷺ اس سے احتراز نہ کرتے، اور جب یہ احتراز اس نہی وتحذیر کے ساتھ مشروط ہے تو اس احتراز کو نہی وتحذیر کے منافی کیسے قرار دیا جائے؟

۳- نہی ووعید کا مقصد، عقل میں اس فعل کی قباحت کو موکد کرنا ہے، لہٰذا اس کا مقصد تاکید ہے، اور جب یہ بہتر ہے کہ عقل میں توحید کے دلائل راسخ اور موکد کرنے کے بعد، اللہ تعالیٰ اس کے قسم قسم کے دلائل سے خبردار کریں، اور اس کا مقصد عقل کو نقل کے ذریعہ موکد اور پختہ کرنا ہے، تو اگر یہاں بھی یہی غرض ہو تو اس مستبعد ہے؟

۴- اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے بارے میں فرمایا: (ومن يقل منهم انی الله من دونه فذلك نجزيه جهنم) (سورہ انبیاء:۲۹)

''اور جو کوئی ان میں سے کہے کہ میری بندگی ہے اس سے ورے، سو اس کو ہم بدلہ دیں گے دوزخ۔''

حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے بتادیا ہے کہ وہ گناہوں سے معصوم ہیں، فرمان باری ہے:

(يخافون ربهم من فوقهم ويفعلون ما يؤمرون) (سورہ نمل:۵۰)

''ڈر رکھتے اپنے رب کا اپنے اوپر سے، اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔''

اور محمد ﷺ کے بارے میں فرمایا: (لئن أشركت ليحبطن عملك) (سورہ زمر:۶۵)

''اگر تو نے شرک مان لیا تو اکارت جائیں گے تیرے عمل۔''

حالاں کہ بالاجماع نہ آپ ﷺ نے شرک یا نہ شرک کی طرف مائل ہوئے۔

نیز فرمایا: (يا أيها النبی اتق الله ولا تطع الكافرين والمنافقين) (احزاب:۱)

''اے نبی! ڈر اللہ سے اور کہا نہ مان منکروں کا اور منافقوں کا۔''

نیز فرمایا: (ودوا لو تدهن فيدهنون) (سورہ قلم:۹)

''وہ چاہتے ہیں کسی طرح تو ڈھیلا ہو تو وہ بھی ڈھیلے ہوں۔''

نیز فرمایا: (بلغ ما انزل الیک من ربك فان لم تفعل فما بلغت رسالته) (سورہ مائدہ:٦٧)

''پہنچادے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے، اور اگر ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا۔''

نیز فرمایا: (و لا تکونن من المشرکین) (سورہ انعام:۱۴)

''اور تو ہرگز نہ شرک والا۔''

اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ آپ ﷺ کو بھی اس سے روکا گیا تھا، اور دوسروں کے لیے بھی یہ ممنوع ہے؛ اس لیے کہ کسی چیز سے روکنا آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے نہیں کہ آپ کے لیے ممنوع ہو دوسروں کے لیے نہیں۔ اب رہ گئی یہ بات کہ نہی وممانعت کو آپ ﷺ کے ساتھ کیوں خاص کیا گیا؟ تو اس کے کئی جواب ہیں:

۱- جس پر اللہ کی نعمتیں جتنی زیادہ ہوں کسی گناہ کا اس سے صدور اتنا ہی زیادہ قبیح ہے۔ اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں آپ ﷺ پر اللہ کی نعمتیں سب سے زیادہ ہیں اس لیے آپ ﷺ سے گناہ کا صدور اتنا ہی زیادہ قبیح ہوگا، اس لیے آپ ﷺ کا خاص طور پر تذکرہ کرنا بجا تھا۔

۲- جس سے جتنی زیادہ محبت ہوتی ہے اس کو خاص طور پر اتنی زیادہ تنبیہ کی جانی چاہیے۔

۳- ایک عقل مند آدمی اپنی تمام اولاد کی موجودگی میں اگر اپنی سب سے بڑی اور لائق اولاد کو کسی بات پر زجر وتوبیخ کرے تو اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہ فعل نہایت خطرناک ہے، کوئی اور اس کا ارتکاب نہ کرے۔ اور لوگوں کی عادت ہے کہ کسی چیز کا حکم دینے یا کسی چیز سے روکنے میں اس شخص کو مخاطب بناتے ہیں جو سب سے زیادہ بلند درجہ ہو، تاکہ دوسرے کو تنبیہ ہو یا اس عمل پر زور دینا مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح کی آیتوں میں یہ ایک طے شدہ ضابطہ ہے۔ (۳)

سوم: فرمان باری (لئن اتبعت أهواءهم) سے مراد یہ نہیں کہ آپ ﷺ تمام امور میں ان کی خواہش کو مانیں، ہوسکتا ہے کہ بعض امور میں ان کی خواہش مانتے تھے مثلاً آپ ﷺ ان کے ساتھ سخت کلامی نہیں کرتے تھے، اس امید سے کہ وہ آپ کی طرف مائل ہوجائیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی منع فرمادیا، اور ان کی طرف سے بالکلیہ ناامید فرمادیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(ولولا أن ثبتناك لقد كدت تركن اليهم شيئا قليلا) (اسراء:۷۴)

''اور اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے تجھ کو نہ سنبھالے رکھا ہوتا تو لگ جاتا جھکنے ان کی طرف تھوڑا۔''

چھـــارم: گو کہ خطاب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہے؛ لیکن مراد کوئی اور ہے۔ مثلاً کسی کے غلام نے آپ کے غلام کے ساتھ بدسلوکی کی اور آپ اس کو عتاب کرتے ہوئے کہیں کہ اگر تم دوبارہ ایسی حرکت کی تو میں تم کو سخت سرزنش کروں گا۔ اس آیت میں مقصود یہ ہے کہ امت کا کوئی فرد ان کی بات نہ مانے۔ (۴)

۲-فرمان باری: ومن حيث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام وانه للحق من رب وما الله بغافل عما تعملون (بقرہ:۱۴۹)

''اور جس جگہ سے تو نکلے سو منھ کر اپنا مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے تیرے رب کی طرف سے، اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔''

سوال یہ ہے کہ مسجد حرام کی طرف منھ کرنے کا حکم تین بار آیا ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے پہلے فرمایا:

قد نرى تقلب وجهك فى السماء فلنولينك قبلة ترضاها فول وجهك شرط المسجد الحرام وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شطره وان الذين ـ وتوا الكتاب ليعلمون أنه الحق من ربهم وما الله بغافل عما يعملون (بقرہ:۱۴۴)

''بے شک ہم دیکھتے ہیں اٹھنا بار بار تیرے منھ کا آسمان کی طرف سو البتہ پھیریں گے ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے، اب پھیر منھ اپنا مسجد حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو منھ اسی کی طرف، اور جن کو ملی ہے کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے، ان کے رب کی طرف سے، اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔''

اس کے بعد یہاں فرمایا:

ومن حيث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام وانه للحق من ربك وماالله بغافل عما تعملون (بقرہ:۱۴۹)

''اور جس جگہ سے تو نکلے سو منھ کر اپنا مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے تیرے رب کی طرف سے، اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔''

اس کے بعد تیسری مرتبہ فرمایا:

ومن حيث خرجت فول وجهك شرط المسجد الحرام وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شرطه لئلا يكون للناس عليكم حجة (بقرہ:۵۰)

''اور جہاں سے تو نکلے منھ کر اپنا مسجد حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہوا کرو منھ کرو اسی کی طرف، تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع۔''

ایک ہی حکم کو بار بار دہرانے میں کیا فائدہ ہے؟

امام رازی کہتے ہیں کہ علما کے اس میں بہت سے اقوال ہیں:

اول: حالات تین طرح کے ہیں: (۱) آدمی مسجد حرام کے اندر ہو (۲) مسجد حرام کے باہر، شہر کے اندر ہو (۳) شہر سے باہر کہیں اور چلا جائے۔ اب پہلی آیت پہلی حالت کے لیے، دوسری آیت دوسری حالت کے لیے، اور تیسری آیت تیسری حالت کے لیے ہے۔ یہاں پر یہ وہم پیدا ہوسکتا تھا کہ خانہ کعبہ سے قربت کا جو احترام ہے دور رہتے ہوئے شاید نہ ہو۔ اس وہم کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو تین مرتبہ ذکر فرمایا۔ یہ توجیہ ابوحیان نے بھی نقل کی ہے۔(۵)

دوم: اللہ تعالیٰ نے اس کو تین بار اس لیے ذکر فرمایا کہ ہر ایک سے الگ الگ فائدہ متعلق ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں یہ بیان فرمایا کہ اہل کتاب جانتے ہیں کہ محمد ﷺ کی نبوت اور اس قبلہ کا معاملہ برحق ہے؛ کیوں کہ وہ توریت وانجیل میں اس کو دیکھ چکے ہیں۔ دوسری آیت میں یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے برحق ہونے پر گواہ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس بات کی گواہی دینا، اہل کتاب کے دائرہ علم میں ہونے سے الگ ہے کہ یہ برحق ہے۔ تیسری آیت میں یہ بیان فرمایا کہ ایسا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع نہ رہے۔ چوں کہ یہ الگ الگ فائدے تھے اس لیے اس کا اعادہ مستحسن ہے تاکہ ہر ایک پر کوئی نہ کوئی فائدہ مرتب ہو۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللّٰہ لیشتروا بہ ثمنا قلیلا فویل لھم مما کتبت أیدیھم وویل لھم مما یکسبون (بقرہ:۷۹)

''سو خرابی ہے ان کو جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے، پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے، تاکہ لیں اس پر تھوڑا سا مول، سو خرابی ہے ان کو اپنے ہاتھوں کے لکھے سے، اور خرابی ہے اس کو اپنی اس کمائی سے۔''

یہ قول زمخشری، ابوحیان، ابوسعود اور ابن عاشور نے بھی نقل کیا ہے۔(۶)

سوم: اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں فرمایا: (قد نری تقلب وجھك فی السماء فلنولینك قبلة ترضاھا فول وجھك شطر المسجد الحرام وحیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ وان الذین اوتوا الکتاب لیعلمون أنہ الحق من ربھم وماالله بغافل

عما یعملون (بقرہ:۱۴۴)

”بے شک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا تیرے منھ کا آسمان کی طرف سو البتہ پھیریں گے ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے، اب پھیر منھ اپنا مسجد حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو منھ اسی کی طرف، اور جن کو ملی ہے کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے، ان کے رب کی طرف سے، اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں۔“

اس آیت سے کسی جاہل کو یہ خیال گزر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب، محمد ﷺ کی رضا جوئی کے لیے فرمایا کہ سو البتہ پھیریں گے ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس غلط خیال کو دور کرنے کے لیے فرمایا: (ومن حیث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام وانه للحق من ربك وماالله بغافل عما تعملون (بقرہ:۱۴۹)

حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے تیرے رب کی طرف سے، اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے۔“

یعنی ہم نے آ ”اور جس جگہ سے تو نکلے سو منھ اپنا مسجد کو اس قبلہ کی طرف محض آپ کی خوشی کے لیے نہیں پھیرا؛ بلکہ اس لیے کہ یہی حق ہے، جس سے مفر نہیں۔ لہٰذا اس کی طرف رخ کرنا محض خواہش کی تکمیل نہیں جیسے یہودیوں کا وہ قبلہ جو منسوخ ہو چکا ہے، اور وہ محض خواہش نفس کی وجہ سے اس پر قائم ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تیسری بار فرمایا: (ومن حیث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام وحیث ما کنتم فولوا وجوهك شطره) (بقرہ:۱۵۰)

”اور جہاں سے تو نکلے منھ کر اپنا مسجد حرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہوا کرو منھ کرو اسی کی طرف۔“

یعنی ہمہ وقت اسی قبلہ پر قائم رہو، اس کو تبدیل نہ کرو مبادا یہ تمہارے دین میں طعن تشنیع کا سبب بنے۔

یہ توجیہ ابوحیان اور ابوسعود نے بھی نقل کی ہے۔(۷)

حاصل یہ ہے کہ پہلی آیت میں ہر زمانہ میں اسی پر قائم رہنے کا حکم ہے، دوسری آیت میں ہر زمانہ اور جگہ میں اس پر قائم رہنے، اور تیسری آیت میں ہر زمانہ میں اس پر قائم رہنے کا حکم ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ کبھی منسوخ نہ ہوگا۔(۸)

چہارم: پہلے حکم کے ساتھ یہ منسلک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر یہ کرم فرمایا کہ ان کو ان

کا پسندیدہ قبلہ (جوان کے باپ ابراہیم کا قبلہ ہے) عطا فرمایا۔ دوسرے کے ساتھ یہ منسلک ہے کہ (ولك وجهة هو موليها) ''ہر کسی کے لیے ایک جانب ہے یعنی قبلہ کہ وہ منھ کرتا ہے اس کی طرف''، یعنی ہر دعوت وملت والے کا ایک قبلہ ہو جس کی طرف وہ منھ کرتا ہے، اور تم سب سے زیادہ عزت والی سمت کی طرف منھ کرو، جس کے بارے میں اللہ جانتا ہے کہ وہی حق ہے۔ یہ بات اللہ نے اس آیت میں فرمائی ہے: (ومن حيث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام وانه للحق من ربك)

اور جس جگہ سے تو نکلے سو منھ کر اپنا مسجد حرام کی طرف اور بے شک یہی حق ہے تیرے رب کی طرف سے۔''

اور تیسرے حکم میں یہ درج ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں (جو قبلہ کے تعلق سے آپ ﷺ سے جھگڑتے تھے) کی حجت ختم کردی۔ اب دیکھا جائے تو یہ تین وجوہات ہیں، ہر ایک کے ساتھ، قبلہ کی پابندی کا حکم منسلک ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ کہا جائے کہ اس قبلہ کے پابند رہو؛ اس لیے کہ اسی قبلہ کی آپ کی خواہش تھی پھر کہا جائے کہ اس قبلہ کے پابند رہو؛ اس لیے کہ یہ برحق قبلہ ہے، نفسانی خواہش کی دین نہیں (اور بے شک یہی حق ہے تیرے رب کی طرف سے) پھر کہا جائے کہ اس قبلہ کے پابند رہو؛ اس کی پابندی میں، یہودیوں کی حجت شکنی ہے۔ یہ تکرار ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت کریمہ (فبأی آلاء ربکما تکذبان) (سورہ رحمان:۱۳)

''پھر کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے تم دونوں۔''

یا جیسے اس آیت کریمہ میں تکرار ہے (ان فی ذلك لآية وما كان اكثرهم مؤمنين) (سورہ شعراء:۱۵۸)

''البتہ اس میں نشانی ہے، اور ان میں بہت لوگ نہیں ماننے والے۔''

یہ توجیہ ابوحیان نے بھی نقل کی ہے۔(۹)

پنجم: یہ سب سے پہلا واقعہ ہے جس میں ہماری شریعت میں نسخ واقع ہوا؛ اس لیے تاکید و توثیق، شبہات کو ختم کرنے اور وضاحت کی خاطر اس میں تکرار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ جواب زمخشری اور ابوحیان نے بھی نقل کیا ہے۔(۱۰)

ششم: ابوحیان کہتے ہیں:

یہ جملہ (تیسری آیت) سابقہ متصل (دوسری) آیت کی تاکید ہے۔ پہلی آیت کی تاکید نہیں؛ اس لیے کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ پہلی آیت اقامت وحضر سے متعلق ہے اور

دوسری آیت سفر اور تیسری آیت بھی سفر سے متعلق ہے؛ لہٰذا یہ آیت دوسری آیت کی تاکید ہوئی۔ اور اس تاکید کا فائدہ اس حکم توثیق اور بیت المقدس کے قبلہ ہونے کے حکم کے منسوخ ہونے کی ترسیخ وتقریر ہے؛ اس لیے کہ نسخ میں فتنہ اور شکوک و شبہات کا احتمال ہے اور قبلہ کی تبدیلی کو لے کر، شیطان طعن و تشنیع کی راہ دکھا سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ان کے لیے دشوار تھا۔ لہٰذا اس نسخ کی تاکید وتوثیق کردی۔ ہماری اس توجیہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو تاکید کے لیے ایک جملہ دوبارلایا گیا ہے۔ اور عربی زبان میں، اکثر وبیشتر یہی ہوتا ہے کہ جملہ کو ایک بار اور ذکر کردیا جائے۔(۱۱)

ہفتم: مہدوی نے کہا:

ان احکام میں تکرار اس لیے ہے کہ ہر ایک کو پورا قرآن یاد نہیں ہوتا، اب اگر تکرار نہ ہوتا تو کسی کے پاس ایک حکم ہوتا جو دوسرے کے پاس نہیں۔ تکرار کی یہ توجیہ جعفر صادق سے منقول ہے۔ اسی لیے قصے اور واقعات میں تکرار نہیں۔ یہ قول ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۱۲)

ہشتم: پہلی آیت میں (فول وجهك) قبلہ اوّل کو منسوخ ہونا بتانا ہے۔ دوسری آیت میں یہ بتانا ہے کہ ہر جگہ حکم یکساں ہے، اور تیسری آیت میں یہ بتانا ہے کہ ہر دور میں یہ حکم باقی رہے گا۔ یہ قول بھی ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۱۳)

نہم: ایک قول ہے:

کہ پہلا حکم ہر حالت کے لیے ہے، دوسرا ہر جگہ کے لیے، اور تیسرا ہر دور کے لیے۔ یہ قول بھی ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۱۴)

۳- فرمان باری: كما أرسلنا فيكم رسولا منكم يتلو عليكم آياتنا ويزكيكم ويعلمكم الكتاب والحكمة ويعلمكم مالم تكونوا تعلمون (بقرہ:۱۵۱)

''جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں کا پڑھتا ہے تمہارے آگے آیتیں ہماری اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھاتا ہے تم کو کتاب اور اس کے اسرار اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے۔''

یہاں پر (يعلمكم) کو دوبار ذکر کیا گیا حالاں کہ ایک کافی تھا۔ اس تکرار کا کیا فائدہ ہے؟ اس کے دو جواب دیے گئے ہیں:

اول: عطف کے ذریعہ دوبارہ لانے کا مقصد، دونوں میں مغایرت اور اختلاف کو، بہ صراحت بتانا ہے مبادا کوئی یہ سمجھ جائے کہ (مالم تکونوا تعلمون) سے مراد کتاب وحکمت ہے۔ نیز یہ بھی تصریح کردی کہ (مالم تکونوا) مفعول ہے، مبتدا نہیں کہ مبادا سننے والا خبر کا منتظر رہے۔ اوراسی انتظام میں اس کا ذہن الجھ کررہ جائے۔ یہ قول ابن عاشور نے نقل کیا ہے۔ (۱۵)

دوم: فعل میں تکرار کا مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ ایک الگ جنس ہے، پہلے میں قطعاً شریک نہیں، لہٰذا یہ عموم کے بعد تخصیص ہے، اور یہ بتانے کے لیے کہ آپ ﷺ کی بعثت ایک نعمت عظمی ہے، یہ نہ ہوتی تو پوری انسانیت دینی معاملہ میں سرگرداں ہوتی، اور کیا کرے کیا نہ کرے، یہ سمجھنے سے قاصر ہوتی۔ یہ قول آلوسی نے نقل کیا ہے۔ (۱۶)　　　(باقی آئندہ)

❁ ❁ ❁

حواشی:

(۱) کشاف ۱/۱۰۱؛ ابن عاشور ۲/ ۳۷؛ آلوسی ۲/۱۲۔

(۲) ابوحیان تفسیر آیت۔

(۳) الکشاف ۱/۱۰۱، ابن عاشور ۲/ ۳۷، آلوسی ۲/۱۲۔

(۴) ابوحیان تفسیر آیت۔

(۵) تفسیر رازی ۴/۱۰۹۔

(۶) تفسیر رازی ۴/۱۰۹۔

(۷) بحرمحیط از ابوحیان تفسیر آیت۔

(۸) ابن عاشور تفسیر آیت؛ الکشاف تفسیر آیت؛ ابوحیان تفسیر آیت؛ ابوسعود ۱/۱۸۰۔

(۹) ابوحیان تفسیر آیت، ابوسعود ۱/۱۸۰۔

(۱۰) رازی ۴/۱۱۸۔

(۱۱) ابوحیان تفسیر آیت۔

(۱۲) کشاف تفسیر آیت، رازی ۴/۱۵۱-۱۵۳؛ ابوحیان تفسیر آیت۔

(۱۳) ابوحیان تفسیر آیت۔

(۱۴) ابوحیان تفسیر آیت۔

(۱۵) ابوحیان تفسیر آیت۔

(۱۶) ابوحیان تفسیر آیت۔

❁ ❁ ❁

سیرت پاک ﷺ دعاؤں کی روشنی میں!

از: سعید الظفر رام پوری
شریک افتاء، دارالعلوم دیوبند

انسانی تاریخ میں ساتویں صدی عیسوی ہمیشہ یاد رہے گی، کیونکہ اس زمانہ میں دنیا ایک عجیب وغریب انقلابی تحریک سے روشناس ہوئی تھی، عرف عام میں اس تحریک کو اسلامی تحریک کہا جاتا ہے اس کی ابتداء جزیرہ نمائے عرب کے ایک گمنام اور غیر تاریخی گوشے یعنی حجاز سے ہوئی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بیس پچیس سال کے اندر ہی یہ تحریک پورے مشرقِ وسطیٰ پر چھا گئی، جہاں اس کا ہدف پورا عالم تھا۔

اس تحریک کی ابتداء اسلام کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ سے ہوتی ہے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے میں آپ کی سیرت مبارکہ کا بہت بڑا دخل ہے۔ آپ ﷺ کی پوری زندگی، اس کا ہر ہر گوشہ کامل اور لائق اتباع ہے، اللہ تعالیٰ نے اس شخصیت کو ہمہ جہت بنایا تھا۔ تاریخی نقطۂ نظر سے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مبارکہ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱- بعثت سے قبل کا دور۔

۲- مکی زندگی کا دور۔

۳- مدنی زندگی کا دور۔

یہ تینوں دور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیات پاک کو حاوی ہیں آپ کے اخلاق و عادات امانت و دیانت، کفار کے ساتھ معاملات، منافقین کے ساتھ نرمی، دین کی نشر واشاعت میں مصائب کا سامنا، آپ کی داخلی اور خارجی زندگی، ازواج مطہرات اور خدام کے ساتھ حسن سلوک غرض سیرت کا ہر رخ ان تین دوروں سے متعلق ہے لیکن ان کے علاوہ بھی سیرت کی تکمیل کے حوالہ سے ایک اہم شعبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ہیں، ان کے تناظر میں بھی کافی

حد تک سیرت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی تکمیل تو کی ہی تھی، خود بھی آپ ﷺ نے بے شمار دعائیں کیں جن کو سیرت کی تکمیل میں بڑا دخل ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رب کائنات نے ان دعاؤں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا اور آپ کو بالکل مجسمۂ عمل بنا دیا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر بہت سی چیزوں کو اپنی بے مثال آخری کتاب قرآن میں جگہ دی۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی مقبول دعاؤں کے تناظر میں بھی آپ کی پاک سیرت دیکھیں۔

عبدیت رسول اللہ ﷺ:

احادیث کی مستند کتابوں میں بے شمار دعائیں منقول ہیں، انہی میں ایسی دعائیں بھی ہیں، کہ جن میں آپ ﷺ نے اپنے آپ کو غلام اور بندہ سے تعبیر کیا۔ اللہ کے حضور ''عبدیت'' کا اظہار جابجا جھلکتا ہے، کہیں آپ اپنی عبدیت کو یوں جتاتے ہیں: اللّٰهم إني عبدك وابن عبدك وابن أمتك اور کہیں اللہ کے نیک بندوں میں شمولیت کے خواہاں ہیں، واجعلنا من عبادك الصالحين. غرض نبوت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے کے بعد بھی آپ ﷺ نے اپنی عبدیت ہی کو پیش نظر رکھا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیب کا یہ اظہار ''عبدیت'' اس قدر پسند آیا کہ اپنی کتاب میں اسی نام سے مختلف مقامات پر خطاب کیا اور یاد فرمایا ہے چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے:

وان كنتم فی ريب مما نزلنا على عبدنا .

اور بنی اسرائیل میں ہے: سبحان الذی اسرى بعبده .

ان کے علاوہ متعدد مقامات پر لفظ ''عبد'' سے ہی یاد فرمایا ہے۔

تواضع:

آپ ﷺ سراپا مجسمہ تواضع تھے، آپ سے بڑھ کر کوئی متواضع نہیں ہوسکتا اور ہو بھی کیوں سکتا ہے، آپ حبیب خدا تھے، رہتی دنیا تک آپ کو مثال انسانیت بنانا تھا۔ چنانچہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام تواضع سے اپنے رب کے شکر گزاروں اور نعمت کے ثناخوانوں میں شرکت کی درخواست ان الفاظ میں کرتے دیکھے جاتے ہیں:

واجعلنا شاكرين لنعمتك مثنين بها .

آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والی یہ دعا تو تواضع کا منتہا ہے۔

اللّٰهم اجعلني في عيني صغيرًا .

یہ الفاظ اس ذات گرامی کے ہیں جس کو دونوں جہاں کی سرداری عطا کی گئی، چنانچہ جب ہم ان دعاؤں کے تناظر میں آپ ﷺ کی حیات مبارکہ پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہر قول وفعل میں ان دعاؤں کا رنگ نظر آتا ہے۔ قارئین کرام بھی اس رنگ کو ملاحظہ فرمائیں۔ بخاری میں مذکور ہے کہ آپ کے ایک ناقہ کا نام ''عضبا'' تھا، کوئی جانور اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا، ایک اعرابی اپنی سواری پر آیا اور اس سے آگے بڑھ گیا، حضرات صحابہ کو یہ بہت ہی شاق گزرا۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

ان حقا على الله عزو جل ان لا يرفع شيئاً من الدنيا إلا وضعه.

دنیا میں خدا کی یہی سنت ہے کہ کسی کو اٹھاتا ہے، تو اسے نیچے بھی دکھاتا ہے۔

بخاری ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کو ''يا خير البرية'' (برترین خلق) کہہ کر پکارا۔ آپ نے فرمایا ذاك ابراهيم یہ شان تو ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔

آپ ﷺ کی سیرت میں تواضع کی ایک یہ ادا بھی ملاحظہ ہو۔ فتح مکہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے بوڑھے، ضعیف، فاقد البصر باپ کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بیعت کرنے کے لئے لائے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے بوڑھے کو تکلیف کیوں دی، میں خود اُن کے پاس چلا جاتا۔ سیرت اور احادیث کی مستند کتابیں ایسے واقعات سے پُر ہیں، اگر اس سے آگے بڑھ کر یہ بات کہی جائے تو حق بجانب ہوگی کہ آپ کی ہر ہر ادا تواضع اور مسکنت کا لطیف سبق دیتی ہے، آپ ﷺ کی سیرت پر ایک نظر ڈالنے سے رات دن میں ان باتوں کا کثرت سے وجود ملتا ہے۔

۱- مجلس میں کبھی پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھتے

۲- ہمیشہ سلام میں پہل کرتے۔

۳- مصافحہ کیلئے خود پہلے ہاتھ پھیلاتے۔

۴- صحابہ کو کنیت سے پکارتے (عرب میں عزت سے بلانے کا یہی رواج تھا)

۵- کسی کی بات کبھی قطع نہ فرماتے۔

۶- اگر نفل نماز میں ہوتے اور کوئی شخص آبیٹھتا تو نماز کو مختصر کردیتے، اور اس کی ضرورت پوری کرنے کے بعد پھر نماز میں مشغول ہوجاتے۔

۷- اکثر اوقات آپ متبسم رہتے۔

خوفِ خدا:

ہمارا عقیدہ ہے کہ نبی کریم ﷺ معصوم تھے، آپ کا اگلا پچھلا سب معاف تھا، لیکن قربان ہوجائیں سرکار دو جہاں پر کہ مرضیٔ مولا کے بغیر آپ کا کوئی قول وفعل وجود میں نہیں آتا تھا، خوف خدا ہر وقت دامن گیر رہتا، رات ہو یا دن، سفر ہو کہ حضر، عبادات ہوں کہ معاملات غرض ہر جگہ آپ کی روحانی آنکھیں اللہ تعالیٰ کو محسوس کرتی تھیں، اس پر مزید دعا کا یہ انداز نرالا ہے:

اللّٰهم اقسم لنا من خشيتك ما تحول به بيننا وبين معاصيك.

روزِ قیامت میدانِ محشر میں اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کے حوالہ سے خوفِ الٰہی کی یہ دعا بھی انفرادی شان رکھتی ہے: واجعلني ممّن يخاف مقامك .

آپ ﷺ کی سیرتِ پاک میں جا بجا ان دعاؤں کا اثر نمایاں ہے، آندھی کے آثار نمایاں ہوتے تو آپ لرز اٹھتے، خوفِ خدا سے بدن کانپ جاتا، اور مسجد کی طرف دوڑتے، اللہ کے حضور روتے گڑگڑاتے کہ کہیں اللہ کا غضب نازل نہ ہوجائے، یہ تو نمونہ ہے آپ کے رجوع الی اللہ کا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح آپ ﷺ کی سیرت کا احاطہ کرنا مشکل ہے، اسی طرح اس باب میں بھی گفتگو مشکل ہے۔

زہد:

اسلام کے ابتدائی دور میں جب اہل اسلام پر کفار کے مظالم بڑھے، اور اللہ کی طرف سے قتال کی اجازت ملی تو مال غنیمت سے خمس (پانچواں حصہ) آپ ﷺ کے لئے شریعت نے مقرر کیا، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے فقر کو پسند کیا، آپ ہمیشہ یہ دعا کرتے تھے:

يا ربّ أجوع يوماً وأشبع يوماً.

یہ تو دعا تھی، اب عملی زندگی کے بھی چند واقعات ملاحظہ ہوں:

۱- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ایک ایک مہینہ برابر ہمارے چولہے میں آگ روشن نہ ہوتی حضرت کا کنبہ پانی اور کھجور پر گذارا کرتا۔

۲- حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ مدینہ تشریف لاکر تین دن تک برابر گیہوں کی روٹی کبھی نہیں کھائی۔

۳- آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا کی آخری شب میں تھے کہ عائشہؓ نے پڑوسن سے چراغ کے لئے تیل لیا تھا۔

۴- آپ نے انتقال فرمایا تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس بعوض غلہ رہن تھی۔

صبر وحلم اور عفوو درگذر:

ان دعاؤں کے علاوہ آپ ﷺ ہمیشہ صبر وشکر کی توفیق مانگتے، اپنے اصحاب کو ہر پسندیدہ اور ناپسندیدہ موقع پر صبر وشکر کی وصیت فرماتے، چنانچہ اپنی مخصوص دعاؤں کے علاوہ صبر وشکر کی تبلیغ کی اور یہی فرماتے تھے:

علينا الشكر إذا أعطى، و الصبر إذا ابتلى.

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اہل مکہ جو ظلم وستم اس برگزیدہ ہستی پر کئے، اس کی مثال تاریخ کے صفحات میں موجود نہیں ہے، لیکن آپ نے کبھی صبر وحلم کا دامن نہیں چھوڑا، دوست ہو یا دشمن، عفوو درگذر سب کے سات برابر رہا۔

۱- حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات مبارک کی بابت کسی سے انتقام نہیں لیا۔

۲- شفا، عیاض میں منقول ہے کہ جنگ اُحد میں کافروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید کردیئے، آپ کے سر میں بھی زخم آیا، آپ ایک غار میں بھی گر گئے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ ان پر بددعا فرمایئے، آپ نے فرمایا: میں لعنت کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا، خدا مجھے اپنی بارگاہ میں بلانے کے لئے بھیجا ہے۔

۳- بخاری شریف میں روایت ہے کہ طائف میں آنحضرت ﷺ وعظ وتبلیغ کے لئے تشریف لے گئے تھے، وہاں کے باشندوں نے آپ پر کیچڑ پھینکی، فقرے کسے، اتنے پتھر مارے کہ آپ لہولہان ہوکر بے ہوش ہوگئے پھر بھی آپ یہی فرماتے رہے: میں ان لوگوں کی ہلاکت نہیں چاہتا، کیونکہ یہ ایمان نہ لاتے تو امید ہے کہ ان کی اولاد مسلمان ہوجائے۔

ظلم سے پناہ:

یہ حال تھا رحمۃ للعالمین کے صبر وشکر اور عفوو درگذر کا، اسی کے تناظر میں یہ دیکھا جاسکتا ہے

کہ یہ ذات بابرکت ظلم سے کس قدر دور ہوگی، مزید برآں آپ ہمیشہ ظلم سے پناہ مانگتے رہے:

أعوذ بك من أن أظلِم أو أظلَم.

یہ دعا تو آپ کے معمولات میں شامل تھی، لیکن رحمت کے پرتو کی یہ جھلک بھی قابل دید ہے کہ آپ ﷺ نے احتمال بشریت اللہ تعالیٰ سے عہد لے لیا، اگر بالفرض کسی کو مجھ سے کوئی تکلیف پہنچے تو اس کو اس کے حق میں قربت اور نعمت کا ذریعہ بنادے۔

اللّٰهم إني أتخذ عندك عهدًا لن تخلفنيه فإنا أنا بشرٌ، فأيّما مومن أذيتُه أو شتمتُه أو جلدتُه أو لعنتُه فاجعلها له صلوة وزكوة، وقربة تقرّبه بها إليك.

تاریخ شاہد ہے کہ آپ کی زندگی بے گردوغبار تھی، نہ بعثت سے قبل کوئی متہم کرسکا، اور نہ ہی منصب نبوت پانے کے بعد کوئی عیب نکال سکا، آپ نے کبھی ظلم کو پسند نہیں کیا، متعصبینِ اسلام کوئی ایسا واقعہ پیش کرنے سے عاجز رہیں گے کہ جس میں آپ کی جانب سے ظلم وزیادتی کا شبہ ہوتا ہو، البتہ تاریخ نے اس واقعہ کو جگہ دینے پر فخر محسوس کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مجمع عام میں یہ اعلان فرمایا کہ: جس کا مجھ پر کوئی حق ہو وہ لے لے، میں نے کسی کو گالی دی ہو تو وہ گالی دے سکتا ہے، ظلم کیا ہو تو بدلہ لے سکتا ہے۔ مجمع عام سے کوئی آواز تک بلند نہیں ہوسکی، سوائے ایک صحابی کے جنھوں نے حیلہ اختیار کرکے آپ ﷺ کی مہر نبوت کو بوسہ دیا۔

ناگہانی وفات سے پناہ:

آپ ﷺ نے اپنی مسنون دعاؤں میں ناگہانی وفات سے پناہ مانگی ہے: اللّٰهم إني أعوذبك من التردّي ومن الغرق والحرق، وأن يتخبطني الشيطان عند الموت، ومن أن أموتَ في سبيلك مُدبرًا وأن أموت لديخا.

چنانچہ سیرت کی کتب میں واقعۂ ہجرت مشہور ہے، اللہ تعالیٰ نے غار کے اندر زہریلے اژدہے سے محفوظ رکھا تھا۔

حسن خاتمہ کی دعا:

آپ ﷺ نے حسن خاتمہ کے لئے بھی دعائیں کی ہیں۔

اللّٰهم احيني مسلما وأمتني مسلما.

سیر واحادیث کی کتابوں میں متعدد الفاظ کے ساتھ آپ کی حسن خاتمہ کی دعائیں مذکور ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ان دعاؤں کے تناظر میں آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے واقعے کو بھی دیکھ لیا جائے:

۲۹/صفر بروز دوشنبہ تھا، آپ ایک جنازے سے واپس تشریف لارہے تھے، راستہ ہی میں دردسر شروع ہوگیا، اس کی کیفیت یہ تھی کہ ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے کہ جو رومال آپ نے سر مبارک پر باندھ رکھی تھی میں نے اسے ہاتھ لگایا تو سینک آتا تھا۔

آپ کی بیماری کی مدت ۱۳ یا ۱۴ دن ہوتی ہے، بیماری کی حالت میں ۱۱/ یوم تک مسجد میں خود آکر نماز پڑھاتے تھے، آپ آخری ہفتہ اپنی زندگی کا حضرت عائشہؓ کے گھر گذارا، جب نزع کی کیفیت طاری ہوئی اس وقت سرور کائنات کو عائشہؓ سہارا دیتی تھیں، پانی کا پیالہ آپ کے سرہانے رکھا ہوا تھا، آپ اس پیالہ میں ہاتھ ڈالتے اور چہرہ انور پر پھیر لیتے تھے، چہرۂ مبارک کبھی سرخ ہوتا، کبھی زرد پڑجاتا، زبانِ مبارک سے یہ فرماتے تھے: لا إله إلا الله، ان للموت سكرات.

اتنے میں عبدالرحمٰن بن أبی بکرؓ آئے، ان کے ہاتھ میں تازہ مسواک تھی، آپ نے اس پر نظر ڈالی، تو صدیقہؓ نے اپنے دانتوں سے مسواک کو نرم کیا، چنانچہ آپ نے مسواک فرمائی اور ہاتھ بلند کیا اور زبان قدسی سے فرمایا:

اللّٰهم الرفيق الأعلى.

اس وقت ہاتھ گر گئے اور پتلی اوپر کو اٹھ گئی، ۱۲/ربیع الاوّل ۱۱ھ یوم دوشنبہ بوقت چاشت جسم اطہر سے روح انور نے پرواز کیا، اس وقت عمر مبارک ۶۳ سال ۴/دن تھی۔

إنا للّٰهِ وإنا إليه راجعون. أفإن مت فهم الخالدون

یہ آپ کی مختصر سی سیرتِ مبارکہ تھی دعاؤں کی روشنی میں، سیرت کے ہر پہلو کی طرح یہ پہلو بھی بہت وسیع ہے، ہم دعوی کرسکتے ہیں کہ جس طرح ہر پہلو تشنہ ہے اس پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ناکافی ہے، یہی حال اس پہلو کا ہے، مزید برآں میری کیا حیثیت۔ صرف کوشش ہے کہ نام بھی میرا آپ ﷺ کے تذکرہ نگاروں میں آجائے۔

❁ ❁ ❁

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد باعثِ رحمت یا....

از: فاروق اعظم عاجزؔ کھگڑیاوی
متعلّم دارالعلوم دیوبند (یوپی)

پہلی بات

آزادی کے بعد اور خصوصاً چند سالوں سے فرقہ پرست قوت نے ہندوستان سے اسلام اوراس کے پیروکار کی بیخ کرنے میں یہود ونصاریٰ کی پوری پوری نیابت اختیار کررکھی ہے۔کبھی بابری مسجد کا معاملہ تو کبھی بھاگلپور وگجرات میں مسلم نسل کشی کا ننگا ناچ، اسی طرح کبھی مسلمانوں کی پرسنل لا، میں مداخلت، کبھی دینی مدارس کو دہشت گردی کا مرکز قرار دینا گویا ”بہروپیا مختلف رنگوں میں“۔

ے ”تم جتنا ہی تراشوگے اتنا ہی سوا ہوگا“ کے تحت جب اسلام دشمن کی تشنہ نگاہ سیراب نہ ہوسکی تو اس نے ہماری تاریخ کو مسخ کرنا شروع کردی، اور یہ آج ہی سے نہیں؛ بلکہ بہت پہلے ہی سے اس کی داغ بیل ڈالی جاچکی ہے؛ لیکن ماضی قریب سے اس میں روز بروز شدت بڑھتی ہی جارہی ہے، اور مسلم حکمرانوں خاص طور پر حضرت عالمگیرؒ کی جانب سے لوگوں میں اس قدر پروپیگنڈہ کیا گیا کہ غیر تو غیر اپنے بھی اسی پرفریب سیلاب میں بہہ پڑے، نیز لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال بھی جنم لینے لگا کہ آیا ہندوستان میں مسلمانوں کا ورود باعث رحمت ہے یا زحمت؟؟؟

متعصب مورخین کی دوغلی پالیسی کے علی الرغم اکثر لوگوں کا زاویۂ فہم اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ: مسلم حکمراں نے ہندو پر تشدد نیز ان کے مقامات مقدسہ کی پوری بے حرمتی کی ہے، اور مذہبی آزادی سلب کرلی گئی تھی؛ لیکن انسان لاکھ اپنی آنکھ بند کرکے روشن سورج کو جھٹلائے پھر بھی سورج روشن ہی رہے گا اس کی چمک دمک پر اس نادان کی آنکھ مچولی سے ہرگز تاریکی طاری نہیں ہوسکتی۔

چناں چہ ذیل کے سطور میں انھی واقعات وحقائق پر روشنی ڈالی جائے گی اوراس نقطے کونکھارا جائے گا کہ ہمارے جتنے بھی دعوے ہیں بغیر دلیل کے نہیں؛ بلکہ مکمل ثبوت کے ساتھ ہیں۔

ورود اسلام سے قبل ہندوستان کا مذہب

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی حالت کا سرسری جائزہ بھی ناگزیر ہے۔ ہندوستان میں اسلام سے پہلے بدھ مذہب کے پیروکار تھے، اور بہت ہی قلت کے ساتھ برہمنی مذہب کا بھی پتہ چلتا ہے؛ لیکن اتنی بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اس وقت آرین مذہب کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی؛ بلکہ بدھسٹ کا اپنی خیرات تقسیم کرتے وقت جہاں دیگر مستحقین لائن میں ہوتے تھے وہاں برہمنوں کی قطار بھی ہوتی تھی (مختصر تاریخ ہند ۱/ ۱۱۷-۱۱۸، از مسٹر ہنٹر) لیکن اس کے باوجود برہمن ''بدھ'' مذہب کو ختم کرکے آرین مذہب قائم کرنا چاہتے تھے۔ مورخ اسلام اکبر شاہ خاںؒ کے حوالے سے چین کے مشہور عالم ''ہیونگ شیانگ'' نے ہندوستان کی سیاحت میں پندرہ سال ۶۳۰-۶۴۵ء) تک گزارے ہیں، اتنی ہی مدت میں ہندوستان کے چپہ چپہ کی سیر کرلی، اور ہر مقامات پر اپنے ماننے والوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ چناں چہ دوران سفر کئی جگہ ڈاکوؤں کے پنجے میں گرفتاری کا ذکر بھی کرتا ہے، اور ہمیشہ ان (لٹیروں) کو کافر اور بے دین بتاتا ہے حالانکہ وہ برہمنی مذہب کے پیروکار اور بدھ کے مخالف تھے۔ (آئینہ حقیقت نما، ص:۸۴)

اسلام سے پہلے ہندوستان کی مذہبی حیثیت

ہندوستان میں بدھ مذہب کو راجا ''اشوک'' کے زمانے میں کافی ترقی ملی؛ لیکن اس کے بعد اس کے شہنشاہی ٹکڑوں میں منقسم ہوگئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بدھ کی اصل تعلیمات مسخ ہوگئیں اور عبادت واخلاق کی بنیاد کھوکھلی ہوکر رہ گئی کیوں کہ اشوک کے عہد کو ۹/سو برس اور گوتم بدھ کے زمانے کو تقریباً ۱۲/سو برس ہوچکے تھے، (آئینہ حقیقت نما، ص:۸۵-۸۶) چناں چہ پورا معاشرہ بت پرستی وبدعقیدگی اور شدت پسندی کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ اسی زمانے کے احوال کی نقاب کشائی اکبر شاہ اس طرح کرتے ہیں کہ: ''یہاں (سندھ) میں عام طور پر بت پرستی رائج تھی، مجرموں کی شناخت کے لیے ان کو جلتی ہوئی آگ میں گذارنے کا عام رواج تھا، اگر آگ میں جل گیا تو مجرم اور بچ گیا تو بے گناہ تھا۔''

پھر مزید کچھ آگے فرماتے ہیں کہ: جادو کا عام طور پر رواج تھا، غیب کی باتیں اور شگون کی تاثیرات بتانے والوں کی بڑی گرم بازاری تھی، محرمات ابدی کے ساتھ شادیاں کرلینے میں تامل نہ تھا، چناں چہ راجا داہر نے اپنی حقیقی بہن کے ساتھ پنڈتوں کی ایماء سے شادی کی تھی، راہزنی اکثر لوگوں کا پیشہ تھا، ذات باری تعالیٰ کا تصور معدوم ہوکر اعلیٰ وادنیٰ پتھر کی مورتوں اور بتوں کو حاجت روا سمجھتے تھے۔'' (آئینہ حقیقت نما، ص:۱۷۴-۱۷۵)

اسی دور کا تذکرہ کرتے ہوئے علی میاں ندویؒ ''منوشاستر'' کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ:

''اس وقت عام طور پر ہندو مذہب نت نئے دیوتاؤں یہاں تک کہ آلۂ تناسل تک کا پوجا جانا بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا (اور آج بھی یہ طریقہ ہندوؤں میں رائج ہے، لاحول ولاقوۃ الا باللہ)'' طبقہ واریت بے انتہا تھی یہاں تک کہ ایک قوم ''شودر'' نامی ہے جس کے متعلق منوشاستر، ص:۶ پر ہے:

''اگر کوئی شودر کسی برہمن کو ہاتھ لگائے یا گالی دے تو اس کی زبان تالو سے کھینچ لی جائے، اگر اس کا دعویٰ کرے کہ اس (کسی برہمن) کو وہ تعلیم دے سکتا ہے تو کھولتا ہوا تیل اس کو پلایا جائے، کتے، بلی، مینڈک، چھپکلی، کوے، الو اور ''شودر'' کے مارنے کا کفارہ برابر ہے۔'' یعنی اگر برہمن کا کوئی شخص دوسری ذات والے کو قتل کردے تو فقط اس کی اتنی سی سزا کہ اس کا سر منڈوا دیا جائے اور اس کے برعکس دوسری قوم کے لوگ برہمن کے سامنے لب کشائی بھی کریں تو ان کی جان کے لالے پڑ جائیں۔ یہ تھی ہندی مذہب کی ادنیٰ جھلک۔

عرب وہند کے تعلقات کا پس منظر

بعثتِ نبوی ﷺ سے بھی پہلے ہندوستان کے مختلف قبائل: زط (جاٹ)، مید، سیابجہ یا سیابجہ، احامرہ، اساورہ، بیاسرہ اور تکرّی (ٹھاکر) کے لوگوں کا وجود بحرین، بصرہ، مکہ اور مدینہ میں ملتا ہے۔ چناں چہ ۱۰ ہجری میں نجران سے بنوحارث بن کعب کے مسلمانوں کا وفد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کو دیکھ کر فرمایا: ''یہ کون لوگ ہیں جو ہندوستانی معلوم ہوتے ہیں'' (تاریخ طبری ۱۵۶/۳، بحوالہ برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش از محمد اسحٰق بھٹی)

مزید اسحٰق بھٹی اپنی مذکورہ کتاب میں فرماتے ہیں: ''کتب تاریخ وجغرافیہ سے واضح ہوتا ہے کہ جاٹ برصغیر سے ایران گئے اور وہاں کے مختلف بلاد وقصبات میں آباد ہوئے اور پھر ایران سے عرب پہنچے اور عرب کے کئی علاقوں میں سکونت اختیار کرلی'' (ایضاً ص:۱۸) نیز تاریخ میں ان

قبائل کا۔ بزمانۂ خلافت شیخین (حضرت ابوبکر وعمرؓ) حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے ہاتھ پر مسلمان ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ (ایضاً،ص:۲۵) خلاصہ یہ کہ یہ قبائل عرب کے ساتھ گھل مل گئے ان قبائل میں سے بعضوں کے بہت سے رشتہ دار تھانہ، بھڑوچ اور اس نواح کے مختلف مقامات میں (جو بحرِ ہند کے ساحل پر تھے) آباد تھے۔

بالآخر عرب و ہند کے درمیان شدہ شدہ مراسم بڑھتے گئے یہاں تک کہ برصغیر (متحدہ ہند) اور عرب کا باہم شادی و بیاہ کا سلسلہ بھی چل پڑا، اس ہم آہنگی کی سب سے اہم کڑی عرب و ہند کے تجارتی تعلقات تھے، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے نت نئے اشیائے خوردونوش وغیرہ: ناریل، لونگ، صندل، روئی کے مخملی کپڑے، سندھی مرغی، تلواریں، چاول اور گیہوں اور دیگر اشیاء عرب کی منڈیوں میں جاتی تھیں۔ (ایضاً،ص:۲۹) اس واقعے کی تصریح ایک مصری مورخ یوں کرتا ہے:

جنوبی عرب سے آنے والے تجارتی قافلوں کی ایک منزل مکہ مکرمہ تھا، یہ قافلے ہندوستان اور یمن کا تجارتی سامان شام اور مصر کو لے جاتے تھے، اثنائے سفر میں یہ لوگ مکہ مکرمہ میں قیام کرتے اور وہاں کے مشہور کنوئیں ''زمزم'' سے سیراب ہوتے اور اگلے دن کے لیے بقدر ضرورت زمزم کا پانی ساتھ لے جاتے تھے۔'' (عرب و ہند عہد رسالت میں بحوالہ المجمل فی تاریخ الادب العربی،ص:۲۷)

ہند میں طلوع اسلام

یوں تو لوگوں میں مشہور ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی روشنی بزورِ تیر و شمشیر سب سے پہلے سرزمین سندھ پر پڑی؛ لیکن یہ واقعہ ۹۳ ہجری کا ہے جب کہ اس سے بہت پہلے بعہد فاروقی ۱۵ھ ہی میں مالابار، اور سراندیپ کے علاقوں میں اسلام کی خوشبو پھیلنا شروع ہوگئی تھی اور سلسلہ وار عہد عثمانیہ سے خلافت امیہ تک یکے بعد دیگرے بہت سے حضرات رسالت وتوحید کی روشنی جنوبی ہند میں لالاکر اس علاقے کے گوشہ گوشہ کو روشن کرنے میں ہمہ تن منہمک تھے، اور اسلام کسی خلل و رکاوٹ کے بغیر پھیل رہا تھا اور لوگوں کے ذہن ودماغ کو مسخر کیے جارہا تھا؛ یہی وجہ ہے کہ مالابار کا راجا ''زمورن یا سامری'' نے معجزہ شقِ قمر کا چشم دید مشاہدہ کیا اور تاریخ و دن محفوظ کرکے تحقیق شروع کردی... معلوم ہوا کہ عرب میں ایک پیغمبر پیدا ہوئے ہیں انھی کا یہ معجزہ تھا۔ (آئینہ حقیقت نما،ص:۱۷-۲۷، ازمورخ اسلام اکبر شاہ خاں نجیب آبادی)

الحاصل راجا نے بسروچشم اسلام قبول کرلیا اور اپنی سلطنت ترک کرکے سراپا ہدایت و رحمت

ﷺ کی بے پناہ اشتیاق میں ان کے کوچے کی طرف چل پڑا؛ لیکن وقت کا - سوائے خدا کسی کو علم نہیں- قبل اس سے کہ وہ اپنی تشنگی بجھاتا دل کی ارماں دل ہی میں لیے ہوئے مالکِ حقیقی سے جاملا۔

رہا محمد بن قاسم کا ہندوستان پر حملہ کا سوال، تو اس کا مضبوط جواب یہ ہے کہ: حملہ کے اصل اسباب راجہ داہر کے سیاہ کرتوت اور اس کے ہمراہیوں کی دراندازی تھی۔

سرزمین ہند پر مسلم حکمراں کے قدم اور ان کے اثرات ونتائج

ہندوستان پر مسلمان حکمرانوں کی تہذیب وتمدن کے اثرات کے پیش نظر علامہ شبلیؒ کا نظریہ انھی کے الفاظ میں تحریر کیا جائے گا تاکہ آئندہ سطور کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ فرماتے ہیں: ''کسی غیر قوم کا کسی غیر ملک پر قبضہ کرنا کوئی جرم نہیں ورنہ دنیا کے سب سے بڑے فاتح سب سے بڑے مجرم ہوں گے لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ فاتح قوم نے ملک کی تہذیب وتمدن پر کیا اثر پیدا کیا،'' چنگیز خاں'' فتوحات کے لحاظ سے دنیا کا فاتح اعظم ہے؛ لیکن اس کی داستان کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے، مرہٹے ایک زمانے میں تمام ہندوستان پر چھا گئے؛ لیکن اس طرح کہ آندھی کی طرح اٹھے، لوٹا مارا، چوتھ (آمدنی کا چوتھائی) وصول کیا اور نکل گئے، بخلاف اس کے متمدن قوم جب کسی ملک پر قبضہ کرتی ہے تو وہاں کی تہذیب وتمدن دفعتہً بدل جاتی ہے، سفر کے وسائل، رہنے سہنے کا طور، کھانے پینے کے طریقے، وضع ولباس کا اندازہ، مکانوں کی سجاوٹ، گھروں کی صفائی، تجارت کے سامان، صنعت وحرفت کی حالت، ہر چیز پر ایک نیا عالم نظر آتا ہے۔ اور گو مفتوح قوم ضد سے احسان نہ مانے لیکن درودیوار سے شکرگذاری کی صدائیں آتی ہیں۔'' (اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اس کا تمدنی اثر، ص:۱-۲)

یوں تو ہلکی پھلکی جھڑپیں ۱۵ھ ہی سے شروع ہوچلی تھیں، نیز سندھی قیدیوں کا - جن کو ایران لڑائی کے وقت کام میں لاتا تھا - عربوں کے ساتھ ہم محاذ ہونے کا اشارہ بھی تاریخ سے ملتا ہے؛ لیکن باضابطہ ہند پر حملہ کا نقشہ یوں ہے: راجا داہر کی سرکشی مسلمانوں کے خلاف حد سے متجاوز ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے عراق کے گورنر حجاج نے محمد بن قاسم کو ہندوستان کی طرف بارہ ہزار افواج مع اسباب وآلاتِ حرب وضرب کے رجا داہر کی گوشمالی کے لیے روانہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اسلامی لشکر جرار کی رجا داہر کی فوج سے زبردست معرکہ ہوا اور راجا داہر مارا گیا۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کی سرزمین کو ظلم وسرکشی سے پاک کردیا... پھر محمد بن قاسم نے

پے در پے کئی مقامات فتح کر لیے اور ان پر شاندار کارکردگی دکھائی جس کی تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ اہل سندھ پہلے کیا تھے اور اسلام کے مقدس اور روح افزا سایے میں آنے کے بعد اخلاق اور تعلیم وتہذیب کے کیسے اعلیٰ معیار پہنچ گئے۔

محمد بن قاسم کے بعد متعدد مسلم حکمراں آئے اور تھوڑی تھوڑی مدت میں بدلتے رہے جس کی وجہ سے پہلے کے بنسبت نظم ونسق خاصا اثر انداز ہوا۔ البتہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دور اقتدار میں اہل سندھ و ہند کے نام دعوتی خطوط روانہ کیے۔ جن میں توحید و رسالت کی دعوت اور بت پرستی و بداخلاقی سے باز رہنے کی بات تھی۔ جس کا سردست نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ بہت سارے ہندو سرداران اسلام میں داخل ہوگئے جن میں سرفہرست ''جے سنگھ'' بن داہر تھا۔

ان تاریخی حقائق (جو مغربی مورخین کی نفرت آمیز آلودگی میں اوجھل ہوکر رہ گئے) پر اہل وطن کو غور کرنے کا مقام ہے۔ پھر مسلمان حکمرانوں کا یہ سلسلہ عبدالملک بن شہاب ۷۷۶ء تک چلا اس کے تقریباً دو صدی بعد ۹۹۷ء میں محمود غزنوی کا ورود ہوا اور متعدد حملوں کے بعد حکومت ہند کی باگ ڈور سنبھالی، پھر تقریباً ڈیڑھ صدی کے بعد ۱۱۷۱ء میں محمد غوری آیا اور کئی معرکہ آرائیوں کے بعد فتح حاصل کی اور سلاطین ہند میں شامل ہوا؛ لیکن ہندوستان پر باضابطہ مسلمانوں کی طویل حکومت کا آغاز سلطان ظہیر الدین بابر سے ہوا اس لیے کہ بابر سے پہلے جو بھی آیا اس کی حکومت محدود علاقے تک رہی چہ جائیکہ محمود غزنوی نے اس میں کافی وسعت پیدا کی، دوسرے یہ کہ ایک کے بعد دوسرے کے آنے تک عرصۂ دراز کا خلا بھی رہا۔

چنانچہ انھی دونوں رکاوٹوں کے باعث اسلامی اثر ورسوخ اہل ہند میں کامل طور پر اثر انداز ہوسکا اور یہاں کے لوگوں میں تعلیم اور تہذیب وتمدن کا بڑا فقدان تھا، اور جو تھوڑی سی مقدار صوفی سنتوں کی تھی بھی تو وہ اس قدر رہبانیت کے گہرے سمندر میں غوطہ زن تھے کہ اپنی ہی ذات سے ناآشنا تھے، تو بھلا ان کے ذریعہ دوسرے کی اصلاح کی کیا توقع۔

بابر نے ہندوستان کو کس حالت میں پایا

بابر نے ترکستان سے مختلف مقامات مسخر کرتا ہوا ۱۵۲۶ء میں ہندوستان کو بھی اپنے زیر کمان کرلیا؛ لیکن ہندوستان کی معاشرت اسے بڑی عجیب وغریب محسوس ہوئی، اور اہل ہند اسے تہذیب وتمدن سے کوسوں دور نظر آئے۔ چناں چہ علامہ شبلیؒ فرماتے ہیں: ''اگرچہ ظاہر ہے کہ اس

سے قبل کی اسلامی حکومتوں نے بھی ہندوستان کی تہذیب وتمدن کو کچھ نہ کچھ ضرور ترقی دی تھی تاہم بابر نے ترکستان سے آکر ہندوستان کو جس حالت میں دیکھا اس کی تصویر اسی کے لفظوں میں یہ ہے: ''ہندوستان میں اچھے گھوڑے نہیں، اچھا گوشت نہیں، انگور نہیں، خریزہ (خربوزہ) نہیں، برف نہیں، آبِ سرد نہیں، حمام نہیں، مدرسہ نہیں، شمع نہیں (ایسی روشنی جو ہر جگہ ہر موقع سے کام آسکے) مشعل نہیں، شمع دان نہیں، مزید کچھ آگے فرماتے ہیں: باغوں اور عمارتوں میں آب رواں نہیں، عمارتوں میں نہ صفائی ہے، نہ موزونی نہ ہوا، نہ تناسب، عام آدمی ننگے پاؤں لنگوٹی لگائے پھرتے ہیں، عورتیں لنگی باندھتی ہیں جس کا آدھا حصہ کمر سے لپیٹ لیتی ہیں اور آدھا سر پر ڈال لیتی ہیں۔'' (اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اس کا تمدنی اثر، ص:۲-۳)

ہندوستان عہدِ اسلامی میں ثریٰ سے ثریا تک

شاہانِ اسلام نے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا اور اس کو ترقی کی سمت گامزن کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا نیز اس کو دیدہ زیب، سونے کی چڑیا اور پرکشش بنانے میں پوری دلچسپی کا مظاہرہ کیا، جس کی مولانا علی میاں ندویؒ یوں منظر کشی کرتے ہیں: ''مسلمان اگرچہ ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے آئے لیکن اجنبی حکمرانوں کی طرح انھوں نے اس کو محض تجارت کی منڈی اور حصولِ دولت کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اس کو وطن بنا کر یہیں رس بس گئے اور مرنے کے بعد بھی اس کی خاک کے پیوند ہوئے اس لیے کہ انھوں نے حکومت و سیاست، علم وفن، صنعت وحرفت، زراعت وتجارت، تہذیب ومعاشرت، ہر حیثیت سے اس کو ترقی دے کر صحیح معنوں میں ہندوستان کو جنت نشاں بنا دیا۔'' (ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے، ص:۱)

یہی وجہ ہے کہ شہنشاہانِ اسلام نے مختلف مقامات پر تعلیمی ادارے قائم کیے، رفاہِ عام کا مکمل نظم ونسق کیا پھر ڈاک کی راہیں ہموار کیں، مختلف الانواع روزمرہ نیز سردیوں کے کپڑوں کے بے شمار کارخانے بنوائے، تجارت وزراعت کا صحیح زاویہ سکھایا اور متمدن ممالک کے اتصال کا سامان مہیا کیا نیز صنعت وحرفت کو بام عروج تک پہنچایا۔ جس کو علامہ شبلیؒ یوں لفظ کا جامہ پہناتے ہیں:

''ہندو ہمیشہ سے نہایت سادہ لباس پہنتے تھے اور غالباً ان کو گزی گاڑھے کے سوا اور کچھ پہننا نہ آتا ہوگا، (جس کی شہادت گذشتہ سطور میں صراحت سے ملتی ہے) اکبر نے دلی، لاہور، آگرہ، شیخ پور، احمد آباد اور گجرات میں پارچہ بافی کے بڑے بڑے کارخانے جاری کیے اور (یہی

نہیں بلکہ) ایران، افغانستان، اور چین سے کاریگر بلوا کر ہر قسم کے قیمتی کپڑے تیار کرائے۔''
(اسلامی حکومت اور ہندوستان میں اس کا تمدنی اثر، ص:۷)

اسی طرح اہل ہند کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے جن خوراک کی بھی ضرورت پڑی خواہ باطنی ہو یا ظاہری مسلم حکمرانوں نے اس کو بہم پہنچایا۔

حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ...

جھوٹ جھوٹ ہے اور سچ سچ ہے، دونوں میں دن ورات کا فرق ہے، گو جھوٹ کو سچ کا لبادہ اوڑھانا دن کو رات بنانے کے مرادف ہے، کوئی حقیقت سے جس طرح ممکن ہو آنکھ بند کرلے؛ لیکن راست بازی اپنی حقیقی روشنی سے مدمقابل کی نگاہ خیرہ کرکے رکھ دیتی ہیں۔

چناں چہ چند غلام اور حقیقت سے بے خبر لوگ اسلامی حکومت کو بے انصاف، تشدد پسند اور سلاطین کی ریڑھ کی ہڈی، ہندوستان کے ہر ہر ذرے کو آفتاب و ماہتاب بنانے والے اور پورے پچاس سال تک سپاہیوں کی مقدار پر تنخواہ لے کر ملک وقوم کی خدمت کرنے والے عالمگیر اورنگ زیب کو متشدد اور مذہب ہندو کا جانی دشمن قرار دیتے ہیں۔ بڑے...رنج والم کی بات ہے۔

اس کے باوجود جواہر لال نہرو اپنی کتاب (تلاش ہند) میں ہندوستانی سماج، ہندوستانی فکر، اور ہندوستان کی تمدن وثقافت پر مسلمانوں کے ناقابل فراموش گہرے اثرات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ کہتے ہیں:

''ہندوستان میں اسلام کی اور ان مختلف قوموں کی آمد نے جو اپنے ساتھ نئے خیالات اور زندگی کے مختلف طرز لے کر آئے، یہاں کے عقائد اور یہاں کی ہیئت اجتماعی کو متاثر کیا، بیرونی فتح خواہ کچھ بھی برائیاں لے کر آئے اس کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے، یہ عوام کے ذہنی افق میں وسعت پیدا کردیتی ہے اور انھیں مجبور کردیتی ہے کہ وہ اپنے ذہنی حصار سے باہر نکلیں، وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دنیا اس سے کہیں زیادہ بڑی اور بوقلموں ہے جیسی کہ وہ سمجھ رہے تھے۔

بالکل اسی طرح افغان فتح نے ہندوستان پر اثر ڈالا اور بہت سی تبدیلیاں وجود میں آگئیں، اس سے بھی زیادہ تبدیلیاں اس وقت ظہور میں آئیں جب مغل ہندوستان میں آئے، کیوں کہ یہ افغانوں سے زیادہ شائستہ اور ترقی یافتہ تھے، انھوں نے ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ اس نفاست کو رائج کیا جو ایران کا حصہ تھی۔'' (تلاش ہند، ص:۲۱۹ بحوالہ ہندوستانی مسلمان، ص:۳۰)

اسی مذکورہ واقعہ کی تائید میں سابق صدر کانگریس اور جنگ آزادی کے ایک رہنما ''ڈاکٹر پٹابی ستیہ رَمیّہ'' کے الفاظ کا نقل کرنا بھی میرے خیال سے بہتر ہوگا: ''مسلمانوں نے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا ہے اور ہمارے نظم ونسق کو مستحکم اور مضبوط بنایا نیز وہ ملک کے دور دراز حصوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کامیاب ہوئے، اس ملک کے ادب اور اجتماعی زندگی میں ان کی چھاپ بہت گہری دکھائی دیتی ہے۔'' (خطبہ صدارت انڈین نیشنل کانگریس اجلاس جے پور ۱۹۴۸ء، بحوالہ ہندوستانی مسلمان، ص:۳۰)

یہ تھی مسلم حکمرانوں کی طرز حکومت اور اس کے بحر ذخار کے چند چھینٹے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ سمندر کو کوزہ میں سمونا انتہائی دشوارتر امر ہے۔ آج ہمارے اہل وطن ان حکمرانوں کے احسانات جس طرح بھی ہو فراموش کردیں؛ لیکن ان کے لگائے ہوئے اس سدا بہار گلشن کی دلربائی سے اپنی آنکھ اور ان کے عطر بیز پھولوں سے اپنی ناک کب تک بند کریں گے جب کہ خود اسی باغ کے بلبل ہیں اور پرورش پاکر اس کی خوشبوؤں سے لہلہا رہے ہیں۔

مورخین کی دجل آفرینی اور اس کی پردہ دری

ہمارے بعض اہل وطن کی نگاہ میں تمام مسلم حکمرانوں میں سب سے بڑا مجرم سلطان اورنگ زیب ہے۔ اور اس پر عائد تمام جرائم میں سے سب سے بڑا جرم ''ہندوؤں کے ساتھ تشدد اور ان کے منادر کو منہدم کرکے مساجد کی تعمیر ہے'' لیکن اس خود تراشیدہ الزام کا حقیقت سے کس قدر تعلق ہے ہر وسیع النظر مورخ اس کے صحیح نتیجہ تک بڑی آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔ لیکن صد افسوس... کہ بعض کوتاہ نظر مورخین جو متعصب یورپین کے اس بہکاوے پر کہ ''کوے تمہارے کان لے جارہے ہیں'' تو یہ تنگ بیں مورخ بجائے اپنی عقل کو کام میں لاتے ہوئے اپنے اپنے کانوں کا جائزہ لیتے یکلخت کوے کی طرف بھاگ پڑے اور حقیقت سے بالکلیہ بے خبری کا ثبوت دیا؛ حالانکہ عالمگیر سے انھیں مندروں اور مسجدوں کو نقصان پہنچا جو باغیوں کی پناہ گاہ بن چکی تھیں، اگر ایک طرف عالمگیر کے ہاتھوں متھرا اور بنارس کے مندروں کو (ظاہری) نقصان پہنچا تو دوسری طرف اسی نے بے جاپور کی جامع مسجد کو بھی زمین سے ملوادیا نیز گولکنڈہ کی مسجدیں بھی اس زد میں آئیں جس کی شہادت ایک منصف مزاج ہندو مورخ ''بی، این، پانڈے'' کی تحریر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ تحریر کرتے ہیں: ''یہ بات بالکل غلط ہے کہ متھرا اور بنارس کے یا کہیں دوسری جگہ کے منادر کو توڑ کر

مسجدیں تعمیر کرائیں۔'' اب خود وہ مورخ اپنی فہم کو وسیع کرے جس نے بہار کے کالج میں داخل شدہ ایک کتاب میں صاف طور پر یہ سوال قائم کردکھایا ہے کہ: ''اورنگ زیب نے مندر منہدم کرواکر کون سی مسجد تعمیر کروائی'' اور جناب پانڈے اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ آگے مزید گویا ہیں: مہا کال مندر (اجّین)، بالا جی مندر (چترکوٹ) کاماکھیہ مندر (گوہاٹی) جین مندر (گرنار) گرودوارارام رائے (دہرادون) وغیرہ کو (عالمگیر نے) جاگیر عطا کرتے وقت اس دعا کی ہدایت کی کہ...اس کے خاندان میں تا قیامت حکومت بنی رہے۔'' (بحوالہ عہد وسطیٰ میں مشترکہ تمدن اور قومی یکجہتی،ص:۱۵۶)

اسی طرح دیگر بعض مورخین نے محمود غزنوی پر بھی اپنا سارا نزلہ اتارا ہے اور اس کے اندر سب سے بڑی خامی یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ ہندوکو زبردستی مسلمان بناتا تھا اور جو انکار کرتا تو اسے قتل کردیتا تھا؛ لیکن اس سفید جھوٹ کا پردہ فاش راجا جے پال کے اس واقعے سے ہوتا ہے کہ ''جے پال'' کی ۵/اگست ۱۰۰۱ء میں گرفتاری ہوئی اور سلطان محمود غزنوی نے پشاور کے میدان میں فتح حاصل کرکے راجا کو مع اس کے ۱۵/سردار کے اپنے ساتھ غزنی لے گیا اور مارچ ۱۰۰۲ء کو تقریباً آٹھ مہینے اپنے ہمراہ رکھنے کے بعد غزنی سے رخصت کیا؛ لیکن نہ تو اسے زبردستی مسلمان بنایا اور نہ ہی -مسلمان نہ ہونے کی صورت میں- اسے قتل کیا، تاریخ شاہد ہے کہ وہ صحیح وسالم غزنی سے واپس آیا۔ اس واقعے سے جہاں غلط فہمیوں کی جھوٹی عمارتیں منہدم ہوتی ہیں وہیں محمود کی بے پایاں شرافت اور عفوودرگذر کا بھی پتہ چلتا ہے۔

گذارش

مذکورہ بالا تحریر سے ہر عقلمند شخص بآسانی یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ شاہانِ مسلم جب ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ کیا لائے، ہندوستان پستی کی کس تہہ تک پہنچ چکا تھا اس کو بلندی کے کس معیار پر پہنچایا۔

سارے بادشاہ سرزمین ہند پر باغباں بن کر آئے اور اپنی بوقلمونی ذہن وافکار اور مذہبی قوت کو اس کی باغبانی اور اس کو خوشگوار بنانے میں صرف کیا، بقدر ضرورت زمین بھی کریدی اور خس و خاشاک کو صاف کرکے از سر نو ایک شاندار اور متنوع گلوں کی پھلواری قائم کی، ہر طرح اس کی آبیاری کی اور اس کے وہ پھول جو صدیوں سے طبقہ واریت، دیوتاؤں کی کثرت اور نفسانیت و

رہبانیت کے بادِسموم جھلس رہے تھے-کوئی زندگی عطا کی اور پھلنے پھولنے کی مکمل راہیں ہموار کیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آج اگر ہم تعصب ونفرت کی دبیز تہہ کا آپریشن کرکے فرقہ واریت کی ہلاکت خیز بیماری سے نجات چاہتے ہیں اور ہندو مسلم ایکتا قائم کرنے کے خواہاں ہیں تو ہمیں یورپ کی دجل آفرینی جال سازیوں سے اپنی نگاہوں کو موڑ کر حق وانصاف کی صحیح کسوٹی اختیار کرنا ہوگی، اور تعصب واختراعات سے بالاتر ہوکر نسل جدید کے سامنے اپنے ملک ووطن کی صحیح تاریخ پیش کرنا ہوگی۔ جبھی ہمارا بابِ ہند کے دو پاٹ بننا ممکن ہوسکے گا تاکہ ہمارے اصل دشمن- جو ہمیں باہم لڑانا چاہتے ہیں-کو منھ کی کھانی پڑے، اور جس طرح ہم پہلے سے ہندی رہے ہیں آئندہ بھی ہندی ہی رہیں۔

❀ ❀ ❀

ضروری اطلاع

ایک طویل عرصہ سے ماہنامہ دارالعلوم کا بدل اشتراک سالانہ =/100 روپے چلا آرہا ہے جبکہ اس مدت میں دیگر مجلّات ورسائل کی قیمتوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔

چونکہ کاغذ، طباعت، اور دیگر مصارف میں بے تحاشہ اضافہ ہوگیا ہے جس کی بنا پر ہمارے لیے یہ ناگزیر ہوگیا ہے کہ ادارہ کو خسارہ سے بچانے کے لیے سالانہ بدل اشتراک میں اضافہ کریں۔

لہٰذا اگست سے ماہنامہ کا سالانہ بدل اشتراک ہندوستان کے لیے فی شمارہ =/15 روپے اور سالانہ =/150 روپے ہوگا۔

ہندوستان سالانہ =/150، پاکستان سالانہ =/200 ہندوستانی سکہ، بنگلہ دیش =/200 ہندوستانی سکہ، سعودیہ ودیگر ممالک سے =/800 ہندوستانی سکہ۔

اسلام کا محاسبہ یوروپ سے درگذر

از: ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی

۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

اسلام اور مسلمانوں پر انسانیت کے دشمنوں کی طرف سے جو چارج شیٹ لگائی گئی ہے اُس کے اہم نکات میں سے عدم رواداری، بنیاد پرستی، خواتین کی حقوق تلفی اور تاریک خیالی ہیں۔ دن رات یہ تاثر دینے کی کوشش چل رہی ہے کہ ''اسلام کے اڑیل غیر لچک والے رویہ'' کی وجہ سے ساری دنیا میں خلفشار پھیلا ہوا ہے۔ یہ چارج شیٹ شاید تاریخ انسانی کی سب سے زیادہ جھوٹی اور خلاف حقیقت چارشیٹ کہی جاسکتی ہے۔ عملاً دنیا میں جو ہو رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ دنیا کی ظالم طاقتوں نے مل کر دنیا کے وسائل اور انسانوں کو اپنا غلام بنانے کے لئے ایک پلان بنایا ہے اس پر وہ عمل پیرا ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دنیا میں چیلنج کرنے والی کوئی طاقت اور نظریہ باقی نہ رہے۔ کمیونزم کی شکست کے بعد ''قوم پرستی'' اور ''اسلام'' ہی دو خطرہ ہیں۔ ''قوم پرستی'' بڑا خطرہ اس لئے نہیں کیونکہ یہ انہیں انسان دشمنوں کا ایجاد کردہ ہے۔ اسلام ہی اکیلا چیلنج ہے جو موجود ہے۔ اور اسلام کے تعلق سے اس انگریزی مقولہ پر عمل ہو رہا ہے کہ ''کتے کو مارنے سے پہلے اسے پاگل مشہور کردو''۔ مغربی ممالک ایک ''گینگ'' کی صورت میں اپنے اپنے حصہ کا رول ادا کررہے ہیں اور ''سردار'' اُن کو حرکت میں رکھ رہا ہے۔ اسلام کے خلاف جنگ میں اُن کا اہم حربہ مسلمانوں میں غیر مرکزیت اور فواحش ومنکرات کا فروغ ہے۔ اس مہم کو جمہوریت کے ''قیام'' اور ''خواتین کی آزادی'' کی مہم کا نام دیا ہے، جمہوریت کے تعلق سے اُن کے منافقانہ رویّہ کی کھلی اور تازہ ترین مثال فلسطین، ترکی، اور فرانس میں دیکھنے میں آئی۔ فلسطین میں جمہوری طریقہ سے الیکشن جیت کر آنے والی جماعت کو ساری مغربی دنیا اور غیر اسلامی دنیا نے منظوری اور مدد نہیں دی۔ اس پر پابندیاں لگادیں۔ انصاف پسندی کی مثال دیکھئے حماس کی ۷۰٪ سیٹیں ہیں اور اس کے وزراء کی

تعداد ۱۹ میں سے ۹ ہوگی فتح کی نشستیں ٪۲۵ ہیں اس کے وزیر ۶ ہوں گے۔ یہ ہے انصاف جو مکہ المکرّمہ میں کیا گیا ہے مگر مغرب ابھی بھی ناراض ہے۔ اور حماس کی سرکار کو مانا نہیں جارہا ہے۔

ترکی میں صدارتی انتخاب میں اسلامی رجحانات کے حامل متوقع امیدوار عبداللہ گل کے وزیراعظم طیب اردگان کے ذریعہ اعلان کئے جانے پر یہ معاملہ اٹھادیا کہ عبداللہ گل اسلام پسند ہیں اوران کی بیوی اسکارف باندھتی ہیں اورایسی خاتون ملک کی خاتون اوّل کے طور پر قصر صدارت میں پہنچنا ترکی میں شوشلزم کے لئے بڑا خطرہ ہوگا۔ وہاں کی مغرب زدہ فوج نے دھمکی دی۔ اور انقرہ اورازمیر میں بڑے بڑے مظاہرہ کرائے گئے کہ اسلام پسندوں سے ترکی کو خطرہ ہے۔ یہاں تک کہ یہ صدارتی انتخابات عدالت نے ایک قانونی حیلہ سے جولائی تک کے لئے ٹال دیئے۔

دوسری طرف دیکھیں کہ اسی ماہ فرانس میں صدارتی الیکشن ہوئے۔ جس میں ایک انتہا پسند عیسائی، صہیونیت کا حامی، بیرونی مہاجرین کا مخالف اور کھلے بندوں سرمایہ داری اور امریکہ واسرائیل کی حمایت کرنے والا شخص نکولس سارکوزی صدر منتخب ہوگیا۔ مگر دنیا میں کوئی چرچا نہیں کوئی ہنگامہ نہیں کوئی بحث نہیں۔

ترکی کے رکن امیدوار پرہی ہنگامہ اورفرانس میں کٹر اورانتہائی سخت تنگ نظر شخص کے منتخب ہونے پر بھی کوئی ہنگامہ نہیں۔ جب کہ طیب اردگان کی پارٹی نے اپنے چار سالہ اقتدار میں یورپین یونین میں شامل ہونے کے لئے کوئی بھی ایسا کام نہیں کیا جس سے مغربی ممالک کو اعتراض کا موقع ملے۔ اس کے برعکس فرانس میں سارکوزی کے مقابلہ نرز اورسیوکلر صدر نے بدنام زمانہ قانون پاس کرکے لاگوکرایا کہ کوئی بھی خاتون اسکارف یا مذہبی علامت پہن کر اسکول نہیں آسکتی۔ جبکہ طیب اردگان کے ترکی میں ایک خاتون ممبر پارلیمنٹ کو اسکارف باندھ کر پارلیمنٹ کی کارروائی میں شریک نہیں ہونے دیا گیا۔ دراصل یہ ساری بہانہ بازیاں اپنے اصل مکروہ اور ظالمانہ عزائم کو پوشیدہ رکھنے کے لئے کئے جارہے ہیں۔ جمہوریت کا رونا رویا جاتا ہے اورڈکٹیٹروں کی حمایت کی جاتی ہے۔ میانمار کے ڈکٹیٹروں، پاکستان کے ڈکٹیٹر، مصر کے ڈکٹیٹر، مغربی ممالک کے منظورنظر کیوں ہیں؟ پاکستان کے صدر/ ڈکٹیٹر پاکستان کو جدید فلاحی ریاست بنانے کے لئے مدرسوں کی اصلاح کے لئے بلیئر اوربش، جاپان اور جرمنی سے کروڑوں روپیہ لے رہے ہیں۔ خواتین کی آزادی کے لئے مقابلۂ حسن کا انعقاد ہورہا ہے وہاں کی خاتون وزیر اسپین جاکر ہواباز کی گردن میں بانہیں ڈال کر فوٹو کھنچواتی ہیں، لاہور میں میراتھن دوڑ کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں مرداور

عورت ایک ساتھ حصہ لے کر شہر میں دوڑتے ہیں، مختارن مائی کی عصمت دری پر رونے والے اسلام آباد میں خواتین کی عصمت فروشی کو ''خواتین کی آزادی'' کے نام پر حلال کرلیتے ہیں۔ اور مغربی آقا بھی مختارن مائی کو اقوام متحدہ کی ''برانڈ ایمبیسڈر'' بناتے ہیں مگر ''کوثر بی'' پر ہونے والے شرمناک ظلم پر ابھی تک زبانیں گنگ ہیں۔ یہ بات غورطلب ہے کہ مغرب کن عوامل کے ذریعہ انسانوں کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہے۔ ایک تو انسانیت میں بے حیائی اور شراب، جوا کا فروغ ''تہذیب'' اور ''آزاد خیالی'' و ''روشن خیالی'' کے نام پر کرتا ہے۔ دوسرے عقیدہ میں کمزوری پیدا کرنے کے لئے ''برداشت'' اور ''رواداری'' کے ناموں کا استعمال کرکے اسلامی دنیا میں اس کے لئے ماحول تیار کرتا ہے۔ ترکی میں صدارت کے اسلام پسند امیدوار کے رائے عامہ کو بنانے کے لئے مغرب نے ایک طرف تو اپنے ایجنٹوں کو سڑکوں پر اتارا ہے کہ وہ ''شریعت منظور نہیں ہے'' کے نعرہ لگائیں دوسری طرف پورا مغربی میڈیا اس مہم پر لگ گیا ہے کہ ان مصنوعی مظاہروں کو دنیا بھر میں نمایاں کرکے پیش کرے۔ فلسطین میں حماس کے مقابلہ کے لئے فتح کو نمایاں کیا جارہا ہے۔ اور فرضی ناموں کے انٹرویو دکھا کر اسے رائے عامہ بتا کر پیش کیا جارہا ہے کہ عوام اب اکتا گئی ہے اور وہ اب آزادی کی جنگ نہیں لڑنا چاہتی ہے۔ نوبت یہاں تک ہے کہ امریکہ اور اسرائیل نے مل کر ڈیڑھ کروڑ ڈالر کا اسلحہ گذشتہ ماہ (اپریل ۲۰۰۷ء) میں مصر کے ذریعہ الفتح کو بھجوایا ہے۔ تاکہ وہ حماس کے مقابلہ میں کمزور نہ پڑے۔ مئی ۲۰۰۷ء کے دوسرے ہفتہ میں جو برادرکشی فلسطین میں جاری ہے اس میں الفتح کے ساتھ ساتھ اسرائیل نے سیدھے حماس کو نشانہ بنایا ہے۔ اور ۴-۵ دنوں میں میزائیل حملوں میں ۲۰ سے زائد حماس رکن اور بے گناہ فلسطینی شہید کردیئے گئے۔ سوڈان میں عرصہ سے یہ منافقین جنوبی لبنان کے عیسائیوں کی بھرپور مدد افریقی ممالک کے ذریعہ کررہے ہیں۔ وسطی ایشیا کی تمام جمہوریاؤں میں ڈکٹیٹروں کی مدد کرکے عوام کو دبا رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کے تمام اداروں کا استعمال مسلمانوں میں آپسی انتشار کو بڑھانے کے لئے کیا جارہا ہے۔ ورلڈ بینک کے مجرم اور عیاش صدر سابق امریکی نائب وزیر دفاع کی جوگرل فرینڈ شاہ علی رضا ہیں وہ نام نہاد خواتین کی حقوق کی علمبردار ۵۱ سال کی ہیں۔ اور پال ولفووٹز سے عشق لڑا رہی ہیں اور اسی کلچر کو کہ ۵۱ سال کی عمر میں عاشقی فرمائی جائے وہ پھیلانے کے لئے دنیا بھر میں کوشاں ہیں یعنی دنیائے اسلام میں ان کا خاص میدانِ کار شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا ہے۔ اور دونوں کی دوستی ۹۰ کی دہائی کی شروعات میں تب ہوئی جب دونوں ''نیشنل انڈومنٹ فار

ڈیموکریسی'' سے جڑے ہوئے تھے۔ یاد رہے کہ پال ولفوٹز ایک کٹر یہودی اور عراق کے خلاف امریکی جنگ کا سب سے بڑا احمایتی رہا ہے۔ ورلڈ بینک میں اپنی تصویر غریبوں کے ہمدرد کی بنائی ہے۔ اور شمالی افریقی ممالک نے اس معاشقہ پر چٹکی لیتے ہوئے بجا ہی کہا ہے کہ ہمیں بات بات پر کرپشن کا طعنہ دینے والے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ غریبوں کی امداد کی رقم کے بل بوتے پر عاشقی منائی جارہی ہے۔ عورتوں کی ہمدرد گرل فرینڈ کی غیر قانونی ترقی دے کر اس کی تنخواہ 133000 امریکی ڈالر سے بڑھا کر 193000 امریکی ڈالر کردی ہے۔ اسی طرح کی دوسری مسلم خاتون امریکہ کی محکمہ خارجہ میں شیریں طاہر خیل ہیں امریکی محکمہ خارجہ میں جنوبی ایشیا کے معاملات کی ذمہ دار ہیں۔ ان کی بھی یہی خصوصیات ہیں۔ گذشتہ ماہ ہندوستان آمد پر ایک اخبار کو انٹرویو دیا اور دل کھول کر بالکل صاف صاف عراق پر امریکی حملہ کی حمایت کی کہ اس سے جمہوریت کو فروغ حاصل ہوگا۔ ہالینڈ میں پرس علی افریقہ نژاد خاتون کو سارے مغربی میڈیا نے خوب سر پر چڑھا کر رکھا کیونکہ وہ قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ پر خوب تنقیدیں کرتی تھی۔ سیاسی طور پر دیکھیں تو ہر ملک کے انتہائی کرپٹ حکمرانوں کو انہیں ''اصلاح پسندوں'' کے در پر جائے امان ملتی ہے۔ تمام مسلم دنیا کے کرپٹ حکمراں اور سیاست داں یہیں پناہ گزیں ہیں۔ سلمان رشدی اور فتنۂ امامت خواتین کی بانی اسریٰ نعمانی سے لے کر بے نظیر بھٹو اور الطاف حسین جیسے استحصال پسند اور مغرب کے ایجنٹ لندن سے ہی کاروبارِ قتل وخون چلا رہے ہیں۔ ایک طرف تو یہ مغربی شاطر مسلم دنیا کی غریبی اور ابتر حالت پر گھڑیالی آنسو بہاتے ہیں دوسری جانب جو لٹیرے اِس ابتر صورت حال کے لئے ذمہ دار ہیں انہیں اپنے گھروں میں امان دیتے ہیں ان کی لوٹی ہوئی دولت کو اپنے یہاں بینکوں میں جمع کرکے اُس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ صومالیہ کی مثال بالکل تازہ ہے جہاں پڑوسی عیسائی ملک کی فوج کو اپنے ایمان فروش ایجنٹوں کے ساتھ صومالیہ پر قبضہ کرادیا۔ اور وہاں کشت وخون جاری ہے۔ مغرب کا اسلحہ بھی فروخت ہورہا ہے اور مسلمان آپسی انتشار میں بھی مبتلا ہورہا ہے۔ یہاں پر غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ حقوق نسواں، ڈیموکریسی، ورلڈ بینک ان سب کا آپس میں رشتہ کیا ہے؟ ایک کٹر یہودی کی صدارت میں ورلڈ بینک افریقی ممالک کی معاشی مدد کن شرطوں پر اور کیوں کررہا ہے؟ پاکستانی مسلح گروپ ''جنداللہ'' سے ایران پر حملہ کون کرارہا ہے؟ مغرب نواز کردوں کے ذریعہ ترکی اور ایران میں کون بم دھماکہ کرارہا ہے؟ لبنان کی حکومت کو فتح کے مسلح گروپ پر لبنان میں فوج کشی کے لئے امریکہ ۳۰۰ ملین ڈالر کے ہتھیار کون دے رہا ہے؟

عراق میں کردامریکی مفادات کا تحفظ کیسے کررہے ہیں؟ اس پلاننگ کا ایک اہم پہلوعقیدہ کو مضمحل کرنا ہے اوراس کے لئے فری میسن طرز کے ہتھکنڈہ ابھی بھی اپنائے گئے ہیں۔ مسلم ممالک میں اُن کے قبل اسلام ماضی کی تاریخ اور تہذیب کو آرٹ اور Ethnicity کے نام پر بڑھایا جارہا ہے۔ افریقی ممالک، مصر، انڈونیشیا ہرجگہ قدیم کی طرف رجوع کے نام پر غیراسلامی تہذیب کو پروان چڑھایا جارہا ہے۔ ۱۸رمئی کے اخبارات میں سینگال کے تعلق سے رائٹر کی یہ خبر میرے مدعا کو بہتر طور پر سمجھا سکتی ہے ''مریدی فرقہ ۱۸۸۷ء میں فرانسیسی غلامی کے زمانہ میں فاتح ہوا تھا۔ یہ فرانسیسیوں کے خلاف بغاوت اور کلچرل پروجیکٹ تھا۔ جس میں اسلامی اور مقامی روایات کو یکجا کیا گیا تھا۔ مریدیوں نے کہا اگر ہم اپنی مساجد بنانے کے لئے سعودیوں سے پیسہ لے لیتے تو پھر ہمیں انہیں کے طریقہ سے عبادت کرنی پڑتی۔ مغربی افریقہ میں سعودی مدد سے مسجدیں بنی ہیں جس سے وہاں وہابی نظریات کا فروغ ہوسکتا ہے۔ جبکہ مریدی رواداری کی تعلیم دیتے ہیں۔ مریدیہ اپنی آزادی اور مذہبی تسکین کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ مگر دیگر مسلم ممالک کی طرح ان کی عورتیں برقعہ پوش نہیں ہوتی ہیں آزادی سے گھومتی ہیں۔ اس طریقہ کی ایک شاخ تو ایسی ہے جس میں نماز روزہ کی پابندی نہیں ہے۔ بلکہ شراب پینے اور دیگر نشہ کو بھی منع نہیں کیا جاتا۔ اسے بائی فال کہا جاتا ہے۔ اس گروپ کے شیخ تیدین سامب نے کہا اسلام امن کا مذہب ہے یہ ہمیں لوگوں کو کلاشنکوف سے مارنا نہیں سکھاتا۔ یہ لوگ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حج کیلئے مکہ جانے کی استطاعت نہیں رکھتا تو وہ ''توبا'' (بانیٔ فرقہ مریدیہ کی جائے پیدائش) آکر اتنا ہی ثواب حاصل کرسکتا ہے۔ نیویارک میں یہ بڑی تعداد میں رہتے ہیں اور ''لٹل سینگال'' نام کی برادری قائم کررکھی ہے۔ (ہندوستان ایکسپریس، ۱۸رمئی ۲۰۰۷ء)

خط کشیدہ جملوں پر غور فرمائیں کہ ''رائٹر'' (ایک جرمن یہودی کی ایجنسی) کس قسم کی خصوصیات مسلمانوں میں پروان چڑھانا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے پندرہ دنوں (مئی ۲۰۰۷ء کے پہلے پندرہ دن میں) بوسنیا سے خبر آئی کہ وہاں کے مقامی یورپین مسلمانوں نے باہر سے آئے مجاہدین سے نفرت کرنی شروع کردی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ سخت قسم کے مسلمان ہیں اور بوسنیائی مسلمان آزادی، شراب نوشی، سور کی گوشت خوری اور آزادانہ جنسی اختلاط اور نائٹ کلب کی زندگی کے عادی ہیں۔ اسی طرح کی خبریں تواتر اور تسلسل کے ساتھ پورے میڈیا اور ہندی، انگلش سب میں یکساں الفاظ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انڈونیشیا اور وسطی ایشیا کے بارے میں بھی

ہمیں یہ ایجنسیاں بتاتی رہتی ہیں کہ وہاں ''صوفی اسلام'' اشاعت پذیر ہے اور ''سخت گیر'' ''کٹر'' ''وہابی مسلمان'' کم ہورہے ہیں اِن تمام رپورٹوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ وہ آزادی پسند، حرام وحلال سے بے پرواہ اور شراب اور جوا کے عادی ہوتے ہیں اور ایسے ہی مسلمان اچھے اور روادار کہلاتے ہیں اور اسی طرح کے مسلمانوں کو اسلامی دنیا میں فروغ دینا ہے۔ اسی لئے حماس کے مقابلہ فتح کی حمایت کی جارہی ہے۔ بے نظیر بھٹو اور مشرف سے امریکہ ماتحتی میں سمجھوتہ کرایا جارہا ہے۔ ترکی میں مظاہرہ کرا کرا اسلام پسند سیاستدانوں کو دباؤ میں لینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایک جانب تو مسلمانوں اور عالم اسلام کے حکمرانوں میں مذہب سے دوری پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش دن رات جاری ہے۔ دوسری طرف تمام مغربی اور مشرقی ممالک کے معاشرہ اور ان کے حکمراں زیادہ سے زیادہ اپنے مذاہب سے وابستہ ہورہے ہیں۔ وہاں کٹر مذہبی گروہ حکومتوں پر حاوی ہورہے ہیں۔ نام نہاد دہشت گردی اور ''اسلامی انتہا پسندی'' کے خلاف جنگ میں آگے تمام ممالک میں اِس وقت مذہبی نسلی انتہا پسند براہ راست یا بالواسطہ اقتدار میں ہیں۔ امریکہ برطانیہ، فرانس، اسرائیل، جرمنی ہر جگہ انتہائی کٹر عیسائی و یہودی ذہن کے حکمراں اور نوکرشاہی حکومت کررہی ہے۔ قارئین بش اور بلیئر کے اُن صلیبی اعلانوں کو بھولے نہیں ہوں گے کہ ''عراق کے خلاف جنگ خدائی حکم ہے'' یا یہ کہ ''میں خدائی مرضی پوری کررہا ہوں''۔ اس کے علاوہ آپ بش کے بڑے بڑے فیصلہ دیکھیں کلوننگ، اسقاط حمل، Stem cell پر تحقیق سب مسئلوں میں بش نے عیسائی مذہبی پیشواؤں کے خیالات کی تائید کی ہے۔ بلیئر بھی اپنے یہاں قدامت پسند عیسائی روایات کو قدیم کی طرف رجوع Return to basics کے نام پر آگے بڑھا رہے ہیں۔ یہی حال جرمنی، اٹلی، فرانس، ہالینڈ ہر جگہ ہے۔ یا تو مذہبی انتہا پسند حکومت کررہے ہیں یا جنونی وطن پرستی کو فروغ دیا جارہا ہے یا بالکل ہی جانور بنانے کی تہذیب کو فروغ دیا جارہا ہے؟ جن باتوں یعنی قدامت پرستی، بنیاد پرستی، عدم رواداری وغیرہ پر عالم اسلام کو نشانہ بنایا جارہا ہے وہی تمام خصوصیات یوروپ، امریکہ اور دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ لڑنے والے ہر ملک میں بڑھائی جارہی ہیں۔ یعنی جو اوروں کے لئے برا ہے اِن ٹھیکیداروں کے لئے اچھا ہے۔

عالم اسلام کی انسانی ذمہ داری: یہ ہے کہ وہ تارِ عنکبوت کو تار تار کردے۔ اور تمام دنیا کے سامنے انصاف، عدل، امن، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے مقاصد کو حاصل کرنے والے نظام کی طرف متوجہ کرائے۔ اللہ کا دیا ہوا نظام ہی دنیا کے مسائل کو حل کرکے اسے جنت

بنا سکتا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی، ہتھیاروں کی اندھا دھند تجارت، صارف کلچر Consumerism سرمایہ کی لوٹ اخلاقی قدروں کی پامالی، نشہ کی بڑھتی لت، جانوروں کی حد تک گری ہوئی جنسی حرکات جیسی لعنتوں سے تمام عالم پریشان ہے اور دنیا کے نام نہاد غنڈہ ٹھیکیدار اپنے مذموم مقاصد کے تحت تریاق کو زہر بنا کر پیش کرنے کی مہم میں آگے ہیں۔ کیونکہ اس سے اُن کی لوٹ، کھسوٹ، ظلم اور اجارہ داری کے تباہ ہونے کا خطرہ ہے۔ اِس وقت دنیا میں تمام منفی پروپیگنڈہ اور گھناؤنی شازشوں، فریب کارانہ بم دھماکوں اور انکاؤنٹروں، بی. بی.سی اور ''دیش بھگت'' میڈیا کی دن رات کی زہر فاشانیوں کے باوجود اسلامی تعلیمات کا سورج اپنی روشنی بکھیر رہا ہے۔ اسلام دلیل کے میدان میں، پرامن طریقہ سے بات منوانے کے میدان میں کبھی کمزور نہیں رہا ہے اور نہ رہے گا کیوں کہ یہ اللہ علیم وخبیر کا پیغام ہے۔ اسلام آخرت میں جنت کے حصول کا ذریعہ تو ہے ہی ساتھ دنیا کو بھی جنت بنانے کا کام یہ اپنے پیرؤں کو دیتا ہے۔ امت مسلمہ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کستوری ہرن کی طرح اپنی مشک کی خوشبو کو اپنے اندر ڈھونڈنے کے بجائے ستارۂ صلیب، ہاتھ، ہتھوڑا، ہنسیا، ہاتھی، سائیکل میں ڈھونڈھ رہا ہے۔ جبکہ وہ جس روشنی اور ہدایت کا امین ہے وہ اِن سب کے لئے ہدایت کا موجب ہے۔ دنیا کے لئے امن انصاف اور حقیقی مسرت کا پیغام ہے۔ اس پیغامِ امن وفلاح کی بے کم وکاست تبلیغ وترویج ہی امت مسلمہ کے لئے دنیاوی افتخار اور نصرت خداوندی کا ذریعہ بن سکتی ہے باقی تمام راستے غلامی، بے بسی اور ذلت کے ہی ہیں۔

❁ ❁ ❁

فتنۂ قادیانیت کا سد باب اور علماء کی ذمہ داریاں

از: مولانا انصار اللہ قاسمی
مبلغ مجلس تحفظ ختم نبوت، اے. پی

اللہ تعالیٰ نے اس دین اسلام کو کامل ومکمل فرمادیا (المائدہ) تمام انسانوں کی نجات وکامیابی اسی دین اسلام کی اتباع و پیروی میں ہے، اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب سے وابستگی اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول نہیں (آل عمران) دینِ اسلام کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا (الحجر) اسلام کے عقائد ونظریات اور تعلیمات میں بھی ردوبدل اور الٹ پھیر کرنے کی کوششیں وسازشیں کی گئیں، اس کے بعض خاص بنیادی تصورات، توحید، رسالت، ختم نبوت، آخرت، جنت وجہنم، ملائکہ، معجزہ وغیرہ میں مختلف گمراہ تعبیرات وتشریحات کے ذریعہ ان کی حقیقت کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور اس کا ذمہ لیا ہے، اور اس کے پیچھے پورا خدائی نظام کارفرما ہے اس لیے یہ کوششیں اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہوگئیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

خدائی نظام کے تحت دین حق کی حفاظت کے سلسلہ میں ایک اہم مورچہ اور مضبوط و مستحکم دستہ علماء حق کا گروہ ہے، اختلاف وفرقہ بندی کی شکل میں، خوبصورت وخوشنما تعبیرات وتشریحات کی صورت میں، عقل وفلسفہ کی راہ سے غرض یہ کہ جن جن پہلوؤں سے اسلام کی حقیقت اور حقانیت پر حملہ کرنے اور اس کے حفاظتی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوششیں کی گئیں، ان کوششوں کا رخ پھیرنے اور ان کی کایا پلٹنے میں بنیادی اور مرکزی کردار علماء حق کے اسی مورچہ و دستہ نے ادا کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ یحمل ھذا العلم من کل خلفٍ عدولہ

ينفون عنه تحريف الغالين و انتحال المبطلين و تاويل الجاهلين. (مشکوٰۃ:۳۶، کتاب العلم)

عادل اور ثقہ لوگ اس علم کو حاصل کریں گے جو غلو پسندوں کی تحریف، باطل پرست لوگوں کے غلط استدلال اور جاہلوں کی تاویلات کو اس دینی علم سے دور کریں گے۔

علماء انبیاء کے وارث اس معنی پر ہیں کہ وہ انبیاء کے مشن و پیغام کے علمبردار ہیں اور ان کے دینی و دعوتی سرمایہ کے نگہبان و نگراں ہیں، علماء کو چراغ اس لیے کہا گیا کہ چراغ کا کام خود جل کر دوسروں کو روشنی پہنچانا ہے، پھر یہ کہ دنیا کا دستور و قانون ہے کہ جب کوئی شخص اپنے اعلیٰ عہدہ ومنصب کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل نہیں کرتا تو وہ شخص اپنے عہدہ ومنصب سے معطل و برطرف کردیا جاتا ہے۔

اس وقت فتنۂ قادیانیت اپنے ناپاک عزائم اور خطرناک منصوبوں کے ساتھ پوری طرح سرگرم ہے، شہری و دیہی علاقوں میں اس فتنہ کے ہم نوا اور ہم خیال اپنی گمراہ و باطل سرگرمیوں... عوامی اجتماعات، رفاہی خدمات، لٹریچر کی نشر واشاعت وغیرہ... کے ذریعہ کفر وارتداد کے سوداگر اور مسلمانوں کے عقیدے وایمان کے غارت گر بنے بیٹھے ہیں۔

قادیانیت دراصل جھوٹی نبوت کا فتنہ ہے، نبوت محمدی کے مدمقابل جھوٹی نبوت کی دعوت اور اس کا پرچار ایک باحمیت مسلمان کے لیے ہرگز ناقابل برداشت ہے، خود رسول اللہ ﷺ کا مبارک عمل ہمارے سامنے ہے، جس وقت جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کے قاصد اس کا خط لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم دونوں اس کے دعوئ نبوت کو تسلیم کرتے ہو ان قاصدوں نے ''ہاں'' میں جواب دیا، آپ ﷺ نے فرمایا اگر قاصدوں کو قتل نہ کرنے کا قانون نہ ہوتا تو میں تم دونوں کو قتل کروادیتا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی نبوت و رسالت کے تعلق سے کتنی غیرت وحمیت تھی، اسی لیے مسیلمہ کے خط کے جواب میں آپ ﷺ نے اس کو ''کذاب'' (بہت بڑا جھوٹا) کا سخت ترین جملہ اور لقب لکھا وہ اسی غیرت وحمیت کا اظہار ہے، آپ ﷺ نے اپنی مبارک زندگی میں کبھی اتنا سخت ترین جملہ نہیں فرمایا جب کوئی بات آپ ﷺ کو ناگوار گذرتی یا ناراضگی کا سبب بنتی تو آپ ﷺ صرف اتنا فرماتے کہ مابال الناس لوگوں کو کیا ہوگیا، یا ما بال فلان، فلاں شخص کو کیا ہوگیا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مسیلمہ کذاب کی جھوٹی نبوت کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑی گئی اور مسیلمہ کذاب کا کام تمام کیا گیا،

اس جنگ میں ۷۰۰/حفاظ وقراء صحابہ کرامؓ شہید ہوئے، صحابہ کرام صرف قرآن کے حافظ وقاری ہی نہیں بلکہ عالم بھی ہوا کرتے تھے، اس جنگ میں ایک بڑی تعداد میں علماء صحابہ کرامؓ کی شہادت گویا بعد کے آنے والے علماء امت کے لیے پیغام تھی کہ جب کبھی اور جہاں کہیں جھوٹی نبوت کا فتنہ پیدا ہوگا اس کے مقابلہ کے لیے سب سے آگے علماء کو رہنا ہوگا اور انھیں قربانی دینی ہوگی، اس جنگ میں ۱۲/سو صحابہ کرام شہید ہوئے، مؤرخین نے عہد نبوی ﷺ کے غزوات میں اور کفار کے مظالم سے شہید صحابہ کرامؓ کی تعداد کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ کل تعداد ۲۵۹ ہے اور صرف مسئلہ ختم نبوت کے لیے بارہ سو صحابہ کرام شہید ہوئے، اندازہ لگایئے کہ جھوٹی نبوت کا فتنہ اتنا سنگین اور خطرناک ہے کہ اس کی سرکوبی اور بیخ کنی کے لیے اسلام کو اپنے مایہ ناز سپوتوں اور برگزیدہ ہستیوں کی ایک بڑی تعداد کو قربان کرنا پڑا۔

موجودہ دور میں جھوٹی نبوت کے فتنہ کی ایک معروف اور واضح شکل قادیانی فرقہ ہے، ماضی قریب میں ہمارے اکابر اور بزرگ علماء کرام جن کے ہم نام لیوا ہیں، جن کے ہم خوشہ چین ہیں، بالواسطہ وبلاواسطہ جن سے تلمذ پر ہمیں فخر ہے، اس فتنہ کے سدباب اور تدارک کے لیے تاریخ ساز خدمات انجام دیئے اور اس سلسلہ میں بالواسطہ وبلاواسطہ اپنے شاگردوں وخوشہ چینوں کے لیے نمونہ عمل چھوڑا، محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی اخیر زندگی میں اس فتنہ کے خلاف جدوجہد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا، قادیانیت کی سرکوبی آپؒ کی زندگی کا مقصد ومشن بن گئی تھی، نہ صرف آپ اس فتنہ کے خاتمہ کے لیے کمربستہ ہوگئے تھے بلکہ اس کے پیچھے اپنے مایہ ناز شاگردوں کی پوری ایک ٹیم لگادی تھی، قادیانیت کے خلاف آپ کا وہ محققانہ اور فاضلانہ معرکۃ الآرا عدالتی بیان جو چاردن تک بھاولپور کی عدالت میں جاری رہا، آج بھی تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے، اس بیان نے ایک انگریز عدالت کے ذریعہ قادیانیت کے کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہونے پر مہر ثبت کردی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے مرض الوفات کے دوران دیوبند کی جامع مسجد میں طلبہ وعلماء کے بھرے مجمع میں کہا کہ:

> ''میں سمجھتا ہوں کہ میرے تدریسی دور میں کم ازکم دوہزار طلبہ مجھ سے حدیث کے چند حروف پڑھے ہیں، ان تلامذہ حدیث سے صرف اتنی گذارش کروں گا کہ خدا کے واسطے تحفظ ختم نبوت کیلئے اپنی علمی وعملی توانائیاں صرف کردیں، اگر اس محاذ پر انھوں نے کوتاہی کی تو میں حشر کے میدان میں ان کا دامن گیر ہوں گا۔'' (آخری پیغام:۲۶)

بھاولپور کے مقدمہ کے موقع پر ایک مسجد میں خطاب کے دوران آپؒ نے کہا کہ ''ہم پر یہ بات کھل گئی کہ گلی کا کتا ہم سے بہتر ہے اگر ہم ختم نبوت کی حفاظت نہ کرسکیں۔''

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بانی حضرت مولانا محمد علی مونگیری، خانقاہ مونگیر بہار کے سجادہ نشین گذرے ہیں، ریاستِ بہار میں قادیانیت کی بڑھتی ہوئی یورش اور یلغار نے انھیں بے چین و بے قرار کردیا، اس کے سدباب اور خاتمہ کے لیے آپ ہمہ تن مشغول ہوگئے، حتی کہ تہجد جیسے خاص عبادت کے موقع پر بھی آپ کا وقت قادیانیت کی تردید میں کتب ورسائل کی تصنیف وتالیف میں گذرتا تھا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ ''قادیانیت کے خلاف اتنا لکھواور اتنا طبع کراؤ اور اس طرح تقسیم کرو کہ ہر مسلمان جب صبح سوکر اٹھے تو اپنے سرہانے ردقادیانیت کی کتب پائے'' آپؒ کے یہاں مولوی نظیر احسن بہاری مسودات کی تبیض پر مامور تھے، دونوں پیر مفلوج تھے، جب کبھی ان سے کام میں تاخیر ہوتی تو فرماتے کہ مولوی صاحب محنت سے کام کرو، تمھیں جہاد کا ثواب ملے گا، ایک مرتبہ انھوں نے پوچھ لیا کہ کیا مجھ کو جہاد بالسیف کا ثواب ملے گا؟ مولانا مونگیریؒ نے برجستہ جواب دیا کہ ''بے شک اس فتنۂ قادیانیت کا استیصال جہاد بالسیف سے کم نہیں''

دیہی علاقوں میں محرم کے موقع سے علموں کی رسم اور ماہ ربیع الاوّل کی مناسبت سے مولود شریف کے جلسے اور دیگر رسوم وروایات مسلمانوں کی ملّی شناخت اور مذہبی تشخص کا ذریعہ ہیں، اس سلسلہ میں اکابر علماء کرام کا مزاج یہ تھا کہ ان رسوم وروایات کو صحیح رخ دے کر ان مواقع کو مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے اور کم ازکم ان رسوم وروایات کے حوالہ سے مسلمانوں کے اندر اپنی مذہبی شناخت وپہچان کا جو احساس ہے اس کو مضبوط کیا جائے اور اس کی حفاظت کا شعور ان کے اندر پیدا کیا جائے، اس خصوص میں حضرت مولانا محمد علی مونگریریؒ اپنے ایک مسترشد اور مجاز بیعت مولانا عبدالرحیم صاحبؒ کو قادیانیت کے سدباب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''مولود شریف کے جلسے کراؤ اور ان کے (مرزا صاحب اور ان کے ساتھی) حالات بیان کرو، جس مقام کے لوگ غریب ہیں ان سے کہو کہ تم (صرف) سنو، شیرنی وغیرہ کی کچھ ضرورت نہیں، میں تمام محبین سے کہتا ہوں کہ وہ تمہاری مدد کریں۔''

غرض یہ کہ حضرت مولانا مونگیریؒ نے چین کی نیند نہیں سوئے اور سکون واطمینان کا سانس نہیں لیا تا آنکہ پوری ریاست بہار سے قادیانیت کا صفایا نہ فرمادیا، صرف بہار ہی میں نہیں بلکہ حیدرآباد دکن بھی حضرت مولانا انوار اللہ فاروقی صاحبؒ (بانی جامعہ نظامیہ) کو باضابطہ خطوط لکھ کر

قادیانیت کی سرکوبی کی طرف توجہ دلائی۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے شیخ حضرت عبدالقادر رائپوریؒ سے ایک دفعہ مولانا لال حسین اخترؒ (سابق قادیانی) پوچھا کہ حضرت کوئی وظیفہ بتادیجئے! حضرت رائپوریؒ نے فرمایا: ''ختم نبوت کا کام کرتے رہو تمہارے لیے یہی وظیفہ ہے۔''

فتنۂ قادیانیت کے سدباب کے سلسلہ میں حسب ذیل تدابیر اختیار کیے جاسکتے ہیں۔

جو علما و مدارس کے ذمہ دار اور نظماء ہیں:

۱- مدرسہ کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ختم نبوت کے موضوع پر خصوصی خطاب رکھا جائے۔

۲- اپنے ادارہ/ مدرسہ کی حیثیت و گنجائش کے لحاظ سے مدرسہ کے اطراف دیہاتوں میں مکاتب کے قیام کی ذمہ داری لیں۔

۳- چہارم عربی کے بعد عالمیت کے نصاب میں ختم نبوت اور فتنۂ قادیانیت کو مستقل مضمون کی حیثیت سے شامل کریں۔

۴- مدرسہ میں طلبہ کی انجمنوں کے تحت ختم نبوت اور قادیانیت کے موضوع پر تحریری وتقریری مسابقے منعقد کیے جائیں اور ان میں شرکاء کی ہمت وحوصلہ افزائی کے لیے پرکشش انعامات رکھے جائیں۔

۵- مدرسہ میں نئے فارغین اور فضلاء کو ''سند فضیلت'' کے حصول کے سلسلہ میں ارتداد سے متاثرہ علاقوں میں ایک سال تک دینی خدمات کی انجام دہی کو لازم اور ضروری قرار دیا جائے۔

۶- موقع بہ موقع اپنے ادارہ/ مدرسہ میں ختم نبوت کے موضوع پر بیانات رکھے جائیں اور بڑی جماعتوں کے طلبہ کے لیے سال میں ۳رتربیتی کیمپ رکھے جائیں۔

۷- مدرسہ کے بڑے طلبہ یا دارالاقامہ میں مقیم اساتذہ کو جمعہ کے خطبہ کے لیے مدرسہ کے اطراف دیہاتوں میں روانہ کیا جائے یہ گاؤں دیہات کے لوگوں سے رابطہ کا انقلابی قدم ہوگا اور فتنوں کے سدباب کے لیے دفاعی کے بجائے اقدامی عمل ہوگا۔

۸- مدرسہ کی جانب سے شائع ہونے والے ماہنامہ میں چند صفحات ختم نبوت اور قادیانیت سے متعلق مضامین کے لیے مختص کیئے جائیں، اس کے علاوہ طلبہ کی جانب سے نکالے جانے والے ''دیواری پرچوں'' میں بھی اس کو خاص اہمیت دی جائے۔

۹- اپنے مدرسہ/ ادارہ کے اطراف علاقوں سے متعلق ضروری اور اہم بنیادی معلومات کا سروے ریکارڈ اپنے یہاں رکھیں کہ اس کی روشنی میں وہ قادیانیت اور دیگر باطل وگمراہ فتنوں کی دراندازی کا بآسانی علم ہوسکے اور وہ سہولت ومنصوبہ بندی کے ساتھ ان کا سدباب کرسکیں۔

جوعلماء درس وتدریس سے وابستہ ہیں:

۱- تدریس کے دوران ختم نبوت کے موضوع پر طلبہ کی خصوصی ذہن سازی کی جائے۔

۲- جوطلبہ مضمون نگاری کا ذوق رکھتے ہیں ان سے ختم نبوت کے موضوع پر مضامین لکھوائیں۔

۳- ہفتہ میں کسی ایک دن اس موضوع پر طلبہ کے درمیان سوال وجواب کا سیشن رکھا جائے۔

جوعلماء امامت وخطابت سے وابستہ ہیں:

۱- جمعہ کے خطبوں میں موقع بہ موقع اس موضوع پر روشنی ڈالیں۔

۲- اپنی مسجد میں ختم نبوت کے موضوع پر مہینہ دومہینہ میں ایک مرتبہ عوامی اجتماع رکھیں۔

۳- ماہ ربیع الاول میں اس موضوع پر سلسلہ وار خطاب کریں۔

۴- عوامی درس قرآن، درسِ حدیث میں اس موضوع پر گفتگو کی جائے۔

۵- کسی کسی موقع سے اس موضوع پر عام فہم انداز اور آسان زبان میں لکھی گئی کتابیں بھی اجتماعی طور پر سنائی جاسکتی ہیں۔

جوعلماء مضمون نگاری اور افتاء کی ذمہ داری سے وابستہ ہیں:

۱- موقع بہ موقع اس موضوع پر قلم اٹھائیں۔

۲- قادیانیت سے متعلق فرضی سوالات قائم کئے جائیں اور ان کے جوابات لکھے جائیں۔

۳- آسان زبان اور عام فہم انداز میں دعوتی نقطۂ نظر سے اس موضوع پر ''مختصر مفید'' رسائل تیار کیئے جائیں۔

قادیانیت کی بڑھتی ہوئی ناپاک سرگرمیاں، اس کی ریشہ دوانیاں اس میدان میں اسلاف کی قربانیاں اور اس کے متعلق علماء امت کی ذمہ داریاں سب مل کر ہم سے سرگوشی کررہے ہیں کہ ہے کوئی جو اپنے دل میں سوز صدیق لے کر ''اینقص الدین وانا حی'' (دین میں کمی ہوجائے اور میں زندہ رہوں) کا نعرۂ مستانہ لگا کر جھوٹی نبوت کے خاتمہ کے لیے میدانِ عمل میں بلاخوف وخطر کود پڑے۔

امیرالہند مولانا سید اسعد مدنیؒ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

از: محمد شمیم اختر قاسمی
ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات (سنی)
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دارالعلوم دیوبند نے ایسی کئی اہم اور نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا کی ہیں جن کی خدمات جلیلہ سے تاریخ ہند کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ انہیں میں ایک اہم اور مقبول شخصیت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کی بھی ہے۔ آپ نے نہ صرف دارالعلوم دیوبند کی مسند حدیث پر رونق افروز ہوکر تشنگان علوم نبوت کو سیراب کیا؛ بلکہ رشد وہدایت کا بھی چراغ روشن کر کے لاکھوں مسلمانوں کے قلب ودماغ کو معمور ومنور فرماکر اوران کا رشتہ خالق کائنات سے مضبوط ومستحکم کیا۔ اسی کے ساتھ ہندوستانی علماء کے متحدہ پلیٹ فارم جمعیۃ علماء ہند کی مسند صدارت پر بیٹھ کر مسلمانوں کی ایسی قیادت ورہنمائی کی جس کی نظیر نہیں ملتی، اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کے وقار کو بڑی تقویت ملی۔ اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان سے لاقانونی اور غیر منصفانہ نظام کی بیخ کنی میں بھی صف اوّل میں رہے، اوراس طرح ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔

ہندوستان کو آزاد ہوئے بہت عرصہ بھی نہ گزرا تھا اور بالخصوص مسلمان آرام کی سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ برادران وطن کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ تعصب وتنگ نظری کا سلسلہ شروع ہوگیا، جگہ جگہ فرقہ وارانہ فسادکی وبا پھوٹنے لگی، ان کے مساجد معابد پر حملے کیے جانے لگے، ان کی مذہبی تعلیم پر پابندی لگائی گئی۔ اس وقت جمعیۃ علماء ہند کے افق سے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نمودار ہوئے اور فتنہ پرور جماعتوں اور فرقہ پرست طاقتوں کا تعاقب کیا جس سے مسلمانوں کے اندر امید واطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ مگر ان کے انتقال کے بعد قومی قیادت کا میدان خالی ہوگیا اور حالات بھی دگرگوں ہونے لگے۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کی نظر انتخاب مولانا حسین احمد مدنی کے فرزند سعید صالح نوجوان مولانا سید اسعد مدنی نوراللہ مرقدہ پر پڑی اور بلاکسی تذبذب اور تردد کے ان کو اپنا امیر اور جمعیۃ علماء ہند کا صدر بنادیا گیا۔ اس منصب جلیلہ پر فائز

ہونے کے بعد آپ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ محتاج بیان نہیں، مختصر یہ کہ اپنے نامور باپ کی ہر گوشہ میں جانشینی کرکے بڑی حد تک اس کا حق ادا کردیا۔ آپ نے اپنی زندگی کا نصب العین بھی انہیں الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

''میرے والد ماجد حضرت شیخ الاسلام نے ہمیں ایمان ویقین اور تحصیل واشاعت دین کے ساتھ وطن عزیز سے تعلق، آزادی سے محبت اور انسانوں کی خدمت کی جو راہ دکھائی تھی میری کوشش یہی ہے کہ جب تک زندہ رہوں ان عنوانات پر زندگی کی داستان ترتیب دیتا رہوں۔''

ان کے زمانہ صدارت میں جب بھی ملک میں کوئی ناگہانی واقعہ رونما ہوا، یا مسلمانوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کی گئی یا ان کی عزت وآبرو پر ڈاکہ ڈالا گیا، یا ان کے مساجد ومعابد پر حملے کئے گئے یا پھر ان کی تعلیم گاہوں پر پابندی لگائی گئی تو مولانا بے چین ومضطرب ہوجاتے، اور جب تک اس کا انسداد نہ کرلیتے چین سے نہ رہتے۔ ان محاسن اور قربانیوں نے انہیں جلد ہی عوام وخواص میں اتنا محبوب بنادیا کہ وہ قوم وملت کے ہوگئے اور قوم ملت ان کے لیے ہوگئی۔ بقول شخصے: مولانا کی قیادت ملت کی امنگوں کا ترجمان تھی تو ملت بھی ان کی محبت وعقیدت کے سرور میں ڈوبی ہوئی تھی۔

یوں تو مولانا اسعد مدنیؒ نے مسلمانان ہند کی فلاح وبہبود اور ان کی تعمیر وترقی کے بہت سے امور انجام دیئے ہیں۔ مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور بہتری پر خاصا زور دیا ہے۔ نہ صرف دینی تعلیم پر توجہ مبذول فرمائی بلکہ عصری علوم میں بھی مہارت حاصل کرنے کی بھی کوشش کی۔ اور اسے دین ودنیا دونوں ہی کے لیے ترقی کا زینہ قرار دیا۔ جو لوگ اپنی غریبی اور مفلوک الحالی کی وجہ سے اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے سے معذور ومجبور تھے ان کے لیے بھی مواقع فراہم کیے۔ اسی کے ساتھ ذمہ دارانِ ادارہ سے اپیل کی کہ وہ اپنے اداروں میں تعلیمی نظام کو بہتر سے بہتر بنائیں، اور ان کے لیے مفید لائحہ عمل تجویز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی مسلمانوں کی ماتحتی اور سرپرستی میں چلنے والے دینی وعصری تعلیم گاہوں پر فرقہ پرست طاقتوں نے انگشت نمائی کی یا ان کے حقوق سلب کرنے کی کوشش کی تو اس کے تحفظ وبقا کے لیے مولانا میدان میں نکل آئے اور جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے اس کا دنداں شکن جواب دیتے، جس سے فسطائی طاقتوں کے ارادے پست ہوجاتے۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ آزادی کے بعد سے ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی الزام واتہام اور

فتنوں کی زد میں رہی، جس میں کسی نہ کسی طرح حکومت وقت کا عمل دخل ضرور رہا ہے۔ کبھی اس کے اقلیتی کردار پر حملہ کیا گیا تو کبھی اسے دہشت گردی کا مسکن بتایا گیا، تو کبھی اس کے تعلیمی معیار کو ناقص ٹھہرا کر اس کی ڈگری کو مشکوک قرار دیا گیا۔ یہاں تک کہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں متعدد بار یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ یونیورسٹی سے مسلم کا لیبل ہٹا دیا جائے کیوں کہ اس سے اقلیتی فرقے کی نمائندگی ہوتی ہے۔

اس کے برعکس بنارس ہندو یونیورسٹی بھی ہے جس کے متعلق اس قسم کی نہ کوشش کی گئی نہ اس کے خلاف کبھی کوئی آواز اٹھی۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ۱۹۱۶ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس کے لیے ایکٹ کا جوڈھانچہ تیار کیا گیا تھا۔ ہندو مسلم فرق کی رعایت سے وہی ڈھانچہ تھا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی کے لیے بنایا گیا۔ چنانچہ اسی ایکٹ میں اس امر کی صراحت تھی کہ علی گڑھ محمڈن کالج ہی یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تعلیم اور انتظام کے اعتبار سے جو اغراض ومقاصد کالج کے تھے وہی اغراض ومقاصد اب یونیورسٹی کے ہوں گے۔ چنانچہ یہاں جدید اور مغربی علوم وفنون کے ساتھ اسلامی علوم وفنون کا بھی خاص اہتمام ہوگا۔ انتظامی اعتبار سے یہ بات بہت اہم ہے کہ اسی ایکٹ میں اس بات کی بھی صراحت تھی کہ کورٹ یونیورسٹی کی سب سے بڑی اور موثر مجلس حاکمہ ہوگی اور اس کا ممبر کوئی غیر مسلم نہ ہوگا۔ وائس چانسلر براہ راست کورٹ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ اسی ایکٹ پر کافی عرصہ سے عمل ہوتا رہا اور اس پر کسی کو اشکال بھی نہ ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں جب ہندوستان جمہوریہ ہوا تو اس وقت مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کی گئی اور یونیورسٹی میں غیر مسلموں کے داخلے کے لیے دروازے کھول دیئے گئے۔ پھر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی ایکٹ میں تبدیلیاں کی گئیں اس کے خلاف ۱۹۶۸ء میں عزیز پاشا اور کچھ دیگر نے سپریم کورٹ میں اپیل کی تو فاضل عدالت عظمیٰ نے علی گڑھ یونیورسٹی کو اقلیتی ادارہ ماننے سے ہی انکار کر دیا۔ جس کے خلاف ملک گیر تحریک چلی، مسز اندرا گاندھی کو مسئلے کی اہمیت اور نزاکت اور اقلیتی کردار ختم کر دینے کی غلطی کا احساس ہوا تو دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد انھوں نے ایکٹ میں ترمیم کر کے یونیورسٹی کے اقلیتی اور تاریخی کردار کو بحال کر دیا۔ اس وقت سے لے کر ۲۰۰۵ء تک یونیورسٹی اپنے آب وتاب کے ساتھ چلتی رہی۔ اسی سال موجودہ حکومت نے مسلمانوں کے لیے پچاس فیصدی ریزرویشن کا ڈھونگ رچ کر اس کے اقلیتی کردار پر سوالیہ نشان لگا دیا۔ اس طرح ایک بار پھر الہ آباد ہائی کورٹ نے اسے اقلیتی ادارہ ماننے سے ہی

انکار کردیا۔اب معاملہ سپریم کورٹ میں جا کر اٹکا ہوا ہے، مسلمان اس وقت کشمکش سے دوچار ہیں، حکومت وقت بھی تماشائی بنی عدالت کے فیصلے کا انتظار کررہی ہے۔اسے چاہیے تھا کہ وہ کورٹ پر دباؤ ڈالتی کہ وہ جلد یونیورسٹی کے معاملہ کو رفع دفع کرے تاکہ بے چینی دور ہو۔

یونیورسٹی کی اقلیتی اور تاریخی کردار کی بازیافت کے لیے شروع سے جمعیۃ علماء نے اہم رول ادا کیا ہے اور جب بھی یونیورسٹی پر کوئی برا وقت آیا تو اس کے خلاف آواز بلند کرنے اور اس کے حقوق دلوادینے میں یہ جماعت پیچھے نہیں رہی ہے۔بالخصوص فدائے ملت مولانا اسعد مدنی صاحب نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہے اور جسے یونیورسٹی حلقے نے بھی سراہا ہے۔مولانا کے اس خیر خواہانہ اور ہمدردانہ اقدام سے بالخصوص اس خیال اور نظریے کی تردید ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ علماء مسلمانوں کو عصری علوم کے حصول سے مانع ہوتے ہیں اور اسے شجر ممنوعہ قرار دیتے ہیں۔چنانچہ اس سلسلے میں جمعیۃ کی جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالحمید نعمانی لکھتے ہیں:

> ”اگست ۱۹۷۲ء میں مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار پر حملہ ہوا تو جمعیۃ علماء ہند نے مارچ ۱۹۷۳ء میں ایکٹ کے خلاف آواز اٹھائی اور دہلی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کنونشن کا انعقاد بھی کیا۔“

آپ کو نہ صرف مسلمانوں کی متحدہ جماعت کی صدارت کا اعزاز حاصل تھا؛ بلکہ آپ حکومت کے ایوانوں میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی کا حق رکھتے تھے۔تین ٹرم تقریباً اٹھارہ سال تک مولانا راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔اس لیے مسلمانوں کے مسائل کو حکومت تک پہنچانے کا اور اس سلسلہ میں تبادلہ خیال کا آپ کو خوب موقع ملا۔ایسا کم ہی ہوا کہ مولانا نے جس اہم اور نازک مسئلے پر بحث کی اس پر توجہ نہ دی گئی ہو۔یہ مولانا کا ایک بڑا وصف تھا کہ ”جو چیز ایک دفعہ ان کی فکر کا حصہ ہوجاتی مولانا اس کے لیے سرگرم ہوجاتے اور اس راہ کی تمام تر مشکلات کو اقدامی سطح پر بہر صورت عبور کرتے اور بالآخر کامیاب بھی ہوتے۔“

اس پس منظر میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کے متعدد مسائل کو مولانا پارلیمنٹ کے جلسے اور بڑے سے بڑے مجمعے میں بڑی دوراندیشی کے ساتھ پیش کرتے اور اس کے مثبت و منفی پہلوؤں سے بھی اعلیٰ حکام کو خبر دار کرتے۔ایسا کئی بار ہوا کہ مسلم یونیورسٹی کو بعض حقوق اور مراعات سے محروم رکھنے کے لیے اجلاس میں شریک بیشتر ممبران مصر رہتے اور مولانا اپنی بات اور مانگ پر اٹل جس کے لیے وہ متعدد طریقے استعمال کرتے اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب

ہوجاتے۔اس کی واضح مثال یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو لے کر پارلیمنٹ میں ہنگامہ آرائی ہوئی۔اسی دوران ایک کانگریسی لیڈر نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی سے لفظ مسلم نکال دیا جائے، اس پر مولانا برہم ہوگئے اور سخت لب ولہجہ میں کہا کہ تم بنارس ہندو یونیورسٹی سے لفظ ہندو نکال دو، میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لفظ مسلم کھرچ دوں گا اور کانگریس کو سیکولر کا لیبل بھی اپنی پارٹی سے ہٹانا ہوگا۔مولانا کے اس جواب پر سارے لوگ خاموش ہوگئے جبکہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ اس پارٹی کے معاون تھے۔

فدائے ملت ایک فعال اور متحرک آدمی تھے، ان کے عزائم میں پختگی تھی، قوم وملت کا ان کے دل میں بڑا درد تھا، وہ ہر ممکن کوشش کرتے کہ مسلمان فلاح وترقی کی بلندی کو چھولیں اور ان کا جس بڑی تنظیم یا جماعت سے آخر عمر تک تعلق رہا اس کا بھی بنیادی مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کے لیے فلاح وبہبود کے مواقع فراہم کیے جائیں۔جہاں کہیں کوئی ان کے حقوق سلب کرنے یا ان کی آزادی پر پابندی لگانے کی کوشش کرے اس کے خلاف آواز بلند کی جائے۔مولانا کی قیادت کے پورے عرصہ پر نظر ڈالی جائے تو یہ چیز صاف نظر آتی ہے کہ جب بھی ایسا کوئی نازک وقت مسلمانوں پر آیا تو انھوں نے انفرادی اور اجتماعی دونوں طریقوں سے اس کے انسداد کی کوشش کی اور ضرورت پڑی تو پورے ملک کے مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کرنے سے بھی نہیں چوکے۔دہلی کے متعدد مشہور مقامات پر مسلمانوں کو جمع کرکے حکومت کو مسلمانوں کی طاقت اور ان کے عزائم سے باخبر کیا۔باوجود اس کے ایسا بھی ہوا ہے کہ مولانا جس مقصد کے تحت تحریک چلارہے ہیں کسی نہ کسی مقام پر لوگ آپ سے جدا ہوجاتے، جس سے مولانا کو بڑی تکلیف ہوتی کیوں کہ اجتماعیت میں طاقت کے ساتھ فلاح وکامیابی بھی ہے۔پھر بھی مولانا کا تحریک سرد نہیں ہوتی وہ تن تنہا منزل مقصود کی طرف رواں دواں رہتے۔ایسا ہی کچھ معاملہ مولانا کے ساتھ اس وقت بھی ہوا کہ مولانا یونیورسٹی کے اقلیتی حقوق کی بحالی کی جنگ لڑرہے ہیں مگر علی گڑھ والوں کا انھیں تعاون نہیں مل رہا ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا یونیورسٹی کی تعمیر وترقی اور اس کے اقلیتی کردار کی بحالی کے کتنے خواہاں تھے اور ان کی معلومات اس سلسلے میں کتنی گہری تھی، چنانچہ مشہور عالم دین اور عربی کے پروفیسر بدرالدین الحافظ لکھتے ہیں کہ:

”۱۹۷۳ء میں جب علی گڑھ میں ایم اے کرنے کے سلسلے میں مقیم تھا تو گرمیوں کی تعطیلات میں دیوبند مولانا وحیدالزماں کیرانوی کے ساتھ چند روز قیام رہا۔اس

دوران کئی بار دارالشفا میں حضرت سے نیاز حاصل ہوا۔ ابتدائی ملاقات میں جب انہیں معلوم ہوا کہ آج کل میں علی گڑھ زیر تعلیم ہوں تو آپ نے مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے مسئلہ پر تفصیلی گفتگو شروع کردی اور پورے معاملہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اس سلسلے میں جمعیۃ کی جدوجہد کا ذکر کیا۔ مگر ساتھ ہی اس پر کبیدہ خاطر نظر آئے کہ علی گڑھ والوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ یہ شاید پہلا ہی موقع تھا کہ مولانا مرحوم کی زبان سے علی گڑھ کے بارے میں اتنی تفصیل سنی۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ دارالعلوم کے خالص عالم ہیں اور انہیں اوّل تو مسلم یونیورسٹی سے اتنی دلچسپی کیوں اور پھر اقلیتی کردار سے متعلق اتنی گہری معلومات بھی رکھتے ہیں۔''

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو کالعدم کرنے کی کئی بار کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی انتظامیہ، اساتذہ اور طلبا نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ اسی طرح متعدد بار حکومت کی طرف سے یونیورسٹی کے بعض اہم امور پر پابندی کی بھی بات سامنے آئی جس سے طلبا اور اساتذہ کے اندر ہیجان کی کیفیت پیدا ہوجاتی۔ جس کے دفاع کے لیے تحریک چلائی جاتی تو بالخصوص طلبا، برادری مولانا مرحوم سے رجوع کرتے اس وقت مولانا ان کی صحیح سمت میں رہنمائی فرماتے، جیسا کہ مولانا کے ایک نیازمند جو یونیورسٹی کے بھی طالب علم تھے لکھتے ہیں:

''علی گڑھ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے خلاف جو ۱۹۶۵ء کا بل آیا تو یونیورسٹی اور ملک میں ہیجان برپا ہوگیا۔ ۱۹۶۵ء میں دو جنگ یاد رکھنے کی ہیں۔ ایک انڈو پاک جنگ اور ایک علی یاور جنگ (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) اس پر ہنگامہ جاری رہا۔ میں ۱۹۷۱ء میں داخل ہوا جہاں دس سال رہا۔ یونین حال کی طرف سے اقلیتی کردار کی جنگ میں ہر جگہ شریک رہا۔ اس دور میں جب بھی ہمارا کوئی وفد دلی جاتا تو مسجد عبدالنبی جاکر مولانا کا سہارا ضرور لیتا۔ مولانا اس تحریک میں شانہ بشانہ شریک رہے اور ہمیشہ دلجوئی فرمائی۔''

یوں تو فدائے ملت مولانا سید اسعد مدنی کے تعلقات یونیورسٹی سے ورثے میں ہے، مگر اس میں استحکام اس وقت ہوا جب شیخ الاسلام سے ملنے یونیورسٹی کے طلبا کا ایک وفد دیوبند پہنچا۔ اتفاق سے مولانا حسین احمد مدنیؒ اس وقت دیوبند سے کسی سفر پر تھے۔ یہ وفد وہاں پہنچا تو مولانا اسعد مدنی نے اس کی ضیافت فرمائی اور اسی دوران انہیں یونیورسٹی سے متعلق تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں۔

پھر تو مولانا کی زندگی میں یونیورسٹی رچ بس گئی اور بیشتر مجالس میں اس کا ذکر خیر کرتے رہے۔ چنانچہ اس ابتدائی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی لکھتے ہیں:

''ایک موقع ایسا آیا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نیشنلسٹ طلبا نے محسوس کیا کہ دوسری درسگاہوں کے ہم خیال طلباء سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہے اور اس مقصد سے ان کی نظر انتخاب فطری طور پر سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کی طرف اٹھی۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۷ء میں مسلم یونیورسٹی کے نیشنلسٹ مسلم طلبا کا ایک سہ رکنی وفد دیوبند گیا۔ اس وفد کے اراکین ضیاء الحسن فاروقی (بعدہٗ پروفیسر شعبۂ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) سعید اختر (بعدہ مالک ومدیر سہ روزہ مدینہ بجنور) اور خاکسار راقم تھے۔ چوں کہ ضیاء صاحب کی حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے قرابت ہوتی تھی، اس لیے ہم تینوں دیوبند پہنچ کر سیدھے مولانا مدنی کے دولت کدے پر چلے گئے، حضرت مولانا اس وقت دیوبند میں تشریف نہیں رکھتے تھے، اس مہمان داری کے فرائض ان کے فرزند سعید سید اسعد مدنی صاحب نے جو ابھی طالب علم ہی تھے انجام دیئے۔ ہمارا قیام غالباً وہاں دو تین دن رہا اور اس مختصر مدت میں خاک سار راقم کی ان سے اچھی دوستی ہوگئی۔ مارچ کا خوش گوار موسم تھا، چاندنی راتیں تھیں، ہم نے دیوبند کی ریلوے لائن کے قریب ٹہل ٹہل کر اپنی دوستی کو مستحکم کیا۔

اس ابتدائی تعلقات نے اتنی وسعت اور ہمہ گیری اختیار کی کہ بتدریج مولانا کا حلقہ علی گڑھ میں بڑھتا گیا، اور مولانا کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا، جب بھی یہاں تشریف لائے پروفیسر شیروانی کے مہمان بنے۔ اس دوران مولانا سے یہاں کے طلبا اور اساتذہ نے علمی وروحانی فیض حاصل کیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کے بعد قیادت کی کش مکش شروع ہوئی تو اس کی ہمدردیاں اپنے قدیم دوست مولانا سید اسعد مدنی کے ساتھ تھیں، کچھ تو ذاتی تعلقات کی بنا پر، کچھ اس واسطے کہ اس کی نظر میں ہندوستان کی جدجہد آزادی میں دیوبند کے مدنی خاندان کا حصہ دوسرے سب خاندانوں سے زیادہ رہا تھا، اور کچھ اس خاطر کہ اس کی خواہش تھی کہ اب ملک وملت کی قیادت پرانی نسل کی جگہ نئی (یعنی ہماری) نسل کے ہاتھ میں آنی چاہیے۔ اس معاملے میں کسی قدر اپنے دوست مولانا اسعد مدنی کی خدمت بھی انجام دی۔ اردو کے ایک معروف وممتاز اخبار کے مدیر شہر، جو راقم

الحروف کے عزیز دوست تھے، اس مسئلے میں گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھے، یعنی ابھی یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ وہ اس کش مکش میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کا ساتھ دیں یا مولانا اسعد مدنی کا۔ اسعد مدنی صاحب نے راقم الحروف سے خواہش کی وہ کوشش کرے کہ اس اخبار کا وزن ان کے پلڑے میں آجائے، کوشش کی گئی اور کامیابی ہوئی۔''

مولانا کا حلقہ ارادت وسیع تھا، جہاں آپ پہنچتے لوگ آپ سے ملاقات کے لیے بے تاب ہوجاتے۔ علی گڑھ میں بھی آپ کے عقیدت مندوں کی بڑی تعداد ہے۔ فضلاء دارالعلوم جو یہاں طالب علم ہیں یا تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی محفلوں اور مجلسوں میں ہمیشہ مولانا کا ذکر خیر ہوتا رہتا ہے۔ اسی عقیدت اور یونیورسٹی سے ہمدردی کے تئیں یونیورسٹی انتظامیہ نے آپ کو یہاں کی بااختیار مجلس کورٹ کا ممبر بنایا۔ آپ یونیورسٹی کورٹ کی ہر مجلس میں شریک ہوتے اور اپنے مفید مشوروں اور آراء سے یونیورسٹی انتظامیہ کو نوازتے اور ساتھ ہی اس بات پر بھی زور دیتے کہ یہاں کا نظام بہتر سے بہتر بنایا جائے تاکہ طلبا کے لیے ترقی کے امکانات روشن ہوں۔

جمعیۃ علماء ہند کا ترجمان اخبار الجمعیۃ دیکھئے اس میں مولانا کی دیگر سرگرمیوں کے ساتھ یونیورسٹی کے حوالے سے آئے دن خبر شائع ہوتی۔ جب کبھی کوئی یونیورسٹی کے وقار کو مجروح کرنے کی بات سامنے آتی تو فوراً مولانا کا بیان اس کے خلاف شامل ہوتا۔ جس میں آپ کبھی سخت لب ولہجہ اختیار کرتے تو کبھی نرم۔

اب مولانا اس دنیا میں نہیں رہے (اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے) اس وقت بھی یونیورسٹی کا اقلیتی کردار داؤ پر لگا ہوا ہے اس کی بحالی کے لیے یونیورسٹی حلقہ کوشش میں لگا ہوا ہے، اب یہ ذمہ داری مولانا ارشد مدنی صاحب پر عائد ہوتی ہے کہ وہ جمعیت کے پلیٹ فارم سے اس کے حقوق کی بحالی کی جدوجہد کریں یہاں سے بلند ہونے والی آواز میں ایسی طاقت ہے کہ حکومت کے ایوان میں سنسنی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ مجبور ہوجاتی ہے مثبت اختیار کرنے کے لیے۔ یہ نہ صرف جمعیۃ کارناموں میں شمار ہوگا بلکہ اس سے یونیورسٹی حلقہ میں بھی جمعیۃ کی پذیرائی ہوگی۔ خود مولانا کے لیے نیک نامی کا سبب ہوگا۔

سید حامد صاحب کے زمانہ وائس چانسلری میں یونیورسٹی کے ایک معروف استاذ کے کسی بیان پر بالخصوص اقامتی حالوں میں افراتفری مچ گئی اور طلباء نے وائس چانسلر سے مطالبہ کیا کہ انہیں یونیورسٹی سے معطل کیا جائے۔ مگر حامد صاحب نے ایسا نہیں کیا، جس کے نتیجہ میں سخت ہنگامہ ہوا۔

لڑکے سڑکوں پر آ گئے اور اسٹرائک شروع کردی، اس اسٹرائک کو ختم کرنے کے لیے وائس چانسلر نے یونیورسٹی کے اندر پی۔اے۔سی کو بلوالیا۔اسی افراتفری کے دوران پی۔اے۔سی کی گولی سے ایک طالب علم شہید ہوگیا۔اس کے بعد یونیورسٹی میں جو ہونا تھا وہ ہوا۔حالات دن بدن دگرگوں ہوتے جارہے تھے اسی دوران مولانا اسعد مدنی صاحب یہاں تشریف لاتے ہیں اور طلباء کو اپنی ناصحانہ گفتگو سے اس بات پر راضی کرتے ہیں کہ وہ اسٹرائک ختم کردیں۔اس سے نہ صرف طلباء کی تعلیم متاثر ہوگی بلکہ یونیورسٹی کا وقار بھی مجروح ہوگا۔مولانا کے بیان کے مطابق طلباء نے تو اسٹرائک ختم کردی، مگران کی جو مانگیں تھیں اس سلسلے میں وائس چانسلر صاحب سے بات کی مگرانھوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کردیا۔اس پورے واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

”رات کو گیارہ بجے کے بعد وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے ملاقات کا موقع دیا اور تقریباً چالیس منٹ ہم نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ہر طریقہ سے معاملات کو نپٹایئے، یہ طلبہ ہیں، نوجوان ہیں، ان کو کچھ تو آپ راضی کریں گے، کم سے کم سسپینشن کیجیے، ملازمت سے علیحدگی نہیں ہے، یہ تو کمیشن فیصلہ کرے گا جرم ہے کہ نہیں، لیکن اتنا تو کردیجیے کہ معاملہ نمٹ جائے۔آپس میں بات چیت کرکے فضا ٹھیک ہو۔لیکن انھوں نے قطعی طور پر ہم سب لوگوں کی درخواست کو رد کردیا اور کہا کہ بالکل نہیں، جو ہمیں کرنا تھا پہلے کردیا۔ اب میں نہیں مانتا۔اس طریقہ سے ان کا جو طریقہ تھا وہ نہایت سخت تھا، بات چیت کرنے سے بالکل گریز، الگ، اور اس فضا میں فورسیز کے ذریعہ وہ یونیورسٹی کو چلانا چاہتے ہیں، یہ علی گڑھ کے حال اور مستقبل کے لیے خطرناک ہے۔تعلیمی اداروں میں فورسیز کا اور پولیس کا نہ جانا بہت عمدہ ہے اور جانا بہت خطرناک ہے اور بالفرض مجبوری ہو تو کم سے کم مدت تک۔آج ایک سال کے قریب ہوا جاتا ہے اور اس سے زیادہ وہاں پولیس کا پڑاؤ ہے، یہ مسئلہ ہے۔اس طرح سے نظام کو چلایا جارہا ہے۔ اس لیے مجھے افسوس ہے اور میں اس بات کو کہنا چاہتا ہوں کہ یونیورسٹی کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں بات چیت کی، افہام وتفہیم کی فضا چلے۔صرف طاقت کے بل پر چلانا یہ بہت نامناسب ہوگا اور اس سے علی گڑھ یونیورسٹی کو اور اس سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگوں کی امیدوں پر پانی پھرے گا اور نقصان ہوگا۔“

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دار العلوم

جلد: ۹۱ | شعبان- رمضان ۱۴۲۸ھ مطابق ستمبر ۲۰۰۷ء | شمارہ: ۹

نگراں

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند- ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۵ روپئے، سالانہ -/۱۵۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۸۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۲۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۲۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبرشمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	بدیہیات قرآن - حکمتیں اور فائدے	مولانا محمد عارف مبارکپوری	۶
۳	قرآنی مدّاتِ زکوٰۃ کی معنویت واہمیت	اختر امام عادل قاسمی	۱۴
۴	بچوں کو بڑوں کی صف میں کھڑا کرنا	مفتی عمر فاروق لوہاروی	۳۵
۵	کیا ۱۸۵۷ء کی جدوجہد "پہلی" جنگ آزادی تھی؟	مولانا محمد ولی رحمانی	۴۷
۶	آزادیٔ وطن اور علمائے دیوبند	عادل صدیقی	۵۴

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان وپاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

یہ ایک واقعہ اور تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان کو سامراج کی غلامی سے نجات دلانے اور وطن عزیز سے انگریزوں کے تسلط کو ختم کرنے کے لئے قوم مسلم بالخصوص علمائے دین نے عظیم قربانیاں دی ہیں بالخصوص ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے برپا کرنے میں علماء اسلام نے کلیدی رول ادا کیا تھا؛ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس تحریک کے جسم میں سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا فتویٰ جہاد خون بن کر دوڑ رہا تھا اور انہی کے ساختہ پرداختہ سید احمد شہید رائے بریلوی، مولانا اسماعیل شہید دہلوی، اور مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی وغیرہ مجاہدین نے جذبۂ جہاد سے پورے ملک کو سرشار کردیا تھا اور یہی جذبہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں کارفرما تھا، تحریک کی ناکامی اور وطن عزیز پر برطانوی سامراج کے قبضہ کے بعد بھی یہ جذبہ زندہ رہا ۱۸۶۵ء اور ۱۸۷۱ء کا عظیم آباد سازش کیس، ۱۸۶۳ء کا انبالہ سازش کیس، ۱۸۷۲ء میں مالدہ اور راج محل کا مقدمۂ بغاوت اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی ریشمی رومال تحریک وغیرہ اس کے معتبر ثبوت ہیں۔ غرضیکہ تاریخ آزادی کا ہر باب مسلمانوں کی ایثار وقربانی اور سرفروشانہ جدوجہد کی خوشبو سے رچا بسا ہوا ہے۔

ملک و وطن کی آزادی کے لئے قوم مسلم کی یہ والہانہ جاں سپاری اگرچہ ان کا ایک مذہبی فریضہ تھی لیکن اسی کے ساتھ اپنے وطن کو غیروں کی تہذیبی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی غلامی سے نجات دلانے کا عظیم مقصد بھی ان کے پیش نظر تھا، انھیں یہ بھی یقین تھا کہ آزادی کے ثمرات اور مفید نتائج سے وہ بھی دیگر برادران وطن کی طرح یکساں مستفید ہوں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں انصاف

اور مساویانہ حقوق سے بہرہ ور ہوں گے۔

چنانچہ آزادی کے میسر آجانے کے بعد ۱۹۵۰ء میں مجاہدین آزادی کی تمناؤں کے عین مطابق وسیع تر جمہوری دستور کا نفاذ عمل میں آیا جو بلاشبہ ایک سیکولر عوامی جمہوریہ کا آئینہ دار تھا مگر صد حیف کہ خود اس دستور کی پاسدار اور محافظ قومی حکومتوں نے حوصلہ کی پستی اور فکر ونظر کی تنگی کی بناء پر اس دستور کو بروئے کار آنے نہیں دیا اور بابائے ملک مہاتما گاندھی کے اس تاریخی اعلان کو کہ ''میں مسلمانوں کو ہندوستان کی سڑکوں پر گھسٹنے نہیں دوں گا انھیں وقار کے ساتھ سر اوپر کرکے چلنا ہوگا'' خود ان کے نام کے پجاریوں نے تعصب وفرقہ واریت کی بھٹی میں بھسم کردیا۔

اس حقیقت سے کون باحیاء وبامروّت آنکھیں چراسکتا ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد جتنے بڑے فسادات اور خونی واقعات رونما ہوئے ہیں ان کا تعلق مسلمانوں سے ضرور رہا ہے۔ جس قوم نے ملک عزیز کے لئے عظیم قربانیاں دیں، آزادیٔ وطن کی خاطر قید وسلاسل کی بے پناہ سختیاں برداشت کیں افسوس کہ آج اسی کو قومی زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں محرومی اور امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اقتصادی، معاشی اور خاص طور پر صنعتی سطح پر وہ اپنی مدد آپ کرنے کے اصول پر چلتے ہوئے آگے بڑھنے کی تگ ودو میں مصروف ہیں مگر قدم قدم پر انہیں روکاوٹوں اور اڑچنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ صنعتی لائسنسوں، قرضوں اور امداد کے معاملہ میں انھیں دانستہ نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ سرکاری ونیم سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لئے تقریباً بند کردیئے گئے ہیں، تعلیمی مواقع سے انہیں ایک حد تک جبری طور پر دور کردیا گیا ہے غرضیکہ زندگی کے ہر میدان میں ان کے ساتھ ایسی غیریت اور جانبداری برتی جاتی ہے گویا مسلمان اس ملک میں کوئی اجنبی قوم ہے جو اچانک زمین سے نکل آئی ہے اور ادھر کچھ دنوں سے مسلمانوں کے خلاف دہشت گردی کے نام سے ایک نیا حربہ بے دریغ استعمال کیا جارہا ہے۔ اب جہاں کہیں بھی بم دھماکہ اور خودکش حملہ ہوتا ہے بڑی آسانی سے بغیر کسی ثبوت وشہادت کے اسے مسلمانوں کے سر تھوپ دیا جاتا ہے، شاید ہماری وزارت داخلہ، اور انتظامی سرکاری مشینری نے یہ اصول طے کرلیا ہے کہ بم دھماکے الفاء، بوڈو، نکسلیوں یا کسی بھی فسطائی تنظیموں کی جانب سے ہی کیوں نہ ہوں نیز یہ دھماکے چاہے مندر میں ہوں یا مسجد میں آنکھ بند کرکے مسلم نوجوانوں خاص طور پر تعلیم یافتہ اور ہنرمند جوانوں پر عائد کردیا جائے۔

تقریباً ایک سال پہلے ہمارے وزیر اعظم منموہن سنگھ نے پارلیمنٹ انکسی میں منعقد ہونے

والے سیمینار بعنوان ''دہشت گردی، اسباب وتدارک'' میں واضح لفظوں میں فرمایا تھا ''اگر کوئی دہشت گرد کہہ کر مسلمانوں کو بھڑکانا چاہتا ہے تو یہ محض بھڑکانے کی سازش ہے اس سازش کو ناکام بنانے کیلئے ہمیں مشترکہ طور پر لڑنا ہوگا'' اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وزیراعظم صاحب نے اپنے اس موقف اورعندیہ کے اظہار میں صاف گوئی سے کام لیا تھا، جس سے یہ توقع ہوگئی تھی کہ اس معاملہ میں اب سرکاری مشینری کی پالیسی میں تبدیلی آئے گی، مگر یہ بیان دیگر سرکاروں کے بیانات کی طرح بس بیان کی حد تک ہی رہا اور حالات جوں کے توں رہے بلکہ پہلے سے بھی خراب ہوگئے۔

یہ ہے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں ایک سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ قومی سرکار اوراس کے اہل کاروں کا غیر جمہوری رویہ اور قانون وانصاف کے محافظوں کا غیر قانونی وغیر دستوری طرزعمل جس نے ہندوستان کی قومی سرکاروں پر سوالیہ نشان لگادیا ہے۔

اس موقعہ پر ہم اپنے اس تاثر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس انتہائی صبر آزما ماحول میں بھی مسلمان پوری پامردی، حوصلہ مندی اورعزم ویقین کی قوت کے ساتھ قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ اور بڑی سے بڑی آزمائشوں سے گزرتے رہنے کے باوجود بھی اس کے فکر وعمل کی توانائی قائم ودائم ہے حالات کی تلخ کامیوں کا اسے شکوہ ضرور ہے لیکن ان سے وہ ہراساں نہیں ہے۔ مسائل کے ہجوم کا اسے احساس ہے مگر اس احساس سے اس کے قوائے عمل مضمحل نہیں ہوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی خوش آیند صورت حال ہے جس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک زندہ قوم ہے، جو انشاء اللہ زندہ رہے گی اور صفحۂ گیتی پر اپنی تاریخ رقم کرتی رہے گی۔ ''وما ذلك على الله بعزيز''

میں چلتا رہا سر اٹھاتے ہوئے
میرا قتل ہر روز ہوتا رہا

❁ ❁ ❁

بدیہیات قرآن

حکمتیں اور فائدے

(۴)

از: مولانا محمد عارف مبارکپوری
شارجہ، متحدہ عرب امارات

۴- فرمان باری: أولئك يلعنهم الله ويلعنهم اللعنون (بقرہ:۱۵۹)

''ان پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں لعنت کرنے والے''۔

سوال یہ ہے کہ فعل (يلعنهم) مکرر کیوں لایا گیا جبکہ حرف عطف کے ذریعہ اس تکرار سے بچا جا سکتا تھا؟

اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

اوّل: چوں کہ دونوں لعنتیں الگ الگ ہیں؛ اس لیے فعل میں تکرار ہے۔ اللہ کی لعنت سے مراد، رحمت سے دور کرنا ہے اور انسان کی لعنت سے مراد، بددعا دینا ہے۔ اس کے برعکس آیت کریمہ (ان الله وملائكته يصلون على النبي) (احزاب:۵۶)

''اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر''

میں فعل میں تکرار نہیں اس لیے کہ تحقیق یہ ہے کہ اللہ کی ''صلاۃ'' اور فرشتوں کی ''صلاۃ'' ایک ہے اور اس سے مراد ذکر خیر ہے۔ یہ قول ابن عاشور اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔ (۱)

دوم: اس خبر کو دو مستقل جملوں کی شکل میں لانے کی وجہ تاکید اور تعظیم ہے۔ یہ قول ابوحیان نے نقل کیا ہے۔ (۲)

۵- فرمان باری: والهكم اله واحد لا اله الا هو (بقرہ:۱۶۳)

''اور معبود تم سب کا ایک ہی معبود ہے۔ کوئی معبود نہیں اس کے سوا۔''

اس آیت میں دو مقام پر بدیہیات ہیں:

مقام اوّل: لفظ (اله) کو دو بار لانے کی کیا ضرورت ہے جبکہ ایک کافی تھا؟

ابن عاشور اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

''یہ اس لیے ہے تاکہ اس پر ''واحد'' کی صفت جاری کی جاسکے، مقصد یوں کہنا تھا: (الھکم واحد) مبتدا اور خبر کے بیچ میں لفظ ''الہ'' کو لایا گیا تاکہ مبتدا کے اندر الوہیت کے مفہوم کو راسخ کیا جاسکے۔ جیسے تم کہتے ہو عالم المدینة عالم فائق (مدینہ کے عالم نمایاں عالم ہیں)۔ نیز اس لیے تاکہ اس لفظ کا ذکر بھی آجائے، جو دراصل نعت (صفت) کی شکل میں آنا چاہیے تھا، جس سے یہ فائدہ حاصل ہو کہ یہ موصوف کے لیے ثابت وصف ہے، اس لیے کہ یہ اس کی نعت ہوچکی ہے؛ کیوں کہ نعت میں اصل یہ ہے کہ وہ وصف ثابت ہو، اور خبر میں اصل یہ ہے کہ وہ وصف حادث ہو۔ اور یہ فصیح کلام میں ایک سلیس استعمال ہے کہ اسم یا فعل کو دوبارہ ذکر کیا جائے تاکہ اس پر وصف یا متعلق قائم ہے، جیسے (الھا واحدا) اور جیسے (واذا مروا باللغو مروا کراما) (فرقان:۷۲) ''اور جب گذرتے ہیں کھیل کی باتوں پر تو نکل جائیں بزرگانہ'' (۳)

مقام دوم: (والھکم الہ واحد) کہنے کے بعد (لا الہ الا ھو) کہنے میں کیا حکمت ہے جب کہ اوّل الذکر، دوسرے کو مستلزم ہے؛ کیوں کہ جس کے لیے وحدانیت ثابت ہوگی اس کے لیے، الوہیت بھی ثابت ہو۔

اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

اوّل: جب (والھکم الہ واحد) کہا تو کسی کے ذہن میں یہ خیال گذر سکتا ہے کہ مان لو ہمارا معبود ایک ہے، ہوسکتا ہے دوسروں کا معبود ہمارے معبود سے الگ ہو؟ اس وہم کو ختم کرنے کے لیے توحید مطلق کو بیان کرنا ضروری تھا، اس لیے فرمایا (لا الہ الا ھو)، اس لیے کہ جب ہم کہتے ہیں ''لا رجل'' (کوئی مرد نہیں) تو اس کا تقاضا ہے کہ اس ماہیت کی ہی نفی ہو اور جب اس ماہیت کی نفی ہوگئی تو اس کے ہر ہر فرد کی نفی اور انکار ہوگیا، اس لیے کہ اگر اس ماہیت کا ایک فرد بھی پایا گیا تو اس کے پائے جانے سے اس ماہیت کا وجود ہوگیا اور یہ لفظ کے مدلول (ماہیت کی نفی اور انکار) سے متصادم ہے، لہٰذا یہ ثابت ہے کہ لا رجل (کوئی مرد نہیں) عام اور ہر ہر فرد کو شامل نفی و انکار کا متقاضی ہے، اب اس کے بعد جب الا زیـــدا کہا جائے تو اس سے حقیقی مکمل توحید

مفہوم ہوگی۔ یہ قول رازی اور ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۴)

دوم: (لا اله الا هو) وحدانیت کے مفہوم کی تاکید اور اللہ کی ذات کے علاوہ سے الوہیت کی نفی ہے۔ یہ جملہ اس لیے آیا ہے کہ معبود کے ہر فرد کی نفی ہو اور پھر اس مفہوم کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں منحصر کردے۔ لہٰذا پہلی آیت سے اللہ کی طرف وحدانیت کی نسبت معلوم ہوئی اور دوسری آیت سے الوہیت کو لفظ صریح کے ذریعہ، اللہ کی ذات میں منحصر کرنے کا علم ہوتا ہے؛ اس لیے کہ جس کے لیے وحدانیت ثابت ہوگی اسی کے لیے الوہیت ثابت ہوگی۔ یہ قول ابن عاشور، ابوسعود اور آلوسی نے ذکر کیا ہے۔(۵)

۶- فرمان باری: یا أیها الناس کلوا مما فی الأرض حلالا طیبا (بقرہ:۱۶۸)

''اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ''۔

سوال یہ ہے کہ حلال اور طیب ایک ہی معنی میں ہیں پھر حلال کی صفت ''طیب'' لانے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

اوّل: یہ تاکید کے لیے ہے؛ اس لیے کہ بہ قول امام مالک اس کا معنی: جو شریعت کی نظر میں لذیذ ہو، اس کو مکروہ اور ناپسند نہ سمجھے یا جو شریعت کی نظر میں شبہ سے پاک ہو۔ اور حلال کو اس سے متصف کرنے کا فائدہ، حکم کے عموم کو بیان کرنا ہے جیسے کہ فرمان باری ہے (وما من دابة فی الارض) (انعام:۸۳) ''اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر''۔

اس سے ان لوگوں کی تردید مقصود ہے، جنھوں نے بعض حلال چیزوں کو حرام کرلیا؛ اس لیے کہ جس نکرہ کی کوئی عام صفت آجائے اس میں عمومیت اور شمول پیدا ہوجاتا ہے، نکرہ غیر موصوفہ کی یہ حیثیت نہیں۔ یہ قول آلوسی اور ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۶)

دوم: یہ تخصیص کے لیے ہے؛ اس لیے کہ اس سے مراد بہ قول امام شافعی، صحیح مزاج سے پیدا ہونے والی درست شہوت، جس کو طیب اور عمدہ قرار دے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ جس کو یہ، طیب اور پاک نہ سمجھے وہ یا تو غیر مشتبہ حلال ہے لہٰذا ممنوع نہیں ورنہ وہ ''حلال'' کی قید سے نکل گئی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ''حلال'' سے مراد، شریعت نے جس کے حلال ہونے کی تصریح کی ہو (اور اس سے مراد، جس کے بارے میں نص نہ ہو) لیکن طبیعت مستقیمہ اس کو لذیذ سمجھے۔ اور اس کو اس کی رغبت اور خواہش ہو۔ اور شریعت میں اس کی حرمت کی کوئی دلیل نہ ہو مثلاً

نشہ آور یا ضرر رسا ہونا۔ اس مقام کا تقاضا ہے کہ یہ قید شہوت فاسدہ کو ابھارنے والی چیز کو خارج کرنے کے لیے قید احترازی نہیں؛ بلکہ اس لیے ہے کہ یہ اس کے مفہوم میں داخل ہے، کیوں کہ طیب اور لذیذ اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کو شہوت مستقیمہ لذیذ قرار دے۔ اور اس صورت میں اس کا فائدہ، اس چیز کو مباح ہونے کو بہ صراحت بیان کرنا ہے، جسے ان لوگوں نے حرام کر رکھا ہے۔ یہ قول آلوسی کا ہے، ابوحیان رازی اور ابن عاشور نے بھی اسے نقل کیا ہے۔(۷)

سوم: اس سے مراد مباح ہے، اور جہاں تک تکرار لازم آنے کی بات ہے تو ہمیں تسلیم نہیں؛ اس لیے کہ ''حلالاً'' سے مراد جس کی جنس حلال ہو اور ''طیبا'' سے مراد جس سے کسی دوسرے کا حق متعلق نہ ہو، کیوں کہ حرام خوری، گو کہ کھانے والا اس کو طیب اور عمدہ سمجھے؛ لیکن اس حیثیت سے کہ اس کا انجام سزا کاٹنا ہے، ضرر رساں ہوگی، طیب اور عمدہ نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ان الذين يأكلون أموال اليتامى ظلما، انما يأكلون فى بطونهم نارا. (نساء:۱۰)

''جو لوگ کہ کھاتے ہیں مال یتیموں کا ناحق وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں''۔

یہ قول رازی نے نقل کیا ہے، ابن عاشور نے اس پر نکیر کی ہے۔(۸)

۷- فرمان باری: أولئك ما يأكلون فى بطونهم الا النار (بقرہ:۱۷۴)

''وہ نہیں بھرتے اپنے پیٹ میں مگر آگ''۔

یہ بدیہی بات ہے کہ انسان پیٹ ہی میں کھاتا ہے، پھر اس کے ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے جب کہ یہ بداہتاً معلوم ہے؟

اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

اوّل: یہاں پر ''بطن'' (پیٹ) کا ذکر مزید وضاحت اور مجاز کے وہم وخیال کو ختم کرنے کے لیے ہے؛ اس لیے کہ اگر آدمی اپنا مال تباہ وبرباد کردے تو بھی کہا جاتا ہے: أكل فلان ماله (وہ اپنا مال کھا گیا) یہ قول طبری، رازی اور ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۹)

دوم: یہ بھر پیٹ کھانے سے کنایہ ہے، کہا جاتا ہے: أكل فلان فى بطنه (اس نے بھر پیٹ کھایا) اور أكل فى بعض بطنه (اس نے آدھا پیٹ کھایا)۔ یہ قول زمخشری، رازی، ابوحیان، اور ابوسعود اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔(۱۰)

سوم: یہ تاکید کے لیے ہے؛ کیوں کہ بداہتاً معلوم ہے کہ کھانا پیٹ ہی میں ہوتا ہے، اس کی نظیر یہ آیت ہے: (ولا طائر يطير بجناحيه) اس کو طبری، ابوحیان اور ابوسعود نے نقل کیا ہے۔

آلوسی نے اس پر نکیر کی ہے۔(۱۱)

۸- فرمان باری: يريد الله بكم اليسر و لا يريد بكم العسر (بقرہ:۱۸۵)

''اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی، اور نہیں چاہتا تم پر دشواری''۔

یہاں پر آیت کا پہلا ٹکڑا (يريد اللّه بكم اليسر) دوسرے ٹکڑے (و لا يريد بكم العسر) سے بے نیاز کرتا ہے؛ اس لیے کہ آسانی چاہنا، دشواری نہ چاہنے کو مستلزم ہے۔ لہٰذا دوسرے جزو کو ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے چند جواب دیے گئے ہیں:

اوّل: تاکید کے لیے ہے۔ یہ قول ابوحیان اور ابن عاشور نے نقل کیا ہے۔(۱۲)

دوم: یہ آیت (يريداللّه بكم اليسر و لا يريد بكم العسر) ماسبق کے سارے مضمون یعنی فرمان باری ''کتب علیکم الصیام'' (آیت:۱۸۳) سے یہاں تک، کی تعلیل وتوجیہ ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ روزہ کی مشروعیت گو بہ ظاہر مشقت اور دشوار معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں جس قدر مصلحتیں پنہا ہیں وہ اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے آسانی چاہتا ہے یعنی بعض دوسرے مذاہب والوں نے ریاضت کے لیے جو خود کو بے جا مشقت میں ڈالا، اس سے ہٹ کر، نفس کی ریاضت کا آسان طریقہ بتادیا۔(۱۳)

۹- فرمان باری: فمن كان منكم مريضاً أو على سفر فعدة من أيام أخر (بقرہ:۱۸۵)

''اور جو کوئی بیمار ہو یا مسافر کو گنتی پوری کرنی چاہیے اور دنوں سے''۔

اس آیت کریمہ کے دوبارہ ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے جب کہ اسکی نظیر آیت (فمن كان منكم مريضا) (بقرہ:۱۸۴) پہلے آچکی ہے اور مریض ومسافر کا حکم معلوم ہو چکا ہے؟ اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

اوّل: چوں کہ پہلی (كتب عليكم الصيام) (بقرہ:۱۸۳) میں روزہ کی فرضیت، اس اختیار کے ساتھ تھی کہ آدمی چاہے روزہ رکھے یا فدیہ میں کھانا کھلائے۔ اور اس آیت میں بہ صراحت مریض اور مسافر سے فرضیت ساقط تھی۔ اس کے بعد آیت (شهر رمضان) سے سابقہ آیت کا حکم منسوخ ہوگیا، اور روزہ رکھنا ہی فرض ہوگیا تو اس سے یہ اندیشہ تھا کہ آدمی یہ نہ سمجھے کہ پہلی آیت میں جن لوگوں کے لیے رخصت تھی وہ بھی منسوخ ہوگئی۔ حتی کہ مریض اور مسافر پر بھی روزہ فرض ہے۔ لہٰذا اس آیت میں اس حکم کو دوبارہ ذکر کردیا گیا تاکہ بہ صراحت، اس رخصت کے باقی رہنے

کا حکم معلوم ہو جائے۔ اور صرف قدرت، حضر اور صحت کے ساتھ ہی کھانا کھلانے کی رخصت منسوخ ہوئی ہے۔ یہ توجیہ ابن عاشور، بیضاوی اور ابوسعود نے ذکر کی ہے۔ (۱۴)

یہ توجیہ اس صورت میں ہے کہ موخر الذکر آیت کو، اول الذکر آیت کے لیے ناسخ مانا جائے؛ لیکن اگر ہم یہ مان کر چلیں کہ دونوں آیتیں بیک وقت نازل ہوئی ہیں، تو اس جگہ پر اس آیت کے دوبارہ ذکر کرنے کا خاص مقصود یہی ٹکڑا (ومن کان منکم مریضا) ہے؛ اس لیے کہ اس کا ذکر روزہ کے دنوں کی تعیین کے بعد آیا ہے، جب کہ پہلی آیت میں سامعین کی رعایت میں قبل از وقت رخصت کی اطلاع دینا ہے۔ یہ توجیہ ابن عاشور نے نقل کی ہے۔ (۱۵)

دوم: اس کا اعادہ تخصیص کی خاطر ہے۔ اس کی توضیح (بہ قول آلوسی) یہ ہے کہ (شھد) ''شہود'' سے ماخوذ ہے، جو ذاتی یا علمی طور پر حضور و وجود کو بتاتا ہے، اور ایک قول کے مطابق یہاں پر دونوں کے اعتبار سے شہود مراد ہے۔ لفظ (الشھر) پہلے معنی کے لحاظ سے مفعول فیہ ہے، اس کا مفعول بہ ترک کر دیا گیا ہے، اس لیے کہ اس سے کوئی غرض وابستہ نہیں۔ لہٰذا یہاں "بلد" یا "مصر" کو مقدر ماننا بلا وجہ ہے۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے لفظ (الشھر) مفعول بہ ہے، اس کا مضاف محذوف ہے اصل عبارت یوں ہے: ھلال الشھر (اور بہ ہر دو تقدیر ''الف لام'' عہد کا ہے) اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو اس مہینہ میں حاضر رہا یا: جس کو اس مہینہ کے چاند کا علم یقینی ہو گیا وہ روزہ رکھے۔ یعنی جس کو چاند میں شبہ ہو اس پر روزہ فرض نہیں۔ مضاف مقدر ماننے کی وجہ یہ ہے کہ پورے ماہ کا علم تو اس وقت ہی ہوگا جب مہینہ گذر جائے اور جب مہینہ گذر گیا تو روزہ کے فرض ہونے کا کوئی مطلب نہیں۔ لہٰذا اس دوسرے معنی کے اعتبار سے آیت (فمن کان منکم مریضا أو علی سفر فعدة من أیام أخر) مریض و مسافر دونوں کے لحاظ سے تخصیص پیدا کرنے والی ہوئی۔ اور پہلے معنی کے اعتبار سے مریض کے لحاظ سے تخصیص پیدا کرنے والی ہے، مسافر کے لحاظ سے نہیں۔ اور اس صورت میں اس کا تکرار اسی تخصیص کے لیے ہے۔ یہ قول بیضاوی اور ابوسعود نے نقل کیا ہے۔ (۱۶)

سوم: اعادہ کی وجہ اس وہم کا ازالہ ہے کہ اوّل الذکر آیت (فمن شھد منکم الشھر فلیصمه) سے منسوخ ہے، جبکہ ''شہد'' تحقق و علم کے معنی میں ہو، نیز رخصت کے حکم کو زیادہ پرزور انداز میں بیان کرنا اور (فمن شھد منکم الشھر فلیصمه) کی مزید توضیح ہے۔ اس کو ابن عاشور نے نقل کیا ہے۔ (۱۷)

۱۰- فرمان باری: فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی (بقرہ:۱۸۶)

''تو چاہیے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر''۔

سوال یہ ہے کہ اگر استجابت سے مراد، دل اور زبان سے ہے تو یہی ایمان ہے، پھر (ولیؤمنوا بی) تکرار محض ہے۔اس میں کیا حکمت ہے؟اس کے چار جواب دیے گئے ہیں:

اوّل: استجابت سے مراد اللہ کے حکم کو ماننا ہے اور یہ عطف مغایر ہے؛ اس لیے کہ امر اوّل سے مراد: فعل ہے اور امر دوم سے مراد: اس پر قائم و دائم رہنا ہے۔ یہ جواب رازی، ابن عاشور، ابوحیان اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔(۱۸)

دوم: استجابت سے مراد عام ہے جو دعوتِ ایمان قبول کرنے کو بھی شامل ہے،اس کے بعد اہتمام کی وجہ سے (ولیؤمنوا بی) کو ذکر کیا گیا جو عام پر خاص کا عطف ہے۔ یہ جواب ابن عاشور نے نقل کیا ہے۔(۱۹)

سوم: استجابت سے مراد فرمابرداری اور سرتسلیم خم کرنا ہے اور ایمان ایک دلی کیفیت کا نام ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے کو نورایمانی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے نیکیاں اور عبادت کرے۔ یہ جواب امام رازی نے نقل کیا ہے۔(۲۰)

چہارم: دوسرے ٹکڑے سے مراد از سرِ نو ایمان لانا ہے۔اس قول کو ابوحیان نے نقل کرنے کے بعد اسے مستبعد قرار دیا ہے۔ اسلئے کہ ابتدائی آیت متقاضی ہے کہ یہ لوگ اہل ایمان تھے۔(۲۱)

پنجم: دوسرے ٹکڑے سے مراد اس بات کا ایمان و یقین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کرتا ہے۔ یہ قول ابوحیان نے عطاء خراسانی سے منسوب کیا ہے۔(۲۲)

۱۱- فرمان باری: ولا تأکلوا أموال الناس بالباطل وتدلوا بها الی الحکام لتأکلوا فریقا من أموال الناس بالاثم وأنتم تعلمون. (بقرہ:۱۸۸)

''اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق، اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ کوئی حصہ لوگوں کے مال میں سے ظلم کرکے (ناحق) اور تم کو معلوم ہے۔''

سوال یہ ہے کہ ناحق مال کھانے کی ممانعت میں یہ بھی داخل ہے کہ حاکموں کے پاس پہنچا کر لوگوں کا مال ناحق کھایا جائے۔ تو الگ سے اسے ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی جب کہ سابقہ ممانعت اس کو شامل تھی؟

ابن عاشور اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ناحق مال کھانے کی ممانعت ذکر کی گئی جو اس صورت کو بھی شامل تھی؛ لیکن خاص طور پر اس کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ یہ سخت گھناؤنی ہے، اور اس میں بہت سے حرام کام آجاتے ہیں۔ نیز یہ بتانے کے لیے کہ رشوت دینے والا بھی گنہگار ہے حالاں کہ اس نے خود ناحق مال نہیں کھایا ہے؛ بلکہ دوسرے کو کھلایا ہے۔(۲۳)

❁ ❁ ❁

حواشی:

(۱) ابن عاشور۲/۶۳؛ آلوسی۲/۲۷۔
(۲) ابوحیان تفسیر آیت۔
(۳) ابن عاشور۲/۵۰۔
(۴) رازی۲/۱۹۲؛ ابوحیان تفسیر آیت۔
(۵) ابن عاشور۲/۷۴؛ ابوسعود۱/۱۸۴؛ آلوسی۲/۲۹۔
(۶) آلوسی۲/۳۹؛ ابوحیان تفسیر آیت۔
(۷) آلوسی۲/۳۸، ۴۰؛ ابوحیان تفسیر آیت؛ رازی۵/۱۸۵؛ ابن عاشور تفسیر آیت۔
(۸) رازی۵/۱۸۵؛ ابن عاشور تفسیر آیت۔
(۹) تفسیر طبری۲/۵۳؛ رازی۵/۲۰۵؛ ابوحیان تفسیر آیت۔
(۱۰) زمخشری تفسیر آیت؛ رازی۵/۲۰۵؛ ابوحیان تفسیر آیت؛ ابوسعود۱/۱۹۵؛ آلوسی۲/۴۳۔
(۱۱) طبری تفسیر آیت؛ ابوحیان تفسیر آیت؛ ابوسعود۱/۱۹۵؛ آلوسی۲/۴۳۔
(۱۲) ابوحیان تفسیر آیت، ابن عاشور تفسیر آیت۔
(۱۳) ابن عاشور تفسیر آیت۔
(۱۴) ابن عاشور تفسیر آیت، بیضاوی۱/۴۶۴، ابوسعود۲/۲۰۲۔
(۱۵) ابن عاشور تفسیر آیت۔
(۱۶) آلوسی۲/۶۲؛ بیضاوی۱/۴۶۴، ابوسعود۲/۲۰۲۔
(۱۷) ابن عاشور تفسیر آیت۔

❁ ❁ ❁

قرآنی مدّات زکوٰۃ کی معنویت واہمیت

از: اختر امام عادل قاسمی
مہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف

زکوۃ اسلام کے معاشی نظام کا ایک اہم حصہ ہے، جس سے مملکت کی بڑی تعداد اور انسانیت کا بڑا طبقہ مستفید ہوتا ہے، مملکت کے مالی واجبات اور دیگر اقتصادی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے اسلام کے پاس ایک مکمل معاشی نظام موجود ہے، اور جب تک کسی سوسائٹی میں پوری طرح وہ معاشی نظام رائج نہ ہو اس وقت تک نہ اسلامی اقتصادیات کی معنویت سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ سوسائٹی کی تمام ضرورتوں کی تکمیل ہوسکتی ہے۔

اسلامی بیت المال کی مالی مدات

قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو اسلامی مملکت کی آمدات کو بالعموم چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: یعنی اسلامی بیت المال میں چار قسم کی مالی آمدات جمع ہوتی ہیں:

(۱) خمس: (الف) خمس غنائم: یعنی جنگ کے مواقع پر دشمنوں سے حاصل شدہ مال غنیمت کا پانچواں حصہ، چار حصے مجاہدین میں تقسیم ہوتے ہیں، اور پانچواں حصہ بیت المال میں جمع ہوتا ہے۔

(ب) خمس معادن: یعنی مختلف قسم کے کانوں سے نکلنے والی اشیاء کا پانچواں حصہ۔

(ج) خمس رکاز: یعنی زمین سے دریافت شدہ کسی قدیم خزانہ کا پانچواں حصہ۔

(۲) صدقات: اس میں مسلمانوں کی زکوٰۃ صدقۂ فطر اور زمینی پیداوار کا عشر وغیرہ سب داخل ہیں۔

(۳) خراج اور مال فئی: اس میں غیر مسلموں کی زمینوں سے حاصل شدہ خراج اور ان کا جزیہ اور ان سے حاصل شدہ تجارتی ٹیکس اور وہ تمام اموال داخل ہیں، جو غیر مسلموں سے ان کی رضامندی کے ساتھ مصالحانہ طور پر حاصل ہوں۔

(۴) ضوائع: اس میں لاوارث مال، لاوارث شخص کی میراث وغیرہ داخل ہیں۔

ان چاروں مدات کے لئے الگ الگ مصارف مقرر کئے گئے ہیں، مگر فقراء ومساکین کا حق سب میں رکھا گیا ہے۔

پہلی مد یعنی خمس غنائم کے مصارف سورۂ انفال میں بیان کئے گئے ہیں، دوسری مد صدقات کے مصارف کا بیان سورۂ توبہ میں آیا ہے، تیسری مد مال فئی وغیرہ کا ذکر سورۂ ''حشر'' میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے، اسلامی حکومت کی اکثر انتظامی ضروریات (فوجی اخراجات، حکومت کے ملازمین کی تنخواہیں، تعمیری وترقیاتی منصوبے وغیرہ) اسی مد سے پوری کی جاتی ہیں۔ چوتھی مد یعنی لاوارث مال رسول اکرم ﷺ کی ہدایات اور خلفائے راشدین کے تعامل کی روشنی میں معذوروں، محتاجوں، اورلاوارث بچوں کے لئے مخصوص ہے۔(رد المحتار کتاب الزکوٰۃ، خطب فی بیان بیوت المال و مصارفها: ۳/۲۵۵،۲۵۶)

اگر ہم مذکورہ بالا مدات میں کسی مد کو دوسرے مدات کے مصارف میں خرچ کرنے لگیں، اور شریعت اسلامیہ نے مالی مدات اوران کے مصارف کے درمیان جو خط امتیاز کھینچا ہے، اس کا لحاظ نہ کرکے مصارف کو خلط ملط کردیں، تو یہ ہماری بدترین غلطی ہوگی۔

اسلام نے ایک مکمل معاشی نظام کے لحاظ سے بیت المال کا ایک وسیع تصور دیا ہے اور ہر مد کے لیے جداگانہ تقاضے مقرر کیے ہیں۔ اگر کسی سوسائٹی میں اسلامی بیت المال کا وسیع نظام قائم نہ ہو، یا اس نظام کا صرف ایک جز ورائج ہو اوراس کی وجہ سے بہت سے بظاہر ضروری مصارف بیت المال کی امداد سے محروم ہوجاتے ہوں، اوران تک مسلمانوں کی رقم نہ پہنچ پاتی ہو تو یہ ہماری ناقص سوسائٹی کا قصور ہے، اسلام کے نظام بیت المال کا نہیں۔

زکوٰۃ اسلام کے معاشی نظام کا ایک حصہ

زکوٰۃ اسلام کے اسی معاشی نظام کا ایک حصہ ہے، زکوٰۃ سے حاصل ہونے والی آمدنی اسلامی بیت المال میں کافی اہمیت رکھتی ہے، مگر جس طرح اس کے حاصل ہونے کے لئے اسلام نے بہت سی بنیادی ہدایات دی ہیں، اسی طرح اس کے خرچ کرنے کے لئے بھی کچھ اصول اور مصارف مقرر کئے ہیں۔

زکوٰۃ کے مصارف

قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کئے گئے ہیں:

انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفى الرقاب والغارمين وفى سبيل الله وابن السبيل فريضةً من الله والله عليم حكيم. (سورۂ توبہ:۶۰)

ترجمہ: ''فرض زکوٰۃ صرف حق ہے غریبوں کا اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان صدقات کی وصولی پر مقرر ہیں اور جن کی دلجوئی کرنا منظور ہے، اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں صرف کیا جائے اور قرضداروں کے قرضہ ادا کرنے میں، اور جہادوالوں کے سامان میں اور مسافروں کی امداد میں، یہ حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں۔''

خدا کی طرف سے یہ تقسیم ایسی قطعی اور واضح ہے کہ اس میں کسی ترمیم وتبدیل کی گنجائش نہیں ہے، ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور مدّ زکوٰۃ سے مدد کا طالب ہوا، نبی کریم ﷺ نے مذکورہ آیت کریمہ کے حوالے سے ارشاد فرمایا:

ان اللّٰه تعالىٰ لم يرض بحكم نبى ولا غيره فى الصدقات حتى حكم فيها هو فجزّأها ثمانية فان كنت من تلك الاجزاء اعطيتك حقك (ابوداؤد، ج:۲،ص:۲۸۱ مختصر السنن، ج:۲،ص:۲۳۱ دارالمعرفۃ)

ترجمہ: ''صدقات کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے حوالہ نہیں کیا؛ بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرمادیئے اگر تم ان آٹھ میں داخل ہو تو تمہیں دے سکتا ہوں۔''

مدات زکوٰۃ کی اہمیت ومعنویت

قرآن کے مقرر کردہ یہ آٹھ مدات بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان کے اندر انسانی زندگی کی بہت سی انفرادی اور اجتماعی ضروریات آگئی ہیں، علامہ ابن تیمیہؒ نے ان مدات کی معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ان مدات میں بنیادی طور پر دو باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

(۱) ایک یہ کہ مسلمانوں کی ضروریات کی تکمیل۔

(۲) اسلام کی نصرت وتقویت۔

فقراء ومساکین، عاملین زکوٰۃ، غلامی یا قرض میں مبتلا شخص یا مسافر کی امداد میں عام مسلمانوں کی ضرورت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اور مجاہدین اور مؤلفۃ القلوب کی مالی اعانت میں اسلام کی نصرت واستحکام کا پہلو پیش نظر ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ، ج:۲۵،ص:۴۰)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مدات زکوٰۃ کی معنویت کا تجزیہ اس طرح کیا ہے:

(۱) مملکت اور انسانی زندگی کی ضروریات اور مسائل تو بیشمار ہیں، مگر بنیادی طور پر انسان کو

اسلامی حکومت میں رہتے ہوئے تین قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

(۱) شخصی ضروریات: فقراء ومساکین، مسافر، اور مقروض میں انہی ضروریات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

(۲) مسلمانوں کی اجتماعی حفاظت کا مسئلہ، اس ذیل میں مجاہدین اور عاملین آتے ہیں۔

(۳) حقیقی یا امکانی شرور وفتن کے دفاع کا مسئلہ اس ذیل میں مؤلفۃ القلوب اور جرمانہ کی بعض شکلیں آتی ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۴۵ مطبوعہ رشیدیہ دہلی)

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے ''فقر اور سفر'' کو تمام مدات کا خلاصہ قرار دیا ہے۔ (العرف الشذی علی الترمذی، ج:۱،ص:۱۴۲)

قرآنی مدات میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے

اگر ہم ان مدات پر الگ الگ نظر ڈالیں تو ان کی معنویت اور بھی اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔

آیت کریمہ میں زکوٰۃ کے لئے آٹھ مدات بیان کئے گئے ہیں، اور کلمۂ حصر ''انّما'' اور احادیث کی روشنی میں تمام علماء کا اتفاق ہے کہ ان مدات میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں ہے، یہ تو ممکن ہے کہ کسی مقام پر یہ تمام مدات بیک وقت موجود نہ ہوں، ایسے حالات میں جمہور فقہاء کے نزدیک زکوٰۃ تمام مدات تک پہنچانا ضروری نہیں ہے بلکہ مذکورہ مدات میں سے جو بھی بآسانی دستیاب ہوجائے اپنی زکوٰۃ اس میں صرف کردینا درست ہے، یہ رائے حنفیہ، مالکیہ، حنابلہ، حضرت سفیان ثوری اور امام ابوعبید کی ہے۔ صحابہ کرام میں حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت ابن عباس کی بھی یہی رائے ہے۔ (المغنی ۲/۶۸۸، ۶۷۰، فتح القدیر ۲/۱۸، الشرح الکبیر وحاشیہ الدسوقی ۱/۴۹۸)

البتہ حضرت امام شافعی کے نزدیک موجود تمام مدات تک زکوٰۃ پہنچانا ضروری ہے اور اگر یہ تمام مدات موجود نہ ہوں تو کم ازکم تین مدات کو بہرحال اپنی زکوٰۃ برابر برابر پہنچانا لازمی ہے۔ (المجموع ۶/۱۸۵، ۱۸۶، شرح المنہاج وحاشیۃ القلیوبی وغیرہ ۳/۲۰۱، ۲۰۲، الموسوعۃ الفقہیہ ۲۳/۳۳۰)

اس کے بعد ہم ان مدات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔

فقراء ومساکین

فقراء ومساکین زکوٰۃ کے سب سے اہم ترین مصرف ہیں، اور زکوٰۃ وصدقات کا نظام بڑی حد تک غربت ومسکنت ہی کے خاتمہ کے لئے جاری کیا گیا ہے، اسی لئے اس نظام سے سب سے

زیادہ فقراء ومساکین کو استفادہ کا موقعہ دیا گیا، گو بیت المال کے تمام ہی مدات میں فقراء ومساکین کا حصہ ہے، مگر صدقات کا شعبہ خاص طور پر اسی طبقہ کے لئے ہے، اور کہنا چاہئے کہ یہ ''شعبۂ فقراء ومساکین'' ہے، اگرچہ کہ اس میں بعض دیگر طبقات کے افراد بھی شامل ہیں، جو اپنے مجموعی حالات کے لحاظ سے زمرۂ مساکین میں شامل نہیں ہیں، لیکن حنفیہ کے بقول شعبۂ زکوٰۃ سے ان کے لئے بھی امداد کی فراہمی اسی وقت ممکن ہے جبکہ وہ اپنے حالات کے سبب اس کے واقعی ضرورت مند ہوں، اس سے صرف ''عاملین زکوٰۃ'' کا استثناء ہے کہ ذاتی زندگی میں خوشحال ہونے کے باوجود مدّ زکوٰۃ سے بقدر خدمت ان کو دینا جائز ہے۔ (فتح القدیر ۲/۱۶، ردالمحتار ۳/۲۶۱)

فقیر اور مسکین کا فرق

فقراء اور مساکین کی اصطلاحی تعریف میں جزوی طور پر تھوڑا اختلاف ہے، اور اسی اختلاف سے یہ اختلاف بھی نکلا ہے کہ ان دونوں میں زیادہ ضرورت مند کون ہے؟

(۱) حنفیہ کے نزدیک فقیر اس کو کہتے ہیں، جس کے پاس نصاب کے بقدر مال نہ ہو، مالک نصاب شخص اصطلاح میں غنی شمار ہوگا، اور اس کے لئے زکوٰۃ لینا یا اس کو زکوٰۃ دینا جائز نہ ہوگا۔ البتہ اگر کسی کے پاس ناقص نصاب ہو مگر اس کی ضروریات بھی اسی کے بقدر ہوں، تو وہ فقیر ہے، اس کے لئے زکوٰۃ لینا درست ہوگا، اور اگر ضروریات اتنی نہ ہوں تو اگرچہ کہ وہ اصطلاحی فقیر ہے مگر اسکے لئے زکوٰۃ لینا درست نہ ہوگا۔ (فتح القدیر، ج:۲، ص:۱۵)

❁ مالکیہ کے نزدیک جس شخص کے پاس ایک سال کے بقدر غذائی اشیاء موجود نہ ہوں وہ فقیر ہے۔

❁ اور حنفیہ و مالکیہ کے نزدیک مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ اور لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے کے لئے مجبور ہو۔ (فتح القدیر ۲/۱۵، الدسوقی ۱/۴۹۳)

❁ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی مال نہ ہو اور نہ ضرورت کے موافق کمائی ہو، اور مسکین وہ ہے جس کی آمدنی اس کی آدھی یا آدھی سے زیادہ ضروریات کی کفالت کرسکتی ہو۔ (حوالۂ بالا)

دسوقی نے بعض علماء کا قول نقل کیا ہے کہ فقیر و مسکین مصداق کے لحاظ سے ایک ہی ہیں، یعنی جو سال بھر کے لائق غذائی اشیاء کا مالک نہ ہو وہ فقیر ہے، خواہ اس کے پاس تھوڑا بہت مال ہو یا نہ ہو۔ (دسوقی ۱/۴۹۲)

❁ یہیں سے فقہاء کے درمیان یہ اختلاف بھی پیدا ہوا ہے کہ فقیر اور مسکین میں زیادہ ضرورت مند کون ہے؟

شافعیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ فقیر زیادہ حاجت مند ہے، جبکہ حنفیہ اور مالکیہ کی رائے میں مسکین زیادہ جات مند ہے، دونوں طبقے کے پاس اپنی اپنی دلیلیں ہیں: مثلاً شافعیہ اور حنابلہ نے سورۂ کہف کی اس آیت سے استدلال کیا ہے:

اما السفینة فکانت لمساکین یعملون فی البحر. (کہف:۷۹)

ترجمہ: ''بہرحال کشتی چند مسکینوں کی تھی، جو سمندر میں محنت ومزدوری کرتے تھے۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسکین کچھ نہ کچھ مالیت کا مالک ہوتا ہے، علاوہ ازیں لغوی طور پر ''فقیر'' فقر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ریڑھ کی بعض ہڈیوں کا چٹخ جانا، یعنی فقیر وہ ہے کہ معاشی طور پر جس کی کمر ٹوٹ گئی ہو، جبکہ ''مسکین''، ''سکن'' سے ماخوذ ہے، سکون حالت اطمینان کی علامت ہے۔

حنفیہ اور مالکیہ نے ایک دوسری آیت سے استدلال کیا ہے:

او مسکینًا ذا متربة (سورۃ البلد:۱۶)

ترجمہ: ''یا خاک آلود مسکین کو''

''خاک آلود'' اس شخص کو کہتے ہیں جو شدت بھوک کی بنا پر زمین پر اوندھے منھ گر پڑا ہو، نیز مسکین ''سکون'' سے ماخوذ ہے، سکون حرکت کی ضد ہے یعنی ''حالت انجماد'' یعنی اس قدر کمزور کہ ہلنے تک کی سکت نہ ہو۔ (المغنی ۶/۴۲۰، فتح القدیر ۲/۱۵، ۱۶، الدسوقی علی الشرح الکبیر ۱/۴۹۲، المحلّی علی المنہاج ۳/۱۹۶، الموسوعۃ الفقہیہ الکویت ۲۳/۳۱۲)

امام فخرالدین رازی (۵۴۴-۶۰۶ھ) نے تفسیر کبیر میں اس پر تفصیلی کلام کیا ہے، اور دونوں فریق کے دلائل کا احاطہ کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر کبیر ۸/۶۲ تا ۶۷ مطبوعہ قاہرہ)

مگر زیر بحث مسئلے میں اس اختلاف سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، اس اختلاف کا اثر زیادہ سے زیادہ وصیت کے باب میں ظاہر ہوسکتا ہے، مثلاً کسی نے فقیر کے لئے دو ہزار (۲۰۰۰) روپے کی اور مسکین کے لئے پانچ سو (۵۰۰) روپے کی وصیت کی تو حضرت امام شافعیؒ کے نقطۂ نظر کے مطابق سب سے زیادہ ضرورت مند شخص کو دو ہزار روپے دیئے جائیں گے، اور حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک کم ضرورت والے شخص کو دو ہزار روپے ملیں گے۔ (تفسیر الکبیر ۸/۶۳)

❁ صحت مند فقیر یا مسکین جو محنت مزدوری کرکے کفاف حاصل کرسکتا ہو، وہ فقیر کے زمرہ

میں آتا ہے یا نہیں؟

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک ایسا شخص اس زمرہ میں داخل نہیں ہے اس کو زکوٰۃ دینا درست نہیں اور نہ اس کے لئے زکوٰۃ لینا جائز ہے، اگر اس کا حال جانتے ہوئے اس کو دیدیا جائے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ (المغنی ۶/۴۲۳، المحلّی علی المنہاج ۳/۱۹۶، المجموع ۶/۱۹۰)

اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لاحظ فیها لغنی و لا لقوی مکتسب" (ابوداؤد ۲/۲۸۵)

ترجمہ: ''زکوٰۃ میں کسی مالدار اور مضبوط کمانے والے شخص کا کوئی حصہ نہیں ہے''۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

لا تحل الصدقة لغنی و لا لذی مرة سویٍّ (ابن ماجہ ۱/۵۸۹ بروایت حضرت ابوہریرہؓ)

ترجمہ: ''زکوٰۃ کسی مالدار یا مضبوط طاقتور کے لئے جائز نہیں''

اس کے بالمقابل حنفیہ اور مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ ''جس کو فقیر صورت دیکھو اس کو فقیر گمان کرو'' اس لئے کہ فقر ومسکنت، اور حاجت وضرورت ایک مخفی چیز ہے۔ اس پر ظاہری حالت ہی کو دلیل بنایا جاسکتا ہے اور ظاہری حالت یہ ہے کہ وہ نصاب کے بقدر مال کا مالک نہیں ہے۔ (فتح القدیر ۲/۲۸، الدسوقی ۱/۴۹۴)

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ ایک موقعہ پر رسول اللہ ﷺ زکوٰۃ کی تقسیم فرمارہے تھے، دو آدمی زکوٰۃ کا مطالبہ لے کر آئے، جو جسمانی طور پر کافی مضبوط تھے، حضور ﷺ نے ان دونوں پر ایک نگاہ ڈالی اور ارشاد فرمایا:

انه لاحق لکما فیه و ان شئتما اعطیتکما (ابوداؤد ۲/۲۸۱)

ترجمہ: ''تم دونوں کا اس میں کوئی حق نہیں ہے، پھر بھی چاہتے ہو تو میں تم دونوں کو دے دوں گا۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو مانگنے کا تو حق نہیں ہے لیکن اگر زکوٰۃ دیدی جائے تو اس کی گنجائش ہے، زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

فقر ومسکنت کا ثبوت

کسی مستور الحال شخص کے لئے فقر ومسکنت کا ثبوت محض اس کے دعوئ فقر سے ہو جائے گا۔ اس سے قسم لینے کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں سرور دوعالم ﷺ نے

دونوں سائلین کے سوال پر یقین فرما کر ارشاد فرمایا: ''اگر تم دونوں چاہو تو میں دے دوں گا'' البتہ اگر کسی کا جھوٹ ظاہر ہو جائے تو محض اس کے دعویٰ پر اسکو فقیر نہیں مانا جائے گا، اور اس کو زکوٰۃ دینا درست نہ ہوگا۔

یا کوئی شخص اپنی ظاہری حالت کے خلاف دعویٰ کرے مثلاً کوئی صاحب عیال ہونے کا دعویٰ کرے یا وہ خوش پوش وخوش حال شخص مانا جاتا تھا اور اب دعویٰ کرے کہ میرا سب کچھ ختم ہو چکا ہے، میں فقیر ہو چکا ہوں تو ان حالات میں دعویٰ کی تصدیق کے لئے تحقیق حال ضروری ہے۔
(المغنی ۲/ ۶۶۳، ۶/ ۴۲۳، الانصاف ۳/ ۲۴۵، المجموع ۶/ ۱۹۵، الموسوعہ ۲۳/ ۳۱۸)

❁ یہاں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کسی فقیر یا مسکین کو زکوٰۃ سے کس حد تک دینا درست ہے؟

جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ زکوٰۃ سے کسی فقیر ومسکین کو اس حد تک دیا جاسکتا ہے جو اس کے سال بھر کی ضروریات کے لئے کافی ہو جائے، اس سے زیادہ دینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے کہ آئندہ سال پھر تقسیم زکوٰۃ کے موقعہ پر اس کو اس میں سے حصہ ملے گا۔

شافعیہ کا ایک قول یہ ہے کہ کسی فقیر ومسکین کی مدد اس حد تک کی جانی چاہئے کہ وہ سطح غربت سے بلند ہو کر مالداری کی حد میں داخل ہو جائے، اور ہمیشہ کے لئے وہ پستی کی اس حالت سے نجات پا جائے، اگر وہ شخص کسی صنعت وحرفت سے وابستہ ہو تو اس کے لئے وہ آلات اور مشینیں خرید کر حوالہ کی جائیں جن سے وہ اپنے پیشہ پر کھڑا ہو سکے، اور خود کفیل بن سکے۔

جبکہ حنفیہ کسی فقیر کی صرف اس حد تک امداد کی اجازت دیتے ہیں جس سے فقر ومسکنت کا اطلاق اس پر باقی رہے، اس سے زیادہ دینا مکروہ ہے، اس لئے کہ اگر زکوٰۃ دیتے ہی وہ مالدار قرار پائے تو یہ قلب معکوس ہو جائے گا، البتہ اگر وہ مقروض ہو یا اس پر اہل وعیال کی یا دوسری مالی ذمہ داریاں ہوں تو زائد دینا بھی بلا کراہت جائز ہوگا۔ (فتح القدیر والعنایۃ ۲/ ۲۸، شرح منتہی الارادات والانصاف ۳/ ۲۲۸، المغنی ۶/ ۶۶۵، الدسوقی ۱/ ۴۹۴، المجموع ۶/ ۱۹۴)

عاملین زکوٰۃ

عاملین زکوٰۃ سے مراد اسلامی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ کارکنان ہیں جو زکوٰۃ کی وصولی کے سلسلے میں مامور ہوں، خواہ وہ فیلڈ ورکر ہوں یا آفس کے ملازمین۔

حنفیہ کے نزدیک تمام مدات زکوٰۃ میں یہ واحد مد ہے جس میں فقر واحتیاج کی شرط نہیں ہے، یعنی یہ ملازمین اور کارکنان ذاتی زندگی میں خوشحال اور مالدار بھی ہوں تب بھی زکوٰۃ سے اپنی

محنت کے بقدر حصہ پانے کے مستحق ہوں گے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''زکوٰۃ کسی مالدار کے لئے جائز نہیں سوائے چند اشخاص کے جن میں ایک عامل بھی ہے''۔

(ابن ماجہ ۱/۵۹۰ مطبوعہ الحلبی بروایت حضرت ابوسعید الخدریؓ)

اس لئے کہ عامل زکوٰۃ کو زکوٰۃ کی مد سے جو کچھ ملتا ہے وہ بطور اجرت اور معاوضۂ عمل ملتا ہے، اور اجرت اجیر کا حق ہے خواہ اجیر شخصی طور پر کتنا ہی خوشحال اور صاحب مال ہو، البتہ حنفیہ کے نزدیک عامل کی اجرت اگر اس کی جمع کردہ زکوٰۃ کے نصف سے زیادہ بنتی ہو تو نصف سے زائد اجرت اس کو نہیں ملے گی۔ (فتح القدیر ۲/۱۶)

شافعیہ اور حنابلہ کی رائے میں عامل سے وقت یا عمل کی تعیین کے ساتھ باقاعدہ اجرت کا معاملہ بھی کیا جاسکتا ہے، البتہ اگر اس کی اجرت جمع کردہ زکوٰۃ کی قیمت سے متجاوز ہوجائے تو بقیہ اجرت زکوٰۃ کے بجائے بیت المال سے ادا کی جائے گی۔ (المجموع ۶/۱۶۸-۱۸۷، المنہاج وشرحہ حاشیۃ القلیوبی ۳/۱۹۶، ۴۲۶)

دراصل زکوٰۃ وصول کرنے کی ذمہ داری امیر وقت کی ہے، مگر ظاہر ہے کہ امیر تنہا اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرسکتا، اس لئے کارکن بحال کئے جاتے ہیں اور ضابطہ کے مطابق ملازمین کو متعلقہ شعبہ کی آمدنی سے تنخواہ ادا کی جاتی ہے قرآن نے اس مصرف کو بیان کرنے کے لئے جو تعبیر اختیار کی ہے اسی سے اس کے استحقاق کی نوعیت بھی سمجھ میں آتی ہے، ''والعاملین علیھا'' یعنی اس طبقہ کو شعبہ زکوٰۃ سے جو کچھ ملے گا وہ ان کے عمل کی بنیاد پر ملے گا۔

۴-مؤلفۃ القلوب

مؤلفۃ القلوب سے ضعیف الایمان مسلمانوں کا طبقہ مراد ہے، جس کی دلجوئی اسلام پر اس کو جمانے اور قبول اسلام کی بنا پر پیش آنے والی پریشانیوں سے نجات دلانے کے لئے شعبۂ زکوٰۃ سے اس کی مدد کی جاتی ہے اور اس طرح زکوٰۃ سے دوہرا نفع حاصل کیا جاتا ہے، ایک طرف مستحق تک زکوٰۃ بھی پہنچتی ہے اور دوسری طرف اسلام کو افرادی قوت بھی حاصل ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں باقاعدہ اس کا نظام قائم تھا اور اس سے مستفید ہونے والے افراد کی ایک فہرست تھی، امام رازیؒ نے پندرہ اشخاص کا نام دیا ہے، جن کو حنین کے دن رسول اللہ ﷺ نے نوازا تھا۔

(۱) ابوسفیان (۲) اقرع بن حابس (۳) عتبہ بن حصن (۴) حویطب بن عبدالعزی (۵)

سہیل بن عمرو (۶) حارث بن ہشام (۷) سہیل بن عمرو الجہنی (۸) ابوالسنابیل (۹) حکیم بن حزام (۱۰) مالک بن عوف (۱۱) صفوان بن امیہ (۱۲) عبدالرحمٰن بن یر بوع (۱۳) الجد بن قیس (۱۴) عمرو بن مرداس (۱۵) العلاء بن الحارث۔ (تفسیر کبیر ۶۸/۸)

علامہ قرطبی نے احکام القرآن (۱۱۴/۸) میں، حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (۳۴۹/۲) میں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری (۲۳۴/۴) میں اور دیگر مفسرین اور مؤرخین نے بھی اس ذیل کے متعدد لوگوں کا ذکر کیا ہے۔

مؤلفۃ القلوب کی قسمیں

علماء نے لکھا ہے کہ عہد نبوی میں مؤلفۃ القلوب کی چھ قسمیں تھیں۔ دو قسموں کا تعلق غیر مسلموں سے تھا:

(۱) ایسے غیر مسلم جن سے خیر کی امید ہو۔ (۲) اور ایسے غیر مسلم جن کے شر کا خوف ہو۔

اور چار قسموں کا تعلق مسلمانوں سے تھا:

(۱) ضعیف الایمان مسلمان جن کو ایمان پر جمنے کے لئے مدد دی جاتی تھی۔

(۲) بعض نومسلموں کی اس لئے امداد کی جاتی تا کہ دوسرے غیر مسلموں کو اسلام کی طرف آنے کی رغبت پیدا ہو۔

(۳) سرحد پر رہنے والے بعض مسلمانوں کی امداد کی جاتی تا کہ موقع پر وہ اسلامی لشکروں کا تعاون کریں۔

(۴) بعض مسلمانوں کی امداد اس لئے کی جاتی کہ مقامی قبائل سے صدقات کی وصولی میں اسلامی کارکنوں کی مدد کریں۔ (المغنی ۴۲۷/۶، ۴۲۹، القلیوبی علی شرح المنهاج ۱۹۶/۳، ۱۹۸، الاحکام السلطانیہ ۱۲۲، الدسوقی ۴۹۵/۱)

مؤلفۃ القلوب کے سلسلے میں دو باتیں خاص اہمیت کی حامل ہیں:

(۱) آیا مؤلفۃ القلوب میں غیر مسلم بھی داخل ہیں؟ اور کیا زکوٰۃ غیر مسلم کو بھی دی جاسکتی ہے؟

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ دینے کا حکم باقی ہے یا منسوخ ہو چکا ہے؟

غیر مسلموں کو زکوٰۃ نہیں دی جائے گی

(۱) جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مشہور بات وہی ہے کہ عہد نبوی میں غیر مسلموں کو بھی تالیف قلب کے لئے زکوٰۃ سے حصہ دیا جاتا تھا، مگر علماء محققین کی رائے اس کے

خلاف ہے، محققین کے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ عہد نبوی میں بھی زکوٰۃ صرف مسلمانوں کو دی جاتی تھی، غیر مسلموں کو زکوٰۃ سے نہیں بلکہ بیت المال کے دیگر مدات سے دیا جاتا تھا۔ امام رازی، علامہ قرطبی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور علماء متأخرین میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب وغیرہ نے اس موضوع پر تفصیلی کلام کیا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ جن غیر مسلموں کا ذکر اس ذیل میں ملتا ہے ان کا زکوٰۃ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

رازی لکھتے ہیں:

هذه العطايا انما كانت يوم حنين ولاتعلق لها بالصدقات. (تفسیر کبیر ۶۸/۸)

ترجمہ: ''یہ عطایا حنین کے موقعہ پر دیئے گئے، مگر ان کا زکوٰۃ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔''

قرطبی لکھتے ہیں:

وبالجملة فكلهم مؤمن ولم يكن فيهم كافر (۱۱۴/۸)

ترجمہ: ''خلاصہ یہ کہ یہ سب مومن تھے ان میں کوئی غیر مسلم نہیں تھا''۔

قاضی ثناء اللہ لکھتے ہیں:

لم يثبت ان النبي صلى الله عليه وسلم اعطى احدًا من الكفار للايلاف شيئًا من الزكوة (تفسیر مظہری ۲۳۴/۴)

ترجمہ: یعنی یہ بات کسی روایت سے ثابت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی غیر مسلم کو مال زکوٰۃ سے اس کی دلجوئی کے لئے حصہ دیا ہو''۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''اس کی تائید تفسیر کشاف کی اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مصارف صدقات کا بیان یہاں ان کفار و منافقین کے جواب میں آیا ہے جو رسول اللہ ﷺ پر تقسیم صدقات کے بارے میں اعتراض کیا کرتے تھے، کہ ہم کو صدقات نہیں دیتے، اس آیت میں مصارف صدقات کی تفصیل بیان فرمانے سے مقصد یہ ہے کہ ان کو بتلایا جائے کہ کافر کا حق مال صدقات میں نہیں ہے''۔

اگر مؤلفۃ القلوب میں کافر بھی داخل ہوں تو اس جواب کی ضرورت نہ تھی (پھر تفسیر مظہری کے حوالے سے لکھتے ہیں) امام بیہقی، ابن سید الناس اور امام ابن کثیر وغیرہم سب نے یہی قرار دیا ہے کہ یہ عطا مال زکوٰۃ سے نہیں بلکہ خمس غنیمت سے تھی۔ (معارف القرآن ۴۰۲/۴)

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ مؤلفۃ القلوب میں غیر مسلم شامل نہیں تھے اور عہد نبوت میں بھی زکوۃ صرف ان نومسلموں کو دی جاتی تھی جن کی دلجوئی مقصود ہوتی تھی۔

کیا مؤلفۃ القلوب کا حکم باقی ہے؟

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حکم باقی ہے یا منسوخ ہو چکا ہے؟ حنفیہ کے نزدیک چونکہ عامل کو چھوڑ کر تمام اصناف زکوٰۃ میں فقر واحتیاج کی شرط ہے، اس لحاظ سے مؤلفۃ القلوب کو منسوخ ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر اس سے مراد مالدار مسلمان ہیں تو ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کی روح اور مزاج کے لحاظ سے ایسے مسلمانوں کو زکوٰۃ دیئے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے اس لئے کہ زکوٰۃ کا تمام نظام ضرورت مند مسلمانوں کے لئے ہے اور غالباً اسی معنی میں حنفیہ کی طرف سے نسخ کی نسبت کی جاتی ہے۔ ائمہ اربعہ میں تنہا امام احمد بن حنبلؒ ہی ہیں کہ جو مؤلفۃ القلوب کی مذکورہ بالا چھ قسموں میں سے ہر قسم کو آج تک باقی مانتے ہیں، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم اور مالدار ہو یا غریب، ان کے علاوہ باقی تمام ائمہ مذکورہ چھ قسموں میں سے کسی نہ کسی قسم کو ضرور منسوخ مانتے ہیں، امام شافعی کے نزدیک ان چھ قسموں میں سے آخری دو قسمیں اب بھی باقی ہیں اور باقی چار قسموں کے بارے میں ان کے یہاں دونوں طرح کے قول ملتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی ۸/۱۱۵)

حضرت امام ابوحنیفہ اور امام مالک تمام قسموں کو منسوخ مانتے ہیں (تفسیر قرطبی ۸/۱۱۵) مگر الموسوعۃ الفقہیہ میں حضرت امام مالک کا قول معتمد یہ نقل کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک مؤلفۃ القلوب منسوخ نہیں ہے۔ (الموسوعۃ ۲۳/۳۱۸، الدسوقی ۱/۴۹۵)

البتہ اوپر مؤلفۃ القلوب کی جو حقیقت ذکر کی گئی ہے اس کی روشنی میں بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک بھی اس کو منسوخ ماننے کی ضرورت نہیں ہے، علماء متأخرین میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تحریر اس سلسلے میں کافی بصیرت افروز ہے:

''محققین، محدثین، اور فقہاء کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مولفۃ القلوب کا حصہ کسی کافر کو کسی وقت بھی نہیں دیا گیا، نہ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں اور نہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں اور جن غیر مسلموں کو دینا ثابت ہے، وہ صدقات وزکوٰۃ سے نہیں؛ بلکہ خمس غنیمت سے دیا گیا، جس سے ہر حاجتمند مسلم اور غیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے، تو مؤلفۃ القلوب صرف مسلم رہ گئے اور ان میں جو فقراء ہیں، ان کا حصہ بدستور باقی ہونے پر پوری امت کا اتفاق ہے، اختلاف صرف اس صورت میں رہ گیا کہ یہ لوگ غنی صاحب نصاب ہوں، تو امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک چونکہ تمام مصارف زکوٰۃ میں فقر و حاجتمندی شرط نہیں ہے، اس لئے وہ مؤلفۃ القلوب میں ایسے لوگوں کو بھی داخل کرتے ہیں جو غنی اور صاحب نصاب ہوں، امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک

کے نزدیک عاملین صدقہ کے علاوہ باقی تمام مصارف میں فقرا و حاجتمندی شرط ہے، اسلئے مؤلفۃ القلوب کا حصہ بھی ان کو اسی شرط کے ساتھ دیا جائے گا کہ وہ فقیر و حاجتمند ہوں، جیسے غارمین اور رقاب، ابن سبیل وغیرہ سب میں اسی شرط کے ساتھ ان کو زکوٰۃ دی جاتی ہے کہ وہ اس جگہ حاجتمند ہوں، گو وہ اپنے مقام میں مالدار ہوں، اس تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولفۃ القلوب کا حصہ ائمہ اربعہ کے نزدیک منسوخ نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض حضرات نے فقراء و مساکین کے علاوہ کسی دوسرے مصرف کو فقر و حاجتمندی کے ساتھ مشروط نہیں کیا، اور بعض نے یہ شرط کی ہے جن حضرات نے یہ شرط رکھی ہے وہ مؤلفۃ القلوب میں بھی صرف انہی لوگوں کو دیتے ہیں جو حاجتمند اور غریب ہوں۔ بہرحال یہ حصہ قائم اور باقی ہے۔ (تفسیر مظہری، تفسیر معارف القرآن، ج:۴، ص:۴۰۴)

مدات کے ذکر میں قرآن کا اسلوب بیان

قرآن کریم نے زکوۃ کے آٹھ مدات میں پہلے کے چار مدات کو حرف جار ''ل'' سے بیان کیا ہے للفقراء والمساکین الخ اور آخری چار مدات کو حرف ''فی'' کے ذریعہ ''وفی الرقاب الخ''

''زمخشری نے کشاف میں اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ یہ آخری چار مصرف بہ نسبت پہلے چار سے زیادہ مستحق ہیں۔ کیونکہ حرف ''فی'' ظرفیت کے لئے بولا جاتا ہے جس کی وجہ سے معنی یہ پیدا ہوتے ہیں کہ صدقات کو ان لوگوں کے اندر رکھ دینا چاہیئے اور ان کے زیادہ مستحق ہونے کی وجہ ان کا زیادہ ضرورت مند ہونا ہے کیونکہ جو شخص کسی کا غلام ہو وہ عام فقراء کے بہ نسبت زیادہ تکلیف میں ہے۔ اسی طرح جو کسی کا قرض دار ہو اور قرض خواہ اس کے سر پر سوار ہو وہ عام غرباء و فقراء سے زیادہ تنگی میں ہوگا۔ (معارف القرآن ۴/۴۰۴)

مگر میرے نزدیک اس سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ قرآن نے مدات زکوٰۃ کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے: ''ل'' کے ذریعہ جن چار مدات کا بیان کیا ہے، ان میں شخصیتیں بذات خود مقصود ہیں اور ذاتی طور پر وہ زکوٰۃ پانے کے مستحق ہیں اور فی کے ذریعہ جن چار مدات کا بیان ہے ان میں شخصیتوں کو زکوۃ انکی شخصی حیثیت میں نہیں بلکہ ان کو درپیش ضروریات کی بنا پر دی جائیگی، اور یہ ضرورتیں دائمی نہیں ہیں بلکہ وقتی ہیں، پھر ختم ہو جائیں گی، آقاء سے غلام کا معاملۂ کتابت ہو یا قرضوں کا بوجھ، مسافرت کی بے سروسامانی ہو یا میدان جہاد کی ضروریات ان میں سے کوئی ضرورت دائمی نہیں ہے؛ بلکہ سب وقتی حاجتیں ہیں، تو دراصل قرآن نے اس تقسیم کے ذریعہ اسی فرق کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک قسم میں شخصیت پیش نظر ہے تو دوسری میں ضرورت، ضرورت ختم ہوتے ہی یہ مستحق زکوٰۃ باقی نہیں رہیں گے۔

تملیک کا مسئلہ

رہا یہ مسئلہ کہ تملیک ضروری ہے یا نہیں؟ تو یہ بات خود لفظ "ایتـــــاء" سے ظاہر ہے، بغیر "تملیک" ایتاء کی تکمیل ناممکن ہے۔

قرآن مجید میں جہاں زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم آیا ہے وہاں "آتوا الزکاۃ" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے اور کسی بھی مسئلہ میں اعتبار اس تعبیر کا ہوگا جو حکم کے وقت اختیار کی گئی ہو، سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ (انما الصدقات الخ) میں زکوٰۃ کے مصارف کا بیان ہے زکوٰۃ کے حکم کا نہیں۔ اس لئے مصارف کے ذیل میں اختیار کردہ اسلوب مدات کی نوعیت کو ظاہر کرتا ہے، ادائیگی کی نوعیت کو نہیں، قرآن کریم نے دو طرح کا اسلوب بیان اختیار کرکے مدات کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، ایک میں شخصیت کو اہمیت دی گئی ہے اور دوسرے میں ضروریات کی جہتوں کو، ایک میں دائمی مستحقین کو بیان کیا گیا ہے تو دوسرے میں عارضی مستحقین کو، ایک کی امداد ان کی ذاتی حیثیت کی بنا پر ہے دوسرے کی ان کو درپیش اتفاقی حالات کی بنا پر۔

اس لئے تملیک کی بحث اصولی طور پر مصرف کے بیان میں نہیں آتی، اس بحث کا موقعہ وہ فرمان الٰہی ہے جہاں زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم سنایا گیا ہے، اصل اس فرمان کے اسلوب اور لب ولہجہ کی اہمیت ہے اور اسی لب ولہجہ کی روشنی میں یہ طے ہوگا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں کیا طریق کار اختیار کیا جاسکتا ہے، آیا مستحقین کو مال زکوٰۃ کا بالکلیہ مالک بنادینا ضروری ہے یا بغیر مالک بنائے ان کے مفاد میں ازخود صرف کردینا کافی ہے؟

اس لحاظ سے غور کیجئے تو قرآن میں "آتوا الزکاۃ" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے اور حدیث میں امیر وقت کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ

توخذ من اغنیائھم و ترد علی فقرائھم (بخاری مع الفتح ۲۶۱/۳ مطبوعہ السلفیۃ)

مسلمانوں کو زکوٰۃ دینے کا حکم اور امیر وقت کو زکوٰۃ لینے اور فقراء تک زکوۃ پہنچانے کا حکم ظاہر کرتا ہے کہ زکوٰۃ مال والوں کی ملک سے نکل کر مستحقین کی ملک میں داخل ہونا ضروری ہے۔

اسی لئے فقہاء حنفیہ اور شافعیہ نے ادائے زکوٰۃ میں تملیک کو ضروری قرار دیا ہے۔

۵- وفی الرقاب

نظام زکوۃ میں اس مد کے قیام کا مقصد دنیا سے غلامی کا خاتمہ تھا، غلامی میں پھنسے ہوئے لوگوں کی امداد اس نظام کے تحت کی جاتی تھی، ایسے غلام جن کے مالک طے شدہ مالی ادائیگی کے تحت ان کو

آزاد کرنے پر رضامند ہوں ان کو عربوں کی اصطلاح میں مکاتب کہا جاتا تھا۔ ایسے غلاموں کو زکوٰۃ سے حصہ دیا جاتا تھا، تاکہ معاہدہ کے مطابق مالی ادائیگی کرکے اپنی گردن آزاد کرالیں، اس طرح اسلام نے شعبۂ زکوٰۃ کو اعلیٰ انسانی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی اجازت دی، اور اسلام کے انہی مساعی کی دین ہے کہ رفتہ رفتہ دنیا سے غلامی کا خاتمہ ہوا اور آج روئے زمین پر کہیں ''اصطلاحی غلامی'' کا نام ونشان نہیں ہے اس لئے اب اس مد پر گفتگو کرنے کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔

۶-الغارمون (قرض کے بوجھ میں دبے کچلے لوگ)

جولوگ کسی سبب سے مقروض ہوجاتے ہیں، فقہاء نے ان کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

(الف) وہ جو اپنی کسی ذاتی ضرورت کے سبب مقروض ہوجائے۔

ایسا شخص باتفاق فقہاء مستحق زکوٰۃ ہے مگر اس کے لئے چند شرطیں ہیں:

(۱) مسلمان ہو۔

(۲) آل رسول سے نہ ہو۔ (حنابلہ کے یہاں ایک قول یہ ملتا ہے کہ سید اگر مقروض ہو تو اس کو بھی زکوٰۃ دینا جائز ہے)

(۳) مالکیہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس نے اس غرض سے قرض نہ لیا ہو کہ زکوٰۃ سے اس نام پر اسے حصہ مل سکے۔

(۴) مالکیہ نے اس شرط کی بھی صراحت کی ہے کہ قرض صرف وہ معتبر ہے جس میں قید وبند کی سزا مل سکتی ہو۔ اس لئے اس میں دَین کفارات اور دین زکوٰۃ داخل نہیں ہیں۔

(۵) قرض کسی معصیت کے سبب نہ ہوا ہو، مثلاً شراب، جوا، یا بدکاری وغیرہ جیسی عادات بد کی بنا پر کوئی مقروض ہوجائے، البتہ توبہ کرلے تو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ شافعیہ نے فضول خرچی کو بھی معصیت ہی کے ذیل میں شمار کیا ہے۔ یہ شرط مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ نے لگائی ہے۔

(۶) قرض فوری واجب الاداء ہو اس شرط کا ذکر شافعیہ کے یہاں ملتا ہے، اگر قرض فوری واجب الاداء نہ ہو بلکہ دین مؤجل ہو تو شافعیہ کے یہاں اس سلسلے میں ایک قول یہ ہے کہ اگر قرض کی ادائیگی اسی سال ضروری ہو تو اس سال کی زکوٰۃ سے مدد کی جائے گی، اور اگر اس سال ضروری نہ ہو تو اس سال کی زکوٰۃ سے حصہ نہیں ملے گا۔

(۷) اپنے طور پر قرض کی ادائیگی پر قادر نہ ہو، اگر قرض کا کچھ حصہ ادا کرسکتا ہو تو صرف اسی قدر زکوٰۃ کا وہ مستحق ہوگا، جس سے کہ وہ بقیہ قرض ادا کرسکے۔ (المغنی ۶/۴۳۲، فتح القدیر ۲/۱۷، ابن

عابدین ۲/ ۶۰، روضۃ الطالبین ۶/ ۳۱۸، الدسوقی ۱/ ۴۹۶، ۴۹۷)

(ب) ایسا قرض جو مسلمانوں کے دو متحارب گروہوں، خاندانوں، فریقوں یا شخصوں کے درمیان مصالحتی کوششوں کے نتیجے میں ہو جائے۔

اس سلسلے میں ایک حدیث بھی وارد ہوئی ہے، رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا صرف تین قسم کے اشخاص کے لئے جائز ہے، ان میں ایک وہ شخص ہے جو لوگوں کے درمیان صلح ومصالحت کے سلسلے میں زیر بار ہو جائے۔ (الموسوعۃ الفقھیہ ۲۳/ ۳۲۲)

حنفیہ کے نزدیک اس قسم کی انسانی خدمت انجام دینے والا شخص اگر مالدار ہو تو زکوٰۃ سے اس کو حصہ نہیں ملے گا، بلکہ اس قسم کے قرضوں کو وہ اپنے ذاتی مال سے ادا کرے گا، البتہ اگر مالدار نہ ہو تو زکوٰۃ سے اس کو ادائیگی قرض کے لئے امداد دی جائے گی۔ (فتح القدیر ۲/ ۱۷)

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک مالدار ہو یا غریب اس سلسلے میں ہونے والے قرضوں کی ادائیگی مال زکوٰۃ سے کی جائے گی، تا کہ اس عظیم انسانی خدمت کے لئے لوگ پیش پیش رہیں، فقر کی شرط لگانے پر بہت سے اچھے اچھے لوگوں کو بھی اس باب میں آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوگی۔
(المغنی ۶/ ۴۳۳، روضۃ الطالبین ۲/ ۳۱۸، المجموع ۶/ ۲۰۶، مغنی المحتاج ۳/ ۱۱۱)

مالکیہ کے یہاں اس سلسلے میں کوئی تصریح نہیں ملتی۔

(ج) قرض کی تیسری قسم وہ ہے جو کسی کا جرمانہ یا ضمان ادا کرنے کے سبب ہو جائے، اس کو دین ضمان کہتے ہیں اس قسم کا ذکر صرف شافعیہ کے یہاں ملتا ہے، البتہ اس میں شافعیہ نے یہ قید لگائی ہے کہ ضامن اور مضمون، یعنی ضمان ادا کرنے والا شخص اور جس کا ضمان ادا کیا جانا ہو دونوں غریب اور تنگدست ہوں، ظاہر ہے کہ حنفیہ بھی اس باب میں ان کی تائید کریں گے۔ (الموسوعۃ الفقھیہ ۲۳/ ۳۲۲)

❁ میت پر اگر قرض ہو تو جمہور کے نزدیک زکوٰۃ سے اس کی ادائیگی درست نہیں ہے، البتہ مالکیہ اس کی اجازت دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میت اس قسم کے حسن سلوک کا زیادہ مستحق ہے اس لئے کہ اس کے قرض کی ادائیگی کا امکان کم ہے، شافعیہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ (روضۃ الطالبین ۲/ ۳۱۸، الزرقانی ۲/ ۱۷۸، المجموع ۶/ ۲۱۱، الموسوعۃ ۲۳/ ۳۲۳)

۷- فی سبیل اللہ

''فی سبیل اللہ'' کے لغوی معنی ہیں ''اللہ کے راستے میں'' مگر یہاں لغوی معنی مراد نہیں ہے،

یہ ایک خاص اصطلاح ہے، فقہاء کے یہاں اس کی تین صورتیں ملتی ہیں:

(۱) رضا کار مجاہدین جو سرکاری ملازم نہ ہوں اور اسلامی حکومت سے ان کی تنخواہ مقرر نہ ہو؛ بلکہ محض رضائے الٰہی کے لئے جہاد پر آمادہ ہوں، ایسے مجاہدین کو باتفاق فقہاء زکوٰۃ دینا جائز ہے، تاکہ وہ زکوٰۃ کی رقم سے ہتھیار، سواری اور جنگی مصالح کی چیزیں حاصل کرسکیں۔

البتہ حنفیہ کے نزدیک شرط یہ ہے کہ وہ غریب ہوں اور بطور خود جنگی سامان حاصل نہ کرسکتے ہوں، دیگر فقہاء کے یہاں یہ شرط نہیں ہے، مالدار ہو یا غریب ہر مجاہد کے لئے زکوٰۃ سے جنگی اغراض کے لئے امداد لینا جائز ہے۔

اسی طرح تنخواہ دار مجاہدین کے لئے زکوٰۃ سے امداد لینا جائز نہیں۔ (ردالمحتار ۲/۶۱، فتح القدیر ۲/۱۷، المغنی ۶/۴۳۶، الشرح الکبیر مع الدسوقی ۱/۴۹۷، المجموع ۶/۲۱۲، ۲۱۳)

(۲) جنگی مصالح کے لئے زکوٰۃ کا استعمال کرنا جس میں زکوٰۃ مجاہدین کے حوالہ نہ کی جائے۔ یہ صورت صرف مالکیہ کے نزدیک جائز ہے، دیگر فقہاء نے اس کی اجازت نہیں دی ہے، شافعیہ نے ایک صورت وقف کی نکالی ہے کہ زکوٰۃ سے جنگی سازوسامان خرید کر جہاد کے لئے وقف کردیا جائے، یعنی مجاہدین بعد از استعمال حکومت کو واپس کردیں یہ صورت ان کے نزدیک جائز ہے، حنابلہ اس کو بھی جائز نہیں کہتے۔

دراصل اس صورت میں تملیک نہیں پائی جاتی جو کہ بنیادی شرط ہے۔ اسی لئے مالکیہ کے علاوہ عام فقہاء نے اس کو جائز قرار نہیں دیا ہے۔ (الدسوقی والشرح الکبیر ۱/۴۹۷، المجموع ۶/۲۱۲، ۲۱۳، المغنی ۶/۴۳۶، ۴۳۷)

(۳) ''حجاج کرام'': جمہور علماء (حنفیہ، مالکیہ اور شافعیہ) کی رائے میں حجاج کرام ''فی سبیل اللہ'' میں داخل نہیں اور حج کے اخراجات کے لئے ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اس لئے کہ ''فی سبیل اللہ'' کتاب وسنت کی ایک مخصوص اصطلاح ہے اور اس سے مراد عام حالات میں صرف مجاہدین ہوتے ہیں۔

البتہ امام احمد کا ایک قول اور بعض حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ حج بھی ''فی سبیل اللہ'' میں داخل ہے، اور اس کے لئے زکوٰۃ استعمال کی جاسکتی ہے۔ (المغنی ۶/۴۳۸، المجموع ۶/۲۱۲، ردالمحتار ۲/۶۷)

اس لئے کہ ایک روایت میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کو ''فی سبیل اللہ'' قرار دیا ہے۔

فھلّا خرجت علیه فان الحج من سبیل الله (ابوداؤد ۲/۵۰۴، حاکم ۱/۴۸۳، ۴۸۴)

ترجمہ: ''تو اونٹ پر سوار ہوکر کیوں نہیں نکلی؟ حج بھی ''سبیل اللہ'' میں داخل ہے''۔

۸-ابن السبیل (مسافر)

مسافر کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایسا مسافر جو وطن سے باہر ہو اور وطن واپسی کے لئے اس کے پاس مال نہ ہو۔ ایسے مسافر کو باتفاق فقہاء زکوٰۃ دینا جائز ہے اتنی رقم کہ وہ اپنے گھر واپس ہوسکے، اس سے زیادہ دینا جائز نہیں، البتہ فقہاء نے ایسے مسافر کے لئے بعض شرطیں عائد کی ہیں:

۱-مسلمان ہو اور ہاشمی نہ ہو۔

۲-وطن واپسی کیلئے اس کے پاس کرایہ موجود نہ ہو، اگرچہ اس کے گھر میں مال موجود ہو۔

۳-مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس کا سفر برائے معصیت نہ ہو۔

۴-چوتھی شرط صرف مالکیہ نے لگائی ہے کہ کوئی قرض دینے والا بھی موجود نہ ہو یا اس وقت جبکہ مسافر گھریلو طور پر مالدار ہوتا کہ اس قرض کی ادائیگی کرسکے۔

حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ جو شخص گھریلو طور پر مالدار ہو اس کے لئے زکوٰۃ لینے سے بہتر یہ ہے کہ اگر قرض ملنا ممکن ہو تو قرض لے لے اور وطن پہنچ کر قرض ادا کردے۔ (الفروع ۲/۶۲۵، روضۃ الطالبین ۲/۳۲۱، شامی ۲/۶۱، الدسوقی ۱/۴۹۷، ۴۹۸)

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ ایک شخص سفر میں تو نہ ہو لیکن کسی ضرورت کے تحت سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو کیا زکوٰۃ سے اس کے لئے زادِ سفر کا انتظام کیا جاسکتا ہے؟

جمہور علماء اس کی اجازت نہیں دیتے۔ البتہ اس شخص کا مال دوسرے مقام پر ہو اور خود اس کے پاس خرچ کے لئے مال موجود نہ ہو اور اسے مال کی سخت ضرورت ہو تو حنفیہ نے اس صورت کو ابن السبیل میں داخل کیا ہے۔ (ردالمحتار ۲/۶۱، ۶۲، الدسوقی ۱/۴۹۷، المجموع ۶/۲۱۵، روضۃ الطالبین ۲/۳۲۱)

مدات کے درمیان ترتیب

یہ آٹھ مدات ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ زکوٰۃ دیتے وقت ان مدات کے درمیان ترتیب کیا ہوگی؟ اور ادائیگی کے وقت ان میں کس کو ترجیح حاصل ہوگی؟

شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک تمام مدات میں ''عامل زکوٰۃ'' کو اولیت حاصل ہے یعنی تقسیم کا آغاز عامل سے کیا جائے گا۔ اس لئے کہ نظام زکوٰۃ کا مدار اسی کی محنت پر ہے اور زکوٰۃ سے اسے جو کچھ ملتا ہے معاوضۂ محنت کے طور پر ملتا ہے۔

حنفیہ اور مالکیہ واقعی حاجت کا لحاظ کرتے ہیں۔ چنانچہ حنفیہ کے نزدیک مقروض کو فقراء پر ترجیح حاصل ہوگی۔ حنفیہ اور دیگر فقہاء نے کچھ اور اسباب ترجیح کا بھی ذکر کیا ہے جو فقہ کی تفصیلی کتابوں میں موجود ہیں۔ (شامی ۲/۶۱،۶۹، الشرح الکبیر ۱/۴۹۸، المجموع ۶/۱۸۷، المغنی ۲/۶۸۹، الانصاف ۳/۲۳۹)

قرآنی ترتیب کی حکمت

قرآن نے مدات زکوٰۃ کے بیان اور ان کی ترتیب میں خاص حکمت کا لحاظ کیا ہے۔ جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا گیا کہ قرآن نے مدات زکوٰۃ کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے ایک حصہ میں شخصیت کو اہمیت دی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں ضروریات کو، دونوں حصوں میں قرآن نے ترتیب میں ضرورت و استحقاق کے مدارج کا لحاظ کیا ہے۔ مثلاً پہلے حصے میں فقراء، مساکین، عاملین زکوٰۃ اور مؤلفۃ القلوب شامل ہیں۔ فقراء ومساکین ہی سے اصلاً یہ پورا شعبۂ زکوٰۃ قائم ہے۔ البتہ فقر ایک فرد کی محتاجی کا نام ہے اور مسکنت ایک گھر کی محتاجی کا۔ یقینی بات ہے کہ گھر کی محتاجی کا درجۂ حرارت فرد کی محتاجی سے زیادہ ہے۔

عاملین زکوٰۃ اصلاً اجیر ہوتے ہیں اور اجیر کی اجرت اور محنت کش کا معاوضۂ محنت کسی کی بلامحنت امداد سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

مؤلفۃ القلوب میں ایسے افراد بھی داخل ہیں جو اسلام کی نشر و اشاعت، اسلامی فوجوں کی نصرت و معاونت کے علاوہ زکوٰۃ کی وصولی میں بھی مددگار ہوتے ہیں اور اس پر ان کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ ایسے لوگوں کی دلجوئی کے لئے زکوٰۃ سے حصہ دیا جاتا ہے، تاکہ وہ مزید رغبت کے ساتھ اس میں دلچسپی لیں، اور بیت المال کا شعبہ صدقات زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوسکے۔ اصولی طور پر بلامعاوضہ محنت کرنے والوں کی دلجوئی وحوصلہ افزائی بامعاوضہ محنت کنندگان کی محنت سے زیادہ وزن رکھتی ہے۔

اس طرح دیکھئے تو قرآن نے چھوٹی ضرورت والے مصرف سے گفتگو کا آغاز کیا اور پھر درجہ بدرجہ زیادہ سے زیادہ مستحق اور قابل توجہ مدات کی طرف عروج کیا اور چوتھے مصرف پر بات پوری ہوگئی۔

اسی طرح مدات کے دوسرے حصے میں ترتیب ''فی الرقاب'' سے شروع ہوئی اور ابن السبیل پر جاکر ختم ہوگئی ہے۔

''فی الرقاب'' ایک مخصوص طبقہ کی ضرورت ہے۔ غلاموں کا طبقہ، جو آج مفقود ہے۔

''الغارمین'' مبتلائے قرض ہونا ایک عام انسانی ضرورت ہے کبھی بھی اور کوئی بھی شخص اس میں مبتلا ہوسکتا ہے۔

''فی سبیل اللہ'' کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے، وہ اس طرح کہ دین اور امت کا تحفظ اس سے وابستہ ہے، نیز اس میں اپنے وطن سے نکل کر سفر کی صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں، ملکوں ملکوں اور جنگل جنگل کی خاک چھاننی پڑتی ہے، اپنے مقام پر رہ کر دس مصیبتیں برداشت کرنا آسان ہے کہ وہاں دلجوئی وتسلی کے ہزار سامان موجود ہوتے ہیں، مگر سفر میں دین کی خاطر تکلیفیں اٹھانا آسان بات نہیں ہے۔

ابن السبیل کا دائرہ اس سے بھی زیادہ عام ہے، کہ فی سبیل اللہ کے مسافر ایک مخصوص طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں، جبکہ ابن السبیل کے عموم میں ہر وہ مسافر داخل ہے، جو معصیت کے علاوہ کسی بھی غرض سے سفر کررہا ہو۔

اس طرح قرآن کریم نے چھوٹی سے چھوٹی، محدود سے محدود تر اور خاص سے خاص مصرف سے لے کر عام سے عام اور وسیع سے وسیع تر اغراض ومقاصد اور ضروریات کا احاطہ کیا ہے، اور چھوٹی سطح سے لے کر بڑی سطح تک اس کے دائرہ کو وسیع کیا گیا ہے۔

زکوٰۃ صرف بنیادی مسائل کا حل ہے

البتہ اس میں انسانی زندگی کی صرف بنیادی ضروریات اور مسائل کو پیش نظر رکھا گیا ہے جس پر زندگی کی بقا اور اس کے تشخص وامتیاز کا تحفظ موقوف ہے۔

اس نظام کے تحت انسانوں کے ترقیاتی منصوبوں اور اعلیٰ فلاحی چیزوں کو شامل نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کو بیت المال کے دوسرے مدات کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے نظام زکوٰۃ دراصل ''شعبۂ غربا'' ہے یعنی ایک عام انسان کو زندگی میں کن بنیادی ضرورتوں اور مسائل سے سابقہ پڑ سکتا ہے، اس نظام کے تحت صرف ان کا حل ڈھونڈا گیا ہے ہم اگر ان مدات پر غور کریں گے تو یہ بات صاف طور پر محسوس ہوگی۔ مثلاً

''فقراء ومساکین'' تو اس نظام کی روح ہی ہیں اور تمامتر سرگرمیاں انسانیت کے اسی کمزور طبقہ کو مستحکم کرنے کے لئے جاری کی گئی ہیں۔ فقراء ومساکین کے بعد عاملین زکوٰۃ کا ذکر آیا ہے، ظاہر ہے نظام زکوٰۃ کا قیام انہی کی جدوجہد سے وابستہ ہے، اور زکوٰۃ کا سارا سرمایہ انہی کی محنتوں سے جمع ہوتا ہے، اس لئے ان کو بھی زکوٰۃ سے محروم کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، کہ ان کے بغیر نہ زکوٰۃ

کا سرمایہ فراہم ہوسکتا ہے اور نہ یہ نظام جاری رہ سکتا ہے۔

عاملین کے بعد ''مؤلفۃ القلوب'' کا ذکر ہے، یہ بھی ہمارے معاشرہ کا لازمی حصہ ہے، اگر کمزوردل اور ضعیف الخیال لوگوں کی مالی مدد نہ کی جائے تو اکثر وہ دشمنوں کی سازشوں اور فریب کاریوں کے شکار ہوسکتے ہیں۔ اور اس طرح مسلمانوں کی افرادی قوت کمزور ہوسکتی ہے۔ افرادی قوت کو پختہ اور وسیع کرنا ایک مکمل معاشرہ کے لئے ضروری ہے، اس کے بغیر نہ اپنی حفاظت ہوسکتی ہے اور نہ دشمنوں کی تدبیروں کو ناکام بنایا جاسکتا ہے۔

''مؤلفۃ القلوب'' کے بعد غلامی کے مسئلہ کو اہمیت دی گئی ہے اس لئے کہ انسان کی شخصی آزادی سب سے بنیادی ضرورت ہے۔ شخصی آزادی حاصل نہ ہو تو ذہن وفکر اور جہد وعمل کی آزادی بھی ممکن نہیں۔

''فی الرقاب'' کے بعد الغارمین کا تذکرہ ہے، قرض بھی ایک عام مجبوری اور اس کی ادائیگی ایک بنیادی ضرورت ہے، قرض کا بار ایک عام شخص کے لئے بدترین بوجھ ہے، جو ذہن وفکر اور محنت وعمل کی تمام تر صلاحیتوں کو معطل کرکے رکھ دیتا ہے۔

''الغارمین'' کے بعد ''فی سبیل اللہ'' کا ذکر ہے۔ جہاد دفاع دین کے لئے لازمی ضرورت ہے، جس قوم سے جہاد کی اسپرٹ رخصت ہوجاتی ہے، اس کی ساری آبرو بھی چلی جاتی ہے، قوم بے وزن ہوکر رہ جاتی ہے اور اندر کا ایمان بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

''فی سبیل اللہ'' کے بعد آخری مد کے طور پر ''ابن السبیل'' کا بیان آیا ہے، سفر ایک عام انسانی ضرورت ہے، اس سے کسی کو چارۂ کار نہیں اور ایک عام انسان ہی سفر کی تکلیفوں کو جھیلتا ہے اور اس راہ کی بہت سی محرومیوں سے دوچار ہوتا ہے۔

زندگی خود ایک سفر ہے، جو سفر آخرت کے آغاز پر ختم ہونے والا ہے، اس طرح قرآن نے زکوٰۃ کے اس پورے سسٹم کو عام انسانی زندگی کی ضرورت اور مسائل سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اس میں ملک وقوم یا انسانوں کے اعلیٰ طبقات کو اونچی ترقیات کا نہ تصور دیا گیا ہے اور نہ ان کی سطح کے مسائل ومشکلات کا حل اس سے وابستہ کیا گیا ہے۔

اس لئے آج جو لوگ اس نظام زکوٰۃ کے دائرہ کو وسیع کرنے کے آرزومند ہیں اور سرمایۂ زکوٰۃ کو تعمیر وترقی کے مختلف پروگراموں اور ملک وملت کے فلاحی منصوبوں میں لگانے کے خواہشمند ہیں، دراصل انھوں نے اس نظام کو سمجھا ہی نہیں۔

❁ ❁ ❁

بچوں کو بڑوں کی صف میں کھڑا کرنا

از: مفتی عمر فاروق لوہاروی
شیخ الحدیث دارالعلوم لندن (یو.کے)

بچے نماز وغیرہ عبادات واحکامات کے مکلّف نہیں ہیں۔ بالغ ہونے پر وہ مکلّف ہوتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

رفع القلم عن ثلاثة: عن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یحتلم وعن المجنون حتی یعقل. (سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب فی المجنون یسرق او یصیب حدا ج:۲،ص:۲۴۹، جامع ترمذی، ابواب الحدود، باب ما جاء فیمن لایجب علیه الحد ج:۱،ص:۲۶۳)

”تین قسم کے لوگ مرفوع القلم ہیں: سونے والا یہاں تک کہ وہ بیدار نہ ہوجائے، بچہ یہاں تک کہ وہ بالغ نہ ہوجائے، اور مجنون یہاں تک کہ اسے جنون سے افاقہ نہ ہوجائے۔“

لیکن جب بچے قدرے سمجھدار ہوجائیں، تو اعتیاد اور تمرین علی العبادت کے لیے شریعت مطہرہ نے ان کو نماز کی تلقین وترغیب اور ایک مرحلہ پر تنبیہ وتادیب کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مروا اولادکم بالصلوة وهم ابناء سبع سنین، واضربوا هم علیها وهم ابناء عشر، و فرقوا بینهم فی المضاجع. (سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰة، باب متی یؤمر الغلام بالصلاة ،ج:۱،ص:۷۱ ونحوه فی الجامع للترمذی، ابواب الصلوة، باب ما جاء متی یؤمر الصبی بالصلاة ج:۱،ص:۹۳)

”اپنی اولاد کو جب وہ سات سال کے ہوجائیں، نماز کا حکم دو۔ اور جب وہ دس سال کے ہوجائیں، تو نماز (چھوڑنے) پر ان کی سرزنش وتادیب کرو اور خواب گاہوں میں ان کو جدا کرو۔“

رہا یہ امر کہ کتنی عمر کے بچوں کو نماز کے لیے اپنے ساتھ مسجد لے جاسکتے ہیں، تو اس کے متعلق کتاب وسنت میں کوئی خاص تحدید وارد نہیں ہوئی ہے؛ لیکن یہاں دوسرا پہلو مسجد کے تقدس و

احترام اور نظافت وصفائی کا ہے، جس کا پاس ولحاظ رکھنے کی انتہائی تاکید آئی ہے۔ جامع ترمذی وغیرہ میں ہے:

عن عائشة قالت: امر النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ببناء المساجد فی الدور وان تنظف وتطیب. رواہ الترمذی مسندا ومرسلاً وقال فی المرسل: ھذا اصح. (جامع ترمذی، ابواب ما یتعلق بالصلوۃ، باب ما ذکر فی تطییب المساجد ج:۱،ص:۱۳۰)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ نے ہر ہر محلّہ میں مسجدیں بنانے کا حکم دیا، اور یہ حکم فرمایا کہ وہ صاف اور خوشبودار رکھی جائیں۔''

صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: البزاق فی المسجد خطیئة وکفارتھا دفنھا. (صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب کفارۃ البزاق فی المسجد ج:۱،ص:۵۹)

''نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ مسجد میں تھوکنا گناہ ہے، اور اس کا کفارہ اس کو دفن کردینا یعنی صاف کردینا ہے۔''

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک روایت نقل فرمائی ہے، جس کی اصل صحیح بخاری، کتاب الوضوء وغیرہ میں ہے؛ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

بینما نحن فی المسجد مع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذ جاء اعرابی فقام یبول فی المسجد فقال اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: مہ مہ، قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لا تزرموہ، دعوہ، فترکوہ، حتی بال، ثم ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم دعاہ فقال لہ: ان ھذہ المساجد لاتصلح لشيء من ھذا البول ولا القذر، انما ھی لذکر اللّٰہ تعالٰی والصلاۃ وقرأۃ القرآن او کما قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم. (صحیح مسلم ج:۱،ص:۱۳۸)

''اس دوران کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسجد (نبوی) میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ ایک اعرابی آئے اور کھڑے ہوکر مسجد میں پیشاب کرنے لگے، رسول اللہ ﷺ کے صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے فرمایا: ٹھہر جاؤ، رُک جاؤ۔ راوی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان کا پیشاب مت روکو، انھیں کرنے دو۔ چنانچہ انھوں نے اسے یونہی چھوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ پیشاب کرچکے، پھر رسول اللہ ﷺ نے انھیں بلایا اور ان سے فرمایا کہ یہ مساجد پیشاب اور گندگی کے کسی کام کے لیے موزوں نہیں ہیں،

یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر، نماز اور تلاوتِ قرآن کے لیے ہیں۔ یا اسی طرح کچھ رسول اللہ ﷺ نے (ان سے) فرمایا۔''

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ حدیثِ مذکور کے فوائد پر کلام کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

وفیه تعظیم المسجد و تنزیهه عن الاقذار. (فتح الباری ج:۱،ص:۳۸۸)

''اس حدیث میں مسجد کی تعظیم اور اس کو قابلِ نفرت چیزوں سے پاک وصاف رکھنے کی تعلیم ہے۔''

اسی طرح مسجد میں ہر ایسے کام سے منع کیا گیا، جس سے اس کا احترام ختم ہوجائے، یا جس سے عبادت میں مشغول لوگوں کے دل پراگندہ ہوں۔ چنانچہ مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان، خرید وفروخت اور بازاروں جیسا شور وشغب، حمد ونعت اور ضرورتِ شرعیہ کے بغیر اشعار سنانا یا بیت بازی کرنا، قصاص لینا اور سزائیں جاری کرنا، جنبی اور حائضہ یا نفساء کا داخل ہونا اور بدبودار چیزوں کو مسجد میں لے جانا یا خود بدبودار ہوکر مسجد میں جانا وغیرہ امور سے ممانعت احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔ یہ سب امور احترامِ مسجد کے منافی ہیں، اور ان میں سے بعض میں اللہ کے نیک بندوں یعنی فرشتوں اور نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وقد کان عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه اذا رأی صبیانا یلعبون فی المسجد ضربهم بالمخفقة وهی الدرة. (تفسیر ابن کثیر، ج:۳،ص:۲۷۵)

''حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جب بچوں کو مسجد میں کھیلتے ہوئے دیکھتے تھے، تو ان کو درہ سے مارتے تھے۔''

احترامِ مسجد کے تأکّد پر دلالت کرنے والی نصوص وآثار کو مدِّنظر رکھتے ہوئے حضرات فقہاء کرام نے بعض بچوں کو مسجد میں لانے کی اجازت دی ہے، اور بعض کے لانے کو ممنوع ٹھہرایا ہے۔ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ وغیرہ کی ایک روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنّبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم. (سنن ابن ماجہ،ص:۵۵) ''تم اپنی مسجدوں سے اپنے بچوں اور پاگلوں کو دور رکھو یعنی ان کو مسجدوں میں نہ آنے دو'' فنّی اعتبار سے اس روایت میں کلام ہے۔ چھوٹے بچوں کو مسجد میں لانے کی ممانعت اِس روایت پر موقوف نہیں، جیسا کہ بعض عمل بالحدیث کے دعویدار سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ سے مقلدین حضرات پر اعتراض کرتے ہیں؛ بلکہ سطورِ بالا میں مذکور احترامِ مسجد کے تأکّد پر دالّ صحیح اور صریح روایات جیسی

روایات ونصوص سے ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ کن بچوں کو مسجد میں لانے کی اجازت ہے اور کن کے لیے ممانعت ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ نابالغ بچوں کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ بچے جو اتنے ناسمجھ اور کم عمر ہوں، کہ انھیں پاکی وناپاکی اور مسجد وغیرہ مسجد کا بالکل شعور نہ ہو، اور ان سے مسجد کے ناپاک ہوجانے کا ظن غالب ہو، ایسے بچوں کو مسجد میں لانا جائز نہیں، مکروہ تحریمی ہے۔

(۲) وہ بچے جو تھوڑی بہت کچھ سمجھ رکھتے ہوں، اور ان سے مسجد کی بے حرمتی اور ناپاک ہونے کا قوی اندیشہ نہ ہو، انھیں مسجد میں لاسکتے ہیں، مگر بہتر یہ ہے کہ نہ لایا جائے۔

(۳) وہ بچے جو پوری طرح باشعور اور باتمیز ہوں، پاکی وناپاکی کو سمجھتے ہوں اور مسجد کا احترام ملحوظ رکھتے ہوں، انھیں مسجد میں لانا بلاکراہت جائز ہے؛ بلکہ نماز کی عادت ڈالنے کے لیے لانا ہی چاہیے۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ سن تمیز وشعور ہر بچے میں یکساں نہیں ہوتا؛ بلکہ استعداد فطری کے لحاظ سے یہ عمر ہر بچے میں مختلف ہوتی ہے، اس لیے باشعور ہونے کی عمر کی تحدید وتعین نہیں ہوسکتا۔ اس اعتبار سے سات سال سے کم عمر بچہ بھی باشعور ہوسکتا ہے، جبکہ اس کی دینی تربیت اور اخلاق وآداب کی تعلیم اچھی طرح ہوئی ہو۔ ویسے شعور کی ابتداء عام طور پر سات سال کی عمر میں ہوتی ہے، اور دس سال کی عمر میں اس کی تکمیل ہوتی ہے، اس لیے حدیث پاک میں سات سال کی عمر میں بچوں کو نماز کا حکم دینے اور دس سال کی عمر میں نماز چھوڑنے پر تادیب کا امر فرمایا گیا ہے، اور پندرہ سال میں عقل وجسم میں پختگی آتی ہے، اس لیے اس وقت احکامِ شرع کا مکلّف قرار دیا جاتا ہے، جبکہ اس سے پہلے بلوغ کو نہ پہنچا ہو۔

فی العلائیة: ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسهم والا فیکره.

وفی الشامیة تحته: (قوله ویحرم الخ) ... والمراد بالحرمة کراهة التحریم... والا فیکره ای تنزیها. تأمل. (ردالمحتار، کوئٹہ، ج:۱،ص:۴۸۶)

وفی التحریر المختار: (قول الشارح والا فیکره) ای حیث لم یبالوا بمراعاة حق المسجد من مسح نخامة او تفل فی المسجد والا فاذا کانوا ممیزین ویعظمون المساجد بتعلم من ولیهم فلا کراهة فی دخولهم اهـ سندی. (التحریر المختار، کوئٹہ، ج:۱،ص:۸۶)

مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق جن بچوں کو مسجد میں لاسکتے ہیں یعنی لانا جائز ہے، ان کو جماعت میں کہاں کھڑا کرنا چاہیے؟ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

نابالغ بچوں کے بارے میں اصل حکم یہ ہے، کہ اگر صرف ایک ہی نابالغ بچہ ہو، تو اس کو بالغوں، مردوں کے ساتھ ان کی صف ہی میں کھڑا کیا جائے، اور اس میں کوئی کراہت نہیں ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے:

عن انس بن مالك ان جدته مليكة دعت رسول الله صلى الله عليه وسلم لطعام صنعته له، فاكل منه، ثم قال: قوموا فلا صلى لكم، قال انس: فقمت الى حصير لنا قد اسود من طول مالبس، فنضحته بماء فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم وصففت انا واليتيم وراء ه والعجوز من ورائنا، فصلّى لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم ركعتين ثم انصرف. (صحیح بخاری، ج:۱،ص:۵۵)

”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ ان کی نانی (یا راویٔ حدیث اسحٰق بن عبداللہ بن ابی طلحہ کی دادی) ملیکہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کو اس کھانے پر بلایا، جو انھوں نے آپ کے لیے تیار کیا تھا۔ آپ نے اس میں سے تناول فرمایا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا: چلو اٹھو! میں تمھیں نماز پڑھا دوں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ میں ہماری اس چٹائی کی طرف اٹھا، جو کثرتِ استعمال کی وجہ سے سیاہ ہو چکی تھی، میں نے (اس کو نرم کرنے کے لیے) اس پر پانی چھڑکا (یا اس کے میل کو دور کرنے کے لیے اس پر پانی بہایا) پس رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے، میں نے اور یتیم (ضمیرہ بن ابی ضمیرہ) نے آپ کے پیچھے صف بنائی اور بڑی بی نے ہمارے پیچھے صف بنائی، رسول اللہ ﷺ نے ہم کو دو رکعت پڑھائی، پھر آپ نے سلام پھیرا (یا اپنے دولت کدہ پر تشریف لے گئے)۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ حدیثِ مذکور سے متعلق استنباطِ احکام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وفيه قيام الطفل مع الرجال فى صف واحد. (عمدۃ القاری، ج:۴،ص:۱۱۲، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

”اس حدیث میں بچے کا مردوں کے ساتھ ایک صف میں کھڑے ہونے کا ثبوت ہے“۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی الفاظ کے قدرے فرق کے ساتھ یہی بات فوائدِ حدیث بیان کرتے ہوئے تحریر فرمائی ہے۔ (فتح الباری، ج:۱،ص:۵۸۵، مکتبہ ابن تیمیہ)

علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ولم ار صريحا حكم ما اذا صلى ومعه رجل وصبى وان كان داخلا تحت

قولہ: (ای قول صاحب الکنز الامام حافظ الدین النسفی) والاثنان خلفه، وظاهر حدیث انس انه یسوی بین الرجل والصبی ویکونان خلفه، فانه قال: فصففت انا والیتیم وراءه والعجوز من ورائنا، ویقتضی ایضاً ان الصبی الواحد لایکون منفردا عن صف الرجال؛ بل یدخل فی صفهم. (البحرالرائق، ج:۱،ص:۳۵۳)

”جب کوئی آدمی نماز پڑھے اوراسکے ساتھ (جماعت میں) ایک مرداورایک بچہ ہو،تو (بچہ کہاں کھڑاہو) اسکاحکم صراحتاً میں نے کہیں نہیں دیکھا،اگرچہ یہ صورت ماتن کے قول: والاثنان خلفه یعنی”دوآدمی ہوں،توامام کے پیچھے کھڑے رہیں“میں داخل ہے۔حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ بچے اورمرد میں یکسانیت اور برابری ہے اوروہ دونوں امام کے پیچھے کھڑے ہوں گے،اس لیے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کہ میں نے اوریتیم نے آپ کے پیچھے صف بنائی،اور بڑی بی نے ہمارے پیچھے صف بنائی، نیز یہ روایت تقاضا کرتی ہے کہ ایک بچہ مردوں کی صف سے الگ کھڑا نہیں ہوگا؛ بلکہ مردوں کی صف میں داخل ہوجائیگا“۔

اوراگرنابالغ لڑکے ایک سے زیادہ ہوں،توان کی الگ صف مردوں کی صف کے پیچھے ہونا چاہیے۔اور یہ حکم بطورسنت یااستحباب ہے،بطوروجوب نہیں۔”سنن ابی داوٴد“میں ہے:

قال ابومالک الاشعری: الا احدّثکم بصلوة النبی صلی الله علیه وسلم قال: فاقام الصلاة، فصف الرجال وصفّ الغلمان خلفهم، ثم صلّی بهم، فذکر صلاته، ثم قال: هکذا صلوة قال عبدالاعلی: لا احسبه الا قال: امتی. (سنن ابی داوٴد،ج:۱،ص:۹۸،۹۹)

”حضرت ابومالک اشعری رضی اللہ عنہ نے (ایک مرتبہ لوگوں سے) فرمایا کہ کیا میں تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز (کا طریقہ) بیان نہ کروں؟ (سنو! میں تمہارے سامنے آپ کی نماز کا طریقہ بیان کرتاہوں) پھر بیان کیا کہ آپ نے نماز قائم فرمائی،توپہلے آپ نے مردوں کی صفیں بنائیں،ان کے پیچھے بچوں کی صفیں بنائیں، پھرآپ نے ان کونماز پڑھائی۔ابومالک رضی اللہ عنہ نے آپ کی نماز کا طریقہ ذکر کیا، پھررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کی نماز کا یہی طریقہ ہے۔“

”الدرالمختار“میں ہے:

ویصف الرجال ثم الصبیان، ظاهره تعدّدهم، فلو واحدا دخل الصف.

(الدرالمختار،مع ردالمحتار،ج:۱،ص:۴۲۲،کوئٹہ)

’’مردوں کی صف بنائی جائے، پھر بچوں کی صف بنائی جائے۔ ’’صبیان‘‘ (بچوں) کا ظاہر بتلا رہا ہے کہ وہ متعدد ہوں (یعنی مردوں کے پیچھے بچوں کی مستقل صف بنانے کا حکم اس وقت ہے، جب بچے متعدد ہوں) لیکن اگر بچہ ایک ہی ہو، تو وہ مردوں کی صف میں کھڑا ہوگا۔‘‘

’غنیۃ المستملی‘ اور ’انوار المحمود علی سنن ابی داود‘ میں ہے:

ثم الترتیب بین الرجال والصبیان سنة، لا فرض، هو الصحیح. (غنیۃ المستملی ص:۴۸۵، انوارالمحمود، ج:۱،ص:۲۴۵)

’’پھر مردوں اور بچوں (کی صفوں) میں ترتیب سنت ہے، فرض نہیں ہے، یہی مفتی بہ قول ہے۔‘‘

جماعت میں ایک سے زائد بچے ہونے کی صورت میں بچوں کی صف کو مردوں کی صف کے پیچھے بنانے کا یہ حکم اس وقت ہے، جبکہ مسجد میں آنے والے بچے باشعور ہونے کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ اور سلیقہ مند ہوں، مسجد میں شرارتیں نہ کریں، شور نہ مچائیں، اور احترامِ مسجد کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموشی سے نماز ادا کریں؛ لیکن اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہو، اور ان کی علیحدہ صف بنانے میں نماز کے اندر شرارتیں کرنے اور اپنی نماز کو باطل کرنے یا ان کے کسی طرزِ عمل اور شرارت سے مردوں کی نماز باطل ہوجانے کا قوی اندیشہ ہو، تو پھر ان کی الگ صف نہ بنائی جائے؛ بلکہ ان کو منتشر اور متفرق طور پر مردوں کی صفوں میں کھڑا کرنا چاہیے، نیز بچوں کو مردوں سے علیحدہ کھڑا کرنے میں اجتماعِ عظیم اور مجمع کثیر کی بنا پر بچوں کے گم ہوجانے یا اغوا ہونے یا اور کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ ہو، تو بچوں کو اپنے ساتھ مردوں کی صف میں متفرق طور پر کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

آج کل عامۃً دو یا زائد لڑکے جماعت میں یکجا جمع ہونے سے دھکم پیل شروع کردیتے ہیں، خوب اُدھم چوکڑی مچاتے ہیں، اور اس طرح شرارتیں کرکے اپنی نماز خراب و باطل کرتے ہیں؛ بلکہ بسا اوقات بالغین کی نماز میں خلل پیدا کرتے ہیں، اس لیے جن مساجد میں یہ صورتِ حال ہو، وہاں مناسب یہ ہے، کہ بچوں کی علیحدہ صف بنانے کی بجائے ان کو ان کے سرپرستان وغیرہ مردوں کی صف میں اپنے برابر کھڑا کرلیا کریں، تاکہ وہ نماز میں کوئی شرارت کرکے اپنی یا دوسروں کی نماز برباد نہ کریں۔ ایسی صورت میں مردوں کی صفوں میں ان کے کھڑے ہونے سے مردوں کی نماز میں کوئی کراہت نہ آئے گی، خواہ پہلی ہی صف میں کیوں نہ ہو؟ البتہ بہتر ہوگا کہ امام کے بالکل پیچھے یا قریب میں کھڑا نہ کیا جائے، کیونکہ حدث وغیرہ کی صورت میں استخلاف کی

ضرورت پیش آسکتی ہے جس میں بالغ ہی کی ضرورت پڑے گی، نیز سہو کی صورت میں اگر امام کو تنبیہ کرنے کی ضرورت پیش آجائے، تو بچے کے مقابلے میں بالغ یہ کام احسن طریقے سے انجام دے سکے۔ اور یہ اس وقت آسانی سے ہوسکتا ہے، جبکہ امام کے قریب میں بالغ لوگ کھڑے ہوں۔ علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ رحمتی کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

ربما يتعين فى زماننا ادخال الصبيان فى صفوف الرجال، لان المعهود منهم اذا اجتمع صبيّانِ فاكثر، تبطل صلاة بعضهم ببعض، وربما تعدى ضررهم الى افساد صلاة الرجال. انتهى. (التحریر المختار، ج:۱،ص:۷۳، کوئٹہ)

''بسا اوقات ہمارے زمانے میں بچوں کو مردوں کی صفوں میں داخل کرنا (کھڑا کرنا) متعین ہوتا ہے، اس لیے کہ بچوں سے معہود ومعتاد یہ ہے کہ جب دو بچے یا اس سے زیادہ اکٹھے ہوں، تو ایک کی (شرارت کی) وجہ سے دوسرے کی نماز (بھی) باطل ہوجاتی ہے۔ اور بسا اوقات ان کا ضرر مردوں کی نماز فاسد کرنے تک متعدی ہوتا ہے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے:

قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم: ليلينى منكم اولوا الاحلام والنّهى ثم الذين يلونهم (ثلاثا) (صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف الخ، ج:۱،ص:۱۸۱)

''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چاہیے کہ تم میں سے بالغ اور عاقل لوگ میرے قریب کھڑے ہوں، پھر جو ان کے قریب ہوں (یعنی عقل یا بلوغ کے اعتبار سے ان سے کم درجہ ہوں جیسے مراہقین)''

علامہ ابی شارحِ مسلم فرماتے ہیں:

وخص اولوا الاحلام بالتقديم، لانه قد يحتاج الى استخلافهم، ولانهم يتفطنون لتنبيه الامام فى السهو على مالا يتفطن اليه غيرهم. (شرح الابى والسنوسى على صحيح مسلم ج:۲،ص:۳۲۵)

''امام کے قریب کھڑا کرنے میں بالغوں کو خاص کیا گیا، اس لیے کہ کبھی ان کو نائب بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور اس لیے بھی کہ سہو کی صورت میں امام کو آگاہ کرنے کو جیسا وہ سمجھتے ہیں، دوسرے نہیں سمجھتے ہیں۔''

اب ذیل میں ہمارے اکابر کے اس سلسلہ کے چند فتاویٰ پیش کیے جارہے ہیں:

فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ المعروف بہ ''احسن الفتاویٰ'' میں ہے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں، کہ نابالغ لڑکے بالغین کے ساتھ نماز میں ایک صف میں کھڑے ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ اور کیا وہ نابالغ لڑکے جو سمجھدار ہوں، یعنی اوقاتِ نماز، تعدادِ رکعات، کیفیاتِ اداءِ نماز وغیرہ جانتے ہوں، تو ان کا حکم الگ ہے یا یہ کہ سب کے لیے ایک حکم ہے؟ نیز یہ کہ صفِ اول، ثانی اور ثالث میں بھی کوئی فرق ہے یا سب صفوں کا ایک ہی حکم ہے؟ بینوا و تؤجروا .

الجواب باسم ملھم الصواب:

اگر صرف ایک ہی نابالغ لڑکا ہو، تو اس کو بالغوں کے ساتھ ہی کھڑا کیا جائے۔ اگر نابالغ لڑکے زیادہ ہوں، تو ان کو پیچھے کھڑا کرنا مستحب ہے، واجب نہیں، مگر اس زمانہ میں لڑکوں کو مردوں کی صفوف ہی میں کھڑا کرنا چاہیے، کیونکہ دو یا زیادہ لڑکے ایک جگہ جمع ہونے سے اپنی نماز خراب کرتے ہیں؟ بلکہ بالغین کی نماز میں بھی خلل پیدا کرتے ہیں۔ قال العلامة الرافعی رحمۂ اللّٰه تعالٰی ”قوله ذکره فی البحر بحثا“ قال الرحمتی: ربما یتعین فی زماننا ادخال الصبیان فی صفوف الرجال، لان المعهود منهم اذا اجتمع صبیّان فاکثر تبطل صلاة بعضهم ببعض، وربما تعدی ضررهم الی افساد صلوة الرجال. انتهی (التحریر المختار، ج:۱،ص:۷۳)

چونکہ یہ قول مطلق ہے، لہٰذا صفِ اوّل، ثانی اور ثالث میں کوئی فرق نہیں۔ یہ حکم ان بچوں سے متعلق ہے، جو نماز اور وضو وغیرہ کی تمیز رکھتے ہوں، زیادہ چھوٹے بچوں کو مردوں کی صف میں کھڑا کرنا مکروہ ہے؛ بلکہ مسجد میں لانا ہی جائز نہیں۔ فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (احسن الفتاویٰ، ج:۳،ص:۲۸۰)

حکیم العصر حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۂ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''جو بچے بالکل کم عمر ہوں، ان کو تو مسجد میں لانا ہی جائز نہیں۔ نابالغ بچوں کے بارے میں اصل حکم تو یہی ہے، کہ ان کی الگ صف بالغ مردوں کی صف سے پیچھے ہو، لیکن آج کل بچے جمع ہوکر زیادہ ادھم مچاتے ہیں، اس لیے مناسب یہی ہے کہ بچوں کو ان کے اعزہ اپنے برابر کھڑا کرلیا کریں۔'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل، ج:۲،ص:۲۲۲)

ایک اور استفتاء کے جواب میں حضرت موصوف رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''اگر بچہ ایک ہو، تو اس کو بالغ مردوں کی صف میں ہی کھڑا کیا جائے۔ اور اگر بچے زیادہ ہوں، تو ان کی الگ صف بالغ مردوں سے پیچھے ہونی چاہیے۔ اور یہ حکم بطور وجوب نہیں، بطور

استحباب ہے، تاہم اگر بچے اکٹھے ہوکر نماز میں گڑبڑ کرتے ہوں، یا بڑا مجمع ہونے کی وجہ سے ان کے گم ہوجانے کا اندیشہ ہو، تو ان کو بڑوں کی صف میں کھڑا کرنا چاہیے، تاکہ ان کی وجہ سے بڑوں کی نماز میں خلل نہ آئے۔ اور یہ حکم ان بچوں کا ہے، جو نماز اور وضو کی تمیز رکھتے ہوں، ورنہ زیادہ چھوٹی عمر کے بچوں کو مسجد میں لانا جائز نہیں۔'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل، ج:۲، ص:۲۲۲)

اب ایشیاء کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے صادر ہونے والا فتویٰ مع استفتاء ملاحظہ فرمائیے، جس میں مذکورہ دونوں اکابر کے فتاویٰ کی تصویب موجود ہے:

استفتاء:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت اقدس قبلہ مفتی صاحب دامت برکاتہم دارالعلوم دیوبند

کیا فرماتے ہیں علماءِ عظام ومفتیان کرام مسائل ذیل میں:

(۱) ہماری مسجد لندن شہر کی ایک بڑی مسجد ہے، جس میں جمعہ کا مجمع تقریباً ۱۳۰۰ سے ۱۵۰۰ مصلیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ حنفی مسلک کی مسجد ہے، لیکن شہر کی مسجد ہونے کی وجہ سے مختلف ممالک کے حضرات مسجد میں آتے ہیں نماز کا فریضہ انجام دینے کے لیے۔ ممالکِ عربیہ، پاکستان، ہندوستان، افریقہ وغیرہ کے حضرات، جو مختلف مسلک کے ہیں، چاروں مذاہب کے علاوہ غیر مقلد حضرات بھی ہوتے ہیں۔ عرصۂ دراز سے یہ مسئلہ یہاں محل نزاع ہے (جھگڑے وفساد کا سبب بنا ہوا ہے) نابالغ بچوں کو جو نماز، وضو وغیرہ کا علم رکھتے ہیں، ان کو بالغوں کی صف میں کھڑا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ کئی سالوں سے مسجد کا امام احسن الفتاویٰ جلد۳، آپ کے مسائل اور ان کا حل جلد۲، شیخ لدھیانوی رحمہ اللہ کا حوالہ دے کر اس بات پر اصرار کرتا ہے، کہ بچوں کو اپنے والد کے ساتھ کھڑے ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں، تاکہ فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو، اور بچوں کی شرارت بھی نہ ہو، چونکہ جب بھی بچوں کو اپنے والد سے علیحدہ کرنے کی بات کی جاتی ہے، تو فتنہ وفساد ہوتا ہے، کئی دفعہ تو گالی گلوچ اور مار پیٹ کی بھی نوبت آجاتی ہے۔ امام صاحب کا کہنا ہے کہ ایک مستحب پر عمل کروانے کے لیے اتنا فساد کسی بھی صورت میں صحیح نہیں ہے؛ بلکہ حضرت مفتی عبدالرشید (رشید احمد) صاحب رحمہ اللہ اور مولانا یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ کے فتاویٰ پر عمل کرلیا جائے، جن کی فوٹو کاپیاں ارسال کررہا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے امام صاحب کا یہ عمل شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟

(۲) مسجد کے ایک ٹرسٹی جن کو اس مسئلہ پر اعتراض ہے، اور وہ ان علمائے کرام کے فتاویٰ کو

ماننے کے لیے تیار نہیں ہے (کیونکہ یہ دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ نہیں ہیں) حالانکہ ہمارے امام صاحب کا کہنا ہے کہ یہ اکابرین علماءِ دیوبند میں سے ہیں، کیا اس ٹرسٹی صاحب کا یہ رویہ جو عالم نہیں ہیں، صحیح ہے یا نہیں؟

فقط حد ادب، محتاج دعا

موسیٰ جی حریف، خادم مسجد، صدر مسجد عمر، لندن (انگلینڈ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجواب و باللہ العصمة و التوفيق.

حامدا و مصليا و مسلما.

(۱) امام صاحب کا قول و عمل مطابق شریعت اور درست ہے۔

(۲) یہ تو صحیح ہے، کہ احسن الفتاویٰ اور آپ کے مسائل سے نقل کردہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے صادر ہوئے فتاویٰ نہیں، مگر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب شہید لدھیانوی رحمهما الله تعالیٰ رحمة واسعة دونوں ہی بزرگ قریبی اکابر علماءِ دیوبند اور معتمد علیہ اہلِ فتویٰ میں سے ہیں۔ مسئلہ مذکورہ فی السؤال سے متعلق جو کچھ صراحت ان حضرات رحمہما اللہ نے اپنی اپنی کتابوں میں کی ہے، وہ ہمارے نزدیک درست ہے۔ فقط۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

العبد احقر محمود بلند شہری غفرلہٗ

الجواب صحیح	دارالعلوم دیوبند
حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ	۱۴۲۷/۲/۱۶ھ
کفیل الرحمٰن	یوم الجمعہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

اب مفتی بہ قول یہ ہے کہ بچوں کو پیچھے کھڑے نہ کریں، ورنہ وہ بہت شرارت کرتے ہیں، لہٰذا ان کو صفوں میں دائیں بائیں کھڑا کیا جائے، تاکہ وہ شرارت کرکے نماز خراب نہ کریں۔ علامہ رافعی نے یہ فتویٰ دیا ہے۔ (انعام الباری دروس بخاری شریف، ج:۳، ص:۵۴۹)

دارالعلوم کراچی کے نائب مفتی حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف صاحب سکھروی دامت برکاتہم کا اس سلسلہ کا مفصل فتویٰ فقہی رسائل، ج:۱، ص: ۲۱۵ تا ۲۲۴ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم وعلمه اتم و احکم.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت اقدس قبلہ مفتی صاحب دامت برکاتہم - دارالعلوم دیوبند

۱ کیا فرماتے ہیں علمائے عظام ومفتیان کرام مسائل ذیل میں، ہماری مسجد لندن شہر کی ایک بڑی مسجد ہے جس میں جمعہ کا مجمع تقریباً ۳۰۰۰ سے ۳۵۰۰ مصلیوں پر مشتمل ہوتا ہے، حنفی مسلک کی مسجد ہے۔ لیکن شہر کی مسجد ہونے کی وجہ سے مختلف ممالک کے حضرات مسجد میں آتے ہیں۔ نماز کا فریضہ انجام دینے کے لئے۔ ممالک عربیہ۔ پاکستان، ہندوستان، افریقہ وغیرہ کے حضرات جو مختلف مسلک کے ہیں، چاروں مذاہب کے علاوہ غیر مقلد حضرات بھی ہوتے ہیں، عرصۂ دراز سے یہ مسئلہ یہاں محل نزاع ہیں۔ (جھگڑے وفساد کا سبب بنا ہوا ہے) نابالغ بچوں کو۔ جو نماز۔ وضو وغیرہ کا علم رکھتے ہیں انکو بالغوں کی صف میں کھڑا کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ کئی سالوں سے مسجد کا امام۔ احسن الفتاویٰ جلد ۳ اپکے مسائل اور انکا حل جلد ۲ شیخ لدھیانوی کا حوالہ دیکر اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ بچوں کو اپنے والد کے ساتھ کھڑے ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں تاکہ فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو اور بچوں کی شرارت بھی نہ ہو چونکہ جب بھی بچوں کو اپنے والد سے علیحدہ کرنے کی بات کی جاتی ہے تو فتنہ وفساد ہوتا ہے کئی دفع تو گالی گلوچ اور مارپیٹ کی بھی نوبت آجاتی ہے۔ امام صاحب کا کہنا ہے کہ ایک مستحب پر عمل کروانے کے لئے اتنا فساد کسی بھی صورت میں صحیح نہیں ہے۔ بلکہ حضرت مفتی عبدالرشید صاحبؒ اور مولانا یوسف لدھیانویؒ کے فتاویٰ پر عمل کرلیا جائے کہ جنکی فوٹو کاپیاں ارسال کررہا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے امام صاحب کا یہ عمل شریعت کے مطابق ہے یا نہیں

۲ مسجد کے ایک ٹرسٹی جنکو اس مسئلہ پر اعتراض ہے اور وہ ان علمائے کرام کے فتاویٰ کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے (کیونکہ یہ دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ نہیں ہیں) حالانکہ ہمارے امام صاحب کا کہنا ہے کہ یہ اکابرین علماء دیوبند میں سے ہیں کیا اس ٹرسٹی صاحب کا یہ رویہ جو عالم نہیں ہیں صحیح ہے یا نہیں؟

فقط مع ادب محتاج دعا موسیٰ جی حریف، خادم مسجد، صدر مسجد عمر لندن (انگلینڈ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۱۹۶/ج

الجواب وباللہ العصمۃ والتوفیق

حامداً ومصلیاً ومسلماً (۱) امام صاحب کا قول وعمل مطابق شریعت اور درست ہے (۲) یہ تو صحیح ہے کہ احسن الفتاویٰ اور آپ کے مسائل سے نقل کردہ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے صادر ہونے فتاویٰ نہیں مگر حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد یوسف صاحب شہید لدھیانوی رحمہما اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ دونوں ہی بزرگ قریبی اکابر علماء دیوبند اور معتمد علیہ اہل فتویٰ میں سے ہیں، مسئلہ مذکورہ فی السوال سے متعلق جو کچھ صراحت ان حضرات رحمہما اللہ نے اپنی اپنی کتابوں میں کی ہے وہ ہمارے نزدیک درست ہے فقط

واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

حسن محمود بلند شہری غفرلہ

دارالعلوم دیوبند

۱۶/۲/۱۴۲۷ھ

یوم الجمعہ

الجواب صحیح
[illegible]

[illegible]

کیا ۱۸۵۷ء کی جدوجہد ''پہلی'' جنگ آزادی تھی؟

از: مولانا محمد ولی رحمانی صاحب
سجادہ نشین خانقاہ رحمانی، مونگیر (بہار)

مرکزی حکومت نے یہ مان لیا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے پہلی مسلح جدوجہد ۱۸۵۷ء میں ہوئی تھی، اس لئے پہلی جنگ آزادی کی ڈیڑھ سوسالہ تقریبات منانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس مد میں قابل لحاظ رقم خاص کی گئی ہے، سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر پہلی جنگ آزادی کی ڈیڑھ سوسالہ یادگار تقریبات کا سلسلہ چل پڑا ہے، ان تقریبات میں کی جانیوالی تقریروں سے یہی تأثر پیدا ہوتا ہے کہ ملک کی پہلی جنگ آزادی کی مسلح کوشش ۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے شروع اور دہلی پر ختم ہوئی، جسکا پورے ملک پر اثر پڑا۔ جب کوئی بات چل پڑتی ہے اور اسے حکومت اور میڈیا کی پشت پناہی مل جاتی ہے تو حقیقت پردہ میں چلی جاتی ہے اور ''غلط'' لوگوں کے ذہنوں میں حقیقت بن جاتا ہے۔ ایک واقعہ سنیے!

۱۰ رمئی ۲۰۰۷ء کو پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کی یادگار تقریب منائی جارہی تھی، اس تاریخی موقعہ پر صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام، وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ، مسز سونیا گاندھی- چیرمین یو پی اے، حزب مخالف کے سربراہ لال کرشن اڈوانی، مرکزی وزراء، لوک سبھا کے اسپیکر سومناتھ چٹرجی، ڈپٹی اسپیکر چرنجیت سنگھ اٹوال، ڈپٹی چیرمین راجیہ سبھا کے رحمان خان اور تقریباً تمام ارکان پارلیمنٹ سنٹرل ہال میں موجود تھے، مسٹر بھیروں سنگھ شیخاوت نائب صدر جمہوریہ اور راجیہ سبھا کے چیرمین کی تقریر ہورہی تھی، اور اس سے یہی تأثر ابھر رہا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگ آزادی ہوئی۔ انکی تقریر کے دوران ڈپٹی اسپیکر مسٹر چرنجیت سنگھ اٹوال نے مداخلت کی، اور کہا کہ ''۱۸۵۷ء سے پہلے ۱۸۴۵ء میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان جنگ ہوئی تھی، ان تقریبات میں اس تاریخی واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔'' اکالی دل کے مسٹر رتن سنگھ اور مسٹر ویریندر سنگھ نے انکی بھرپور تائید کی، اس مداخلت پر صدر جمہوریہ

اور وزیر اعظم سمیت پورا ہاؤس سناٹے میں آگیا، یہ وہ مرحلہ تھا جہاں نائب صدر جمہوریہ بھیروں سنگھ شیخاوت نہ تردید کر سکتے تھے نہ تائید۔

مسٹر چرنجیت سنگھ اٹوال ڈپٹی اسپیکر لوک سبھا نے سچائی کی ایک روشنی جلادی کہ آزادی کی مسلح جدوجہد ۱۸۵۷ء سے پہلے شروع ہو چکی تھی، وہ سکھ ہیں انہیں کم از کم اپنی تاریخ یاد ہے، انہوں نے اپنے علم کے مطابق بات کہدی، افسوس ہے کہ اس پڑھے لکھے بھرے پورے ہاؤس میں ایک تاریخ داں ایسا نہ تھا جو اس غلط تاریخ سازی کا سمت قبلہ درست کرتا، اور چند جملے کہہ جاتا۔ ہوسکتا ہے بعض دوسرے تاریخ داں بھی یہی مانتے ہوں کہ میرٹھ سے لے کر دہلی تک کی ۱۸۵۷ء میں کی گئی جدوجہد آزادی پہلی مسلح جنگ آزادی تھی، میرے علم میں سب سے پہلے یہ بات مسٹر ساورکر نے کہی تھی اور اس جنگ میں مسلمانوں کے رول کی تعریف کی تھی۔

سچائی یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو پہلی مسلح جنگ آزادی قرار دینا صحیح نہیں ہے، ''یہ تاریخ کی سیاسی تصنیف'' تو کہی جاسکتی ہے، تاریخی حقیقت سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہے، انگریزوں سے باقاعدہ منظّم جنگ علی وردی خاں نے بنگال میں ۱۷۵۴ء میں کی تھی، بعد میں اور بھی قابل ذکر تاریخ ساز جنگیں انگریزوں سے لڑی گئیں، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی بھی میرٹھ سے نہیں کلکتہ سے شروع ہوئی تھی پھر میرٹھ پہونچی، یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج سے سب سے بڑی آخری منظّم جنگ آزادی تھی۔

معتبر تاریخی کتابوں میں جدوجہد آزادی اور انگریزوں کو بھگانے کی مسلح جدوجہد کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ جسے صرف اسلئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس جدوجہد کی قیادت مسلمان یا سکھ کررہے تھے۔ انگریزوں کے خلاف ملک کے مختلف حصوں میں بار بار مسلح جدوجہد کی گئی۔ ان مسلح کوششوں کا اثر تدریجاً پورے ملک پر پڑا، اور انگریزوں کو بحیثیت حاکم ملک سے نکالنے کا مزاج بنتا گیا۔ یہ کوششیں اسلئے کامیاب نہیں ہوسکیں۔ کہ پورے ملک میں جذبہ آزادی بیدار نہیں ہوا تھا۔ انگریز پلاننگ کے ساتھ اپنا دائرہ حکومت بڑھا رہے تھے، اور آزادی کے لئے جان دینے والے پورے ملک میں منظّم اور متحد نہیں تھے اور نوابوں اور راجاؤں کا دربار انگریزوں کی سازشوں کے گھیرے میں آچکا تھا۔

کسی بھی جدوجہد کیلئے پہلے افراد کی ذہن سازی ضروری ہے۔ اور یہ کام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (ولادت ۱۷۰۳ء وفات ۱۷۶۲ء) نے ۱۷۳۱ء میں باقاعدہ شروع کیا۔

حضرت شاہ صاحب کی تحریریں محفوظ ہیں۔ آزادی ہند کیلئے انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو خط بھی لکھا۔ وہ مدرسہ رحیمیہ مہندیان میں اور اپنے سلسلہ درس قرآن میں آزادی کیلئے افراد سازی کا کام کرتے رہے۔ حضرت شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والے شاگرد اور مرید برما سے لیکر عرب ممالک اور افریقہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ اندرون ملک علماء کرام میں ''آزادی کا حوصلہ'' بلند ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزوں نے عام ہندوستانیوں کے علاوہ کم از کم انیس (۱۹) ہزار علماء کو شہید کیا (بعض مورخین نے شہید علماء کی تعداد (۵۲) باون ہزار لکھی ہے)۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے بعد ان کی درسگاہ کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے آباد رکھا۔ وہ درس وتدریس کے ساتھ وطن دوستی اور انگریز دشمنی کا مزاج بھی بناتے رہے، انگریزی حکومت کے خلاف انکا مشہور فتویٰ جہاد تاریخ اور فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ اس فتویٰ کی مسجدوں کے ذریعہ بڑے پیمانے پر اشاعت ہوئی اور انگریزی حکومت کی غلط کاری اور ملک پر اسکے نقصان دہ اثرات عوام پر واضح ہوئے۔ ۱۷۳۱ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک ایک سو چھبیس (۱۲۶) سال کا وقفہ ہے اس مدت اور اس میں کی گئی فکری اور عملی جدوجہد آزادی تاریخ کا حصہ نہ بنتی تو سچی بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا انقلابی اقدام نہیں ہوتا۔

علماء کرام نے ہر جگہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اس پیغام کا نوٹس لیا۔ اور ۱۷۳۵ء میں علماء صادق پور نے جدوجہد شروع کی، ان علماء کے اثرات صرف بہار پر نہیں بلکہ پورے ملک پر تھے، جن سے کام لیا گیا، تاریخ کی کتابوں میں اسے ''وہابی موومنٹ'' سے یاد کیا جاتا ہے، علماء صادق پور نے عوام وخواص میں آزادی کی روح پھونکنے میں بڑی مدد دی، علماء صادق پور (پٹنہ) کی یہ جدوجہد سو سال تک جاری رہی، جب ۱۸۳۵ء میں حضرت مولانا عبدالرحیم صادق پوریؒ کو گرفتار کرکے کالا پانی (جزائر انڈمان) بھیجا گیا، انکے مکانات اور قبرستان پر انگریزوں نے قبضہ کیا اور انہیں مٹا کر میونسپلٹی اور دوسرے دفاتر بنادیئے، تو یہ مرکز جدوجہد کمزور پڑگیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے زیر اثر علماء نے پورے ملک میں آزادی کی جدوجہد شروع کردی، یہ تاریخ ہند کا گراں قدر حصہ ہے۔

انگریزوں نے اتر ہندوستان میں کلکتہ کو اپنا مرکز بنایا۔ تاکہ سمندری راستہ سے انہیں مدد ملتی رہے اور دہلی سے دور رہ کر تدریجاً دہلی اور پورے ملک پر قبضہ کیا جائے۔ کلکتہ کا ڈائمنڈ ہاربر اور فورٹ ولیم انگریزوں کا مرکز تھا۔ سراج الدولہ کے نانا علی وردی خاں نے خطرہ کو محسوس کرلیا تھا، اور ۱۷۵۴ء میں فورٹ ولیم پر حملہ کرکے انگریزوں کو بھگادیا، انگریز ڈائمنڈ ہاربر میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اسے پہلی منظّم اور مسلح جنگ آزادی قرار دیا جاسکتا ہے۔ علی وردی خاں اسکے بعد

زیادہ دنوں زندہ نہیں رہے ورنہ آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

علی وردی خاں کے نواسہ نواب سراج الدولہ حاکم ہوئے آزادی وطن اور انگریزوں کو ملک سے باہر کرنے کے سلسلہ میں انکا رویہ نانا جیسا تھا۔ سراج الدولہ نے حوصلہ اور ہمت کے ساتھ انگریزوں کو شکست دینا چاہا۔ مگر انکا دربار سازشوں کا اڈہ بن گیا تھا۔ اور سلطنت کی ذمہ دار شخصیتیں اپنی قیمت لگوا چکی تھیں۔ اسلئے انہیں شکست ہوئی۔ اور ۱۷۵۷ء میں برٹش فوج نے ان کے دارالسلطنت مرشد آباد میں انہیں شہید کر دیا۔

تاریخ کے صفحات میں بکسر کی جنگ (۱۷۶۴ء) کی تفصیل موجود ہے جس میں مغل فرماں روا شاہ عالم، نواب اودھ شجاع الدولہ اور میر قاسم کی فوج مشترکہ طور پر شریک تھے۔ یہ جنگ بھی ہندوستانیوں کی شکست پر ختم ہوئی۔ میر قاسم نے مونگیر (بہار) کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔ میر قاسم کا قلعہ آج بھی موجود ہے، انگریزوں نے مونگیر میں ان سے ۱۷۶۳ء میں ٹکر لی، ڈکرانالہ پُل توڑا گیا اسکی شکستہ دیواریں اور بکھری اینٹیں آج بھی اس تاریخ کو یاد دلاتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دس بارہ برسوں سے ان کے نام پر آباد محلّہ قاسم بازار کو کرن بازار اور مغلوں کی فوج کی چھاؤنی مغل بازار کو منگل بازار کہنا شروع کیا گیا ہے!

حافظ رحمت خاں شہید نواب تھے عالم اور حافظ تھے، انہوں نے علماء اور علاقائی حکمرانوں کو یکجا کر کے انگریزوں سے جنگ کرنا چاہی۔ حافظ صاحب کا سلسہ علم حضرت شاہ ولی اللہؒ سے جُڑا ہوا ہے، حافظ رحمت خاں شہید کی سربراہی میں انگریزوں سے جو جنگ ہونی تھی اسکا رُخ انگریزوں نے نواب اودھ کی طرف پھیر دیا، اور نواب اودھ کی فوج کے ساتھ انگریزی فوج نے حافظ صاحب سے جنگ کی، یہ فیصلہ کن جنگ ۱۷۷۴ء میں ہوئی جس میں حافظ صاحب اور ان کے رفقاء (جن میں ممتاز علماء شریک تھے) کی بڑی تعداد شہید ہوگئی، اسی سلسلہ کی ایک کڑی قاضی واجد رحمۃ اللہ علیہ کا بےنفس اور مجاہدانہ کردار بھی ہے، جسکی یاد دلوں میں تازہ اور تاریخ کی نئی کتابوں میں محفوظ رہنی چاہیئے۔

۱۸۵۷ء سے بہت پہلے دکن کے فرماں روا حیدر علی (۱۷۸۲ء) اور ان کے صاحبزادہ۔ ٹیپو سلطان کے ذکر کے بغیر آزادی ہند کی کوئی تاریخ ادھوری ہوگی۔ جو مستقل انگریزوں کیلئے چیلنج بنے رہے۔ ٹیپو سلطان نے ہندوستان کے علاقائی فرمان رواؤں کو انگریزی حکومت کے خلاف منظّم کرنا چاہا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ہندوستان کے باہر بھی رابطہ قائم کیا۔ نظام حیدر آباد اور

نواب بنگالہ کو بھی خطوط لکھے اور اپنے نمائندوں کے ذریعہ آنیوالے دنوں کے خطرات اور انگریزوں کے ارادہ سے واقف کرایا، ساتھ ہی انہوں نے مشترکہ جدوجہد کی اپیل کی، مگر نوابوں کی وقتی مصلحتوں اور سرفروشی کے جذبہ کی کمی کی وجہ سے مشترکہ جدوجہد آزادی کی راہ نہیں بن سکی۔

ٹیپو سلطان نے ہمت نہیں ہاری اور وہ برٹش فوج سے پنجہ آزمائی کیلئے تیاری کرتے رہے۔ مگران کے ایک فوجی سردار کرشنا راؤ کی خودفروشی نے ٹیپو سلطان کو نقصان پہونچایا۔ اور سازشی ان کے امور سلطنت میں درآئے۔ ان کی فوج میں ہندو مسلمان شریک تھے، ٹیپو سلطان نے نامساعد حالات کو سمجھتے ہوئے ہی یہ کہا تھا کہ ’’شیر کی ایک دن کی زندگی لومڑی کے سو سال سے بہتر ہے‘‘۔ انہوں نے انگریزوں سے جنگ کی اور ۱۷۹۹ء میں میدان جنگ میں شہید ہوئے، جب انگریزی جنرل کو ان کی شہادت کا یقین ہوگیا تو جنرل بارس نے فخر کے ساتھ کہا تھا ’’اب ہندوستان ہمارا ہے‘‘۔

ٹیپو سلطان کی شہادت (۱۷۹۹ء) کے بعد اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے اور بھی چھوٹی بڑی جھڑپیں انگریزوں سے ہوئیں، مگر انگریزوں کی کامیاب حکمت عملی اسلحہ کی برتری اور نظم وضبط نے مقابلہ کرنے والے منتشر ہندوستانی حکمرانوں پر قابو پالیا۔ پھر بھی اس اٹھاون سال (۱۷۹۹ء سے ۱۸۵۷ء) میں چار کوششیں ایسی ہوئیں جنہیں بھلایا نہیں جاسکتا اور جس نے ۱۸۵۷ء کی تیاری میں مہمیز کا کام کیا۔

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ ملک کے نامور عالم دین اور مجاہد وقت تھے، ملک اور بیرون ملک ان کے لاکھوں مرید پھیلے ہوئے تھے، انکا سلسلہ بھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے ملتا ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ نے ملک کو آزاد کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ اور اپنے شاگردوں اور مریدوں اور دوسرے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیا۔ انہوں نے خاموشی سے افراد سازی کے ساتھ ہتھیار جمع کرنے کا کام کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مونگیر، بہار (جو اُس وقت بھی قانونی اور غیر قانونی اسلحہ سازی کا مرکز تھا، اور آج بھی اسکی یہ خصوصیت زندہ ہے) اور بنگالہ کا سفر کیا، اس پورے سفر میں لوگوں نے انکا والہانہ استقبال کیا اس سفر کے نتیجہ میں آزادی کی جدوجہد کو عوامی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور اسلحوں کو حاصل کرنے کی راہ ہموار ہوئی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے دست راست حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے انگریزوں سے مئی ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں جنگ کی، یہ جنگ بھی مقامی حالات کی وجہ سے ہار پر ختم ہوئی۔ اس معرکہ میں یہ دونوں حضرات اور ان

کے بہت سے رفقاء شہید ہوئے۔

۱۸۴۵ء میں انگریزوں کی جنگ سکھوں سے ہوئی، یہ جنگ پورے ہندوستان کو آزاد کرانے کے ذہن کے ساتھ نہیں ہوئی تھی بلکہ سکھوں کے علاقہ کو خودمختاری دلانے کے جذبہ سے لڑی گئی تھی، انگریزوں نے سکھوں سے مصالحت کی اور نتیجہ کے طور پر پنجاب میں سکھوں کی عملداری قائم ہوگئی۔ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے جانشین کے طور پر مہاراجہ دلیپ سنگھ کو انگریزوں نے جانشین مان لیا۔ اس طرح ۱۸۴۵ء کی جنگ اٹوال کا مقصد پورا ہوا۔ اور سکھوں کو کامیابی ملی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل ایک اور اہم جنگ ہوئی۔ یہ جنگ شیر دل خاتون بیگم حضرت محل کی سربراہی میں لڑی گئی۔ اس جنگ میں ضلع شاہ آباد (بہار) کے راجہ کنور سنگھ کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ اس جنگ میں ہندوستانی ہندو و مسلمان سپاہیوں کے ساتھ نیپالی (گورکھا) سپاہی اور عملدار شریک تھے۔ یہ گورکھے انگریزوں سے مل گئے انگریزوں نے اُن سے نیپال میں محدود عملداری کا وعدہ کیا۔ اور نیپالیوں نے بیگم حضرت محل کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جسکے نتیجہ میں ۱۸۵۶ء کی جنگ اودھ ہندوستانیوں کی شکست پر ختم ہوگئی۔ بیگم حضرت محل نے نہ صرف اپنا اسٹیٹ کھو دیا بلکہ اپنی زندگی دربدری میں گذار دی اور تاج برطانیہ کے معافی کے اعلان کے باوجود انگریزوں سے مصالحت نہیں کی۔

۱۸۵۷ء سے پہلے ۱۸۵۶ء میں ویر کنور سنگھ اور انکے بھائی امر سنگھ نے جگدیش پور (ضلع شاہ آباد۔ بہار) میں انگریزوں سے زبردست جنگ کی، اس جنگ میں گرچہ ویر کنور سنگھ کو ہار ہوئی، انکا اسٹیٹ تباہ کر دیا گیا، مگر اس جنگ کے اثرات اتر ہندوستان پر گہرے پڑے۔ جنگ آزادی میں ویر کنور سنگھ اور انکے خاندان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔

ایسے چھوٹے بڑے بہت سے چراغ آزادی ہند کی راہ میں ۱۸۵۷ء سے پہلے روشن ہوئے ان سارے حالات و واقعات کو مختصر مضمون میں سمیٹا نہیں جاسکتا، مگر یہ واقعہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پہلی جنگ آزادی نہیں تھی، بلکہ یہ آخری منظّم مسلح جدوجہد تھی، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے متعلق یہ بات بھی جانی جاتی ہے کہ یہ میرٹھ سے شروع ہوئی تھی۔ انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں نے میرٹھ میں جو کارروائی کی، اسکی ابتداء کلکتہ (دمدم اور بارک پور) سے ہوئی تھی، برٹش آرمی کے ہندو مسلمان سپاہیوں میں یہ بات عام ہوئی کہ کارتوس میں گائے کا چمڑا اور سور کی چربی کا استعمال ہوتا ہے۔ ۲۲؍جنوری ۱۸۵۷ء کو پہلے پہل اس خبر سے ہندوستانی

فوجی کلکتہ میں بھڑک اٹھے اور انہوں نے زبردست احتجاج کیا، کچھ ایسی ہی صورتحال لکھنؤ میں پیش آئی، ان تمام سپاہیوں کو غیر مسلح کرکے ملازمت سے برخواست کردیا گیا، ان میں سے کچھ سپاہی انگریز فوج کی چھاؤنیوں میں پہونچے اور حالات سنائے جنکی وجہ سے مختلف مقامات پر برٹش آرمی کے خلاف انگریزوں کی ہندوستانی فوج برافروختہ ہوگئی۔

۲۴/اپریل ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں کلکتہ جیسا واقعہ دہرایا، انگریز ذمہ داروں نے ۹/مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں ایک رجمنٹ کے ہندوستانی سپاہیوں کو دس سال کی قید بامشقت کی سزا سنادی، اس فیصلے کا اعلان بھی توہین آمیز طریقہ پر ہوا تھا، ہندوستانی سپاہیوں نے انگریز افسروں کو ہلاک کرکے ان قیدیوں کو آزاد کرایا، اور میرٹھ سے دہلی کی طرف کوچ کرگئے، یہ ۱۰/مئی ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے، میرٹھ کے ہندوستانی فوجیوں کی آمد نے دہلی کے فوجیوں میں نئے حوصلے دیئے، اور دہلی میں بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کا اعلان کردیا گیا، انگریزوں نے سکھ رجمنٹ کی مدد سے تقریباً چار ماہ تک دہلی کا محاصرہ کئے رکھا، ۱۴/ستمبر کو زبردست جنگ ہوئی، ۱۴/۱۵/ستمبر ۱۸۵۷ء کی تاریخ ہندوستان کی مسلح جدوجہد آزادی کا خونی باب ہے، آزادی ہند کے معروف مورخ ولیم ڈیلرمپل نے لکھا ہے: ''جب دہلی کا محاصرہ ختم ہوا تو بہت سے مبصروں کے مطابق باقی بچنے والے باغیوں میں آدھے ''جہادی'' تھے، جنہوں نے ۱۴/ستمبر کو برطانوی حملہ کے خلاف زبردست مزاحمت کی تھی۔''

ٹھیک انہیں تاریخوں میں حضرت ضامن شہیدؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا منیر الدینؒ اور انکے رفقاء نے شاملی کے میدان میں انگریزی فوج سے جنگ کی، ۱۴/ستمبر ۱۸۵۷ء کو حضرت ضامن شہیدؒ اور انکے بہت سے رفقاء شہید ہوگئے، اس جنگ میں ہندوستانیوں کو ہار ہوئی، دہلی کے تاریخی معرکہ اور شاملی کی جنگ کی تاریخ ایک ہی ہے، اسے اتفاق نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ ایک مشترکہ جدوجہد آزادی کی دوکڑیاں ہیں، دہلی معرکہ میں انگریز جنرل نکلسن مارا گیا، مگر آخر کار دہلی اور شاملی دونوں جگہ ہندوستانیوں کو شکست ہوئی، اور بہادر شاہ ظفر ۱۷/اکتوبر کو گرفتار کرکے رنگوں بھیج دیئے گئے۔

یہ پوری تاریخ بتاتی ہے کہ

(۱) میرٹھ میں ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی پہلی مسلح جدوجہد نہیں تھی، پہلی مسلح جدوجہد کلکتہ میں ۱۷۵۴ء میں ہوئی۔

(۲) ۱۸۵۷ء کا انقلابی اقدام میرٹھ سے نہیں کلکتہ سے شروع ہوا تھا۔

آزادئ وطن اور علمائے دیوبند

از: عادل صدیقی
دارالعلوم دیوبند

یہ مہینہ اگست کا ہے، اس میں ہم ہندوستان کی آزادی کی ساٹھویں سال گرہ منارہے ہیں، لیکن ایسے موقعوں پر جس طرح سے ہندوستان کی تاریخ آزادی ہم کو بتائی اور سنائی جاتی ہے، اس میں بہت سے قابل قدر ابواب چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ یہ قیمتی صفحات ہیں جن کو ہم قصداً پس پشت ڈال رہے ہیں اور اگر اس سلسلے کی کچھ باتیں منظر عام پر آتی بھی ہیں تو وہ گرد آلود ہوتی ہیں اور تنگ نظری کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جس کو انگریزوں نے غدر کا نام دیا ہے، ناکام ہوگئی تو ہمارے دانشوروں نے یہ ذہن بنایا کہ ابھی ہمارے پاس اس قدر طاقت نہیں کہ ہم میدان جنگ میں کامیابی حاصل کرسکیں چنانچہ میدان جنگ سے قبل اس لڑائی کو ذہنوں کے ذریعے لڑنے کی خاطر ۳۰؍مئی ۱۸۶۶ء کو دلی کے شمال میں ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر دیوبند میں اسلامی تعلیمات اور دینیات کا ایک مرکز دارالعلوم کے نام سے قایم کیا گیا۔ برطانیہ نے چوں کہ مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا، اس لئے قدرتی طور پر ان کا غصہ علمائے کرام اور مسلمانوں کے خلاف تھا اور انھوں نے ہزارہا مسلمانوں کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا۔ یہ لڑائی ہندوؤں اور مسلمانوں نے شانہ بشانہ لڑی۔ ۱۸۷۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم شیخ الہند مولانا محمود حسن نے ایک جماعت ثمرات التربیۃ کے نام سے قائم کی اس جماعت کے ذریعے ایسے نوجوان تیار کئے گئے جو برطانوی سپاہیوں سے میدان جنگ میں دودو ہاتھ کرسکیں۔ یہ تحریک تقریباً ۳۰ برس تک چلتی رہی۔ ۱۸۸۰ء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کا انتقال ہوا اور اس کے بعد یہ تحریک آگے نہ بڑھ سکی اور اس سے دست کش ہونا پڑا۔ ۱۹۰۹ء میں شیخ الہند مولانا محمود حسن نے جمعیۃ الانصار نامی جماعت قایم کی۔ مولانا عبیداللہ سندھی کو دیوبند بلایا گیا تا کہ اس نئی تنظیم کے دفتری امور کی ذمہ داری ان کے

سپرد کردی جائے۔ ۱۹۱۱ء میں دارالعلوم دیوبند میں سالانہ جلسہ ہوا جس میں پہلی بار جمعیۃ الانصار کا تعارف کرایا گیا۔ اس موقع پر غیر منقسم ہندوستان کے ۳۰ ہزار سے زیادہ متبحر علماء (ان میں باہر ملکوں کے کچھ علماء بھی شامل تھے) کے سامنے جمعیۃ نے اپنے قیام کی وجوہات اور اغراض و مقاصد بیان کئے۔ اس موقع پر ملک کو آزاد کرانے اور انگریزوں کے ذریعے ملک کے استحصال کرنے کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا۔ جمعیۃ الانصار نے اپریل ۱۹۱۱ء میں مرادآباد میں ریلی کی جس میں علی گڑھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دیوبند کے علماء اور عوام شریک ہوئے۔ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں بھی جمعیۃ نے بڑے پیمانے پر عوامی اجتماعات کئے ان اجتماعات میں میرٹھ اور شملہ کے ہزارہا افراد نے شرکت کی۔ ان اجتماعات میں عوامی شرکت کو دیکھ کر انگریزوں کی سرکار حیران و پریشان ہوگئی اور اس کے بعد انگریزوں نے ان تحریکات کے سرچشمہ یعنی دارالعلوم دیوبند کو ہی ختم کرنے کا پلان بنایا۔ شیخ الہند نے اس جماعت کے سرکردہ افراد سے کہا کہ وہ اس جماعت سے خود کو الگ کرلیں تاکہ دارالعلوم کو بچایا جاسکے۔ ۱۹۱۳ء میں جمعیۃ الانصار پر پابندی لگ گئی اور اس کے بعد مجاہدین آزادی نے دلی میں ایک نئی تنظیم بنائی جس کا نام تھا نظارۃ المعارف۔ اس میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبیداللہ سندھی پیش پیش تھے۔ اس جماعت نے ملک کو آزاد کرانے کو ہی اپنا نصب العین قرار دیا۔ دلی میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبیداللہ سندھی اور شیخ الہند خفیہ طور پر آپس میں ملاقاتیں کیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جرمنی اور برطانیہ کے درمیان پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور مجاہدین آزادی نے اپنا طریق کار بدل ڈالا۔ انھوں نے اندرون ملک آزادی سے متعلق سرگرمیوں کو برطرف کرتے ہوئے جرمنی کی مدد کرنا شروع کی۔ آزادی کے فدائیین نے اس جنگ کو ایک ایسا اچھا موقع سمجھا جبکہ برطانوی مفادات کو نقصان پہنچایا جاسکتا تھا۔ برطانوی افواج کے خلاف مسلح جنگ کا پلان بنایا گیا۔ حاجی صاحب ترنگ زئی اور مولانا سیف الرحمٰن کابلی کو فیلڈ کمانڈر بنایا گیا۔ یہ دونوں حضرات شیخ الہند کی رضا کار جماعت کے ہی آدمی تھے۔ ان کا ہیڈ کوارٹر باجور میں زِلفی کا مقام تھا۔ باجور قبائلی خودمختار علاقے بنام یاغستان کی راجدھانی تھی۔ شیخ الہند نے اپنے نمایندے مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیجا اور خود سعودی عرب کے لئے روانہ ہوگئے۔ اس طرح سے آپ نے اسلامی ملکوں کو ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں اپنا ہم نوا بنانا چاہا۔ ملک کی آزادی کے لئے پوری دنیا میں رائے عامہ کو ہموار کرنا ضروری تھا یہ کوشش ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے کئی بار کئی گئی ۱۹۱۵ء میں جب شیخ الہند نے کابل میں

جلاوطن حکومت قایم کی تو یہ پیغام دیا کہ ہندوستان کی آزادی ہندو اور مسلمان مل کر ہی حاصل کرسکتے ہیں، چنانچہ اس حکومت کا پہلا صدر راجہ مہندر پرتاپ کو بنایا گیا اور برکت اللہ بھوپالی نے پورے یوروپ میں گھوم کر ہندوستان کی آزادی کے مطالبہ کو سب کے سامنے رکھا۔

شیخ الہند ۹/اکتوبر ۱۹۱۵ء کو مکہ شریف پہنچے اور ترکی کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی، انھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف ان کو امداد دینا چاہی۔ یہی وہ طریقہ کار تھا جسے بعد میں سبھاش چندر بوس نے اپنایا اور انھوں نے بھی ٹوکیو میں رہتے ہوئے انڈین نیشنل آرمی قایم کی جس کے ایک سرکردہ رکن شاہنواز تھے اور جو آزاد ہندوستان میں وزیر زراعت بنے تھے۔ شیخ الہند کی ریشمی رومال کی تحریک تاریخی حیثیت رکھتی ہے جس کا ذکر مشہور مورخ ڈاکٹر تارا چند اور ایشوری پرشاد نے اپنی تاریخ کی کتابوں میں کیا ہے۔ اس برطانیہ مخالف تحریک میں ۲۲۲ سرکردہ علماء کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ ۲۳/صفر ۱۳۳۵ھ کو مکہ میں شیخ الہند اور ان کے رفقائے کار مولانا وحید احمد، مولانا عزیز گل، حکیم سید نصرت حسین، مولانا سید حسین احمد مدنی کو گرفتار کرلیا گیا اور ان کو براستہ قاہرہ مالٹا کی جیل میں نظر بند کرلیا گیا۔ ۲۹/ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو بذریعہ بحری جہاز ان کو مالٹا بھیجا گیا گویا کہ یہ لوگ ۲۱/فروری ۱۹۱۷ء کو بھیجے گئے اور تین سال چار ماہ جیل میں رہے یہ لوگ ۸/جون ۱۹۲۰ء کو رہا ہوکر بمبئی آئے۔ البتہ مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد میاں منصور انصاری نے اور کئی برس جیل میں گذارے۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملک کی آزادی کی خاطر ایک پلیٹ فارم پر لایا جاسکے۔

مختصراً یہ کہ ہندوستان کی تاریخ آزادی ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ خدمات سے بھری پڑی ہے تاہم جب کبھی کوئی موقع آتا ہے تو اس میں صرف ایک طبقہ کو ہی دکھایا جاتا ہے اور مسلمانوں کی خدمات کو یکسر نظر انداز کردیا جاتا ہے جس سے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فضا پر خراب اثر پڑ رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے مدارس اور اسکولوں، نیز کالجوں میں تاریخ صحیح صحیح تناظر میں عوام کے سامنے آئے تاکہ سب لوگ کندھے سے کندھا ملا کر ملک وقوم کی خدمت انجام دے سکیں۔

❁ ❁ ❁

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۹۱ | رمضان- ذی قعد ۱۴۲۸ھ مطابق اکتوبر-نومبر ۲۰۰۷ء | شمارہ: ۱۰-۱۱

نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند- ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۵ روپئے، سالانہ -/۱۵۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۸۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۲۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۲۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	بدیہیات قرآن - حکمتیں اور فائدے	مولانا محمد عارف مبارکپوری	۶
۳	دھاگے - دانوں کی مروجہ تسبیح کی شرعی حیثیت	مفتی عمر فاروق لوہاروی	۱۷
۴	دینی مدارس کا مزاج	قاری سعید الرحمٰن	۳۲
۵	تحریک مجاہدین پر ایک نظر	پروفیسر ایوب قادریؒ	۴۰
۶	محاربۂ ۱۸۵۷ء	پروفیسر خلیق نظامیؒ	۵۳
۷	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ایک مختصر جائزہ	جناب ڈاکٹر محمود حسین	۷۹
۸	۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے کچھ....	ڈاکٹر اجمل فاروقی	۸۳
۹	سری لنکا میں تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر....کیمپ	شاہ عالم گورکھپوری	۸۶
۱۰	کمیونزم کی شکست کے بعد اسلام دنیا کیلئے....	ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی	۹۳
۱۱	مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ - حیات وخدمات	سہیل اختر اڑیسہ	۱۰۱
۱۲	مولانا محمد نعیم کی امریکہ میں وفات	......	۱۱۲

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

اسلام ایک زندہ مذہب ہے۔اس کی تعلیمات کائنات انسانی کے لئے یکسر رحمت ورافت ہے۔جس کی اساس و بنیاد ایسے مضبوط ومحکم اصولوں پر قائم ہے، جن کی صداقت دن کے اجالوں کی طرح روشن وعیاں ہے۔اسلام صرف ایک سماجی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس سے بھی بلند تر عقائد واعمال پر مبنی ہے۔یہ ایک ایسا مذہب ہے جو حیات بعد الممات کی بنیادوں پر کائنات انسانی کو رشد وہدایت کی دعوت دیتا ہے۔اور معاش ومعاد دونوں کی فلاح و بہتری کا پیغام سناتا ہے۔

آخر اس سچائی سے کون ذی عقل اور ہوش مند انکار کرسکتا ہے کہ انسانیت ترقی وبلندی کی معراج پر اسی وقت رسائی حاصل کرسکتی ہے جبکہ اس کے سامنے یہ تصور یقین محکم کی حیثیت اختیار کرلے کہ ذات واحد کے سوا عالم ہست و بود میں کوئی قابل پرتش نہیں، وجود و بقا، حیات وموت، عزت وذلت، تربیت وربوبیت، پروردگاری وپالنہاری وغیرہ سب صرف اور صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اس سچائی کے منکشف ہوجانے کے بعد ایک دوسری حقیقت خود بخود نمایاں ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ جب انسان کی زندگی ایک سب سے بلند وبالاتر طاقت کے قبضہ میں ہے تو بلاشبہ اسی بلند طاقت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ انسان کو یہ ہدایت اور رہنمائی دے کہ کس راہ پر چل کر وہ انسانی دنیا میں ایک سچا انسان اور خلق خدا کے لئے صحیح معنوں میں رحمت ورأفت کا پیکر بن سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر معراجِ انسانیت کے رتبۂ عالی ومرتبۂ سعادت تک پہنچنے کیلئے کونسا راستہ سیدھا ودرست ہے؟ اس بات کو آشکارا کرنے کے لئے ارشاد فرمایا گیا: ”رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ

ثُمَّ هَدَىٰ" ہمارا رب ہی وہ ہے جس نے ہر چیز کو وجود عطا کیا پھر ہدایت ورہنمائی سے نوازا۔

اس لئے زندگی کے اعلیٰ مقاصد تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے ہم اپنی دنیوی ترقی اور معاشی سرافرازی کی جدوجہد کے ساتھ خدائے وحدہ لاشریک لہ کے بتائے ہوئے نظام حیات (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" (یقیناً اللہ کا مقرر کردہ دین اسلام ہی ہے) کی تعلیم وتحصیل سے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ غافل اور بے پروا ہوں تاکہ آنے والے دنوں میں ہمیں افسوس نہ ہو کہ

"یک لمحہ غافل بودم وصد سالہ راہم دور شد"

اس بات سے کون واقف نہیں ہے کہ ہمارے ملک ہندوستان کا نظام حکومت جمہوری ولادینی ہے (یعنی سیکولر ریاست کسی فرد کی مذہبی دینی تعلیم کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے گی) اس لئے خدائی نظام حیات سے آشنا اور بہرہ ور ہونے کے لئے من حیث القوم ہر ہر فرد پر یہ اولین فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی اگلی نسلوں کی فلاح وصلاح اور اسے خدائی نظام حیات دین اسلام سے وابستہ وپیوستہ رکھنے کے لئے مذہبی بنیادی تعلیم کا بار خود اپنے کاندھوں پر اٹھائے تاکہ کم سنی کے یہ نقوش ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے لوح قلب پر ثبت رہیں اور زندگی کے میدانوں میں رواں دواں رہتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے دین کا دامن نہ چھوٹے۔ دین سے بھی وابستگی ہمارے ملی وجود اور انسانی دنیا میں ہمارے تشخص وامتیاز کا واحد ذریعہ ہے خدانخواستہ اگر ہمارے ہاتھوں سے دین کا دامن چھوٹ گیا تو پھر صحراؤں کے ذرات کی طرح بکھر کر دنیا کے نقشہ سے بے نام ونمود ہوجائیں گے۔

گھر ترا چھوڑ کر جائیں تو کدھر جائیں گے
گھر میں گھر جائیں گے صحرا میں بکھر جائیں گے

اس دنیا میں اگر کچھ لوگوں کو مذہبی تعلیم کے نام سے الرجی ہوتی ہے تو ہونے دیجئے۔ تاریخ بارہا اس سچائی کو واضح کرچکی ہے کہ انسانیت کے باہمی تعاون واشتراک اور صحیح معنوں میں اخوت انسانی ومساوات کی نقیب ہر دور میں یہی اسلامی تعلیمات ثابت ہوئیں ہیں، اور یہی نہیں بلکہ بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جو شخص جتنا زیادہ اسلامی عدم ثقافت سے آشنا ہوتا ہے اسی قدر اس کے دل میں اپنے وطن اور وطن میں بسنے والوں کی محبت، خدمت کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں خود جنگ آزادی کی تاریخ گواہی دے رہی ہے کہ اخلاص وطن کی جدوجہد میں اسلامی علوم کے حاملین علماء حق نے جس بڑی تعداد کے ساتھ خود کو اور اپنے ماننے

والوں کو دار ورسن کے لئے پیش کیا اور باہمی تعاون واشتراک کا جو بلند کردار قرطاس عالم پر ثبت کیا مذہب سے نا آشنا زندگی اس بے لوث کردار وعمل کا مقابلہ نہیں کرسکی۔

اس دنیا میں روٹی کا مسئلہ لاریب ایک مسئلہ ہے جس سے مشرق ومغرب کی فضائیں پرشور ہیں، لیکن دینی علوم ومذہبی افکار کے بغیر اسے بھی اطمینان بخش طریقہ پر حل نہیں کیا جاسکتا۔ جو قومیں روٹی کے اس مسئلہ کو خدائی نظام معیشت سے بے نیاز ہوکر سلجھانا چاہتی ہیں وہ کس طرح کے تضاد اور کشمکش کی شکار ہیں ارباب علم وبصیرت سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

بہرحال ہم جب اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر اسلامی تعلیم کی حفاظت واشاعت ہمارا ایک عظیم مقصد ہونا چاہئے، اور اس بارے میں کتاب وسنت نے جو فرائض ہمارے اوپر عائد کئے ہیں اگر ہم انہیں انجام دینا شروع کردیں تو ہمارا مستقبل ہر خطرہ سے محفوظ ہوجائیگا۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قُوْا اَنْفُسَکم واَهلِیْکُم نارًا" اے مسلمانو تم (اعمال صالحہ کے ذریعہ) اپنے آپ کو اور (صحیح تعلیم وتربیت کے ذریعہ) اپنی اولاد کو نار جہنم سے بچاؤ۔

اس عظیم الشان فرض کی ادائیگی کی صورت یہی ہے کہ ہم اپنے بچوں کی دینی تعلیم کا اہتمام کریں۔ چشم فلک نے ایک زمانہ وہ بھی دیکھا ہے کہ ہر مسلمان کا گھر دینی تعلیم کا مدرسہ تھا، ان کی مسجدیں، دینی تعلیم کی درسگاہیں تھیں، ان کے ہر قریہ اور ہر گاؤں میں دینی مکاتب اور مدرسے قائم تھے اور وہاں کے علماء تعلیم وتربیت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ دینی تعلیم سے اس وابستگی نے انہیں دنیا کی تمام قوموں میں ممتاز وسربلند کردیا تھا۔ آج اسی احساسِ فرض کو دوبارہ زندہ وقائم کرنے کی ضرورت ہے اور بس اپنے عمل اور کردار سے انسانی دنیا کو باور کرانا ہے کہ اسلام ایک زندہ مذہب ہے۔ اور اس کے دامن سے وابستہ گروہ انسانی ایک زندہ قوم ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

❁ ❁ ❁

بدیہیات قرآن
حکمتیں اور فائدے
(۵)

از: مولانا محمد عارف مبارکپوری
شارجہ، متحدہ عرب امارات

۱۲- فرمان باری: فمن لم یجد فصیام ثلاثة أیام فی الحج و سبعة اذا رجعتم تلك عشرة كاملة (بقرہ:۱۹۶)

''پھر جس کو قربانی نہ ملے تو روزے رکھے تین حج کے دنوں میں، اور سات روزے جب لوٹو، یہ دس روزے پورے ہوئے''۔

اس آیت میں دو مقام پر بدیہیات ہیں:

مقام اوّل: تین اور سات دس ہوتے ہیں، اس کے بعد یہ کہنا کہ ''یہ دس روزے'' ایک واضح چیز کی وضاحت ہے؟

اس کے کئی جواب دیے گئے ہیں۔

۱- (و سبعة اذا رجعتم) میں جو ''واؤ'' ہے وہ جمع کی افادیت میں نص قطعی نہیں؛ بلکہ بسا اوقات ''أو'' کے معنی میں بھی آتا ہے، جیسا کہ (مثنی و ثلاث و رباع) [نساء/۳] نیز جیسا کہ جالس الحسن و ابن سیرین یعنی اِن کی یا اُن کی مجلس میں رہو۔ لہٰذا (تلك عشرة كاملة) لاکر اللہ تعالیٰ نے اس وہم کو ختم فرمادیا۔ یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔(۱)

رازی سے پہلے زمخشری نے بھی یہ جواب نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''واو کبھی کبھی اباحت کے لیے آتا ہے جیسے: جالس الحسن و ابن سیرین کہ مخاطب اگر دونوں کی مجلس میں بیٹھ جائے یا کسی ایک کی مجلس میں بیٹھے تو بھی حکم کی بجاآوری کرنے والا شمار ہوگا۔ آخری ٹکڑا لاکر اس اباحت کی نفی کردی گئی۔''(۲)

لیکن ابوحیان اس رائے سے خوش نہیں، وہ اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس میں نظر ہے؛ اس لیے کہ یہاں اباحت کا وہم نہیں ہوتا، کیوں کہ سیاق، ایجاب کا سیاق ہے، جو اباحت کے منافی ہے، تخییر (اختیار دینے) کے منافی نہیں، اس لیے کہ تخییر، واجبات میں بھی ہوجاتی ہے۔'' (۳)

یہ قول ابن عاشور نے بھی نقل کیا ہے، اور اس کو زجاج سے منسوب کرتے ہوئے، تخییر کے معنی کے منشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ معنی اگرچہ واو کی اصل کے خلاف ہے، حتیٰ کہ ابن ہشام کا خیال ہے کہ واو اس معنی میں نہیں آتا، اور تخییر کا فائدہ، امر کے صیغے سے مل رہا ہے نہ اس وہم سے کہ اللہ تعالیٰ نے دو مختلف حالتوں میں دو عدد کا ذکر فرمایا اور مختصر عدد کو دونوں میں سے دشوار تر حالت کے لیے اور بڑے عدد کو ان میں سے خفیف حالت کے لیے خاص کیا۔ اس سے لامحالہ یہ وہم پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف تین روزے فرض کیے، اور سات روزے اس شخص کے لیے رخصت ہے جو تخییر کا خواہش مند ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس وہم کو دور کرنے کے لیے، اشارہ فرمادیا کہ اللہ کی منشا، دس روزے فرض کرنا ہے، رہا الگ الگ رکھنا، تو محض اللہ کی طرف سے رخصت اور رحمت ہے۔ اب اس سے رحمت الٰہی پر تنبیہ کا فائدہ حاصل ہوگیا۔

اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: (وواعدنا موسی ثلاثین لیلة وأتممناها بعشر فتم میقات ربه أربعین لیلة) [اعراف/۱۴۳]

''اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا اور پورا کیا ان کو اور دس سے، پس پوری ہوگئی مدت تیرے رب کی چالیس راتیں۔''

اس لیے کہ منشا یہی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام چالیس راتیں سرگوشی کریں؛ لیکن آسانی کی خاطر یہ مدت ان کو متفرق کرکے پہنچائی۔ (۴)

یہ جواب ابوسعود اور آلوسی نے بھی نقل کیا ہے۔ (۵)

۲- عموماً یہ ہوتا ہے کہ بدل، مبدل منہ (اصل) سے کمزور حالت میں ہوتا ہے، جیسا کہ تیمّم اور پانی کا معاملہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ یہاں بدل اس نوعیت کا نہیں؛ بلکہ مبدل (اصل) کے قائم مقام ہونے میں کامل ہے۔ تاکہ جس کو قربانی میسر نہیں اور روزہ کی

مشقت اٹھاسکتا ہے، مطمئن رہے کہ اللہ کے یہاں اسے اجر مکمل مل گیا ہے۔ اور (عشرۃ) کا ذکر اس لیے ہے تاکہ (کاملۃ) تک رسائی درست ہو؛ کیوں کہ اگر یوں ہوتا: تلك كاملة تو یہ ممکن تھا کہ اس سے، سات چھوڑ کر صرف تین یا تین چھوڑ کر صرف سات مراد لے لیا جائے۔ لہٰذا (عشرۃ) کا ذکر کرنا ضروری تھا۔ یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔ اور ابوحیان نے اس کو استاذ ابوالحسن علی بن باذش سے منسوب کیا ہے۔(۶)

۳- اگر اللہ تعالیٰ یوں فرماتے کہ میں نے تم پر روزے دس دن کے فرض کیے تو کچھ بعید نہیں تھا کہ کسی دلیل کی بناء پر، کچھ دن، اس لفظ سے خارج ہوجاتے؛ اس لیے کہ شریعت اور عرف میں عام کی تخصیص کثرت سے پائی جاتی ہے۔ اور اگر یوں فرماتے: ''تین دن حج میں اور سات دن لوٹنے پر''۔ تو یہ احتمال رہ جاتا کہ کسی دلیل مخصص کی وجہ سے یہ مخصوص ہوجائے؛ لیکن جب اس کے بعد یہ فرمادیا کہ ''یہ دس پورے'' تو یہ صراحتاً معلوم ہوگیا کہ کوئی دلیل مخصص ہرگز نہیں، اس لیے اب اس کی دلالت نہایت قوی ہوگئی اور تخصیص ونسخ کا احتمال حد درجہ بعید ہوگیا۔ یہ قول رازی نے نقل کیا ہے۔(۷)

۴- عدد کے درجے چار ہیں: اکائیاں، دہائیاں، سیکڑے اور ہزار۔ اس کے علاوہ عدد یا تو مرکب ہے یا مکسور۔ اس تفسیر کے لحاظ سے دس کو عدد کامل بتانا، تعریف کا محتاج ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگئی: میں نے یہ عدد اس لیے واجب کیا کہ اس میں صفت کمال پائی جاتی ہے، اور وہ کسر اور ترکیب سے خالی ہے۔ یہ قول رازی نے ذکر کیا ہے۔(۸)

۵- تاکید عربی زبان کا ایک مشہور اسلوب ہے۔ مثلاً اللہ کا فرمان ہے: ولكن تعمى القلوب التي في الصدور [حج/۴۶] (پراندھے ہوجاتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں) نیز: ولا طائر يطير بجناحيه [انعام/۳۸] (اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دونوں بازووں سے) اس کا فائدہ یہ ہے کہ جو بات بہت زیادہ الفاظ میں بیان کیا جائے اور بہت ساری صفات ذکر کردی جائیں، بہ مقابلہ اس بات کے (جو ایک عبارت میں بیان کردی جائے) سہو ونسیان کا احتمال نہایت کم ہوتا ہے، لہٰذا بہت ساری عبارتوں میں کسی بات کا بیان کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ اس میں ایسی بہت سی مصلحتیں پوشیدہ ہیں جن کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اگر ایک عبارت میں کوئی بات بیان کردی جائے تو یہ اندازہ نہیں ہوسکے گا کہ اس میں کوئی ایسی اہم مصلحت ہے، جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور جب تاکید میں یہ مصلحت ہے تو یہاں اس کا ذکر، اس بات کی دلیل ہے کہ

اس روزہ میں اس تعداد کی رعایت، ایسی اہم چیز ہے کہ اس کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قول رازی نے نقل کیا ہے۔(۹)

۶- اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے مخاطب عرب ہیں، جو حساب کے ماہر نہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس انداز سے بیان کردیا کہ کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار فرمایا کہ مہینہ یوں ہوتا ہے اور آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تین بار اشارہ فرمایا۔ پھر دوبارہ اسی طرح کیا لیکن تیسری بار انگوٹھا بند کرلیا۔ پہلی بار تیس کا اشارہ فرمایا اور دوسری بار، انتیس کا۔ یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔(۱۰)

ابن عرفہ کہتے ہیں: ''عربوں کا یہ طریقہ ہے کہ جب دو عدد کو ذکر کرتے ہیں تو اس کو اجمالا بھی بیان کردیتے ہیں۔''

زمخشری نے اس قول کی تحسین کرتے ہوئے لکھا ہے: ''کسی بھی حساب میں آخر میں نچوڑ بیان کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ عدد اجمالی طور پر بھی معلوم ہوجائے جیسا کہ تفصیلی طور پر معلوم ہوچکا ہے۔ اور دو طرح سے احاطۂ علم میں آجائے اور اس کا پختہ علم ہوجائے۔ عربوں میں یہ مثل مشہور ہے کہ علمان خیر من علم یعنی دوبارہ کا جان لینا ایک بار کے جاننے سے بہتر ہے۔''

ابن عرفہ کہتے ہیں: ''عرب والے ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کو حساب کا زیادہ علم نہیں۔ اور آیا ہے کہ ہم حساب کتاب نہیں جانتے۔ عربی اشعار میں یہ چیز کثرت سے ملتی ہے، ایک مشہور عربی شاعر نابغہ کہتا ہے:

توهمت آيات لها فعرفتها   لست أعـوام و ذا العام سابع

میں نے اس (محبوبہ) کی نشانیوں کو تلاش کیا تو میں ان کو پہچان گیا، حالاں کہ چھ سال گذر گئے ہیں اور یہ ساتواں سال ہے۔

اعشیٰ شاعر کہتا ہے:

ثلاث بالغداة فهي حسبي   وست حين يدركني العشاء

تین جام صبح میں یہ میرے لیے کافی ہیں اور چھ جام رات میں۔

فذلك تسعة فى اليوم ريي   وشرب المرء فوق الري داء

یہ دن بھر میں نو جام ہوگئے، اور سیراب ہونے کے بعد آدمی شراب نوشی کرے تو بیماری ہے۔

فرزدق کا شعر ہے:

ثلاث واثنتان وهن خمس وسادسة تميل الی شمام

تین اور دو یہ پانچ ہوئے، اور چھٹیں میں، بوس کنار ہوتا ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

فسرت الیهم عشرين شهرا وأربعة فذلك حجتان

میں ان کی طرف چلا بیس ماہ اور چار ماہ یہ دو سال ہوگئے۔

یہ قول زمخشری، ابوحیان، ابن عاشور، ابوسعود اور آلوسی نے بھی نقل کیا ہے۔(۱۰)

۷- یہ ٹکڑا، خط وکتابت میں تصحیف اور غلطی سے پیدا ہونے والے ابہام کو ختم کرنے کے لیے ہے۔ اس لیے کہ (سبعة) اور (تسعة) کتابت میں ہم شکل ہیں۔ اس کے بعد جب (تلک عشرة کاملة) کہہ دیا تو یہ اشتباہ ختم ہوگیا۔ یہ قول رازی اور ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۱۱)

۸- فرمان باری (فمن لم يجد فصيام ثلاثة أيام في الحج وسبعة اذا رجعتم) میں احتمال تھا کہ اس سے مراد یہ لیا جائے کہ لوٹنے کے بعد واجب یہ ہے کہ سات دن پورے کیے جائیں اور ان سات میں، سابقہ تین روزے شامل مانے جائیں گے یعنی حج سے واپسی پر اس کے ذمہ سابقہ تین روزوں کو چھوڑ کر چار روزے ہوں گے۔ اس میں دوسرا احتمال یہ تھا کہ واپسی کے بعد سابقہ تین روزے چھوڑ کر سات روزے اور واجب ہیں ان دونوں صورتوں کا اس میں احتمال تھا۔ اب اس کے بعد جب (تلك عشرة كاملة) کہہ دیا تو یہ اشکال ختم ہوگیا اور یہ واضح ہوگیا کہ واپسی پر سابقہ تین روزوں کو چھوڑ کر سات روزے اور واجب ہیں۔ یہ قول رازی نے نقل کیا ہے۔(۱۲)

۹- اللہ تعالیٰ نے حج میں تین اور حج سے واپسی پر سات روزے رکھنے کا حکم دیا تو اس میں یہ وضاحت نہیں کہ یہ اللہ کے نزدیک ایک عظیم اور مکمل طاعت ونیکی ہے، لیکن جب اس کے بعد یہ فرمایا (تلك عشرة كاملة) تو معلوم ہوگیا کہ یہ نیکی میں کمال اور اس کا اعلیٰ درجہ ہے۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کو ''لام'' اختصاص کے ذریعہ اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جیسا کہ فرمایا: ''الصوم لی'' اسی طرح حج کو بھی لام اختصاص کے ذریعہ اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ جیسا کہ فرمایا (وأتموا الحج والعمرة لله) نیز اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں عبادتوں کا، اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق ہے۔ اور عقلا بھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ روزے کے حق میں تو اس لیے کہ عقل کو اس کی حکمت تک رسائی کی کوئی صورت نہیں۔ پھر بھی یہ نفس کے لیے نہایت ہی شاق ہے، اس لیے اس کی ادائیگی محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوسکتی ہے۔ اور حج بھی ایسی

عبادت ہے، جس کی حکمت، عقل کو معلوم ہی نہیں ہوسکتی، پھر یہ نہایت شاق ہے، کیوں کہ اس کی خاطر اہل وعیال اور ملک کو چھوڑنا پڑتا ہے، اور اکثر لذتوں سے کنارہ کشی اختیار کرنی پڑتی ہے، لہٰذا یہ بھی محض اللہ کی رضا ہی کے لیے ادا کی جائے گی۔ مزید براں یہ کہ ان دس دنوں میں سے بعض، حج کے زمانہ میں آتے ہیں، جس کی وجہ سے دوہری مشقت ہوتی ہے اور کچھ روزے حج کے بعد آتے ہیں، جس میں ایک دشواری سے دوسری دشواری کی طرف جانا ہے اور معلوم ہے کہ یہ کثرت ثواب اور رفع درجات کا سبب ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ روزے فرض کیے اور یہ گواہی دی کہ یہ عبادت انتہائی درجہ کامل اور بلند ہے۔ لہٰذا فرمایا (تلك عشرة كاملة) یہاں پر نکرہ لانا، اس کی اعلیٰ حیثیت کی دلیل ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ یہ دس ہیں، کون سے دس؟!! وہ دس جو مکمل ہیں۔ یہ حکمت رازی نے نقل کی ہے۔(۱۳)

۱۰- (عشرة) کا ذکر اس وہم کے ازالہ کے لیے ہے کہ (سبعة) سے مراد تعداد نہیں؛ بلکہ کثرت ہے۔ ابوعمر بن العلاء، اور ابن اعرابی نے عربوں کا یہ قول نقل کیا ہے: سبع اللّٰه لك الأجر یعنی اللہ تم کو زیادہ سے زیادہ ثواب دیں۔ روایات میں: له سبع، له سبعون، سبع مئة کے الفاظ آئے ہیں۔ ماہر لغت ازہری فرمان باری (سبعين مرة) کی تشریح میں کہتے ہیں کہ یہ (سبع) کی جمع ہے، جس کا استعمال کثرت کے لیے ہے۔ یہ قول ابوحیان اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔(۱۴)

۱۱- عبارت میں تقدیم وتاخیر ہے۔ اصل یوں ہے: فتلك عشرة : ثلاثة في الحج وسبعة اذا رجعتم. (یہ دس روزے ہیں: تین حج میں اور سات حج سے واپسی پر) یہ قول ابوالعباس مبرد سے منسوب کیا گیا ہے، لیکن یہ نسبت درست نہیں۔ قرآن کریم اس سے مبرا ہے۔ یہ قول ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۱۵)

۱۲- (عشرة) کا ذکر اس لیے ہے تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ (سبعة)، (ثلاثة) کے ساتھ ایسے ہی ہے جیسے یہ فرمان باری (وقدر فيها أقواتها في أربعة أيام) [فصلت/۱۰] (اور ٹھہرائیں اس میں خوراکیں اس کی چار دن میں) یعنی ان دو دنوں کے ساتھ جو سابقہ آیت (خلق الأرض في يومين) [فصلت/۹] (بنائی زمین دو دن میں) یہ قول ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۱۶)

۱۴- مبرد سے ہی یہ وجہ بھی منقول ہے کہ شاید سننے والا یہ خیال کرے کہ ''سات'' کے بعد کچھ اور ہے۔ لہٰذا اس وہم کو ختم کردیا۔ اسے ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۱۷)

۱۵- ''عشرة'' کو اس لیے ذکر کردیا تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ کمال، ان تین روزوں کے ساتھ

خاص ہے، جو حج میں ہیں یا ان سات روزوں کے ساتھ خاص ہے، جو حج سے واپسی پر رکھے جائیں۔ یہ دس روزے ہی کمال کیساتھ متصف ہیں۔ اسے ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۱۸)

مقام دوم: ''دس پورے'' کہنے سے یہ وہم ہوتا ہے کہ کوئی ایسا دس بھی ہے جو دس ہونے میں پورا نہیں، حالاں کہ یہ محال ہے؟

اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

پہلا جواب: لفظ ''کاملة'' میں تین طرح سے کمال کے بیان کا احتمال ہے: (۱) یہ قربانی کے قائم مقام اور اس کا بدل ہونے میں کامل ہیں۔ (۲) قربانی کرنے والے کو جس طرح مکمل ثواب ملتا ہے اسی طرح اسے بھی مکمل ثواب ملے گا۔ اس لحاظ سے یہ کامل ہیں۔ (۳) یہ اس لحاظ سے مکمل ہیں کہ ''تمتع'' کرنے والے کا حج (اگر وہ روزے رکھ لے) مکمل ہوتا ہے جیسے اس شخص کا حج جو تمتع نہ کرے۔ یہ قول رازی نے نقل کیا ہے۔(۱۹)

دوسرا جواب: یہ تاکید کے لیے ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں: کتبت بیدی (میں اپنے دونوں ہاتھوں سے لکھا) نیز جیسے اللہ کا فرمان ہے: (فخر علیهم السقف من فوقهم) [نحل/۲۶] (پھر گر پڑی ان پر چھت اوپر سے) زمخشری کہتے ہیں کہ اس (تاکید) میں روزے کی مزید وصیت کرنا ہے۔ اور یہ کہ آدمی اس میں سستی نہ کرے اور ان کی تعداد میں کمی نہ کرے۔ جیسے آپ کسی بات کا (جو آپ کے نزدیک اہمیت کی حامل ہے) کا حکم دینا چاہتے ہیں اور آپ کے نزدیک مخاطب کا ایک مقام ہے، تو آپ اس سے کہیں کہ اللہ اللہ! دیکھو کوتاہی نہ کرنا۔ یہ جواب ابوحیان اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔(۲۰)

تیسرا جواب: یہ صفت دس کے کامل ہونے کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ اس لیے کہ دس میں تمام اعداد کی خاصیتیں یک جا ہیں۔ کیوں کہ ایک، ابتداء عدد ہے۔ دو عدد کا شروع ہے، تین پہلا طاق عدد ہے۔ چار پہلا عدد مجذور ہے۔ پانچ پہلا عدد دائرے۔ چھ پہلا عدد تام ہے۔ سات پہلا عدد ہے۔ آٹھ، زوج الزوج کا پہلا عدد ہے۔ اور نو پہلا عدد مثلث ہے۔ اور دس کی طرف خود عدد لوٹتے ہیں؛ اس لیے کہ اس کے بعد کا ہر عدد، خود اس سے اور اس سے پہلے والے سے مرکب ہے۔ یہ قول آلوسی نے بعض محققین کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔(۲۱)

چوتھا جواب: یہ مقصد اور ترتیب میں مکمل ہیں؛ لہٰذا اگر اس ترتیب پر روزے نہ رکھے تو کامل نہ ہوں گے۔ اسے ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۲۲)

پانچواں جواب: یہ الفاظ گو کہ خبر کے ہیں؛ لیکن اس سے مراد، امر ہے۔اور تقدیر عبارت یوں ہے: فلتکن الصیامات صیامات کاملة (یہ روزے مکمل روزے ہونے چاہئیں) اس لیے کہ حج جس کا حکم آیا ہے وہ بھی پورا ہی ہونا چاہئے جیسا کہ فرمان باری ہے: (وأتموا الحج والعمرة للّٰہ) [بقرہ/۱۹۶] اور یہ روزے، اس حج میں ہونے والی کمی کی تلافی کے لیے ہیں لہٰذا یہ روزے بھی پورے ہونے چاہئیں تا کہ حج (جس کا پورا و مکمل ہونا ضروری ہے) میں ہونے والی کمی کی تلافی ہو سکے۔اور روزوں کے مکمل ہونے سے کیا مراد ہے اس کی وضاحت ہم حج کے مکمل ہونے کی بحث میں کر چکے ہیں۔ رہا یہ کہ امر کے الفاظ استعمال کرنے کے بجائے خبر کے الفاظ کیوں استعمال کیے تو اس لیے کہ جب کسی چیز کا حکم حد درجہ تاکیدی اور قطعی ہو تو یہ مکلف وجود میں لاتا ہی ہے۔اور اسی وجہ سے یہ ممکن ہے کہ کسی چیز کے وقوع کی خبر کو، اس کے قطعی حکم ہونے اور شریعت کی طرف سے اس کے واجب کرنے میں مبالغہ سے کنایہ قرار دیا جائے۔ یہ جواب رازی اور ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۲۳)

۱۴- اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فاذا أفضتم من عرفات فاذکروا اللّٰہ عند المشعر الحرام واذکروہ کما ھداکم [بقرہ/۱۹۸]

''پھر جب طواف کے لیے لوٹو عرفات سے، تو یاد کرو اللہ کو مشعر الحرام کے نزدیک اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کو سکھلایا۔''

اللہ کے ذکر کا حکم ایک بار آیت کے ابتدائی ٹکڑے (فاذکروا اللّٰہ عند المشعر الحرام) میں آچکا ہے پھر دوبارہ اگلے ٹکڑے (واذکروہ کما ھداکم) میں اس کا حکم دینے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

پہلا جواب: ہمارا مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفی ہیں، قیاسی نہیں۔لہٰذا (فاذکروا اللّٰہ) میں ذکر کا حکم ہے۔ پھر (واذکروہ کما ھداکم) میں ہمیں یہ حکم ہے اللہ کا ذکر اس کے ان اسماء وصفات سے کریں جو اس نے ہمیں بتائے ہیں۔ نہ ایسے ناموں کے ذریعہ جو ہم اپنی طرف سے بنالیں۔ یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔(۲۴)

دوسرا جواب: پہلے اللہ تعالیٰ نے ذکر کا حکم دیا پھر فرمایا (واذکروہ کما ھداکم) یعنی ہم نے جس ذکر کا حکم دیا ہے اسے بجالاؤ، جیسا کہ اللہ نے تمہیں دین اسلام کی رہنمائی فرمائی۔ گویا اللہ

تعالیٰ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ تمہیں اس ذکر کا حکم اس لیے دیا گیا تاکہ تم اس نعمت کے شکر گذار بنو۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان پورا کرنے کے بعد، ''تکبیر'' یعنی اللہ کی بڑائی بیان کرنے کا حکم دیا۔

ولتکملوا العدة ولتکبروا اللّٰہ علی ما ھداکم [بقرہ/۱۸۵]

''اوراس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی۔''

اور قربانی کے تعلق سے فرمایا: کذلك سخرھا لکم لتکبروا اللّٰہ علی ما ھداکم [حج/۳۷]

''اسی طرح ان کو بس میں کردیا تمہارے کہ اللہ کی بڑائی پڑھو اس بات پر کہ تم کو راہ سجھائی۔''

یہ جواب امام رازی نے نقل کیا ہے۔(۲۵)

تیسرا جواب: (فاذکروا اللّٰہ عند المشعر الحرام) میں زبان سے ذکر کا حکم ہے اور (واذکروہ کما ھداکم) میں دل سے ذکر کا حکم ہے۔اس کی تشریح یہ ہے کہ عربی میں ذکر دو طرح کا ہے (۱) نسیان اور بھول کی ضد (۲) ذکر قولی۔نسیان اور بھول کی ضد ذکر، کی مثال اللہ کا فرمان ہے (وما أنسانیه الا الشیطان أن أذکرہ) [کہف/۶۳] اور ذکر قولی کی مثال اللہ کا فرمان (فاذکروا اللہ کذکرکم آباء کم أو أشد ذکرا [بقرہ/۲۰۰] (اور یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو) اور (والذکروا اللّٰہ فی أیام معدودات) [بقرہ/۲۰۳] (اور یاد کرو اللہ کو گنتی کے چند دنوں میں) اس سے معلوم ہوا کہ ذکر دونوں معنوں میں وارد ہے۔ پہلے سے مراد زبانی ذکر اور دوسرے سے مراد قلبی ذکر ہے۔اور انہی دونوں کے ذریعہ مکمل عبودیت کا حصول ہوتا ہے۔یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔(۲۶)

چوتھا جواب: ابن انباری نے کہا کہ: (واذکروہ کما ھداکم) سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو توحید کے ذریعہ یاد کرو جیسا کہ اس نے تمہیں اپنی ہدایت کے ذریعہ یاد فرمایا۔ اسے رازی اور ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۲۷)

پانچواں جواب: ممکن ہے کہ اس سے مراد مسلسل ذکر کرنا ہو گویا ان سے یوں کہا گیا کہ اللہ کو بار بار یاد کرو جیسا کہ اس نے تمہیں بار بار ہدایت دی۔اس کا حاصل یہ ہے کہ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا (یا أیھا الذین آمنوا اذکرو اللّٰہ ذکرا کثیرا [احزاب/۴۱] (اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کی بہت سی یاد) یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے اور ابوحیان نے اسے محمد بن قاسم نحوی سے منسوب کیا ہے۔(۲۸)

چھٹا جواب: اللہ تعالیٰ نے مشعر حرام کے پاس ذکر کا حکم دیا ہے۔ اس میں شرعی وظائف و احکام کو بجالانے کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد اللہ نے فرمایا: (واذکروہ کما ھداکم) اس کا مطلب یہ ہے کہ مشعر حرام پر ذکر کو موقوف کرنے میں شرعی وظائف کی بجا آوری ہے۔ یہ بات سمجھ میں آنے کے بعد تم حقیقت کے مراتب سے قریب ہو جاؤ گے۔ اور وہ یہ ہے کہ تمہارا دل مشعر حرام سے منقطع ہو جائے؛ بلکہ اس کے علاوہ ہر چیز سے منقطع ہو جائے، اور اللہ کے جلال کے نور اور اس کی صمدیت میں غرق ہو جائے، اور اس کا ذکر کرے؛ اس لیے کہ وہی اس ذکر کی مستحق ذات ہے، نیز اس لیے کہ یہ ذکر، تمھیں اس کی ذات کے ساتھ باعزت نسبت عطا کرے گا بایں معنی کہ تم اس حالت میں مقام عروج میں پہنچ جاؤ گے، اسی کا ذکر کروگے اور اسی کی ثناء میں مشغول ہوگے۔ پہلے ابتدائی حالت کا ذکر کیا پھر بعد والی حالت کا؛ اس لیے کہ بندہ اس حالت میں مقام عروج میں ہوتا ہے اور ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف چڑھتا ہے۔ یہ ایسا شریفانہ مقام ہے، جس کو نہ زبانی بیان کیا جاسکتا ہے اور نہ تصور میں آسکتا ہے۔ جو اس تک رسائی کا خواہاں ہے اسے اس ذات تک پہنچنے والوں میں ہونا چاہیے، نہ کہ اثر وخبر کو سننے پر اکتفا کرے۔ یہ جواب رازی نہ نقل کیا ہے۔(۲۹)

ساتواں جواب: ذکر اوّل سے مراد، اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات حسنیٰ کا ذکر ہے اور دوسرے ذکر سے مراد، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکریہ میں مشغول ہونا ہے۔ شکریہ میں بھی ذکر ہوتا ہے۔ لہٰذا شکر کو ذکر کہنا صحیح ہے۔

دوسرے ذکر سے مراد، شکر ہے اس کی دلیل یہ ہے اس کو ہدایت پر معلق کیا ہے (کما ھداکم) اور کسی نعمت پر جو ذکر مرتب ہو وہ شکر ہی تو ہے۔ یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔(۳۰)

آٹھواں جواب: اللہ تعالیٰ نے (فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام) فرمایا تو کسی کو یہ وہم ہوسکتا تھا کہ ذکر، اسی مقام اور اسی عبادت (حج) کے ساتھ خاص ہے۔ اس شبہ کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا (واذکروہ کما ھداکم) یعنی اللہ کا ذکر ہر حالت اور ہر جگہ کرو۔ اس لیے کہ یہ ذکر، ہدایت کے شکریہ میں واجب ہوا ہے اور چوں کہ ہدایت کی نعمت قائم ہے، ختم ہونے والی نہیں، اس لیے اس کا شکریہ بھی لگاتار جاری رہنا چاہیے، اس میں انقطاع نہ ہو۔ یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔(۳۱)

نواں جواب: (فاذکروا اللہ عند المشعر الحرام) سے مراد مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازیں ایک ساتھ ادا کرنا ہے اور (واذکروہ کما ھداکم) سے مراد لا الٰہ الا اللہ اور سبحان

اللہ پڑھنا ہے۔ یہ جواب رازی اور ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۳۲)

دسواں جواب: اوّل اور دوم ذکر کے حکم سے مراد ایک ہی ہے البتہ تاکید اور مبالغہ کے لیے دوبارہ لایا گیا؛ اس لیے کہ ذکر تمام عبادتوں میں سب سے افضل ہے۔ یہ جواب ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۳۳)

گیارہواں جواب: اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کا اچھا ذکر کرو جیسا کہ اس نے تم کو اچھی ہدایت دی۔ اور اسی طرح سے اس کا ذکر کرو جیسے اس نے تم کو بتایا ہے، اس طریقہ کو نظر انداز نہ کرو۔ یہ جواب زمخشری اور ابوسعود نے نقل کیا ہے۔(۳۴)

❁ ❁ ❁

حواشی:

(۱) رازی ۵/۱۰۹۔
(۲) زمخشری تفسیر آیت۔
(۳) ابوحیان ۲/۲۶۸۔
(۴) رازی ۳/۵۰۰؛ ابن عاشور ۲/۲۲۸۔
(۵) ابوسعود ۲۰۸؛ آلوسی ۲/۸۳۔
(۶) رازی ۳/۵۰۰؛ ابوحیان ۲/۲۶۸۔
(۷) رازی ۳/۵۰۰۔
(۸) رازی ۳/۵۰۰۔
(۹) رازی ۳/۵۰۰۔
(۱۰) زمخشری تفسیر آیت، ابوحیان ۲/۲۶۸، ابن عاشور ۲/۲۲۸، ابوسعود ۱/۲۰۹، آلوسی ۲/۸۳-۸۶۔
(۱۱) رازی ۳/۵۰۰؛ ابوحیان ۲/۲۶۸۔
(۱۲) رازی ۳/۵۰۰۔
(۱۳) رازی ۳/۵۰۰۔
(۱۴) ابوحیان تفسیر آیت، آلوسی ۲/۸۵۔
(۱۵) ابوحیان تفسیر آیت۔
(۱۶) ابوحیان تفسیر آیت۔
(۱۷) ابوحیان تفسیر آیت۔
(۱۸) ابوحیان تفسیر آیت۔
(۱۹) رازی ۳/۵۰۰ نیز دیکھئے آلوسی ۲/۸۳، ابوحیان تفسیر آیت۔
(۲۰) ابوحیان تفسیر آیت؛ آلوسی ۲/۸۳۔
(۲۱) آلوسی ۲/۸۳۔
(۲۲) ابوحیان تفسیر آیت۔
(۲۳) رازی ۳/۵۰۰؛ ابوحیان تفسیر آیت۔
(۲۴) رازی ۵/۳۲۸۔
(۲۵) رازی ۵/۳۲۸۔
(۲۶) رازی ۵/۳۲۸۔
(۲۷) رازی ۵/۳۲۸۔؛ ابوحیان تفسیر آیت۔
(۲۸) رازی ۵/۳۲۸۔؛ ابوحیان تفسیر آیت۔
(۲۹) رازی ۵/۳۲۸۔
(۳۰) رازی ۵/۳۲۸۔
(۳۱) رازی ۵/۳۲۸۔
(۳۲) رازی ۵/۳۲۸؛ ابوحیان تفسیر آیت۔
(۳۳) ابوحیان تفسیر آیت۔
(۳۴) زمخشری تفسیر آیت، ابوسعود ۱/۲۱۲۔

دھاگے-دانوں کی مروجہ تسبیح کی شرعی حیثیت

از: مفتی عمر فاروق لوہاروی
شیخ الحدیث دارالعلوم لندن (یوکے)

تمہید:

دھاگے دانوں کی مروجہ تسبیح کو عربی میں "سُبحہ" اور "مِسبَحہ" کہا جاتا ہے۔اور ہمارے عرف میں ذوالالہ کا اطلاق آلہ پر کرتے ہوئے "تسبیح" کہا جاتا ہے۔بعض حضرات اس کے استعمال کو بدعت قرار دیتے ہیں، اور استعمال کرنے والوں کو موردِ طعن ٹھہراتے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوا، کہ اس سلسلے میں ایک مختصر سی تحریر شائع کی جائے، جس سے مسئلہ کی حقیقت واضح ہوجائے۔

ذکراللہ کی اہمیت:

"ذکراللہ" اللہ تعالیٰ کے قرب ورضاء اور انسان کی روحانی ترقی اور ملاءِ اعلیٰ سے اس کے ربط کا خاص الخاص وسیلہ ہے۔شیخ ابن القیم رحمہ اللہ نے "مدارج السالکین" میں ذکراللہ کی عظمت و اہمیت اور اس کے اثرات وبرکات پر ایک بڑا بصیرت افروز اور رُوح پرور مضمون لکھا ہے۔قرآن مجید نے دس مختلف ومتنوع اسالیب و پیرایوں سے ذکراللہ کی تاکید وترغیب اور تحضیص وتلقین فرمائی ہے۔چنانچہ:

(۱) بعض آیات میں اہلِ ایمان کو تاکید کے ساتھ اس کا حکم دیا گیا ہے۔

(۲) بعض آیات میں اللہ کو بھولنے اور اسکی یاد سے غافل ہونے سے شدت سے منع فرمایا گیا ہے۔

(۳) بعض آیات میں فرمایا گیا ہے، کہ فلاح اور کامیابی اللہ کے ذکر کی کثرت کے ساتھ وابستہ ہے۔

(۴) بعض آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ذکر کی تعریف کی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ ذکر کے صلہ میں ان کے ساتھ رحمت ومغفرت کا خاص معاملہ کیا جائے گا، اوران کو اجرِ عظیم سے نوازا جائے گا۔

(۵) بعض آیات میں آگاہی دی گئی ہے، کہ جولوگ دنیا کی بہاروں اور لذّتوں میں منہمک اور مست ہوکراللہ کی یاد سے غافل ہوجائیں گے، وہ ناکام اورنامراد رہیں گے۔

(۶) بعض آیات میں فرمایا گیا، کہ جو بندے ہمیں یاد کریں گے، ہم ان کو یاد کریں گے اور یاد رکھیں گے۔

(۷) بعض آیات میں فرمایا گیا ہے، کہ اللہ کے ذکر کو ہر چیز کے مقابلے میں عظمت وفوقیت حاصل ہے، اوراس کائنات میں وہ ہر چیز سے بالاتر اور بزرگ تر ہے۔

(۸) بعض آیات میں بڑے اونچے درجہ کے اعمال کے بارے میں ہدایت فرمائی گئی ہے، کہ ان کے اختتام پراللہ کا ذکر ہونا چاہیے، گویا ذکراللہ ہی کوان اعمال کا خاتمہ بنانا چاہیے۔

(۹) بعض آیات میں ذکراللہ کی ترغیب اس عنوان سے دی گئی ہے، کہ دانش منداور صاحبِ بصیرت وہی ہیں، جوذکراللہ سے غافل نہیں ہوتے۔

(۱۰) بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے، کہ اونچے سے اونچے اعمالِ صالحہ کی روح ذکراللہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے قول وعمل سے ذکراللہ کی ترغیب وتلقین فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ آپ نے فرمایا:

جاء اعرابیان الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال احدھما: یا رسول اللّٰہ، اخبرنی بامرٍ اتثبت بہ قال: لایزال لسانك رطبا من ذکر اللّٰہ . (الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان ۹۲/۲،حدیث:۸۱۱۔ ورواہ الترمذی وقال: حدیث حسن غریب ورواہ ایضا ابن ماجہ والحاکم وقال: صحیح الاسناد ولم یخرجاہ واقرہ الذہبی)

’’دواعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں سے ایک نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ مجھے کوئی ایسی بات بتادیجئے، جس کو میں مضبوطی سے تھام لوں، اوراس پر کاربند ہوجاؤں۔آپ نے فرمایا: تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے۔‘‘

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

سألت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ایّ الاعمال احبّ الی اللّٰه تعالٰی؟ قال: ان تموت ولسانك رطب من ذکر اللّٰه. (الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان ۲/۹۳ حدیث: ۸۱۵)

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا، کہ اعمال میں سے کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسندیدہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تمہاری موت اس حال میں آئے، کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو۔''

اذکار وتسبیحات کا شمار کرنا:

''ذکراللہ'' اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے نماز، تلاوتِ قرآن اور دعا، وغیرہ سب ہی کو شامل ہے، لیکن مخصوص عرف واصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس، توحید وتمجید، اس کی عظمت وکبریائی اور اس کی صفاتِ کمال کے دھیان وبیان کو''ذکراللہ'' اور ''تسبیح'' کہا جاتا ہے۔ جس طرح شریعتِ اسلامیہ میں ذکراللہ کی ترغیب وتاکید وارد ہوئی ہے، اسی طرح اس کے خاص کلمات بھی تلقین فرمائے گئے ہیں۔ تسبیح وتقدیس اور توحید وتمجید وغیرہ کے جو کلمات اور اذکار وتسبیحات منقول ہیں، ان میں سے بعض کی خاص تعداد روایات میں وارد ہوئی ہے۔ جیسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من قال سبحان اللّٰه وبحمده فی یوم مائة مرة حطت (عنه) خطایاه، وان کانت مثل زبد البحر. (صحیح بخاری ۲/۹٤۸ کتاب الدعوات، باب فضل التسبیح)

''جو شخص روزانہ ''سبحان اللہ وبحمدہ'' سو مرتبہ کہے، تو اس کی لغزشیں معاف کردی جائیں گی، گو وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔''

خارجِ صلاۃ ان اذکار وتسبیحات کو شمار کرنے کے بارے میں کل تین اقوال ہیں:

(۱) ضعفاء اور کمزوروں کے لیے کراہت نہیں ہے، اقویاء کے لیے کراہت ہے۔

(۲) مطلقاً یعنی اقویاء اور ضعفاء ہر ایک کے لیے مکروہ ہے۔

(۳) کسی کے لیے مکروہ نہیں، جبکہ وہ ریاء کو مستلزم نہ ہو۔

ان تین اقوال میں صحیح اور صواب قول تیسرا ہے، کہ جب اذکار وتسبیحات کا شمار کرنا ریاء اور دکھاوے کو مستلزم نہ ہو، تو مطلقاً مکروہ نہیں، نہ ضعفاء کے لیے کوئی کراہت ہے نہ اقویاء کے لیے۔

پہلے اور دوسرے قول کے لیے کوئی قابلِ اعتماد اور قوی دلیل نہیں ہے، جب کہ تیسرے قول کے لیے دلیل اور مضبوط ترین دلیل یہ ہے، کہ رسول اللہ ﷺ سے قولاً وعملاً اور نصّاً واشارتاً احادیثِ صحیحہ میں اذکار کا شمار کرنا ثابت ہے، اسی لیے امام ترمذی، امام ابوداود اور امام نسائی جیسے حضرات محدثین رحمہم اللہ نے اپنے اپنے مجموعۂ احادیث میں مستقل باب قائم کرکے تسبیحات کے شمار کا جواز ثابت فرمایا ہے۔

واضح ہو، کہ اذکار کا شمار کرنا فعلِ عبث نہیں ہے؛ بلکہ اس میں جہاں ایک طرح کا اہتمام پایا جاتا ہے، وہیں اس میں ایک نفع بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس کا نفع یہ ہے، کہ نفس سے شروع میں جب کوئی عمل کرایا جاتا ہے، تو اس پر سخت گراں ہوتا ہے، اور اس کو خوش رکھنا ضروری ہے، تاکہ کام کرے، اور سست ہوکر بےکار نہ ہوجائے۔ پس جب (تسبیحات) شمار کی جائے گی، تو نفس کو خوشی ہوگی، کہ میں نے آج اس مقدار میں کام کیا، اور اتنے اجر کا مستحق (امیدوار) ہوا۔ کل کو اور زیادہ کام کروں، تاکہ ثواب زیادہ ملے۔ اور جو بے شمار پڑھ لیا، نفس کو تکان تو ہوجائے گا، لیکن مسرّت نہ ہوگی، پس دوسرے روز فرائض بھی ادا کرنا دشوار ہوگا۔'' (المسکی الذکی یعنی تقریر ترمذی از حضرت تھانوی رحمہ اللہ ۲/۲۶۲)

شیخ عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی رحمہ اللہ مذکورہ بالا اقوالِ ثلثہ میں سے تیسرے قول کی تصحیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وهو الصحيح، لانه اسكن للقلوب، واجلب للنشاط. (مجموعۂ رسائل اللکنوی ۱/۱۵۱)

''یہی (عدم کراہت والا تیسرا قول) صحیح ہے، اس لیے کہ یہ شمار کرنا قلوب کے لیے زیادہ باعثِ سکون اور زیادہ نشاط آور ہے۔''

انگلیوں کے پوروں پر اذکار کا شمار کرنا:

رسول اللہ ﷺ سے اذکار وتسبیحات کا انگلیوں کے پوروں پر شمار کرنا ثابت ہے؛ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا، کہ آپ کے قول وفعل سے تو پوروں ہی پر شمار کرنا ثابت ہے۔ اس سلسلے کی دو احادیث حسب ذیل ہیں:

(۱) عن عبد الله بن عمرو قال: رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يعقد

التسبیح – قال ابن قدامة – بیمینه . (سنن ابی داود، ابواب الوتر، باب التسبیح بالحصی ۱/ ۲۱۰ وسکت عنه ابوداود، ونقل المنذری تحسین الترمذی واقره واخرجه الترمذی وفی روایته: بیده، واخرجه ابن حبان ایضا بلفظ بیده)

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، کہ آپ تسبیح شمار فرمارہے تھے- اس سند کے امام ابوداؤد رحمہ اللہ کے شیخ ثانی ابن قدامہ نے اس روایت میں "بیمینہ" (دائیں ہاتھ مبارک سے) کا اضافہ نقل کیا ہے- اب معنی یہ ہوں گے کہ آپ اپنے دائیں دست مبارک سے تسبیح شمار فرمارہے تھے۔''

(۲) عن یسیرة وکانت من المهاجرات قالت: قال لنا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: علیکن بالتسبیح والتهلیل والتقدیس واعقدن بالانامل فانهن مسئولات مستنطقات ولا تغفلن فتنسین الرحمة. قال الترمذی: هذا حدیث انما نعرفه من حدیث هانی بن عثمان . (جامع الترمذی، ابواب الدعوات، احادیث شتّی ۱۹۹/۲ سنن ابی داود، کتاب الصلاة، ابواب الوتر، باب التسبیح بالحصی ۱/ ۲۱۰ الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان ۱۰۳/۲ حدیث: ۸۳۹، مسند احمد ۴۰۲/۶ حدیث: ۲۷۱۵۴، وحسّنه النووی فی "الاذکار" ص:۲۲ وابن حجر فی "نتائج الافکار" ۸۴/۱)

''حضرت یسیرہ (بنت یاسر) رضی اللہ عنہا سے جو مہاجرات میں سے ہیں، روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ارشاد فرمایا، کہ تم تسبیح (سبحان اللہ کہنا)، تہلیل (لا الہ الا اللہ کہنا)، اور تقدیس (جیسے "سبحان الملک القدوس" یا "سبوح قدوس رب الملائکة والروح" کہنا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں تقدیس سے مراد ''تکبیر'' یعنی ''اللہ اکبر'' کہنا ہو) کو لازم پکڑو، اوران کو انگلیوں کے پوروں سے شمار کرو، اس لیے کہ (دیگر اعضاء کی طرح) پوروں سے بھی (قیامت کے دن ان سے کیے گئے اعمال کے بارے میں) سوال کیا جائے گا، اوران میں گویائی پیدا کرکے ان کو بُلوایا جائے گا۔ اور ذکر سے غافل مت ہوؤ یعنی ذکر کو مت چھوڑو، ورنہ تم رحمت کو یعنی سبب رحمت کو چھوڑنے والی ہوں گی۔''

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اذکار وتسبیحات کے شمار کرنے کا طریقہ آج کل کے معروف طریقے (پے درپے انگلیوں پر گننا) کی طرح نہیں تھا؛ بلکہ ایک خاص طریقہ اور متعین کیفیت تھی۔

کنکریوں اور گٹھلیوں پر اذکار کا شمار کرنا:

جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا گیا، کہ رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل سے تو اذکار کا انگلیوں کے پوروں ہی سے شمار کرنا ثابت ہے، لیکن آپ ﷺ کی تقریر سے یہ بات بھی ثابت ہے، کہ کنکریوں اور گٹھلیوں پر بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

الروایات فی التسبیح بالنوی والحصی کثیرة عن الصحابة وبعض امهات المؤمنین؛ بل رآها النبی صلی اللّٰه علیه وسلم واقرها. (مجموعة رسائل اللکنوی ۱۳۲/۱)

”حضرات صحابہ کرام اور بعض امہات المومنین سے کھجور کی گٹھلیوں اور کنکریوں کے ذریعہ تسبیح کے سلسلہ میں روایات بہت ہیں؛ بلکہ نبی ﷺ نے ان کو دیکھا، اور (نکیر نہیں فرمائی؛ بلکہ) اس کو برقرار رکھا۔“

ذیل میں اس سلسلے کی چند روایات پیش کی جارہی ہیں:

(۱) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

انه دخل مع رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم علی امرأة وبین یدیها نوی او حصی تُسبِّحُ بها، فقال: (الا) اخبرك بما هو ایسر علیك من هذا او افضل، فقال: سبحان اللّٰه عدد ما خلق فی السماء وسبحان اللّٰه عدد ما خلق فی الارض وسبحان اللّٰه عدد ما خلق بین ذلك وسبحان اللّٰه عدد ما هو خالق، واللّٰه اکبر مثل ذلك، والحمد للّٰه مثل ذلك، ولا اله الا اللّٰه مثل ذلك، ولا حول ولاقوة الا باللّٰه مثل ذلك.

(سنن ابی داود، ابواب الوتر، باب التسبیح بالحصی ۲۱۰/۱، جامع ترمذی، احادیث شتّی من ابواب الدعوات وقال الترمذی: حسن غریب ۱۹۷/۲، واخرجه ابن حبان: الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان ۱۰۱/۲ حدیث: ۸۳۵ والحاکم وقال الحاکم: صحیح الاسناد ووافقه الذهبی: المستدرك للحاکم ج:۱، ص:۵۴۷، ۵۴۸، والطبرانی فی الدعاء ۱۵۸۴/۳ حدیث: ۱۷۳۸)

”حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ایک خاتون کے پاس پہنچے (ممکن ہے وہ خاتون ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ہو، یا ممکن ہے کہ کوئی محرم خاتون تھیں۔ اگر اجنبیہ تھیں تو ممکن ہے کہ یہ واقعہ نزولِ حجاب سے قبل کا ہو یا یہ کہیے کہ دخول فی البیت، رؤیت کو مستلزم نہیں) دراں حالیکہ اس خاتون کے سامنے کھجور کی گٹھلیاں یا

سنگریزے تھے، وہ ان گٹھلیوں یا کنکریوں پر تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تم کو وہ نہ بتادوں، جو تمہارے لیے اس سے زیادہ آسان ہے یا فرمایا کہ اس سے افضل ہے، پھر آپ نے فرمایا: (کہ تم اس طرح کہو:) سبحان اللّٰہ عدد ما خلق فی السماء و سبحان اللّٰہ عدد ما خلق فی الارض و سبحان اللّٰہ عدد ما بین ذلك و سبحان اللّٰہ عدد ما ھو خالق (سبحان اللہ ساری آسمانی مخلوق کی تعداد کے مطابق، سبحان اللہ ساری زمینی مخلوقات کی تعداد کے مطابق، سبحان اللہ زمین وآسمان کے درمیان کی ساری مخلوقات کی تعداد کے مطابق، سبحان اللہ اس ساری مخلوقات کی تعداد کے مطابق، جس کو ابدالآباد تک پیدا فرمانے والے ہیں) اللہ اکبر اسی طرح (اللہ اکبر عدد ما خلق فی السماء، واللہ اکبر عدد ما خلق فی الارض...) الحمد للہ اسی طرح، لا الہ الا اللہ اسی طرح اور لاحول ولاقوۃ الا باللہ اسی طرح۔''

(۲) ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

دخل علیّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و بین یدی اربعة آلاف نواة اسبح بها (بهن) قال: لقد سبّحت بهذه، الا اعلمك باكثر ممّا سبحت به فقلت: بلى علمنى فقال: قولى: سبحان اللّٰہ عدد خلقه. (جامع الترمذى، ابواب الدعوات، باب بلا ترجمة قبيل احاديث شتّى من ابواب الدعوات، وقال الترمذى: هذا حديث غريب لانعرفه من حديث صفية الا من هذا الوجه من حديث هاشم بن سعيد الكوفى وليس اسناده بمعروف ۱۹۵/۲ و اخرجه الحاكم فى المستدرك ۵۴۷/۱ وقال: هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه، ووافقه الذهبى)

''حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے، دراں حالیکہ میرے سامنے کھجور کی چار ہزار گٹھلیاں تھیں، جن کے ذریعہ میں تسبیح پڑھ رہی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے ان کے ذریعہ جتنی تسبیح پڑھی، میں اس سے زیادہ تم کو نہ بتلاؤں؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں! مجھے سکھایئے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم کہو: سبحان اللہ عدد خلقہ''۔

مروجہ تسبیح کے عدمِ جواز کے اثبات میں ابوزید بکر بن عبداللہ نے ''السبحة تاريخها وحكمها'' نامی ایک رسالہ لکھا ہے، اس میں موصوف نے حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہما کی مذکورہ دونوں حدیثوں کے متعلق اولاً لکھا کہ ''وفی ثبوت سند كل منهما

نـظـر" (السبحة ص:١٦) (ان دونوں میں سے ہر ایک کی سند کے ثبوت میں نظر ہے) لیکن جب سنداً ومتناً تفصیلی بحث کی ہے، وہاں موصوف نے دونوں حدیثوں کی اسنادی حیثیت کے بارے میں اعتراف کیا ہے کہ: واما حديث صفية وحديث سعد بن ابی وقاص فيشهد كل واحد منهما للآخر، اذ ليس فی إسناد احدهما من قُدح فيه من جهة عدالته. (السبحة ص:٢٢) (بہرحال حضرت صفیہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کی حدیثوں میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے شاہد ہے، اس لیے کہ ان دونوں میں سے کسی کی سند میں ایسا راوی نہیں ہے، جس کے متعلق عدالت کی جہت سے کوئی نقد کیا گیا ہو)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں کنکریوں اور گٹھلیوں پر اذکار و تسبیحات کو شمار کرنے کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً:

(۱) ابونضرہ سے مروی ہے:

حدثنی شيخ من طفاوة قال: تثويت اباهريرة بالمدينة، فلم أر رجلا من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم اشد تشميرا ولا اقوم علىٰ ضيف منه، فبينما انا عنده يوما، وهو على سريرله، معه كيس فيه حصى او نوى، واسفل منه جارية له سوداء، وهو يسبح بها، حتى اذا نفد ما فى الكيس القاه اليها، فجمعته فاعادته فى الكيس، فدفعته اليه ... (سنن ابی دواود، كتاب النكاح، باب مايكره من ذكر الرجل ما يكون من اصابته اهله ٢٩٥/١، واخرجه الترمذی فی الادب، باب طيب الرجال ١٠٧/٢ مختصرا بقصة الطيب، وقال الترمذی: هذا حديث حسن الا ان الطفاوی لانعرفه الا فی هذا الحديث، ولا نعرف اسمه، واخرجه ابن ابی شيبة فی مصنفه، كتاب الصلاة، باب فی عقد التسبيح وعدد الحصى ١٦٣/٢ حديث: ٧٦٦٠)

"ابونضرہ فرماتے ہیں کہ ایک شیخ طُفاوی نے مجھ سے بیان کیا، کہ میں مدینہ منورہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا مہمان بنا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کسی کو ان سے زیادہ عبادت میں کوشش کرنے والا اور ان سے زیادہ مہمان کی خدمت کرنے والا نہیں دیکھا، اس دوران کہ میں ایک دن ان کے پاس تھا، اور وہ اپنی ایک چارپائی پر تھے، ان کے پاس ایک تھیلی تھی، جس میں کنکریاں یا کھجور کی گٹھلیاں بھری ہوئی تھیں، چارپائی سے نیچے ان کی ایک سیاہ رنگ کی باندی بیٹھی تھی، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ان کنکریوں یا گٹھلیوں پر تسبیح شمار

کر کے پڑھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تھیلی کی وہ سب کنکر یا گٹھلیاں ختم ہوجاتیں، تو وہ اس تھیلی کو اس باندی کی طرف ڈال دیتے، وہ ان کنکریوں یا گٹھلیوں کو جمع کرتی اور پھر تھیلی میں بھر کر ان کو دے دیتی۔ (وہ پھر ان پر تسبیح شروع کردیتے)

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

عن ابی سعید انه كان يأخذ ثلاث حصيات فيضعهن على فخذه، فيسبّح ويضع واحدة، ثم يسبّح ويضع اخرى، ثم يسبّح ويضع اخرى، ثم يرفعهن ويصنع مثل ذلك، وقال: لا تسبّحوا بالتسبيح صَفِيرًا. (المصنف لابن ابی شيبة ۱۶۳/۲ حديث: ۷۶۵۹)

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے، کہ آپ تین کنکر لے کر اپنی ران پر رکھتے تھے، پھر تسبیح پڑھتے اور ایک کنکر رکھتے تھے، پھر دوسری مرتبہ تسبیح پڑھتے اور دوسرا کنکر رکھتے تھے، پھر تیسری مرتبہ تسبیح پڑھتے اور تیسرا کنکر رکھتے تھے، پھر ان سب کنکر کو اٹھاتے، اور دوبارہ اسی طرح کرتے تھے۔ اور آپ فرماتے تھے، کہ تسبیح پڑھنے میں سیٹی نہ بجاؤ۔'' (مراد یہ ہے کہ تسبیح پڑھنے میں اس طرح جلدی نہ کرو کہ مسلسل جلد جلد حرفِ سین کی ادائیگی سے سیٹی کی آواز آئے)

(۳) یونس بن عبید اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں؛ ان کی والدہ نے فرمایا:

رأيت ابا صفية رجلا من اصحاب النبی صلى الله عليه وسلم قالت: كان جارنا ههنا، فكان اذا اصبح يسبح بالحصى او النوى. (الطبقات الكبرى لابن سعد ۴۳/۷)

''یونس بن عبید کی والدہ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی حضرت ابوصفیہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا - راویہ فرماتی ہیں کہ وہ یہاں ہمارے پڑوسی تھے- جب صبح ہوتی، تو وہ سنگریزے یا گٹھلیوں پر تسبیح پڑھتے تھے۔

مذکورہ بالا احادیث وآثار سے انگلیوں کے پوروں، کھجور کی گٹھلیوں اور کنکریوں پر تسبیحات و اذکار کا شمار کرنا قولاً یا عملاً یا تقریراً ثابت ہورہا ہے، لہٰذا اس طرح اذکار وتسبیحات کے شمار کرنے کا جواز بلاشبہ قطعی ہے۔ چنانچہ امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''سنن'' میں مستقل ایک باب قائم فرمایا ہے: "باب التسبيح بالحصى" (سنن ابی داود، ابواب الوتر ۲۱۰/۱) اسی طرح شیخ محمد بن علی بن محمد الشوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''نیل الاوطار'' میں باب قائم فرمایا ہے: "باب جواز عقد التسبيح باليد وعدّه بالنوى ونحوه" (نیل الاوطار ۳۱۶/۲)

دھاگے دانوں کی مروّجہ تسبیح پر اذکار کا شمار کرنا:

عہدرسالت میں دھاگے دانوں کی مروّجہ تسبیح کا وجود تو نہیں تھا، لیکن ماقبل میں مذکور احادیث و آثار سے انگلیوں کے پوروں، کھجور کی گٹھلیوں اور سنگریزوں پر اذکار کے شمار کرنے کا جواز ثابت ہوگیا، اور یہ بات ظاہر ہے، کہ جو گٹھلی وغیرہ منثور ومنتشر اور متفرق و الگ ہوں، ان سے شمار کرنے میں اور جو گٹھلی اور تسبیح کے دانے وغیرہ منظوم اور دھاگے میں پروئے ہوئے ہوں، ان سے شمار کرنے میں کوئی فرق نہیں۔ منظوم یعنی مروجہ تسبیح دراصل پہلی صورت ہی کی ترقی یافتہ اور سہل شکل ہے۔ جب پہلی صورت کا جواز ثابت ہوگیا، تو دوسری صورت کا جواز بھی نکل آیا۔

علامہ شوکانی فرماتے ہیں:

والحديثان الاخران (حديث سعد بن ابى وقاص الذى اخرجه ابوداود والترمذى وغيرهما وحديث صفية الذى اخرجه الترمذى والحاكم وصححه السيوطى) يدلّان على جواز عدّ التسبيح بالنوى والحصى وكذا بالسبحة لعدم الفارق لتقريره صلى اللّٰه عليه وسلم للمرأتين على ذلك وعدم انكاره. (نيل الاوطار ٣١٦/٢)

شیخ محمد عبدالرحمٰن بن عبدالرحیم مبارکپوری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ويدلّ على جواز عدّ التسبيح بالنوى والحصى حديث سعد بن ابى وقاص... وحديث صفية ... پھر آگے علامہ شوکانی رحمہ اللہ کا مذکورہ بالا کلام نقل فرمایا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی بشرح جامع الترمذی ۳۲۲/۹)

حضرت موصوف جب شرح کرتے ہوئے حدیثِ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پر پہنچے، تو تحریر فرمایا:

وفيه دليل على جواز عدّ التسبيح بالنوى والحصى وكذا بالسبحة لعدم الفارق لتقريره صلى اللّٰه عليه وسلم للمرأة على ذلك وعدم انكاره ... (تحفۃ الاحوذی ۱۲/۱۰)

شیخ محمد شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ ''عون المعبود شرح سنن ابی داود'' میں حدیث سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وهذا اصل صحيح لتجويز السبحة بتقريره صلى اللّٰه عليه وسلم فانه فى معناها، اذ لا فرق بين المنظومة والمنثورة فيما يعدّبه، ولا يعتد بقول من عدّها بدعة.

(عون المعبود ۴/۲۶۹)

"بذل المجهود شرح سنن ابی داود" میں بعینہٖ مذکورہ بالا عبارت ہے۔(بذل المجہود ۶/۲۲۹دارالبشائرالاسلامیہ)

شیخ محمود محمد خطاب السبکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ومثل النوى فيما ذكر السبحة اذ لا تزيد السبحة على ما فى هذا الحديث (اى حديث سعد بن ابى وقاص) الا بضم نحو النوى فى خيط، ومثل هذا لا يعدّ فارقا. (المنهل العذب المورود ۸/۱٦٤)

"انوارالمحمود علیٰ سنن ابی داود" میں ہے:

يجوز التسبيح بالانملة والحصى والنوى، ولا فرق بين المنظومة والمنثورة فيما يعدّ به، ولا يعتدّ بقول من عدّها بدعة... وبالجملة فى الحديث دليل لتجويز السبحة بتقرير النبى صلى اللّٰه عليه وسلم اذ لافرق بين المنظومة والمنثورة. (انوارالمحمود ۱/٤٦۰،٤٦۱)

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لم ينقل عن احد من السلف ولا من الخلف المنع من جواز عدّ الذكر بالسبحة؛ بل كان اكثرهم يعدّونه بها ولايرون ذلك مكروها. (المنحة فى السبحة ص:٦)

مروّجہ تسبیح کے استعمال میں ایک خاص ہدایت اور تنبیہ:

صاحب المنہل نے صاحب المدخل کے حوالہ سے ایک ہدایت وتنبیہ ذکر فرمائی ہے، جو اپنی جگہ بالکل بجا اور درست ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ تسبیح کو قاعدہ میں استعمال کیا جائے، اس کو قلادہ کی طرح گلے میں لٹکانا یا جس طرح خواتین اپنے ہاتھوں میں کنگن استعمال کرتی ہیں، اس طرح تسبیح کو ہاتھ پر لپیٹنا اور لوگوں کے ساتھ علمی یا غیر علمی گفتگو کے ساتھ ساتھ اس کو گھماتے رہنا گویا تسبیح بھی پڑھ رہے ہیں اور باتیں بھی ہورہی ہیں، یہ سب ریاء، شہرت طلبی اور بدعت کی باتیں ہیں۔اسی طرح علامہ علی عدوی کے حوالہ سے مزید بات یہ ذکر فرمائی ہے، کہ معتاد طریقے سے ہٹ کر بہت بڑی بڑی تسبیح بنوانا بھی ریاء اور شہرت طلبی کے امور ہیں، جو بالاتفاق حرام ہے، لہٰذا جو آدمی معتاد طریقے پر تسبیح استعمال کرے، اس کو عجب، ریاء اور شہرت طلبی کے امور سے گریز اختیار

کرنا چاہیے۔

قال صاحب المدخل: من البدع الشنيعة التى تصدر من متصوفة هذا الزمان ما يفعله بعضهم من تعليق السبحة فى عنقه، و قريب من هذا ما يفعله بعض من ينسب الى العلم فيتخذ السبحة فى يده كاتخاذ المرأة السوار فى يدها و يلازمها وهو مع ذلك يتحدث مع الناس فى مسائل العلم وغيرها و يرفع يده و يحركها فى ذراعه و بعضهم يمسكها فى يده ظاهرة للناس ينقلها واحدة واحدة كانه يذكر عليها وهو يتكلم مع الناس فى القيل والقال وما جرى لفلان وما جرى على فلان، ومعلوم انه ليس له الا لسان واحد، فعدّه علىٰ السبحة على هذا باطل لما علمت انه ليس له لسان آخر حتى يكون بهذا اللسان يذكر و باللسان الآخر يتكلم فيما يختار، فلم يبق الا ان يكون اتخاذها علىٰ هذه الصفة من الشهرة والرياء والبدعة اهـ وقد سئل العلامة شيخ المشايخ على العددى عن اتخاذ السبح (فاجاب) بأن اتخاذ السبح الكبار من خشب او عظم او غير ذلك حرام يجب التباعد عنه باتخاذ سبحة من السبح المعتادة ممّا لا يحصل بها شهرة الا انه بعد اتخاذها على الوجه المذكور لا يكون واضعا لها فى رقبته او نحو ذلك ممّا يقتضى أن حاملها من اولاد الفقراء فيؤول امره الى الرياء المحرم بالاجماع، ويحذر ايضاً ممّا يفعله بعض الناس من كونه يتكلم مع الناس فى اللهو واللعب و يدير السبحة من أولها الى آخرها يوهم انه يسبح فى تلك الحالة، والحاصل انه اذا تعاطى السبحة على الوجه المعتاد يتباعد عن الامور المقتضية للشهرة والعجب والرياء، لان ذلك كله محبط للعمل. اهـ (المنهل العذب المورود ٨/١٦٤،١٦٥)

انگلیوں پر شمار کرنا اولیٰ ہے:

دھاگے دانوں کی مروجہ تسبیح پر اذکار وتسبیحات شمار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، جبکہ اس کا استعمال قاعدہ کے مطابق ہو، تاہم اس حیثیت سے کہ انگلیوں کے پورے قیامت کے دن ان کے ذریعہ اذکار وتسبیحات شمار کرنے والوں کے بارے میں شہادت دیں گے، اور اپنا عمل ظاہر کریں گے، کہ ہم بھی شریک تسبیح رہے تھے، افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ اذکار وتسبیحات انگلیوں پر شمار

کرنا چاہیے۔ حدیث یُسیرہ رضی اللہ عنہا کے ذیل میں ''المنہل'' میں لکھا ہے:

وفی الحدیث الحث علی الذکر والترغیب فی عدّہ علی الانامل، لتشھد لہ یوم القیامۃ، ولتعود برکۃ الذکر علیھا، وأن العدّ علیھا اولی من عدّہ علی نحو السبحۃ. (المنھل ۸/۱۶۵)

علامہ شوکانی فرماتے ہیں:

والحدیث الاول (ای حدیث یسیرۃ) یدلّ علی مشروعیۃ عقد الانامل بالتسبیح ... وقد علّل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم دلك فی حدیث الباب بأن الانامل مسئولات مستنطقات یعنی انھن یشھدن بذلك، فکان عقدھن بالتسبیح من ھذہ الحیثیۃ اولی من السبحۃ والحصیٰ. (نیل الاوطار ۲/۳۱۶)

شیخ عبدالرحمٰن مبارکپوری نے بھی تقریباً یہی بات تحریر فرمائی ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ۹/۳۲۲)

کیا شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ مروّجہ تسبیح کے بدعت ہونے کے قائل تھے؟

بعض حضرات کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ مروجہ تسبیح کے بدعت ہونے کے قائل تھے۔ چنانچہ بعض ویب سائٹ پر ''مجموع فتاوی شیخ الاسلام لابن تیمیہ'' کی طرف منسوب کرکے یہ بات لکھی ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مروجہ تسبیح کے سلسلے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاویٰ میں کل تین مختلف مواقع میں کلام کیا ہے۔ دو مقامات میں ضمناً اور ایک مقام میں مستقلاً۔ تینوں فتاویٰ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، تاکہ قارئین کو صحیح صورتِ حال سمجھنے میں آسانی ہو:

(۱) جامع مسجد میں سجادہ بچھا کر اس پر نماز پڑھنا بدعت ہے یا نہیں: اصلاً اس مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

وربما تظاھر احدھم بوضع السجادۃ علی منکبہ، واظھار المسابح فی یدہ، وجعلہ من شعار الدین والصلاۃ، وقد علم بالنقل المتواتر أن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم واصحابہ لم یکن ھذا شعارھم، وکانوا یسبحون ویعقدون علی اصابعھم، کما جاء فی الحدیث: ﴿اعقدن بالاصابع فانھن مسؤلات مسنطقات﴾ وربما عقد احدھم التسبیح بحصی او نوی. والتسبیح بالمسابح من الناس من کرھہ، ومنھم من

رخّص فيه، لكن لم يقل احد: ان التسبيح به افضل من التسبيح بالاصابع وغيرها. (مجموع الفتاوى قديم ۱۸۷/۲۲ باب شروط الصلاة)

اس عبارت میں جولوگ سجادہ کو کندھے پر رکھنے اور ہاتھوں میں تسبیح کے ظاہر کرنے کو شعارِ دین وصلاۃ میں سے خیال کرتے ہیں، ان کی تردید کی ہے، اذکار کو شمار کرنے کے لیے تسبیح کے استعمال کی تردید نہیں فرمائی ہے؛ بلکہ خود کوئی حکم لگانے کی بجائے دوسروں کے نظریات کو ظاہر فرمایا ہے، کہ بعض نے مکروہ قرار دیا ہے اور بعض نے اجازت دی ہے۔ (تیسرے فتوے میں بھی ان نظریات کو ذکر کیا ہے اور وہاں اپنی رائے کو بھی ذکر فرمایا ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے)

(۲) وسئل عمّا اذا قرأ القرآن ويعد فى الصلاة بسبحة هل تبطل صلاته ام لا؟

فاجاب: ان كان المراد بهذا السؤال أن يعدّ الآيات او يعدّ تكرار السورة الواحدة، مثل قوله ﴿قل هو اللّٰه احد﴾ بالسبحة فهذا لا بأس به، وان اريد بالسؤال شىء آخر فليبينه، واللّٰه اعلم. (مجموع الفتاوى قديم ۶۲۵/۲۲ كتاب الصلاة، باب ما يحرم او يكره فى الصلاة)

اس فتوی میں اثناءِ صلوۃ آیاتِ قرآنی کا یا ایک ہی سورۃ کو بار بار پڑھنے کی صورت میں اس کے اعداد کا مروجہ تسبیح کے ذریعہ شمار کرنے کا جواز بیان کیا ہے۔

(۳) وعدّ التسبيح بالاصابع سنة، كما قال النبى صلى اللّٰه عليه وسلم للنساء: ”سبّحن واعقدن بالاصابع فانهن مسئولات مستنطقات.“ واما عدّه بالنوى والحصى ونحو ذلك فحسن، وكان من الصحابة رضى اللّٰه عنهم من يفعل ذلك وقد رأى النبى صلى اللّٰه عليه وسلم ام المؤمنين تسبح بالحصى، واقرها علىٰ ذلك، وروى أن اباهريرة كان يسبح به.

واما التسبيح بما يجعل فى نظام من الخرز ونحوه، فمن الناس من كرهه، ومنهم من لم يكرهه، واذا احسنت فيه النية فهو حسن غير مكروه، واما اتخاذه من غير حاجة، او اظهاره للناس مثل تعليقه فى العنق، او جعله كالسوار فى اليد او نحو ذلك، فهذا اما رياء للناس او مظنة المراءاة ومشابهة المرائين من غير حاجة: الاول محرم، والثانى اقل احواله الكراهة، فان مراءاة الناس فى العبادات المختصة كالصلوة والصيام والذكر وقرأة القرآن من اعظم الذنوب... (مجموع الفتاویٰ قديم ۵۰۶/۲۲)

اس فتوی میں انگلیوں سے اذکار و تسبیحات شمار کرنے کو ''سنت'' قرار دیا ہے، اور کھجور کی گٹھلی اور کنکر وغیرہ سے شمار کرنے کو ''حسن'' قرار دیا ہے، اور مروجہ تسبیح کے متعلق ذکر فرمایا، کہ بعض لوگ اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں، اور بعض مکروہ قرار نہیں دیتے۔ آگے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اپنی رائے اور نظریہ مذکور ہے، کہ جب اس میں نیت اچھی ہو تو ''حسن اور غیر مکروہ'' ہے، لیکن بلاضرورت تسبیح بنوانا یا گلے میں لٹکانے اور ہاتھ میں کنگن کی طرح لپیٹنے جیسی صورتوں کے ذریعہ لوگوں کے سامنے اس کا اظہار کرنا یا تو ریاء ہے یا مظنۂ ریاء اور بلاضرورت ریاکاروں کی مشابہت ہے۔ اگر ریاء ہے، تو حرام ہے۔ اور اگر مظنۂ ریاء اور بلاضرورت ریاکاروں کی مشابہت ہے، تو اس میں کم از کم حکم کراہت کا ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے تینوں فتاوی میں سے کسی میں بھی مروجہ تسبیح کے مطلقاً بدعت ہونے کا قول نہیں کیا ہے؛ بلکہ مروجہ تسبیح کے بنانے اور رکھنے میں اگر نیت اچھی ہو، تو اس کو بلاکراہت ''حسن'' قرار دیا ہے۔ (باقی)

دینی مدارس کا مزاج

از: قاری سعید الرحمٰن
جامعہ اسلامیہ راولپنڈی، پاکستان

صدیوں سے دینی مدارس قائم ہیں اور اپنے مقاصد کی تکمیل میں مصروف ہیں، دین کی جو بہاریں آج نظر آرہی ہیں وہ ان دینی مراکز کی برکات ہیں۔ حکومتی تعاون سے الگ تھلگ اپنے مزاج کے مطابق خاموشی سے اپنے کام میں یہ ادارے مگن ہیں۔ مدارس کی نشأۃ ثانیہ کا آغاز اب سے ایک سو چالیس (۱۴۰) سال قبل محرم ۱۲۸۳ھ = ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند اور پھر رجب ۱۲۸۳ھ = ۱۸۶۸ء میں مظاہر علوم سہارنپور سے ہوا۔ نشأۃ ثانیہ کے اس دور سے آج تک مدارس بڑے بحرانوں سے دوچار رہے، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے غیروں کے بے پناہ سازشوں کے باوجود اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہے۔ اربابِ مدارس اور علماء کرام کی مساعی اپنی جگہ اہم ہیں لیکن اصحابِ خیر مسلمانوں کا تعاون بھی انتہائی قابل رشک ہے۔ اسی لیے مدارس کبھی حکومتی تعاون کے دستِ نگر نہیں رہے، اربابِ مدارس کے سامنے بانی دارالعلوم دیوبند قاسم العلوم والخیرات حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ کے وہ آٹھ اصول ہیں جو آج بھی دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں حضرتؒ کے قلم سے محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک اصول نمبر ۸ یہ ہے کہ: ''اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں تب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی اس کی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر، کارخانۂ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجاء جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا۔'' القصہ آمدنی اور تعمیر میں ایک قسم کی بے سروسامانی رہی۔ (تاریخ دارالعلوم، ص:۱۰۶)

دارالعلوم دیوبند کے بارے میں مشہور مؤرخ شیخ محمد اکرام اپنی کتاب ''موج کوثر'' میں لکھتے ہیں کہ: ''دارالعلوم دیوبند کی ابتداء نہایت معمولی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کے کرم اور بانیوں کے

حسنِ نیت سے جلد ہی اس نے ترقی شروع کردی۔'' آگے لکھتے ہیں کہ: ''دیوبند کا قیام جنگ آزادی کے بیس پچیس سال بعد ہوا، لیکن جلد ہی اس نے قوم کے تعلیمی نظام میں معزز جگہ حاصل کرلی اور آج قدیم طرز کی اسلامی درس گاہوں میں سب سے...اس کی ترقی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا بیج اچھا تھا اور اچھے ہاتھوں سے بویا گیا تھا۔''

آگے لکھتے ہیں: ''دارالعلوم کو خوش قسمتی سے ایسے اساتذہ ملے جنھوں نے قوم کی نظروں میں اس کا وقار بڑھادیا۔ مثلاً مولانا محمودالحسن محدّث، مولانا انورشاہ محدّث اور مولانا شبیراحمد عثمانی یہ لوگ زہد وتقویٰ، راست گوئی، بے ریائی اور بے حرصی میں اسلاف کے بہترین علماء وصلحاء کا نمونہ تھے، خودغرضیوں اور کج بحثوں سے قطعاً پاک۔ نتیجہ یہ کہ مخالفین بھی ان کی عزت کرتے (موج کوثر، ص:۲۰۶ تا ۲۰۹) ان کے علاوہ شیخ المحدثین حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ قابل ذکر ہیں۔

دورحاضر کی عظیم شخصیت، علم وروحانیت کا حسین امتزاج، زندگی کا بیشتر حصہ درس وتدریس میں گذارنے والے، علماء وطلباء کیلئے قابل تقلید ہستی، تقریباً پونے صدی مدارس کے نظام سے وابستہ یعنی حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے اپنی خودنوشت اور دلچسپ معلوماتی اور اکابر کے ذکر پر مشتمل ''آپ بیتی'' میں مدارس کے مزاج اور طلباء وعلماء کے لئے بڑی فکرانگیز معلومات مہیا فرمائی ہیں۔ آج کل جب کہ سیکولر لابی اور مدارسِ دینیہ کے خلاف قوتیں وطاقتیں ان اسلامی مراکز کے خلاف مسلسل سازشوں میں مصروف ہیں علماء وطلباء کیلئے ان اکابر کے تجربات قابل توجہ ہیں۔ ''آپ بیتی'' ص:۳۵ میں ''طلباء کی تربیت اور اس کی اہمیت'' کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: ''میرے اکابرؒ کے ہاں طلباء کے آداب پر خصوصی نگاہ رہتی تھی۔ اوّل تو اس زمانہ میں اکابر اور اساتذہ کا احترام طلباء کے اندر مرکوز تھا، حضرت حکیم الامّۃ تھانویؒ کو بھی اس کا بہت احساس تھا ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں کہ ''فلاں مدرسہ میں ایک وقت میں اکابر کی ایک ایسی جماعت تھی کہ ہر قسم کی خیروبرکات موجود تھیں، ظاہر کے اعتبار سے بھی اور باطن کے اعتبار سے بھی، اس وقت تعمیر اتنی بڑی نہ تھی مگر ایک ایسی چیز اتنی بڑی تھی کہ مدرسہ خانقاہ معلوم ہوتا تھا ہر چہار طرف بزرگ ہی بزرگ نظر آتے تھے، اب سب کچھ ہے اور پہلے سے ہر چیز زائد ہے مگر وہی چیز نہیں جو اس وقت تھی گویا جسد ہے روح نہیں۔'' مدرسہ میں انجمن قائم کرنے پر فرمایا ''اب تعلیم وتربیت ختم اور نہ اب استاذ کا ادب رہا اور نہ مہتمم صاحب کا ادب رہا، نہ پیر کا ادب رہا نہ باپ کا'' یہ نہایت مشہور مقولہ اور

نہایت مجرّب ہے کہ ’’شاگرد استاذ کی بے حرمتی سے علم کی برکات سے ہمیشہ محروم رہتا ہے اور والدین کے بے حرمتی کرنے والا روزی سے ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔‘‘

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب دہلوی رئیس التبلیغ کے ملفوظات میں مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ نے طلباء کے متعلق تین اصول تفصیل سے لکھوائے، مرض الوفات میں جب ضعف انتہاء کو پہنچا ہوا تھا بات کرنے کی طاقت نہیں تھی بعد نماز فجر خاکسار کو بلایا اور ارشاد فرمایا کہ کان بالکل میرے لبوں سے لگا دو اور سنو! یہ طلباء اللہ کی امانت اور اس کا عطیہ ہیں ان کی قدر اور اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ ان کا وقت ان کی حیثیت کے مناسب پورے اہتمام سے کام میں لگایا جائے اور ذرا سا وقت بھی ضائع نہ جائے، یہ بہت کم وقت لے کر آئے ہیں، پہلے میری دو تین باتیں ان کو پہنچا دو: پہلی یہ کہ اپنے تمام اساتذہ کی توقیر اور ان سب کا ادب واحترام آپ کا خصوصی اور امتیازی فریضہ ہے آپ کو ان کی تعظیم کرنی چاہیے جیسے کہ ائمہ دین کی کی جاتی ہے وہ آپ لوگوں کیلئے علم نبوی کے حصول کا ذریعہ ہیں علم دین کے اساتذہ کے حقوق کا معاملہ اور بھی زیادہ نازک ہے ان طلباء کو میرا ایک پیغام تو یہ پہنچاؤ کہ اپنی زندگی کے اس پہلو کے اصلاح کی یہ خاص طور سے فکر کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے ’’علم لاینفع‘‘ سے پناہ مانگی اور اس کے علاوہ بھی عالم بے عمل کے لئے جو سخت وعیدیں قرآن وحدیث میں آئی ہیں وہ آپ کے علم میں ہیں۔ دوسری بات ان طلبہ سے یہ کہی جائے کہ ان کا وقت بڑا قیمتی ہے وہ بہت تھوڑا وقت لے کر آئے ہیں لہٰذا اس کا ایک لمحہ بھی یہاں ضائع نہ کریں آگے فرمایا یہ طے شدہ امر ہے اور عادت اللہ ہمیشہ سے یہی جاری ہے کہ اساتذہ کا احترام نہ کرنے والا کبھی بھی علم سے منتفع نہیں ہوسکتا۔‘‘ حضرت مولانا محمد الیاس دہلویؒ کے مقبول اور مستجاب ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ کا تبلیغی کارنامہ آج پوری دنیا میں جاری و ساری ہے۔ ان کا یہ ملفوظ علماء وطلباء کیلئے فکر انگیز ہے۔ حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ آگے فرماتے ہیں کہ میرا تجربہ یہاں تک ہے کہ انگریزی طلبہ میں بھی جو لوگ طالب علمی میں اساتذہ کی مار کھاتے ہیں وہ کافی ترقیاں حاصل کرتے ہیں۔ اونچے اونچے عہدوں پر پہنچتے ہیں غرض جس سے وہ علم حاصل کیا تھا وہ نفع پورے طور پر حاصل ہوتا ہے۔ اور جو اس زمانہ میں استاذوں کے ساتھ نخوت وتکبر سے رہتے ہیں وہ بعد میں اپنی ڈگریاں لئے ہوئے سفارشیں ہی کراتے ہیں کہیں اگر ملازمت مل بھی جاتی ہے تو آئے دن اس پر آفات آتی رہتی ہیں بہرحال جو علم بھی ہو اس کا کمال اس وقت تک ہوتا ہی نہیں اور اس کا نفع حاصل ہی نہیں ہوتا جب تک اس فن کے اساتذہ کا ادب نہ

کرے چہ جائے کہ ان سے مخالفت کرے۔ (آپ بیتی، ص:۶۲)

''تذکرۃ الرشید'' میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے بارہا فرمایا کہ ''جب میں اور مولوی محمد قاسم دہلی میں استاذ (مولانا مملوک علیؒ) سے پڑھتے تھے، منطق کی کتاب ''سلم العلوم'' شروع کرنے کا ارادہ ہوا۔ وقت میں کمی کی وجہ سے دوبار ہفتہ میں پڑھانے کا طے ہوا۔ ایک روز یہی سبق ہو رہا تھا کہ ایک شخص نیلی لنگی کندھے پر ڈالے ہوئے آنکلے اور ان کو دیکھ کر حضرت مولوی صاحب مع تمام مجمع کے کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ لو بھئی حاجی صاحب (حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحبؒ) آگئے، حاجی صاحب آگئے اور حضرت مولانا نے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا: لو بھائی رشید سبق پھر ہوگا مجھے سبق کا بہت افسوس ہوا اور میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے کہا بھئی یہ اچھا حاجی آیا ہے ہمارا سبق ہی گیا۔ مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا ایسا مت کہو یہ بزرگ ہیں اور ایسے ہیں، ایسے ہیں۔ حضرت حاجی صاحب ہمارا حال دریافت فرمایا کرتے اور یوں کہا کرتے تھے کہ سارے طالب علموں میں وہ دو طالب علم (مولانا نانوتویؒ اور مولانا گنگوہیؒ) ہوشیار معلوم ہوتے ہیں'' حضرت حاجی صاحب کی آمد پر مولانا مملوک علی صاحب کا اس عقیدت واحترام سے کھڑا ہونا دلیل ہے کہ بڑوں کی عزت کس طرح کی جاتی ہے۔

پہلے دور میں مدارس میں ہڑتالیں سٹرائی (Strike) وغیرہ ناپید تھیں بعد میں جب طلبہ کے مزاج میں آزادی، خودرائی، اساتذہ اور بڑوں کی بے ادبی کی فضاء پیدا ہونی شروع ہوئی تو یہ تحریکات بھی ظاہر ہونے لگیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے ''آپ بیتی'' میں ۱۳۸۴ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں ناکام سٹرائیک پر تفصیلی بحث فرمائی ہے اور اس کے عبرت ناک اور حیرت انگیز نتائج کا ذکر فرمایا ہے جو اس دور کے طلبہ کیلئے انتہائی قابل توجہ ہیں۔

حضرت فرماتے ہیں: ''اس ناکارہ نے اپنی زندگی میں تکبر اور گھمنڈ کے بہت ہی نقصانات اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جھوٹوں اور نادانوں کی زبان کی بدولت بڑے بڑے اکابر کو پریشانیوں میں مبتلا دیکھا۔ مدرسہ مظاہر علوم کی ۱۳۸۴ھ کی ناکام سٹرائیک اسی عُجب و پندار کے ثمرات کا نتیجہ تھا۔ مدارس میں طلبہ کا اخراج ہوتا ہی رہتا ہے لیکن اس عجب کی نحوست نے ایک معمولی طالب علم کے اخراج کو سٹرائیک تک پہنچا دیا۔ میرے نزدیک تو اس ہنگامہ کی بنیاد شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کا سایہ سرپرستی سے اٹھنا تھا ۱۳۸۲ھ میں حضرت کا وصال لاہور میں ہوا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ مدرسہ کے ممبران میں اہل اللہ ضرور ہونے چاہئیں۔ ایک طالب علم جس کی بہت سی شکایتیں مدرسہ مظاہر

علوم کی شاخ مدرسہ خلیلیہ کے ناظم کے پاس پہنچ رہی تھیں، سینمابینی، انگریزی بال، اساتذہ کا عدم احترام، نماز کی عدم پابندی، مدرسہ کے اہل شوریٰ کے مشورہ سے اس کا اخراج کیا گیا، اس طالب علم نے لیبر یونین کے ایک غیر مسلم لیڈر کے مشورہ سے رات تقریر کی کہ میرا اخراج تم سب کے اتفاق سے رک سکتا ہے۔ میں نے ناظم صاحب کو کہا کہ اس ہنگامہ کی خبر لے، مگران کو اپنی نظامت پر اتنا گھمنڈ تھا کہ انھوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ طلباء نے اندر سے دروازہ بند کرکے ایک درخواست ناظم صاحب کے پاس بھیجی، جس میں بہت سے لغو مطالبات کے ساتھ یہ مطالبہ بھی کیا فلاں طالب علم کا اخراج ملتوی کیا جائے، مدرسہ کے سب اکابر، ناظم صاحب مولانا اسعد اللہ صاحب، مولانا امیر احمد صاحب صدر مدرس وغیرہ نے بارہا سمجھایا، مگر وہ نہ مانے اس ہنگامہ میں (مرکزی) مدرسہ مظاہر علوم کے طلبہ نے بھی عصبیت جاہلیہ میں ان کا ساتھ دینے کا تہیہ کیا۔ فوراً ایک جمعیۃ الطلبہ قائم ہوئی، صدر اور ناظم متعین ہوکر حلف اٹھالئے گئے کہ جب تک شاخ والوں کے مطالبات پورے نہ ہوں مدرسہ میں بھی سٹرائیک کی جائے۔ مدرسہ کی مجلس شوریٰ میں جب یہ مسئلہ پیش ہوا تو میں نے بڑے زور سے کہا کہ اس میں دورۂ حدیث کا کوئی طالب شریک نہیں، مدرسہ کے نائب ناظم تعلیمات مولانا عبدالمجید صاحب نے دبی زبان سے کہا کہ دورہ والے بھی اس میں ہیں، میرے گھمنڈ کا مبنی یہ تھا کہ ۱۳۴۰ھ سے حدیث کے سبق میں طلبہ کو ہر سال ان کا مقام وحیثیت بتاتا اور یہ کہ تم عنقریب مقتدائے قوم بننے والے ہو۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ اس سال دورۂ حدیث والوں کی اکثریت جنید وشبلی بنیں گے، مگر میری حیرت کی انتہاء نہ رہی جب تحقیق سے معلوم ہوا کہ دورۂ حدیث کی پوری جماعت اس میں پیش پیش ہے اور زیادہ قلق اس سے ہوا کہ مجھ سے اور دیگر اساتذہ سے خصوصی تعلق رکھنے والے طلبہ در پردہ شریک رہے دورہ کی اس جماعت کے حالات پر جو قلبی چوٹ لگی وہ آج دس برس تک بھی فراموش نہیں ہوئی۔ اس دوران ان طلبہ نے اپنے اساتذہ کی خوب بے عزتی کی۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ مظاہر علوم تشریف لائے اور تبلیغی جماعتوں کو مسجد میں مستقل ٹھہرادیا جو ذکر وتلاوت اور دعاؤں میں مصروف رہتے، مختلف صوبوں وعلاقوں کی جماعتیں آتی اور اپنے اپنے صوبہ وعلاقہ کے طلبہ کو سمجھاتے۔ آخر میں افریقہ ممباسہ کے الحاج ابراہیم اسحاق آئے، انھوں نے طلبہ کے اس گروہ کے صدر صاحب سے گفتگو کی۔ پہلے انھوں نے سٹرائیک کی وجوہ بیان کیں۔ حاجی صاحب نے پوچھا کہ آپ لوگ مدرسہ میں کتنی فیس داخل کراتے ہیں۔ انھوں نے کہا

ہمارے مدارس میں فیس نہیں ہوا کرتی۔ س: آپ لوگ فارغ ہونے کے بعد مدرسہ کی کیا خدمت کرتے ہو؟ ج: کوئی متعین نہیں۔ س: آپ لوگ کھانے کا اپنے خود انتظام کرتے ہو یا مدرسہ میں قیمت داخل کرتے ہو؟ ج: ہمارا کھانا مدرسہ کی طرف سے مفت ملتا ہے۔ حاجی صاحب نے کہا کہ جب سب کچھ مدرسہ آپ کو مفت دیتا ہے تو پھر سٹرائیک کیوں کررہے ہو۔ اس دوران مدرسہ کے منتظمین کے درمیان اختلافات پیدا کرنے کی بھی زبردست سازشیں کی گئیں جو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ناکام ہوئیں۔

ایک اور مقام پر حضرت شیخ الحدیثؒ مدارس میں طلبہ تنظیموں کے وجود کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ناکارہ مدارس عربیہ میں جمعیۃ الطلبہ کا انتہائی مخالف ہے۔ اس کی قباحت تو طالب علمی کی زمانہ ہی سے میرے دل میں پڑی ہوئی ہے۔ مگر دن بدن تجربات نے مجھ کو تو اس سے اس قدر متنفر بنادیا کہ اس کے نام سے نفرت، اس کے شرکاء سے طبیعت میں انقباض ہوتا ہے۔ اس ناکارہ کا اپنے اکابر کے ساتھ ایک معمول ہمیشہ رہا ہے کہ یہ ناکارہ صحابہ کرامؓ کی طرح کہ وہ ہر فعل کو یوں فرماتے تھے کیف افعل مالم یفعلہ رسول اللہ ﷺ - یعنی جو کام رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا وہ میں کیسے کروں - اور علامہ منذری نے ترغیب وترہیب میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے ''البرکۃ مع اکابرکم'' (ترغیب، ج:۱، ص:۵۳) کہ برکت تمہارے اکابر کے ساتھ ہوتی ہے۔ میرے اکابر جو حقیقی معنی میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارثین و نائبین ہیں اور ان کے اقوال وافعال کو میں نے سنت کے بہت ہی زیادہ موافق پایا ہے اور اس کے خلاف میں ہمیشہ نقصان ہی پایا ہے، ان سب اکابر کو بھی میں نے ہمیشہ طلبہ تنظیموں کے مخالف ہی پایا...ان تنظیمات سے وابستہ طلباء میں اکابر کی بے حرمتی، اکابر مدرسہ اور اساتذۂ کرام کی حکم عدولی، توہین وغیرہ کے مناظر گذرے جب سے تو اس سے بہت ہی نفرت بڑھ گئی - ان طلباء میں اکابر کا احترام تو بالکل ہی نہیں رہتا۔ علوم سے مناسبت بھی قائم نہیں رہتی، اچھی تقریر تو مشق سے پیدا ہوجاتی ہے جس سے وہ اپنے آپ کو عالم فاضل سمجھنے لگتے ہیں اور اساتذہ پر تنقیدات شروع کردیتے ہیں جس سے علم سے محرومی طے شدہ ہے۔

ان واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ وفاق المدارس کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت عطا فرمائی ہے، اس سلسلۃ الذہب میں مدارس باہم منسلک ہیں، لیکن خطرہ ہے کہ گھمنڈ کی وجہ سے اس کو نظر نہ لگ جائے، اسلئے تعداد کی کثرت کو بیان کرنے کی بجائے اس کی کارکردگی

اور تعلیمی معیار کی طرف توجہ دی جائے۔ مدارس کے طلبہ میں بڑوں کا ادب واحترام علمی صلاحیت کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے جو آج کے دور میں مضمحل بلکہ مفقود ہوتا جارہا ہے۔ ہندوستان کے بزرگ عالم دین مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ نے ''آداب المتعلمین'' میں اپنے استاذ کا واقعہ لکھا ہے کہ ''حضرت استاذی مولانا شاہ عبدالرحمٰن صاحبؒ محدث صدرالمدرسین مظاہر علوم سہارنپور (راقم کے والد محترمؒ) نے اپنا ایک واقعہ سنایا تھا کہ میں اپنے وطن سے جب سہارنپور پڑھنے کے لئے آیا تو ہر استاذ سے مل کر آیا تھا۔ ایک استاذ جن سے ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں ان سے ملاقات نہ ہوسکی جب سہارنپور آکر پڑھنا شروع کیا تو کتاب بالکل سمجھ میں نہ آئی حالانکہ میں اپنی جماعت میں بہت سمجھدار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اسباب پر غور کیا۔ اللہ پاک نے رہنمائی فرمائی اور ان استاذ کی خدمت میں خط لکھ کر معافی مانگی اور ملاقات نہ ہوسکنے کی وجہ لکھی۔ انھوں نے جواب میں فرمایا: میرے دل میں خیال ہوا تھا کہ مجھے چھوٹا سمجھ کر شاید تم نہیں ملے، لیکن تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ یہ بات نہیں تھی۔ اس کے بعد دعائیہ الفاظ لکھے۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ اساتذہ کے احترام ہی کا نتیجہ ہے کہ تمہارے سامنے ترمذی پڑھا رہا ہوں۔ درس کا یہ عالم تھا کہ سب کا اس پر اتفاق تھا کہ ان سے بہتر اس وقت ترمذی پڑھانے والا برصغیر میں کوئی نہیں۔ (آداب المتعلمین، ص:۳۱)

اس کتاب کے ص:۳۶ میں ہے کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں نے علم حدیث کی سند حضرت حاجی محمد افضل صاحب سے حاصل کی تھی۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ تحصیل علم سے فراغت کے بعد حاجی صاحب نے اپنی ٹوپی جو پندرہ برس تک آپ کے عمامہ کے نیچے رہ چکی تھی مجھے عنایت فرمائی۔ میں نے وہ ٹوپی پانی میں بھگوئی۔ صبح وہ پانی پی گیا۔ اس پانی کی برکت سے دماغ ایسا روشن اور ذہن ایسا تیز ہوگیا کہ کوئی مشکل کتاب مشکل نہ رہی۔ اساتذہ کی ٹوپیاں اچھالنے والے اور مدرسہ کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کی اسکیمیں کرنے والے طلبہ اس پر غور کریں کہ استاذ کی عظمت کرنے والوں نے کیا دولت حاصل کی اور پھر انھوں نے دنیا کو کیا فیض پہنچایا۔

ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر علماء وطلباء کو یہ چیز مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ لادین طبقہ ہمارے صفوں میں اختلافات برپا کرکے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے درپے ہے۔ کفر کو بھی اگر اس وقت خطرہ ہے تو دینی مدارس سے ہے کہ یہ دین کو اصلی حالت میں باقی رکھنے کا

ذریعہ ہیں۔ وفاق المدارس کے خلاف پروپیگنڈا اسی ایجنڈے کی تکمیل ہے۔

سیموئیل ہینگٹن Samuel Huntington جو تہذیبی تصادم کتاب کا مصنف ہے اپنی کتاب ''ہم کون ہیں''؟ Who are we میں کہتا ہے کہ ہمارا دشمن اسلام ہے اور خطرہ صرف اسلام سے ہے۔ اس میں اس نے کہا ہے کہ اسلام کی طاقت کا منبع (Power House) اسلامی مدارس ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان کو بند کردیا جائے یا ان کے نصاب کو جدیدیت اور مغربیت سے ہم آہنگ کردیں۔ (نوائے وقت۔ کالم، کے ایم اعظم، ۱۲؍جولائی ۲۰۰۶ء)

ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ مدارس اسلام کے آخری مورچہ ہیں ان کا ختم ہونا پورے تمدن کا سقوط ہے۔ کفر جن خطرناک منصوبوں کے ساتھ مدارس کو ختم کرنے اور کمزور کرنے پر لگا ہوا ہے وہ ہم سب کیلئے قابل غور ہیں۔ انہی منصوبوں میں مدارس کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرنا اور مدارس سے وابستہ حضرات کے درمیان خلیج بپا کرنا ان کا اہم مقصد ہے ان سب سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مدارس کے نظام کو اکابر کے نقش قدم پر چلانا ہماری زندگی کا اہم مشن ہونا چاہیے تاکہ اسلام کے یہ قلعے مزید مستحکم و مضبوط ہوسکیں۔

❁ ❁ ❁

تحریک مجاہدین پر ایک نظر

از: پروفیسر ایوب قادریؒ

دوراوّل:

سید احمد شہیدؒ کی تحریک تجدید واحیائے دین اور جہاد کی تحریک تھی توحید خالص کی تبلیغ، شرک وبدعت اور قبر پرستی کا استیصال، مراسم محرم کی بیخ کنی، شادی وغمی نیز دیگر تقریبات کے غیر اسلامی مراسم کے بجائے اسلامی سادہ زندگی کا احیاء اور نکاح بیوگان کی ترویج واشاعت اس تحریک کے خاص عنصر تھے، اس مقصد کے لئے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے تقویت الایمان جیسی انقلاب آفریں کتاب لکھی[(۱)]۔ پھر تو اس سلسلہ کو اس قدر وسعت ہوئی کہ اس خانوادے کے دوسرے تربیت یافتہ علماء نے احیاء سنت اور اصلاح معاشرہ کے لئے متعدد کتابیں اور رسالے لکھے، اور اچھا خاصا ادب مہیا کردیا۔[(۲)]

سید احمد شہید کی تحریک کا اہم ترین عنصر جہاد اور اصل مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام تھا سید صاحب کا کوئی مکتوب یا وعظ ترغیب جہاد سے خالی نہ تھا جس زمانہ میں پنجاب میں سکھا شاہی کا زور تھا مساجد اور اسلامی شعائر کی علانیہ بے حرمتی ہوتی تھی۔ اس علاقے کے مسلمان سخت مصائب و آلام میں مبتلا تھے ان کی زندگیاں اجیرن ہوچکی تھیں، سید احمد شہیدؒ نے اس طاغوتی اور برائے نام سکھا شاہی حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کیا، گھر بار چھوڑا بہت سے شہر اور قصبات کا دورہ کیا ہجرت و جہاد کے وعظ کہے اللہ کے دین کی سربلندی اور اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر سرحد کے پہاڑوں کو کمین گاہ بنایا اور اسلام کے ان خادموں نے ایمان واخلاص کے بھروسے پر دین کے دشمنوں سے مقابلہ کیا، اور ان کے چھکے چھڑا دیئے مگر ملت کا نصیبہ سویا ہوا تھا گردش کے دن ابھی باقی تھے، غلامی کا دور ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ حالات نے ناسازگاری دکھائی، اپنوں نے غیروں کا

ساتھ دیا، نتیجہ ظاہر تھا کہ ۲۴/ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۶/مئی ۱۸۳۱ء) کو سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ شہید نے بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کیا۔[۳]

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

دورِ دوم وسوم

حادثۂ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء کے بعد جماعتی تنظیم کی غرض سے اہل الرائے حضرات کے مشورے اور اصرار پر شیخ ولی محمد پھلتی امیر جماعت قرار پائے۔ مجاہدین کی سالاری عامہ کے فرائض مولوی نصیرالدین منگلوری نے انجام دیے اور جب شیخ ولی محمد پھلتی سید احمد شہید کی زوجہ بی بی صاحبہ کو لے کر سندھ چلے گئے تو مجاہدین کی امارت وسالاری کا سارا بارگراں مولوی نصیرالدین منگلوری کے دوش ہمت پر رہا۔[۴]

مولوی نصیرالدین منگلوری[۵] کی شہادت (۱۸۳۸ء) کے بعد جب مولوی سید نصیرالدین دہلوی مجاہدین کے مرکز ستھانہ پہنچے تو وہ امیر بنادیئے گئے، لیکن ابھی وہ وہاں کوئی کارنامہ انجام نہ دینے پائے تھے کہ ان کا انتقال ہوا، مولانا غلام رسول مہر صاحب کا خیال ہے کہ ۱۸۴۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔[۶] اوران کے انتقال پر تحریک مجاہدین کا دوسرا دور ختم ہوا۔

مولانا ولایت علی

مولوی سید نصیرالدین دہلوی کی وفات کے بعد مجاہدین نے میر اولاد علی کو اپنا امیر بنالیا۔ جو ایک مرتبہ مولوی نصیرالدین منگلوری کی شہادت کے بعد بھی کچھ مدت کے لئے منصب امارت پر مقرر ہوئے تھے، لیکن جب مولانا ولایت علی عظیم آبادی اس علاقہ میں پہنچے (۱۷/شوال ۱۲۶۲ھ م ۹/اکتوبر ۱۸۴۶ء) تو قیادت ان کے سپرد ہوئی اوراب تحریک مجاہدین کا تیسرا دور شروع ہوا مولانا ولایت علی نے مجاہدین کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی، اس وقت کشمیر کے راجا گلاب سنگھ اور مجاہدین کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی تھی، راجا کو شکست ہوئی اس نے انگریزوں کے سایہ میں جاکر پناہ لی، جو اس وقت تک پنجاب کے ایک حصہ پر قابض اور ملکی معاملات میں پوری طرح دخیل ہوچکے تھے۔ مارچ ۱۸۴۹ء میں تمام پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ ۱۸۴۹ء سے تحریک جہاد کا ایک نیا موڑ شروع ہوتا ہے۔ چونکہ اب تک مقابلہ سکھوں سے تھا اس لئے سرکار کمپنی خاموش

تھی جب پنجاب پورے طور پر انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو مجاہدین کی سرگرمیاں انگریزی حکومت کو ایک آنکھ نہ بھائیں، حکومت کے پیدا کردہ حالات سے مجبور ہوکر مولانا ولایت علی اور ان کے بھائی مولانا عنایت علی اپنے وطن پٹنہ پہنچے اور وہاں مجسٹریٹ کے سامنے جاکر دو سال کے لئے مچلکے دئے۔ مولانا ولایت علی نے تبلیغ وتذکیر کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ مولانا عنایت علی کو بنگال بھیجا اور دو سال کی مدت گزارنے کے بعد سرحد روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچنے کے سال ڈیڑھ سال بعد ۲۲/محرم ۱۲۶۹ھ (۵/نومبر ۱۸۵۳ء) کو انتقال ہوگیا۔

مولانا عنایت علی

مولانا ولایت علی کے انتقال کے بعد ان کے منجھلے بھائی مولانا عنایت علی امیر مقرر ہوئے جو نہایت پرجوش مجاہد تھے بہت سے معرکوں میں حصہ لے چکے تھے۔ مولانا عنایت علی نے ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۸ء تک برابر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور براہ راست انگریزی حکومت سے جھڑپیں رہیں انگریزوں کے حلیف جہاں دادخاں والی امب پر حملہ ہوا اسی زمانے میں مولانا عنایت علی نے انگریزی حکومت کی فجوں سے بھی براہ راست تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی[۷] ۱۸۵۸ء میں پشاور سے جنرل کاٹن کی سرکردگی میں مجاہدین پر حملہ ہوا، مجاہدین نے خوب داد شجاعت دی، مگر بڑی تعداد میں شہید ہوئے اور کچھ پہاڑوں میں چھپ گئے۔ مولانا عنایت علی نے ستھانہ کا رخ کیا، مگر راستے ہی میں بمقام چمپئی داعی اجل کو لبیک کہا (۱۲۷۴ھ=۱۸۵۸ء)

مولانا عنایت علی کے بعد ۱۸۶۲ء میں ان کے بھتیجے مولانا عبداللہ ابن مولانا ولایت علی، امیر مقرر ہوئے[۸] مولانا عبداللہ (ف ۱۹۰۳ء) زمام کار ہاتھ میں لیتے ہی تندہی اور مستعدی کے ساتھ جماعت کی فوجی تربیت میں لگ گئے۔ مولانا عبداللہ کا دور امارت کا سب سے اہم واقعہ معرکۂ امبیلا (۱۸۶۳ء) ہے، معرکۂ امبیلا میں مجاہدین نے دین کی عظمت اور سربلندی کے لئے جس عزم واستقلال اور بہادری وجانبازی کا مظاہرہ کیا اس سے انگریزی حکومت کے حوصلے پست ہوگئے گو میدان انگریزی حکومت ہی کے ہاتھ رہا مگر اس کو بخوبی اندازہ ہوگیا کہ سرحد کے مجاہدین کو انگریزی مقبوضات کے اندر سے رسد اسلحہ، رقوم اور تازہ دم مجاہدین پہنچتے ہیں اور ہندوستان میں اس تحریک کا سب سے بڑا مرکز صادق پور پٹنہ ہے اور اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے معلوم نہیں کتنے مراکز ہیں۔

بغاوت کے مقدمات

جنگ امبیلا کے بعد انبالے کا مشہور مقدمہ (۱۸۶۴ء) ظہور پذیر ہوا جس میں گیارہ ملزم: (۱) محمد شفیع انبالوی (۲) عبدالکریم (۳) الٰہی بخش (۴) میاں حسینی تھانیسری (۵) حسینی عظیم آبادی (۶) عبدالغفور (۷) قاضی میاں جان (۸) مولوی یحییٰ علی (۹) میاں عبدالغفار (۱۰) مولوی عبدالرحیم (۱۱) محمد جعفر تھانیسری تھے جن میں سے اول الذکر چھ حضرات ابتلاء و آزمائش میں ثابت قدم نہ رہ سکے اور سرکاری گواہ بن کر نہایت ذلت و خواری کے ساتھ رہا ہوئے البتہ پانچ حضرات نے ایمان و استقامت کا پورا پورا ثبوت دیا۔ قاضی میاں جان انبالہ جیل میں وفات پاگئے، مولوی یحییٰ علی نے جو تقویٰ اور ایمان و اخلاص میں سلف کا نمونہ تھے جزیرہ انڈمان کو آرام گاہ بنایا باقی تین حضرات میاں عبدالغفار، مولوی عبدالرحیم اور مولوی محمد جعفر تھانیسری نہایت سخت جان نکلے اور اٹھارہ سال کی مدت جزائر انڈمان میں گزار کر وطن پہنچے۔(۹)

مقدمۂ انبالہ کے بعد حکومت نے پٹنہ (۱۸۶۵ء) مالدہ (۱۸۷۰ء) راج محل (۱۸۷۰ء) اور پٹنہ (۱۸۷۱ء بار دوم) میں بہت سے علماء تجار اور مبلغین پر بغاوت اور سازش کے مقدمے چلائے۔ پٹنہ کے پہلے مقدمے ۱۸۶۵ء میں مولانا احمد اللہ صادق پوری (۱۲۲۳ھ-۱۲۹۸ھ) بن الٰہی بخش کو ملزم بنا کر مقدمہ چلایا گیا۔ اول انہیں سزائے موت کا حکم ہوا پھر اپیل کرنے پر یہ سزا حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل ہوئی اور ان کا انتقال ۲۸/ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۲/نومبر ۱۸۸۱ء کو جزائر انڈمان میں ہوا۔(۱۰)

مالدہ کے مقدمہ ۱۸۷۰ء کے ملزم مولوی امیرالدین بن رفیع منڈل تھے مالدہ ان کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ایک شخص نولو کرسٹو گھوش نے مخبری کی جس کے نتیجے میں مولوی امیرالدین گرفتار ہوئے مقدمہ چلا حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی، جزائر انڈمان پہنچے بحیثیت قیدی ان کا نمبر (۱۷۴۷۸) تھا۔ ۱۸۸۲ء میں مولوی عبدالرحیم کے ہمراہ رہا ہوئے۔ اگلومی (راج محل) پرگنہ سنتھال میں سکونت اختیار کرلی۔(۱۲)

پٹنہ کا دوسرا مقدمہ ۱۸۷۱ء میں چلا جس میں سات ملزم پیر محمد، امیر خاں، حشمت داد خاں، (یا حشم داد خاں) مولوی مبارک علی، مولوی تبارک علی (ابن مولوی مبارک علی) حاجی دین محمد اور امین الدین تھے، ان حضرات میں جماعتی تنظیم کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم مولوی

مبارک علی تھی۔ (۱۳)

اس مقدمہ میں ماخوذین کی جائدادیں ضبط ہوئیں ان کو جیلوں میں ٹھونسا گیا حبس دوام بعبور درائے شور کی سزائیں دی گئیں یہی نہیں بلکہ بنگال اور بہار کے تمام مبلغوں کی فہرست مرتب کی گئی اور اس فہرت کے بموجب تقریباً دس سال تک یہ غریب تنگ کئے جاتے رہے اور اس کی وجہ سے بنگال کے کتنے ہی خوش حال خاندان تباہ و برباد کردیئے گئے۔ سازش کے مقدمات کا ذکر کرنے کے بعد مولوی مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں: (۱۴)

''اس کے یہ معنی نہیں کہ صرف یہی حضرات قید ومحن میں مبتلا کئے گئے ۱۸۴۹ء سے ۱۸۷۱ء تک گرفتاریوں کا سلسلہ برابر جاری رہا بڑی تعداد لے دے کر'' چھوڑ دی گئی اور بے قانون اور بے سزا حوالات اور جیلوں میں سڑتے پھرے ایک اچھی خاصی جماعت وعدہ معاف گواہ بننے پر مجبور کی گئی۔

سرعبدالرحیم لکھتے ہیں: (۱۵)

''بنگال میں وہابی تحریک کے بعد جو عمل اختیار کیا اس سے مسلمان جاگیردار اور زمینداروں کی تمام املاک جو وسعت میں تمام بنگال کی ایک چوتھائی تھی گورنمنٹ انگلشیہ نے ضبط کرلی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری ملت کے سیکڑوں شریف اور خوش حال خاندان نان شبینہ کو محتاج ہوگئے۔ اور ہماری قوم کے ہزاروں افراد بیکسی اور مفلسی میں دربدر پھرنے لگے۔''

حکومت کی معاندانہ پالیسی

حقیقت یہ ہے کہ انگریز نے تحریک جہاد کو بری طرح کچلا، مجاہدین اور مصلحین کو 'وہابی' (۱۶) کے نام سے موسوم کرکے بدنام کیا گیا۔ تمام ملک میں ''وہابیوں'' کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں سے ان کے حالات اور سرگرمیوں کی کیفیت طلب کی ایک محکمہ سراغ رسانی اسی مقصد خاص کے لئے وجود میں آیا، حکومت انگریزی نے باغی اور وہابی مترادف الفاظ قرار دیئے، عامۃ المسلمین میں ان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کیا۔ اور ایک عام معاشرتی انقطاع شروع ہوگیا۔

بعض علماء کا کردار

بہت سے علماء نے مذہبی خدمات سمجھ کر وہابیوں کی مخالفت کی، حکومت نے ایسے علماء کی سرگرمیوں کو بہ نظر استحسان دیکھا اور ان علماء کو بالواسطہ یا بلا واسطہ ان خدمات کا معاوضہ دیا، وہابیوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے روکا گیا،(۱۷) مقدمات قائم کرکے ان کے قبضے سے مسجدیں نکالی گئیں ایک عرصہ تک حکومت کی عام پالیسی اس سلسلے میں یہ رہی کہ ایسے مقدمات میں بالعموم وہابیوں کی مخالفت پارٹی کے حق میں فیصلہ ہوا۔

مولوی وصی احمد سورتی ثم پیلی بھیتی (ف ۱۳۳۴ھ) نے ایک ''فتویٰ'' جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد مرتب کیا۔ گم نام سے گمنام مولوی نے اس پر دستخط کئے۔(۱۸) اس فتوے کی خوب تشہیر ہوئی مولوی محمد لدھیانوی (ف ۱۹۰۱ء) بن مولوی عبدالقادر لدھیانوی نے اس موضوع پر ایک رسالہ انتظام المساجد باخراج اہل الفتن والمفاسد لکھا۔(۱۹) اسی طرح لاہور کے مولوی نبی بخش حلوائی نے اخراج المنافقین من مساجد المسلمین لکھا۔(۲۰) ان فتاویٰ اور رسائل کی رو سے مساجد میں ''وہابیوں'' کو نماز پڑھنے سے روکا گیا ان کو زدوکوب کیا گیا ان کی تذلیل اور تشہیر کی گئی۔ اگر ایک طرف ''ولیم ولسن ہنٹر نے اور انڈین مسلمانس'' لکھ کر ان کے خلاف حکومت کو مواد مہیا کیا تو دوسری طرف مولانا فضل رسول بدایونی (ف ۱۳۰۹ھ=۱۸۷۲ء) اور ان کے ہمنوا علماء نے غریب ''وہابیوں'' کے خلاف تصنیفات وتالیفات کا ایک انبار لگا دیا۔

مولوی فضل رسول بدایونی کی تصانیف میں سیف الجبار، تصحیح المسائل، البوارق المحمدیہ لرجم الشیاطین النجدیہ، احقاق الحق وابطال الباطل اور مجموعہ رسائل وفوائد وغیرہ ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ مولانا فضل رسول بدایونی کی تصانیف کی طباعت کے سلسلے میں ایک بات خاص طور سے ہم نے نوٹ کی کہ ان کی اکثر تصانیف کسی نہ کسی سرکاری ملازم کی اعانت سے شائع ہوئی ہیں۔

شاید یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہو کہ مولوی فضل رسول بدایونی کو ریاست حیدرآباد سے سترہ روپے یومیہ وظیفہ دیا گیا جو بعد کو گیارہ روپے یومیہ ہوگیا۔ اور ۱۹۱۵ء تک ان کی اولاد کو ملتا رہا۔ جیسا کہ ان کے سوانح نگار نے لکھا ہے۔(۲۱)

مولانا حیدر علی ٹونکی نے اس سلسلے میں ایک خاص بات یہ لکھی(۲۲) ہے کہ مولوی فضل رسول بدایونی نے مولانا اسمٰعیل شہید دہلویؒ کی شہادت ۱۸۳۱ء کے بیس سال بعد وہابیوں کی رد میں

کتابیں لکھنی شروع کیں۔ظاہر ہے پنجاب کے انگریزوں کے قبضے میں آجانے کے بعد مجاہدین کا مقابلہ براہ راستہ انگریزوں سے تھا۔

مولوی فضل رسول کے ہمنوا علماء میں ان کے بھانجے اور داماد مولوی فیض احمد بدایونی نے تعلیم الجاہل، مولوی عماد الدین سنبھلی نے شمس الایمان، مولوی محی الدین نے رسالہ صولۃ قادریہ مولوی سراج الحق نے رسالہ تحفۃ الحرمین شریفین، رسالہ مسائل فقہیہ مولوی عبدالفتاح گلشن آبادی نے تحفہ محمدیہ فی ردوہابیہ لکھے۔(۲۳)

وہابی یا اہل حدیث

غیروں اور اپنوں کے اس رویے سے ''وہابی'' گھبرا اٹھے اور انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے جہاد کی تحریک اندرون ہند پاکستان قطعی طور سے ختم ہوگئی۔اپنے لئے ''وہابی'' کے بجائے ''اہل حدیث'' کا نام مروج ومشتہر کیا۔انھوں نے باقاعدہ حکومت برطانیہ کی وفاداری کا اعلان کیا مولوی محمد حسین بٹالوی (ف ۱۳۳۸ھ) نے سرکاری تحریرات میں وہابی کے بجائے اہل حدیث لکھے جانے کے باقاعدہ احکام جاری کرائے۔

مولوی محمد حسین بٹالوی نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی منسوخی پر ایک مستقل رسالہ ''الاقتصاد فی مسائل الجہاد'' ۱۲۹۲ھ میں لکھا۔(انگریزی اور عربی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ یہ رسالہ سرچارلس ایچی سن اور سرجیمس لائل، گورنران پنجاب کے نام معنون کیا گیا۔مولوی محمد حسین نے اپنی جماعت کے علماء سے رائے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں یہ رسالہ اشاعت السنہ کی جلد دوم شمارہ گیارہ میں بطور ضمیمہ شائع کیا پھر مزید مشورہ وتحقیق کے بعد ۱۳۰۶ھ میں باضابطہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔اس سلسلے میں خود مولوی حسین بٹالوی لکھتے ہیں:(۲۴)

> ''اگر چہ اس مضمون منسوخی جہاد، کے رسائل گورنمنٹ اور ملک کے اور خیر خواہوں نے بھی لکھے ہیں لیکن جو ایک خصوصیت اس رسالے میں ہے وہ آج تک کی کسی تالیف میں پائی نہیں جاتی وہ یہ ہے کہ یہ رسالہ صرف مؤلف کا خیال نہیں رہا۔اس گروہ کے عوام وخواص نے ...اس کو پسند کیا اور اس سے اپنی آرا کا توافق ظاہر کیا۔
> اس توافق رائے حاصل کرنے کے لئے مؤلف (محمد حسین بٹالوی) نے عظیم آباد پٹنہ تک ایک سفر کیا تھا جس میں لوگوں کو یہ رسالہ سنا کر اتفاق حاصل کیا اور جہاں خود

نہیں پہنچا وہاں اس رسالہ کی متعدد کاپیاں ارسال کر کے توافق حاصل کیا۔

مولوی مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:(۲۵)

''اس کتاب پر (مولوی محمد حسین بٹالوی) انعام سے بھی سرفراز ہوئے جماعت اہل حدیث کو فرقے کی شکل دینے میں ان کا خاص حصہ ہے۔ اور یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے اس سادہ لوح فرقے میں وفاداری کی خوبو پیدا کی، نہ صرف یہ ہوا بلکہ دوسرے معاصر علماء کو سرکاری مخالفت کے طعنے بھی دیئے۔''

مسعود عالم ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:(۲۶)

''معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے معاوضے میں سرکار انگریزی سے انہیں ''جاگیر'' بھی ملی تھی۔ اس رسالے کا پہلا حصہ پیش نظر ہے پوری کتاب تحریف و تدلیس کا عجیب وغریب نمونہ ہے۔''

مولوی عبدالمجید خادم سوہدری لکھتے ہیں:(۲۷)

''(مولوی محمد حسین بٹالوی نے) اشاعۃ السنہ کے ذریعہ اہل حدیث کی بہت خدمت کی ''لفظ'' ''وہابی'' آپ ہی کی کوشش سے سرکاری دفاتر اور کاغذات سے منسوخ ہوا اور جماعت کو اہل حدیث کے نام سے موسوم کیا گیا... (آپ نے) حکومت کی خدمت بھی کی اور انعام میں جاگیر پائی۔''

مولوی محمد حسین بٹالوی نے لفظ ''وہابی'' کی منسوخی کے لئے جو کوششیں کی ہیں وہ سارا تحریری مواد ہمارے پیش نظر ہے طوالت کے خوف سے ہم اس کو یہاں نقل نہیں کر سکتے صرف اشارات پر اکتفا کرتے ہیں، انھوں نے ارکان جماعت اہلحدیث کی ایک دستخطی درخواست لفٹنٹ گورنر پنجاب کے ذریعے سے وائسرائے ہند کی خدمت میں روانہ کردی، اس درخواست پر سرفہرست شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط تھے۔ گورنر پنجاب نے وہ درخواست اپنی تائیدی تحریر کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیج دی، وہاں سے حسب ضابطہ منظوری آگئی کہ آئندہ وہابی کے بجائے ''اہل حدیث'' کا لفظ استعمال کیا جائے۔ لفٹنٹ گورنر پنجاب نے باقاعدہ اس کی اطلاع مولوی محمد حسین کو دی، اسی طرح گورنمنٹ مدراس کی طرف سے ۱۵/اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۲۷، گورنمنٹ بنگال کی طرف سے ۴/مارچ ۱۸۹۰ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۵۶، اور گورنمنٹ یوپی کی طرف سے ۲۰/جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۳۸۶، گورنمنٹ سی پی کی طرف

سے ۴؍جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۴۰۷ اور گورنمنٹ بمبئی کی طرف سے ۴؍اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۷۳۲ اس امر کی اطلاع مولوی محمد حسین بٹالوی کو ملی۔

مولوی محمد حسین بٹالوی نے خوشامد اور کاسہ لیسی کی حد کردی وہ لکھتے ہیں:(۲۸)

''اس گروہ اہل حدیث کے خیر خواہ وفادار رعایا برٹش گورنمنٹ ہونے پر ایک بڑی اور روشن اور قوی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ برٹش گورنمنٹ کے زیر حمایت رہنے کو اسلامی سلطنتوں کے ماتحت رہنے سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس امر کو اپنے قومی وکیل اشاعۃ السنہ کے ذریعے سے جس کے (۱۰) جلد (۶) میں اس امر کا بیان ہوا ہے۔ (اور وہ نمبر ہر ایک لوکل گورنمنٹ در گورنمنٹ آف انڈیا میں پہنچ چکا ہے) گورنمنٹ پر بخوبی ظاہر اور مدلل کرچکے ہیں جو آج تک کسی اسلامی فرقہ رعایا گورنمنٹ نے ظاہر نہیں کیا اور نہ آئندہ کسی سے اس کے ظاہر ہونے کی امید ہوسکتی ہے۔''

اسی طرح ملکہ وکٹوریہ کے جشن جوبلی پر جو ایڈریس محمد حسین بٹالوی نے گروہ مسلمانان اہل حدیث کی طرف سے پیش کیا تھا اس میں لکھا تھا:(۲۹)

''یہ مذہبی آزادی اس گروہ کو خاص کر اس سلطنت میں حاصل ہے بخلاف دوسرے اسلامی فرقوں کے کہ ان کو اور اسلامی سلطنتوں میں بھی یہ آزادی حاصل ہے اس خصوصیت سے یہ یقین ہوسکتا ہے کہ اس گروہ کو اس سلطنت کے قیام واستحکام سے زیادہ مسرت ہے اور ان کے دل سے مبارکباد کی صدائیں زیادہ زور کے ساتھ نعرہ زن ہیں''

اسی طرح لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کی سبکدوشی پر جماعت اہل حدیث نے ایک خوشامدانہ ایڈریس دیا، جس پر سب سے پہلے شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط ہیں، اس کے بعد ابوسعید محمد حسین وکیل اہل حدیث مولوی احمد اللہ واعظ میونسپل کمشنر امرتسر، مولوی قطب الدین پیشوائے اہل حدیث روپڑ، مولوی حافظ عبداللہ غازی پوری(۳۰) مولوی محمد سعید بنارسی، مولوی محمد ابراہیم آرہ اور مولوی نظام الدین پیشوائے اہل حدیث مدراس کے دستخط ہیں۔

مولوی محمد حسین بٹالوی کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں:

''ان بے چاروں کو یہ ہوش نہیں رہا کہ وہ اپنے کو سرکار کی زد سے بچانے کی فکر میں کیا کررہے ہیں اور اپنے ماننے والوں کو کس پستی کی طرف لے جارہے ہیں۔ مولوی

محمد حسین صاحب اوران ہی جیسے بعض علماء اہل حدیث کی روش کا یہ نتیجہ ہوا کہ موجودہ جماعت اہل حدیث کا عام رجحان فروعی مسئلوں تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔''

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم لکھتے ہیں:(۳۱)

''اہل حدیث کے نام سے اس وقت بھی جو تحریک ہے حقیقت کی رو سے وہ قدم نہیں نقش قدم ہے۔ مولانا اسماعیل شہیدؒ جس تحریک کو لے کر اٹھے تھے وہ فقہ کے چند مسائل نہ تھے بلکہ امامت کبریٰ، توحید خالص اور اتباع نبی کریم ﷺ کی بنیادی تعلیمات تھیں مگر افسوس ہے کہ سیلاب نکل گیا اور باقی جو رہ گیا ہے وہ گزرے ہوئے پانی کی فقط لکیر ہے۔''

مولوی محمد حسین بٹالوی کی پوری پالیسی میں شمس العلماء شیخ الکل میاں نذیر حسین مدد و معاون بلکہ سرپرست و سرخیل رہے، اور صادق پور کی بجائے مرکز قیادت دہلی و لاہور منتقل ہوگیا۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز پر دسمبر ۱۹۰۶ء میں بمقام آرہ (بہار) آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس وجود میں آئی جس کے سب سے فعال کارکن مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری تھے۔ اہل حدیث کانفرنس کی کارروائی کم وبیش مولوی محمد حسین بٹالوی ہی کے انداز پر رہی۔

انگریز یا سکھ

تحریک مجاہدین کے سلسلے میں ایک امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ بعض لوگوں نے یہ بحث چھیڑی ہے کہ تحریک مجاہدین کا مقصد سکھوں کا استیصال تھا یا انگریزوں کے اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنا۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریک مجاہدین کا مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام اور مسلمانوں کے گئے ہوئے اقتدار کو واپس لانا تھا۔

ہمارے خیال سے تحریک مجاہدین کی اساس شاہ عبدالعزیز دہلوی کے اس فتوے پر ہے جس میں انھوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا ہے۔(۳۲) مولانا مہر صاحب نے مکاتیب شاہ اسمٰعیل شہید سے اس کے متعلق ناقابل تردید شہادتیں پیش کی ہیں۔(۳۳)

اس سلسلے میں انھوں نے باقاعدہ جہاد کا منصوبہ بنایا اور ایک طریق کار وضع کیا کہ پہلے سکھوں کا خاتمہ کرنا چاہئے۔ اور پھر انگریزوں کی طاقت سے نمٹنا چاہیے چنانچہ اس کے بدیہی

آثار وقرائن موجود ہیں۔ سکھوں[۳۳] کے بعد انھوں نے مسلسل انگریزوں سے مقابلہ کیا اور حکومت برطانیہ پریشان ہوگئی حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کا مقصد مسلمانوں سے زیادہ تو انگریز مورخ ڈبلیوڈبلیو ہنٹر نے سمجھا ہے اور آور انڈین مسلمانس“ میں واضح کردیا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ شوشہ بھی خود اپنوں ہی کی طرف سے حکومت برطانیہ کی وفاداری کے سلسلے میں چھوڑا گیا۔ سب سے پہلے سرسید احمد خاں (ف ۱۸۹۸ء) نے اورانڈین مسلمانس پر تبصرہ[۳۴] کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ جہاد سکھوں کے خلاف تھا پھر اس تحریک کے خاص رکن مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اصل مواد میں ترمیم کرکے انگریزوں کی بجائے سکھوں کا لفظ لکھا اور اس کو مشتہر کیا[۳۵] بعض کوتاہ فہم یا پست ذہنیت رکھنے والے اشخاص تحریک مجاہدین کی اہمیت کم کرنے کے لئے اس قسم کے غیر معیاری رسالے کبھی کبھی چھاپتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس کوچے ہی سے نابلد ہیں وہ تحریک مجاہدین کو کیا سمجھیں۔

❁ ❁ ❁

حواشی:

(۱) مولانا فضل حق خیرآبادی (ف ۱۲۷۸ھ=۱۸۶۱ء) نے سب سے پہلے تقویۃ الایمان کی ایک عبارت ”اس شہنشاہ کی تو یہ شان...کی برابر کے پیدا کرڈالے“ پر امتناع نظیر اور امکان نظیر کی بحث چھیڑی اور ایک مختصر سا رسالہ اس عبارت کے رد میں لکھا، پھر تو اس سلسلے میں بہت سے رسالے قلمبند ہوئے اور تقویۃ الایمان کے مستقل رد لکھے گئے۔ غرض اس تحریک کی مخالفت کے آغاز کا سہرا مولانا فضل حق خیرآبادی کے سر ہے۔ (اعتراضات تقویۃ الایمان از مولانا فضل حق خیرآبادی۔ قلمی مملوکہ حکیم نصیرالدین ندوی کراچی) ص:۱۔

(۲) مسائل اربعین ومائۃ مسائل (شاہ محمد اسحاق ف ۱۲۶۲ھ=۳۷-۱۸۳۸ء) نصیحۃ المسلمین ورسالہ جہادیہ مولوی خرم علی بلہوری (ف ۱۲۷۳ھ=۱۸۵۶ء) ہدایۃ المومنین رسالہ راہ سنت ورسالہ ردعقائد مشرکین (مولوی اولاد حسن قنوجی (ف ۱۲۵۳ھ=۳۷-۱۸۳۸ء) رسالہ تقویٰ، رسالہ کلمات کفر وعقائد نامہ (مولوی سخاوت علی (ف ۱۲۷۴ھ=۱۸۵۸ء) رسالہ دعوت ورسالہ رد شرک مولوی ولایت علی (ف ۱۲۶۶ھ=۱۸۵۲ء) رسالہ بت شکن (مولوی عنایت علی ف ۱۲۷۶ھ=۱۸۵۸ء) رسالہ تجہیز وتکفین مسلمان کی، (مولوی محمد عمران بدایونی ف ۱۲۷۱ھ=۱۸۵۵ء) رفاہ المسلمین (شرح مسائل اربعین، وسعادت دارین (مولوی سعد الدین بدایونی ف ۱۲۸۳ھ=۱۸۶۶ء) تحفۃ المسلمین (ترجمہ مسائل اربعین) ورسالہ عقیقہ (ملا نظام ف ۱۸۹۰ء) تذکیر الاخوان (مولوی سلطان خاں شاہ آبادی) تنبیہ الغافلین (ترجمہ وشرح) وترجمہ مسائل اربعین وتفسیر مقبول (مولوی عبداللہ بن بہادر علی حسینی وغیرہ کتب ورسائل خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

(۳) جس وقت اللہ کے یہ فرمانبردار بندے (دین وملت کی خاطر میدان جہاد میں اپنی جانیں نچھاور کررہے تھے اس زمانے میں اس تحریک کے سب سے زیادہ مخالف مولانا فضل حق خیرآبادی (ف ۱۲۷۸ھ=۱۸۶۱ء) ایجنٹ دہلی کے محکمہ میں سررشتہ دار اور مولوی فضل رسول بدایونی (ف ۱۲۸۹ھ=۱۸۷۲ء) کلکٹری بدایوں (سہسوان) میں سررشتہ دار تھے، حکومت برطانیہ کی دوراندیشی اور پالیسی ملاحظہ ہو کہ اس نے مسلمانوں کے ذہین اور صاحب علم وفضل طبقے کو سرکاری خدمات کے لئے حاصل کرلیا۔ دہلی میں

دبیرالدولہ نواب فریدالدین (ف ۱۲۴۴ھ=۱۸۲۸ء) منشی زین العابدین (ف ۱۲۷۳ھ=۱۸۵۶ء) مفتی صدرالدین آزردہ (ف ۱۲۸۵ھ=۱۸۶۸ء) مولوی فضل امام خیرآبادی (ف ۱۲۴۴ھ=۱۸۲۹ء) مولوی محمد صالح خیرآبادی (برادر فضل امام خیرآبادی) منشی فضل عظیم خیرآبادی (فرزند اکبر فضل امام خیرآبادی) مولوی فضل حق خیرآبادی (ف ۱۲۷۸ھ=۱۸۶۱ء) بدایوں میں مولوی فضل رسول (ف ۱۲۸۹ھ=۲-۱۸۷ء) مولوی علی بخش صدرالصدور (ف ۱۳۰۳ھ=۶-۱۸۸۵ء) مرادآباد میں مولوی عبدالقادر چیف رامپوری (ف ۱۲۶۵ھ=۱۸۴۹ء) الہ آباد میں مفتی اسداللہ (ف ۱۳۰۰ھ=۳-۱۸۸۲ء) وقاضی عطاء رسول چریا کوٹی۔ کلکتہ میں قاضی نجم الدین خاں کاکوروی (ف ۱۲۲۹ھ=۱۸۱۳ء) اوران کے صاجزادگان، قاضی سعید الدین (ف ۱۲۶۲ھ=۱۸۴۶ء) مولوی حکیم الدین (ف ۱۲۶۹ھ=۱۸۵۴ء) اور قاضی علیم الدین (ف ۱۲۵۷ھ=۱۸۴۱ء) وغیرہ مدراس میں قاضی ارتضاء علی گوپاموی (ف ۱۲۷۰ھ=۴-۱۸۵۳ء) اور ناسک میں خان بہادر مولوی عبدالفتاح مفتی وغیرہ برصغیر پاک وہند کے وہ اعاظم وافاضل ہیں جنھوں نے منصب افتاء، اقتضاء اورصدرالصدوری کے ذریعے سرکار کمپنی کے انتظام واقتدارحکومت کو بحال اور مضبوط کیا، ملاحظہ ہوسیرت فریدیہ از سرسید احمد خاں، ص:۱۸،۴۰ باغی ہندوستان از عبدالشاہد خاں شروانی، ص:۴۰ علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اوّل ص:۲۵۵،ص:۲۵۷ وجلد دوم ص:۱۱۳، ۱۹۹۶۹۸۷ بیاض مولانا فضل حق خیرآبادی ص ۳۴ (مملوکہ حکیم نصیرالدین نظامی دواخانہ کراچی) اکمل التاریخ از محمد یعقوب ضیاء جلدوم ص:۵۱ تذکرہ علمائے ہند، ص:۱۰۸، ۱۰۹، ۳۴۲، ۳۴۴، ۳۴۴، ۵۰۹، ۵۱۲، ۵۱۳۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری ص ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۹۰، ۳۸۷، ۴۳۳۔ مجاہدین از مولانا غلام رسول مہر (کتاب منزل لاہور ۱۹۵۶ء) ص:۱۲۱، ۱۲۴۔

(۴) مولوی نصیرالدین منگلوی کے حالات کے لئے دیکھئے سرگذشت مجاہدین ص ۱۲۳-۱۲۸۔ مولوی سیدنصیرالدین دہلوی کے لئے ملاحظہ ہوسرگذشت مجاہدین، ص:۱۳۵-۲۱۳۔

(۵) سرگزشت مجاہدین ص:۲۰۷

(۶) سرگزشت مجاہدین ص:۲۹۔

(۷) ۱۸۵۸ء میں مولانا عنایت علی کے انتقال کے بعد میں تین سال تک مجاہدین کی قیادت میر نصر اللہ اور میر مقصود علی نے کی۔ ملاحظہ ہوہسٹری آف فریڈم مومنٹ جلد دوم حصہ اوّل ،ص:۱۴۶ کراچی ۱۹۶۰ء ۔

(۸) اس مقدمے کے واقعات وحالات کے لئے ملاحظہ ہوسرگزشت ص:۳۹۱ وص:۳۹۵ وتواریخ عجیب (کالاپانی) ازمولوی محمد جعفرت تھانیسری (مرتبہ محمد ایوب قادری) کراچی ۱۹۱۲ء ۔

(۹) ملاحظہ ہوتواریخ عجیب (کالاپانی ص:۲۲۱، ۲۲۷۔

(۱۰) تواریخ عجیب ص:۲۲۷-۲۲۸۔

(۱۱) تواریخ عجیب، ص:۳۵۲۔

(۱۲) اس مقدمے کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ازمسعود عالم ندوی حیدرآباد دکن (۱۳۷۱ھ) ص:۱۶۷،ص:۱۸۰ وسرگزشت مجاہدین، ص:۴۱۶،ص:۲۵۔

(۱۳) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ازمسعود عالم ندوی۔ص:۱۶۸، ۱۶۹۔

(۱۴) خطبۂ صدارت آنریبل سرعبدالرحیم، اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ علی گڈھ ۱۹۲۵ء (ترجمہ قاضی عبدالرشید) ص ۱۲، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ۱۹۲۵ء ۔

(۱۵) ترکوں اور انگریزوں کے سیاسی پروپیگنڈے نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کو وہابیت کا نام دے کر بدنام کیا، ہندپاکستان میں انگریزوں نے سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے حضرات کو وہابیوں کے نام سے مطعون کیا۔ اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو ''ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ازمسعود عالم ندوی۔ص:۱۵، ۳۱۔

(۱۶) ملاحظہ ہو جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد مرتبہ وصی احمد سورتی مطبوعہ مطبع ریاض آگرہ)

(۱۷) ایضاً۔

(۱۸) ایضاً، ص:۱۹۔

(۱۹) اخراج المنافقین من مساجد المسلمین نبی بخش حلوائی (کریمی پریس لاہور)

(۲۰) اکمل التاریخ (جلد دوم) از مولوی محمد یعقوب صاحب، ضیاء القادری بدایونی (۱۹۱۵ء) ص:۵۲۔

(۲۱) صیانۃ الاناس از حیدر علی ص:۳،۴۔ (خطی) رضا لائبریری رامپور)

(۲۲) ملاحظہ ہو طوالع الانوار از مولوی انوار الحق (مطبع صبح صادق سیتاپور ۱۲۹۶ھ) ص:۸۵ و۹۱ و اکمل التاریخ جلد دوم ص:۲۵

(۲۳) رسالہ اشاعۃ السنہ لاہور جلد ۸ نمبر ۵، ص:۲۶۱-۲۶۲۔

(۲۴) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۲۹۔

(۲۵) سیرت ثنائی از مولوی عبد المجید خادم سوہدری (گجرانوالہ ۱۹۵۲ء) ص:۳۷۲۔

(۲۶) اس سلسلے میں ملاحظہ ہو اشاعۃ السنہ لاہور جلد گیارہ شمارہ:۲، ص:۲۶-۳۹ و مآثر صدیقی جلد دوم (لکھنؤ ۱۹۲۳ء) ص: ۱۶۲-۱۶۳۔

(۲۷) اشاعۃ السنہ (لاہور) جلد ۸ شمارہ ۹، ص:۲۶۲۔

(۲۸) اشاعۃ السنہ (لاہور) جلد ۹ شمارہ نمبر ۷ ص ۲۰۵-۲۰۶۔

(۲۹) مولوی حافظ عبداللہ غازی پوری کی سرکار انگلشیہ کی وفاداری کے سلسلے میں ملاحظہ ہو ''شمع توحید'' از مولوی ثناء اللہ امرتسری مکتبہ ثنائیہ سرگودھا سنہ طباعت ندارد، ص:۴۲۔

(۳۰) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، ص:۲۹۔

(۳۱) تراجم علماء حدیث ہند از ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی (مقدمہ از مولانا سید سلیمان ندویؒ) دہلی ۱۹۳۸ء ص:۳۸۔

(۳۲) تفصیل کیلئے دیکھئے فتاویٰ عزیزی از شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۴۱ھ) ص:۱۶-۱۷۔

(۳۳) جماعت مجاہدین از مولانا غلام رسول مہر (کتاب منزل لاہور ۱۹۵۵ء) ص:۱۱-۱۶

(۳۴) مولانا محمد میاں مصنف ''علماے ہند کا شاندار ماضی'' نے جلد دوم (ص:۲۷۰-۲۷۷) میں سکھوں کے مقابلہ کو ہنگامی حالات کا تقاضا بتایا ہے۔

(۳۵) ملاحظہ ہو سید احمد شہیدؒ (مہر) ص:۱۵۹-۱۶۲۔

❁ ❁ ❁

محاربۂ ۱۸۵۷ء

از: پروفیسر خلیق نظامیؒ

۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدیم وجدید کے درمیان یہی وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش بھی پڑھے جاسکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے۔ مغلیہ سلطنت جس کے دامن میں ایک ایسی تہذیب نے پرورش پائی تھی جو رنگ ونسل اور مذہب وملت کے سارے امتیازات سے بالاتر ہوکر ایک عرصہ تک ہندوستان کی سیاسی وحدت کی ضامن رہی تھی، یہاں پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے۔اور اس کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہوجاتا ہے۔پُرانا سماجی نظام اور پرانے نظریات وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہوجاتے ہیں اور نئی سماجی قوتیں صرف فکر ونظر کے سانچے ہی توڑنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے سارے محور بدل دیتی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں صرف ایک سیاسی نظام ہی کا جنازہ نہیں نکلتا بلکہ ہندی قرونِ وسطیٰ کا سارا تہذیبی سرمایہ بھی نیست ونابود ہوجاتا ہے۔دہلی جو صدیوں تک علم وہنر کا مرکز اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہی تھی اس طرح تباہ وبرباد ہوجاتی ہے کہ دیکھنے والے بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں۔

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک! اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

اس سیاسی اور تمدنی بربادی کی داستان مورخین نے مختلف نقطۂ ہائے نظر سے ترتیب دی ہے۔بعض نے اس کا مطالعہ محض سپاہیوں کے ہنگامہ کی حیثیت سے کیا ہے،بعض نے پوری تحریک میں صرف چند رجعت پسند عناصر کی سرگرمی دیکھی ہے اور کچھ مصنّفین نے اس کو ایک ڈوبتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کے سنبھالے کی کوشش سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اوراس طرح کی تمام تعبیریں

حقیقت کے صرف ایک پہلو کو سامنے لاتی ہیں اس لیے جزوی طور پر صحیح لیکن کلی طور پر غلط ہیں۔

دنیا کی کسی تحریک کا بھی بے تعصبی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اُس میں حصہ لینے والے سب لوگوں کے مقاصد اور مطمح ہائے نظر ایک نہیں ہوتے۔ ''فرانس'' میں جب Cahiers ذریعہ فرانسیسی باشندوں کی شکایات اور مطالبات کا پتہ لگانے کی جستجو کی گئی تو معلوم ہوا کہ جہاں کچھ لوگ مطلق العنان شخصی حکومت سے نالاں تھے، وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو صرف یہ شکایت تھی کہ اُن کے محلّہ میں روشنی کا کوئی معقول انتظام نہ تھا

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

تاریخ عالم شاہد ہے کہ کسی محکم سیاسی نظام کو توڑنے کے لیے جو تحریک بھی اٹھتی ہے اُسے اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے کتنی ہی پُر پیچ وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی وقتی جذبات اور عارضی مصالح، بنیادی مقاصد اور حقیقی نصب العین کو شکست دیتے ہوئے نظر آئے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تحریک اُن ہاتھوں میں چلی جاتی ہے جو اپنے افکار کی پستی اور کردار کی درماندگی کی بنا پر قیادت کی اہلیت نہیں رکھتے، لیکن بایں ہمہ تحریک کے مقصد و منہاج کا جو نقش معاصرین کے ذہنوں میں قائم ہو جاتا ہے وہی اس کی نوعیت کو متعین کرتا ہے اور اُسی سے اُس کی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ انقلابِ فرانس کا مقصد شہنشاہیت کا استیصال اور ایک ایسے نظام کی تشکیل تھا جس کی عمارت حُریت، اخوت اور مساوات کی محکم بنیادوں پر قائم ہو، لیکن کیا انقلاب ''فرانس'' کی تاریخ میں صرف یہی مرکزی نقطۂ نظر ہمیشہ اور ہر طبقہ کا رہا ہے؟ - مورخوں نے تسلیم کیا ہے کہ انقلاب کے دوران میں بارہا ایسے عناصر برسر اقتدار آئے جو تحریک کی قیادت کی اہلیت نہ رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود تحریک کا دھارا Scum white scum red کو اپنی سطح پر لیے اپنے مقصد کی جانب بڑھتا رہا۔

۱۸۵۷ء میں سپاہیوں کی بغاوت بھی ہوئی اور رجعت پسند عناصر نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد بھی کی، لیکن مجموعی حیثیت سے تحریک کی نوعیت غیر ملکی اقتدار کے خلاف قومی تحریک ہی کی رہی اور اس کا احساس ''انگلستان'' کے بعض معاصر صحافیوں اور مدبروں کو بھی تھا۔ لارڈ ''سالسبری'' نے ایوان عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ کیسے تسلیم کرلیا جائے کہ اتنی وسیع اور زبردست تحریک صرف کارتوسوں کی وجہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''لندن'' کے ایک اخبار نے اسی زمانہ میں لکھا تھا:

''اگر بے اطمینانی صرف سپاہیوں تک ہی محدود ہے اور عام لوگ ہمارے ساتھ ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ہند کیوں بار بار انگریزی فوجیں طلب کرتی ہے اور تار پر تار کیوں کھڑکاتی ہے؟ اگر لوگ حکومت کے ساتھ ہیں جیسا کہ وزیر اور کمپنی کے ڈائرکٹر بیان کرتے ہیں تو انھیں وہیں سے اتنے آدمی مل سکتے ہیں کہ وہ اُن سے دس فوجیں کھڑی کرلیں''

انگریز نے اپنا تسلط قائم کرلینے کے بعد جس بہیمیت اور بربریت کے ساتھ ہندوستانیوں کو سزائیں دی تھیں اور ہزاروں بے گناہ انسانوں کو محض انتقامی جذبے کے ماتحت موت کے گھاٹ اُتارا تھا اُس سے ملک میں خوف اور دہشت کی ایک عام کیفیت پیدا ہوگئی۔ ہندوستانیوں میں اتنی ہمت تک نہ رہی کہ تحریک کی نوعیت کے متعلق ایک حرف بھی نوک زبان پر لاسکیں۔ انگریز نے تحریک کو ''غدر'' کہا تو وہ خود بھی اُسے ''غدر'' کہنے لگے۔

جوں جوں دلوں سے خوف کے پردے ہٹے، تحریک کی صحیح نوعیت کا احساس بھی بیدار ہونے لگا اور اُسی کے ساتھ ساتھ زاویہ نگاہ میں تبدیلی بھی پیدا ہونے لگی۔ ''غدر'' سے ''رستخیز بے جا'' ہوا، اور ''رستخیز بے جا'' سے ''ہنگامہ ۱۸۵۷ء'' اور آزادی کے بعد ''آزادی کی پہلی جنگ'' یا ''قومی تحریک''۔ گویہ سب الفاظ بدلتی ہوئی سیاسی فضا کے آئینہ دار ہیں، لیکن یہ شبہ ذہن میں پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ معاصرین ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو ''قومی تحریک'' یا ''آزادی کی جدوجہد'' سے تعبیر نہیں کرتے تھے صحیح ہے کہ قومیت کا موجودہ تصور اس دور میں نہ تھا، لیکن انگریزوں کے خلاف پورے ''ہندوستان'' کے ایک ہونے کا تصور ''غدر'' سے بہت پہلے ہندوستانی ذہن میں کام کرنے لگا تھا۔ ''سید احمد شہیدؒ'' نے ''ہندوراؤ'' کو جو خط لکھا تھا اُس میں ''بیگانوں'' کے ''ہندوستان'' پر قابض ہوجانے کی شکایت تھی! گویا وہ ایک ہی گھر کے آدمی کو مشترکہ دشمن کے خلاف اشتراک عمل کی دعوت دے رہے تھے۔ رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' میں گو مصلحت وقت نے بعض مقامات پر ''سرسید'' کا قلم پکڑلیا ہے لیکن پھر بھی اُنھوں نے تحریک کی نوعیت کو واضح کرنے میں سرمو کوتاہی نہیں کی۔ اُن کا ایک طرف یہ لکھنا کہ:

''بہت سی باتیں ایک مدّت دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہوگیا تھا صرف اس کے شتابے میں آگ لگانی باقی تھی۔ کہ سال گزشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگادی۔''(۱)

اور دوسری طرف یہ کہنا کہ:

''سب لوگ تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ واسطے اسلوبی اور خوبی اور پائداری گورنمنٹ کے مداخلت رعایا کی حکومت ملک میں واجبات میں سے ہے...اور یہ بات نہیں حاصل ہوتی جب تک کہ مداخلت رعایا کی حکومتِ ملک میں نہ ہو...پس یہی ایک بات ہے جو جڑ ہے تمام ''ہندوستان'' کے فساد کی اور جتنی باتیں اور جمع ہوتی گئیں وہ سب اُس کی شاخیں ہیں۔'' (۲)

صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ تحریک کی عوامی حیثیت کے پورے طور پر معترف تھے۔ خود انگریزوں نے اس تحریک کو دبانے کے لیے جو طریقۂ کار اختیار کیا تھا اور جس طرح ہندوستانیوں کو سزائیں دی تھیں اُس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس تحریک کو ''قومی تحریک'' سمجھتے تھے۔ (۳) اور اسی طرح اُنھوں نے اس کا مقابلہ بھی کیا تھا۔ ہندوستانیوں نے اس ہنگامے کو جس نگاہ سے دیکھا تھا اور اس میں شرکت کرنے والوں کو قومی تاریخ میں جو درجہ دیا تھا اس کا اندازہ منیر شکوہ آبادی کے اُن اشعار سے لگایا جا سکتا ہے جو اُنھوں نے نوابانِ ''فرخ آباد'' اور مولوی ''محمد باقر'' کی پھانسی کے سلسلے میں کہے ہیں۔ لکھتے ہیں ؎

تاریخ اُن کے قتل کی کافی ہے یہ منیر
دونوں شہیدِ راہِ خدا آہ آہ ہائے

خدا کی راہ میں مقتول ہو کے آخر کار
گئے جہان سے وہ سوئے روضۂ رضواں
کہی منیر نے یہ اُن کی مرگ کی تاریخ
شہید و متقی و عالمِ علومِ نہاں

محض یہ حقیقت کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر سے گزرنے والوں کو (۱۲۷۴ھ) ''مجاہدین فی سبیل اللہ'' اور ''شہداءِ راہ خدا'' کا درجہ دیا گیا تھا۔ ہندوستانیوں کی تحریک سے گہری وابستگی کو سمجھنے کے لیے بس کرتی ہے!

۱۸۵۷ء کی تحریک میں سکھوں اور پارسیوں کے علاوہ ہر مذہب و ملت کے لوگوں نے حصہ لیا تھا۔ تحریک کی ہمہ گیری کا عالم یہ تھا کہ تین ہفتوں کے اندر اندر سارے ملک میں ہنگامے شروع

ہو گئے تھے۔اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ''ہندوستان'' کے بعض علاقے تحریک سے علیحدہ رہے اور بعض نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔لیکن اس سے تحریک کی نوعیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔کسی بھی قومی تحریک یا جنگِ آزادی میں تمام علاقوں اور تمام طبقات نے شرکت نہیں کی ہے۔انقلاب ''فرانس'' کے وقت ملک میں ایک ایسا طبقہ موجود تھا جو شہنشاہیت کو قائم رکھنا چاہتا تھا اور اس کی موافقت میں کام کررہا تھا۔اسی طرح ''امریکہ'' کی جنگِ آزادی میں بہت سے لوگ تاجِ برطانیہ کے مددگار رہے تھے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک عوامی ہوتے ہوئے بھی ناکام کیوں رہی۔اس سلسلہ میں تاریخِ انقلاب کا ایک راز فراموش نہیں کرنا چاہیے۔انقلابی جذبات کے بیدار ہونے کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ عوام کے دل میں کسی نظام کے خلاف شدید بے چینی ہو وہاں اس کی کامیابی کے لیے ازبس لازمی ہے کہ مستقبل کی تعمیر کا ایک واضح خاکہ ذہن میں ہو۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت اور برطانوی طریق کار سے سخت بیزاری ضرور نظر آتی ہے لیکن کسی ایک شخص کے ذہن میں بھی تشکیل جدید کا نقشہ نہیں ملتا! یہی نہیں؛ بلکہ اُس وقت جتنی طاقتیں بھی میدان میں سرگرم عمل تھیں اُن میں سے کوئی بھی ایک کُل ہند نظام کا بوجھ سنبھالنے کی صلاحیت نہ رکھتی تھی۔یہ ایسی محرومی تھی جس نے ساری تحریک کی روح کو مضمحل کردیا تھا۔اور ہر فوجی مہم کسی مقصد تک رہبری کرنے کے بجائے وقتی ہنگامہ آرائی میں ختم ہوجاتی تھی۔جمہوریت اور خود اختیاری کے افکار ابھی سیاسی شعور میں داخل نہیں ہوئے تھے اس لیے سیاسی زندگی کی تعمیرِ نو کا سوال بے معنی تھا۔شخصی حکومت کا تصور اس طرح رگ وریشہ میں پیوست ہوچکا تھا کہ ہر مقام پر لوگ ایک ''بہادر شاہ''، ایک ''نانا صاحب''، ایک ''رانی لکشمی بائی''، ایک ''برجیس قدر'' کی تلاش کرتے تھے۔اور چاہتے تھے کہ ان ہی کے سہارے کوئی ایسا نظام تشکیل پاجائے جو اُن کے مصائب کا علاج اور اُن کے درد کا مداوا بن سکے۔مغل بادشاہ، ''ہندوستان'' کا تو سوال کیا، ''لال قلعہ'' کو بھی قابو میں رکھنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔(۴) ''مرہٹوں'' کی اجتماعی طاقت کا عرصہ ہوا خاتمہ ہوچکا تھا۔''روہیلوں'' کے چند سردار جو اس وقت مختلف مقامات پر اپنی طاقت کا استحکام کررہے تھے، مقامی طور پر مدافعت اور کاربرآری کی صلاحیت تو رکھتے تھے، لیکن ایک وسیع علاقہ پر حکومت کرنے کے لیے جس دور اندیشی، تدبر اور انتظامی صلاحیت کی ضرورت تھی اس کا دُور دُور کہیں پتہ نہ تھا۔پھر اس شخصی عقیدت کے نازک رشتوں کو بھی توڑنے کے لیے کتنے ہی عناصر کام

کررہے تھے۔ ''دہلی'' میں ''بخت خاں'' کو نہ صرف مغل شہزادوں کا تعاون حاصل نہ ہوسکا بلکہ اس کا اثر توڑنے کے لیے یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ ''شیرشاہ'' کی طرح اس کا اقتدار بھی مغلیہ خاندان کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔ ''لکھنؤ'' میں ''حضرت محل'' کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی کہ اگر ''احمداللہ شاہ'' کی مدد سے اقتدار قائم ہوا تو سنیوں کا غلبہ ہوجائے گا۔ اسی طرح ''روہیلوں'' کے علاقوں میں ہندو زمینداروں کو ''روہیلہ'' سرداروں سے برگشتہ کیا گیا۔ ''لارنس'' نے سکھوں کو ''بہادرشاہ'' سے بدظن کرکے ''دہلی'' کے ساتھ سکھوں کے اشتراکِ عمل کے امکانات کو ختم کردیا۔ ان تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود اگر ۱۸۵۷ء کا ہندوستان اپنی بہترین صلاحیتوں کو یکجا کردیتا تو یقیناً غلامی کی زنجیریں اتنی آسانی سے نہ پہنائی جاسکتیں!

(۲)

۱۸۵۷ء کی تحریک غیرملکی اقتدار کے خلاف جنگ کی ابتدا، بھی تھی اور ایک منزل بھی یہ سمجھ لینا صحیح نہ ہوگا کہ اس سے قبل انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات کا اظہار نہیں ہوا تھا۔(۵) ہندوستانیوں کا ذہن غیرملکی تسلط کے خلاف پورے طور پر تیار ہوچکا تھا۔ یہ سیاسی شعور اور بیداری ''شاہ ولی اللہ'' دہلویؒ (م۱۷۶۲ء =۱۱۷۶ھ) اوران کے گھرانے کی پیدا کی ہوئی تھی۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی تصانیف میں ملوکیت اور شہنشاہیت کے خلاف جگہ جگہ آواز اُٹھائی تھی اور سیاسی نظام کی اصلاح کے لیے صرف اعلیٰ طبقوں اور امراء وحکام ہی کو متوجہ نہیں کیا تھا، بلکہ عوام کو بھی مخاطب کیا تھا۔ اُن کی تحریک کا سب سے زیادہ ترقی پسند پہلو یہ تھا کہ وہ سیاسی نظام کا انحصار ''عوام'' پر سمجھتے تھے اوران میں یہ احساس پیدا کرنا چاہتے تھے کہ اگر وہ تیار ہوجائیں تو سارے مصائب کا اعلاج ممکن ہے۔ ان کے جانشینوں نے اُن کی تحریک کو آگے بڑھایا اوران کے پیدا کیے ہوئے سیاسی شعور کی روشنی میں ملک کی رہبری کی۔ شاہ ''عبدالعزیز'' صاحبؒ (م۱۸۲۴ء = ۱۲۳۹ھ) نے ایک فتویٰ میں کہا تھا:

''دریں شہر حکم امام المسلمین اصلاً جاری نیست وحکمِ روساء نصاریٰ بے دغدغہ جاری ست ومراد از اجراء احکام کفر اینست کہ درمقدمہ ملک داری و بندوبست رعایا واخذ خراج و باج وعشور اموال تجارت وسیاست قطاع الطریق وسراق وفیصل خصومات وسزائے جنایات کفار بطور حاکم باشند آرے اگر بعضے احکام اسلام رامثل جمعہ، عیدین واذان وذبح بقرتعرض نہ کنند نہ کردہ باشند، لیکن اصل اصول ایں چیزہا نزدایشاں ہباء وہدرست زیرا کہ مساجد را بے تکلف ہدم می نمائند وہیچ مسلمان یاذمی

بغیر استیمان ایشاں دریں شہر ونواح نمی تواند آمد و برائے منفعت خود از واردین مسافرین وتجار مخالفت نمی نمایند اعیان دیگر مثلاً ''شجاح الملک'' و ''ولایتی بیگم'' بغیر حکم ایشاں دریں بلاد داخل نمی توانند شد و ازیں شہر تا ''کلکتہ'' عمل نصاریٰ ممتد است۔ آرے در چپ و راست مثل ''حیدرآباد''، ''لکھنؤ'' و ''رامپور'' احکام خود جاری نہ کردہ اند بسبب مصالحت واطاعت مالکان آں'' (۶)

''یہاں روساء نصاریٰ کا حکم بلا دغدغہ اور بے دھڑک جاری ہے اور ان کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری اور بندوبست رعایا، خراج وباج، مالِ تجارت پر ٹیکس، ڈاکوؤں اور چوروں کو سزائیں، مقدمات کے تصفیے، جرائم کی سزائیں وغیرہ (ان تمام معاملات میں) یہ لوگ بطور خود حاکم اور مختار مطلق ہیں۔ ہندوستانیوں کو اُن کے بارے میں کوئی دخل نہیں بیشک نماز جمعہ، عیدین، اذان، ذبیحہ گاؤ جیسے اسلام کے چند احکام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے، لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور بنیاد ہے وہ قطعاً بے حقیقت اور پامال ہے۔ چنانچہ بے تکلف مسجدوں کو مسمار کردیتے ہیں عوام کی شہری آزادی ختم ہوچکی ہے۔ انتہا یہ کہ کوئی مسلمان یا غیر مسلم اُن کی اجازت کے بغیر اس شہر یا اُس کے اطراف وجوانب میں نہیں آسکتا۔ عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی اجازت دینا بھی ملکی مفاد یا عوام کی شہری آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے نفع کی خاطر ہے۔ اس کے بالمقابل خاص خاص اور ممتاز اور نمایاں حضرات مثلاً ''شجاع الملک'' اور ''ولایتی بیگم'' ان کی اجازت کے بغیر اس ملک میں داخل نہیں ہوسکتے۔ ''دہلی'' سے ''کلکتہ'' تک انہی کی عملداری ہے۔ بیشک کچھ دائیں بائیں مثلاً ''حیدرآباد''، ''لکھنؤ''، ''رامپور'' میں چونکہ وہاں کے فرمانرواؤں نے اطاعت قبول کرلی ہے (براہ راست) نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے۔

شاہ ''عبدالعزیز'' صاحبؒ نے ''ہندوستان'' کو ''دارالحرب'' قرار دے کر، غیرملکی اقتدار کے خلاف سب سے پہلا اور سب سے زیادہ موثر قدم اُٹھایا تھا (۷)۔ اس فتوے کی اہمیت کو وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ''دارالحرب'' کے صحیح مفہوم کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی سیاست پر خاندان ولی اللّٰہی کے اثرات کا بھی صحیح علم رکھتے ہوں۔ سید احمد شہیدؒ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ وغیرہ نے اپنے سیاسی فکر میں انگریزی اقتدار کو جو درجہ دیا تھا اُس کی بنیاد یہی فتویٰ تھا۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک جس کو مصلحتاً

بعض ممتاز اشخاص نے سکھوں کے خلاف تحریک کا رنگ دے دیا تھا، حقیقتاً انگریزوں ہی کے خلاف سب سے زیادہ منظّم کوشش تھی۔ اُن کا مقصد اولیں یہی تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایسے مقام پر طاقت کا استحکام ضروری تھا جہاں سے انگریزوں کے خلاف جنگ کی تنظیم کرنے میں مدد ملے۔ اگر سرحد اور پنجاب میں وہ اپنی طاقت کے استحکام میں کامیاب ہوجاتے تو ہندوستان میں برطانوی سامراج کے قدم اتنی آسانی سے نہیں جم سکتے تھے۔ ان کی تحریک کی نوعیت اور اُن کے مقاصد کا اندازہ اس خط سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے راجہ ''ہندوراؤ'' کو لکھا تھا:

''بررائے عالی روشن ومبرہن است کہ بیگانگاں بعید الوطن، ملوک زمین وزمن گردیدہ اندو تاجران متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ، امرائے کبار وریاست رؤسائے عالی مقدار برباد نمودہ اندو عزت واعتبار شاں بالکل ربودہ چوں اہل ریاست وسیاست درزاویۂ خمول نشستہ اند ناچار چندے اہل فقر ومسکنت کمرہمت بستہ ایں جماعتِ ضعفاء محض بنابر خدمت دین رب العالمین برجستند، ہرگز ہرگز از دنیاداران جاہ نیستند، محض بنابر خدمت درین رب ذوالجلال برخاستہ اند، نہ بنابر طمع مال ومنال رفتے کہ میدان ہندوستاں از بیگانگاں ودشمنان خالی گردیدہ وتیر سعی ایشاں برہدف مراد رسیدہ آئندہ مناصب ریاست وسیاست بطالبین آں مسلم باد۔'' (۸)

> ''جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہان کے تاجدار اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بڑے بڑے اہل حکومت کی حکومت اوران کی عزت وحرمت کو انھوں نے خاک میں ملادیا ہے جو حکومت وسیاست کے مردمیدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اس لیے مجبوراً چند غریب وبے سروسامان کمرہمت باندھ کر کھڑے ہوگئے اور محض اللہ کے دین کی خدمت کے لیے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ یہ اللہ کے بندے ہرگز دنیادار اور جاہ طلب نہیں ہیں۔ محض اللہ کے دین کی خدمت کے لیے اُٹھے ہیں، مال ودولت کی اُن کو ذرہ برابر طمع نہیں۔ جس وقت ہندوستان ان غیرملکیوں سے خالی ہوجائے گا اور ہماری کوششیں بارآور ہوگئیں حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو اُن کی طلب ہوگی۔''

سید صاحب کے عزیز ترین مرید اور دست راست مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ نے اُن کی

سیاسی فکرکو ''منصب امامت'' میں اور زیادہ واضح طور پر پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ملوکیت سب سے بڑی لعنت ہے۔ سلاطین وملوک کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''استیصال اوعین انتظام ست واہلاک اوعین اسلام و اطاعتِ ہر متسلط از احکام شرعیہ نیست۔'' (۹)

''اُن کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا، عین انتظام ہے اور اُن کو فنا کر دینا عین اسلام ہے۔ ہر صاحب اقتدار کی اطاعت کرنا حکم شریعت نہیں ہے۔''

مسلمانوں کی تنظیمی صلاحیت، عسکری قابلیت، معاملہ فہمی اور تدبر کا جو کچھ بچا کھچا سرمایہ رہ گیا تھا اس کو سید احمد شہیدؒ نے بہترین طریقہ پر استعمال کیا۔ وقتی طور پر اُن کو ناکامی ضرور ہوئی لیکن ان کی تحریک نے سرفروشی کا جو جذبہ پیدا کر دیا تھا وہ ایک عرصہ تک قلب وجگر میں شعلہ کی طرح بھڑکتا رہا۔

جلے، جل کر بجھے بھی چشمِ صورت بیں میں پروانے
فروزاں کر گئے وہ نام لیکن شمعِ سوزاں کا

حقیقت یہ ہے کہ سید احمد شہیدؒ اور اُنے رفقاءِ کار کے خون سے آزادی کا پودا ہندوستان میں سینچا گیا۔ انگریزوں نے اُن کی تحریک کی نوعیت کو خوب سمجھ لیا تھا اور وہ اس جذبہ سے بھی بے خبر نہ تھے جو جماعت مجاہدین کے قلب وجگر کو گرمائے ہوئے تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے ایک طرف تو ''وہابی'' کا لقب دے کر اس مکتبِ خیال کے لوگوں کو ختم کیا اور دوسری طرف کوشش کر کے اس تحریک کو اس طرح پیش کیا اور کرایا جس سے متاخرین کو ایسا محسوس ہونے لگا گویا اس کا رُخ محض سکھوں کی طرف تھا۔ حد یہ ہے کہ جماعت مجاہدین کے ایک رکن مولوی ''محمد جعفر'' تھانیسری نے تواریخ عجیبہ میں اُن کے مکتوبات کو مسخ کیا اور ''نصاریٰ نکوہیدہ خصال'' کی جگہ ''سکھان نکوہیدہ خصال'' کر دیا اور ''کفار فرنگ بر ہندوستان تسلط یافتہ'' کو ''کفار دراز مویاں کہ بر ملک پنجاب تسلط یافتہ'' میں تبدیل کر دیا۔ مولانا ''غلام رسول مہر'' نے جس کاوش سے ان تمام لفظی اور معنوی تحریفات کو بے نقاب کیا ہے اس کو اس دور کی سب سے زیادہ قابل قدر علمی تحقیقات میں شمار کرنا چاہیے۔ (۱۰)

سید احمد شہیدؒ نے بالاکوٹ سے کلکتہ تک اپنا نظام پھیلا دیا تھا۔ جو شخص ایک بار بھی ان کی تحریک میں شامل ہوگیا اس کا پورا خاندان عمر بھر جہاد کی تمنا کرتا رہا۔ ہزاروں انسانوں کے دل میں آزادی کی لگن پیدا ہوگئی۔ حد یہ ہے کہ وہ شاعر جن کی ساری عمر عشقیہ شعر وشاعری میں گزری

تھی بے اختیار پکار اُٹھے:۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار پہ تیرے کرم کا ہوں اُمیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے عروجِ شہید اور صدیق دے

مومن (۱۱) کو شہادت کی یہ تمنا اس لیے تھی کہ۔

ایں عیسویاں بہ لب رسانند جان من و جان آفرینش
مگزار کہ پائمال گردیم زاں سیم سراں آفرینش
تا چند بہ خواب ناز باشی فارغ زفغاں آفرینش
مومن شدہ ہم زبان عرفی از بہر امان آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست
اے فتنہ نشان آفرینش

سید صاحبؒ کی تحریک نے مسلمانوں میں جو روح پھونک دی تھی اُس کے مظاہرے اُن کی شہادت کے بعد ایک عرصہ تک ہوتے رہے۔ جنگ بالاکوٹ کے چودہ پندرہ سال بعد سرسید احمد خاں نے لکھا تھا:

''اس واقعہ (یعنی شہادت) کو چودہ پندرہ برس گزرتے ہیں اور یہ طریقہ آخرالزماں میں بنیاد ڈالا ہوا آنحضرت کا ہے اب تک اس سنت کی پیروی عباداللہ نے ہاتھ سے نہیں دی۔ اور ہر سال مجاہدین اوطان مختلفہ سے بہ نیت جہاد اسی نواح کی طرف راہی ہوا کرتے ہیں اور اس امر نیک کا ثواب آپ کی روح مطہر کو پہنچتا رہتا ہے۔'' (۱۲)

سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد لوگوں میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ'' نے ان کو موجودہ کمزور نسلوں سے اُٹھا لیا ہے اور جب ہندوستان کے مسلمان یک جان ہو کر انگریز کافروں کے خلاف جہاد شروع کریں گے تو امام صاحب ظاہر ہو کر فتح کی طرف ہماری رہنمائی کریں گے۔'' (۱۳) چنانچہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں عملاً حصہ لینے والے بہت سے افراد سید احمد شہیدؒ کے افکار و نظریات سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ (۱۴) بخت خاں کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ وہ بھی جماعت مجاہدین ہی سے متعلق تھے۔ بہادر شاہ کے مقدمہ کے دوران میں اُن کو ''وہابی العقیدہ''

بتایا گیا تھا۔(۱۵) کوئی شخص بھی جس نے ''ہنٹر'' کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' پڑھی ہے اس سے انکار نہیں کرے گا کہ وہابی کا لفظ اس زمانہ میں ''سید صاحبؒ'' اور اُن کے ہم خیال علماء کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور بقول ہنٹر ''وہابی'' اور ''غدار'' ہم معنی الفاظ تھے۔(۱۶) ''بخت خان'' نے علماء سے جس نوع کے تعلقات رکھے، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سید صاحبؒ کی تحریک سے متاثر تھے۔ جس وقت وہ تحریک میں حصہ لینے کے لیے دہلی پہنچے تھے سو (۱۰۰) علماء ان کے ہمراہ تھے۔(۱۷) دوران ہنگامہ میں وہابی علماء کی ایک جماعت ٹونک سے اُن کے پاس آئی تھی۔ اس کے علاوہ جے پور، بھوپال، ہانسی حصار اور ''آگرہ'' (۱۸) سے بھی کافی علماء کھچ کھچ کر اُن کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ ان علماء پر بخت خاں کو اس قدر اعتماد تھا کہ تخلیہ کے ان مخصوص مشوروں میں جن میں سوائے اُن کے اور بادشاہ کے کوئی تیسرا شخص نہ ہوتا تھا ان علماء کو شریک کرلیا جاتا تھا۔(۱۹) مولوی ''ذکاء اللہ دہلوی'' کا بیان ہے کہ ''دہلی'' میں جہاد کے فتوے کو جو اہمیت اور چرچا حاصل ہوا وہ ''بخت خاں'' کے دہلی آنے کے بعد ہوا۔(۳)

مولانا لیاقت علی الہ آبادی (۲۰) بھی اسی مکتب خیال کے مجاہد معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے شائع کیے ہوئے دو اشتہارات کا مضمون ملاحظہ فرمائیے۔ ایک ایک حرف سید صاحب کے انداز فکر کی ترجمانی کرتا ہوا نظر آئے گا۔ ایک اشتہار میں تو ستائیس اشعار اس جہادیہ نظم میں سے نقل کیے گئے ہیں جو سید صاحب کے مجاہدین میدان جنگ میں پڑھا کرتے تھے(۲۱)۔ مولانا عنایت علی صادق پوری جن کی کوششوں سے ''مردان'' میں رجمنٹ (۵۵) نے بغاوت کی تھی۔ سید صاحبؒ کے خلیفہ اور جماعت مجاہدین کے سرگرم کارکن تھے۔(۲۲)

مولانا عبدالجلیل شہید علی گڈھیؒ جنھوں نے ''علی گڑھ'' میں فرنگی قوت سے دلیرانہ مقابلہ کیا، ''سید صاحبؒ'' کے خلفاء میں سے تھے۔ ان چیدہ شخصیتوں کے علاوہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں حصہ لینے والے اور بہت سے اشخاص سید صاحبؒ کی جماعت یا اُن کے مکتب خیال سے تعلق رکھتے تھے۔ اور غالباً اسی بنا پر بعض لوگوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو مسلمانوں کی تحریک قرار دیا تھا۔ ہر چند کہ مجاہدین نے اس ہنگامہ میں بڑی سرگرمی دکھائی لیکن وہ اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہ لے سکے۔ اس کے دو سبب تھے۔ اوّل تو یہ کہ ''بالاکوٹ'' کی ناکامی نے کسی بڑے پیمانے پر تنظیم کا حوصلہ ختم کردیا تھا۔ دوسرے یہ کہ تحریک مجاہدین کی مذہبی نوعیت کے باعث ہندوستان کے تمام طبقات اور مختلف مذاہب کے لوگ اُن کی قیادت پر غالباً متفق نہیں ہوسکتے تھے۔ چنانچہ انفرادی طور پر مقامی

حالات کے پیش نظر اس مکتب خیال کے لوگوں نے بہت نمایاں حصہ لیا اور غیر ملکی تسلط کے خلاف جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہیں رہے، لیکن تحریک کی قیادت اپنے ہاتھوں میں نہ لے سکے۔

(۳)

دنیا کے بیشتر انقلاب کسی اہم حادثہ یا سانحہ سے شروع نہیں ہوئے۔ عموماً یہ ہوا ہے کہ خاموش سطح کے نیچے آتشیں مادہ جمع ہوتا رہا ہے اور پھر کسی معمولی سے واقعہ نے جو بہ حالات دیگر سطح آب پر تموج بھی پیدا نہیں کرسکتا تھا، ساری فضا میں طوفان برپا کردیا ہے۔ فرانس اور امریکہ کے انقلابات کی ابتدا، معمولی معمولی واقعات سے ہوئی، لیکن تھوڑی ہی مدت میں تمام بیتاب عناصر اوپر آگئے اور ساری فضا پر چھاگئے۔ یہی صورت ۱۸۵۷ء میں پیش آئی۔ کارتوسوں کا تو صرف ایک بہانہ تھا جس نے سوسال کی بے چینی کو متحرک کردیا، ورنہ انگریزوں کے خلاف ایک عرصہ سے جذبات میں شدید ہیجان برپا تھا۔

بعض مصنّفین نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو منظّم سازش کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ''کریک روفٹ ولسن'' (Crocroft Wilson) کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کی چھاونیوں اور فوجی مقامات پر بیک وقت بغاوت کی تیاری بہت پہلے سے تھی، لیکن تاریخی شواہد اس خیال کی تائید نہیں کرتے۔ ہنگامہ بالکل اتفاقیہ شروع ہوا، اور چونکہ بے چینی کے جراثیم پہلے سے ہر جگہ موجود تھے اس لیے جہاں بھی اس ہنگامہ کی خبر پہنچی وہاں آگ لگتی چلی گئی۔

بعض مورخین نے چپاتیوں کی تقسیم کو غیر ضروری اہمیت دی ہے اور اس کو اسباب بغاوت میں شمار کیا ہے۔ تھورن ہل (Thornhill) کے اس بیان نے کہ ''ویلور'' کی بغاوت سے قبل بھی ''مدراس'' میں چپاتیاں تقسیم ہوئی تھیں۔(۲۳) اس نظریہ کو تقویت پہنچائی ہے۔ ملک بھر میں چپاتیوں کی تقسیم حیرت انگیز ضرور ہے، لیکن ۱۸۵۷ء کی تحریک کا اس سے کوئی خاص تعلق اب تک ثابت نہیں ہوسکا۔ حکیم ''احسن اللہ'' نے اپنے بیان میں بتایا تھا کہ چپاتیوں کی تقسیم پر قلعہ معلّیٰ میں بھی سب لوگ تعجب میں پڑ گئے تھے اور کوئی اُن کا مقصد نہ سمجھ سکا تھا۔(۲۴)

پھر ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ بہادر شاہ اور باغی سپاہیوں نے بیرونی طاقتوں سے سازباز کرلیا تھا۔ یہ الزام بھی ثبوت کا محتاج رہا۔ ایسا ضرور ہوا کہ ایک اعلان جو شاہ ایران کی طرف منسوب تھا جامع مسجد پر چسپاں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور سب بیانات کی صحت مشتبہ ہے۔ مقدمہ میں کہا گیا تھا کہ بہادر شاہ نے اپنے سفیر ایران بھیجے تھے لیکن یہ ثابت نہ ہوسکا۔ ''مکندلال''

نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ مرزا ''سلیمان شکوہ'' کے پوتے ''مرزا حیدر'' وغیرہ ''لکھنؤ'' سے آئے تھے اور اُنھوں نے بہادر شاہ اور شاہ ایران کے درمیان تعلقات قائم کرانے کے سلسلہ میں گفتگو کی بھی تھی۔ بعض مورخوں نے ''ایران'' میں برطانوی سفیر ''مرے'' (Murray) کا خط نقل کیا ہے جس میں اس نے ایک ایرانی عہدہ دار کا بیان نقل کیا ہے کہ شمالی ہندوستان کے والیان ریاست کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے ''ایران'' سے خطوط بھیجے گئے تھے۔ ان تمام بیانات کے باوجود ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں کسی بیرونی طاقت کی نمایاں مداخلت کا ثبوت نہیں ملتا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک نہ کسی بیرونی طاقت کی مداخلت سے پیدا ہوئی، نہ اس کے پیچھے کوئی منظّم سازش تھی۔ یہ بالکل قدرتی اظہار تھا اس گہری نفرت اور بے چینی کا جو انگریزوں کے خلاف ایک عرصہ سے دلوں میں جمع ہورہی تھی۔ سپاہیوں نے پیش قدمی اس لیے کی کہ وہ انگریزوں کے غیرمنصفانہ برتاؤ سے عاجز ہوچکے تھے اور فوجی قانون کے ماتحت ہوتے ہوئے وہ زیادہ عرصہ تک ان ناانصافیوں کو برداشت بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ۱۸۰۶ء سے جب ''سرجارج بارلو'' (Sir George Barlow) نے سپاہیوں کے تلک لگانے، داڑھی رکھنے اور صافہ باندھنے پر اعتراض کیے تھے، متواتر فوج کے ساتھ ایسا برتاؤ ہورہا تھا۔ جس سے اُن کے جذبات میں اشتعال پیدا ہونا لازمی تھا۔ ہندوؤں میں بحری سفر کے خلاف مدتوں سے ایک نفرت چلی آتی تھی، انگریزوں نے نہ اُن کے جذبات کو سمجھا نہ اُن کا احترام کیا۔ ذات پات کے جذبات کو بھی اسی طرح نظرانداز کیا گیا۔ سردار بہادر ہدایت علی نے بتایا تھا کہ کابل میں ہندو سپاہی نہ اشنان کرسکتے تھے نہ اُنھیں ہندوؤں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ملتا تھا۔ (۲۵) علاوہ ازیں مختلف اوقات میں جو وعدے فوج سے کیے گئے تھے، اُن کو نہ صرف یہ کہ پورا نہیں کیا گیا بلکہ اُن کے خلاف عمل کیا گیا۔ اس سے سپاہیوں میں بددلی پھیل گئی۔ (۲۶) پھر ہندوستانی اور انگریز سپاہیوں کی تنخواہوں اور معیار زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور اس فرق نے وہ احساس کمتری پیدا کردیا تھا جو نہ صرف بے چینی بلکہ ارتکابِ جرم کا ہمیشہ سب سے بڑا محرک ہوتا ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی فوج ۳۱۵۵۲۰ اشخاص پر مشتمل تھی۔ اس پر ۹۸۰۲۲۳۵ پونڈ خرچ آتا تھا۔ اس میں سے ۵۶۶۸۱۱۰ پونڈ یورپین فوج پر خرچ ہوتا تھا اور یہ اس صورت میں جبکہ ان کی کل تعداد ۵۱۳۱۶ سے زیادہ نہ تھی۔ (۲۷) ایک ہندوستانی پیادہ کو سات روپیہ ماہانہ اور سوار کو ستائیس روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ سوار کو اپنا گھوڑا رکھنا پڑتا تھا اس قلیل تنخواہ میں سے بھی کٹ کٹا کر

بعض اوقات ایک سپاہی کو ڈیڑھ روپیہ ماہانہ اور بعض صورتوں میں صرف چند آنوں سے زیادہ نہ ملتے تھے۔(۲۸) ان حالات میں فوجیوں کی بددلی اور بے چینی کا اندازہ کچھ مشکل نہیں ہے۔

علاوہ ازیں انگریزوں نے عیسائیت کو پھیلانے کے لیے جو حربے اور طریقے اختیار کیے تھے اُن سے ہندوستانیوں میں زبردست بدگمانی پھیل گئی تھی۔(۲۹) بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی بعض ایسی تجاویز جن کا مقصد مذہبی مداخلت سے زیادہ سماجی اصلاح تھا، وہ بھی ہدفِ ملامت بن گئیں۔عیسائی مبلغ اسکولوں میں، بازاروں میں، شفاخانوں میں، جیل خانوں میں غرض جس جگہ موقع ملتا، تبلیغ کرنے لگتے تھے۔ان کے طریقۂ کار سے معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی اعانت اُن کو حاصل تھی۔بعض اضلاع میں پادریوں کے ساتھ تھانے کے چپراسی جاتے تھے۔اور یہ پادری ''غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سُننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہنچتی تھی۔''(۳۰) گورنمنٹ اسکولوں میں انجیل کی لازمی تعلیم دی جاتی تھی۔جیل خانوں میں قیدیوں کو عیسائیت کی طرف راغب کیا جاتا تھا۔سرسید احمد خاں نے لکھا ہے:

> ''۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی کیے گئے وہ تمام اضلاع ممالک مغربی وشمالی میں ارادۂ گورنمنٹ کے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ''ہندوستان'' کو اس طرح پر مفلس اور محتاج کرکرا پنے مذہب میں لے آئیں گے، میں سچ کہتا ہوں کہ جب سرکار آنربل ایسٹ انڈیا کمپنی کوئی ملک فتح کرتی تھی ''ہندوستان'' کی رعایا کو کمال رنج ہوتا تھا۔''(۳۱)

بعض قوانین کا صاف مقصد یہ تھا کہ عیسائیت قبول کرلینے والوں کی مدد کی جائے۔مثلاً ۱۸۵۰ھ کے Act XXI کے مطابق مذہب تبدیل کردینے کے بعد بھی ایک شخص موروثی جائداد میں حقدار رہتا تھا۔ان حالات میں جب پادری ''ای ایڈمنڈ'' نے وہ خط جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ''اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد ورفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک چاہیے، اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہوجاؤ''تو ہندوستانیوں میں ایک آگ سی لگ گئی۔

پھر انگریزوں نے بعض ریاستوں کے الحاق میں جس کھلی بے انصافی اور ظلم کو روا رکھا تھا اس سے اضطراب اور بے چینی کے شعلے ہر جگہ بھڑکنے لگے۔صحیح ہے کہ بعض ریاستیں، انتظامی

معاملات میں کوئی خاص صلاحیت نہیں رکھتی تھیں، اور اُن کو ختم کرکے انگریزوں نے حقیقتاً ایک ایسے نظام پر ضربِ کاری لگائی جس کی افادیت ختم ہوچکی تھی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ محلات شاہی کے ساتھ ہزاروں خانداں پرورش پاتے تھے۔ اور ہر ریاست کی اقتصادی زندگی میں نوابوں اور راجاؤں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ جب ان ریاستوں کا الحاق ہوا تو ہزاروں متعلقین بے سہارا رہ گئے۔اودھ کے الحاق کے بعد انگریزوں سے نفرت جس حد کو پہنچ گئی تھی اس کے متعلق ''ٹریولیان'' کا بیان ہے کہ ''سقّوں نے انگریزوں کے لیے پانی بھرنا چھوڑ دیا، آیائیں اجازت لیے بغیر نوکری سے رخصت ہوگئیں، باورچی اور ہرکارے 'آقاؤں' سے گستاخی اور بدتمیزی سے پیش آنے لگے۔''

اقتصادی بدحالی اور ابتری نے انگریز کے خلاف شعلوں کی لپک کو بڑھا دیا۔ مصحفی (م۱۲۴۰ھ=۱۸۲۴ء) نے مدتوں پہلے کہا تھا۔

ہندوستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر(۳۲) کھینچ لی

اس دور کے ''شہرآشوب'' دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر اقتصادی زبوں حالی کا ذمہ دار انگریز کو ٹھہرایا جاتا تھا۔شاہ کمال الدین کمال انگریز کی پیدا کی ہوئی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہی یہ شہر ہے اور ہے وہی یہ ہندستاں　　کہ جسکو رشکِ جناں جانتے ہیں سب انساں
فرنگیوں کی سوکثرت سے ہوکے سب ویراں　　نظر پڑے ہے بس اب صورت فرنگستاں
نہیں سوار رہے یاں سوائے ترک سوار
جہاں کہ نوبت وشہنائی جھانجھ کی تھی صدا　　فرنگیوں کا ہے اس جاپہ ٹم ٹم اب بجتا
اسی سے سمجھو رہا سلطنت میں کیا رتبہ　　ہو جبکہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا
نہ شاہ ہے نہ وزیر، اب فرنگی ہیں مختار

سرسید نے بتایا ہے کہ لوگ اس قدر نادار اور محتاج ہوچکے تھے کہ صرف آنہ ڈیڑھ آنے یومیہ پر فوج میں ملازمت کے لیے آمادہ ہوجاتے تھے۔ ایک طرف ریاستوں کے الحاق سے ہزارہا ہندوستانی بے روزگار ہوگئے، دوسری طرف ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ و برباد کرکے صنعتی طبقہ کو پریشان اور بدحال کردیا گیا۔ انگلستان کی تیارشدہ چیزوں کے لیے ایک منڈی درکار تھی، اس کے

لیے ہندوستان کی مقامی صنعتوں کو عمداً ختم کیا گیا۔ سرسید نے لکھا ہے:

''اہل حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیائے تجارت ولایت کے بالکل جاتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سونے بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔'' جولاہوں'' کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ (۳۳)

(۴)

۱۸۵۷ء کی تحریک مختلف منزلوں سے گزری، مختلف طبقات نے اس میں حصہ لیا اور مختلف عناصر مختلف اوقات میں بروئے کار آتے رہے۔ ان میں کچھ عناصر ترقی پسند تھے اور بعض قوتیں رجعت پسند۔ روساء میں رانی لکشمی بائی، نانا صاحب، ناہر سنگھ، حضرت محل، نواب علی بہادر، نواب تفضّل حسین، خان بہادر خاں، نواب محمود خاں وغیرہم وہ شخصیتیں تھیں جن کے عزم، مقصد کی سچائی اور مسلسل جدوجہد سے تحریک میں جان پیدا ہوئی۔ بلند حوصلگی اور انفرادی صلاحیتوں میں یہ لوگ بہت سے انگریزوں سے یقیناً بدرجہا بہتر تھے۔ صحیح ہے کہ ان میں سے بعض کو انگریزوں سے ذاتی شایتیں بھی تھیں اور جاگیردارانہ نظام کو قائم رکھنا چاہتے تھے، لیکن جہاں تک تحریک میں حصہ لینے اور سرگرمی دکھانے کا تعلق تھا ان کا خلوصِ نیت کسی سے کم نہ تھا۔ ملازمت پیشہ طبقہ میں تاتیا ٹوپی، عظیم اللہ خاں، بخت خاں، وزیر خاں وغیرہ آخری وقت تک انگریزوں سے لڑتے رہے۔ اُن میں جوشِ عمل بھی تھا اور انتظامی صلاحیتیں بھی تھیں۔ حالات نے جہاں تک مساعدت کی اُنھوں نے پوری دلیری کے ساتھ غیر ملکی طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ مسلمان علماء ومشائخ جن میں مولانا احمد اللہ شاہؒ، حاجی امداد اللہؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا فیض احمد بدایونیؒ، مولانا لیاقت علی، مولانا فضل حق خیرآبادیؒ، مولانا عبدالقادر لدھیانویؒ وغیرہم شامل تھے۔ اپنے خلوص اور سرفروشانہ جذبات میں یقیناً بے مثال تھے۔ ان کی انگریز دشمنی میں ذاتی رنجشوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اُن میں حب الوطنی کا جذبہ، غیر ملکی اقتدار سے نفرت اور انگریز کی مشنری کوششوں کا شدید ردّعمل کام کر رہا تھا۔ اگر تحریک کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جہاں تک عوام میں بے چینی پیدا کرنے کا تعلق تھا، اس کی زیادہ تر ذمہ داری ان ہی علماء پر تھی۔ مولوی احمد اللہ شاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ:

''ان کی تقریروں میں ہزاروں آدمی ہندو اور مسلمان جمع ہوجاتے تھے۔ چنانچہ آگرہ کی تقریروں میں دس دس ہزار کا مجمع ہوتا تھا۔ ان کی ہر دل عزیزی کی یہ

حالت تھی کہ پولیس نے (ایک موقع پر مجسٹریٹ کے حکم پر) اُنھیں گرفتار کرنے سے انکار کردیا۔'' (۳۴)

ان مختلف طبقات کی کوششوں اور حالات کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ تحریک میں اُن کی شرکت کی نوعیت واضح ہوجائے۔

سب سے پہلے بہادرشاہ، شاہی خاندان اور قلعہ معلی کے حالات پر نظر ڈالیے۔ یوں تو مدت سے ''سلطنت شاہ عالم، از دہلی تا پالم'' کا نقشہ تھا اور بقول شاہ ولی اللہؒ دہلی کی حکومت ''لعب صبیان'' بن چکی تھی، لیکن ۱۸۰۴ء میں جب لارڈ لیک کی فوجیں دہلی میں داخل ہوگئیں تو مغل بادشاہ کی حیثیت کمپنی کے ایک ملازم سے زیادہ نہ رہی۔ انگریزوں نے بادشاہ کو ہٹانے میں عجلت سے کام نہیں لیا کیونکہ اس کے نام کے سہارے اپنا اقتدار قائم کرنے میں مدد ملتی تھی۔ (۳۵) لیکن بہرنوع کوشش یہی رہی کہ بادشاہ کے اختیارات کا دائرہ اتنا محدود کردیا جائے کہ وہ لاشے محض ہوجائے۔ بہادر شاہ ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھا۔ ۱۸۵۷ء میں اس کی عمر ۸۲ سال سے متجاوز تھی۔ نامساعد حالات، پیرانہ سالی اور ذاتی مشاغل کی نوعیت نے اس کو عضو معطل بنادیا تھا۔ ممکن ہے کہ سرسید نے اس کی نااہلیت ثابت کرنے میں مبالغہ سے کام لے کر یہ لکھ دیا ہو کہ

''دلی کے معزول بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اگر اس سے کہا جاتا کہ پرستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا تابعدار ہے تو وہ اس کو سچ سمجھتا اور ایک چھوڑ دس فرمان لکھ دیتا، دلی کا معزول بادشاہ کہا کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اُڑ جاتا ہوں اور لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے، ایسے مالی خولیا والے آدمی...''

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بابر اور اکبر کے جانشین میں جس سیاسی بصیرت، معاملہ فہمی، تفرس اور تدبر کی ضرورت تھی، وہ اس میں نام کو نہ تھا۔ جہاں تک ذاتی کردار کا تعلق تھا وہ اپنے بعض پیشروؤں سے بہتر تھا۔ لیکن ذاتی کردار کی یہ چند خوبیاں ایک سلطنت کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی تھیں۔ مذہبی معاملات میں بہادر شاہ کو خاصی دلچسپی تھی اور دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری سے پیش آتا تھا۔ حالانکہ سرسید نے لکھا ہے کہ ''دہلی میں ایک بڑا گروہ مولویوں اور اُن کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رو سے معزول بادشاہ دلی کو بہت بُرا اور بدعتی سمجھتے تھے۔ اُن کا

یہ عقیدہ تھا کہ دلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اہتمام ہے ان مسجدوں میں نماز درست نہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جامع مسجد میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے اور غدر سے بہت قبل کے چھپے ہوئے فتوے اس معاملہ میں موجود ہیں۔'' (۳۶)

بہادر شاہ کی زندگی جن حالات میں گزرتی تھی اس کا کچھ اندازہ احسن الاخبار وغیرہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ (۳۷) بادشاہ کو ایک لاکھ روپیہ ماہانہ پنشن ملتی تھی لیکن اخراجات اس سے کہیں زیادہ تھے۔ چنانچہ ہر وقت مالی پریشانیاں رہتی تھیں اور ساہوکاروں اور امرا سے روپیہ قرض لینا پڑتا تھا۔ میر حامد علی خاں، حافظ محمد داؤد خاں، لالہ زور آور چند وغیرہ سے بہادر شاہ کے روپیہ قرض لینے کا ذکر متعدد جگہ آیا ہے۔ (۳۸) اور وصولی کے لیے ان لوگوں کے تقاضوں کا بھی ذکر ہے اس طرح بادشاہ کی وقعت لوگوں کی نظر میں کم ہوتی تھی اور طرح طرح کے نامناسب حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ نواب حامد علی خاں نے عدالت دیوانی میں دعویٰ دائر کرنے کا ارادہ کیا تا اور بہادر شاہ کو اُنہیں بلاکر رقم کی ادائیگی کی طرف سے اطمینان دلانا پڑا تھا۔ (۳۹) ان مالی پریشانیوں کے باعث اکثر قلعہ معلیٰ کی ملازمتیں فروخت کی جاتی تھیں۔ نواب حامد علی خاں کو مختاری کا عہدہ اس شرط پر پیش کیا گیا تھا کہ وہ دس ہزار روپیہ نذرانہ کے طور پر پیش کریں۔ (۴۰) ۲۶/جون ۱۸۴۶ء کے احسن الاخبار کی اطلاع ہے:

''سالگ رام .... کی عرضی نظرِ فیض انور سے گزری... اس میں مذکور تھا کہ اگر مجھے آغا حیدر ناظر کی جگہ عہدۂ نظارت پر مقرر کردیا جائے تو میں دس ہزار روپیہ نذرانہ پیش کروں گا۔ حکم ہوا کہ جب ہم آغا حیدر ناظر کا تمام روپیہ جو ہمارے ذمہ ہے ادا کردیں گے تو اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ (۴۱)

۳۱/جولائی کو آغا حیدر کے داماد حسین مرزا کی عرضی کے جواب میں حکم شاہی ہوتا ہے:

''تمہیں عہدۂ نظارت سے اس وقت سرفراز کیا جاسکتا ہے جب کہ سات ہزار روپیہ نذرانہ پیش کرو اور مرحوم آغا حیدر کے نذرانے کے دعوے سے دست برداری لکھ دو'' (۴۲)

جب قلعہ معلیٰ میں ''نذرانوں'' کے نام سے رشوتوں کا بازار گرم تھا تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جہاں جہاں بھی قلعہ کے اثرات پہنچے ہونگے وہاں بدنظمی، ابتری اور افراتفری کا کیا عالم ہوگا!

بہادر شاہ کی کثیر اولاد تھی۔ اس کی تربیت میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی گئی تھی۔ شہزادے ایک

دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔(۴۳) سلاطین کی کثیر تعداد(۴۴) قلعہ میں بھوکی مرتی تھی۔(۴۵) ان کی زبوں حالی کی دردناک داستانیں اخبارات میں کثرت سے درج ہیں۔ پروفیسر اسپیر نے اپنی کتاب Twilight of the Mughuls میں اُن کے حالات بہ تفصیل بیان کیے ہیں۔(۴۶) جب یہ شہزادے تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ کرتے تھے تو کمپنی کا حکم ہوتا تھا کہ ''اگر سلاطین کا گزارہ مقررہ تنخواہ سے نہیں ہوتا تو اوقات بسری کے لیے انہیں کہیں ملازمت کرلینی چاہیے''(۴۷) مجبور ہوکر وہ قرض لیتے تھے اور بعد کو قرض خواہ عدالتی کارروائیاں کرتے تھے۔(۴۸) بیشتر شہزادے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر بادشاہ کے مفاد کو نظرانداز کرسکتے تھے۔اُن کو آسانی سے خریدا جاسکتا تھا۔کون کہہ سکتا ہے کہ انگریزوں کی طاقت اس قدر جلد قائم ہوجاتی اگر شہزادے اس طرح سازشوں میں گرفتار نہ ہوتے! جس خاندان میں مرزا الٰہی بخش جیسے ننگِ ملک وننگِ خاندان افراد موجود ہوں اس کے مستقبل سے کس کو اُمید ہوسکتی ہے! بخت خاں کو انہی شہزادوں کی ریشہ دوانیوں اور مسلسل سازشوں کے باعث نہایت ہی صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔عبداللطیف کے روزنامچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انتہائی تحمل اور بردباری سے نامساعد حالات کا مقابلہ کیا۔لیکن ایک موقع پر اس کا پیمانۂ صبر چھلک گیا۔بعض مصنّفین نے لکھا ہے کہ آخر میں اس درجہ پریشان ہوگیا تھا کہ اس نے بادشاہ سے کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی شہزادہ کو لوٹے گا تو میں اس کی ناک کٹوادوں گا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک میں بادشاہ اور مغلیہ خاندان کا حصہ کیا تھا؟ انھوں نے کہاں تک تحریک کو آگے بڑھانے میں مدد دی تھی؟ بہادر شاہ کے متعلق یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے وہ ایک انقلابی تحریک کی رہنمائی کی قطعاً صلاحیت نہ رکھتا تھا۔اس نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں جو کچھ بھی حصہ لیا وہ حالات کی مجبوری کی بنا پر تھا،کسی شورش انگیز مقصد کی بنا پر نہیں تھا۔اس کی ملکہ زینت محل کے متعلق انگریزوں سے سازباز کا شبہ تھا۔شہزادے الگ سازشوں کے جال پھیلا رہے تھے۔ اور ان کے سازشوں ہی کی بنا پر بعد کو بہادر شاہ کی گرفتاری ہوئی۔مغل شہزادوں کے ساتھ جو بھی ہمدردی پیدا ہوتی ہے، وہ ان کے حسرتناک انجام اور ہڈسن کے ظالمانہ برتاؤ کی وجہ سے ہے، ورنہ تحریک کے دوران میں اُن کا طرزِ عمل کسی طرح بھی قابل ستائش نہیں تھا۔مغل شہزادوں میں اگر کوئی شخص تحریک کی اصل روح سے متاثر نظر آتا ہے تو وہ فیروز شاہ ہے۔جس کی سرگرمی، جوشِ عمل اور استقامت نے تحریک کو وہ قوت بہم پہنچائی جس کے سہارے سخت سے سخت منزلیں طے کی

جاسکتی تھیں۔

جہاں تک امراء کا تعلق ہے، ان میں بیشتر ایسے تھے جو ذاتی مفاد اور منفعت کی خاطر بڑے سے بڑے مفاد کو قربان کرسکتے تھے۔ اُن و نہ ملک سے محبت تھی، نہ بہادر شاہ سے ذاتی اقتدار کو بڑھانے کی خاطر وہ دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ سرسید نے صحیح لکھا ہے کہ لوگ ''اُس کے منہ پر اس کی خوشامد کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے ہنستے تھے'' (۴۹) حکیم احسن اللہ خاں، نواب احمد قلی خاں وغیرہ جو دربار کے عمائدین میں سے تھے عوام کی نظر میں اس بناپر معتبر نہ رہے تھے کہ دشمنوں سے مل جانے کا اُن پر شبہ تھا۔ جاسوسوں کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ بعض امراء نہایت ہی شرمناک سازشوں میں مبتلا تھے۔ دربار کی ساری خبریں انگریزوں کو انہی کے ذریعہ پہنچتی تھیں۔ بعض امراء ایسے بھی تھے جن کے پاس دولت کی فراوانی تھی؛ لیکن جب تحریک کے دوران میں روپیہ کی ضرورت پڑی تو ایک امیر بھی ایسا نہ تھا جس نے روپیہ سے مدد کرنے پر آمادگی ظاہر کی ہو۔ دہلی کی فتح کے بعد جب انگریزوں نے ان امراء کے گھروں کو کھدوایا تھا تو لاکھوں روپے کے زیورات اور جواہر برآمد ہوئے تھے۔ (۵۰) لیکن جب بھی بہادر شاہ یا بخت خاں وغیرہ نے مصارف جنگ کے لیے اُن سے روپیہ قرض طلب کیا تو اُنھوں نے نہ صرف اپنی بے زری کا اظہار کیا بلکہ لڑنے پر آمادہ ہوگئے۔ نواب فخرالدولہ امین الدین خاں بہادر نے جس طرح ناراضگی کا اظہار کیا تھا اُس کی تفصیل عبداللطیف نے دی ہے۔ اس وقت امراء میں گو اٹھارویں صدی کی سی گروہ بندی نہیں رہی تھی، لیکن ہر شخص حصولِ مقصد کے لیے خود ایک پارٹی بنا ہوا تھا اور دوسروں کی تذلیل و تشہیر کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔

اس وقت سب سے زیادہ صحت مند عناصر جنھوں نے تحریک میں حصہ لیا وہ تھے جنھوں نے دہلی کی مسموم فضا میں پرورش نہیں پائی تھی اور یہاں کے اثرات سے کسی حد تک محفوظ رہے تھے۔ بخت خاں روہیلوں کی ضرب المثل تنظیمی صلاحیتوں کا مظہر تھا اس میں مقصد کا خلوص بھی تھا اور عسکری تنظیم کا جذبہ بھی۔ اس نے دہلی میں بدنظمی اور ابتری کو روکنے کی پوری کوشش کی۔ اگر مغل شہزادے اس کے ساتھ تعاون کرجاتے، یا آخر میں بہادر شاہ اس کے مشورہ پر عمل کرلیتا تو بہت سے واقعات کا رخ بدل جاتا۔

والیانِ ریاست میں رانی لکشمی بائی اور بیگم حضرت محل کی شخصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رانی لکشمی بائی نے مردانہ لباس پہن کر فوجوں کی قیادت کی۔ اس کی حیرت افروز شجاعت

نے تحریک میں چار چاند لگادیے اور وہ آخری دم تک انگریزوں کا مقابلہ کرتی رہی۔ حضرت محل کے متعلق مولانا شرر کا بیان ہے کہ لوگ اس کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے تھے۔ اودھ کی آزادی کے لیے اس نے اپنی جان کی بازی لگادی تھی آخر وقت تک قیصر باغ میں بیٹھی تحریک کی تنظیم کرتی رہی۔ جب پانی سر سے اونچا ہوگیا تو قیصر باغ کو چھوڑ کر نیپال کا رُخ کیا۔

روہیلہ سرداروں میں خان بہادر خاں اور نواب محمود خاں نے بھی بڑی جوانمردی سے تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۸۵۷ء میں خان بہادر خاں کی عمر ستر سال سے زیادہ تھی۔ انھوں نے بریلی کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لیا اور انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت کا استحکام کیا۔ محمود خاں نے ضلع بجنور میں انگریزوں کا مقابلہ کیا، اور بجنور، دھام پور، نگینہ اور آدم پور پر قبضہ کرلیا۔ بہادر شاہ نے اُن کو امیر الدولہ، ضیاء الملک مظفر جنگ کے خطابات دیے تھے۔ اور ان کی خدمات کو سراہا تھا، اول الذکر کو بریلی میں پھانسی دی گئی اور موخر الذکر کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ملی، لیکن ابھی انڈیمان کو روانہ نہ ہوئے تھے کہ قید حیات ہی سے رہا ہوگئے۔

دہلی کی ایجنسی کے ماتحت سات ریاستیں تھیں: جھجر، فرخ نگر، بلبھ گڑھ، بہادر گڑھ، دوجانہ، پاٹودی اور لوہارو۔ ان ریاستوں نے اپنے حالات اور مصلحتوں کے ماتحت تحریک میں حصہ لیا اور دہلی کی حکومت سے تعلقات قائم کرلیے۔ نواب عبدالرحمٰن خاں والیِ جھجر اور اسکے خُسر عبدالصمد خاں نے کافی سرگرمی دکھائی۔ عبدالصمد خاں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا تھا اور برابر انگریزوں سے لڑتا رہا۔ راجہ ناہر سنگھ والیِ بلبھ گڑھ نے بہادر شاہ کے ساتھ تعاون کیا تھا اور برابر دربار سے خط و کتابت رہتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد انگریزوں نے جھجر، فرخ نگر، بلبھ گڑھ کی ریاستیں ضبط کرلیں اور ان کے والیوں کو پھانسی کی سزا دی۔ غالب ایک خط میں علاؤ الدین احمد خاں علائی کو لکھتے ہیں:

> ''قصّہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپئے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔''

(۵)

۱۸۵۷ء کی تحریک کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں نے دوش بدوش یہ جنگ لڑی تھی۔ اور ہندو مسلم سوال کسی نوعیت اور کسی شکل میں بھی لوگوں کے سامنے نہیں تھا۔ محض یہ

واقعہ کہ تحریک کے آغاز میں ہی ہندو اور مسلمان سب کی نظریں بہادر شاہ کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔ تحریک کی ہمہ گیر نوعیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بہادر شاہ کی ذاتی نااہلیت تسلیم لیکن اس کی حیثیت ایک علامت اور ایک نشانی کی تھی۔ وہ ڈوبتا ہوا سورج سہی لیکن وہ ایک ایسی صبح کی شام تھا جس میں ہندوستان نے اپنے سیاسی وقار اور تمدنی عظمت کے نادر جلوے دیکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تمام وہ طاقتیں تک جو کچھ عرصہ سے سلطنت مغلیہ کے مدمقابل آگئی تھیں، بہادر شاہ کے گرد جمع ہوگئیں۔ مرہٹے ایک مدت سے مغلوں سے برسرپیکار تھے، لیکن ۱۸۵۷ء میں پیشوا نے بہادر شاہ کو تسلیم کرنے میں مطلقاً کوئی عذر نہیں کیا۔ نانا صاحب کے خاص مشیروں میں عظیم اللہ خاں رہا۔ رانی جھانسی نے مسلمان توپچی ملازم رکھے۔ احمد اللہ شاہ نے ہندو اور مسلمان دونوں کے مشترکہ اجتماعات میں تقریریں کیں۔ بہادر شاہ نے بعض نہایت اہم کام مثلاً ٹکسال کی نگرانی، پولیس کا کام ہندوؤں کے سپرد کیا اور انھوں نے بادشاہ کے ساتھ پورا تعاون کیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس اتحاد عمل سے انگریزوں کو بڑی تشویش پیدا ہوگئی تھی انہیں اپنی ناکامی کے آثار اگر کسی چیز میں نظر آتے تھے تو وہ صرف ہندوستان کے مختلف طبقوں اور مذاہب کے لوگوں میں اشتراک عمل اور اتحاد میں۔ غیر متحد ہندوستان تو ریتے کی دیوار کی طرح گرایا جاسکتا تھا، لیکن متحدہ ہندوستان انگریزوں کے لیے کوہ گراں کی مانند تھا۔ چنانچہ تحریک کے دوران میں پوری کوشش کی گئی کہ کسی طرح اس اتحاد کو ختم کیا جائے۔ تحریک کے بعد تو انگریز کی حکمت عملی کی ساری عمارت اسی پر تعمیر ہوئی تھی کہ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' ہنگامہ کے دوران میں بقرعید آئی (۵۱) اور انگریزوں نے اس موقع کو ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ تعجب کی بات ہے کہ اس سازش کے جال اس طرح پھیلائے گئے کہ مولانا احمد سعید مجددیؒ جو بڑے نیک دل، عالی حوصلہ اور مرنجاں مرنج شیخ وقت تھے، اس سازش سے غیر محسوس طریقہ پر متاثر ہوگئے بہادر شاہ نے جب اُن کو مفتی صدرالدین آزردہ کے ذریعہ صورت حال سے آگاہ کیا تو فوراً اپنی ضمنی تحریک سے دست کش ہوگئے۔ بریلی میں خان بہادر خاں اور وہاں کے ہندو زمینداروں میں نفاق ڈالنے کے لیے بھی یہی تدابیر اختیار کی گئی لین کامیاب نہ ہوسکی۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل خط مطالعہ کے قابل ہے:

''من جانب جارج کوپر صاحب سکریٹری چیف کمشنر اودھ بخدمت جی ایف ایڈمنسٹن صاحب سکرٹری حکومت ہند

لکھنؤ، یکم دسمبر ۱۸۵۷ء

جناب عالی!

بہ سلسلہ مکتوب چیف کمشنر بنام گورنر جنرل بہادر مورخہ ۱۴؍ستمبر جس میں انھوں نے پچاس ہزار روپے کی رقم بریلی کی ہندو آبادی کو مسلمان باغیوں کے خلاف آمادۂ پیکار کرنے پر صرف کرنے کی اجازت دی ہے۔ مجھے کپتان گوں کے خط مورخہ ۱۴؍ کا اقتباس پیش کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جس سے حضور والا کو یہ علم ہوگا کہ یہ کوشش ناکام رہی اور اس کو ترک کردیا گیا اور اس پر کوئی رقم صرف نہیں ہوئی۔

آپ کا خادم

جارج کوپر

سیکرٹری چیف کمشنر۔ عالم باغ کیمپ یکم دسمبر ۱۸۵۷ء

پھر سکھوں کو بہادر شاہ سے بدظن کرنے کے لیے لارنس نے پنجاب میں یہ شہرت دی کہ بہادر شاہ کی طرف سے اعلان کرایا گیا ہے کہ جو شخص بھی ایک سکھ کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو پانچ روپیہ انعام دیا جائے گا۔ عبداللطیف نے بتایا ہے کہ سکھوں کا ایک وفد اس سلسلہ میں بہادر شاہ سے آکر ملا اور اس بات کی شکایت کی۔ بہادر شاہ نے جواب دیا۔

''از ماجز مہربانی نیاید ونظر عاطفت بر اہل ہر کیش باید''

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات خراب کرانے کے لیے منظّم کوششیں شروع کردیں۔ اور سیاست، سماج، زبان اور ادب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں یہ زہر نہ پھیلایا گیا ہو۔ سر ہنری ایلیٹ نے (جس کی تاریخ ہند کی آٹھ جلدیں گزشتہ پچھتّر سال سے ہماری ساری چھوٹی بڑی تاریخوں کا ماخذ رہی ہیں) حکومت کو لکھا کہ اگر اس کی مرتب کی ہوئی تاریخ ہند شائع کردی گئی تو ہندوستان میں ساری قومی تحریکیں خود بخود سرد پڑجائیں گی۔ چنانچہ ہندو مسلم اختلافات کو تاحد طوفان پہنچانے کے لیے یہ کتاب شائع کردی گئی۔

❁ ❁ ❁

حواشی:

(۱) رسالہ اسباب بغاوت ہند،ص:۳۔

(۲) ایضاً،ص:۱۱-۱۲۔

(۳) ملاحظہ ہو Topics for Indian statesemn Bruce Norton جس میں اس پہلو پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۴) احسن الاخبار،ص:۹۵-۹۶۔

(۵) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو Civel Disturbances during the british Rule in India (1765-1857) S.B. Chaudiri

(۶) فتاویٰ عزیزیہ،ج:۱،ص:۱۷۔

(۷) شاہ صاحب کے تدبر اور بصیرت کی اس سے زیادہ روشن اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ اگر ایک طرف انھوں نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تو دوسری طرف انگریزی تعلیم کی موافقت میں رائے ظاہر کی۔ ملاحظہ ہو رسالہ اسباب بغاوت ہند،ص:۲۰۔

(۸) ''مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا'' مولانا ابوالحسن علی ندوی،ص:۲۷۳-۲۷۴۔ جماعت مجاہدین،مولانا مہر(جلد۳،ص:۱۳-۱۴)

(۹) منصب امامت،ص:۹۸۔

(۱۰) سید احمد شہید جلد اول،ص:۲۵۰-۲۶۱۔

(۱۱) حکیم مومن خاں مومن سید صاحبؒ کے مرید تھے اور ان کے دامن تربیت سے وابستہ تھے۔ لوگوں کو تحریک میں شرکت کی دعوت اس طرح دیتے ہیں۔

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا — فدا جی سے راہ خدا میں ہوا
حبیب حبیب خداوند ہے — خداوند اس سے رضامند ہے
امام زمانہ کی یاری کرو — خدا کے لیے جاں نثاری کرو

(۱۲) آثارالصنادید،ص:۱۰۳(پہلا ایڈیشن)

(۱۳) ہمارے ہندوستانی مسلمان،ص:۱۷۔

(۱۴) پروفیسر موجم دار کی یہ رائے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں ''وہابیوں'' نے حصہ نہیں لیا تھا قطعاً غلط ہے۔ (The Sepay Mutiny p.37) تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ ''وہابی'' اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ محض یہ بات کہ انگریزوں نے اپنا تسلط قائم ہوجانے کے بعد ''وہابیوں'' کو سخت سزائیں دی تھیں اور اس مکتب خیال کے لوگوں کو پسپا کیا تھا، تحریک میں ان کا حصہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

(۱۵) The Trial of Bahadur Shah II p.282.

(۱۶) ہمارے ہندوستانی مسلمان،ص:۱۰۸۔

(۱۷) ۱۸۵۷ء کے ہیرو،ص:۷۳۔

(۱۸) The Trial of Bahadur Shah II P. 282

(۱۹) ۱۸۵۷ء کے ہیرو،ص:۸۱۔

(۲۰) یہی رائے حکیم احسن اللہ خاں کی تھی۔ ملاحظہ ہو The Trial of Bahadur Shah II P. 282

(۲۱) مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو،غدر کے چند علما،ص:۱۲۸-۱۳۱؛ ۱۸۵۷ء کے مجاہد،ص:۱۳۸-۱۴۴۔

(۲۲) سید احمد شہید جلد دوم، ص:۲۵۸-۲۶۰۔

(۲۳) سید احمد شہید جلد چہارم ص:۲۹۱-۲۹۵۔

(۲۴) The Personal Adventures and Experiences of a Magistrate during the Rise, progress and suppression of the Indian Mutiny P.P. 2-3

(۲۵) سرسید احمد خاں بھی اس کا اصلی سبب متعین نہ کرسکے تھے، لیکن اُنھوں نے لکھا تھا۔ کہ ''اس زمانہ میں تمام ہندوستان میں وبا کی بیماری تھی اور خیال میں آتا ہے کہ اُس کے دفع کرنے کو بطور ٹوٹکہ یہ کام ہوا ہو کیونکہ جاہل ہندوستانی اس قسم کے ٹوٹکے بہت کیا کرتے ہیں۔ (رسالہ اسباب بغاوت ہند، ص:۳)

(۲۶) ۱۸۵۷ء ڈاکٹر سین ص:۶۔

(۲۷) The Mutiny in the Bengal Army P.4

(۲۸) The Mutiny in the Bengal Army P.4

(۲۹) Eighteen fifty seven p 25

(۳۰) سرہنری لارنس کے سوانح نگار نے اس کا ایک خط نقل کیا ہے جس میں کیننگ کو لکھا ہے کہ ایک معمولی فوجی نے گفتگو میں اس سے کہا کہ دس سال سے حکومت برطانیہ جبریہ طریقہ پر اور دھوکہ بازی کے ساتھ تمام ہندوستانیوں کا مذہب تبدیل کرانے کی جدوجہد کررہی ہے Edwardes and Merivale II P.322-323

(۳۱) رسالہ اسباب بغاوت ہند، ص:۱۸۔

(۳۲) ایضاً، ص:۱۶-۱۷۔

(۳۳) سرسید کی اس عبارت کو ''بہ تدبیر'' کی تشریح سمجھنا چاہیے: ''رعایائے ہندوستان ہماری گورنمنٹ کو میٹھے زہر اور شہد کی چھری اور ٹھنڈی آنچ کی مثال دیا کرتی تھی اور پھر اس کو اپنے دل میں سچ سمجھتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ اگر ہم آج گورنمنٹ کے ہاتھ سے بچے ہوئے ہیں تو کل نہیں اور کل ہیں تو پرسوں نہیں۔'' رسالہ اسباب بغاوت ہند ص ۱۴۔

(۳۴) رسالہ اسباب بغاوت ہند۔ص:۳۶۔

(۳۵) مسلمانوں کا روشن مستقبل ص:۸۰۔

(۳۶) سرسید کا خیال تھا کہ: ''بلاشبہ جو ہیئت بادشاہ دلی کی سرکار نے بنا رکھی تھی وہ ہمیشہ نامناسب اور قابل اعتراض کے تھی اور جناب لارڈ الن براصاحب بہادر نے جو تجویز کی تھی وہ بیشک لائق منظوری کے تھی بلکہ اس سے زیادہ عمل درآمد کرنا واجب تھا، بیشک دلی کا بادشاہ بھوبل میں کی ایک چنگاری تھا جس نے ہوا کے زور سے اُڑ کر تمام ہندوستان کو جلا دیا۔'' رسالہ اسباب بغاوت ہند ص:۱۱

(۳۷) رسالہ اسباب بغاوت ہند ص:۹۔

(۳۸) Twilight of the Mughals P. 73

(۳۹) احسن الاخبار ص:۱۲۲۔ ستر سال سے زیادہ کی عمر میں شادیوں کا سلسلہ جاری تھا۔

(۴۰) احسن الاخبار، ص:۸۷و۹۷، ۱۰۷، ۱۲۳، ۱۳۹، ۱۶۰۔

(۴۱) ایضاً، ص:۹۴-۹۵۔

(۴۲) ایضاً، ص:۱۱۱۔

(۴۳) ایضاً، ص:۷۸۔

(۴۴) ایضاً، ص:۸۷۔

(۴۵) احسن الاخبار میں اُن کی ہنگامہ آرائی کے متعدد واقعات درج ہیں۔ ایک مرتبہ بہادر شاہ نے تنبیہ کا ایک فرمان بھی اُن کے

نام جاری کیا تھا۔لیکن اُن کی حالت قطعاً نا قابل اصلاح تھی۔ان کی ہمتیں یہاں تک بڑھ گئی تھیں کہ ''حضور کو اطلاع دی گئی کہ بعض سلاطین کا ارادہ ہے کہ جس وقت روپیہ خزانۂ انگریزی سے خزانہ شاہی میں آئے تو جبراً روپیہ پر قبضہ کرلیں۔حضور انور نے یہ خبر سنی تو صاحب کلاں بہادر کے نام شقہ جاری فرمایا کہ روپیہ قلعہ میں نہ بھیجا جائے بلکہ ہاتھی سواروں کا ایک دستہ خزانہ کے ساتھ متعین کرکے قطب صاحب کے متصل جو حویلی ہے وہاں روانہ کردیا جائے (ص:۹۵-۹۶)

(۴۶) خود بہادر شاہ نے ۱۸۴۸ء میں ان کی تعداد ۲۱۰۴ بتائی تھی۔ملاحظہ ہو۔

Punjab Governament Records, vol I (Delhi Residency and Agency) P. 431.

(۴۷) سر سید احمد خاں نے اکبر شاہ ثانی کے عہد کا حال لکھا ہے: ''شاہزادوں کو جو قلعے کے نو محلے میں رہتے تھے ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا اور چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ بھوکے مرتے ہیں، بھوکے مرتے ہیں۔'' سیرت فریدیہ۔ص:۲۳-۲۴۔

(۴۸) Twilight of the Mugals PP. 62-66.

(۴۹) اردو ترجمہ احسن الاخبار ص:۱۰۔

(۵۰) ۸ رمئی ۱۸۴۸ء کے احسن الاخبار کی خبر ہے: ''آغا حیدر ناظر کے نام ایک شقہ جاری کیا گیا کہ سلاطین کو سمجھا دیا جائے کہ قرض لینے سے ہاتھ روکیں۔کیونکہ جب قرض خواہ عدالت انگریزی میں دعویٰ کرتے ہیں اور تمہیں کچہری میں گھسٹنا پڑتا ہے تو خاندان تیموریہ کی بدنامی ہوتی ہے'' (ص:٦٦) لیکن جب بادشاہ خود اس مرض میں مبتلا تھے تو شہزادوں پر ان نصیحتوں کا کیا اثر ہوسکتا تھا!

(۵۱) رسالہ اسباب بغاوت ہند ص:۱۰۔

(۵۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو Siege of Delhi, C.G. Griffths

(۵۳) انگریز عید کے موقع پر کس طرح ہندو مسلم فساد کے متمنی تھے۔دیکھئے:

Delhi 1857, its Siege Assault and Capturs, Col. K. Yoang PP. 152,158,160.

❀ ❀ ❀

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء
ایک مختصر جائزہ

از: جناب ڈاکٹر محمود حسین
وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

۱۸۵۷ء برصغیر ہندو پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم سال ہے۔ جس طرح نحیف سے نحیف جسم بھی شدید بیماری کی صورت میں ایک نہ ایک مرتبہ اپنی ساری توانائیوں کو سمیٹ کر مرض کو دفع کرنے کے لئے پورا زور صرف کر دیتا ہے کم وبیش ایسا ہی واقعہ ۱۸۵۷ء میں پیش آیا جب کہ ہندو پاکستان کے لوگ جو اندرونی زوال اور بیرونی تسلط کی دوہری مار سے پس چکے تھے ایک مرتبہ پھر منظّم ومتحد ہوئے اور انھوں نے اجنبی اقتدار کے جوئے کو کاندھے سے اتار پھینکنے کے لئے غیر معمولی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ افسوس ہے کہ غیر ملکی غلبے کے خلاف عوام کے اس مقدس جہاد کو مخالفین نے ایک حقیر واقعہ بنانے کی کوشش کی۔ بغاوت، شورش، ہنگامہ، غدر نہ جانے اور کتنے ایسے نام ہیں جو اس واقعہ کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض تو ناکافی معلومات کا نتیجہ ہوں لیکن بلاشبہ ان میں سے اکثر ذاتی یا قومی مفاد کے پیش نظر تراشے گئے ہیں۔

۱۸۵۷ء سے متعلق جو تاریخی ناانصافی ہوئی ہے اس کا بڑا سبب یہ رہا کہ بدلے ہوئے حالات میں عرصے تک جنگ آزادی کے مشارکین ومشاہدین کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ واقعات کی صحیح تصویر پیش کرتے۔ ظلم واستبداد کے خلاف جہاد میں ہار جانا تاریخ میں کوئی ان ہونی بات نہیں لیکن انگریز حاکموں نے محبانِ وطن کو ان کی ناکامی کے بعد جس ظلم وستم کا نشانہ بنایا اس کی مثال کم

ملے گی۔

محبان وطن کے خلاف طرح طرح کے بہانے بنائے گئے اور اکثر پر بے بنیاد الزام لگاکر انہیں سنگینوں کا شکار بنایا۔ انگریزوں نے جس طرح سیاست میں برصغیر کے عوام پر ستم ڈھائے اسی طرح علمی طور پر بھی عوام کے اس جہاد حریت کی وقعت کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی۔ اس کو محض غدر سے تعبیر کیا گیا گویا یہ ایک معمولی شورش تھی جو فوج سے اٹھی اور فوج ہی میں دب کر رہ گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ آغاز تو ایسا ہی ہوا جیسا کہ اکثر بیان کیا جاتا ہے یعنی یہ کہ ہندوستانی فوجیوں کو اپنے حکام کے ساتھ متعدد شکائتیں پیدا ہوگئی تھیں جو رفتہ رفتہ عام فوجی بے چینی کا باعث بن گئیں۔ یہی وہ بے چینی اور بے اطمینانی ہے جو ۱۸۵۷ء میں جنگ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ لیکن چونکہ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ برصغیر کے مختلف طبقات نے جو قطع نظر جذبۂ آزادی کے اور دوسری وجوہ کی بناء پر اجنبی تسلط سے بیزار تھے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ یہ واقعہ جس کا آغاز تو فوجی شورش سے ہوا بالآخر قومی جنگ کی صورت اختیار کرگیا۔ مگر حال کے جن مورخین نے مسئلہ کو اسی طرح سمجھا ہے ان کی تصانیف کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں داستان کی تکمیل اور نتائج کے اخذ کرنے میں اس رول کو ملحوظ نہیں رکھا گیا جو کہ مسلمان علماء نے اس جنگ آزادی میں ادا کیا۔

محاربہ ۱۸۵۷ء کو جنگ آزادی کہا جائے یا نہ کہا جائے اس کا انحصار بڑی حد تک اس پر ہے کہ جنگ آزادی سے آخر مراد کیا ہے۔ اگر جنگ آزادی کے لئے لازمی شرط یہ ہو کہ سارا ملک بلا استثناء اس میں شامل ہوجائے جیسا کہ بعض مصنّفین کا خیال ہے تو پھر ۱۸۵۷ء کے معرکہ کو جہاد حریت سے موسوم کرنا ایک منطقی غلطی ہوگی۔ جنگ آزادی جانچنے کی کسوٹی ہمارے نزدیک رقبہ وآبادی نہیں بلکہ وہ جذبہ ہے جو اس جنگ میں کارفرما رہا ہو اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ۱۸۵۷ء کی جنگ کیا بہ لحاظ واقعہ اور کیا بہ اعتبار نتائج برصغیر کی پہلی جنگ آزادی کہلائی جاسکتی ہے۔ رقبہ اور آبادی جو اس سے متاثر ہوئی وہ بھی کم نہ تھی۔

جہاں تک واقعات کا تعلق ہے یہ بھی جانتے ہیں کہ انگریز برصغیر میں تاجروں کی حیثیت سے داخل ہوئے لیکن یہاں کے سیاسی حالات بالخصوص درباری رقابتوں سے فائدہ اٹھاکر پہلے تو انھوں نے دکن میں اپنا عمل دخل بڑھایا اور کچھ عرصے بعد بنگال کے علاقے کے مالک بن بیٹھے۔ البتہ ابتداء ہی سے انگریز پیش قدمی اور توسیع اقتدار کی پالیسی پر کارفرما رہے اور نت نئے طریقوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ سارے برصغیر پر قابض ہوگئے۔

بیرونی غلبے کا فوری اثر یہ پڑا کہ حکمراں طبقہ اقتدار سے محروم ہوگیا اور امراء اپنا اثر و رسوخ کھو بیٹھے۔ سیاسی محرومی اپنے جلو میں معاشی ابتری بھی لئے ہوئے تھی۔ پہلی بڑی معاشی مار زمیندار طبقے پر پڑی جس سے وہ طبقہ بھی متاثر ہوا جو ان سے کسی نہ کسی طرح پر وابستہ تھا۔ تاجر و صنعت کار طبقے بھی انگریزی حکومت سے خوش نہیں رہ سکتے۔ ملک کی صنعتیں اور حرفتیں ملک کے نئے حالات میں پنپ نہ سکیں۔ یہاں کی صنعتیں حکومت کی سرپرستی کے بغیر آزاد مقابلے کی تاب نہ لاسکتی تھیں۔ سیاسی و معاشی غلامی میں ظاہر ہے کہ ملکی تہذیب بیرونی اثر سے آزاد نہیں رہ سکتی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی تہذیب رفتہ رفتہ ملک میں اثر و نفوذ کرنے لگی جو دور رس نتائج کا باعث بنی۔ ان حالات میں ایک غیور قوم کا اجنبی حکومت کو للکارنا ایک فطری امر تھا۔

ہندو اور مسلمان طویل سیاسی اور تہذیبی مقاصد میں ہمیشہ سے الگ الگ رہے ہیں لیکن بیرونی غلبے سے آزادی حاصل کرنا ایسا جذبہ تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے شریک تھے۔ اس موقعہ پر جو نقطۂ اتحاد دونوں قوموں کے لئے قابل قبول ہوسکتا تھا وہ مغل شہنشاہ کی ذات تھی مانا کہ مغل بادشاہ کا وجود اب برائے نام تھا لیکن اس کی قانونی حیثیت اب بھی مسلم تھی۔ مزید برآں عوام کی وفاداری کی دیرینہ روایات بھی مغل خاندان سے وابستہ تھیں۔ ان ہی وجوہ کی بناء پر قیادت کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں کی نظریں مغل شہنشاہ پر پڑیں۔ لیکن ملک کی سیاسی بے چینی ابھی منظّم تحریک کی پختہ صورت نہ اختیار کر پائی تھی کہ فوج میں بغاوت کی چنگاری اٹھی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شعلے کی شکل میں برصغیر کے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس جنگ میں امیر و غریب، عالم و جاہل سب ہی شامل تھے۔ مرد تو مرد عورتوں نے بھی اس موقعہ پر غیر معمولی شجاعت کا مظاہرہ کیا۔

نتائج کے اعتبار سے بھی یہ جنگ برصغیر میں پہلی جنگ آزادی کہلانے کی مستحق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزوں کو نکال باہر کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن ان کی یہ ناکامی عوام کے جذبۂ حریت کو پامال نہ کرسکی۔ بیرونی اقتدار کے خلاف جذبہ روز بروز بڑھتا رہا ہے حصول آزادی کی متواتر کوششیں مختلف سمتوں میں جاری رہیں جس کا پھل بالآخر مکمل آزادی کی صورت میں ۱۹۴۷ء میں ملا۔

تاریخ میں اختلاف رائے ایک معمولی امر ہے یہ تحقیق حق میں کسی طرح حارج نہیں تاریخی مساعی میں اختلاف رائے کا پایا جانا ایک اعتبار سے ضروری بھی ہے۔ علم تاریخ میں ایک فرد کی کوشش بالکل ناکافی ہوتی ہے کیونکہ کسی مورخ کی آنکھ میں اتنی تیزی نہیں کہ واقعہ کو اس کے پورے

پس منظر میں دیکھے مختلف آنکھوں کی مدد ہی سے وہ بصیرت حاصل ہوسکتی ہے جس سے واقعہ کی ماہیت کو اچھی طرح دیکھا جاسکتا ہے۔ مختلف نقطہ ہائے نظر سے مسئلے کے سمجھنے میں الجھاؤ ضرور پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن دلائل کی تنقیدی جانچ سے اس الجھاؤ کو دور کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کسی فی الحقیقت تاریخ بنیادی طور پر ایک ایسا علم ہے جس میں تنقید کے ذریعہ ہی سے حقیقت تک پہنچا جاتا ہے۔ جہاں تک ۱۸۵۷ء کا تعلق ہے اس پر اب تک جو کام ہوئے ہیں اور خاص طور پر ۱۸۵۷ء میں صدسالہ یادگار کے موقع پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں اپنی اپنی جگہ پر مستحسن ہیں لیکن ان کو کافی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ قطع نظر اختلاف رائے کے جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ کہ ابھی تک کوئی ایسا مبسوط کام نہیں کیا گیا ہے جس میں مسلمان علماء کے کارناموں کو بیان کیا گیا ہو۔ ناکامی کے بعد محبان وطن پر جو جھوٹے مقدمات چلائے گئے اور ان کے خلاف بربریت اور وحشت کے جو افسانے گھڑے گئے وہ سب مورخ کی ناقدانہ جانچ کے محتاج ہیں۔ ضرورت ہے کہ مورخین اس طرف متوجہ ہوں۔

❁ ❁ ❁

۱۰رمئی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے کچھ بھلادیئے گئے حقائق

ترتیب: ڈاکٹر اجمل فاروقی
۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

مولوی احمد اللہ شہید فیض آبادی

مدراس کے رہنے والے مولانا عرصے سے فیض آباد میں رہتے تھے۔ بڑے جاگیردار تھے۔ ان کی جائیداد ضبط کرکے پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ عوام نے وِدروہ کرکے انہیں جیل سے نکال لیا۔ بریلی، شاہ جہاں پور میں انگریزوں سے لڑے۔ انھوں نے دوبار سرکولن کیمبل کو نیچا دکھایا۔ انگریزوں نے راجا پون سے غداری کراکر انھیں راجا کے ہاتھوں شہید کروایا۔ ہومس نے لکھا کہ ''اگر اس وقت ہندوستان میں کوئی ماہر شاسک تھا تو وہ مولوی صاحب تھے۔ اگر وہ بادشاہ بنتے تو یہ ان کا حق تھا۔ پنڈت سندر لال نے کہا دنیا میں آزادی کے شہیدوں میں ان کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا۔ ان کے علاوہ مولانا امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ ضامن شہید، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عبدالجلیل امام جامع مسجد علی گڑھ، مولوی لیاقت علی الٰہ آبادی، مولانا جعفر تھانیسری، مولانا محمد یحییٰ علی، مولانا شفیع مبالوی، مولانا مملوک علی، مولانا پیر محمد، مولانا سرفراز علی بھی لاکھوں ہندوستانیوں کی اگوائی کررہے تھے جو دیش کی عزت آزادی اور فخر کے لیے جان و مال کی قربانی دے رہے تھے۔

انگریزوں کا ظلم

ڈاکٹر ولیم نے باقی انگریز شاسکوں کی طرح مسلمانوں کو غدر کا ذمہ دار ٹھہرا کر انہیں ظلم اور لوٹ پاٹ وتباہی کا نشانا بنایا۔ ۱۵/دنوں میں ۲ لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ داڑھی، لمبا کرتا باغی کی پہچان تھی۔ باغی کا دوسرا نام مسلمان بتایا گیا۔ کل ۵۱ ہزار علماء کو شہید کیا گیا۔ (Thomson) تھومسن نے یہ تعداد تین سالوں میں ۱۴ ہزار بتائی ہے۔ چاندنی چوک سے خیبر تک کوئی پیڑ ایسا نہ تھا کہ عالم کی لاش نہ لٹکی ہو۔

بادشاہ ظفر کے شہزادوں : مرزا خضر سلطان، مرزا مغل، مرزا ابوبکر اور مرزا عبداللہ کو (Hudson) ہڈسن نے خود گولی ماری اور خون پیا۔ علماء کو بڑے پیمانے پر کالا پانی کی سزا دی گئی۔ جامع مسجد دہلی کو فوج کا اصطبل بنا دیا۔ ہزاروں عورتوں نے کنوؤں اور باولیوں میں کود کر عزت بچائی۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۱ء تک تین لاکھ قرآن جلائے گئے تاکہ مسلمانوں میں سے جہاد کا خیال نکالا جا سکے۔ الہ آباد، فتح پور، بریلی جہاں بھی انگریزوں نے جیت حاصل کی بستیوں کو جلا دیا۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں سب کو مار دیا۔ گھروں کو تباہ کرنا ان کی خاص سزا تھی۔ دہلی میں آج بھی جمنا پل کے پاس سوتنترا سینانی اسمارک میں وہ بوڑھا برگد موجود ہے جس پر ۱۴۰۰ مسلمانوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ اسی پیڑ کے پاس کنوؤں میں اندھیری کوٹھریاں موجود ہیں جس میں مسلمان قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ منشی ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ایک انگریز افسر لوگوں کو پوچھتا تھا کہ وہ ہندو ہے کہ مسلمان اور جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی مار دیتا تھا۔ لارڈ رابرٹ (Lord Robert) نے اپنی کتاب (41-Years in India) میں لکھا کہ دہلی کی فتح کے بعد انگریزوں نے قتل عام کی منادی کرادی اور سات دنوں تک دہلی جلتی لٹتی رہی۔ ۲۷۰۰۰ مسلمانوں کو عدالتوں نے پھانسی دی اور قتل عام میں جو مارے گئے ان کا کوئی حساب نہیں۔ رڑکی میں سنہرا گاؤں میں برگد کا پیڑ آج بھی موجود ہے جہاں ۲۵۰ ہندوستانیوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ نوح میں نیم کے درخت پر ۵۲ میواتیوں کو اور فیروز پور جھرکا میں املی کے پیڑ پر سیکڑوں متوالوں کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ مراد آباد کے نواب مجو خان شہید کی لاش کو ہاتھی کے پیر سے باندھ کر شہر میں گھسیٹا گیا۔ بعد میں چونے کے پانی میں ڈال کر جلایا گیا The other side of the Medal میں Lt.Robertson نے لکھا: ''ہم لوگ پیشاور سے جہلم تک پیدل سفر کرتے ہوئے پہنچے راستے میں کچھ ضروری کام کرتے آئے۔ باغیوں سے اسلحہ چھینا؛ انہیں پھانسی پر لٹکایا۔ توپ سے اڑانے کا جو طریقہ ہم نے استعمال کیا اس سے ہمارا ڈر لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا۔ فوجی عدالت کے حکم

سے باغیوں کے سر قلم کر دیئے گئے اور یہی پالیسی اس وقت تمام چھاونیوں میں عمل میں لائی جارہی ہے۔'' جھجھر کے نواب عبدالرحمٰن شہید کو پھانسی دی گئی کیونکہ وہ باغیوں کی مدد کرتے تھے۔ اکبر آبادی مسجد میں شاہ ولی اللہ کا مدرسہ برباد کر دیا گیا۔ صرف دہلی میں ایک لاکھ گھر اور مسجدیں زمین سے ملا دیں۔

اردو اور آزادی کا سفر

آزادی کی جنگ میں انقلابیوں کے دہلی میں جمع ہونے کے بعد سے وہاں سے تمام ملک کی چھاونیوں اور شہروں کو اردو میں خط لکھ کر ابھارا گیا۔ نانا صاحب، خان بہادر خان، بیگم حضرت محل سب نے اردو میں خط بھیج کر جہاد کے لیے لوگوں کو اکسایا۔ اردو کے اخباروں طلسم لکھنؤ، صادق الاخبار، دہلی گزٹ، اردو اخبار دہلی، سراج الاخبار دہلی، اردو معلّٰی دہلی، حبیب الاخبار بدایوں اردو کے لئے فخر کی بات ہے کہ ''دہلی اردو اخبار'' کے ایڈیٹر محمد باقر کو گولی ماری گئی۔ بہادر شاہ ظفر کے نواسے مرزا بیدار بخت نے ''پیامِ آزادی'' کے نام سے رسالہ میں آزادی کا Manifesto چھاپا۔ مرزا بیدار بخت کو انگریزوں نے ان کے جسم پر سور کی چربی مل کر شہید کیا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر عظیم اللہ خان تھے۔ انہیں پھانسی دی گئی۔

❁ ❁ ❁

مآخذ:

(۱) ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگ آزادی میاں محمد شفیع۔

(۲) تحریک آزادی ہندو اور مسلمان محمد احمد صدیقی۔

(۳) تاریخی منظر نامہ عطاء الرحمٰن وجدی۔

(۴) شبیر احمد عرفان حبیب اخبار خبر دار جدید۔

(۵) فروز بخت احمد راشٹریہ سہارا اردو، دہلی۔

سری لنکا میں تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر چھ روزہ تربیتی کیمپ

ملکی سطح پر قادیانی فتنہ کے سد باب کی کامیاب کوشش، دوسو سے زائد مندوب وعلماء کی شرکت

۸ تا ۱۷؍ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ = ۲۶؍ اپریل تا ۵؍ مئی ۲۰۰۷ء

از: شاہ عالم گورکھپوری

سری لنکا کا شماران ممالک میں ہوتا ہے جن میں ایک عرصہ سے قادیانی فتنہ اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے میں مصروف ہے۔ سری لنکا کے بعض علماء کے بقول ۱۹۱۶ء میں پہلی بار قادیانیت نے سری لنکا میں قدم رکھا تھا لیکن مسلسل اپنی تمام تر ریشہ دوانیوں کے باوجود اپنے ناپاک عزائم میں تاہنوز ناکام ہے۔ البتہ اِدھر دو تین سال کے عرصہ میں قادیانی تحریک کے بیرونی پرچارکوں نے ملکی فضا خراب کرنے میں کچھ زیادہ ہی تیزی پیدا کردی ہے۔ مسلسل مسلمان نوجوانوں کو ورغلانا، دین اسلام کے نام پر مسلمانوں کو بے دین بنانا، اور اپنے لیٹریچر خفیہ طور پر مسلمانوں میں تقسیم کرنا اور تبلیغ کے نام پر مسلمانوں کو اپنے ہیڈ کوارٹر قادیان اور لندن کے سیر کرانا وغیرہ ان کی ریشہ دوانیوں کو دیکھتے ہوئے جمعیۃ علماء سری لنکا نے پہلی بار اس فتنہ کے سد باب اور مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھنے کے لئے قدم اٹھایا اور ملکی سطح پر چھ روزہ تربیتی کیمپ کا انعقاد کیا۔

سری لنکا چونکہ ہندوستان کا پڑوسی ملک ہے اس مناسبت سے جمعیۃ علماء سری لنکا نے تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر تربیتی کیمپ کے لیے کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت دارالعلوم دیوبند سے رابطہ کیا اور اس کے لیے باضابطہ صدر کل ہند مجلس کی خدمت میں درخواست لے کر ایک وفد بھیجا جن کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں: (۱) جناب شیخ ظریف احمد صاحب نائب صدر جمعیۃ علماء سری لنکا، (۲) مفتی محمد رضوی صاحب قاسمی استاذ مدرسہ الرشاد العربیہ گرانفاص، (۳) جناب مولانا مفتی مفاز قاسمی صاحب استاذ مدرسہ عربیہ کولمبو۔

صدر محترم کی منظوری کے بعد راقم السطور (شاہ عالم گورکھپوری) کا سفر طے ہوا اور پروگرام کے لیے مورخہ ۲۶/اپریل تا ۵/مئی ۲۰۰۷ء کی تاریخیں طے پائیں۔

پروگرام کے مطابق ۲۶/اپریل ۲۰۰۷ء بروز جمعرات ۲ربجے کے قریب راقم السطور سری لنکا کے ایئرپورٹ پر اترا جہاں استقبال کے لیے محترم شیخ ظریف صاحب نائب رئیس جمعیۃ علماء سری لنکا، مولانا محمد الیاس صاحب کاشفی نائب شیخ الحدیث مدرسہ الرشاد العربیہ گرانفاص، مولانا مفتی محمد رضوی القاسمی وغیرہ احباب موجود تھے، عصر کی نماز کا وقت قریب تھا نماز سے فراغت کے بعد مختصر سا قیام ایئرپورٹ سے قریب ہی شہر نگمبو میں طے تھا جہاں طعام وغیرہ کا بھی نظم تھا۔ راقم سطور سری لنکا میں پہلی بار جن کا مہمان ہوا وہ تھے جناب الحاج زومی صاحب صاحبزادہ سابق امیر جماعت تبلیغ سری لنکا، موصوف نے ماشاء اللہ پرتکلف ضیافت کا نظم کیا تھا فجزاہم اللہ خیراً۔ راقم سطور وطن سے پہلی بار باہر کسی دوسرے ملک میں تبلیغ ہی کے لئے نکلا تھا اور وہاں مسکن جو ملا وہ بھی تبلیغ کا، اس عملی اور قلبی ربط باہم سے ظاہر سی بات ہے کہ باہمی انسیت جو پیدا ہوگی وہ پرکیف ہوگی۔

نماز مغرب کے بعد شب کا قیام کولمبو شہر میں طے تھا وقت پر راقم سطور جناب شیخ رفقان صاحب کے مکان پر پہنچا جہاں محترم جناب شیخ مفتی محمد رضوی صدر جمعیۃ علماء سری لنکا ورکن مجلس شوریٰ تبلیغی جماعت سری لنکا سے ملاقات ہوئی موصوف ماشاء اللہ خلیق، جیدالاستعداد عالم دین اور وسیع النظر بزرگ ہیں۔ طعام وغیرہ سے فراغت کے بعد آئندہ پروگرام سے متعلق مشورہ ہوا جس میں شیخ ظریف، شیخ رفقان کے علاوہ بہت سے احباب شریک تھے۔ اگلے دن جمعہ کی نماز شیخ رضوی کے ہمراہ ان کی مسجد میں ادا کی بعد نماز شیخ رفقان کے مکان پر ہی تامل ناڈو (انڈیا) کے ہی ایک مشہور عالم دین شیخ محمد خان الباقوی سے ملاقات ہوئی اور کچھ اپنے موضوع پر تبادلہ خیالات کیا گیا۔ موصوف ماشاء اللہ تحفظ ختم نبوت کے موضوع پر ایک فکرمند عالم دین ہیں کل ہند مجلس تحفظ ختم نبوت کا طریقہ کار اور اب تک کی مختصراً کارکردگی سن کر نہایت خوشی کا اظہار کیا اور دعاؤں سے نوازا۔ اسی دن نماز مغرب کے بعد مدرسہ دینیہ پلّی ملا باندورائے کے لیے روانگی ہوئی، گاڑی میں سفر کے رفیق جناب شیخ ظریف اور مفتی مفاز احمد قاسمی صاحب تھے، تقریباً ایک گھنٹے میں سو کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے عشاء کے وقت ہم مدرسہ دینیہ میں تھے۔ جہاں اساتذہ وطلبہ کے ہمراہ مدرسہ کے مہتمم جناب شیخ محمد رمضان صاحب نے وفد کا استقبال کیا۔

تربیتی کیمپ کی پہلی نشست:

مشورہ کے مطابق پورے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرکے تربیتی پروگرام رکھے گئے تھے۔ چنانچہ مدرسہ دینیہ پاندورائے میں قرب و جوار کے تمام مدارس کے نمائندے جمع تھے، جن کی کل تعداد ۸۶ تھی۔

پروگرام کا آغاز حسب اعلان صبح ۸ر بجے الحمدللہ مدرسہ کے ایک طالب علم کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا، جناب شیخ جعفر صاحب مہتمم مدرسہ بریرہ نسواں کا تعارفی اور ابتدائی خطاب ہوا جو مقامی زبان میں تھا۔ موصوف نے پروگرام کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ سری لنکا کی تاریخ میں یہ الحمدللہ پہلا واقعہ ہے کہ از ہر ہند دارالعلوم دیوبند نے ہماری سرپرستی کرکے ایک خاص موضوع پر علمی اعتبار سے ہمیں فیضیاب و سیراب ہونے کا موقع فراہم کیا ہے جس سے پورے ملک کے مسلمانوں میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے اور ارباب مدارس و طالبان علوم دینیہ کے لئے تو یہ بے بدل زریں موقع ہے کہ ہم اپنے گھر بیٹھے دارالعلوم دیوبند کے فیض سے بواسطہ جناب مولانا شاہ عالم صاحب گورکھپوری فیضیاب ہورہے ہیں۔ اس موقع سے ہم جس قدر دارالعلوم دیوبند کے مشکور ہوں، کم ہے۔

موصوف نے ملک میں قادیانیت کے پھیلتے ہوئے جراثیم سے بھی حاضرین مندوبین کو باخبر کیا اور اس کے بھیانک اثرات وخطرات سے بھی واقف کرایا۔

موصوف کے تعارفی خطاب کے بعد راقم سطور کو دعوت دی گئی۔ راقم نے اس پہلی نشست میں تاریخی پہلو سے قادیانیت کا اس انداز میں تعارف کرایا کہ سامعین وحاضرین پر قادیانیت کا فتنہ ہونا اور ایمان وعمل کے لئے مہلک ہونا روز روشن کی طرح واضح ہوگیا جس کی تفصیلات بذریعہ ٹیپ ریکارڈ نقل کرکے کسی دوسرے موقع پر پیش کی جائے گی۔ واضح رہے کہ اس نشست میں ترجمان کے فرائض جناب شیخ محمد الیاس صاحب اور جناب مفتی مفاز صاحب نے ادا کیے۔ ان احباب کو اردو اور مقامی زبان پر ماشاء اللہ عبور حاصل ہے۔

تربیتی پروگرام کی دوسری نشست ۴ تا ۶ر بجے شام ہوئی اسی طرح تیسری نشست بعد نماز مغرب ۷ تا ۱۱ر بجے شب میں ہوئی۔ نشست مکمل ہونے کے بعد عشاء کی نماز پڑھی گئی۔ اگلے روز اتوار میں صبح ۷ر بجے چوتھی نشست کا آغاز ہوا جس میں مرزا قادیانی کے عقائد ونظریات پر بحث کی

گئی۔ یہ نشست ۱۲/بجے تک چلتی رہی بعدہٗ نماز ظہر وطعام وغیرہ سے فراغت کے بعد عصر سے لیکر مغرب ۷/بجے تک پانچویں نشست منعقد ہوئی جو ۱۲/بجے تک چلتی رہی۔ چھٹی نشست بعد نماز ظہر ساڑھے تین بجے سے شروع ہوئی جو ساڑھے پانچ بجے تک چلتی رہی اس نشست میں راقم سطور کے مختصر بیان کے بعد مقامی کبار علماء میں سے جناب مفتی محمد رضوی صاحب اور امیر جماعت وغیرہ کے بیانات ہوئے اور تمام مندوبین کو شرکت اور کتابوں کے سیٹ وغیرہ تقسیم کیے گئے، جس کو جامعہ دینیہ نے تیار کرائے تھے۔

چھٹی نشست میں مقامی علماء کرام نے تاثرات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ صحیح معنوں میں اب تک قادیانی فتنہ کی خطرناکی و زہرناکی کو اس انداز میں نہیں سمجھا گیا تھا جیسا کہ اس تربیتی پروگرام سے سمجھا گیا ہے۔ مقررین نے تربیتی پروگرام کی افادیت کا اظہار کرتے ہوئے جمعیۃ علماء سری لنکا اور دارالعلوم دیوبند کا بھی شکریہ ادا کیا اور امید ظاہر کی کہ آئندہ بھی اس طرح کا پروگرام ضرور ہوگا، انشاء اللہ۔

۳۰/اپریل بروز دوشنبہ میں راقم سطور واپس شہر کولمبو پہنچا بلکہ اتوار اور دوشنبہ کی درمیانی رات میں ہی تقریباً دس بجے مدرسہ دارالرشاد (معروف بہ مرکز مدرسہ) میں پہنچ چکا تھا۔ جہاں صبح بعد نماز فجر جامعہ کے نائب مدیر جناب مولانا ابوالحسن ندوی مدظلہ اور مدیر جناب مولانا محمد سلطان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ترجمانی کے فرائض بذات خود مفتی محمد رضوی صاحب ادا فرمارہے تھے۔ ان اکابر کے سامنے بطور خاص تعلیم، تبلیغ اور فرقہائے باطلہ کا تعاقب وغیرہ موضوع سخن رہا کہ امت کی ہدایت و رہنمائی میں ان تینوں اجزاء کی برابر کی حصہ داری ہے تینوں بغیر ایک دوسرے کے ناقص اور ادھورے ہیں۔

اسی دن مرکز تبلیغ میں بھی بندہ نے حاضری دے کر اراکین شوریٰ اور اکابر سے ملاقات کی ماشاء اللہ مدرسہ اور مرکز کی جدید طرز کی عمارتیں خوبصورتی کی ایک مثال رکھتی ہیں ظاہری خوبصورتی سے کہیں بڑھ کر باطنی خوبصورتی یعنی تعلیم وتبلیغ کا عمدہ نظام اور حسین امتزاج یہاں پایا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ الحمدللہ پورے سری لنکا میں مساجد نمازیوں سے آباد ہیں اور بدھسٹ حکومت میں بھی مسلمان دیندار اور باعمل ہیں۔

ناشتہ سے فراغت کے بعد ساڑھے نو بجے شہر نگمبو میں پروگرام تھا جہاں قادیانیوں کا ہیڈ کوارٹر واقع ہے۔ کولمبو سے نگمبو کے سفر میں جناب مولانا مفتی محمد یوسف صاحب مولانا محمد الیاس

صاحب، مفتی مفاز، مفتی محمد رضوی القاسمی وغیرہ احباب ہمراہ تھے۔ ۱۰ سے ایک بجے تک نگمبو کی جامع مسجد میں شاندار پروگرام ہوا۔ اس پروگرام میں راقم سطور نے تربیتی انداز کے بجائے عمومی انداز میں قادیانیت کی خطرناکی سے سامعین کو باخبر کرایا جس میں ترجمانی کے فرائض جناب مولانا محمد الیاس صاحب نے ادا کیے۔ سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو سے زائد تھی۔

اسی دن عصر کی نماز کے بعد نگمبو سے کنڈی کے لیے روانگی ہوئی اور عشاء کے وقت ہم جناب الحاج محمد رفیق صاحب اور الحاج عبدالسلام صاحب کے مہمان ہوئے اس دوران ہمارے سفر کے رفیق جناب مفتی محمد مفاز صاحب قاسمی مولانا محمد رضوی قاسمی صاحب، شیخ فہمی اور جناب مفتی محمد فاہم صاحبان تھے۔

جامعہ ستاریہ کے سالانہ اجلاس میں شرکت:

یکم مئی کا نصف دن آرام اور نصف آخر سری لنکا کے معروف ومشہور ادارہ جامعہ فتاحیہ کے لئے خاص تھا حسن اتفاق کہ جامعہ ستاریہ کا سالانہ اجلاس پہلے سے طے تھا اور ناچیز کا پروگرام بھی اس سے چند کیلومیٹر کے ہی فاصلے پر تھا اس وجہ سے منتظمین جامعہ بالخصوص جناب شیخ رزان صاحب اور مفتی محمد رضوی صاحب کے اصرار پر بندہ نے بھی اجلاس میں شرکت مناسب جانا چونکہ جامعہ کے اجلاس میں بھی ملک کے بہت سارے علماء وفضلاء شریک تھے جامعہ کے اجلاس میں شرکت سے پہلی بار ایسا ہوا کہ اس علاقہ میں دارالعلوم دیوبند کا تعارف عوام وخواص میں ہوا، راقم نے دارالعلوم کی تاریخ اور اس کے علمی وفقہی ومسلکی کارناموں پر روشنی ڈالی اس سے سری لنکا کے بہت سے معمر علماء نے پہلی بار براہ راست دارالعلوم کے کسی خادم کی زبانی دارالعلوم کا تعارف سنا اور خوش ہوئے۔ اس اجلاس میں بطور خاص شیخ رزان مہتمم جامعہ فتاحیہ، شیخ آگار محمد مہتمم جامعہ تنظیمیہ، شیخ صلاح الدین وغیرہ علماء سے ملاقات ہوئی اور موضوع سے متعلق تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔

جامعہ دارالعلوم سبیل السلام اکوولا میں قیام

یکم مئی میں ہی بعد نماز ظہر جامعہ فتاحیہ کے اجلاس سے واپس ہوکر مدرسہ بریرہ نسواں میں کچھ وقفے کیلئے حاضری ہوئی، جامعہ کے مخلص منتظم جناب شیخ جعفر صاحب اور ان کی محنتوں کو دیکھ

کر معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ سری لنکا میں تعلیم نسواں کا بھی معقول نظم ہے اللّٰھم فزد فزد، نماز مغرب سے کچھ قبل دارالعلوم سبیل السلام پہنچے۔ اس ادارہ کے ذمہ دار دارالعلوم دیوبند کے ایک فاضل جناب مولانا محمد رئیس قاسمی صاحب ہیں، مولانا موصوف کے یہاں قیام اس لئے طے کیا گیا تھا تاکہ چند مخصوص علماء کے درمیان مرزا قادیانی کی تصنیفات کا علمی انداز میں بھرپور جائزہ لیا جائے۔ الحمدللہ بعد نماز مغرب ۷/بجے پروگرام شروع ہوا جو شب ۱۰/بجے تک جاری رہا۔ اس دوران مرزا کی تصنیفات بطور خاص روحانی خزائن میں شامل کتابوں میں مرزا قادیانی کے باطل عقائد ونظریات اور اسلام مخالف مواد کو راقم سطور نے موضوع سخن بنایا چونکہ مجمع صرف اہل علم کا تھا اس لئے ماشاء اللہ علماء حضرات نے پہلی بار ایسا ہوا کہ مرزائی عقائد ونظریات کو مرزا کی کتابوں میں بچشم خود دیکھ کر، پڑھ کر جانا اور سمجھا، شب کا قیام وطعام محترم جناب الحاج مختار احمد صاحب والد گرامی مولانا رئیس احمد قاسمی صاحب کے مکان پر ہوا موصوف نے پرتکلف ضیافت کا نظم کر رکھا تھا۔ فجزاہم اللہ خیرا۔

دوروزہ تربیتی کیمپ جامعہ حلیمیہ ماتلا

۲/مئی بروز چہارشنبہ سے دو یوم کا تربیتی کیمپ سری لنکا کے پہاڑی علاقہ ماتلا میں طے تھا پروگرام کے مطابق الحمدللہ ۲/مئی بدھ کی صبح ۷/بجے ہم جامعہ حلیمیہ ماتلا میں ہمراہ شیخ محمد رئیس قاسمی ومفتی محمد رضوی القاسمی پہنچ چکے تھے۔ جہاں اس علاقہ کے تقریباً ایک سو علما جمع تھے۔ اعلان کے مطابق صبح ۸/بجے تربیتی کیمپ کی پہلی نشست کا آغاز ہوا تلاوت قرآن مجید کے بعد راقم سطور نے ساڑھے آٹھ سے دس بجے تک مرزائیت اور قادیانیت کے تاریخی پہلو پر روشنی ڈالی، پھر کچھ وقفہ کے بعد ۱۰/بجے سے دوسری نشست کا آغاز ہوا جس میں راقم سطور نے مرزائی عقائد ونظریات کے موضوع پر گفتگو کی یہ نشست ساڑھے بارہ بجے اپنے اختتام کو پہنچی۔

تیسری نشست نماز عصر کے بعد ۴/بجے سے نماز مغرب ۷ بجے تک اور چوتھی نشست بعد نماز مغرب ساڑھے سات بجے سے شب ۱۲/بجے تک چلتی رہی۔ اس نشست میں علاقہ کے معروف ومشہور معمر علماء، جناب مولانا محمد صالح شیخ الحدیث جامعہ حلیمیہ ومہتمم صاحب جامعہ حلیمیہ مولانا محمد حنیف صاحب کے علاوہ اہل حدیث مکتب فکر کے ایک بڑے عالم جناب شیخ مبارک بھی اپنے رفقاء کے ہمراہ شریک پروگرام تھے۔

۳؍مئی بروز جمعرات صبح ۷؍بجے پانچویں نشست کا آغاز ہوا۔ ۹ سے ۱۰؍بجے ایک گھنٹہ وقفہ کے بعد اس پروگرام کی آخری اور چھٹی نشست کا آغاز ہوا جس میں راقم سطور کے مختصر بیان کے بعد مندوبین شرکاء کو سند شرکت سے نوازا گیا یہاں کل مندوبین کی تعداد ۹۰ تھی جب کہ دیگر مقامی و بیرونی شرکاء کی تعداد بھی پچاس تک تھی۔ دوپہر کا کھانا شیخ میزان صاحب کے گھر طے تھا، طعام سے فراغت کے بعد موصوف کی چائے فیکٹری المیز ان کا سیر کیا گیا۔ موصوف ماشاء اللہ علم دوست اور نیک مخیّر لوگوں میں سے ہیں آپ کا میزان گیسٹ ہاؤس ملک کے اعلیٰ رہائش گاہوں میں شمار ہوتا ہے ان پروگراموں سے فارغ ہوکر اب واپسی شروع ہوئی الحمدللہ اس سفر میں جتنے پروگرام تھے وہ سب بحسن وخوبی اپنے اختتام کو پہنچے واپس ہوتے ہوئے راستے میں جامعہ حقانیہ دس کمرہ میں نماز مغرب ادا کی گئی، جامعہ حقانیہ ماشاء اللہ پر بہار پہاڑوں کی وادی میں واقع ہے، جامعہ کے مہتمم جناب مولانا محمد ظفیر صاحب اور اس کے منتظم اعلیٰ جناب مولانا محمد حنیفہ صاحب مدظلہ کے اصرار پر بعد نماز معرب تا عشاء طلبہ میں کچھ ناصحانہ باتیں ہوئی۔ یہاں ترجمانی کے فرائض جناب مولانا مفتی محمد رضوی القاسمی نے ادا کئے۔ شب کا قیام جامعہ میں ہی ہوا جہاں جناب مولانا مفتی محمد یوسف صاحب فاضل بنوری ٹاؤن، جناب قاری اظہر صاحب مہاراشٹری، مولانا محمد علی مظاہری وغیرہم سے ملاقات ہوئی۔ ۴؍مئی بروز جمعہ قبل نماز جمعہ مسلسل چار گھنٹہ کے سفر کے بعد ہم کولمبو مدرسہ الرشاد پہنچے، سخت بارش کی وجہ سے ہمارا نظام درہم برہم تھا، آج ہی دیوبند کی واپسی طے تھی لیکن بارش کی وجہ سے اگلے روز کی فلائٹ کا ٹکٹ لیا گیا۔ بعد نماز جمعہ مفتی محمد رضوی صاحب کے ہمراہ متعدد مقامات پر ازراہ ملاقات وتفریح جانا ہوا۔ شب کا قیام مفتی رضوی صاحب کے حجرہ میں رہا۔ موصوف ماشاء اللہ ایک متبحر اور کتابوں کے باذوق علماء میں سے ہیں۔ رات بھر موصوف کے کتب خانہ سے استفادہ کیا کئی ایک نایاب کتابیں بندہ کو یہاں دستیاب ہوئی۔ ۵؍مئی کی صبح ۱۰؍بجے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر ایئرپورٹ کے لئے روانگی ہوئی، نہایت خلوص ومحبت کے ساتھ مفتی محمد یوسف صاحب، مولانا محمد الیاس صاحب، مفتی محمد رضوی صاحب وغیرہم نے ایئرپورٹ پر ساڑھے گیارہ بجے الوداع کہا اور راقم سطور براستہ مدراس شب ۱۲؍بجے دہلی آ پہنچا۔

دعاء ہے کہ اللہ رب العزت ان جملہ پروگراموں کو قبول فرما کر اپنی رضامندی کا ذریعہ اور ہمارے لیے باعث نجات بنائے پروگرام کے منتظمین کو اللہ تعالیٰ بے حد قبول فرمائے اور پروگرام کے نیک ثمرات مرتب فرما کر قادیانیوں کو صراط مستقیم سے نوازے۔ آمین

کمیونزم کی شکست کے بعد اسلام دنیا کیلئے سب سے بڑا خطرہ ہے

(مسز مارگریٹ تھیچر بحوالہ کلدیپ نیر) ۱۸/۷/۲۰۰۷ء

از: ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی
۱۵- گاندھی روڈ، دہرہ دون

۹/۱۱ کے بعد سے یوں تو دنیا میں کچھ مخصوص مقامات میں وقفہ سے اسلام مسلم دشمنی کا بونڈر اٹھتا ہے۔ ان میں سے بیشتر معاملات میں آخر میں کچھ نہیں ملتا۔ آسٹریلیا میں ڈاکٹر حنیف کی گرفتاری کو لے کر ہمارے ملکی پریس، نام نہاد دانشوران وطن پرستی کے ٹھیکیداران نے جس طرح اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بھڑاس نکالی اور جس تنظیم اور ہمہ جہتی حملہ کا شکار امت مسلمہ کو بنایا وہ ہر انصاف پسند اور انسان دوست کے لئے باعث تشویش ہے۔ ابھی جبکہ آسٹریلیا میں خود کوئی بات طے نہیں ہو پائی تھی ہمارے یہاں ساری چیزیں طے کردی گئی تھیں۔ ڈاکٹر حنیف کے دادا، ماں، باپ ہر ایک کا شجرہ بتادیا گیا اور گھر کی فوٹو کے ساتھ ''دہشت کا گڑھ'' جیسے ٹائٹل لگائے گئے اور ملّت کی ہر فکر اور متحرک تنظیم کو مختصر حوالوں سے ملامت زدہ بنایا گیا وہابی، تبلیغی، سلفی، جماعت اسلامی اور ڈاکٹر ذاکر نائک کی دعوتی تنظیم آئی، آر، ایف سبھی کو نشانہ پر لیا گیا۔ اس سے پہلے کے واقعات کی آڑ میں دیوبند، مدارس وغیرہ کو شکار کرلیا گیا تھا اِس قسط میں بقیہ ماندہ کو بھی شکار بنایا گیا۔ اور سب نے مل کر میڈیا ٹرائیل کیا۔ اسی دوران کے کچھ اور قتل وغارت گری اور ظلم وتشدد کے کچھ بین الاقوامی اور ملکی واقعات کو ملکی میڈیا اور دیش بھکتی کے ٹھیکیداروں نے اس طرح ہائی لائٹ نہیں کیا جس میں الزام مسلمانوں کے سر نہیں آتا تھا۔ مثلاً: اُسی روز ہندوستان میں ماؤوادیوں نے رائے پور کے دانتے واڑہ ضلع کے جنگل میں سیکورٹی دستوں پر حملہ کرکے سی.آر. پی ایف کے اسسٹنٹ کمانڈنٹ وجے کمار سمیت کئی پولیس افسر اور ۲۴ جوان ہلاک کردیئے۔ ۴۱ پولیس اہلکار لاپتہ تھے جن میں سے کچھ بعد میں واپس آگئے تھے۔ دوسرے واقعہ میں تقریباً اُسی

دن بڑودہ کی ایم.ایس یونی ورسٹی کے آرٹ ڈپارٹمنٹ کے ذمہ دار کے ساتھ ایک تقریب کے دوران ہندوتشدد پسندوں نے خوب مار پیٹ کی۔ اگر کچھ خاتون واکراُن کی مدد نہ کرتیں تو اُن کا بچنا بھی محال تھا۔ بین الاقوامی منظرنامہ میں انہیں دنوں طبی پیشہ سے تعلق رکھنے والے یوروپی حیوانوں کی حیوانیت کی خبر آئی جس میں بتایا گیا کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں لیبیا کے بن غازی شہر کے اسپتال میں اِن درندہ صفت بلغاریائی نرسوں نے ۴۲۶ لیبیائی بچوں کو دانستہ ایڈس کے وائرس انجکشن کے ذریعہ متاثر کیا تھا۔ جس میں سے بہت سے بچوں کی بعد میں موت ہوگئی تھی۔ اس مقدمہ میں پانچوں یوروپی نرسوں کوموت کی سزا لیبیا کی سپریم کورٹ نے بحال کردی تھی۔ اوراپیلوں کو خارج کردیا تھا۔ اس کے بعد انسانیت کے ہمدرد ''روشن خیال'' ''سیکولر'' فرانسیسی صدر سارکوڈی نے لیبیا کا دورہ کیا ان کے ساتھ دنیا کے سب سے ''مہذب'' ممالک کے مجموعہ ''یورپین یونین'' کے بیرونی معاملات کے کمشنر بنیٹا فریرو والڈنر بھی تھے اور اِن مجرم درندہ نرسوں کو ہوائی جہاز میں بٹھا کر بلغاریہ لے آئے۔ بدلہ میں لیبیا کے ''دہشت گرد'' مسلمان بچوں کی قیمت کے طور پر میڈیکل مدد اور کروڑوں ڈالر مالیت کے ہتھیاروں کے آرڈر دے دیئے گئے۔ (راشٹریہ سہارا ۲۱/۷/۲۰۰۷ء اور ٹائمس آف انڈیا ۲۵/۷/۲۰۰۷ء)

۱۴/۷/۲۰۰۷ء کو خبر آئی کہ ۱۳/۷/۲۰۰۷ء کو واشنگٹن میں امریکی سینیٹ (Senate) کے افتتاح کے موقع پر اس بار روایتی طور پر عیسائی عقیدہ کے مطابق نہیں بلکہ ہندو عقیدہ کے مطابق دعاء ہوگی اس کام کے لئے ہندو پجاری راجن زید کو خصوصی طور سے بلایا گیا۔ وہ جیسے ہی ڈائس پر پہنچے عیسائی انتہا پسندوں نے جس کا تعلق مذہبی جماعت Save - America سے تھا راجن زید کے خلاف نعرہ لگائے۔ اور چلائے کہ ''یہ جھوٹی عبادت (دعاء) ہے'' اور یہ کہ ''لارڈ جیمس معاف کرے کہ ہم نے بدعقیدہ لوگوں سے دعاء کرائی'' وہ چلاتے رہے یہ قابل نفرت ہے۔ اور یہ کہ ''کوئی خدا نہیں مگر مسیحؑ'' اور ''ایک ہی خدا سچا ہے۔'' وغیرہ۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۴/۷/۲۰۰۷ء)

ہندو نیپالی القاعدہ:

۲۱/۶/۲۰۰۷ء کو اِسی اخبار نے خبر لگائی ''ہندو قاعدہ نے نیپال میں خودکش بمباروں کو تربیت دی'' خبر میں بتایا گیا کہ ایک سابق نیپالی ہندو پولیس افسر نے ''نیپال ڈیفنس آرمی'' کے نام سے گروپ تشکیل دیا ہے۔ اس افسر نے اپنا نام پریورتن ifjorZau بتایا ہے اور بتایا ہے کہ

ہمارے ساتھ ۱۲۰۰ مسلح لوگ ہیں جنہیں ہر طرح کے گولہ بارود بنانے اور استعمال کرنے کی تربیت ہے۔ اور میرے اکثر ساتھی سابقہ ماؤوادی ہیں اس لئے ہماری تربیت پوری ہے۔ ہمیں پوری دنیا کے ہندوؤں سے مدد مل رہی ہے۔ ہمارے تربیتی مراکز ہند- نیپال سرحد پر واقع ہیں جہاں ہم تربیت دیتے ہیں۔ ہمیں کمیونسٹوں، مسلمانوں اور عیسائیوں سے مقابلہ کرنا ہے۔ ہمیں ہندوستان سے گولہ بارود بنانے کا سامان ملتا ہے۔ ہم نے پانچ خودکش بمباروں کو تربیت دے دی ہے جو ہر جگہ جاسکتے ہیں یہاں تک کہ موجودہ حکومت کے صدر مقام ''سنگھ دربار'' تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲۱/۶/۲۰۰۷ء)

۲۷/۷/۲۰۰۷ء کی خبر ہے کہ ہندوستانی بیرونی خفیہ ایجنسی ''را'' کے سابق افسر اعلیٰ اور کیبنٹ سکریٹریٹ میں ایڈیشنل سکریٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہونے والے بی رمن نے اپنی آنے والی کتاب "The Kaoboys of RAW - Down the memory lane" میں لکھا ہے کہ ۱۹۷۱ء میں رچرڈ نکسن امریکی صدر اور پاکستانی صدر جنرل یحییٰ خان نے مل کر ہندوستانی پنجاب میں علیحدگی پسندگی کو سکھوں میں پھیلانے کی سازش رچی تھی۔ اس میں امریکہ اور پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں نے مشترکہ طور پر حصہ لیا تھا۔ اس تحریک کو ایک دہائی تک پنجاب میں خوب عروج ہوا اور ۱۹۸۴ء میں شریمتی اندرا گاندھی کے قتل کے ساتھ ہی یہ تحریک ختم ہونا شروع ہوگئی۔ اِس تحریک میں برطانیہ کی سرزمین کا بھی استعمال کیا گیا تھا۔

۴/۸/۲۰۰۷ء کے تمام چھوٹے بڑے اخبارات میں امریکی صدارت کے لئے ممکنہ ری پبلکن امیدوار ٹام ٹین کریڈو کا بیان اخبارات میں شائع ہوا کہ ''ان کے خیالات میں دہشت گرد امریکہ پر حملہ کرسکتے ہیں اور امریکہ کو پیشگی کارروائی کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ پیشگی کارروائی کے طور پر بہتر راستہ یہ ہوگا کہ اسلامی مقامات مقدسہ پر حملہ کی جوابی دھمکی دے دی جائے۔ اور حملے کی صورت میں جوابی کارروائی بھی کی جائے''۔ ٹام کریڈو ۲۰۰۵ء میں بھی اس طرح کے (شیطانی) خیالات کا اظہار کرچکا ہے۔ (ہندوستان ایکسپریس ۴/۸/۲۰۰۷ء)

کیا یعقوب قریشی نے ڈیلیکن پر حملہ کرنے کو کہا تھا؟ مگر میڈیا یعقوب قریشی کے پیچھے پڑ گیا اور عدالت میں بھی مقدمہ درج ہے مگر ٹام ٹین کریڈو کے خلاف غلام ہندوستانی میڈیا چپ رہا۔

۱۵/۸/۲۰۰۷ء کی خبر میں بتایا گیا ہے کہ شیوسینا کے فسادیوں نے ۱۴/۸/۲۰۰۷ء کو انگریزی میگزین ''آؤٹ لک'' میں ایک مضمون کے مشمولات سے مشتعل ہوکر اس کے ممبئی آفس پر

جم کرتوڑ پھوڑ کی۔مگر کوئی پولیس کارروائی وغیرہ کی اطلاع نہیں ہے۔15/8/07. Tol

اس کے علاوہ کہاں تک یاد دلایا جائے جو کہ اعدائے اسلام کی دشمنانہ اور منافقانہ رویّہ کو ظاہر کرسکے۔ ماضی قریب میں بین الاقوامی منظرنامہ میں برطانیہ میں مقیم سابق K.G.B افسر الیگزینڈر لجوینینکو (Litvinenko) کے تابکار مادہ کے ذریعہ قتل کو جو کہ روسی سرکار کی ایماء پر کرایا گیا پر وہ تبصرہ نہیں ہوئے جو اسی طرح کے معاملات میں مسلمانوں پر ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں ۱۳/۳ اور ۷/۷ کے جرائم پر بڑی بحث ہوتی ہے مگر ۱۲/۶ اور ممبئی فسادات اور کوئمبٹور فسادات میں ہسپتالوں تک میں مسلمانوں کے قتل عام اور ری کرشنا کمیشن پر حکومتوں کی بے عملی اور اِن جرائم کے مرتکبین، ان کے حمایتی پولیس اور افسران و سیاستدانوں کے رول پر کوئی بحث نہیں ہوتی۔ان تنظیموں کی سرگرمیوں پر ان کے آمدنی کے ذرائع پر اُن کے بیرونی روابط پر کوئی گفتگو اور بحث ہمارے پریس اور میڈیا میں نہیں ہوتی۔ اِس سارے میڈیا ٹرائیل کے دوران جس میں بڑے بڑے نام نہاد دفاعی امور کے ماہرین دراصل ہتھیار لابی کے ایجنٹ اور مشہور مسلم دشمن شخصیات نے حصہ لیا اس بحث میں موٹے طور پر دنیا میں تمام شر و فساد فی الارض کے لئے اسلام اور مسلمانوں کو ذمہ دار قرار دیا گیا اور اُس میں بھی ''وہابی اسلام'' اور ''بنیاد پرست اسلام'' کو ذمہ دار بتایا گیا۔ اور اس حوالہ سے اپنی اپنی قابلیت کے مطابق علماء سلف وخلف سب کو نشانہ پر لیا گیا بطور خاص امام ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہؒ، محمد بن عبدالوہابؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، سید قطب شہیدؒ کو ہدف ملامت بنایا گیا۔ کہتے ہیں تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اس معاملہ میں بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جب ہمارا ملک ۱۸۵۷ء کی ۱۵۰ویں سالگرہ منا رہا تھا اور ''بغاوت'' اور ''مسلح جدوجہد'' کی بحث میں الجھا ہوا تھا مگر یہ منانے والے اِس بات کو دانستہ بھول رہے ہیں کہ اُس وقت بھی وقت کے ظالموں اور فرعونوں نے اپنے خلاف آواز اٹھانے والوں کو ''وہابی'' ہی بتایا تھا اور ان کی پہچان وہی بتائی تھی جو آج کا فرعون بش بلیئر اور ان کے خوشامدی بتا رہے ہیں داڑھی، لمبا کرتہ، اونچا پائجامہ بتا رہے ہیں۔اس وقت بھی آج کی طرح ہی عناصر انگریز ظالموں سے ''سر'' اور ''رائے بہادر'' کے خطاب لے رہے تھے جیسے آج نوبل، بوکر Booker، نائٹ ہڈ اور ''لارڈ'' کے خطاب لے رہے ہیں۔ اس وقت ''وہابی'' کہلائے جانے والے پھانسیوں پر چڑھائے گئے اور آزادی کے بعد بھی انہیں پیچھے دھکیلا گیا۔آج ایک بار پھر وہی ڈرامہ ملکی اور بین الاقوامی پس منظر میں ہو بہو دہرایا جارہا ہے۔اس بحث کے ضمن میں کچھ نکات پر سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اگر ''وہابی'' اور ''سلفی''

اسلام ہی مسئلہ کی وجہ ہے تو دنیا بھر میں پچھلے تین سو سالوں میں جو ظلم، لوٹ مار، قتل وغارت گری یورپین اور امریکی اقوام نے مچائی ہے وہ کس کے کھاتہ میں جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن تیمیہؒ سے لے کر سید قطب تک سب نے اپنے ملک اور دین کی حفاظت کی جنگ لڑی ہے کسی دوسرے ملک پر اپنی مرضی تھوپنے کے لئے حملہ نہیں کیا۔ تاتاریوں، انگریزوں، فرانسیسیوں، ڈچ اور سوویت روس کو عراق، شام، ہندوستان، لیبیا، مصر وغیرہ جانے کی کیا ضرورت تھی؟ حملہ آور یہ یورپین طاقتیں تھیں یا ابن تیمیہ، عبدالوہاب اور شاہ ولی اللہ اور سید قطب رحمہم اللہ علیہ تھے۔ دوسرا اہم نکتہ ''طاقت'' یا ''تشدد'' یا ''جہاد'' کا بہت اچھالا جارہا ہے ''جہادی لٹریچر'' ''جہادی ذہنیت'' کے حوالہ سے ہر ایک کو مجرم بنادیا گیا ہے۔ دنیا کا ہر انصاف پسند یہ جاننا چاہتا ہے کہ اپنے اوپر ہونے والے حملوں اور اپنے ممالک میں مچائی جارہی لوٹ اور کھسوٹ کے خلاف کیا صرف اہل اسلام نے ہی طاقت کا سہارا لیا ہے؟ کیا مہابھارت، کروکشیتر، جارج واشنگٹن، ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد سب میں طاقت کا استعمال نہیں کیا گیا تھا؟ کیا پہلی، دوسری جنگ عظیم کے کروڑوں انسانوں کے قتل کے لئے بھی ''وہابی'' ''جہادی'' ہی ذمہ دار تھے؟ عجیب تماشہ ہے کہ ایک طرف ہم آزادی کی ۱۵۰ ویں سالگرہ منارہے ہیں دوسری طرف انہیں طاقتوں کے حمایتی بن رہے ہیں جو ہماری غلامی کے ذمہ دار رہے ہیں۔ اور آج بھی وہ ہمیں دراصل آلۂ کار ہی بنانا چاہتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ ہم بن رہے ہیں یا نہیں؟ دنیا کی انسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ قبائلی دور سے لے کر آج تک ہر قوم نے اپنی حفاظت کے لئے ''طاقت'' کا استعمال کیا ہے۔ یہ عجیب تماشہ ہے کہ جو یورپ اپنی حفاظت کے لئے دوش تا کمر زرہ میں ڈوبا ہوا ہے (صرف امریکہ کا دفاعی بجٹ تقریباً ۴۵۰ ارب ڈالر کا ہے جو کل دنیا کے مجموعی دفاعی بجٹ تقریباً ۸۵۰ ارب ڈالر کا نصف ہے) وہ مسلم ممالک یا سعودی عرب کو دنیا میں کشمکش کے لئے کیسے ذمہ دار گردان سکتا ہے؟ کیا آج یہ حقیقت نہیں ہے کہ دنیا کی ہتھیاروں کی تجارت ان پانچ بڑوں امریکہ، برطانیہ، اسرائیل، فرانس اور روس کے ہاتھ میں ہے۔ ایرک فرام نے اپنی کتاب The Anatomy of Human Destructivenes میں لکھا ہے کہ یوروپ نے ۱۴۸۰ سے ۱۹۴۰ کے درمیان آپس میں ۲۶۵۹ جنگیں لڑی ہیں۔ P.No. (245)

اگر نشہ کی عادت اور افیون سے چھٹکارا پانے کے لئے امریکہ ہزاروں کلومیٹر دور افغانستان کی افیم کی کاشت پر پابندی لگا سکتا ہے۔ اور ''جہادی ذہنیت'' سے روکنے کے لئے صوبہ سرحد، ہند

نیپال سرحد، سعودی عرب، مصر کے مدارس بند کرانے یا ان کے نصاب تبدیل کراسکتا ہے تو دنیا یہ مطالبہ کرنے میں کیوں حق بجانب نہیں ہے کہ ''جہاد'' کو عملی شکل دینے کے لئے درکار گولہ بارود، میزائل اور کیمیکل کی یوروپی اور امریکی فیکٹریاں بند کرادی جائیں؟ جس دلیل سے افیم کی کاشت پر پابندی سے یوروپ نشہ سے بچ سکتا ہے اسی طرح ہتھیار کی صنعت پر پابندی سے دنیا تشدد، اور ''جہاد'' سے نجات پاسکتی ہے۔ جدید دور کی تاریخ ہم دیکھیں تو پائیں گے کہ مسلمانوں نے بشمول ہمارے وطن ہندوستان کے کہیں بھی پہلے مرحلہ میں ہی ہتھیار یا طاقت کی بات نہیں کی۔ اسرائیل کے بنے ہوئے عرصہ گذرا مگر اصل جہاد تو ۱۹۶۴ء کے غاصبانہ قبضہ کے بعد ہی ہوا ہاں عالمی برادری کو یہ ضرور بتانا ہوگا کہ اس نے ۲۵۰ سے زائد قرار دادیں اس قبضہ کے خلاف پاس کرائیں مگر اس پر عراق اور افغانستان کی طرح ایک سال میں ''مشرقی تیمور'' کی طرح ایک سال سے بھی کم عرصہ میں کیوں عمل درآمد نہیں کرایا؟ کہا جارہا ہے کہ مسلمان ''ڈائیلاگ'' مکالمہ اور مذاکرہ نہیں کرتے حالانکہ شاید یہ تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ مگر کیا دھونس، اور ''دادا گیری'' کے سایہ میں مذاکرات ممکن ہیں؟ آپ کہیں یروشلم اور بیت المقدس پر بات نہیں ہوگی وہ تو ہمارے ہیں باقی بات کرلو۔ رام مندر تو مسجد کی جگہ ہی بنے گا باقی مذاکرات کرلو۔ شری کرشنا کمیشن پر عمل کرنے سے لا ء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہوگا باقی مذاکرات کرلو۔ امریکی افواج خلیج اور عراق پر مسلط رہیں گی باقی مذاکرات کرلو۔ بے حیائی، اختلاط مرد وزن، ہم جنسی، زنا، سود، جوا، شراب کی ہماری تہذیب کو نہ اپنائیں تو ڈائیلاگ مخالف بتایا جائے۔ مگر سر سے اسکاف اتروادیں، بے حیائی اور سود، شراب خوری پر مجبور کریں تو ڈائیلاگ کے حامی بتائے جائیں توحید اور دین خالص کی تبلیغ کرنے والے N.G.O کو دہشت گرد بتائیں مگر شرک اور عیسائیت کی تبلیغ کرنے والی N.G.O پر شکنجہ کسا جائے تو مذاکرات اور رواداری کا مخالف بتایا جائے۔ دنیا جانتی ہے کہ اسلام تبلیغی دین ہے وہ دعوت، مذاکرہ، مکالمہ کے ذریعہ پھیلا ہے وہ مکالمہ کے مخالفت کیسے کرسکتا ہے؟ ماضی میں اس نے کہاں مذاکرہ اور مباحثہ سے جی چرایا ہے۔ اور وہ اس سے منھ کیوں موڑے گا جبکہ دلیل کی طاقت اس کے ساتھ ہے قرآن کی دلیل اور آیات اُس کے ساتھ ہیں تو مقابلہ سے کیوں بھاگے گا؟ اصل میں مکالمہ کی بات کرنے والے خود مکالمہ سے گھبراتے ہیں کیونکہ وہ اپنی حقانیت پر مطمئن نہیں ہیں اور مسلمانوں کے اپنے دین وعقائد پر اطمینان کو ''بنیاد پرستی'' ''انتہا پسندی'' کا لیبل لگا کر مقابلہ سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ ورنہ جتنا وقت آج میڈیا اور حکومتیں اسلام کے ساتھ تصادم میں لگارہی

ہیں اتنا وقت میڈیا میں کھلے دل ودماغ سے مباحثہ پر کیوں نہیں لگاتیں؟

ایک بہت بڑا الزام مسلمانوں کے بظاہر ہمدردوں کی جانب سے یہ لگایا جارہا ہے کہ مسلمان قیادت ''انتہا پسندوں'' ''دہشت گردوں'' کے خلاف کچھ نہیں کررہی ہے۔ دراصل یہ الزام اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ دوسرے کے دروازہ پر ڈالنے جیسا ہی ہے جو یہ الزام مسلمانوں پر لگارہے ہیں انھیں بتانا ہوگا کہ خود ان کا اپنا ایجنڈہ کیا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ سب دنیا میں اپنا ورلڈ آرڈر یا تہذیب کو سیکولرزم، جمہوریت، حقوق نسواں، آزادی، خوشحالی کے نام پر نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں یہ حق کس نے دیا ہے؟ اب اگر مسلم قوم اپنی دلائل کی بنیاد پر اس ایجنڈہ کو خلاف انسانیت سمجھتی ہے کیونکہ اس میں عدل، انصاف، مساوات، برائیوں پر پکڑ اور بھلائیوں کا پھیلاؤ شامل نہیں ہے اور وہ اس کے بالمقابل انھیں نکات پر مبنی اپنا ایجنڈہ دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے تو طاقت، مکر، سازش اور مکر فریب کے سہارے کیوں دبایا جارہا ہے؟۔ دونوں ایجنڈہ پر مکالمہ کیوں نہیں ہوتا؟ ''دہشت گردی'' کے نام پر جاری تشدد سے متعلق تمام اہم شخصیات اور تنظیمیں کیا کسی نہ کسی وقت ''دہشت گردی'' کا رونا رونے والوں کے منظورِ نظر نہیں رہی ہیں؟ اسامہ، طالبان، LTTE، فتح مجاہدین افغانستان، ISI، حماس، اخوان سب کی سب ایک وقت یا دوسرے وقت روس کی یا امریکہ کی یا اسرائیل کی یا فرانس کی حمایت یافتہ نہیں تھیں؟ پھر ہندوستان میں بھی آج جو ''اسلامی دہشت گردی'' کے نام سے ہونا بتایا جارہا ہے کیا اس میں مسلم قیادت کی شہ شامل ہے یا ہمارے ان عیار ہتھیاروں کے تاجر دوست ممالک کا ہاتھ ہے؟ ''را'' کے سابق چیف بی رمن نے اپنی کتاب میں صاف لکھا ہے کہ رچرڈ نکسن اور یحییٰ نے مل کر ہندوستانی پنجاب میں ISI-CIA سے سکھ دہشت گردی کی آگ برطانیہ کی مدد سے لگائی تھی۔ (27/7/07 ToI) اگر ان دہشت کا کاروبار کرنے والے ممالک کو ہتھیار فروخت کرنے ہیں تو یہ ایسا ورلڈ آرڈر کیوں بننے دیں گے جس میں امن ہو عدل ہو انصاف ہو غرضیکہ ہتھیاروں کی ضرورت ہی نہ ہو۔ ابھی جو کچھ CIA نے ۲۵ سال گذرنے کے بعد اپنی سیاہ کرتوتوں کو Declassify کرکے منظر عام پر لائے ہیں اس کے بعد بھی کیا شبہ رہ جاتا ہے کہ دنیا بھر میں کھلے عام یا خفیہ طریقہ سے قتل، ظلم، تشدد، نفرت کا کاروبار مختلف خوبصورت ناموں سے یہی خون آشام بھیڑیئے چلارہے ہیں۔ اور خون دوسروں کے منھ پر لگارہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ خون صاف کرکے اپنی بے گناہی ثابت کرو۔ اگر مسلم قیادت تشدد کے پھیلاؤ کو روکنے میں ناکام رہی ہے تو حکومتیں کیا کم ذمہ دار ہیں؟ ماؤوادیوں کا

تشدد، نارتھ ایسٹ کا تشدد، ہندوتملوں کی دہشت، اسپین کے عیسائیوں کی دہشت، سوڈان کے عیسائیوں اور نائیجیریا کے عیسائیوں کا تشدد اور دہشت کیا یہ سب مسلم قیادت کی وجہ سے رونما ہورہے ہیں؟ مسلم قیادت ملکی اور بین الاقوامی طور پر موثر ہوتی اور وہ اپنے ہم ایمان لوگوں پر ہورہے مظالم کا مداوا کرسکتی تو تشدد کیسے پھیلتا؟ اگر یہ قیادت اور سیکولر حکومتیں فرقہ وارانہ فسادات، تفریق اور تعصب، قبلہ اول سے یہودیوں کے غاصبانہ قبضہ اور بش کی آڑ میں عیسائی تنگ نظر مذہبی جنونیوں کے ایجنڈہ پر لگام لگاپاتیں تو یہ تشدد نہیں ہوتا۔ جوکہ بے بسی، ذلت اور ناانصافی کی کوکھ سے جنم لے رہا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے یہ تشدد نہیں تھا۔ آپ خود مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو ڈھاتے ہیں اُن کی بستیوں کو جلاتے ہیں ان کی عورتوں کو ننگا کرکے عصمت دری کرتے ہیں اس کی ویڈیو فلمیں بناکر بانٹتے ہیں۔ ہندوتو کے علمبردار الیکشن جیتنے کے لئے نفرت آمیز کیسٹ تیار کراتے ہیں اور تقسیم کرتے ہیں اور سرکاریں چپ ہیں۔ اسی جھوٹ اور ظلم کا اثر سب پر پڑتا ہے۔ ہندو مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں مسلمان اپنے آپ کو مظلوم، بے آواز سمجھتے ہیں تو مسلم قیادت کے پاس یہ سیکولر دنیا دینے کے لئے کیا چھوڑتی ہیں جسے دکھا کر وہ ان کی مایوسی اور غصہ کو دور کریں؟۔

اس بحث کے دوران سب سے خطرناک بات یہ آئی کہ ہندوستان کی حکومت اور برسراقتدار گروہ کی بڑی اکثریت مغرب کی اسلام دشمن جنگ کو ہندوستان لانا چاہتی ہے۔ ''را'' کے سابق اعلیٰ افسر نے جوکہ کیبنٹ سکریٹریٹ میں ایڈیشنل سکریٹری بھی رہ چکے ہیں نے TOI کی ۹؍۷؍۲۰۰۷ء کی اشاعت میں حکومت کو مشورہ دیا ہے کہ ہندوستان میں امریکی اور اسرائیلی شہریوں یا ان کے مفادات پر حملہ کرنے سے پہلے القاعدہ برانڈ انتہاپسندوں کو پہچان کر ختم کردے۔ امریکہ اسرائیل، یوروپ کی اسلام دشمن جنگ کو مسلمان قیادت ہندوستان لارہی ہے یا وہ گروہ جو موساد اور ایف بی آئی کے دفاتر ہندوستان میں کھلوارہا ہے؟۔ اگر ہندوستان کی حکومت اپنی تربیت یافتہ افواج اور ''را'' جیسے حساس اداروں کے تمام ہی لوگوں پر قابو نہیں رکھ سکتی اور ان میں سے بہت سے لوگ ملک دشمنی کرتے پکڑے جاتے ہیں جیسا کہ ''را'' کے ایک سابقہ اعلیٰ افسر راجندر سنگھ کی امریکہ کے لئے غداری کا معاملہ اور وارم روم کیک کا معاملہ بھی سامنے ہے تو ۲۵ کروڑ کی ملت اسلامیہ کے اکادکا افراد کے معاملات پر ساری قوم اور دین اسلام کو مطعون کرنا خود ایک بڑا ظلم ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ اسلام دنیا کی سلامتی اور امن کے لئے ناگزیر ہے۔ اسلام کے خلاف جنگ انسانیت کے خلاف جنگ ہے۔ دنیا کو یہ سمجھانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مہتمم سادس
حیات وخدمات

از: سہیل اختر اڑیسہ
متعلّم دارالعلوم دیوبند

حرف آغاز

نظم وضبط بالفاظ دیگر کسی ادارے سے حسن انتظام اور ذمہ داری کے ساتھ منسلک رہنا اور کامیاب قرار دیا جانا ایک عمیق مبحث ہے۔ منتظم اور ادارہ، ان دونوں میں جتنی ہم آہنگی، تال میل اور موافقت ہوگی اتنا ہی وہ ادارہ نکھرتا ہے اور منتظم کو ایک کامیاب اور منجھا ہوا انتظام کار سمجھا جاتا ہے، حسن نظام کا حامل ادارہ اور حسن انتظام کی حامل شخصیت اس دنیا میں نایاب تو نہیں کمیاب ضرور ہے اور جو لوگ کمیاب کی فہرست میں داخل ہیں وہ اب تاریخی اعتبار سے ہمارا ماضی اور کردار کے اعتبار سے ہمارا مستقبل بن چکے ہیں، جن کی مشغولیت، علمی وانتظامی مصروفیت اور ادارہ یا تنظیم میں ان کی دلچسپیاں ہر مسلمان منتظم کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں، انہیں کمیاب لوگوں میں ایک نادر نمونہ ''حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند'' ہیں جن کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ دارالعلوم جیسے مقدس ادارے نے ان کی علمی، فکری اور نظریاتی اصلاح کی اور حضرت موصوفؒ نے سنور کر دارالعلوم دیوبند کو نکھارا، ان کی کوششیں اس میدان میں بہت ہی نمایاں ہیں، سوانح نگاروں کے تحقیقی تجزیات کے مطابق حضرت ممدوحؒ کی شہرت، اہمیت اور عظمت کا راز دارالعلوم سے ان کی نسبت، حسن نظم وضبط اور ذمہ داری ومسئولیت کا حقیقی شعور ہے، یہ تو ایک مخصوص پہلو ہے جو ان کے انتظامی کارکردگیوں کو چار چاند لگاتا ہے لیکن ہمیں اس مقالے میں اس اعلیٰ منتظم، فکرمند مہتمم اور قابل وماہر ذمہ دار کے انتظامی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے ان اہم اہم پہلوؤں کو اُجاگر کرنا ہے جو ان کی شخصی انفرادیت وعظمت کو مزید دوبالا

کرتی ہے ہم نے اس مقالے میں ایسا تجزیاتی طریقۂ کار اختیار کیا ہے جس سے ان کی زندگی کے سارے نشیب وفراز واضح ہوسکیں، خانگی مسائل، انتظامی عرق ریزیاں، علمی وادبی کارکردگیاں اور تدریسی وتدریبی مشاغل سب واضح طور پر نمایاں ہوسکیں۔ ان کے اسلوب زندگی، طرز معاشرت اور فکری ونظریاتی منہج کی تشریح ہوسکے، ان کی زندگی کے اہم وقوعوں، حادثات اور زندگی سے متعلق کوائف کا احاطہ کیا جاسکے، مدرسہ عربیہ اسلامیہ دیوبند سے منسلک ہونے کا پس منظر اور کارکردگیوں کا پیش منظر ظاہر ہوسکے۔ ان لافانی نقوش کو جو دارالعلوم کی تاریخ کے روشن باب سمجھے جاتے ہیں اسے مشعل راہ بنایا جاسکے اور انہیں ان کی خدمات کے عوض خراج عقیدت پیش کیا جاسکے: لیکن ایک تلخ اور زمینی سچائی یہ بھی ہے کہ ان کے تصنیفی وتالیفی کارناموں، ان کی اعلیٰ شخصیت، بلند حیثیت اور علمی وقعت، ان کی انتظامی قوت ومتانت اور انقلابی صلاحیت اور ان کے جذبات وعزائم، علمی کمالات، تدریسی حالات انتظامی کوائف اور خانگی واقعات پر بسیط ومفصل قلم کاری، مواد کی عدم دستیابی اور واقعاتی دستاویزوں کی کم حصولیابی کی بناء پر انتہائی کٹھن اور دشوار گذار کام ہے۔

مقدمہ

حضرت مرحوم کی انفرادی، خانگی، عائلی، تنظیمی، روحانی اور اجتماعی زندگی کی تفصیلات اور ان کے کارناموں کے حوصلہ افزا نتائج کے خدوخال کسی بھی سوانح میں پورے شرح وبسط کے ساتھ نہیں لکھے گئے جو ایک المیہ ہے اور اس تاریخ ساز انسان کے ساتھ ناانصافی بھی عین ممکن ہے کہ ان کی سوانح نگاری سے بے اعتنائی کی کلیدی وجہ ان کے عہد اہتمام میں ہوئے شورش اور ہنگامہ ہو جن کی تباہ کاریوں میں ان کے کارنامے مستور ہوکر رہ گئے ہوں اور وہ سارے تعارض شذرات جس کے ذریعے ان کے ایام طفولیت کے حالات، عہد نوخیزی کے واقعات اور بہت سارے وہ خانگی لوازمات جو کسی شخصیت کی سوانح نگاری کے لئے لابدی ہوتے ہیں، کی طرف کسی کا تصور نہیں گذرا ہو۔ ان تمام باتوں کے باوجود اکابرین کی سوانح میں حضرت مرحوم کی چندے تاریخی یادگاریں ہی ان کی اہمیت کو جتلانے کے لئے کافی ہیں ان کا انتظام وتدبر اور ان کی تدبیر انہیں انفرادیت بخشتی ہے اور ان کا حوصلہ، ان کی ہمت اور قوت ان کے تعارف کے لئے کافی ہے۔

مؤرخین اور وقائع نگار یہ لکھتے ہیں کہ اگر یہ درست ہے کہ نظام سازی، صحیح ذمہ داری

نبھانے، دارالعلوم کو بلند و بالا مقام دینے اور اسے منفرد نوعیت کا ادارہ بنانے میں ان کے پیش رو اساطین اور اکابرین کا کارنامہ عظیم تھا، دین الہامی کی اشاعت، شریعت اسلامی کے فروغ اور دینیات واسلامیات کے تحفظ کا اہتمام ان کا اساسی ہدف تھا تو حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کا انتظام وتدبیر ان افکار کا تکملہ اور بہترین ترجمان تھا جس نے دارالعلوم کی مرکزیت، اہمیت اور عظمت کو فروغ دیا، جس نے دارالعلوم کے ارتقائی ادوار کو نیا رخ دیا اور اپنی محنت، ہمت اور صلاحیت سے اسے ایک ناقابل تسخیر تحریک بنادیا۔

ابتدائی احوال وکوائف اور خاندانی پس منظر

حضرت مہتمم صاحبؒ، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ کے (جن کا شمار دارالعلوم دیوبند کے موسسین میں ہوتا ہے اور جو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ۴۲ سال تک رکن رہے) کے نور نظر اور کہنہ مشق اور معروف ومشہور اسلامی محقق حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے برادر محترم تھے، ان کا خاندانی پس منظر علمی تھا بایں بنا یہی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس دور کی روایت کے مطابق انھوں نے خود والدین سے ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی ہوگی اور پھر بعد میں اس وقت کے مشہور ومعتمد اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہوگا۔ وہ شیخ الہندؒ کے خاص شاگرد رشید تھے، حضرت گنگوہیؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے دارالعلوم دیوبند میں اول سے آخر تک تعلیم حاصل کی اور اس وقت کے پائے کے اساتذہ سے حصول علم کا شرف حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں ایک ماہر منتظم تھے وہیں درس وتدریس کے حوالے سے سارے درآبدار اور سیمابی پارے ان کی علمی طبیعت میں سموئے ہوئے تھے۔ ایک شریف زادی سے نکاح کیا پر لاولد رہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں خانگی جھمیلوں سے محفوظ رکھا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ دارالعلوم دیوبند کے انتظامات کو یکسوئی کے ساتھ انجام دینے لگے اور واقعہ یہ ہے کہ اسی یکسوئی نے ان کے حوالے سے ایک عظیم تاریخ رقم کی ہے۔

شخصیت سازی میں اہم بزرگوں کا کردار

حضرت مہتمم صاحبؒ کی فطرت طبعی طور پر بزرگوں کے اثرات کو بآسانی قبول کرتی تھی، بایں وجہ ان کی زندگی میں ہمیشہ بزرگ علماء کے گہرے نقوش دیکھنے کو ملتے تھے، قابل قدر اور مبارک ہستیوں نے ان کی تربیت کی تھی ظاہر سی بات ہے کہ اپنی متاثر طبیعت کی بناء پر ان کے

تاثرات کا سایہ ان پر کافی گہرا نقوش چھوڑتا تھا، شیخ الہند کی سرپرستی اور مناسبت نے انہیں کندن بنادیا تھا، علمی خاندان ہونے کی بناء پر بلا کا وقار اور حیرت انگیز سنجیدگی ان کی ذات میں درآئی تھی، ان کا دارالعلوم سے غایت الفت اور لگاؤ انہیں بہی خواہان و فداکاران دارالعلوم کے نقوش و تاثرات کا نتیجہ تھا، دارالعلوم کے معاملے میں حد درجہ حساسیت انہی بزرگوں کے وساطت سے آپ تک پہنچی تھی زمانۂ طالب علمی میں صالح ترین اساتذہ نے ان کی تربیت کی تھی اور فراغت کے بعد حضرت مولانا حافظ احمد صاحبؒ، حضرت مولانا علامہ کشمیریؒ اور ان کے ہم عصر جتنے جلیل القدر اساتذہ تھے کی صحبت نے ان کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ بیک وقت جہاں ان سے حضرت شیخ الہند کی سادگی، بزرگی اور للّٰہیت ٹپکتی تھی وہیں انتظام میں وہ حافظ احمد صاحب کے خوبصورت پیکر تھے۔

علمی پرواز اور اخلاقی بلندی

حضرت کی شخصیت کی ہمہ جہتی و ہمہ گیری ملک کے دینی تعلیم یافتہ طبقوں میں مسلم ہے، بیک وقت خدا تعالیٰ نے انہیں مختلف نوعیّتوں کی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں، ہر محاذ پر انہیں قابل بنایا تھا خواہ وہ علمی ہو یا اخلاقی ہر پہلو سے وہ ایک مکمل انسان تھے۔ علمی پرواز کا اندازہ ان کی گرانقدر تصانیف سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے، حیدرآباد کی عدالت شرعی کا مفتی اعظم کہلانا ان کی علمی قابلیت اور خداداد صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ جو جلیل القدر اور معزز علمی ہستیوں پر مشتمل تھی ان کی جانب سے حضرت ممدوح کا اہتمام کے لئے ترجیحی انتخاب علمی پیمانے پر موازنہ کے بعد ہی ہوا تھا اتنے بڑے علمی ادارے کے لئے معزز منصب پر فائز ہونے کے لئے اعلیٰ درجہ کی علمی امتیازات کی نسبت اور حیثیت ضروری ہوتی ہے اس پس منظر سے ان کی علمی قابلیت، درستی صلاحیت اور کتابی نسبت کی عکاسی ہوتی ہے یونہی حضرت علامہ انور شاہ کشمیری جیسے متبحر اور بے لوث عالم دین (جسے انیسویں صدی کا ابن حجر کہا گیا) نے نہیں فرمادیا کہ ''اگر مجھ پر کسی کے علم کا اثر پڑتا ہے تو وہ مولانا حبیب الرحمٰن ہیں'' ان کی وسعت علمی، ہمہ جہت صلاحیت اور علمی قابلیت کا عالم اسلام کے ثقہ حضرات علماء نے اعتراف کیا ہے اور بہت سارے وہ حضرات جن کی جبین پر موصوفؒ کی نسبت دیوبندیت سے شکنیں پڑتی تھیں انھوں نے بھی حضرت مہتمم صاحب کی علمی وقعت وجلالت کا برملا اظہار کیا ہے۔

یہ اصول مسلم ہے کہ کسی بھی عالم کے لئے اصولی طور پر یہ لازمی ہوتا ہے کہ وہ اخلاقیات کے تمام تقاضوں پر پورا اترے مزید اس کی علمی فطرت اسے غیر اخلاقی خرافات انجام دینے سے روکے تب جا کر وہ کہیں عالم کہلانے کا حقدار ہوتا ہے اس نظریے کے مطابق ان کا اخلاقی معیار تو کافی بلند ہے اور قابل قبول بھی؛ مزید ان کی حیات گذاری اور روابط وتعلقات کا تفصیلی خاکہ ان کے وسیع الظرف اور اخلاقی معیار پر رفعت کے حامل ہونے کی واضح ترین غماز ہے، برداشت اور تحمل مزاجی ان کی فطرت ثانیہ تھی، کسی حادثہ یا شورش کے وقت ان کا ضبط قابل دید اور قابل رشک ہوا کرتا تھا۔ آج بھی اسے ہم مشعل راہ اور رہنمائے حیات بنا سکتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک حادثے میں انتظامیہ اور طلباء کے درمیان شبہات کی بناء پر پیدا ہوئی کشیدگی اور تناؤ کے تلخ ترین تکدرات کے موقع پر ان کا ہر قدم احتیاط پر مبنی اور منصفانہ تھا، انتظامیہ کی آئینی برتری کے باوجود کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جسے منصب کا غلط استعمال کہا جاسکے۔ الغرض حضرت ممدوحؒ علم وفضل، حسن خلق ومعاشرت اور سحر انگیز طبیعت کے مالک تھے، اخلاقی بلندی کے ساتھ ساتھ وہ بڑے پائے کے عالم بھی تھے۔

عدالت وتفقہ اور فقہی امتیاز

فقہ وفتاویٰ اور شرعی مسائل میں انہیں خصوصی ملکہ حاصل تھا، قضاء وافتاء کے معاملے میں ان کو خاصا عبور حاصل تھا، فقہی مسائل میں کافی دسترس رکھتے تھے، معاملہ فہمی، نکتہ رسی اور فقہی دقیقہ سنجی ان کے خصوصی اوصاف تھے البتہ انتظام وانصرام کی پیچیدگیوں اور اہتمام کے الجھنوں کی بنیاد پر ان کا جوہر کھل کر سامنے نہیں آتا تھا انتظامی مسائل میں اس طرح الجھے کہ پوری زندگی انہیں معموں میں کھپا دی۔ حضرت مہتمم حافظ احمد صاحب کی پیرانہ سالی اور ضعیف العمری کی بناء پر مفتی اعظم کے منصب پر ان کا انتخاب ان کی انہیں خصوصیات اور فقہی امتیازات کی بناء پر ہوا تھا، گرچہ ظاہری عنصر یہ کہتا ہے کہ بوجہ نیابت انہیں منصب افتاء سپرد کیا گیا تھا لیکن سچ بات یہ ہے کہ وہ اس کے حقدار بھی تھے اس انتخاب میں ان کے حد درجہ علمی وفقہی شغف کا بھی دخل رہا ہے ۱۹۲۵ء = ۱۳۴۴ھ میں حیدرآباد کے مفتی اعظم کے منصب پر آپ کا تقرر عمل میں آیا لیکن افسوس دارالعلوم دیوبند کے داخلی شورشوں کی بنیاد پر وہ اس منصب سے جلد ہی دستبردار ہوگئے اور ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔

فہم وفراست، تدبر وتدبیر کا بہترین شاہکار

فہم وفراست اور تدبر کے لحاظ سے وہ ایک آئیڈیل انسان تھے، نہ جانے ایک انسان میں اتنے سارے بلند محاسن کہاں سے یکجا ہوگئے تھے تاریخ میں بہت کم لوگوں کی ایسی ایسی نظیر ملتی ہے حضرت مہتمم صاحب فہم وفراست تدبر ودرایت کے ایک شاندار پیکر تھے، دارالعلوم دیوبند میں ان کے عہد اہتمام میں ایک غیر پسندیدہ اور نازیبا وقوعہ پیش آیا تھا جسے انھوں نے لائق وفائق فہم و فراست اور شاندار تدبیر سے بآسانی سلجھالیا، اور اس کی چنگاریاں فروکردیں، یہ تو ایک نمایاں معروضہ تھا جو روداد دارالعلوم میں مرقوم ہے اس کے علاوہ وہ بہت سارے امور جو اندرون مدرسہ پیش آتے رہتے تھے اسے بھی بسہولت نمٹالیا، ظاہری بات ہے دارالعلوم دیوبند ایک بڑا ادارہ ہے اس کا انتظام بھی خاصا طویل اور مختلف شعبہ جات پر مشتمل ہے کچھ اونچ نیچ ہوتی ہوگی اور اس کے پھوڑا بننے کے امکان سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا ہے تو عین ممکن تھا کہ کسی نہ کسی نوعیت کی شورش برپا ہوتی اور اسے دارالعلوم کی تاریخی دستاویزوں میں لکھنا پڑتا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تو اس سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے اندر کی خداداد مدبرانہ صلاحیت اور فہم وفراست اور کچھ فطری رعب نے ان غیر پسندیدہ عوارض کی جڑ پکڑنے ہی نہیں دیا اور اس کے نشو ونما سے پہلے ہی اپنے حساس شعور کی بناء پر اس کی بیخ کنی کردی، تو یہ امر واقعی ان کے باتدبیر منتظم اور فہم وفراست کے حامل شخصیت ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی

سیاست حضرت مولانا کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی واقعتاً حضرت ممدوح کافی منجھے ہوئے سیاسی شخصیت کہلاتے تھے، ان کے زمانے کے ہندوستان میں سیاسی تحریکیں بڑی منہ زور ہورہی تھیں اقلیت کی سیاست حق تلفیاں ہورہی تھی، جمعیۃ العلماء اور چند مخصوص تنظیموں کے علاوہ کسی میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اقلیت کی موافقت میں آواز اٹھاسکتی۔ حضرت ممدوح سیاسی نظریات وافکار میں اسلامی طریقۂ حکومت کے موافق اور اس بات پر مصر تھے کہ حکومت بااہل کارندوں پر مشتمل ہو اور آپسی مشاورت کا خاص اہتمام ہو، موجودہ اسلوب سیاست سے وہ ذرہ برابر بھی مطمئن نہیں جس کا اظہار ان کی گرانقدر تصنیف ''تعلیمات اسلام'' کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ حضرت قاری

طیب صاحب ''دارالعلوم دیوبند کے پچاس مثالی شخصیات'' میں رقم طراز ہیں کہ ''حضرت مولانا کی سیاسی سوجھ اتنی تھی کہ وہ وزیر بن سکتے تھے مگر دارالعلوم دیوبند کی انتظامی مصروفیتیں اس کے آڑے آئیں'' الغرض مزاج شروع ہی سے سیاست آشنا واقع ہوا تھا، جمعیۃ العلماء سے وابستہ مختلف تحریکوں میں حصہ لیتے رہے ان کی پوری زندگی تو نہیں البتہ بیشتر اوقات سیاسی مشاغل میں ضرور گذرے ہیں۔

خطابت اور کثرت مطالعہ

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کو قدرت کی طرف سے وہ تمام صلاحیتیں اور صفات وافر مقدار میں ودیعت کی گئی تھی جو ایک کامیاب خطیب کے لئے درکار ہوتی ہیں، طاقت زبان اور قوت بیان کے ساتھ انہیں بے مثال حافظے کی نعمت بھی حاصل تھی اور یہی چیزیں کامیاب اور موثر خطیب کے اجزائے ترکیبی ہیں، مضامین کی سنجیدگی و بلند پائیگی، مطالعے کی گیرائی، نظر وفکر کی وسعت، اپنے مفہوم کو موزوں ترین الفاظ میں بیان کرنے کی قدرت، مفکرانہ طریقۂ استدلال اور اپنے موقف کو ثابت کرنے کا بہترین اسلوب انکا طرۂ امتیاز تھا، یونہی ایک متشدد قسم کے بریلوی نے ان کی تقریری صلاحیت کا لوہا نہیں مان لیا تھا بلکہ اس میں ان کی پراثر خطابت، سحر انگیز طریقۂ گفتار اور شاندار اسلوب کا دخل تھا جس سے متاثر ہوکر اس نے دیوبندی نظریات کی حقیقت و صداقت کو تسلیم کرلیا تھا۔

حضرت عثمانی صاحب مرحوم جہاں وہ بلند پائے کے خطیب تھے وہیں ان کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا کتب بینی کا شوق انہیں دیر رات جگایا کرتا تھا حضرت ممدوح مرحوم کے مطالعے کی گیرائی وگہرائی کا اعتراف کبار علماء نے کیا ہے دہلی کے ہردلعزیز عالم حضرت مولانا سید محمد میاں تحریر فرماتے ہیں ''آپ نحیف الجثہ اور کمزور تھے، غذا بہت تھوڑی تھی لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس ضعف اور نقاہت کے باوجود بے پناہ ہمت آپ کو عطا کی گئی تھی امور اہتمام میں شب وروز انہاک کے باوجود کتب بینی کے شوق نے آپ کے مطالعے کو بہت ہی گیرائی بخش دی تھی۔'' (علماء حق)

جناب سید محبوب رضی تاریخ دارالعلوم میں رقم طراز ہیں ''مطالعے کے شوق نے آپ کو نہایت وسیع المعلومات کردیا تھا'' ان کے علاوہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری، انکے فرزند ارجمند حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری، حضرت مولانا نعمانی کے ساتھ ساتھ مناظر احسن گیلانی اور بہت

سے مؤرخین نے ان کے تبحر علمی، وسعت مطالعہ، دقت نظر، مثالی حافظے، سخن فہمی اور زبان و بیان کی نزاکتوں کو سراہا ہے۔

زمانۂ انتظام وانصرام اور منفرد کارکردگیاں

آپ کا اہتمام سے منسلک ہونا انتظام وانصرام کی نئی داستان دہراتا ہے، اس سے قبل بھی دارالعلوم دیوبند بزرگ مہتمموں اور ذمہ داروں کے حساس سایوں تلے، معیار، شان اور افتخار سے آگے بڑھ رہا تھا لیکن حضرت مہتمم سادس کے تعلق نے اسے ایک نیا رخ دیدیا، اسے حیات نوبخش دی، ایک زبردست تبدیلی کے خوشگوار احساس نے دارالعلوم دیوبند کے انتظام کی کایا پلٹ دی اور سب کچھ ترتیب، صلاح و درستگی اور پختگی کے ساتھ انجام پانے لگا، ہر شعبہ میں نظم ونسق کا اہتمام ہونے لگا، دارالعلوم کے حساس شعبوں میں توجہ دی جانے لگی، انتظامیہ سے لے کر مطعم تک کا نظام صاف ستھرا اور اچھا ہوگیا۔ حضرت مہتمم صاحب کی تگ ودو، توجہ ولگن اور سخت کوششوں نے دارالعلوم دیوبند کو اس مقام پر پہنچادیا جہاں پر سترہ کروڑ اسلامیان ہند وپاک ناز کرسکیں۔

حضرت مولانا حافظ احمد صاحب کی وفات کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی دارالعلوم دیوبند کے اصولی مہتمم قرار دیئے گئے دستوری اہتمام تو تقریباً آدھا برس ہی رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ جب ۱۳۲۵ھ میں حضرت حافظ احمد صاحب کے معاون اور دست راست منتخب ہوئے تبھی سے ان کی مہتممانہ خدمات، احسانات اور عنایات کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا اسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے دنیا کی معروف ہستی حضرت قاری طیب صاحبؒ فرماتے ہیں:

''موصوف کا مستقل اہتمام گو آدھا برس رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا حافظ احمد صاحبؒ کے دست راست اور ان کے چالیس سالہ خدمات کے روح رواں نیابت کی صورت میں آپ ہی رہے۔''

''تحدیث نعمت'' میں حضرت مولانا منظور نعمانی تحریر فرماتے ہیں کہ ''حضرت ممدوح دفاتر اور دستاویزوں میں نائب مہتمم سے موسوم کئے جاتے تھے لیکن عملاً وہی مہتمم تھے'' خود مولانا حبیب الرحمٰن نے ایک بار تقریر کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ''حضرت شیخ گنگوہی نے مجھے یہاں مہتمم ثانی بنا کر بھیجا ہے'' الغرض ان کے سارے کارنامے جو تقریباً دو دہائیوں میں محیط ہیں ان کی نسبت ان

کی طرف کرنا کوئی غیر منصفانہ عمل نہیں بلکہ یہ ان کا حق تھا جسے تاریخ نے ذہنوں کے دیواروں میں چن دیا تھا۔ بہرکیف آپ نے اپنی خداداد صلاحیت، قابل رشک تدبر اور مخصوص تدبیر اور انتظام سے دارالعلوم کے انتظامی قوائم کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر منظّم کیا۔ تعلیمی، تربیتی اور اصلاحی شعبوں میں خصوصی توجہ دی دارالعلوم سے وابستہ تمام مخلوط شعبوں کو جن کی تقسیم ناگزیر تھی، تقسیم کیا، اور اسے استحکام بخشنے کے لئے جی جان لگادی، اہتمام کے تمام امور کی حفاظت وصیانت کا خصوصی لحاظ رکھا، تحفظات کی کمیٹی قائم کی اور راست صادر ہونے والے تمام نجی امور کے تحفظ کے خیال سے اسے محافظ خانے میں ترتیب اور طریقے سے مرتب کیا۔ گذشتہ ریکارڈوں کو ازسرنو ترتیب دیا، حضرت عثمانی مرحوم تمام شعبہ جات پر نظر رکھتے تھے، انتظامی معاملات میں کافی سخت تھے ۱۳۴۷ھ کے روداد دارالعلوم میں انھوں نے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ ''میں انتظامی معاملات میں کافی سخت ہوں'' ان کا طریقۂ کار کافی محنتانہ اور تھکا دینے والا ہوتا تھا وہ خود بھی تھکتے تھے اور دوسروں سے بھی خوب کام لیتے تھے۔

سید محبوب رضی تاریخ دارالعلوم میں یوں رقم طراز ہیں ''اہتمام کے امور میں اس قدر شغف تھا کہ شب وروز کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہوتا تھا انھوں نے دارالعلوم کے شعبہ انتظام وانصرام کو اتنا منظّم ومستحکم کردیا تھا کہ جب حکومت آصفیہ کی جانب سے نواب صدریار جنگ دارالعلوم کے حسابات کی تنقیح کے لئے دیوبند آئے تو ان کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک ایک اور دو دو آنے تک کے حسابات کے کاغذات اور رسیدیں باضابطہ طور پر فائل میں موجود تھیں نواب صدریار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ کوئی کاغذ ایسا نہ تھا جو مانگا گیا ہو اور فوراً پیش نہ کردیا گیا ہو۔'' الغرض انتظامی کارکردگیاں انتہائی صاف ستھری تھیں، دارالعلوم جیسا معتمد ادارہ تھا ویسے ہی معتمد مہتمم صاحب تھے ادارہ اور منتظم کے اس تال میل نے ادارہ کو نکھرنے پر مجبور کردیا اور انتظامی تانا بانا دن بدن مستحکم ہوتا گیا آج ہم جو دارالعلوم دیوبند کو ترقی یافتہ ادارہ کی شکل میں دیکھ رہے ہیں کُل نہیں تو اکثر انہیں کی مرہون منت ہے ان کی ان کارکردگیوں پر اسلامیان ہند وپاک انہیں سلام اور خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

تصنیفی وتالیفی خدمات

حضرت عثمانی مرحوم کی مجموعی تصنیفی وتالیفی تخلیقات گرچہ شمار میں کم ہیں لیکن اپنی اہمیت،

ضرورت اور ماہیت کے اعتبار سے کافی مہتم بالشان اور گرانقدر ہے، حضرت کا تصنیفی ذوق اور تالیفی شوق پرتموج تھا لیکن بے شمار مصروفیات اور گوناگوں مشاغل کی بنا، پر ان کے ذوق وشوق کی تسکین کا سامان فراہم نہیں ہو پاتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف ہاتھوں میں گنے جاسکتے ہیں البتہ جو کتابیں اور تالیفات ہیں وہ مختلف فنون پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں، اس سے تفنن علوم میں ان کی مہارت کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے حضرت ممدوح کو اپنے پیش رو اساطین کی جانب سے عشق محمدی کے حسین جذبات اور کومل احساسات وراثت میں ملے تھے، ''قصائد لامیۃ المعجز ات'' اسی داستان عشق کا سرنامہ اور عنوان تھا اس قصیدے میں تشبیہات واستعارات کے انتخاب کے حوالے سے جو مستانہ شعور نظر آتا ہے، اس نے ان اشعار کوئی تاب وتوانائی بخش دی ہے، ''قصائد لامیۃ المعجز ات'' تین سو اشعار نعت پر مشتمل ہے ایک سو معجزے نہایت فصیح و بلیغ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ دوسری تصنیف ''تعلیمات اسلام'' اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے قابل ستائش ہے، اسلامی طرز حکومت اور مشورہ کی اہمیت پر کافی مدلل کتاب ہے اس کتاب کے مضامین میں جس بصیرت کا پتہ چلتا ہے اسے عام آدمی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے ''اشاعت اسلام'' ان کی وہ تالیف ہے جو ان کی تخلیقی زندگی کا اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے اس کتاب کی اہمیت کا احساس اس کے مطالعے کے بعد ہی ہوگا اس کے چیختے عنوان ''اسلام کیونکر پھیلا؟'' سے دور حاضر کے تنقیدی ماحول میں اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اشاعت اسلام ان سلسلہ وار مضامین کا مجموعہ ہے جو کافی عرق ریزی اور احتیاط وسنجیدگی سے ماہنامہ... میں تحریر کئے گئے تھے اسی طرح درسیات میں حاشیۂ مقامات حریری اور حاشیہ تفسیر جلالین اہم علمی و درسی کارناموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ سیرت نگاری میں رحمۃ للعالمین جو پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے ایک گرانقدر سرمایہ ہے مگر افسوس وہ اب تک طبع ہوکر نہیں آئی ہے۔ مرثیہ نگاری میں خصوصی دسترس رکھتے تھے، نظم ونثر دونوں میں تخصصات کے حامل تھے، عجیب وغریب اور پرکشش انداز تھا، منظوم اشعار سر دھننے پر مجبور کرتے تھے تو نثری کلام عش عش کرنے پر آمادہ کرتے تھے، تحریری صلاحیت خداداد تھی ان کے مضامین جو مختلف جرائد میں شائع ہوتے تھے ملک بھر کے پڑھے لکھے طبقے میں بڑی دلچسپی اور بڑے جوش وولولے سے پڑھے جاتے تھے۔ ان کا طریقۂ کار اور انداز بیان انتہائی شستہ، شگفتہ اور منجھا ہوا تھا الغرض یہ تصانیف جہاں ان کے افکار ونظریات کے دستاویز ہیں وہیں وہ ان کے فنی محاسن اور تخلیقی کمالات کا پتہ بھی دیتے ہیں۔

سانحۂ وفات

اہتمام کی گراں بار ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ دارالعلوم میں ہوئے شورش اور ہنگامے کے قلق نے حضرت ممدوح پر بڑا گہرا اثر ڈالا اوران کی صحت خراب ہوگئی غیر معمولی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ ان کا مرض بڑھتا گیا بالآخر ۱۳/رجب ۱۳۴۸ھ کوملت اسلامیہ کا عظیم مجاہد اور مادر علمی کا محافظ وسائبان ابدی نیند سوگیا، مادر علمی کا جونقصان ہوا اس کی تلافی ممکن نہیں ٹھہری، حضرت مولانا قاری طیب صاحب نے اس حادثہ پر روداد دارالعلوم ۴۹-۱۳۴۸ھ میں جن الفاظ کے سہارے تعزیتی اور ماتمی مضمون تحریر کیا ہے اس سے اسی بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ ان کی موت سے مادر علمی میں ایک ''زلزلہ'' آگیا تھا۔

حرف آخر

الغرض وہ ایک مکمل انقلابی، باعزم منتظم، حوصلے سے لبریز مربی ومبلغ اورامت وانسانیت کے درد سے آشنا اور غمخوار انسان تھے، نفسیاتی، تاریخی اور روحانی طور پر زیادہ بامعنی بنانے والی طبعی قوت، انسانی امکانات اورکائناتی مظاہر پرحکیمانہ نگاہ ان کا طرۂ امتیاز تھا، ان کی انتظامی کارکردگی، انصرامی تگ ودو اور ذمہ دارانہ جدوجہد تاریخ دارالعلوم کے لئے موقع افتخار ہے اور ہمارے لئے قابل اتباع بھی۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند اسلاف کی وہ کڑی تھے جس کے نقش پا کی تقلید آج بھی مدارس اور ذمہ داران مدارس کے حسن مستقبل کی ضامن ہے۔

❁ ❁ ❁

حوالہ جات وماخذ ومراجع:

(۱) تاریخ دارالعلوم (جلداول)
(۲) تاریخ دارالعلوم (جلددوم)
(۳) مشاہیر دیوبند
(۴) مشاہیر علماء دیوبند
(۵) لالۂ وگل
(۶) حیات انور
(۷) اشاعت اسلام
(۸) دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات
(۹) روداد دارالعلوم ۴۹-۱۳۴۸ھ
(۱۰) تحدیث نعمت
(۱۱) ذکر رفتگاں
(۱۲) علماء حق

دیوبندی عالم دین مولانا محمد نعیم کی امریکہ میں وفات

دارالعلوم دیوبند میں تعزیتی نشست، قاری محمد عثمان صاحب نے دعائے مغفرت کرائی

دیوبند: ۲۶/اگست ۲۰۰۷ء

عربی کے مشہور عالم، دارالعلوم دیوبند کے قدیم مدرس، شیخ الحدیث مولانا محمد نعیم دیوبندی کے انتقال پُر ملال کی خبر دیوبند پہنچتے ہی رنج وغم کا ماحول چھا گیا۔ مرحوم اپنے صاحبزادہ جناب قاری عبداللہ سلیم صاحب کے پاس شکاگو امریکہ میں مقیم تھے، اس خبر کو سنتے ہی مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے اپنے نائب قاری محمد عثمان صاحب کو دارالعلوم کی مسجد قدیم میں ختم شریف اور ایصال ثواب کے لئے ایک اجتماع کے لئے فرمایا۔ چنانچہ قاری محمد عثمان صاحب اور آپ کے ہمراہ نائب مہتمم حضرت مولانا عبدالخالق مدراسی نے مسجد قدیم میں طلبائے دارالعلوم سے ختم کلام پاک وختم کلمہ طیبہ کرا کے ایصال ثواب کرایا۔ اس موقع پر قاری محمد عثمان صاحب نے اپنی تقریر میں مولانا محمد نعیم صاحب کی قلمی، دینی، درسی خدمات پر خصوصاً تفسیر قرآنِ کریم کے حوالے سے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ کچھ عرصے سے مولانا مرحوم شکاگو کے نواح میں بخاری شریف پڑھا رہے تھے۔ اس سے پہلے دارالعلوم وقف دیوبند میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث بھی دیا اور منتسبین دارالعلوم آپ کی علمی، دینی اور ثقافتی خدمات اور صلاحیتوں کے پوری طرح معترف ہیں۔ قاری محمد عثمان صاحب نے فرمایا کہ مولانا مرحوم اپنی علمی خدمات کے باعث ہمیشہ ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔ اس موقع پر آپ نے مفتی عبدالرحمٰن، مفتی مدرسہ امینیہ اور کچھ دیگر مرحومین کا جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، ذکر فرمایا اور ان سب کے لئے حاضرین سے دعائے مغفرت کرائی۔

مولانا محمد نعیم صاحب کی وفات حسرت آیات کو عالم اسلام کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے آپ نے سب مرحومین کو کلماتِ خیر سے یاد کیا اور سب کیلئے دعائے مغفرت وترقی درجات کرائی۔

جاری کردہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند

(مولانا) عبدالخالق مدراسی
نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۹۱ | ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ مطابق دسمبر ۲۰۰۷ء | شمارہ: ۱۲

نگراں
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر
حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ -/۱۵ روپئے، سالانہ -/۱۵۰ روپئے
سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۸۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۲۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۲۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman,
Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبرشمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	بدیہیات قرآن - حکمتیں اور فائدے	مولانا محمد عارف مبارکپوری	۶
۳	قربانی، فدائیت کا بہترین نمونہ	مولانا مصلح الدین قاسمی	۱۴
۴	قطع حیات بہ جذبۂ رحم (Euthanasia) کی شرعی حیثیت	مفتی محمد شمیم اختر قاسمی	۱۸
۵	دعوت دین - ایک اہم فریضہ	محمد مونس قاسمی	۳۷
۶	فتنہ نمازِ سہ گانہ (۳-وقت کی نماز)	ڈاکٹر اجمل فاروقی	۴۴
۷	دھاگے-دانوں کی مروجہ تسبیح کی شرعی حیثیت	مفتی عمر فاروق لوہاروی	۴۷

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

دیوانوں کا چاک گریباں، کل بھی تھا اور...

ہمارا ملک ہندوستان دستوری حیثیت سے ایک جمہوری ملک ہے، جس کا دستور وآئین تمام شہریوں کے مساوی حقوق پر مبنی ہے دستور کی رو سے ملک کی قومی حکومتیں اس کی ذمہ دار اور پابند ہیں کہ وہ ملک میں بسنے والی اقلیتوں کے حقوق بالخصوص مذہب، زبان، تہذیبی وسماجی اقدار وغیرہ کا تحفظ کریں۔

لیکن ملک میں آباد اقلیتوں خاص طور پر سب سے بڑی اقلیت مسلم طبقہ کو ابتداء سے یہ شکایت چلی آرہی ہے کہ ان کے حقوق کے سلسلہ میں ملکی حکومتیں نہ صرف سرد مہری کا معاملہ کرتی ہیں بلکہ ان کے ساتھ کھلا امتیازی سلوک کیا جاتا ہے اور جان بوجھ کر انھیں زندگی کے ہر شعبہ میں پیچھے ڈھکیلنے کی غیر منصفانہ اور ناروا کوششیں کی جاتی ہیں، جبکہ ملک کی حکومتیں اس شکایت کو خلاف واقعہ کہہ کر رد کرتی رہی ہیں، اقلیتوں کی جانب سے اور حکومتوں کی طرف سے رد وانکار کا یہ سلسلہ ایک عرصہ سے جاری تھا اسی پس منظر میں موجودہ حکومت نے اس شکایت کی اصلیت اور سچائی معلوم کرنے کی غرض سے سابق جسٹس راجندر سچر کی صدارت وسرکردگی میں ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد یہ ظاہر کیا گیا کہ اگر معلومات وتحقیقات سے یہ شکایتیں ثابت ہوگئیں تو ان کا مداویٰ کیا جائے گا۔

۹/مارچ ۲۰۰۵ء کو اس کمیٹی کے سلسلہ میں وزیر اعظم کی جانب سے نوٹیفکیشن جاری کیا گیا، اور کمیٹی کو پابند کیا گیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور تعلیمی کیفیات اور صورتِ حال پر

مبنی رپورٹ تیار کرکے حکومت کو پیش کرے۔

کمیٹی نے ۱۷رنومبر ۲۰۰۶ء کو اپنی رپورٹ حکومت کو سونپ دی، سچر کمیٹی نے درج ذیل امور کو اپنی تحقیقات اور رپورٹ کا موضوع مقرر کیا تھا:

۱- کن بلاکوں، ضلعوں، علاقوں اور ریاستوں میں مسلم اقلیت کی آبادی اچھی خاصی ہے۔

۲- مختلف اضلاع، علاقے اور صوبہ جات میں ان کی معاشی سرگرمیوں کی کیفیت کیا ہے، اور کس طرح گذر بسر کرتے ہیں۔

۳- ملک کے دیگر باشندوں کے بالمقابل ان کی معاشی حالت کیسی ہے؟

۴- ان کی معاشی وسماجی سطح، نیز شرح خواندگی، شرح اموات خواتین بوقت زچگی، کمسن بچوں کی شرح اموات، ان باتوں میں دیگر ملکی لوگوں کے مقابلے میں ان کی حالت وکیفیت کیا ہے؟

۵- پبلک اور پرائیویٹ سیکٹروں کی ملازمتوں میں ان کا تناسب کیا ہے؟ کیا یہ تناسب مختلف ریاستوں میں الگ الگ ہے؟ کیا یہ تناسب آبادی کی شرح کے مطابق نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟

۶- ریاست مہاراشٹر کی او، بی، سی آبادی میں مسلم سماج کا او، بی، سی میں حصہ کس قدر ہے؟ کیا مسلم او، بی، سی کو مرکزی و ریاستی او، بی، سی کمیشن میں شامل کیا گیا ہے؟ (جس کا مقصد مرکزی وصوبائی سطح پر انھیں ریزرویشن سہولیات دینا ہے) مسلم او، بی، سی کا پبلک سیکٹر میں مرکزی وصوبائی سطح پر مختلف سالوں میں کتنا حصہ رہا ہے؟ تعلیم، حفظان صحت، بلدیہ کے ذریعہ سہولیات، بینک کریڈٹ بذریعہ حکومت، وبذریعہ نجی سیکٹر۔ ان امور میں دیگر باشندگان کے مقابلے میں مسلم سماج کا معیار وموازنہ کیا ہے؟ بس اسٹاپ، ہسپتال وغیرہ مسلم آبادی والے علاقوں میں ریاستی سطح پر مہیا ومیسر ہیں یا نہیں؟

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس رپورٹ سے اقلیتوں کی شکایتوں کی نہ صرف حرف بہ حرف تصدیق ہوتی ہے؛ بلکہ اس رپورٹ سے مسلم اقلیت کی حالت زار کا جو نقشہ ابھر کر سامنے آیا ہے وہ ان شکایتوں سے بدرجہا زائد ہے۔ کمیٹی کی رپورٹ کا ایک ایک پیراگراف بآواز بلند شہادت دے رہا ہے کہ ملک کی اس سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ غیرمعمولی امتیاز برتا گیا ہے اور جان بوجھ کر زندگی کی شاہراہ ترقی سے اسے دور رکھنے کی ہمہ گیر مذموم کوشش کی گئی ہے، مسلم اقلیت کی زبوں حالی کی اس داستان الم سے غالبًا متاثر ہوکر ہمارے نرم دل (مگر حکومت اور پارٹی کی

پالیسیوں کے حصار میں گھرے) وزیراعظم نے یہ اعلان کیا تھا کہ مسلم اقلیت اس کی مستحق ہے کہ اس کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں میں خصوصی رعایت کی جائے جس سے یہ توقع ہو چلی تھی کہ سچر کمیٹی کی سفارشات اوراس کی رپورٹ سے حاصل معلومات کی بنیاد پر ملک کی اس سب سے بڑی اقلیت کے دستوری وقانونی حقوق سے اسے فیض یاب ہونے کا موقع فراہم کیا جائے گا اوراس کی راہ سے تعصب، فرقہ پرستی اور ظلم وزیادتی کی حائل رکاوٹیں دور کیے جانے کی مؤثر منصفانہ اقدامات کئے جائیں گے؛ مگر حکومت کے اب تک کے رویہ سے یہی ظاہر ہورہا ہے دیگر کمیشنوں اور کمیٹیوں کی رپورٹوں کا جوحشر ہوا ہے سچر کمیٹی کی رپورٹ کا بھی وحی حشر ہوگا۔ اے بسا آرزو کی خاک شدہ

سچر کمیٹی کی رپورٹ آئے ہوئے ایک سال سے زائد کا عرصہ گذر چکا ہے؛ مگر حکومت دم سادھے بیٹھی ہے، اوراس سلسلے میں اسکی جانب سے کوئی ایسا سنجیدہ اقدام دیکھنے میں نہیں آرہا ہے جس سے نصف صدی سے دبی کچلی اقلیت راحت کا سانس لے سکے، ان حالات میں کانگریس پارٹی کی گذشتہ سے پیوستہ ہفتہ منعقدہ ورکنگ کمیٹی کی وہ تجویز جس میں مسلم اقلیت کے سلسلے میں حکومت کے اقدامات کی تعریف وتحسین کی گئی ہے نہ صرف قابل حیرت ہے بلکہ زخم پر نمک چھڑکنے کے مرادف ہے۔

ملک کی اس سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ حکومت کا موجودہ رویہ اور ملک کی سب سے قدیم، عظیم سیکولر سیاسی پارٹی کانگریس کی جانب سے اس کی تحسین وستائش، اس بات کا صاف اشارہ ہے کہ مسلم اقلیت حکومت اور سیاسی پارٹیوں سے اب تک کی اپنی توقع اورامید کو ختم کرلے، یہاں سے اسے کچھ ملنے والا نہیں ہے، اور خوداعتمادی کے ساتھ آپ اپنی خدمت کرو کے اصول پر اپنی جدوجہد کو تیز کردیں، یہ ایک خوش آیند صورت حال ہے کہ ہزار رکاوٹوں اور ظلم وتشدد کے بے پناہ طوفانوں میں گھری قوم مسلم آزادی کے بعد سے گھسٹتے ہی سہی زندگی کے میدان میں آگے بڑھی ہے، ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے، ہم انشاء اللہ آگے ہی بڑھیں گے، ظلم وناانصافی کی یہ خلیج کچھ دشواریاں تو پیدا کرسکتی ہیں؛ مگر ہمارے راستے کو روک نہیں سکتی۔ ”ہمت مرداں مدد خدا“

چٹانیں چور ہوجائیں جو ہو عزم سفر پیدا　☆　جوانو یہ صدائیں آرہی ہیں آبشاروں سے

بدیہیات قرآن

حکمتیں اور فائدے

(۶)

از: مولانا محمد عارف مبارکپوری
شارجہ، متحدہ عرب امارات

فرمان باری ہے: ”واذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیها ویهلك الحرث والنسل والله لایحب الفساد“ (بقرہ/۲۰۵)

’’اور جب پھرے تیرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک میں تاکہ اس میں خرابی ڈالے، اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں، اور اللہ ناپسند کرتا ہے فساد کو‘‘۔

اس آیت میں دو مقام پر بدیہیات ہیں:

مقام اوّل: ”سعی“ کے حقیقی معنی: تیزی کے ساتھ پاؤں سے چلنا۔ اور ظاہر ہے اس لحاظ سے سعی زمین میں ہی ہوگی پھر (فی الارض) کے ذریعہ اس کی وضاحت کرنے میں کیا حکمت ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے عموم معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں بھی جاتا ہے، فساد کی سعی کرتا ہے۔ اور لفظ (فی الارض) سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کے مختلف اطراف میں بہت زیادہ نقل و حرکت کرتا ہے۔ اس لیے کہ جب (الارض) کو عام رکھا ہے، تو اس سے کثرت، سعی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح کا مضمون اس سے پہلے (لاتفسدوا فی الارض) (بقرہ/۱۱) میں آچکا ہے۔ یہ جواب ابوحیان نے نقل کیا ہے۔(۱)

مقام دوم: فساد پیدا کرنا ایک عام لفظ ہے، جس کے تحت کھیتیاں اور جان تباہ کرنا داخل ہے، پھر اس کو الگ سے بیان کرنے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

اوّل: اللہ تعالیٰ نے فساد انگیزی کو اولاً (لیفسد فیها) کے ذریعہ اجمالی طور پر بیان فرمایا

پھر (ویھلك الحرث والنسل) میں اس کی تفصیل بیان فرمائی۔ اس کی نظیر یہ آیت کریمہ من کان عدوا للّٰہ، وملائکتہ ورسلہ وجبریل ومیکال. (بقرہ/۹۸)

''اور جو کوئی ہو دشمن اللہ کا اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل ومیکائیل کا''۔

فساد انگیزی کی ان دو شکلوں کو خاص طور پر اس لیے بیان فرمایا کہ دنیا کی آبادی میں ان دو چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے ان دونوں کو تباہ کرنا، حد درجہ کی فساد انگیزی ہے۔ یہ جواب رازی اور ابوحیان نے نقل کیا ہے۔ (۲)

یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ فساد انگیزی کے معنی، تخریب کاری لی جائے لیکن اگر فساد انگیزی کا معنی یہ لیا جائے کہ یہ شخص جب مجلس نبوی سے واپس ہوتا تو اس کا کام ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرے، اور کفر کی تائید کے راستے نکالے۔ اور اس کو بھی فساد انگیزی کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کی بات نقل کرتے ہوئے فرمایا:

أتذر موسیٰ و قومه ليفسدوا فی الارض (اعراف/۱۲۷)

''یوں چھوڑتا ہے تو موسیٰ اور اس کی قوم کو کہ دھوم مچائی ملک میں، اور موقوف کردے تجھ کو اور تیرے بتوں کو''۔

نیز فرمایا: ''انی أحاف أن يبدل دينكم أو أن يظهر فی الارض الفساد'' (مومن/۲۶)

''میں ڈرتا ہوں کہ بگاڑ دے تمہارا دین یا پھیلائے ملک میں خرابی''۔

اور اسی طرح کی توجیہ اس فرمان باری میں آچکی ہے:

واذا قيل لهم لا تفسدوا فی الارض (بقرہ/۱۱)

''اور جب کہا جاتا ان سے، فساد نہ ڈالو ملک میں''۔

اس صورت حال کو ''زمین میں فساد انگیزی'' سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ اس کی وجہ سے لوگوں میں اختلاف جنم لیتے ہیں، ان کا شیرازہ بکھرتا ہے، اور ہر ایک دوسرے سے اظہار براءت کرتا ہے، پھر قطع رحمی اور خوں ریزی ہوتی ہے۔ فرمان باری ہے:

فهل عسيتم ان توليتم أن تفسدوا فی الارض، وتقطعوا أرحامكم'' (سورہ محمد/۲۲)

''پھر تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے، تو خرابی ڈالو ملک میں اور قطع کرو اپنی قرابتیں''۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے خبردار کردیا کہ اگر یہ لوگ ین سے اعراض کریں گے تو زمین میں فساد انگیزی اور قطع رحمی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور یہ اسلوب قرآن میں (جیسا کہ ہم بتاچکے ہیں) بہ کثرت موجود ہے۔

فسادانگیزی کو، تخریب کاری اور لوٹ مار کے مقابلہ، اس معنی پر محمول کرنا بہتر ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے، اس کو حرف عطف (واو) کو ذریعہ بیان فرمایا ہے، اور معطوف، معطوف علیہ سے، لازماً الگ ہوتا ہے۔ یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔ (۳)

دوم: فسادانگریزی سے مراد، شبہ ڈالنا ہے۔ جس طرح دینِ حق، دو امور سے عبارت ہے: علم اور عمل۔ اسی طرح دینِ باطل دو امور سے عبارت ہے: شبہات اور غلط کام کرنا۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے بارے میں اولاً یہ بیان فرمایا کہ یہ شبہات پیدا کرنے میں لگتا ہے، اور (لیفسد فیها) سے یہی مراد ہے، اس کے بعد یہ بتایا کہ یہ شخص غلط کار رہے۔ اور (ویهلك الحرث ولانسل) سے یہی مراد ہے۔ یہ جواب رازی نے نقل کیا ہے۔ (۴)

۲-فرمان باری: "والمطلقات يتربصن بأنفسهن ثلاثة قروء" (بقرہ/۲۲۸)

''اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک''۔

سوال یہ ہے کہ اگر یوں کہہ دیتے (يتربصن ثلاثة قروء) تو بھی کافی تھا، جیسا کہ ایک دوسری جگہ فرمایا:

تربص أربعة أشهر (بقرہ/۲۲۶)

''مہلت ہے چار مہینے کی''

یہاں پر (بأنفسهن) کے ذریعہ تاکید لانے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

اول: (بأنفسهن) کے ذکر میں، عورتوں کو انتظار کرنے پر ورغلانا اور خوب ترغیب دینا ہے؛ اس لیے کہ یہ ایسی چیز ہے، جس سے ان کو اعراض ہوتا ہے، اس میں ان کو اس پر آمادہ کرنا ہے۔ کیوں کہ عورتوں کی طبیعت، مردوں کی طرف مائل ہوتی ہے، اس ٹکڑے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کی اس رغبت کو لگام دیں، اور انتظار پر مجبور کریں۔ یہ جواب زمخشری، رازی، ابن عاشور، ابوسعود، آلوسی اور بیضاوی نے نقل کیا ہے۔ (۵)

دوم: (بأنفسهن) کا تعلق، (يتربصن) سے ہے، اور اس صورت میں ظاہر یہ ہے کہ ''باء''

سببیت کی ہے۔یعنی اپنے نفس کی وجہ سے۔اوراس صورت میں (بأنفسهن) کا ذکر ضروری تھا؛ اس لیے کہ اگر یوں کہا جاتا: "یتربصن بهن" تو یہ ترکیب درست نہ ہوتی؛ کیوں کہ اس میں اسم متصل کی ضمیر کو رفع دینے والے فعل کو، ضمیر مجرور کی طرف، متعدی کرنا ہوتا، جیسے: (هند تمر بها) اور یہ ترکیب صحیح نہیں۔ یہ جواب ابوحیان نے ذکر کیا ہے۔(٦)

سوم: تاکید کے زائد ہے اور مطلب یہ ہے: یتربصن أنفسهن) جیسے کہتے ہیں: جاء زید بنفسه، جاء زید بعینه یعنی نفسه و عینه ۔یہ جواب ابوحیان اور ابن عاشور نے نقل کیا ہے۔ البتہ ابن عاشور نے صاحب "المغنی" کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اس کو دو وجوہات سے رد کیا ہے:

الف: باعتبار لفظ، اس وجہ سے کہ ضمیر متصل کی تاکید کا حق یہ ہے کہ ضمیر منفصل یا کسی اور فاصل کے ذکر کے بعد آئے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حرفِ عطف پر اکتفا کیا۔

ب: باعتبار معنی، اس وجہ سے کہ یہاں تاکید کا کوئی تقاضا نہیں، اس لیے کہ سامع کا ذہن اس طرف نہیں جاسکتا کہ اس امر کا مخاطب مبتدا یعنی "المطلقات" (جس کی ضمیر خبر میں موجود ہے) کے علاوہ کوئی اور ہے۔(٧)

اس اشکال کا جواب ابوحیان دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ اعتراض نہ ہو کہ یہاں پر تاکید جائز نہیں؛ کیوں کہ یہ ضمیر مرفوع متصل (یعنی یتربصن میں جونون نسوۃ ہے) کی تاکید کے باب سے ہوگیا اور اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کی تاکید ضمیر منفصل کے ذریعہ لائی جاچکی ہے، اور ترکیب یوں ہو: یتربصن هن بأنفسهن اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تاکید پر حرف "با" کی وجہ سے جر آ گیا، تو یہ تابع ہونے سے خارج ہوگئی۔ اور اس میں وہ علت مفقود ہوگئی، جس کی وجہ سے ضمیر مرفوع متصل کی تاکید محال تھی تا آں کہ ضمیر منفصل کے ذریعہ اس کی تاکید لائی جائے، اگر نفس وعین کے ذریعہ اس کی تاکید لانی ہو۔ اس جواز کی نظیر: أحسن بزید، وأجمل ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: وأجمل به ہے۔ "به" کو فاعل ہونے کے باوجود، حذف کردیا گیا۔ یہ اہلِ بصرہ کا مذہب ہے۔

نیز اس لیے کہ جب حرف جر "با" کی وجہ سے اس پر جر آ گیا تو صورت میں فاعل ہونے سے خارج ہوگیا۔ اور "فضلہ" کی طرح ہوگیا۔ لہٰذا اس کا حذف کرنا جائز ہوگیا۔ مزید براں یہ کہ اخفش نے "المسائل" میں لکھا ہے کہ قاموا أنفسهم بلا تاکید جائز ہے۔

یہاں پر اس تاکید کا فائدہ یہ ہے کہ یہ عورتیں خود اس مدت کا انتظار کریں گی، اس میں یہ احتمال ختم ہوگیا کہ کوئی اور ان کے ساتھ اس کام کو انجام دے گا۔ ان عورتوں کو ہی، اس انتظار کا حکم دیا گیا ہے۔ اس صورت میں اس فعل کے، ان سے واقع ہونے کا زیادہ تقاضا ہے۔ لہٰذا اس کی تاکید کی ضرورت محسوس ہوئی؛ کیوں کہ عورتوں کی طبیعت میں، شادی اور مردوں کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اور جب اس کی تاکی لادی گئی، تو معلوم ہوگیا کہ یہ شدت سے مطلوب ہے۔ (۸)

۳- فرمان باری: واذا طلقتم النساء فبلغن أجلهن فأمسكوهن بمعروف أو سرحوهن بمعروف ولا تمسكوهن ضرارا لتعتدوا (بقرہ/۲۳۱)

"اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی عدت تک تو رکھ لو ان کو موافق دستور کے، یا چھوڑ دو انکو بھلی طرح سے، اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کے لیے۔"

سوال یہ ہے کہ (فأمسكوهن بمعروف) اور (ولا تمسكوهن ضرارا) میں کوئی فرق نہیں؛ کیوں کہ کسی بات کا حکم دینا اس کی ضد سے روکنا ہے؛ لہٰذا اس تکرار کا کیا فائدہ ہے؟

اس اشکال کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

اول: (ولا تمسكوهن ضرار) یہ ٹکڑا (فأمسكوهن بمعروف) کی تاکید کی طرح ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے، ستانے کے لیے عورتوں کو روکے رکھنے سے منع فرمایا۔ اور اس ممانعت میں حکمت یہ ہے کہ (فأمسكوهن بمعروف) میں جو امر ہے اس کی تعمیل ایک بار دستور کے موافق رکھ لینے سے ہو جاتی ہے، یہی امر کا مدلول ہے، یہ ہمہ وقت کو شامل نہیں۔ اس کے بعد "نہی" آئی، جو تمام اوقات کو شامل ہے۔ اور اس میں اس غلط عادت پر تنبیہ ہے جو دورِ جاہلیت میں رائج تھی کہ طلاق کے بعد، رجوع کر لیتے، پھر طلاق دیتے پھر رجوع کر لیتے تاکہ عورت کو ستائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس فعل بد سے، خصوصاً منع فرما دیا تاکہ اس گھناؤنے عمل پر تنبیہ ہو جائے، جو عورتوں کے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک ہے کہ اس طریقہ سے ان عورتوں کی عدت (جو مہینوں سے عدت گذارتی ہیں) نو ماہ تک طول پکڑ جاتی تھی۔ یہ جواب رازی، ابوحیان، ابوسعود اور آلوسی نے نقل کیا ہے۔ (۹)

دوم: ابن عاشور کہتے ہیں:

"(ولا تمسكوهن ضرار) میں (فأمسكوهن بمعروف) کے مفہوم مخالف کی تصریح ہے، اس لیے کہ "ضرار"، "معروف" کی ضد ہے۔ یہ مفہوم، امر سے سمجھ میں آرہا تھا اس کے

باوجود عطف کے ذریعہ اس کے بیان کرنے کی وجہ، اس ضد کی حددرجہ برائی کو بیان کرنا کہ شوہر (جو دستور کے موافق رکھنے کے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کرتے ہیں) عموماً اسی کے مرتکب ہوتے ہیں، نیز اس میں تاکید بھی ہے، اور اس میں نکتہ یہ ہے کہ ایک مفہوم کو ذہن کے اندر دو مختلف طریقے (جن کا مقصد ایک ہے) سے راسخ کر دیا جائے۔(۱۰)

ابن عاشور پہلے جواب سے مطمئن نہیں، وہ رقم طراز ہیں:

''فخرالدین رازی نے کہا کہ اس آیت میں ''امر'' پر، ضد کی شکل میں، ''نہی'' کا عطف کیا گیا ہے، اس میں نکتہ یہ ہے کہ ''نہی'' کے برخلاف ''امر'' تکرار کا متقاضی نہیں۔''

لیکن امر و نہی کے درمیان یہ تفریق مسلم نہیں، علم اصول کا یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے، البتہ انھوں نے اس کی بنیاد اس پر رکھی ہے کہ لغوی لحاظ سے امر و نہی کے درمیان فرق ہے۔ تاہم اگر ہم یہ کہیں کہ جہاں کہیں، ''امساک'' میں ''معروف'' پایا جائے، وہاں ''ضرار'' کا وجود نہیں ہوگا۔ اور جہاں ''معروف'' معدوم ہوگا، ''ضرار'' کا وجود ہوگا۔ لہٰذا ''ضرار''، ''معروف'' کی نقیض کے، مساوی ہوگیا۔ تو اس صورت میں ہم، اس عطف میں نکتہ یہ قرار دے سکتے ہیں کہ یہ، اثبات ونفی کے دو طریقوں سے، ''امساک بالمعروف'' کے حکم کی تاکید ہے، گویا یوں کہا گیا: لا تمسکوا الا بمعروف۔ جیسا کہ سموئل کے اس شعر میں ہے:

تسیل علی حد الظبات نفوسنا   ولیس علی غیر الظبات تسیل

''تلوار کی دھاروں پر ہماری جان جاتی ہے۔ تلوار کی دھاروں کے علاوہ کسی اور چیز پر ہماری جان نہیں جاتی''۔(۱۱)

۴-فرمان باری: ولاجناح علیکم فیما عرضتم به من خطبة النساء أو أكننتم فی أنفسکم علم الله أنکم ستذکروهن ولکن لا تواعدوهن سرا الا أن تقولوا قولا معروفا ولا تعزموا عقدة النساء حتی یبلغ الکتاب أجله واعلموا أن الله یعلم ما فی أنفسکم فاحذروه واعلموا أن الله غفور حلیم. (بقرہ/۲۳۵)

''اور کچھ گناہ نہیں تم پر کہ اشارہ میں کہو پیغام نکاح ان عورتوں کا یا پوشیدہ رکھو اپنے دل میں، اللہ کو معلوم ہے کہ البتہ ان عورتوں کا ذکر تم کروگے، لیکن ان سے نکاح کا وعدہ نہ کر رکھو چپ کر، مگر یہی کہ کہہ دو کوئی بات رواج شریعت کے موافق، اور نہ ارادہ کرو نکاح کا، یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت، مقررہ اپنی انتہا کو، اور جان رکھو کہ

اللہ کو معلوم ہے، جو کچھ تمہارے دل میں ہے، سو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو اللہ بخشنے والا اور تحمل کرنے والا ہے۔''

بدیہی بات ہے کہ اشارہ میں نکاح کا پیغام دینا، اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ دل کا میلان ہو اور زبان سے کچھ نہ کہے، اور جب اشارہ میں نکاح کا پیغام دینا پہلے مباح قرار دے دیا تو اب (أو أکننتم فی أنفسکم) کا جملہ ایک واضح امر کی وضاحت کے درجہ میں ہوگیا؟

اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

اوّل: امام رازی لکھتے ہیں:

''آیت کا مطلب وہ نہیں جو آپ نے سمجھا؛ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فی الحال ''تعریض'' (اشارہ میں کہنا) کو مباح اور ''تصریح'' (صراحتاً اظہار کرنا) حرام قرار دیا، اس کے بعد فرمایا (أو أکننتم) اور اس سے مراد یہ ہے کہ دل میں یہ عزم کرے کہ مستقبل میں اس کا اظہار صراحتاً کرے گا۔ پہلی آیت میں فی الحال تعریض کو مباح اور تصریح کو حرام کرنا ہے، اور دوسری آیت میں اس امر کو مباح کیا ہے کہ دل میں یہ عزم رکھے کہ زمانہ عدت گذرنے کے بعد، اس کا صراحتاً اظہار کردے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ سبب بیان کیا جس کی وجہ سے اس کو مباح کیا ہے، اور فرمایا (علم اللّٰہ أنکم ستذکروھن) اس لیے کہ نکاح کے باب میں جب نفس میں شہوت پیدا ہوجاتی ہے، تو صاحبِ شہوت، عزم وتمنا سے بہ مشکل چھوٹ سکتا ہے، اور چوں کہ اس میلان قلبی کو دور کرنا، ایک شاق امر کی طرح ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس سے حرج کو اٹھادیا اور اس کو مباح کردیا۔''

یہ جواب ابوحیان نے بھی نقل کیا ہے۔ (۱۲)

دوم: ابن عاشور کہتے ہیں:

''گناہ نہ ہونے کے باب میں، تعریض پر، (أو أکننتم فی أنفسکم) کا عطف کرنے (حالانکہ یہ بات عیاں ہے کہ تعریض، نفس میں عزم کے بعد ہی ہوتی ہے، اور تعریض پر گناہ نہ ہونے کا لازمی مطلب ہے کہ محض نفس کے عزم پر گناہ نہیں ہوگا) فائدہ یہ تنبیہ ہے کہ عزم ایسی چیز ہے جس کو دور نہیں کیا جاسکتا، اور نہ اس کو ممنوع کیا جاسکتا ہے، اور جب یہ واقعہ اور صاحبِ عزم کا اپنے عزم کو زبان پر لانا ایک انسانی فطرت ہے کہ انسان اس کو چھپائے نہیں رکھ سکتا، تو اللہ تعالیٰ نے مقام رخصت کو بیان فرمادیا کہ یہ انسانوں پر، اللہ کے رحم وکرم کا ایک مظہر ہے، نیز اس میں

حالتِ عدت کے احترام کو بھی ملحوظ رکھا، اوراس رخصت کی علت بھی بیان فرمادی کہ اس کا سبب، نفی حرج ہے۔ یہ ہے اس تشریع کی حکمت جواس سے پہلے ان کے سامنے بیان نہیں ہوئی تھی۔''

یہ جواب ابوحیان نے بھی نقل کیا ہے۔(۱۳)

❁ ❁ ❁

حواشی:

(۱) ابوحیان تفسیر آیت۔

(۲) رازی ۵/۲۱۷؛ ابوحیان ۲/۲۲۹۔

(۳) رازی ۵/۲۴۶۔

(۴) رازی ۵/۲۴۶۔

(۵) زمخشری تفسیر آیت، رازی ۴/۴۳۴؛ ابن عاشور تفسیر آیت، ابوسعود ۱/۲۲۶؛ آلوسی ۲/۱۳۰؛ ابوحیان تفسیر آیت؛ بیضاوی ۱/۵۱۳۔

(۶) ابوحیان تفسیر آیت۔

(۷) ابوحیان تفسیر آیت؛ ابن عاشور تفسیر آیت۔

(۸) ابوحیان تفسیر آیت۔

(۹) رازی ۶/۴۵۳؛ ابوحیان تفسیر آیت؛ ابوسعود ۱/۲۳۰؛ آلوسی ۲/۱۴۴۔

(۱۰) ابن عاشور تفسیر آیت۔

(۱۱) ابن عاشور تفسیر آیت۔

(۱۲) رازی ۶/۴۶۹؛ ابوحیان ۲/۵۲۱۔

(۱۳) ابن عاشور تفسیر آیت؛ ابوحیان تفسیر آیت۔

❁ ❁ ❁

قربانی، فدائیت کا بہترین نمونہ

از: مولانا مصلح الدین قاسمی
استاذ ادب عربی، شاہی مرادآباد

تصور کیجیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانیوں کا، کیسی آزمائش کی گھڑی رہی ہوگی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جب نمرود نے دہکتی ہوئی آگ تیار کرائی تھی، ایک طرف نارِ نمرود اوراس کے وہ چیلے چپاٹے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں جلنے کا تماشہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھے، اور دوسری طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عشقِ حقیقی تھا جو بار بار آگ میں کودنے کے لیے کچوکے لگا رہا تھا، بالآخر نبی موصوف بے دھڑک آگ میں کود پڑے، اور خدائی فرمان ”یَا نَارُ کُونِی بَرْدًا وَسَلَامًا عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ“ (اے آگ تو ٹھنڈی اور سلامتی بن جا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر) کے آگے آگ اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکی، اور دنیا نے دیکھا کہ آتشِ نمرود میں عشقِ حقیقی کس طرح پنپتا اور پروان چڑھتا ہے۔ سچ ہے

آج بھی ہو جو ابراہیم سا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

پھر تصور میں لائیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فدائیت کا: حکم ہوتا ہے اپنی بیوی اور بچے کو اُس سنسان وادی میں چھوڑ کر آیئے جہاں نہ آدم نہ آدم زاد، ایسا ویرانہ جہاں صرف چلچلاتی دھوپ ہے، نہ کھانا ہے نہ پانی، نہ کوئی قریب اور عزیز، نہ کوئی خبر گیری کرنے والا اور نہ کوئی راہ گیر، جہاں نہ اپنوں کا معلوم اور نہ بیگانوں کی خیر خبر، حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کا حکم پاتے ہی بیوی اور بچے کو اُس جھلسی ہوئی پہاڑیوں اور کھانے پانی سے خالی وادی میں چھوڑ کر آگئے، یہ بالکل نہ سوچا کہ اُس تپتی ہوئی وادی میں ممتا کی ماری ایک ماں اور شیر خوار بچے کا کیا ہوگا۔ بس خدا کا حکم ملتے ہی تعمیل کے لیے فوراً تیار ہوگئے اور حکم کو جسیمی شکل دینے میں ذرہ برابر بھی تاخیر نہ کی۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور اُن کے ننھے منے بچے پر اُس وحشت ناک وادی میں کیا گذری؟ یہ بھی تاریخ کا ایک

باب ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی فدائیت کا مظہر ہے۔

اُس تپتی ہوئی وادی میں وہ شیرخوار بچہ جب دیوارِ کعبہ سے ایڑیاں رگڑتا تو ماں تڑپ تڑپ کر کبھی صفا کی طرف دیکھتی کہ شاید کوئی قافلہ نظر آجائے اور پانی مل جائے، اور کبھی دوڑتی ہوئی مروہ پر چڑھتی کہ شاید ادھر کوئی قافلہ گذرتا ہوا دکھائی دے، پھر بھاگی بھاگی بچے کو دیکھنے آتی کہ کس حال میں ہے، اُس معصوم کو دیکھ کر پھر پانی کی تلاش میں صفا و مروہ کا چکر لگاتی، اور جب امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی تو بے قرار ہوجاتی، کلیجے منہ کو آنے لگتے، تا آں کہ اللہ رب العزّت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لاڈلے کی ایڑیوں کی رگڑ سے پانی کا چشمہ جاری فرمادیا جو ''زمزم'' کے نام سے مشہور ہے، اور اُس وقت سے اب تک اسی طرح جاری ہے۔

اللہ اکبر! فدائیت کا یہ نمونہ اب کون پیش کرسکتا ہے کہ ابھی ایک امتحان ختم نہیں ہوا کہ دوسرا شروع ہوگیا، جب بچہ بڑا ہوگیا اور بوڑھے باپ کو کچھ سہارا دینے کے لائق ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دکھایا گیا کہ وہ اپنے لاڈلے کو اللہ کی راہ میں قربان کررہے ہیں، چوں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا خواب بھی وحی کے درجے میں ہوتا ہے اِس لیے صبح اٹھتے ہی اُس خواب کا تذکرہ اپنے بیٹے سے کیا، اِس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کوئی ہچکچاہٹ اور سراسیمگی نہیں ہوئی، اور نہ ہی کوئی قلق ہوا؛ کیوں کہ ان کا قلب حبّ خدا سے سرشار تھا اور بطورِ امتحان بیٹے سے سوال کیا تمہاری رائے اِس کے بارے میں کیا ہے؟۔

یہاں کسی شخص کے دل میں یہ خلجان پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خدائی حکم کی تعمیل کرنا بیٹے کے اتباعی جواب پر منحصر تھا؟ ایسی کوئی بات نہیں؛ بل کہ ان سے صلاح ومشورے میں بہت سارے اسرار وحکم پنہاں ہیں: پہلی حکمت یہ تھی کہ ان میں اطاعتِ خداوندی کا جذبہ وولولہ کس حد تک ہے یہ بات کھل کر سامنے آجائے، نیز اُن کے حوصلے کو بھی پرکھنا اور جانچنا مقصود تھا۔ دوسری حکمت یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ اسے قبول کریں گے تو مستحق اجر ہوں گے، تیسری حکمت یہ تھی کہ عین ذبح کے وقت ممکن تھا کہ محبتِ پدری، محبت طبعی اور تقاضائے انسانی فعل مامور میں آڑے نہ آجائے، اِس وجہ سے نبی موصوف نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے مشورہ لیا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس واقعے کو اِس انداز سے بیان فرمایا ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّی اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰیؕ؟
قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ.

''سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا: برخوردار! میں دیکھتا ہوں کہ تم کو (بامرالٰہی) ذبح کررہا ہوں سوتم بھی سوچ لو تمہاری کیا رائے ہے؟ وہ بولے: ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ کیجیے انشاء اللہ آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے دیکھیں گے۔''

یہ امتحان کس قدر سخت تھا اِس کی طرف اشارہ خود الہ رب العزّت نے ''فلما بلغ معه السعي'' سے اشارہ فرمادیا کہ ارمانوں سے مانگے ہوئے اُس بیٹے کو قربان کرنے کا حکم اُس وقت دیا گیا جب یہ بیٹا اپنے باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تھا، اور پرورش کی مشقتیں برداشت کرنے کے بعد اب وقت آیا تھا کہ وہ قوتِ بازو بن کر باپ کا سہارا ثابت ہو، مفسرین نے لکھا ہے کہ اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال تھی، اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ بالغ ہوچکے تھے۔

یوں تو ذبح کرنے کا یہ حکم براہِ راست کسی فرشتے وغیرہ کے ذریعے بھی نازل کیا جاسکتا تھا، لیکن خواب میں دکھانے کی بظاہر حکمت یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت شعاری اپنے کمال کے ساتھ ظاہر ہو، خواب کے ذریعے دیئے ہوئے حکم میں انسانی نفس کے لیے تاویلات کی بڑی گنجائش تھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تاویلات کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے اللہ رب العزت کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کردیا اور اِس امتحان میں سو فیصد کامیاب ہوئے۔

قربانی کا یہ واقعہ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فدائیت کا مظہر ہے وہیں اِس واقعے سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بھی بے مثال جذبۂ جاں نثاری کی شہادت ملتی ہے، اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کم سنی ہی میں اللہ رب العزت نے انھیں کیسی ذہانت اور کیسا علم عطا فرمایا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سامنے اللہ کے کسی حکم کا حوالہ نہیں دیا تھا؛ بلکہ محض ایک ایک خواب کا تذکرہ فرمایا تھا، لیکن حضرت اسماعیل علیہ السلام سمجھ گئے کہ انبیا علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے، اور یہ خواب بھی درحقیقت حکمِ الٰہی کی ہی ایک شکل ہے، چناں چہ انھوں نے جواب میں خواب کے بجائے حکمِ الٰہی کا ذکر کیا اور والد بزرگوار کو یہ کہہ کر یقین دلایا ''یٰٓا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِی إنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ'' (ابا جان! جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے کر گذریئے، انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب پاکستانی علیہ الرحمہ اپنی تفسیر معارف القرآن میں اِس

آیت کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

''اِس جملے میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی غایتِ ادب اور غایتِ تواضع کو دیکھئے، ایک تو انشاء اللہ کہہ کر معاملہ اللہ کے حوالے کردیا، اور اِس وعدے میں دعوے کی جو ظاہری صورت پیدا ہوسکتی تھی اسے بالکل ختم فرمادیا، دوسرے آپ یہ بھی فرماسکتے تھے کہ ''آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے'' لیکن اس کے بجائے آپ نے فرمایا ''انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے'' جس سے اِس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ یہ صبر وضبط تنہا میرا کمال نہیں ہے؛ بلکہ دنیا میں اور بھی بہت سے صبر کرنے والے ہوئے ہیں، انشاء اللہ میں بھی ان میں شامل ہوجاؤں گا، اِس طرح آپ نے اِس جملے میں فخر وتکبر، خود پسندی اور پندار کے ادنیٰ شائبے کو ختم کرکے اس میں انتہا درجے کی تواضع اورانکسار کا اظہار فرمادیا۔

(روح المعانی، بحوالہ معارف القرآن ج ۷، ص: ۴۵۹۔ فرید بک ڈپو دہلی)

اللہ رے! یہ جذبۂ قربانی اور یہ فدائیت، کہ بیٹے کے گلے پر چھری چلادی، اور ہائے رے یہ اِقدام فداکاری کہ چھری تلے گردن رکھ دیا اور خلیل وذبیح دونوں نے اپنا اپنا حق ادا کریا، قرآن نے بھی اعلان کردیا ''قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ'' (الصّٰفّٰت/۱۰۵) (تم نے خواب سچ کر دکھایا ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں) یعنی اللہ کے حکم کی تعمیل میں جو کام تمہارے کرنے کا تھا اُس میں تم نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور آزمائش میں پورے پورے کامیاب رہے، اور یہ ادائے قربانی اللہ کو اتنی پسند آئی کہ رہتی دنیا تک کے لیے یادگار اور قربِ خداوندی کا ذریعہ بنادیا جسے امت مسلمہ ہر سال مناتی ہے، اور اِس قربانی میں درحقیقت مسلمانوں کے اِس عقیدے کا اعلان ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ رب العزت کے حکم کے آگے اپنی عزیز سے عزیز ترین چیز کو بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ سچ لکھا حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ نے:

''اسلام جب بھی چمکا ہے قربانیوں سے چمکا ہے، آج بھی قربانیوں ہی سے چمکے گا۔ اسلام کے لیے قربانیاں ہوں تو یہ دشمنوں کے گھیرے میں بھی چمکتا ہے، اور جب قربانیاں نہ ہوں تو اپنی بادشاہت میں بھی مٹ جاتا ہے۔''

اللہ رب العزّت پوری امت مسلمہ میں جذبۂ ایثار وقربانی پیدا فرمائے۔ (آمین)

قطع حیات بہ جذبۂ رحم (Euthanasia) کی شرعی حیثیت

(۱)

از: مفتی محمد شمیم اختر قاسمی
ریسرچ اسکالر: شعبۂ دینیات (سنی)
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

جب کبھی کوئی آدمی شخصی یا گھریلوں الجھنوں، سماجی ذمہ داریوں سے دوچار ہوتا ہے، یا اپنے حسب منشا اعلی عہدہ ومنصب کے حصول میں ناکام ہوتا ہے تو وقتی طور پر اسکا رنج اسے بہت ہوتا ہے۔ اسی کرب میں بعض آدمی خودکشی بھی کرلیتا ہے، تاکہ اس کا واسطہ آئندہ مزید ناکامیوں و نامرادیوں سے نہ پڑے۔ اس نامناسب اقدام کو کسی بھی سماج ومعاشرہ میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اسلام بھی اس عمل کو حرام قرار دیتا ہے۔ ایسا کرنے والوں کا ٹھکانہ سوائے جہنم کے اور کہیں نہیں ہے۔ جب کہ ملکی قانون میں یہ اقدام بذات خود کوئی برا نہیں ہے اور نہ قابل مواخذہ ہے کیوں کہ ہر شخص اپنی ذات کا مالک ہے اور وہ اس میں تصرف کرنے کا پورا اختار رکھتا ہے۔ البتہ اقدام خودکشی کو ضرور جرم قرار دیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ کوئی شخص خودکشی کا اقدام کرے اور کسی وجہ سے وہ اس میں ناکام ہوجائے تو ایسی صورت میں اسے سزا دی جائے گی۔

یوتھینزیا (Euthanasia) کیا ہے؟

اسی کے زیر اثر اب یہ رجحان بھی بڑھتا جارہا ہے کہ اگر کوئی شخص پیدائشی طور پر لاعلاج بیماری میں مبتلا ہے یا عمر کے کسی بھی حصے میں وہ لاعلاج اور مہلک بیماری میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اسکی حالت مثل مردہ کے ہوجاتی ہے جو خود سے اپنا کوئی کام نہیں کرسکتا ہے، یہاں تک کہ اس کے جسم پر جو مکھی بیٹھی ہوئی ہے اسے بھی وہ بھگا نہیں سکتا ہے۔ اس کی ساری ضرورتوں کی تکمیل اس کے

قریب ترین رشتہ دار انجام دیتے ہیں۔ تکلیف بھی اتنی شدید ہے کہ مریض ہر وقت کراہتا اور ایڑیاں رگڑتا رہتا ہے۔اس کی تکلیف اس کے رشتہ داروں سے دیکھی نہیں جاتی اور اس کی وجہ سے اس کے احباب ہر وقت ہراساں و پریشان رہتے ہیں۔ اسی طرح بعض مریضوں کی تکلیف کی شدت کم کرنے کے لیے دوا اور آلات کے ذریعہ مستقل طور پر بے ہوشی میں رکھا جاتا ہے۔اس صورت میں اگر ان تدبیروں کو بروئے کار نہ لایا جائے تو مریض کا زندہ رہنا مشکل ہوجاتا ہے اور اس کی تکلیف میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ایسے وقت میں مریض خود یا اس کے قریبی رشتہ دار چاہتے ہیں کہ ایسے مریض کا زندہ رہنا نہ رہنے کے برابر ہے تو کیوں نہ اسے مناسب تدبیر کے ذریعہ موت کے آغوش میں پہنچا دیا جائے۔اس طرح سے مریض کو بھی ناقابل برداشت تکلیف سے نجات مل جائے گی اور ان کے احباب کو بھی پریشانیوں سے چھٹکارا مل جائے گا جو مریض کی دیکھ بھال اور اس کی خدمت کی وجہ سے ہوتی ہے۔اسی عمل کو جدید علم طب میں یوتھینز یا (Euthanasia) کہا جاتا ہے۔یعنی قطع حیات بہ جذبۂ رحم جس کے لیے Mercy Killing کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔جب کہ ڈکشنری میں اس لفظ کے معنی یہ بیان کیے گئے ہیں:

"Frequently interprete as the painless killing of a person sufring from an incureble disiase"(۱)

یوتھینز یا (Euthanasia) کی قسمیں:

عام طور سے یوتھینز یا (Euthanasia) کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں: عملی (Active) غیر عملی (Passive) (۲) دونوں کا تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک ہی مطلب ہے، یعنی قطع حیات بہ جذبۂ رحم۔

عملی (Active) یوتھینز یا کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مہلک بیماری مثلاً کینسر یا دماغی بخار یا پھر طویل بے ہوشی میں مبتلا ہوجائے اور ڈاکٹروں نے اس کی بیماری کو لاعلاج قرار دے دیا ہو اور اس کی بقاء زندگی کی بھی کوئی توقع نہیں۔ باوجود اس کے تکلیف بھی اتنی شدید کہ وہ ہر وقت بے چین اور ایڑیاں رگڑتا رہتا ہے، ہر طرح کی احتیاطی تدابیر اور دواؤ علاج کے باوجود بھی اس کے تکلیف کے ازالہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی؛ البتہ مصنوعی آلات کے ذریعہ اس کی سانس کو برقرار رکھا گیا ہے۔ایسی صورت میں مریض کی تکلیف کی شدت کم کرنے کے لیے تیز ادویہ زیادہ مقدار میں دے دی جائیں تاکہ اس کی سانس رک جائے، یا پھر مصنوعی آلات تنفس اس سے ہٹا لیا

جائے اور وہ آسانی سے موت کی آغوش میں چلا جائے۔

غیر عملی (Passive) میں شدید تکلیف میں مبتلا شخص کو مارنے کی کوئی ترکیب نہیں کی جاتی؛ بلکہ مریض کو زندہ رکھنے کے لیے جو دوا یا آلات استعمال کیے جاتے ہیں اسے روک دیا جائے تاکہ وہ تڑپ تڑپ کر اپنی موت آپ مرجائے اور اس طرح مریض کو شدید تکلیف سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے۔ اس طرح اس کے قریبی رشتہ داروں کو بھی مریض کی وجہ سے جن پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس سے انہیں چھٹکارا مل جائے۔

لاعلاج بیماری میں اضافی تکلیف:

اس کے علاوہ ایک تیسری نوعیت جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ مریض پیدائشی طور پر یا وقتی طور پر کسی جان لیوا بیماری میں مبتلا ہے مثلاً دماغی بخار، پولیو، نمونیہ، کینسر، یا شدید بڑھاپا یا اپاہج وغیرہ جو بذات خود مہلک اور تکلیف دہ بیماریاں ہیں، جن کا ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق کوئی علاج نہیں۔ ایسی صورت میں وہ کسی دوسری بیماری میں مبتلا ہوجاتا ہے تو کیا ایسی صورت میں اس نئی بیماری کا علاج کرایا جائے یا نہیں، جب کہ وہ پہلے سے ہی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہے اور اس نئی بیماری کے علاج سے شفایابی کے باوجود اس کی صحت پر کوئی خاص اثر پڑنے والا نہیں ہے۔

یوتھینزیا (Euthanasia) سے متعلق مریض کوئی بھی ہوسکتا ہے:

یوتھینزیا (Euthanasia) سے متعلق مریض کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً ایک بچہ پیدائشی طور پر مفلوج اور اپاہج ہے، یا بعد میں وہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوگیا، جس کا علاج زندگی کے کسی حصے میں بھی ممکن نہیں، پوری زندگی اسے بستر مرض پر پڑا رہنا پڑے گا۔ اپنے قریبی رشتہ داروں کے رحم وکرم پر وہ کسی طرح زندہ ہے۔ اسی طرح عمر کی ساری منزلیں بہت اچھی طرح سے گزارنے کے بعد آخر میں جب اس پر بڑھاپا طاری ہوا تو اس کی صحت بہت خراب ہوگئی وہ اس لائق بھی نہیں رہا کہ اپنی کسی بھی ضرورت کی خود سے تکمیل کرسکے، اس کے حواس بھی اس قدر مختل ہوگئے کہ اچھے برے کی تمیز بھی جاتی رہی، تکلیف اور پریشانی کا غلبہ اس حد تک ہے کہ وہ ہر وقت تڑپتا اور چیختا چلاتا رہتا ہے۔ دوا سے بھی اس کی تکلیف کم نہیں ہورہی ہے۔ اس صورت میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایسے مریض کو مناسب تدبیر کے ذریعہ قبل از وقت ماردیا جائے تاکہ خود مریض اور اس کے متعلقین کے حق میں زیادہ تکلیف اور پریشانی کا باعث نہ ہو۔

اس طرح کا اقدام تاریخ کے کسی دور میں کیا گیا ہے؟

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مرض کی بھیانک صورتیں ہر عہد اور زمانے میں رونما ہوئی ہیں اور تکلیف کی حدوں کو پار کرنے کے باوجود بھی ناقابل علاج مریضوں کو ہر ممکن زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی تھیں۔ چہ جائے کہ وہ اپنی موت آپ کیوں نہ مرجائے۔ دانستہ طور پر مریض یا اس کے متعلقین کے ذہن میں اس طرح کا تصور نہ پیدا ہوتا تھا کہ لاعلاج مریضوں کو مناسب تدبیر کے ذریعہ قبل از وقت موت کے آغوش میں پہنچادیا جائے۔ جب کہ پچھلے چند سالوں سے اس کی آوازیں بلند ہورہی ہیں اور یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ایسا کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ یہ عمل تو مریض کے حق میں ہمدردی پر مبنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی شہنشاہ جارج پنجم کے ساتھ ۱۸۶۵ء میں اسی عمل کے ذریعہ موت کی نیند سلادی گئی، باوجود اس کے اس عمل میں تیزی نہیں آئی تھی۔

یہ آواز کب سے بلند ہورہی ہے:

کہا جاتا ہے کہ Derek Humpry کی بیوی ۱۹۸۰ء سے کچھ پہلے کینسر کی بیماری میں مبتلا ہوئی، جسے ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے دیا۔ اس بیماری میں ہر وقت وہ تڑپتی اور بلکتی رہتی تھی۔ جب تکلیف اپنی حدوں کو پار کرگئی اور اسے برداشت کرنے کی طاقت نہ رہی تو اس کی بیوی نے اپنی مرضی سے ایک معاہدہ کے تحت اپنی جان مناسب تدبیر کے ذریعہ ختم کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ زہریلی شراب پلاکر اس کی جان ختم کردی گئی اور ہمیشہ ہمیش کے لیے وہ اس پریشانی سے نجات پاگئی۔ اس حادثہ کا Derek Humpry پر خاصا اثر پڑا اور اسی دن سے وہ یوتھینیز یا (Euthanasia) کا وکیل بن گیا۔ بیوی کے انتقال کے کچھ دنوں بعد اس نے دوسری شادی کرلی اور دونوں میاں بیوی نے مل کر جگہ جگہ اس کی ترجمانی اور وکالت کی۔ اس موضوع پر اس نے باضابطہ ایک کتاب لکھی جس کا نام اس نے جینس وے (Jen's Way) رکھا۔ پھر ۱۹۸۰ء کے قریب اس کی دوسری کتاب Let me die befor i Wake منظر پر آئی۔ اسی موضوع پر اس نے تیسری کتاب لکھی جس کا نام The right to die under standing Euthanasia رکھا۔ اس کی یہ ساری کتابیں خاص طور پر امریکہ میں خوب پڑھی گئیں جسے اس نے عوام میں مقبول بنادیا۔ ان کتابوں کی آمدنی سے اس نے Hemlock Sosiety بھی قائم کی جہاں لاعلاج اور ضعیف العمر مریضوں کے لیے یوتھینیز یا (Euthanasia) پر عمل کرنے کی

ترغیب دی جاتی تھی۔ اس سے اس کا مدعا یہ تھا کہ جو لا علاج مریض بڑی تعداد میں اسپتالوں میں موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور جو برائے نام زندہ ہیں وہ اس عمل کے ذریعہ جان ختم کرکے مرض کی شدت سے نجات پاسکیں۔ Derek Humpry نے جو سوسائٹی قائم کی اس کے ممبر صرف امریکہ میں ۱۵ ہزار ہیں اور ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو پچاس برس کی عمر کو پار کرچکے ہیں اور ان میں بھی زیادہ تر وہ عورتیں ہیں جو اپنے قریبی رشتہ دار مریض کو دیکھ کر متاثر ہوئی ہیں۔ اسی کے زیر اثر یورپی ممالک میں ۳۰ سوسائٹیاں قائم ہوئیں جن میں تین سوسائٹی امریکہ میں ہیں۔ ان میں دوتہائی تعداد Active Euthanasia پر یقین رکھتی ہے۔(۳)

Derek Humpry نے جس یوتھینز یا(Euthanasia) کی وکالت اورحمایت کی ہے وہ Pasive Euthanasia ہے۔ یعنی یہ کہ تکلیف دہ بیماری کی تکلیف کم کرنے کے لیے اور اس کی سانس کو برقرار رکھنے کے لیے جو ادویہ یا آلات استعمال کیے جاتے ہیں وہ روک لیے جائیں اور اس کی دوا بند کردی جائے تاکہ مریض سکون سے دنیا سے رخصت ہوجائے۔(۴)

اس کا اثر دوسرے ممالک میں:

جب یوتھینز یا(Euthanasia) مغربی ملکوں میں مقبول ہونے لگا تو اس کا اثر دوسرے مشرقی ممالک میں بھی پڑا اور کچھ لوگوں کی آواز اس کی حمایت میں بلند ہوئی۔ ہندوستان میں مینومسانی جیسے لوگ اس کی وکالت کرنے لگے۔ ان کی صدارت میں Society for right to die with degnity قائم ہے اور ایسے ہی لوگوں کے زیر اثر مہاراشٹر اسمبلی میں ۱۹۸۵ء میں Passive Euthanasia کی حمایت میں ایک غیر سرکاری مسودہ قانون پیش کیا گیا اور اسے رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے گشت کرایا گیا۔ جیسا کہ مولانا جلال الدین عمری کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس کی وضاحت ہوتی ہے:

> ”Passive Euthanasia کی تائید میں مہاراشٹر اسمبلی میں ۱۹۸۵ء پروفیسر S.S.Varde نے ایک غیر سرکاری مسودہ قانون پیش کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جو مریض ڈاکٹروں کی رائے میں کسی ایسے مرض میں مبتلا ہوں کہ اس کا بچنا ممکن نہ ہو، اسے کوئی ایسی جراحت پہنچی ہو اور وہ بحالت ہوش اپنی آزاد مرضی سے اس خواہش کا اظہار کرے کہ دواؤں کی مدد سے اس کا عرصہ حیات طویل نہ کیا جائے تو اس کے معالجوں کو اختیار ہوگا کہ وہ ایسی دوائیں دینا بند کردیں جو اس کے جسم وجاں

کا رشتہ برقرار رکھ سکتی ہیں، تاکہ وہ جلد اس تکلیف سے نجات پاسکے۔ اس صورت میں اس کے معالجین پر کوئی دیوانی یا فوج داری ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ اس مسودہ قانون میں اس کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے تو بحالت صحت اپنی اس خواہش کو قلم بند کردے کہ آئندہ کبھی وہ اس نازک صورت حال سے دوچار ہو تو اس کے ساتھ یہ عمل کیا جائے۔'' (۵)

اس عمل کو بروئے کار لانے میں حرج ہی کیا ہے؟

مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یوتھینز یا Euthanasia کے عمل کو بروئے کار لانے میں لاعلاج اور شدید تکلیف میں مبتلا مریضوں کے ساتھ انتہائی ہمدردی کا پہلو مضمر ہے۔ سماج میں ہر شخص ایک دوسرے سے محبت کرتا ہے، اس کے دکھ درد میں کام آتا ہے، اچھے برے دنوں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا معاملہ کرتا ہے۔ ایسی صورت میں لاعلاج مریضوں کو وہ تڑپتا ہوا کیسے دیکھ سکتا ہے، تو پھر کیوں نہ بہ جذبہ ہمدردی موت کی نیند سلادے، تاکہ نہ مریض زیادہ تکلیف اور پریشانیوں سے دوچار ہو اور نہ اس کے متعلقین۔ اس کے علاوہ اس کے علاج پر جو روپے خرچ ہورہے ہیں وہ محفوظ بھی رہ سکیں۔ اگر مریض یا اس کے قریبی متعلقین کی مرضی سے اس عمل کو بروئے کار لایا جائے تو بظاہر اس میں کیا قباحت ہے؟

اسلام اس عمل کو اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے:

لیکن اسلامی پہلو سے اس ہمدردی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اگر اسلام میں اس کی اجازت ہوتی تو پھر وہ خودکشی جیسے اقدام کو ناجائز اور حرام نہ ٹھہراتا۔ یوتھینز یا Euthanasia پر عمل کرنے سے جن مفاسد سے بالخصوص مسلم معاشرہ دوچار ہوگا، وہ خودکشی جیسے اقدام سے کسی قدر کم نہیں۔ اس صورت میں مسلمانوں کو اس پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی یا نہیں یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس کا حل تلاش کیا جانا از حد ضروری ہے۔ کیوں کہ الٰہی شریعت کا کردار ایک شفیق طبیب کی طرح ہے جو مریض کی حالت، عادت مرض کی قوت اور ضعف کے تقاضے کے مطابق مریض کو مرض کی اصلاح پر آمادہ کرتا ہے، یہاں تک کہ جب مریض کی صحت مستقل ہوجاتی ہے تو اس کے لیے ایک معتدل لائحہ عمل تجویز کردیتا ہے جو اس کے تمام حالتوں کے مناسب ہوتا ہے۔ (۶)

اس سلسلہ میں اسلام کا موقف کیا ہے اس کے جاننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم اس

مسئلہ پر غور کریں کہ اسلام میں انسان کی جان کی کیا قدر و قیمت ہے اور کسی بندہ کو اپنی جان کے ختم کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ جب کوئی انسان بیمار پڑتا ہے تو اس بارے میں مریض، اس کے رشتہ دار اور ڈاکٹروں کا کیا فریضہ بنتا ہے۔ اس کے بعد بآسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام قتل حیات بہ جذبۂ رحم (Euthanasia) کی اجازت دیتا ہے کہ نہیں اور اگر دیتا ہے تو کیوں اور نہیں دیتا ہے تو کیوں اور اس میں کون سی مصلحت مضمر ہے؟

زندگی خدا کی طرف سے عطا کی ہوئی ایک امانت ہے:

انسان دنیا میں آتا ہے تو پہلے اسے بڑے دشوار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ۹ مہینے مادر شکم میں رہتا ہے جو ایک طرح سے اس کی دنیا ہوتی ہے۔ پھر وہ ایک خاص وقت میں کٹھن مرحلہ سے گزر کر اس دنیا میں آتا ہے۔ اس وقت نوزائدہ بچے پر کیا گزرتی ہے وہ وہی جانتا ہے، مگر وہ اس تکلیف کا بعد میں اظہار نہیں کرسکتا۔ اسی طرح اس کی ماں کی جو حالت ہوتی ہے اس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح کیا گیا ہے:

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهاً وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا. (احقاف:۱۵)

(پیٹ میں رکھا اس کی ماں نے اس کو اور جنا اس کو تکلیف سے)

یہ مشیت خداوندی ہے کہ اتنی سخت تکلیف کے باوجود عورت دوسرا بچہ جننے کے لیے عمر کے ایک خاص حصے تک تیار رہتی ہے، ورنہ اس تکلیف کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ ایک بچہ جننے کی تکلیف کا تصور کرکے آئندہ دوسرا بچہ پیدا کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس حالت میں کسی کی موت ہوجاتی ہے تو وہ شہادت کی موت قرار دی گئی ہے۔ جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

والمراة تموت بِجُمع شهيد. (۷)

پیدائش کے بعد سے لے کر بچہ کے ہوش سنبھالنے تک اس کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔ اگر بچہ کو ہلکی سی بھی تکلیف ہوتی ہے تو ماں تڑپ اٹھتی ہے اور اس کی بے چینی اسے سکون سے رہنے نہیں دیتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بظاہر بچہ کی دیکھ بھال اور اس کی حفاظت والدین کرتے ہیں، مگر درحقیقت اس کی ساری نگہبانی خدائے عزوجل کررہا ہے جس نے اسے عدم سے وجود بخشا ہے۔ ایسی صورت میں انسان کی جان کا مالک بھی خدا ہی ہے جس نے اس کو پیدا کیا اور وہی اس کی جان ختم کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہے۔ اگر کوئی اس کے عطا کردہ وجود میں خلل ڈالتا ہے یا اس کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ عنداللہ مجرم ہے:

''زندگی اوراس کے مسائل کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر موجودہ نقطۂ نظر سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ وہ اس دعویٰ ہی کو تسلیم نہیں کرتا کہ انسان اس دنیا میں کسی بھی چیز کا حق کہ اپنی ذات کا مطلق مالک ہے اور وہ اس میں اپنی آزادمرضی سے تصرف کرسکتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ پوری دنیا اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اور وہ اسے چلارہا ہے۔ اس لیے وہی اس کا حقیقی مالک بھی ہے۔ اس دنیا میں انسان خود سے نہیں آیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو وجود بخشا ہے اور اسی نے اس کے لیے سامان زیست فراہم کیا ہے۔ اس لیے وہی اس کی ذات پر مالکانہ اقتدار بھی رکھتا ہے۔ انسان اپنی ذات یا اپنے کسی اقدام کے بارے میں کوئی آزادانہ فیصلہ نہیں کرسکتا، ورنہ اس کی حیثیت اس مجرم کی ہوگی جو دوسرے کی چیزوں کو اپنی مرضی سے استعمال کرے اوران کے بارے میں فیصلے صادر کرتا پھرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو یہ فیصلہ کرنے کا حق ہی نہیں ہے کہ اسے کب تک دنیا میں رہنا ہے اور کب یہاں سے کوچ کرنا ہے، جس نے زندگی دی ہے وہی فیصلہ کرے گا کہ زندگی کب واپس لی جائے گی۔'' (۸)

اللہ کے نزدیک کسی انسان کی جان کتنی محترم ہے اوراس کا اس دنیا میں آنا کتنا ضروری ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ تنگ دستی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل کردیتے تھے تاکہ وہ اس کی پرورش کے بوجھ سے آزاد رہیں۔ مگر اسلام نے نہ صرف اس کی مخالفت کی بلکہ اس فعل کو حرام قرار دیا اور فرمایا:

وَلَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا. (بنی اسرائیل:۳۱)

(اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے ہم ہی روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو بھی، بے شک ان کا مارنا بڑی خطا ہے)

ایک اور مقام پر اسی بات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوْآ اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ، نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ. (انعام:۱۵۱)

دونوں آیتوں میں الگ الگ دو لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے۔ ایک وہ ہیں جو فی الحال مفلس تو نہیں ہیں مگر ڈرتے ہیں کہ جب عیال زیادہ ہوں گے تو کہاں سے ان کو کھلائیں گے۔ جب کہ دوسرے طبقہ کو عیال سے پہلے اپنی روٹی کی فکر ستارہی تھی۔ اس لیے ایک جگہ خشية املاق اور

دوسری جگہ مــــن امــلاق کے ذریعہ خبردار کیا گیا کہ تم کو رزق کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور تم کو بھی۔ (۹)

اگر کوئی آدمی کثرت اولاد کے بوجھ سے چھٹکارا پانے کے لیے بچے کو وجود میں آنے سے قبل ہی ماں کے شکم میں تلف کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسلام اس عمل کو حرام ٹھہراتا ہے۔ یا پھر سرے سے ہی کوئی شخص یہ چاہے کہ عورت دوسرا بچہ ہی نہ جنے اور اس کے لیے وہ احتیاطی تدابیر عمل میں لاتا ہے تو اس عمل کو بھی اسلام نے اچھا قرار نہیں دیا ہے:

”جَاءَ رَجُلٌ مِنُ اَنُصَارِ اِلٰی رَسُوُلِ اللّٰہ ﷺ اِنَّ لِیُ جَارِیَةً اَطُوُفُ عَلَیُھَا وَاَنَا اَکُرَہُ اَنُ تَحُمِلَ فَقَالَ اِعُزِلُ عَنُھَا اِنُ شِئُتَ فَاِنَّہٗ سَیَاْتِیُھَا مَا قُدِّرَ لَھَا قَالَ فَلَبِثَ الرَّجُلَ ثُمَّ اَتَاہ فَقَالَ اِنَّ الُجَارِیَةَ قَدُ حَمَلَتُ قَالَ قَدُ اَخُبَرُتُكَ اَنَّہٗ سَیَاتِیُھَا مَا قُدِّرَ لَھَا“ (۱۰)

اس طرح کے بہت سے احکام قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی میں ملتے ہیں جن سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس خالق نے مفلسی کے عالم میں کسی کو وجود بخشا ہے تو وہی اس کو رزق بھی فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا اسے ہی اختیار ہے کہ کب کسی کی جان لی جائے۔ بس انسان کے ذمہ ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرے اور اس میں کوئی تصرف نہ کرے۔

کوئی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج نہ ہو:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو ساتھ ہی اس کے دکھ، درد، آلام ومصائب کے علاوہ راحت وسکون اور صحت وتندرستی کو بھی اس کی زندگی کا اہم حصہ بنادیا۔ جب کبھی انسان بیمار پڑتا ہے تو بعضے وقت یہ بیماری بغیر دوا وعلاج کے دوچند روز کے بعد خود ہی ختم ہوجاتی ہے اور آدمی چنگا اور ہشاش بشاش ہوجاتا ہے۔ اسی طرح بعضے وقت بیماری میں شدت ہوتی ہے اور تکلیف بھی، تو بغیر دوا اور ڈاکٹروں کی مدد کے اس کی بیماری ختم نہیں ہوتی۔ تھوڑی سی حفاظت اور علاج و پرہیز اسے تندرست وتوانا بنادیتا ہے اور ذراسی بے توجہی اس کی زندگی کو خطرہ میں ڈال دیتی ہے۔ ایسی صورت میں انسان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی جان کی حفاظت اور تندرست رکھنے کے لیے مناسب ادویہ اور تدابیر اختیار کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور اس کی وجہ سے اس کی جان کو کوئی خطرہ پہنچتا ہے تو وہ عنداللہ گنہگار ہوگا، کیوں کہ صحت وتندرستی کے برقرار رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیماری بھی رکھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بیماری نہیں اتاری ہے جس کا اس نے تریاق یا اس کی دوا نہ پیدا کی ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ دَاءً الا اَنْزَلَ لَہٗ شِفَاءً (۱۱)

(کوئی ایسی بیماری نہیں اُتاری اللہ نے جس کی شفا نہ پیدا کی ہو)

ایک دوسری حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے بیمار لوگوں کو علاج کرانے اور دوا کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: اَنْزَلَ الدَّوَاء الَّذِیْ اَنْزَلَ الْاَدْوَاء (۱۲)

(دوا بھی اتاری اس ذات نے جس نے بیماریاں اتاری ہیں)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اسکی زندگی کا ایک عنصر صحت و تندرستی اور بیماری کو بھی بنایا اور بیماری کے ساتھ اس نے دوا بھی پیدا کی تا کہ وہ اس کو استعمال کر کے تندرست ہو جائے۔ مگر بعض وقت مریض اپنی صحت کے لیے جو دوا تجویز کرتا ہے وہ دوا تو ٹھیک ہوتی ہے مگر وہ اپنا اثر نہیں دکھاتی اور بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے جس سے انسان کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ جیسا کہ خود اللہ کے رسول ﷺ نے دوا کے بے اثر ہونے کے متعلق فرمایا ہے:

لِکُلِّ داءٍ دَوَاءٌ فَاِذَا اُصِیبَ دَوَاءُ الدَّاءِ بَرَاءَ بِاِذْنِ اللّٰہِ تَعَالیٰ. (۱۳)

(ہر مرض کی دوا ہے جب دوا لگ جاتی ہے تو اللہ کے حکم سے صحت ہو جاتی ہے)

اسی لیے فقہا نے لکھا ہے کہ صحت کی بحالی کے لیے دوا کرنا مباح ہے، بشرطیکہ اعتقاد یہ ہو کہ شفا دینے والا اللہ ہے اور صرف یہ اعتقاد ہو کہ دوا ہی شافی ہے تو جائز نہیں ہے۔ (۱۴)

معالج کا جان کار ہونا ضروری ہے:

اسلام نے صحت کی حفاظت کیلئے تجربہ کار اور علم رکھنے والے ڈاکٹروں سے رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیوں کہ حاذق طبیب ہی مریض کی صحت کو اچھی دوا کے ذریعہ بروقت بحال کر سکتا ہے اور وہ یہ رائے دے سکتا ہے کہ کون سی چیز اس کو تندرست رکھنے میں مفید ہو سکتی ہے اور کون سی غیر مفید۔ چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے جس کے راوی حضرت سعد رضی اللہ عنہ ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں بیمار ہوا تو اللہ کے رسول ﷺ عیادت کے لیے تشریف لائے، میرے سینہ پر دست مبارک رکھا، میں نے اپنے قلب کے اندر اس کی ٹھنڈک محسوس کی۔ آپ نے فرمایا: تمہیں دل کی شکایت ہے تم قبیلہ ثقیف کے حارث بن کلدہ کے پاس جاؤ وہ اس مرض کا علاج کرتا ہے۔ اس تکلیف میں آدمی کو مدینہ کے سات اچھی قسم کے چھوہارے گٹھلیوں سمیت کٹوا کر پھانکتے رہنا چاہیے۔ (۱۵)

آپ ﷺ نے نہ صرف جان کار اور تجربہ کار ڈاکٹروں سے دوا علاج کرنے کا حکم دیا بلکہ ساتھ ہی آپ نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ ناواقف اور نا تجربہ کار طبیب سے علاج نہیں کرانا چاہیے، اس

سے نہ صرف صحت خراب ہوتی ہے بلکہ جان کے ہلاک ہونے کا پورا پورا خطرہ رہتا ہے۔اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ نے ناواقف ڈاکٹروں کو بھی خبردار کیا ہے کہ بغیر صحیح جان کاری کے کسی کا علاج نہیں کرنا چاہیے:

مَنْ تَطَبَّبَ وَلَا يُعْلَمُ مِنْهُ طِبٌّ فَهُوَ ضَامِنٌ. (۱۶)

(طب کو اچھی طرح نہ جاننے کے باوجود جس نے علاج کیا اوراس سلسلہ میں وہ متعارف نہیں تھا تو وہ کسی بھی نقصان کا ضامن ہوگا)

ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

أَيُّمَا طَبِيبٌ تَطَبَّبَ عَلٰى قَوْمٍ لَّا يُعْرَفُ لَهُ تَطَبُّب قَبْلَ ذٰلِكَ فَأَعْنَتَ فَهُوَ ضَامِنٌ.(۱۷)

(جس شخص کا پہلے سے طبیب ہونا معلوم نہیں تھا،اس نے لوگوں کا بہ تکلف علاج کیا اور نقصان پہنچایا تو وہ ضامن ہوگا)

چند مستثنیات کے ماسوا ہر بیماری کا علاج بندہ کے اختیار میں ہے:

علاج کے بعد بھی بعض بیماریاں ایسی ہیں جن کا کوئی علاج نہیں۔اس میں ایک موت ہے اور دوسرا بڑھاپا۔موت کسی کی واقع ہونے والی ہے تو کتنی ہی احتیاطی تدابیر اختیار کیوں نہ کرلی جائیں اسے کوئی روک نہیں سکتا اور وہ وقت معینہ پرآ کر رہے گی۔اسی طرح بڑھاپے کو بھی کوئی دوا ٹال نہیں سکتی، کیوں کہ بڑھاپا طاری ہی اسی لیے ہوتا ہے کہ اب اس کا کام اس دنیا سے ختم ہوگیا اس لیے اسے بڑھاپے کی منزل میں پہنچادیا گیا جس میں وہ کچھ دن مبتلا رہ کراس دنیا سے رخصت ہوجائے گا۔چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

تداووا عباد اللّٰه فان اللّٰه عزوجل لم ينزل داء الا انزل معه شفاء الا موت والهرم. (۱۸)

(اللہ کے بندو! علاج کراؤ اس لیے کہ اللہ عزوجل نے موت اور بڑھاپے کے سوا جو بھی بیماری اتاری ہے اس کے لیے شفا بھی رکھی ہے)

ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ ہر بیماری کا علاج اللہ نے پیدا کیا ہے مگر بڑھاپے کا کوئی علاج نہیں:

"تَدَاوَوْ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَمْ يَضَعْ دَاءً لَا وَضَعَ لَهُ شِفَاءً غير او قال دواءً الا داءً واحدًا فقالوا يا رسول الله ﷺ وما هو؟ قال الهرم."(۱۹)

کیا انسان نے بعض بیماری کے علاج میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے؟

باوجود اس کے بعض بیماریاں ایسی ہیں جن کا علاج اطبا ڈھونڈھنے میں اب تک ناکام ہیں۔ یہ انسانوں کی کم علمی ہے نہ کہ خالق کائنات کا نقص۔ اسی لیے تو قرآن میں متعدد مقام پر اہل ایمان کو مخاطب کیا گیا ہے کہ تم کائنات کی تخلیق پر غور نہیں کرتے، تم اشیا کے رموز وحقائق کے جاننے کی کوشش کیوں نہیں کرتے، تمھیں اتنا شعور کیوں نہیں کہ تم نامعلوم چیزوں کا علم حاصل کرلو۔

دنیا نے دیکھا ہے کہ انسان جن نامعلوم چیزوں کے جاننے کی کوشش برابر کرتے رہے انھیں اس میں کامیابی مل گئی۔ کینسر جو کسی زمانے میں لاعلاج بیماری تصور کیا جاتا تھا آج اطبا نے اس کا کلی علاج تو نہیں البتہ اس کے انسداد کا حل کافی حد تک تلاش کرلیا ہے۔ سیکڑوں مریض دوا کے سہارے آج زندہ ہیں چہ جائے کہ ان کی جان کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ ان کا عرصہ حیات تنگ نہیں ہوا ہے۔ اگر بیماری پہلے اور دوسرے مرحلے ہی میں تھی اور بروقت اس کا علاج شروع کردیا گیا تو یہ بیماری بھی ختم ہوجاتی ہے۔ خود اللہ کے رسول ﷺ کو اس بات کا اندازہ تھا کہ بعض بیماریوں کا علاج ابھی انسان کی دسترس سے باہر ہے، لہٰذا آپ نے لوگوں کو اس میں کامیابی حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُنْزِلْ دَاءً إِلَّا أَنْزَلَ لَهُ شِفَاءً عَلِمَهُ مَنْ عَلِمَهُ وَجَهِلَهُ مَنْ جَهِلَهُ. (۲۰)

(اللہ نے کوئی بیماری نہیں اتاری مگر یہ کہ اس کی شفا بھی اتاری ہے، جاننے والا اسے جانتا ہے، نہیں جاننے والا نہیں جانتا۔)

حالات اور وقت کے ساتھ آدمی کی ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ پہلے طب میں وہ سہولتیں نہیں تھیں جو آج کے زمانے میں ہیں اور آئندہ بھی مزید سہولتیں فراہم ہوں گی (انشاء اللہ) جو مریض اور طبیب کے لیے تقویت کا باعث ہوں گی۔ چنانچہ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ:

وفی قوله ﷺ لكل داء دواء، تقوية لنفس المريض والطبيب وحث على طلب ذلك الدواء والتفتيش عليه، فان المريض اذا استشعرت نفسه ان لدائه دواءً يزيله تعلق قلبه بروح الرجاء، وبرد من حرارة الباس والفتح له باب الرجاء ومتى قويت نفسه انبعثت حرارته العزيزية وكان ذلك سببا لقوة الارواح الحيوانية والنفسانيه والطبييعية ومتى قويت هذه الارواح قويت القوى التى هى حاملة لها فقهرت المرض عرفعته ولذلك الطب اذا علم ان لهذا الداء دواءً امكنه طلبه والتفتيش عليه."(۲۱)

(رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کل داء دواء مریض اور طبیب دونوں کے لیے تقویت کا باعث ہے۔ اس میں علاج کے تلاش کی ترغیب بھی ہے۔ اگر مریض کو یہ محسوس ہو کہ اس کا مرض لاعلاج نہیں ہے بلکہ اس کا علاج ممکن ہے تو اس کا دل امید سے بھر جائے گا اور مایوسی ختم ہو جائے گی۔ اس سے وہ اپنے اندر نفسیاتی طور پر مرض پر غالب آنے والی توانائی محسوس کرے گا۔ اسی طرح طبیب کو جب معلوم ہوگا کہ ہر بیماری کی اللہ نے دوا رکھی ہے تو تلاش وجستجو اس کے لیے ممکن ہوگی)

عیادت سے مریض کی صحت کو تقویت ملتی ہے:

یہیں سے عیادت کی شرعی حیثیت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب کوئی مسلمان کسی مصیبت اور بیماری میں مبتلا ہو تو دوسرے بھائی کو چاہیے کہ وہ اس کی عیادت کے لیے پہنچے اور مریض کو تسلی بخش باتیں سنا کر لوٹے۔ اس سے مریض کی صحت پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس کے اندر سے مایوسی ختم ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری دیکھ بھال کرنے والے بہت سارے لوگ ہیں۔ کبھی کبھی یہ خیر خواہی مریض کے حق میں اتنی مفید ہوتی ہے کہ دوا بھی اس کا بدل نہیں ہوتی اور بیمار باتوں باتوں میں اچھا ہو جاتا ہے اور بستر مرض سے اٹھ کر چلنے پھرنے لگتا ہے۔ ایسا کرنے سے نہ صرف مریض کے حق میں فائدہ ہوتا ہے بلکہ عیادت کے لیے جانے والے شخص کو بھی اللہ تعالیٰ ڈھیر ساری نیکیوں سے نوازتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ:

مـامن مسلم یعود مسلما غدوةً الا صلی علیه سبعون الف ملك حتی یُمسی وان عاد عشیة الا صَلّٰی علیه سبعون الف ملك حتی یصبح وکان له خریف فی الجنة۔(۲۲)

(جو مسلمان بھی کسی مسلمان کی صبح کے وقت عیادت کرتا ہے تو ستر ہزار فرشتے شام تک اس پر رحمت کی دعا بھیجتے ہیں۔ اگر وہ شام کے وقت اس کی عیادت کرتا ہے تو ستر ہزار فرشتے صبح تک اس پر رحمت کی دعا بھیجتے ہیں اور جنت میں اس کے لیے پھل ہوں گے)

ایک دوسری حدیث میں ہے:

اِنَّ الْمُسْلِمَ اِذَا عَادَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ لَمْ یَزَلْ فِی خُرْفَةِ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَرْجِعُ(۲۳)

(بے شک مسلمان جب اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو اس کے وہاں سے واپس ہونے تک وہ جنت کے پھلوں میں رہتا ہے۔)

عیادت نہ صرف یہ کہ اپنے قریب ترین رشتہ دار کی کی جائے بلکہ اس کے مستحق سارے لوگ ہیں۔ بچہ، بوڑھا، جوان، عورت، مرد، پڑوسی، یہاں تک کہ غیر مسلموں کی بھی کی جانی چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا اس پر کثرت سے عمل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو تاکید کے ساتھ فرمایا:

اَطْعِمُوا الْجَائِعَ وَعُوْدُوا الْمَرِيْضَ وَفَكُّوا الْعَانِيَ. (۲۴)

(بھوکے کو کھانا کھلاؤ، مریض کی عیادت کرو، اور قیدی کو چھڑاؤ)

بیماری سے گناہ کم ہوتے ہیں:

تندرستی کے برقرار رہنے کے لیے ضروری ہے کہ انسانوں کا واسطہ چھوٹی موٹی بیماری سے پڑتا رہے، تاکہ اس کے جسم سے غیر ضروری اجزا اور فضلات کا اخراج ہوتا رہے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ گناہ کم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ جس بندے سے خفا ہوتا ہے تو اسے بیماری میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ بندہ نے جو گناہ کیا ہے اس کی مدافعت ہو جائے۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

مَا مِنْ مُصِيْبَةٍ تُصِيْبُ الْمُسْلِمَ اِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا عَنْهُ حَتّٰى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا بِهَا(۲۵)

(مسلمانوں کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے یہاں تک کہ اسے کوئی کانٹا بھی چبھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے)

اگر کسی مومن بندے کو یہ اندازہ ہو جائے کہ بیماری اور مصیبت کے ذریعہ اسے کتنا بڑا فائدہ پہنچنے والا ہے تو وہ یہی چاہے گا کہ ہمیشہ بیماری میں مبتلا رہے۔ جیسا کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا:

يَوَدُّ اهل العافية يوم القيامة حين يُعْطى اهلُ البلاء الثواب لَوْ اَنَّ جُلُوْدَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فى الدنيا بالمقاريض. (۲۶)

(جو لوگ عافیت میں ہیں، قیامت کے دن جب کہ مصیبت زدوں کو ثواب دیا جائے گا، یہ چاہیں گے کاش! دنیا میں قینچیوں سے ان کی کھالوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاتے)

ایک دوسری حدیث میں بیماری کو مسلمانوں کے لیے ایک نعمت اور اس کے گناہوں کا کفارہ قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا:

مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُصِيْبُهُ اَذًى شَوْكَةٌ فَمَا فَوْقَهَا اِلَّا كَفَّرَ اللّٰهُ بِهَا سَيِّئَاتِهِ كما تَحُطُّ

الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا. (۲۷)

(جس مسلمان کو کانٹا چبھنے کی یا اس سے بڑی کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کی غلطیوں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جیسے درخت اپنے پتوں کو گرا دیتا ہے)

علامہ ابن قیم نے بیماری کو مومنین کے لیے گناہوں کا کفارہ قرار دینے کے بعد شیخ عبدالقادر جیلانی کی اس نصیحت کو نقل کیا ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے کو کی تھی کہ مصیبت اور پریشانیوں میں مبتلا ہونے کے بعد رنجیدہ خاطر نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے خدا کا عطیہ اور نعمت تصور کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالقادر نے فرمایا اے میرے بیٹے مصیبت تجھے ہلاک کرنے کے لیے نہیں آتی بلکہ تیرے صبر و ایمان کا امتحان لینے آتی ہے۔ نیز اس کا علاج یہ بھی ہے کہ تو سوچے کہ اگر دنیا میں مصائب و محن نہ ہوتے تو بندے عجب و فرعونیت، شقاوت قلبی جیسے امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جن سے آدمی دنیا میں اور آخرت میں ہر جگہ تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے یہ تو ارحم الراحمین کا کمال رحمت ہے کہ بعض اوقات وہ مصائب کی دوا استعمال کرا دیتا ہے جن کے باعث امراض سے تحفظ رہتا ہے اور صحت عبدیت قائم رہتی ہے۔ نیز کفر و عدوان و شرک وغیرہ کے فاسد مادوں کا استفراغ جاری رہتا ہے۔ بس پاک ہے وہ ذات جو ابتلا کے ذریعہ رحم فرماتی ہے اور انعامات کے ذریعہ ابتلا میں ڈال دیتی ہے، جیسا کہ مشہور شعر ہے:

قد ینعم اللّٰہ بالبلوی وان عظمت ویبتلی اللّٰہ بعض القوم بالنعم

(یعنی گاہے گاہے اللہ تعالیٰ مصائب کے ذریعہ انعام فرماتا ہے، اگرچہ وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں، اللہ تعالیٰ بعض اقوام پر انعام کر کے انہیں ابتلا میں ڈال دیتا ہے۔) (۲۸)

بیماری میں صبر کی اہمیت:

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے جس بندے سے زیادہ محبت کرتا ہے اسے اتنی ہی بڑی ابتلا و آزمائش میں بھی مبتلا کرتا ہے تاکہ اندازہ لگائے کہ میرے بندہ کا مصیبت میں کیا رویہ رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔'' (۲۹) اس طرح کی اور دوسری

احادیث ہیں جن سے اسی مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں مومن بندے کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہر حال میں صبر کرے اور اسے اپنی تکالیف کا مداوا تصور کرے۔ اگر وہ ناشکری اور جزع وفزع کرتا ہے تو وہ اپنی تکلیف میں اضافہ ہی کرتا ہے کیوں کہ صبر سے تکالیف میں برداشت کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور اس سے قوت ارادی مضبوط ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ. وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ. وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ. الَّذِیْنَ اِذَا اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ. اُولٰئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ وَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ. (البقرہ:۱۵۳-۱۵۷)

(اے ایمان والو! مدطلب کرو صبر اور نماز کے ذریعہ، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، جو لوگ اللہ کے راستے میں مارے جائیں انہیں مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے۔ ہم ضرور تمہیں کسی قدر خوف اور بھوک کے ذریعہ اور مالوں، جانوروں اور پھلوں میں کمی کرکے آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنادو جن پر اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف جانا ہے۔ ایسے ہی لوگوں پر ان کے رب کی عنایات ہیں اور رحمت ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں)

بعض صحابہ کرام بیماری میں مبتلا ہوتے تو وہ دوا علاج ترک کردیتے اور صبر وشکر کو ہی اس کا مداوا سمجھتے تھے جس کی اللہ کے رسول نے ممانعت کی اور فرمایا کہ صحت کو تندرست رکھنے کے لیے دوا بھی ضروری ہے اور صبر بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک عورت مرگی کی بیماری میں مبتلا تھی جب اس پر دورہ پڑتا تو اسے کپڑوں کی خبر نہ رہتی اور وہ بے ستر ہوجاتی تھی۔ اس نے اللہ کے رسول ﷺ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم چاہو تو دعا کروں اور چاہو تو صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ اس کے عوض جنت عطا فرمائے گا۔ اس پر اس نے کہا تب تو میں صبر کروں گی۔ البتہ آپ دعاء فرمائیے کہ دورہ کی حالت میں میری بے ستری نہ ہو۔ آپ نے اس کی دعا فرمائی(۳۰) اس عالم پریشانی میں جو بندہ صبر کرتا ہے اللہ کے نزدیک اس کا مقام بہت بلند ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاسَاءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاسِ. اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰئِکَ ھُمُ

اُلْمُتَّقُوْنَ. (البقرہ:۱۷۷)

(وہ لوگ جو صبر کرتے ہیں تنگی ترشی اور تکلیف میں اور جنگ کے وقت، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں)

صبر وشکر کو مومن کا خاص وصف قرار دیتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''مومن کا معاملہ کتنا اچھا ہے کہ وہ جس حال میں بھی ہوتا ہے وہ اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے، یہ بات مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتی، اگر وہ مسرت سے ہم کنار ہوتو شکر کرتا ہے، یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے، اگر تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے، یہ بھی اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔'' (۳۱)

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں، نبیوں اور نیک بندوں کو بڑی مشکلات، سخت سے سخت بیماری اور آزمائش میں مبتلا کر کے ان کے صبر کا امتحان لیا ہے، مگر وہ ہر حال میں صبر کرتے رہے جس کے صلے میں اللہ نے ان کے مرتبہ کو بلند فرمایا۔ صبر ایوب سے کون واقف نہیں ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام مہلک ترین بیماری میں ایک لمبے عرصہ تک مبتلا رہے، پھر بھی انھوں نے صبر کے علاوہ لفظ شکوہ اپنی زبان پر کبھی آنے نہیں دیا۔ اس بیماری میں ان کے تمام قریبی لوگ ساتھ چھوڑ گئے مگر ان کی بیوی ۱۸ سال تک خدمت کرتی رہیں۔ ان کی تکلیف کی شدت کی وجہ سے بعضے وقت ان کی بیوی بھی کرب والم میں مبتلا ہوجاتی تھیں۔ ایک دن بہ جذبہ ہمدردی ان کی بیوی نے کچھ ایسے الفاظ کہے جو صبر ایوب کے منافی تھا اور خدا کی جناب میں شکوہ کا پہلو لیے ہوئے تھا، اس پر وہ اپنی مونس وغم خوار بیوی سے ناراض ہوگئے اور کہا کہ تم نے کفران نعمت کی ہے اس کی سزا میں تم کو ضرور دوں گا۔ (۳۲) اس صبر کے صلہ میں اللہ نے ان کے درجات بلند کیے جس کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے:

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ، فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ.

(انبیا:۸۳-۸۴)

(اور یاد کرو جب ایوب نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے۔ ہم نے اس کی پکار سنی اور اسے جو تکلیف تھی وہ دور کردی۔ ہم نے اسے اس کے اہل وعیال دیئے اور اس کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیئے۔ یہ رحمت ہے ہماری طرف سے اور عبادت کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے)

صبر کے ذریعہ نہ صرف دینوی واخروی درجات بلند ہوتے ہیں بلکہ اس سے مریض کی صحت پر بھی مثبت اثرات پڑتے ہیں۔ کیوں کہ جو آدمی بیماری کی حالت میں صبر کرے گا اسے اپنی تکلیف کا بوجھ ہلکا معلوم ہوگا اور اس کی امیدیں اور نیک خواہشات برآئیں گی۔ چنانچہ دوران بیماری صبر کی افادیت اور اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا جلال الدین عمری لکھتے ہیں:

''مرض چھوٹا ہو یا بڑا، قابل علاج ہو یا لاعلاج ہر حال میں اسلام نے صبر کی تعلیم دی ہے۔ جو لوگ مذہبی اقدار کی اہمیت نہیں محسوس کرتے ان کے نزدیک یہ ایک بے معنی نصیحت ہے۔ اس سے انسان کے مسائل حل نہیں ہوتے اور وہ ممکنہ تدابیر بھی اختیار نہیں کرتا، لیکن یہ صبر کا غلط تصور ہے۔ صبر اس بات کا نام ہے کہ آدمی مشکلات میں جزع فزع اور گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کرے، شکوہ شکایت کی جگہ جم کر ان کا مقابلہ کرے، جو تدبیریں اس کے بس میں ہوں ان کو پورے سکون کے ساتھ اختیار کرے اور نتیجہ اللہ کے حوالے کردے۔ اس سے انسان کی قوت ارادی (Will Power) مضبوط ہوتی ہے اور آدمی کے اندر خوداعتمادی اور خدااعتمادی پیدا ہوتی ہے، مریض کے اندر مضبوط قوت ارادی ہو تو وہ مرض کا بڑی ہمت اور پامردی سے مقابلہ کرسکتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک واقعہ ہے کہ جن مریضوں کی قوت ارادی مستحکم ہوتی ہے وہ مایوس اور بے صبر مریضوں کے مقابلہ میں لمبی زندگی پاتے ہیں''۔ (۳۳)

موت کی دعا نہیں کرنی چاہیے:

ہر انسان کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہے۔ بعض بیماری قابل علاج ہوتی ہے تو کوئی لاعلاج اور زندگی بھر وہ کرب والم کی دنیا میں زندہ رہتا ہے، ایسی حالت میں وہ چاہتا ہے کہ اس لاعلاج بیماری اور تکلیف بھری دنیا سے کسی طرح نجات پالے جس کے لیے وہ بعضے وقت دعا کرتا ہے کہ اللہ تو مجھ کو اس تکلیف دہ زندگی سے نکال کر موت دے دے، جو درست نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بیماری اسی لیے طاری کرتا ہے کہ اس کے اندر قوت برداشت کا داعیہ پیدا ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایسی دعا کرنے سے منع فرمایا ہے:

لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ مِنْ ضُرٍّ اَصَابَهٗ فَاِنْ كَانَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَلْيَقُلِ اللّٰهُمَّ اَحْسِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِيْ. (۳۴)

(تم میں سے کوئی شخص کسی تکلیف کو پہنچے تو موت کی تمنا نہ کرے، اگر کسی وجہ سے

بالکل ضروری ہوجائے تو اس طرح کہے اے اللہ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک کہ زندہ رہنا میرے حق میں بہتر ہو اور جب موت میرے حق میں بہتر ہے تو موت دے دے)

مصائب ومشکلات اور بیماری تو وقتی چیز ہے۔ یہ کبھی جلد رفع ہوجاتی ہے اور کبھی وقت لگتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی اسکا مقابلہ نہ کرے۔ اللہ نے انسان کو دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے اور اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے تو پھر کیوں نہ اس کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ بزدلی ہے اور مومن کے شان کے خلاف ہے اور کفران نعمت ہے۔ اندازہ لگائیے کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں بعض بیماری کا بہتر علاج گرم لوہے سے داغنے کا تھا۔ جس کی تکلیف سے آدمی کی ہڈی چرمراجاتی تھی باوجود اس تکلیف کے وہ زندہ رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کو بطور علاج گرم لوہے سے سات داغ لگائے گئے، اس سے انہیں سخت تکلیف ہوئی باوجود اس کے انھوں نے فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے موت کی دعا کرنے سے منع فرمایا ہے ورنہ تکلیف اتنی سخت ہے کہ میں اللہ سے موت کی دعاء کرتا۔ "نَهَانَا اَنْ نَدْعُوَ بِالْمَوْتِ لِدَعَوْتُ بِهِ" (۳۵)

یہ تو صحابہ کا عمل تھا، خود اللہ کے رسول ﷺ کو لوہے سے داغنے کی تکلیف کا اندازہ تھا۔ باوجود اس کے آپ نے حفظان صحت کے تحت اس کی اجازت دی کہ تم اس طریقہ پر عمل کر کے اپنا علاج کراؤ۔ جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

اَلشِّفَاءُ فِی الثَّلَاثَةِ شَرْبَةِ عَسَلٍ وَشَرْطَةِ مَحْجَمٍ وَكَيَّةِ نَارٍ وَاَنْهٰى اُمَّتِىْ عَنِ الْكَىِّ. (۳۶)

(شفا تین چیزوں میں ہے، شہد کا گھونٹ، پچھنے کا نشان اور آگ سے داغ لگانے میں۔ میں اپنی امت کو داغ لگانے سے منع کرتا ہوں)

کون انسان کب تک زندہ رہے گا اور کب اس کی موت ہوگی یہ اللہ ہی جانتا ہے اور زندگی اور موت دینے کا حق بھی اسی اللہ کو ہے۔ انسان کے بس میں اگر یہ چیز ہوتی تو دنیا کا نظام درہم برہم ہوکر رہ جاتا۔ انسان کا دنیا میں زندہ رہنا بھی تقویت اور ترقی درجات کا باعث ہے۔ اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا کہ موت کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اگر وہ نیک ہے تو امید ہے کہ اس سے اس کی نیکی میں اضافہ ہوگا اور اگر برا ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ اس سے تائب ہوجائے: "وَلَا يَتَمَنَّنَ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ اِمَّا مُحْسِنًا فَلَعَلَّهُ اَنْ يَزْدَادَ خَيْرًا وَاِمَّا مُسِيْئًا فَلَعَلَّهُ اَنْ يَسْتَعْتِبَ" (۳۷)

(باقی آئندہ)

دعوت دین - ایک اہم فریضہ

از: محمد مونس قاسمی
قصبہ محمدی ضلع لکھیم پور، یوپی

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو امت دعوت بنا کر بھیجا اور اس کا خاص وصف یہ قرار دیا کہ وہ انسانیت کو سیدھے راستہ کی طرف بلائے، چنانچہ ارشاد ہوا: ”کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر“ تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہو، تم بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہو۔ نیز فرمایا: ”وَکذلك جعلناکم امة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیدا“ اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی و معیاری امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ (اور ان پر نظر رکھنے والے) ہو اور رسول اللہ ﷺ تم پر گواہ ہوں۔

چنانچہ یہ ایک معتدل اور معیاری اور لوگوں کی گواہ اور ان پر نظر رکھنے والی امت ہے، دیگر انسانی گروہوں پر نظر رکھنے اور ان کی غلط کاریوں کی نشاندہی کرنے والی امت ہے۔ جب اس کو یہ منصب دیا گیا ہے تو اس کا فرض بنتا ہے کہ اس منصب کا حق ادا کرے۔

دعوت اسلامی کے تناظر میں اگر ہم ہندوستان کا جائزہ لیں تو یہاں دعوت کے امکانات دوسرے خطوں کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔ اس کی چند وجوہ ہیں:

الف: ہندوستان کی مٹی میں حد درجہ جذبہ احسان مندی پایا جاتا ہے۔ خصوصاً ہمارے برادرانِ وطن ہندو قوم کے اندر یہ جذبۂ احسان مندی اس درجہ موجود ہے کہ یہ قوم اپنے محسن اور بہی خواہ کے سامنے ماتھا ٹھیک کر جذبۂ منت شناسی کے غلو میں اس کی پوجا کرنے لگتی ہے۔

ب: اسی ملک کی مٹی میں مذہب سے والہانہ تعلق اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے اور مذہب پر قربان ہونے کا جذبہ حد درجہ اس ملک کے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ انسان مذہب کے تئیں قربانی خدا کی خوشنودی کے لیے دیتا ہے۔ اگر اس قوم کے لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ شرک اور

بت پرستی کا یہ راستہ جس کے لیے آپ قربانی دے رہے ہیں، غلط بلکہ اللہ تعالیٰ کو انتہا درجہ ناراض کرنے والا ہے، اللہ کو راضی کرنے کی راہ صرف اسلام ہے، تو یہ قوم اسلام کے لیے کہیں زیادہ قربانی دینے کو تیار ہو جاتی ہے۔

ج: اس ملک کے خمیر میں روحانیت رچی بسی ہے اور اسلام کی حقانیت اور روحانیت کا تعارف اس قوم کے لیے بڑا پرکشش ہوتا ہے۔

د: ایک بڑا اہم پہلو یہ ہے کہ برادرانِ وطن ہندو قوم میں اکثر افراد محض رسمی ہندو ہیں اور شعوری ہندو اس ملک میں برائے نام ہیں۔ چنانچہ جناب مولانا کلیم صدیقی صاحب (مشہور داعی و مبلغ) بیان فرماتے ہیں کہ ''راقم سطور سے ہندوستان میں ہندو قوم کی مرکزی مذہبی کتابوں، ویدوں پر سند سمجھے جانے والی شخصیت جناب پنڈت راجندر پرشاد شرما نے بڑی ذمہ داری سے یہ بیان کیا کہ ہمارے ملک میں دسیوں ہزار میں سے کوئی ایک آدھ ہندو اپنی مرکزی مذہبی کتاب ویدوں کے درشن کر پاتا ہے اور لاکھوں میں ایک، دو ویدوں کا پاٹھ کر پاتے ہیں اور اخیر میں بڑے اعتماد کے ساتھ یہ بات بتائی کہ پورے ملک میں جہاں ایک ارب کی آبادی ہے ایک سو سے زیادہ ویدوں کو سمجھنے والے لوگ نہیں ہیں، گویا ایک کروڑ میں ایک ویدوں کو سمجھنے والا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ سچی بات یہ ہے کہ شعوری طور پر کوئی ہندو رہ بھی نہیں سکتا۔ (اور کیوں نہ ہو جبکہ یجر وید جیسی قدیم کتاب میں اس طرح کے منتر موجود ہیں کہ ''خدا کی مورت و شکل نہیں ہے۔'' یجر وید ۳-۳۲، بحوالہ ہندوازم) اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس قوم کا اپنے مذہب سے تعلق بہت رسمی ہے، اس لیے اس قوم میں دعوت کا کام بہت آسان ہے۔'' (افکار، اگست ۲۰۰۷ء)

دعوتی عمل کا کوئی متعین طریقہ نہیں۔ یہ داعی کی اپنی صواب دید پر ہوتا ہے کہ حکمت و موعظت حسنہ کے ساتھ کس مزاج و ماحول میں کیا طریقۂ کار مفید ہوگا۔ تاہم بطور نمونہ چند امور پیش ہیں:

❁ داعی کے لیے پہلا قدم مدعو سے تعارف اور دوستی ہے۔ تعارف حاصل کرنا آسان بھی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں جن برادرانِ وطن سے ملنا جلنا ہوتا ہے ان میں سے دو تین افراد کا انتخاب کر لیا جائے، مثلاً پڑوس یا محلّہ میں یا سفر کے دوران یا کسی تقریب اور پروگرام میں ملاقات ہوتی ہو وغیرہ۔

ابتدائی تعارف میں داعی اور مدعو کے درمیان نام ورہائش، تعلیم، پیشہ، گھر اور خاندان سے متعلق موٹی موٹی تفصیلات پر مشتمل معلومات کا تبادلہ خیال آپس میں ہوسکتا ہے۔ داعی ملاقاتوں و روابط کے اس سلسلہ کو جاری رکھے۔ ابتداء میں اگر اسلام پر راست گفتگو نہ ہوسکے تو کوئی حرج نہیں ہے ایسی ملاقاتیں اور روابط بے کار ثابت نہ ہوں گے۔ دراصل مسلمانوں اور برادران وطن کے درمیان جو دوری اور خلیج پائی جاتی ہے اسے دور کرنے کے لیے اس طرح کے روابط ضروری ہیں۔

❁ اس دوران دعوتی گفتگو یا مطالعہ کے لیے مختصر کتابچے وغیرہ دیے جاسکتے ہیں۔ گفتگو زیادہ تر اصولی باتوں پر مرکوز ہونی چاہیے۔ قرآن نے مدعوئین سے گفتگو کے سلسلہ میں ایک اہم رہنمائی کلمہ مشترک کی تلاش اور اس پر گفتگو کرنے کے بارے میں دی ہے۔ مثلاً مدعو خدا کو مانتا ہے۔ داعی اس نکتہ پر گفتگو کرکے اسلام کے تصورتوحید، ایمان باللہ اور اس کے عملی تقاضوں کو حکمت کے ساتھ پیش کرے۔

❁ دعوت پہنچانے کے بعد نتیجہ دیکھنے کے لیے داعی کو جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ روابط کا سلسلہ برقرار اور اسلام پر گفتگو جاری رکھے۔ پیش کش اور برتاؤ میں نرمی اور محبت کا غلبہ ہونا چاہیے۔

❁ مدعو جب اسلام کا کچھ مطالعہ کرلے تو عملی تعلیم و تجربہ کے طور پر دو چار دفعہ اپنے ساتھ مسجد لے کر جائیں، تاکہ عبادات کی عملی شکل و کیفیت اس کے سامنے آئے۔ علاوہ ازیں دعوتی پروگراموں مثلاً درس قرآن اور خطابات عام وغیرہ میں برادرانِ وطن کو بھی شریک کرایا جاسکتا ہے۔ ابتدائی دعوتی کتب کے مطالعہ کے بعد قرآن مجید کا ۳۰ واں پارہ مترجم دینا مناسب ہوگا۔ مدعوئین کسی دوسرے شہر میں رہتے ہوں تو ڈاک سے کتابچے وغیرہ روانہ کیے جاسکتے ہیں۔ خط وکتابت سے بھی دعوتی ربط پیدا کیا جاسکتا ہے۔

دعوت کے اجتماعی طریقے:

انفرادی دعوت کے علاوہ اجتماعی طور پر چند مسلمان بھائی مل جل کر بھی دعوت کا کام کرسکتے ہیں۔ ذیل میں بعض اجتماعی دعوتی پروگراموں کو درج کیا گیا ہے جو دعوت پہنچانے کے لیے مؤثر ثابت ہوسکتے ہیں۔

❁ ایک چھوٹا سا وفد بنا کر بنیادی دعوتی کتب وغیرہ کے ساتھ اپنے علاقہ کی منتخب غیر مسلم شخصیتوں سے ملاقاتیں کی جاسکتی ہیں۔ ماہ ڈیڑھ ماہ بعد دوسری باران شخصیتوں سے ملنا چاہیے اور

کتابوں پر ان کے تاثرات، سوالات اور الجھنوں کو معلوم کرنا چاہیے اور جواب دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

❁ مظلوم اور پسماندہ طبقات پر آئے دن ظلم وستم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کا وفد ان تک پہنچ کر اظہارِ ہمدردی کرے ان کے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش اور تعاون کرنے کی سعی کرے۔

❁ کسی آبادی یا بڑے شہر کے ایک ایریا میں مسلمان مل جل کر برادرانِ وطن کے لیے عید ملن کا پروگرام منعقد کریں، مختصراً قرآن مجید، رمضان، روزہ اور عید پر اظہار خیال کے بعد شرکاء کی ضیافت کریں اور تعارفی کتابچے وغیرہ انھیں دیں۔

❁ برادرانِ وطن کے کسی منتخب علاقہ (بالخصوص دلت طبقہ) میں اسلامی کتابوں اور رسالوں پر مشتمل لائبریری کا نظم کیا جانا چاہیے۔

❁ کسی مقام پر منتخب برادرانِ وطن کے لیے اجتماعی محفل منعقد کی جاسکتی ہے۔ ۵ تا دس افراد کے اس پروگرام میں قرآن اور پیغمبر اسلام کا تعارف اور اسلام کی دعوت مختصراً پیش کی جاسکتی ہے۔ سوالات کے جوابات دیے جائیں۔ شرکاء کو دعوتی لٹریچر بھی دیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ پروگراموں کو ایک مرتبہ کرکے چھوڑ نہیں دینا چاہیے بلکہ یہ سلسلہ مستقل طور پر چلتا رہے۔ داعی کو جزئیات اور طویل گفتگو سے بچتے ہوئے اصولی باتوں تک اپنی گفتگو کو مرکوز رکھنا چاہیے۔

❁ داعی اپنے مدعو کی ذاتی زندگی، اس کے مسائل اور پریشانیوں میں دلچسپی لے کر مشورہ دے۔ تعاون کرے اور ہمدردی وغم گساری کا رویہ اختیار کرے تو اس کے بہت گہرے اثرات پڑتے ہیں۔

داعی کی تیاری:

دعوتی کام کے لیے سب سے پہلے خود اپنی علمی، فکری اور عملی تیاری ناگزیر ہے۔ داعی اپنے مدعو کے سامنے بہتر سے بہتر عملی کردار پیش کرے۔ علمی تیاری کے لیے قرآن وتفسیر میں غور وتدبر کے ساتھ منتخب احادیث، سیرت رسول ﷺ اور سیرت صحابہؓ کا مطالعہ کرے اور سیرت کے بعض اہم واقعات کو نوٹ کرے، مثلاً رسول اللہ ﷺ کی رحم دلی، انسانوں سے محبت، سادہ زندگی، عفو ودرگذر (فتح مکہ کے

موقع پر دشمنوں کو معاف کردینا) ان واقعات سے برادرانِ وطن بے حد متاثر ہوتے ہیں۔

چند امور سے اجتناب:

❁ دعوت اور داعی کے وقار کو نقصان پہنچانے والا رویہ اختیار نہ کرے۔

❁ مناظرانہ انداز اور بحث وتکرار سے ہر حال میں گریز کرے۔

❁ غیر حکیمانہ انداز اور مدعو پر کسی بات کو مسلط کرنے کا انداز نہیں ہونا چاہیے۔ مدعو کے اندر ہٹ دھرمی، ضد اور نفرت نہ پیدا ہونے دے۔

❁ جلد بازی اور فوری نتیجہ پانے کے لیے مدعو پر اصرار نہ کرے۔ گفتگو اصولی باتوں پر پہلے کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح اختلافی باتوں کو بنیاد بنا کر دعوت پیش نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن مجید کی روشنی میں کلمہ سواء یعنی مشترک بنیادیں مثلاً ایک اللہ کا تصور وغیرہ پر گفتگو کرنا چاہیے۔ وجود الٰہ سے آگے بڑھ کر عملی تقاضے اور زندگی پر اثرات ونتائج سمجھانا چاہیے۔

آج زمینی صورت حال یہ ہے کہ اس اہم شعبہ کی طرف بہت کم توجہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل دین وعلم حضرات اس عظیم الشان امر دین کو اپنی توجہات کا مرکز بنائیں اور اس کو معمولی یا ناقابل عمل کام نہ سمجھیں۔ اس سلسلہ میں اَکابر واسلاف رحمہم اللہ کا موقف ورائے کیا ہے؟ ذیل میں پیش خدمت ہے تاکہ مزید فکر وعمل کو مہمیز ملے۔ اور اس کار عظیم کی نزاکت واہمیت معلوم ہوسکے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ:

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ دعوت دین کو بالخصوص غیر مسلموں کے لیے خاص کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''جب اسلام ہی دین کامل ہے تو جن لوگوں کے پاس یہ نعمت نہیں ہے ان کے پاس بھی اس کو پہنچانا چاہیے کیونکہ اوّل تو یہ بات مروت وہمدردی کے خلاف ہے کہ ایک نافع چیز سے خود ہی نفع اٹھایا جائے اور دوسروں کو محروم رکھا جائے۔ دوسرے ہم کو شرعاً بھی اس کا حکم ہے کہ جن لوگوں کو اسلام کی خوبیاں معلوم نہیں ہیں ان کے سامنے اس کے محاسن بیان کریں...''

ہماری یہ حالت ہے کہ بہت سے لوگ تو اس کام کو معمولی کام سمجھتے ہیں اور جو لوگ اس کی ضرورت ومرتبہ کو سمجھتے ہیں وہ بھی ایسی جگہ جا کر تبلیغ کرتے ہیں جہاں ان کی خاطر ومدارات ہوتی

ہے، کفار میں جا کر کوئی تبلیغ نہیں کرتا کیونکہ خاطر و مدارات کہاں؛ بلکہ بعض دفعہ تو برا بھلا سننا پڑتا ہے۔اس وجہ سے لوگ کفار کو تبلیغ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔(الاتمام لنعمۃ الاسلام،ص:۲۸۷)

قاری محمد طیب صاحبؒ:

دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ دعوت دین کے مفہوم کے تعلق سے پائی جانے والی عمومی غلط فہمی کو دور کرنے کی خاطر اپنی کتاب دعوت دین کے قرآنی اصول کے ایک مخصوص عنوان ''ایک غلط فہمی کا ازالہ'' کے تحت لکھتے ہیں: ''تبلیغ اسلام کے معنی مسلمانوں کو عباداتی رنگ کے کچھ احکام پہنچادینے اور انہیں وابستہ کر لینے کے نہیں ہیں کہ جس کے بعد یہ سمجھ لیا جائے کہ فریضہ تبلیغ ادا ہو گیا یا ارباب تبلیغ فرائض دعوت سے سبکدوش ہو گئے مجھے اس انداز کی کسی دعوت خاص کی ضرورت وافادیت سے اگرچہ انکار نہیں لیکن اسے فریضہ تبلیغ سے سبکدوشی سمجھ لیا جانا قرآن کے اصول تبلیغ کی روشنی میں یقیناً صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ جزوی تبلیغ، تذکیر واصلاح کے عنوانات سے یاد کی جاسکتی ہے مگر عرف شریعت کے لحاظ سے اسے تبلیغ نہیں کہا جاسکتا...''

اپنی اسی تصنیف میں ایک مقام پر فرماتے ہیں: ''اس لیے میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اگر سب نہیں تو کم از کم ارباب علم وبصیرت کی ایک جماعت سارے موہوم منصوبوں کو چھوڑ کر دعوت الی اللہ کے لیے کمربستہ ہو جائے اور اپنوں سے گزر کر دوسری اقوام کے ساتھ انتہائی خیر خواہی سے انہیں دین حق کی طرف مائل کرنے پر لگ جائے اور اس کی زندگی کا واحد نصب العین غیروں کے سامنے اسلام پیش کرنا اور انہیں دعوت حق دینا ٹھہر جائے۔''

شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ:

مولانا محمد زکریا صاحبؒ (جو تبلیغ کے حوالہ سے محتاج تعارف نہیں) مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں میں بھی ین کی تبلیغ کی آرزو اور تڑپ رکھتے تھے۔ چنانچہ شیخ الحدیثؒ کے خلیفہ مولانا یوسف متالا (مہتمم دارالعلوم-برطانیہ) ایک مضمون میں عام انسانوں میں دعوت دین کے لیے شیخ الحدیثؒ کی بے چینی کے تعلق سے رقم طراز ہیں: ''غالباً ۱۹۷۹ء کی مدینہ طیبہ حاضری کے دوران ایک روز احقر حضرت کی قیام گاہ کے برابر خدام والے حجرے میں تھا کہ حضرت کے خادم محمد اعجاز

چمپارنی آئے اور فرمایا حضرت یاد فرمارہے ہیں تو حضرت نے زاروقطار روتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ سن یہ کیا کہہ رہا ہے۔ بھائی اعجاز صاحب نے کہا کہ میں نے حضرت سے پوچھا کہ وہ عوام الناس جنھوں نے اسلام کا نام بھی نہیں سنا ہے اور جنھیں اسلام کی کوئی تبلیغ نہیں کی گئی کیا انہیں عذاب ہوگا۔ یہ سن کر حضرت نے فرمایا اس پر ضرور کام ہونا چاہیے اور اس موضوع پر اسلام کے محاسن پر کتابیں ہونی چاہئیں۔ (بحوالہ اقرا، ڈائجسٹ، کراچی، نومبر ۱۹۷۶ء)

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ:

دعوت کی ترجیح کے حوالہ سے مولاناؒ فرماتے ہیں: ''انبیاء کرام علیہم السلام کے طرز دعوت وتبلیغ میں اصل مخاطب غیرمسلموں ہی کو بنایا جاتا ہے اور ان کے سخت دلوں کو ایمان ویقین، سوز دروں، اخلاص اور اسوۂ حسنہ کی روشنی وگرمی سے موم بنا کر ایمان وعمل کے سانچہ میں ڈھالا جاتا ہے اور جب اس طرح مومنوں کی امت دعوت، تیار ہوجاتی ہے تو اسے نبوی تعلیمات سے آراستہ کر غیرمسلموں ''امت اجابت'' کو اللہ کے دین کی طرف مدعو کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور یہ کار نبوت پوری امت کے اہل افراد پر فرض قرار یا جاتا ہے اور امت مسلمہ کو تو اسی دعوت کے لیے خیر امت قرار دیا گیا ہے۔'' (ماخوذ - دعوت اسلام ایک اہم فریضہ)

❁ ❁ ❁

فتنہ نمازِ سہ گانہ
(۳-وقت کی نماز)

از: ڈاکٹر ایم اجمل فاروقی
۱۵/ گاندھی روڈ، دہرہ دون

دنیا میں اِس وقت ترکی میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں اور گھریلو حالات سے متعلق بہت دلچسپی پائی جارہی ہے۔ حالیہ پارلیمانی اور صدارتی انتخابات سے قبل بہت زبرست پروپیگنڈہ مہم عالمی میڈیا میں چھیڑی گئی بڑے بڑے جلوسوں کی خبریں اور تصاویر شائع ہوئیں کہ وہاں سیکولر ترقی پسند عوام کٹر مسلمانوں کے خلاف خصوصاً خواتین سڑکوں پر آگئی ہیں اور اسلام پسندوں کے خلاف بہت ماحول بنا ہوا ہے، اِس تمام پروپیگنڈہ کے علی الرغم انتخابات کے نتائج نے اِس پروپیگنڈہ مہم کی قلعی کھول دی۔ مگر شیطانی طاقتوں کے آلۂ کار ہار ماننے والے کہاں ہیں؟ ترکی کو اب ایک نئی سازش کے لئے لانچنگ پیڈ بنایا گیا ہے کہ ''زمانہ کی ضرورتوں اور حالات کے تغیر وتبدل کی وجہ سے اب نماز پانچ بار ادا کرنے کے بجائے تین بار ادا کی جائیں''۔ اور اِس بات کو بھی پہلے کی ہی طرح ایسے پیش کیا گیا جیسا کہ اِسے کسی بہت بڑی علمی، دینی شخصیت نے پیش کیا ہے اور اس کو ترکی کے علاوہ عرب ممالک میں بھی پذیرائی مل رہی ہے۔ خصوصاً مصر کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہاں کے علمی حلقوں اور اخوان المسلمین کے بھی ایک حلقہ کی تائید حاصل ہے۔ ابھی آزاد ذرائع سے یہ معلوم کرپانا مشکل ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ یہ خیال ظاہر کرنے والے کون ہیں؟ اُن کی علمی عوامی حیثیت کیا ہے؟ اور دراصل انھوں نے کہا کیا؟۔ پھر بھی ذرائع ابلاغ سے کوئی اور رخ سامنے نہیں آیا۔ اب ہمارے سامنے دوصورتیں ہیں یا تو اس کو شیطان کی فریب کاریوں اور سازشوں میں سے ایک سازش مان کر ''کچھ نہیں سب بکواس ہے'' کا رویہ اپنائیں۔ دوسرا یہ کہ نصوص اور عقل وسائنس وتجربہ کی کسوٹی پر اِس بکواس کو رگڑ کر اس کا جھوٹ ہونا ظاہر کردیا جائے۔ کہ یہ جراثیم جہاں جہاں بھی پرورش پارہے ہوں ان کا قلع قمع ہوجائے۔

نصوص کی جہاں تک بات ہے وہ سورج کی طرح روشن اور عیاں ہیں حضور ﷺ کا عمل احادیث میں اوقات پنج گانہ کی تصریحات اور ان ۱۴۵۰ سالہ تواتر اس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔قرآن پاک میں ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتٰباً موقوتاً (نساء:۱۰۳) کی تاکید صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ پھر اول وقت آخر وقت کی باقاعدہ صراحتیں ایسی بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نمازیں اسی طرح سے فرض ہیں جو کہ آج ساری دنیا میں معروف ومشہور ہیں۔دوسری بات کو ذرا تفصیل سے دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہوائی سفر وغیرہ کی وجہ سے ٹائم زون کے جو مسئلے پیدا ہوئے ہیں اس پر مستند علماء اور اداروں کی طرف سے شریعت کی روشنی میں رہنمائی مہیا کرادی ہے۔ اوّل تو یہ مسئلہ کتنے فیصد لوگوں کو درپیش ہے پھر اُس کا شرعی حل بھی موجود ہے۔اس بحث میں ایک بہت اہم نکتہ یہ ہے کہ اللہ رب کائنات نے جو علیم بھی ہے حکیم بھی ہے جو انسانی جسم اور جبلت اور انسانی فطرت کا خالق بھی ہے اور عالم بھی ہے اس نے نماز کو وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کی کیا مصلحت ہے؟ ابھی تک طبّی تحقیقات کی روشنی میں دیکھا جائے تو جس مصروفیت اور تغیر زمانہ کی آڑ لے کر یہ فتنہ بپا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس مصروفیت، تناؤ اور دباؤ سے نمٹنے کا بہترین طریقہ یہ صبح سے رات تک مختلف خصوصی اوقات میں ادا کی جانے والی یہ نمازیں ہی ہیں۔تحقیقات بتاتی ہیں کہ انسانی جسم میں فطری طور پر حیاتیاتی گھڑی Biological Clock ہوتا ہے۔جس کے مطابق انسانی جسم کی حرکات وسکنات اور جسمانی وذہنی کارکردگی کنٹرول ہوتی ہے۔دن کے مختلف اوقات میں جسم اور ذہن کی صلاحیتوں کا پیمانہ یا سطح مختلف ہوتی ہے۔صبح کو اپنے عروج پر ہو کر ظہر کے وقت تک مستقل استعمال کی وجہ سے ڈھلنے لگتی ہے تو اُس وقت ظہر کی نماز کے ذریعہ انسانی جسم اور روح دونوں کی تازگی کا انتظام کردیا گیا۔اسی طرح وقفہ وقفہ سے انسانوں کی عوامی مصروفیات اور روحانی وجسمانی تکان کو دور کرنے کا انتظام وقت کی پابندی کے ساتھ نماز کی ادائیگی کے ذریعہ کردیا گیا ہے۔انسان روح اور جسم دونوں کا مجموعہ ہے اور دونوں کی اپنی اپنی ضرورتیں ہیں۔اسی طرح نماز کی ایک ظاہری شکل (حرکات وسکنات) ہیں اور دوسری روحانی شکل (خشوع وخضوع) ہے اس طرح دونوں ایک دوسرے کا تکملہ (پورا کرنے والے) ہیں۔اس میں اگر ہم بغیر مکمل علم کے جیسا علم کہ اللہ کا ہے مستقل تغیر وتبدل کرنا چاہتے ہیں تو یہ پوری انسانیت کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔یہ تو طے شدہ بات ہے کہ اللہ غنی اور صمد ہے وہ انسانوں کے رکوع، سجود، قیام وقعود نیز اِن کی خیرات، صدقات کا اور دان دکشنا کا محتاج نہیں ہے اس نے جو بھی ارکان فرض کیے ہیں اس میں اصل فائدہ دراصل خود انسان کا ہے انسانی معاشرہ

کا ہے پوری انسانی برادری کا ہے۔ جس جسمانی طبعی گھڑی Clock کی میں نے بات کی ہے اس کا آج مختلف میدانوں میں بہت مہارت کے ساتھ استعمال ہو رہا ہے۔ مینجمنٹ کے ماہرین اس کا استعمال کر رہے ہیں۔ فوجی ماہرین اس کا استعمال کر رہے ہیں۔ یوگا جسے آج کل دنیا بھر میں جھاڑ پونچھ کر دنیا بھر میں بڑی چمک دمک سے پیش کیا جارہا ہے تمام اسکولوں، یونیورسٹیوں میں یوگا کی تعلیم عام کی جارہی ہے۔ کھیلوں کی دنیا میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اسپورٹس میڈیشن کے ماہرین اس بات کو جانتے ہیں کہ کس وقت میں انسانی جسم کی کارکردگی اپنے عروج وشباب پر ہوتی ہے وہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ٹیم یا کھلاڑی کو مقابلہ کا وہی وقت ملے تاکہ وہ جسم کی ۱۰۰٪ صلاحیت کا استعمال کرسکے۔ ایسا وقت نہ ملنے کی صورت میں کھلاڑیوں نے شارٹ کٹ کے طور پر طاقت بڑھانے والی ادویہ Steroids کا استعمال کرنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ بڑی کمپنیاں اپنے ملازمین کے اوقات کے تعین میں اس تحقیق کا استعمال کر رہے ہیں کہ انسانی جسم ایک نظام الاوقات کا پابند ہے اور مختلف اوقات میں اس کی کارکردگی مختلف ہوتی ہے۔ یہ وہ معمولی علم ہے جو آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ۱۴۵۰ سال بعد ہمیں حاصل ہے۔ آئندہ ہزاروں سالوں میں جب انسانی علم؛ تحقیق اور تجربہ مزید ترقی کرے گا تو اور نہ جانے کیا کیا فوائد شریعتِ اسلام کے ظاہر ہوں گے۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ آج کی گلا کاٹ مسابقہ اور مقابلہ کی زندگی مادہ پرستانہ معیارِ زندگی کی اندھا دھند دوڑ میں حیران و پریشان انسان کو اور زیادہ وقت ملتا کہ وہ اپنے جسمانی اور روحانی وجود کو تروتازہ کرپاتا وہ اپنے خالق سے بات کرپاتا وہ اپنی زندگی اور دنیا کی حقیقت کو زیادہ سے زیادہ وقت سمجھنے اور recharge (مقوی) بنانے کی کوشش کرتا اُس کے خلاف سخت حالات میں دباؤ سے نمٹنے کے لئے زیادہ ضرورت کے علی الرغم اسے پہلے سے بھی کم سطح پر لاکر اس طرح کی بچکانہ یا مکارانہ تجاویز پیش کرنا انسانیت کی بھلائی نہیں انسانیت پر ظلم ہے۔ دین کی حقیقت سے واقف ہر شخص کو سمجھنا اور یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع واطاعت میں نہ اللہ کا کوئی فائدہ ہے اور نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ دین کی اتباع کے ذریعہ ہی بنی نوع انسانی جسمانی، روحانی، دنیاوی واخروی خوشی اور کامیابی حاصل کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ صرف ضلالت اور گمراہی مقدر ہے جس کا نتیجہ ناکامی اور فساد فی الارض ہے۔ ایسے انسانوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ تنبیہ ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے: ''یہ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہوئے تو کہہ مجھ پر احسان نہ رکھو اپنے اسلام لانے کا بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تم کو راہ دی ایمان کی اگر سچ کہو'' (الحجرات:۱۷)

❁ ❁ ❁

دھاگے- دانوں کی مروجہ تسبیح کی شرعی حیثیت

(۲)

از: مفتی عمر فاروق لوہاروی
شیخ الحدیث دارالعلوم لندن (یوکے)

چند شبہات وسوالات اوران کے جوابات:

اب چند شبہات وسوالات اوران کے جواب ذکر کیئے جاتے ہیں:

(۱) سعودیہ کے سابق مفتیٔ اعظم شیخ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے، کہ شریعتِ مطہرہ میں مِسْبحه (مروجہ تسبیح) کی کوئی اصل نہیں ہے۔ وہ فتویٰ "فتاویٰ اسلامية لمجموعة من العلماء الافاضل" میں موجود ہے۔ جب یہ بے اصل ہے، تو لامحالہ اسے بدعت ہی قرار دیا جائے گا۔

جواب: پہلی بات یہ ہے، کہ سابقہ تفصیل سے معلوم ہوگیا، کہ مروجہ تسبیح کی اصل شریعتِ مطہرہ میں موجود ہے، لہٰذا اسے بدعت قرار نہیں دیا جاسکتا۔

دوسری بات یہ ہے، کہ کوئی آدمی مروجہ تسبیح کو عبادت اور دین وقربت خیال کرکے استعمال نہیں کرتا؛ بلکہ شمار کے لیے ایک آلہ خیال کرتا ہے، اس لیے بایں حیثیت بھی اس کو بدعت ٹھہرایا نہیں جاسکتا۔

تیسری بات یہ ہے، کہ سعودیہ کے سابق مفتیٔ اعظم شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی نظر میں بھی مروجہ تسبیح بے اصل ہونے کے باوجود بدعت نہیں ہے!!! حضرت موصوف رحمہ اللہ کا فتویٰ اس طرح ہے:

لا نعلم اصلاً فی الشرع المطهر لتسبيح بالمسبحة، فالاولیٰ عدم التسبيح بها، والاقتصار علی المشروع فی ذلك، وهو التسبيح بالانامل. (فتاویٰ اسلامية لمجموعة من العلماء الافاضل ج:۲،ص:۳۶۶)

''مسبحہ کے ذریعہ تسبیح شمار کرنے کے لیے شریعت مطہرہ میں ہم کوئی اصل و بنیاد نہیں جانتے ہیں، لہٰذا اولیٰ یہ ہے، کہ اس کے ذریعہ تسبیح شمار نہ کی جائے، اور اس میں مشروع پر اکتفاء کیا جائے، اور مشروع انگلیوں کے پوروں سے تسبیح شمار کرنا ہے۔''

شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی نظر میں مروجہ تسبیح کا استعمال اگر بدعت ہوتا، تو موصوف ہرگز یہ تعبیر استعمال نہ فرماتے، کہ ''اولیٰ'' یہ ہے، کہ اس کے ذریعہ تسبیح شمار نہ کی جائے۔

واضح رہے، کہ حضرت موصوف نے اس فتویٰ میں مشروع میں صرف انگلیوں کے پوروں سے تسبیح شمار کرنے کو لکھا ہے، لیکن انھوں نے اپنے دوسرے فتویٰ میں کھجور کی گٹھلی اور سنگریزے وغیرہ کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو: فتاویٰ نور علی الدرب، ج:۱، ص:۱۷۳۔

(۲) جو صحابیات رضی اللہ عنہن کھجور کی گٹھلیوں یا کنکریوں پر تسبیحات شمار کر رہی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے ان چیزوں پر زیادہ مقدار میں تسبیحات پڑھنے کی بجائے جو اسہل و افضل طریقہ تھا، وہ ارشاد فرمایا، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ گٹھلی یا کنکر وغیرہ پر اذکار شمار نہیں کرنا چاہیے، اور اسی پر مروجہ تسبیح کی بنیاد تھی، تو مروجہ تسبیح پر اذکار کا شمار کرنا ثابت ہوتا ہے۔

جواب: رسول اللہ ﷺ نے ایک افضل صورت ارشاد فرمائی، اس سے یہ لازم نہیں آتا، کہ گٹھلیوں یا سنگریزوں پر اذکار کا شمار کرنا ناجائز ہے۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

والارشاد الی ما هو افضل لا ينافي الجواز. (نیل الاوطار، ج:۲، ص:۳۱۷)

شیخ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے بھی بعینہٖ یہ عبارت نقل فرمائی ہے۔ (تحفۃ الاحوذی، ج:۱۰، ص:۱۲)

شیخ محمود محمد خطاب السبکی رحمہ اللہ حدیث سعد رضی اللہ عنہ پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وفيه دلالة على جواز عدّ التسبيح بالنوى او الحصى، فانه صلى الله عليه وسلم لم ينه المرأة عن ذلك؛ بل ارشدها الى ماهو ايسرلها وافضل، ولو كان غير جائز لبيّن لها ذلك. (المنهل العذب المورود، ج:۸، ص:۱۶۴)

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد میں کہیں دور تک بھی اس احتمال کا گذر نہیں ہے، کہ گٹھلیوں اور سنگریزوں پر اذکار کا شمار کرنا ممنوع ہے؛ بلکہ آپ کے ارشاد کا منشاء اور غرض یہ ہے، کہ زیادہ ثواب حاصل کرنے کا ایک طریقہ جس طرح کثرتِ ذکر ہے، اسی طرح ایک آسان طریقہ یہ بھی ہے، کہ اس کے ساتھ ایسے الفاظ شامل کردیئے جائیں، جو کثرتِ تعداد پر دلالت کرنے والے ہوں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

واعلم ان من كان اكثر ميله الى تلوّن النفس بلون معنى الذكر، فالمناسب فى حقه إكثار الذكر، ومن كان اكثر ميله الى محافظة صورة العمل فى الصحيفة وظهورها يوم الجزاء، فالانفع فى حقّه اختيار ذكر راب (اى فائق) على الاذكار بالكيفية. (حجة الله البالغة، ج:۲،ص:۷۳ مبحث فى الاذكار وما يتعلق بها)

''اور جان لیں کہ وہ شخص جس کا زیادہ میلان اپنے باطن کو ذکر کے رنگ میں رنگنا ہو، یعنی باطن میں احسانی کیفیت (نسبتِ یاد داشت) پیدا کرنا مقصود ہو، اس کے لیے ذکر کی کثرت مناسب ہے۔ اور جس شخص کا زیادہ میلان نامۂ اعمال میں عمل کی صورت کی نگہداشت کی طرف اور بروز جزاء اس صورت کے ظہور کی طرف ہو، اس کے حق میں زیادہ مفید ایسے ذکر کو اختیار کرنا ہے، جو کیفیت کے ذریعہ اذکار پر فائق ہو۔''

جو صحابیات رضی اللہ عنہن کھجور کی گٹھلیوں یا کنکریوں پر اذکار وتسبیحات شمار کررہی تھیں، ان کو کنکریوں یا گٹھلیوں پر اذکار وتسبیحات کے شمار کرنے سے روکنا مقصود نہیں تھا؛ بلکہ ان کو افضل وایسر کی تعلیم دینی مقصود تھی، اس کی تائید حسب ذیل روایت سے ہوتی ہے:

عن ابن عباس عن جويرية ان النبى صلى الله عليه وسلم خرج من عندها بكرة حين صلّى الصبح وهى فى مسجدها ثم رجع بعد ان اضحى وهى جالسة فقال: مازلت على الحال التى فارقتك عليها، قالت: نعم قال النبى صلى الله عليه وسلم: لقد قلت بعدك اربع كلمات ثلاث مرّات لو وزنت بما قلت منذ اليوم لوزنتهن: سبحان الله وبحمده عدد خلقه ورضى نفسه وزنة عرشه ومداد كلماته. (صحيح مسلم،ج:۲،ص:۳۵۰، جامع ترمذى مع عارضة الاحوذى،ج:۱۳،ص:۶۷، سنن النسائى،ج:۱، ص:۱۹۸،۱۹۹)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ام المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز پڑھ کر ان کے پاس سے صبح میں باہر تشریف لے گئے، دراں حالیکہ وہ اپنی نماز پڑھنے کی جگہ میں تھیں، پھر آپ چاشت کا وقت ہوجانے کے بعد لوٹے، دراں حالیکہ وہ (اسی جگہ) بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ نے دریافت فرمایا، کہ تم برابر اسی حال پر ہو، جس حال پر میں نے تم کو چھوڑا تھا؟ (یعنی تم برابر اپنی اسی نماز پڑھنے کی جگہ بیٹھ کر وظیفہ پڑھ رہی ہو؟) انھوں نے جواب دیا: جی ہاں! نبی ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس سے جانے کے بعد

میں نے چار کلمے تین دفعہ کہے، اگر وہ تمہارے آج (صبح سے) پڑھے ہوئے وظیفہ کے ساتھ تولے جائیں، تو ان کا وزن بڑھ جائے گا۔ وہ کلمات یہ ہیں: سبحان اللّٰہ و بحمدہ عدد خلقه ورضی نفسه وزنة عرشه ومداد كلماته. (میں اللہ کی پاکی اور حمد بیان کرتا ہوں اس کی مخلوقات کی تعداد کے برابر، اس کی ذات کی خوشنودی کے برابر، اس کے عرش کے وزن کے برابر اور اس کے کلمات کی تعداد کے برابر)

"**المنهل**" میں ہے: وفي الحديث دلالة على الترغيب في الذكر بهذه الكلمات وان الذكر يتضاعف ويتعدّد بعدد ما احال عليه الذاكر وإن لم يتكرر الذكر فيحصل لمن قال: سبحان الله عدد كل شيء مثلاً مرة مالا يحصل لمن كرر التسبيح بدون احالة علی عدد. (المنهل العذب المورود، ج:۸، ص:۱۶۷)

(۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثرِ ذیل میں تسبیح پر تسبیحات شمار کرنے سے ممانعت معلوم ہوتی ہے:

عن سعيد بن جبير، قال: رأى عمر بن الخطاب رجلا يسبّح بتسابيح معه، فقال عمر: انما يجزيه من ذلك أن يقول: سبحان اللّٰه ملء السموات والارض، وملء ماشاء من شيء بعد، ويقول: الحمد لله ملء السموات والارض وملء ما شاء من شيء بعد، ويقول: الله اكبر ملء السموات والارض وملء ما شاء من شيء بعد.

(المصنف لابن ابی شيبة، ج:۵، ص:۲۲۰)

جواب: اولاً: تو یہ اثر منقطع ہے۔ اور ثانیاً: اس آدمی کو اس عمل سے روکنا مقصود نہیں؛ بلکہ ماقبل کی طرح یہاں بھی اَسہَل واَیسَر کی تعلیم مقصود ہے۔

(۴) بنوکلیب کی ایک خاتون تسبیح پر تسبیحات شمار کررہی تھیں، جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ دیکھا، تو فرمایا، کہ شواہد یعنی انگلیاں جو قیامت کے دن گواہی دیں گی، کہاں ہیں؟ یعنی بجائے تسبیح پر شمار کرنے کے انگلیوں پر تسبیحات شمار کرو۔ گویا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے تسبیح سے شمار کرنے پر نکیر فرمائی:

عن ابی تميمة عن امرأة من بني كليف، قالت: رأتني عائشة اسبّح بتسابيح معي، فقالت: اين الشواهد؟ تعني الاصابع. (المصنف لابن ابی شيبة، ج:۵، ص:۲۱۷)

جواب: اس کی سند میں جہالت ہے؛ بنوکلیب کی خاتون مجہول ہے۔ برتقدیرِ صحتِ اثر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے اعلیٰ وافضل کی تلقین ہے۔ ماقبل میں مذکور ہوا، کہ اذکار و

تسبیحات کا انگلیوں پر شمار کرنا اعلیٰ وافضل ہے۔

(۵) حسبِ ذیل روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تسبیح اور کنکریوں کے ذریعہ اذکار شمار کرنے پر انکار وارد ہوا ہے:

عن الصلت بن بهرام قال: مَرّ ابن مسعود بامرأة معها تسبيح تسبّح به، فقطعه، والقاه. ثم مَرَّ برجل يسبّح بحصى، فضربه برجله، ثم قال: لقد سبقتم، ركبتم بدعة ظلما، ولقد غلبتم اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم علماً. (البدع والنهى عنها لابن وضاح القرطبى، ص:۱۲)

''صلت بن بہرام سے مروی ہے، کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک خاتون کے پاس سے گذر ہوا، اس کے پاس تسبیح تھی، جس سے وہ تسبیح پڑھ رہی تھی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس تسبیح کو توڑ کر ڈال دیا۔ پھر آپ ایک آدمی کے پاس سے گذرے، جو کنکریوں سے تسبیح پڑھ رہا تھا، اس کو پاؤں مارا، پھر فرمایا کہ تم (اپنے زعم میں صحابۂ کرام سے) بڑھ گئے؟ (نہیں؛ بلکہ) تم بے جا بدعت کے مرتکب ہوئے۔ تم (یہ خیال کرتے ہو کہ تم) محمد ﷺ کے اصحاب سے علم میں بڑھ گئے !!!

جواب: اس روایت کی سند میں انقطاع ہے، کیوں کہ صلت بن بہرام کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔ برتقدیر صحت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا انکار اذکار شمار کرنے کے لیے تسبیح یا کنکریوں کے استعمال پر نہیں ہے؛ بلکہ نفس اذکار شمار کرنے پر ہے۔ ان کا موقف اذکار شمار کرنے کی کراہت کا نقل کیا جاتا ہے، چنانچہ حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے مروی ہے:

كان عبدالله يكره العدّ، ويقول: أيمنّ على الله حسناته؟ (المصنف لابن ابى شيبة، ج:۵، ص:۲۱۹، ۲۲۰)

''حضرت عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ اذکار کے شمار کرنے کو ناپسند کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ کیا اللہ پر اپنی نیکیوں سے احسان جتایا جاتا ہے؟''

یہ روایات موقوف ہیں، جبکہ مرفوع روایاتِ صحیحہ سے رسول اللہ ﷺ کا قولاً، عملاً اور تقریراً اذکار وتسبیحات کا شمار کرنا ثابت ہے۔ ممکن ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا نظریہ یہ ہو، کہ رسول اللہ ﷺ سے فرض نمازوں کے بعد جیسے مخصوص مواقع میں اذکار کا شمار کرنا ثابت ہے، ان کے

علاوہ مواقع میں شمار کرنا مکروہ ہے، لیکن جمہور صحابہ اس کے بلا کراہت جواز کے قائل ہیں۔

(۶) حسبِ ذیل روایت میں بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کنکریوں سے تسبیحات واذکار شمار کرنے پر نکیر منقول ہے۔ اوراس پر مروجہ تسبیح کی بنیاد ہے، تو اس سے مروجہ تسبیح کا ممنوع ہونا ثابت ہوتا ہے:

عن سیار ابی الحکم: أن عبد اللّٰہ بن مسعود حُدّث: أن اناسا بالکوفة یسبحون بالحصی فی المسجد، فاتاهم وقد کوّم کلّ رجل منهم بین یدیه کومة حصی، فلم یزل یحصبهم بالحصی حتی اخرجهم من المسجد، ویقول: لقد احدثتم بدعة ظلما او قد فضلتم اصحاب محمد صلی اللّٰہ علیه وسلم علماً. (البدع والنهی عنها لابن وضاح، ص:۱۱)

''ابوالحکم سیّار سے مروی ہے، کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان کے پاس تشریف لائے، دراں حالیکہ ان میں سے ہر ایک آدمی نے اپنے سامنے کنکریوں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ آپ ان کو کنکریوں سے مارتے رہے، یہاں تک کہ ان کو مسجد سے نکال دیا۔ اور آپ (ان کو مارتے ہوئے) فرماتے تھے، کہ یا تو تم نے بے جا بدعت گڑھ لی، یا پھر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب سے علم میں بڑھ گئے۔'' (اور یہ دوسری صورت ہو نہیں سکتی، لامحالہ پہلی صورت متعین ہوگئی، کہ تم نے یہ بدعت گڑھ لی ہے)

اس روایت کی سند میں بھی انقطاع ہے، کیوں کہ ابوالحکم سیّار کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔ برتقدیرِ صحت ممکن ہے، کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا انکار نفس اذکار شمار کرنے پر ہو، جبکہ صحیح مرفوع روایتوں سے اس کا بلا کراہت جواز ثابت ہے، جیسا کہ ماقبل میں گذرا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ذکر کے لیے مسجد میں اجتماع واہتمام والتزام اور ہیئت کذائیہ پر نکیر کی ہو۔ ذیل کی روایت جس کی سند میں فنّی اعتبار سے تقریباً کوئی کلام نہیں، کا محمل بھی یہی ہے، روایت اس طرح ہے:

اخبرنا الحکم بن المبارك انا عمر (هکذا جاء فی السنن للدارمی، وصوابه: عمرو) بن یحیی قال سمعت ابی یحدث عن ابیه (ای عن عُمارة بن ابی حسن المازنی) قال: کنّا نجلس علی باب عبد اللّٰہ بن مسعود قبل صلاة الغداة، فاذا خرج مشینا معه الی المسجد، فجاء نا ابو موسی الاشعری فقال: أخرج الیکم ابو عبد الرحمن بعد؟ قلنا: لا،

فجلس معنا حتى خرج، فلما خرج قمنا اليه جميعا، فقال له ابوموسىٰ: يا ابا عبدالرحمن، انى رأيت فى المسجد آنفا امرًا انكرته، فلم أرَ والحمد لله الا خيرا. قال: فما هو؟ فقال: إن عشت فستراه. قال: رأيت فى المسجد قوما حلقا جلوسا ينتظرون الصلاة فى كل حلقة رجل وفى ايديهم حصا فيقول: كبروا مائة، فيكبرون مائة، فيقول: هلّلوا مائة، فيهللون مائة، ويقول: سبّحوا مائة، فيسبّحون مائة.

قال: فماذا قلت لهم؟ قال: ما قلت لهم شيأ انتظار رأيك او انتظار امرك. قال: افلا امرتهم ان يعدّوا سيئاتهم، وضمنت لهم ان لا يضيع من حسناتهم، ثم مضى ومضينا معه حتّى اتى حلقة من تلك الحلق، فوقف عليهم فقال: ما هذا الذى أراكم تصنعون؟ قالوا: يا ابا عبدالرحمن، حصا نعدّ به التكبير والتهليل والتسبيح .

قال: فعدّوا سيئاتكم، فانا ضامن أن لا يضيع من حسناتكم شيء، ويحكم يا امة محمد، ما اسرع هلكتكم، هؤلاء صحابة نبيكم صلى الله عليه وسلم متوافرون، وهذه ثيابه لم تبل، وآنيته لم تكسر، والذى نفسى بيده إنكم لعلىٰ ملّة هى اهدى من ملة محمد؟ او مفتتحوا باب ضلالة؟ قالوا: والله يا ابا عبدالرحمن، ما اردنا الا الخير. قال: وكم من مريد للخير لن يصيبه، ان رسول الله حدثنا: ان قوما يقرؤون القرآن لا يجاوز تراقيهم، وايم الله ما ادرى لعل اكثرهم منكم، ثم تولّى عنهم. فقال عمرو بن سلمة: رأينا عامة اولئك الحلق يطاعنونا يوم النهر وان مع الخوارج. (سنن الدارمى، باب فى كراهية اخذ الرأى، ج:۱،ص:۷۸)

''عمارہ بن ابی حسن المازنی فرماتے ہیں، کہ ہم نمازِ فجر سے پہلے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے (گھر کے) دروازے پر بیٹھتے تھے، جب آپ گھر سے نکلتے، تو ہم آپ کے ساتھ مسجد جاتے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہمارے پاس تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے پاس اب تک ابوعبدالرحمٰن (یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) نہیں آئے؟ ہم نے عرض کیا: نہیں۔ تو آپ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے گھر سے نکلنے تک ہمارے ساتھ تشریف فرما ہوئے۔ جب آپ نکلے، تو ہم سب آپ کی طرف اٹھے۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے آپ سے فرمایا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! میں نے مسجد میں ابھی ایک بات دیکھی، جس کو میں نے اوپرا پایا، ویسے تو الحمدللہ خیر ہی کو دیکھا۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ وہ کیا ہے؟ ابوموسیٰ اشعری رضی

اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر زندگی نے وفا کی، تو عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے، اور وہ یہ کہ میں نے مسجد میں کچھ لوگوں کو مختلف حلقوں میں نماز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے دیکھا، ہر حلقے میں ایک آدمی ہے، لوگوں کے ہاتھوں میں کنکریاں ہیں، وہ آدمی کہتا ہے: سومرتبہ ''اللہ اکبر'' پڑھو، تو لوگ سومرتبہ اللہ اکبر پڑھتے ہیں، پھر وہ کہتا ہے: سومرتبہ ''لا الہ الا اللہ'' پڑھو، تو لوگ سومرتبہ لا الہ الا اللہ پڑھتے ہیں، پھر وہ کہتا ہے، کہ سومرتبہ ''سبحان اللہ'' پڑھو، تو لوگ سومرتبہ سبحان اللہ پڑھتے ہیں۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ نے ان سے کیا کہا؟ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے ان سے آپ کی رائے کے انتظار میں راوی کہتا ہے کہ یا یہ فرمایا کہ آپ کے حکم کے انتظار میں کچھ نہیں کہا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ ان کو یہ حکم دیتے کہ وہ اپنے گناہ شمار کریں اور ان کو ضمانت دیتے، کہ ان کی نکیوں میں سے کچھ ضائع نہیں ہوگا (یعنی ان اذکار کو شمار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آدمی جو ذکر کرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اس پر وہ اجر دیں گے، وہ ذکر اور نیکی ضائع نہیں ہوگی) پھر ابن مسعود رضی اللہ عنہ (مسجد کی جانب) چلے، ہم بھی آپ کے ساتھ ہولیے، یہاں تک کہ ان حلقوں میں سے ایک حلقہ کے پاس آکر کھڑے ہوگئے، اور ان سے دریافت فرمایا، کہ یہ کیا چیز ہے، جو میں تم کو کرتے ہوئے پا رہا ہوں؟ انھوں نے جواب دیا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! ہم ان سنگریزوں سے تکبیر، تہلیل اور تسبیح شمار کرتے ہیں۔

آپ نے فرمایا: بجائے اس کے تم اپنے اپنے گناہ شمار کرو، میں ضمانت دیتا ہوں کہ (اگر ان اذکار کو شمار نہ کرو، تو) تمہاری نیکیوں میں سے کچھ ضائع نہیں ہوگا۔ اے امتِ محمد ﷺ! تم پر افسوس! تمہاری ہلاکت کس قدر جلد آگئی، ابھی یہ اصحابِ نبی ﷺ تمہارے درمیان بکثرت موجود ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے بوسیدہ نہیں ہوئے اور آپ کے برتن نہیں ٹوٹے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور تم ابھی سے بدعتوں میں مشغول ہوگئے) اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! یا تو تم ایک ایسے دین پر ہو، جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے (نعوذ باللہ) زیادہ راست ہے، یا تو تم گمراہی کا دروازہ کھولنے والے ہو۔ ان لوگوں نے جواب دیا: اے ابوعبدالرحمٰن! اللہ کی قسم! ہم اس عمل سے نیکی ہی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بہت سے نیکی کا ارادہ کرنے والے ایسے ہیں کہ انھیں ہرگز نیکی حاصل نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ کچھ لوگ قرآن پڑھیں گے، مگر قرآن ان کی ہنسلیوں سے تجاوز نہیں کرے گا۔ اللہ کی قسم! قطعی بات میں نہیں جانتا، ہوسکتا ہے کہ

ان کے بیش تر لوگ تم ہی میں سے ہوں۔ یہ کہہ کر ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے چلے گئے۔ عمرو بن سلمہ کہتے ہیں کہ ان حلقے والوں میں سے اکثر کو ہم نے دیکھا کہ جنگِ نہروان میں خوارج کے ساتھ مل کر یہ لوگ ہم پر برچھے مارتے تھے۔"

(۷) حدیث پاک میں ہے: لا یزال لسانك رطبا من ذکر اللّٰه. (الاحسان بترتیب صحیح ابن حبان، ج:۲، ص:۹۲، جامع ترمذی وغیرہ) "تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہر وقت تر رہے۔" اس کا تقاضا یہ ہے کہ زبان ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے سرشار اور تر رہنا چاہیے، تو پھر اذکار و تسبیحات کے شمار کرنے اور اس کے لیے مروجہ تسبیح کے استعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جواب: ویسے تو ہر وقت زبان پر اللہ تعالیٰ کا ذکر ہونا چاہیے، لیکن خود احادیثِ طیبہ میں بعض بعض اذکار کی تعداد مروی و منقول ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص اذکار کو خاص اوقات میں خاص تعداد کے ساتھ پڑھنا مقصود ہے، اس لیے ان ادکار کو شمار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ نیز جیسا کہ ماقبل میں گذرا کہ گننے سے ادائیگیٔ اذکار میں نشاط پیدا ہوتا ہے۔

(۸) شریعت مطہرہ میں سو سے زیادہ مقدار میں کوئی ذکر نہیں ہے، سو سے زیادہ میں مطلق ذکر کا حکم ہے، اور سو تک انگلیوں کے پوروں سے گننے میں کوئی دشواری نہیں ہے، جبکہ اس سے زائد میں شمار کرنے کی ضرورت نہیں، لہٰذا مروجہ تسبیح کے استعمال کی احتیاج بھی نہیں۔

جواب: جب تقریر رسول ﷺ سے مروجہ تسبیح کی اصل (کھجور کی گٹھلیوں اور سنگریزوں پر اذکار کا شمار کرنا) ثابت ہوگئی، تو اس سے اس سوال کی خود ہی بیخ کنی ہوجاتی ہے۔ اب چاہے سو کے اندر اذکار شمار کیے جارہے ہوں یا اس سے زائد میں۔ سو سے زائد میں ادکار کا شمار کرنا ادائیگی اذکار میں نشاط کا موجب ہے، کمامرّ۔

(۹) مروّجہ تسبیح کے استعمال میں ہنود و نصاریٰ وغیرہ کے ساتھ تشبّہ پایا جاتا ہے، کیونکہ ان کے ہاں بھی تسبیح رائج ہے۔

جواب: اذکار کے شمار کرنے میں مروجہ تسبیح کا استعمال غیر مسلمین مذہبی شعار کے طور پر نہیں کرتے ہیں۔ نیز ان کی تسبیح یا جپ مالا میں اور مسلمان جو تسبیح استعمال کرتے ہیں، ان میں فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ نصاریٰ میں کیتھولک پچاس چھوٹے دانوں کی تسبیح استعمال کرتے ہیں، جو چار بڑے دانوں پر منقسم ہوتے ہیں، اور ان کی تسبیح میں دو بڑے اور تین چھوٹے دانوں اور ملپ سے

بنا ہوا ہار لٹکا رہتا ہے۔ ہندوؤں کی جپ مالا مختلف فرقوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ شیوائیہ فرقہ کی جپ مالا میں چوراسی (۸۴) دانے ہوتے ہیں، اور وشنو فرقہ کی جپ مالا کے دانوں کی تعداد ایک سو آٹھ (۱۰۸) ہوتی ہے، جب کہ مسلمانوں کی تسبیح کے دانوں کی تعداد تینتیس (۳۳)، ننانوے (۹۹) اور عامۃً سو (۱۰۰) ہوتی ہے۔ اور مسلمانوں کی تسبیح غیر مسلمین کی جپ مالا وغیرہ کے دانوں کی ہیئت میں بھی اختلاف ہوتا ہے، لہٰذا مروجہ تسبیح کے استعمال میں غیر مسلمین کے ساتھ مشابہت نہیں پائی جاتی ہے۔

خلاصۂ بحث:

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اذکار و تسبیحات کا انگلیوں پر شمار کرنا اولیٰ و افضل ہے، تاہم مروّجہ دھاگے دانوں کی تسبیح پر شمار کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں، جائز ہے۔ کیونکہ اس کا وجود اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہیں تھا، لیکن اس کی اصل آپ ﷺ کے عہدِ مبارک میں موجود تھی، لہٰذا اسے مطلقاً بدعت قرار دینا نادانی ہے۔

تتمّہ: کاؤنٹر مشین یا الکٹرانک تسبیح سے اذکار کا شمار کرنا:

ہمارے زمانے میں لوہے وغیرہ دھات کا انڈے کے حجم کے برابر ایک آلہ تیار ہوا ہے، اس میں نوسو ننانوے یا نو ہزار نوسو ننانوے تک نمبر ہوتے ہیں۔ اذکار و تسبیح پڑھنے والا اسے اپنی ہتھیلی میں رکھتا ہے، اور انگوٹھے یا انگلی سے اس کا بٹن دباتا رہتا ہے، جس سے نمبر (عدد) بدلتا رہتا ہے۔ جب نوسو ننانوے یا نو ہزار نوسو ننانوے پر پہنچتا ہے، تو پھر ازسرِ نو شروع کرتا ہے۔ جس طرح دھاگے والی تسبیح سے اذکار کا شمار کرنا جائز ہے، اسی طرح اس کاؤنٹر مشین سے شمار کرنا بھی جائز ہے؛ البتہ اس مشین میں بٹن دبانے سے آواز کچھ بلند ہوتی ہے، اس لیے تسبیح پڑھنے والے کو چاہیے، کہ کوئی آدمی نماز یا تلاوت میں مشغول ہو، یا کوئی آدمی سویا ہوا ہو، اور کاؤنٹر مشین پر اذکار شمار کرنے سے نماز، تلاوت یا نیند میں خلل واقع ہوسکتا ہو، تو وہاں کاؤنٹر مشین کو استعمال کرنے سے اجتناب کرے۔

''الیکٹرانک تسبیح'' سے اذکار شمار کرنے میں بھی بٹن دبانے سے آواز بلند ہوتی ہے، اگرچہ لوہے کے کاؤنٹر مشین کی آواز سے قدرے کم ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سے اذکار شمار کرنے کا حکم وہی ہے، جو کاؤنٹر مشین سے شمار کرنے کا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم